

ممتاز ناقد و محقق، شہید بغداد، عالم ربانی
حضرت علامہ شیخ اسید الحق قادری عثمانی بدایونی
کی خدمات اور کارنامے پر خصوصی پیش کش

عالم ربانی نمبر

ملکائے جہان

جہانگیر

April 2014

میں جو خانقاہی نظام قائم کرنا چاہتا ہوں وہ آج کے روایتی نظام سے بہت مختلف ہے۔ یہ ایک زندہ نظام ہوگا، اس میں جتنا زور فکر فرد یعنی روز قیامت اور آخرت پر ہوگا، اتنا ہی زور غم امروز یعنی حالات حاضرہ پر اور امت کے موجودہ مسائل پر ہوگا۔ ترک دنیا کر کے صرف 'ہو حق' کی ضرر میں لگانا اسوۂ حسنہ نہیں ہے۔ تصوف پر سب سے بڑا الزام یہی لگایا جاتا ہے کہ اس کے اثر سے ملت دنیاوی مسائل اور کش مکش زندگی سے منہ موڑ کر خانقاہوں میں جا بیٹھی ہے اور ملت کے زوال میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ہم جو خانقاہی نظام چاہتے ہیں اس میں دین و دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلیں گے، ظاہری اور باطنی مسائل کے ساتھ امت کے مسائل پر بھی ارتکاز ہوگا۔ لا تنس نصیبک من الدنیا کا مطلب بھی یہی ہے کہ آخرت اور دنیاوی زندگی کے درمیان توازن ہو۔

علامہ اسید الحق قادری عثمانی

(ذاتی ڈائری کا ایک ورق: ۲۰۰۳ء)

داغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

دارالاسلام

مکتوب مدیر بہ نام ناشر

محترمی رضاء الحسن قادری صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج آپ کا دو بار فون آیا، مگر میں ایک ضروری میٹنگ میں تھا، اس لیے ریسیو نہیں کر سکا، معذرت خواہ ہوں۔ کل رات عزیز از جاں دوست مولانا سید الحق قادری رحمہ اللہ سے متعلق آپ کا تفصیلی مضمون پڑھا، بے حد پسند آیا۔ آپ نے اپنے اور ان کے علمی تعلق کے ضمن میں حضرت شہید کے اعلیٰ کردار و محاسن، فراخ دلائی و یہ اور علمی و دینی خلوص و دردمندی کی ایک داستان کو محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ رب العزت آپ کے علم و عمل میں برکتیں عطا فرمائے۔

مضمون کا آخری حصہ مجھ غریب کے ذکر پر مشتمل ہے۔ حالانکہ جن باتوں کے حوالے سے آپ نے میرا ذکر فرمایا ہے، میں کب کا انہیں فراموش کر چکا ہوں، میں ہمیشہ آپ کے دینی جذبے اور اشاعتی کاموں کا قدر دال رہا ہوں، اس میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ وہ ایک وقتی ملال تھا، جس کا ذکر میں نے دو لوگوں سے کیا تھا، ایک ثاقب رضا صاحب سے اور دوسرا اپنے دوست مولانا مرحوم سے۔ مگر گھٹتا ہے کہ ملکہ احباب میں یہ بات زیادہ پھیل گئی اور مختلف ذرائع سے مختلف انداز میں آپ تک پہنچی اور آپ نے یہ سمجھ لیا کہ میں انہی باتوں کو اب تک لیے بیٹھا ہوں، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ثاقب رضا صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ ”عالم ربانی نمبر“ شائع کرنا چاہتے ہیں تو میں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔

آپ دینی علمی کاموں میں ہمہ وقت مجھے اپنا معاون پائیں گے۔ آپ جب اور جہاں سے چاہیں میری کتابیں شائع کر سکتے ہیں۔ بس میری اتنی خواہش ہے کہ کتابوں کی سیٹنگ اسی طرح باقی رہنے دی جائے جیسے آپ کو ارسال کی گئیں ہے۔

آپ کا مذکورہ مضمون میں جام نور کے جون ۲۰۱۴ء کے شمارے میں شائع کر رہا ہوں، نیز آپ کی خواہش کے مطابق ”عالم ربانی نمبر“ کے پاکستانی ایڈیشن میں بھی اسے شامل کر کے آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ جلد ہی ٹائٹل اور کلر پیج پر بھی آپ کو بھیج دوں گا۔ احباب کو سلام

مخلص: خوشتر نورانی ۵ جون ۲۰۱۴ء

مستازنا قدو محقق، شہید اقداد، عالم ربانی
حضرت علامہ شیخ اسید الحق قادری عثمانی بدایونی
کی خدمات اور کارنامے پر خصوصی پیش کش

عالم ربانی نمبر

”میں کچھ بھی کروں، میرا میدان عمل اور دائرہ کار کچھ بھی ہو، بہر حال میں دو چیزوں سے علیحدگی اختیار نہیں کر سکتا:
(۱) مسلکی فکر، یعنی اہل سنت و جماعت پر تعلق
(۲) غوث اعظم سے غیر مشروط نسبت غلامی
میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان دونوں چیزوں سے الگ ہو کر میرا کوئی وجود یا شخص باقی رہ جائے گا۔ دھوئی کا کتا نہ گھر کا رہتا ہے، نہ گھاٹ کا، لہذا میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنی اس وابستگی میں ذرا چلک آنے دوں یا ان پر کوئی کپڑا مار کر لوں۔ ہاں! مگر بے جاتشد، غلو اور تعلق کے بدلے تعصب کو ترک کیا جاسکتا ہے، بلکہ ترک کرنا ضروری ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ غوث پاک کا قدم تمام اولیا کی گردنوں پر قیامت تک ہے، اس عقیدے سے دست بردار ہونے کو ایک لمحے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں، مگر مجھے اس پر اصرار نہیں ہونا چاہیے کہ ہر سلسلے والا اس پر اسی یقین و اذعان کے ساتھ ایمان لائے جس طرح میں لایا ہوں۔ یہ بے جاتشد اور تعصب و غلو ہے۔“

شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری
ذاتی ڈائری کا ایک ورق: ۲۰۰۳ء

ضابطہ و دستور

سلسلہ مطبوعات: 28

طبع: شعبان المعظم 1435ھ / جون 2014ء

قیمت: 270 روپے Net



ملک کانجمن

جلال نسوی

گیارہواں دور ۱۳۲ ارواں جام
اپریل ۲۰۱۳ء / جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ

مدیر اعلیٰ: خوشتر نورانی
مرتبین: ذیشان احمد مصباحی، ارشاد عالم نعمانی
سرکولیشن منیجر: منظر سبحانی
اشتہار منیجر: غلام قادر فیضی
ترمیم کار: کوثر سمنانی
ناشر: دارالسلام



جامع مسجد محلہ مولانا راجی، اندرون بھائی ٹیٹ، لاہور، پنجاب - پاکستان
0321-9425765 darulislam21@yahoo.com

مرے بیٹے، مرے بھیا، مرے بابا خدا حافظ

حضور غوث کو تم بھاگئے اچھا خدا حافظ
مرے بیٹے، مرے بھیا، مرے بابا خدا حافظ
مرے نور نظر تھے تم مرے تخت جگر تھے تم
نہیں ہیں اب یہ میرے جسم میں گویا خدا حافظ
مکمل کرنا تھی تعمیر میخانہ مگر تم تو
اوهوری چھوڑ کر ہی چل دیے بھیا خدا حافظ
برا ہے حال بے حد ماں کا بیوی بھائی بہنوں کا
خدا ہی صبر دینے والا ہے سب کا خدا حافظ
میں بڑھا اور ضعیف و ناتواں نا کارہ سا انسان
بھلا برداشت کیسے ہوگا یہ صدمہ خدا حافظ
مری تنہائی کی ہر لمحہ تم کو فکر رہتی تھی
تو اب کیوں جا رہے ہو چھوڑ کر تنہا خدا حافظ
سپر غوث تو نے کر دیا سالم تو خوش ہو، ہیں
یقیناً غوث کی آغوش میں بھیا خدا حافظ

از: شیخ عبدالحمید محمد سالم القادری

(زیب سجادہ: خانقاہ عالیہ قادریہ بدایونی شریف)

انتساب

تاجدار اہل سنت، فنائے غوثیت، جامع شریعت و طریقت
حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم القادری عثمانی بدایونی
(زیب سجادہ: خانقاہ عالیہ قادریہ بدایونی شریف)

کے نام

جن کی تربیت، توجہات اور مستجاب دعاؤں نے
شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری
کو ”سراپا اخلاص و عمل، عالم ربانی اور ممتاز ناقد و محقق“ بنادیا

شع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

من شرب كأس الشهادة

القييد العالي فضيلة الشيخ العلامة مولانا اسيد الحق محمد عاصم القادري البديوي
رحمه الله تعالى رحمة واسعة واسكنه سجن جناته

قَاسَيْتُ حُزْنَ لَيْسَ كَأَلَا حُزَانِ أَبْكِي دَمًا مَا كَانَ مِنْ سَلْوَانِ
لَقَسْنَدِبِ الْأَقْلَامِ دُمْرًا كَامِلًا أَنَّى لِهَذَا الْجُرْحِ مِنْ جَبَرَانِ
كُنْتُ الْخَلِيلَ وَلَيْسَ كَالْعَلَانِ كُنْتُ الْقَرِينَدَ بِمُخْفِلِ الْإِخْوَانِ
مَا كُنْتُ بَيْنَ الْجَمْعِ وَالْأَحْبَابِ إِلَّا وَلَسَاءُ أَصَادِقِ الْأَحْسَانِ
كُنَّا نَرَى فِيكَ الْمَحَاسِنَ كُلَّهَا خُبَا وَدَا بِسَائِمِ الْأَسْبَابِ
كُنَّا نَرَى فِيكَ الْمَعَالِمَ كُلَّهَا لِقِيَا قِصَّةِ الْأَقْوَامِ بِالْفُرْقَانِ
أَبْكِي وَيَبْكِي الْكُلُّ لِلْجُرْمَانِ مِنْ عَالِمِ مُسْتَحْكِمِ الْأَرْكَانِ
وَأَرَى الْمُعَاوِدَ وَالْمَدَارِسَ كُلَّهَا تَبْكِي عَلَى مَنْ غَابَ فِي الْبَغْدَانِ
مَنْ كَانَ يَمْلَأُ جَمْعَنَا بِمَبَاهِجِ بِالْعِلْمِ وَالْعِرْفَانِ وَالْبُرْهَانِ
وَأَسِيدَ حَقِّ كُنْتُ فِينَا دَائِمًا وَرَفْعَهُ مِنْ غَوْلِنَا الْجِيلَانِ
أَنْتَ الشَّهِيدُ بِكُلِّ مَفْهُومٍ لَهُ وَأَجَبَكَ الشَّهَادَةَ وَالْحُسْنَانِ
هَلْ غَبَتْ عَيْنَا لِحُلَّةٍ مِنْ نَبِيْنَا قَدْ كُنْتُ مِنَ الرُّوحِ فِي الْأَبْدَانِ
لَوْ لَا الرُّجْعَاءُ فِي جَنَّةِ الرَّحْمَنِ لَجَرَى شَجْوِي بِدَمِ لَنَا الْعَيْنَانِ
لَا تَحْزَنُوا صَحْبِي عَلَى مَنْ غَاشَ فِي حُبِّ الرُّسُولِ وَمَاتَ بِالْإِيمَانِ
قَدْ صَارَ لِي مَنْ قَارَ بِالرُّضْوَانِ إِذْ خَصَّصَهُ الْحَنَانُ بِالْفُقْرَانِ
وَلَهُ النَّعِيمُ بِجَنَّةِ الْمَسْنَانِ فَرَحَ لَهُ مَا لَيْسَ فِي الْحُسْنَانِ
مَا كَانَ فِي الدُّنْيَا دَوَامٌ وَبَقَا كُلُّ بِمَوْتٍ لَا يَسُ الْإِثْقَانِ
لَتَدْعُو لَهُ بِجَوَارِ حَتْمِ الْأَنْبِيَا فِي زُمْرَةِ كَسَاوَا ذَوِي الْقُرْآنِ

مولانا محمد جلال رضا انصاری
قاہرہ (مصر)

لذت جام شہادت

گم شدہ بیش بہا، فضیلۃ الشیخ علامہ مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری بدایونی علیہ الرحمۃ والرضوان کی یاد میں

- ۱- میں اس وقت زندگی کے سب سے بڑے غم سے دوچار ہوں اور میری آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے، گویا اب اس غم کا مداوا ناممکن ہے۔
- ۲- ارباب قلم کو چاہیے کہ اس عظیم سانحے پر غصے تک نوحہ کناں رہیں، کیوں کہ یہ غم اب بھرتا ہوا نظر نہیں آتا۔
- ۳- تم سارے دوستوں سے الگ اور حلقہ احباب میں مفرد و یکساں تھے۔
- ۴- تم عوام و خواص اور احباب و اغیار سب کے لیے سراپا و قاف اور احسان و اخلاص رہے۔
- ۵- ہمیں تمہاری ذات میں الفت و محبت اور خندہ روئی جیسی تمام اخلاقی خوبیاں نظر آتی تھیں۔
- ۶- اور تمہاری شخصیت میں قیادت و امامت کے لیے مطلوب جملہ اوصاف کے آثار جلوہ گر تھے۔
- ۷- جن عظیم اور جلیل القدر عالم کو کھوکھو میں بھی رو رہا ہوں اور میرے ساتھ ہر شخص رو رہا ہے۔
- ۸- میں دیکھ رہا ہوں کہ بغداد و معلیٰ میں روپوش ہو جانے والے اس شخص کے غم میں تمام علمی ادارے اور مدارس گریہ کناں ہیں۔
- ۹- اس کی دل آویز شخصیت انجمن احباب کو علم و عرفان اور دلیل و برہان سے رونق بخشتی تھی۔
- ۱۰- تم ہمارے سچ ہمیشہ شیر حق بن کے رہے اور یہ شیر اند و صف تم نے حضرت غوث اعظم جیلانی سے ورثے میں پایا تھا۔
- ۱۱- تم شہادت کے تمام تر مفہوم کے ساتھ درجہ شہادت پر فائز ہو گئے اور حسین کریمین اور تمام شہداء کے محبوب نظر بن گئے۔
- ۱۲- کیا ہوا کہ تم اچانک ہم سے روٹھ گئے؟ جب کہ تم ہماری انجمن میں ایسے تھے جیسے جسم میں روح ہوا کرتی ہے۔
- ۱۳- اگر خدا سے رحمت کی جنت میں تمہارے ہونے کی امید نہ ہوتی تو اس غم فرقت میں ہماری آنکھیں ضرور خون کے آنسو بہاتیں۔
- ۱۴- میرے دوستوں اس شخص کا غم نہ کرو جو عشق رسول کے ساتھ زندہ رہا اور دولت ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا۔
- ۱۵- وہ رضاے الہی سے سرفراز بندوں میں شامل ہو گیا اور اللہ کریم نے اپنی خصوصی بخشش سے اسے شاد کام فرمادیا۔
- ۱۶- اللہ کریم کی بہشت جاوداں میں اس کے لیے ایسی ایسی نعمتیں اور مسرتیں ہیں جن کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔
- ۱۷- دنیا میں کسی کے لیے دوام و بقا نہیں، ہر ایک کو مر کر کفن پوش ہونا ہے۔
- ۱۸- ہم اس کے لیے عاشقان قرآن کے زمرے میں سرکار ختمی مرتبت ﷺ کے قرب و محاسن کی دعا کرتے ہیں۔

استمداد بحضور غوث الثقلین

از: مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

ظلمت شب میں اچانک دل تیرہ چمکا
گوپا وادی طوی میں کوئی شعلہ چمکا
یا شب تار میں جیسے یلہ بیضا چمکا
یعنی سوئی ہوئی قسمت کا ستارہ چمکا

آئی آواز کہ تو اتنا پریشان ہے کیوں
اتنا افسردہ و رنجیدہ و تیران ہے کیوں

ایک ہستی ہے اگر اس سے تو فریاد کرے
اس سے گر شکوہ ہے رچی صیاد کرے
وہ ابھی تجھ کو غم دہر سے آزاد کرے
دلِ ناشاد کو ترے وہ ابھی شاد کرے

کیا بڑی بات ہے اس کو غم ہستی کا علاج
وہ تو کر دیتا ہے زہلی ہوئی کشتی کا علاج

ہاں وہی غوث کہ سر غوث سے شکت جس کا
کہ تو غور ازل سے درج رہا جس کا
اولیٰ ہوتے ہیں نقشب کتب پا جس کا
”خیر کو خطرے میں لاتا نہیں کتا جس کا“

جس کے قدموں کا نشان گردن افراد پہ ہے
دوشِ اقطاب پہ ابدال پہ اتمام پہ ہے

یعنی وہ غوث جہاں حضرت عبدالقادر
بے نشانوں کا نشان حضرت عبدالقادر
قطب اقطابِ زمان حضرت عبدالقادر
قبلہ و کعبہ جاں حضرت عبدالقادر

چل انھیں کے در دولت پہ لیے چلتے ہیں
آج تجھے بابِ اجابت پہ لیے چلتے ہیں
یہ وہی در ہے جسے قبلہ حاجات کہیں
جس کے ہر ذرے کو ہم خارقِ عادات کہیں

تو بھی گر چاہتا ہے غم کا مداویوں کر
ایک جھلے میں علاجِ غم فردا یوں کر
دلِ بیمار کو اک آن میں اچھا یوں کر
آ در غوث پہ اور عرض تمنا یوں کر

غوثِ اعظمؒ بنیں بے سروسامان مددے
قبلہ جاں مددے کعبہ ایمان مددے

لطف فرما کہ ہے طوفانِ بلا میں کشتی
آگنی حوصلہ ذوقِ عمل میں پستی
آج ویران ہے پھر سے مرے دل کی بہتی
ما گداکیم و تو سلطانِ دو عالم ہستی

از تو داریم طمع یا شہ جیلاں مددے
غوثِ اعظمؒ بنیں بے سروسامان مددے

عالم ربانی کی آخری تحریر

جسے انہوں نے آستانہ غوث اعظم بغداد میں واقع قادری لائبریری کی زیارت کے بعد لائبریری کے معاینہ رجسٹر پر لکھا تھا۔

باسمہ تعالیٰ

لقد سعدت بزيارة المكتبة القادرية بحضرة القادرية الشريفة، وليست زيارتي هذه اول زيارة، وانما تشرفت بزيارتها قبل هذه اكثر من مرة في عقد التسعينيات عند ما كنت ازور بغداد، فهذه المكتبة آن ذاك كانت في مبناها القديم، ولكنني فرجت الآن عند ما وجدتها في المبنى الجديد، بارك الله في من ساهم في بناءها وتجديدها. وجدت المكتبة معمورة بقيم الكتب بما فيها اكثر من الف المخطوطات القديمة والقيمة وآلاف كتب مطبوعة، وهذا ان دل على شيء فهو يدل على ان القائمين باشراف المكتبة وتحسينها هم اصحاب الخبرة ولهم ذوق رفيع، جعلها الله تعالى خادمة ومساعدة للعلم والعلماء رافعة راية العلم والتحقيق والبحث عالية خفاقة، ورزقنا الله تعالى زيارة بعد زيارة لها ولحضرة القادرية المقدسة، ورزقنا الله تعالى بركات سيدي الشيخ القطب عبد القادر الكيلاني الذي اتسمت المكتبة باسمه. آمين.

اسيد الحق قادری

خادم العلم والعلماء

بالمدرسة القادرية، بمدينة بدايون الشريفة (الهند)

فی ۲ من مارس سنة ۲۰۱۳ م

باسمہ تعالیٰ

میں آستانہ غوث اعظم میں واقع قادری لائبریری کی زیارت سے مشرف ہوا۔ میری اس لائبریری میں یہ پہلی حاضری نہیں ہے، بلکہ اس سے قبل ۹۰ کی دہائی میں جب میں بغداد حاضر ہوا تھا اس وقت بھی ایک سے زائد بار اس لائبریری کی زیارت سے مشرف ہوا تھا۔ اُس وقت اس لائبریری کی عمارت قدیم تھی، مگر اس مرتبہ اسے نئی عمارت میں دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی تعمیر و تجدید کاری میں شریک ہونے والے حضرات پر اپنا خاص فضل فرمائے۔

یہ لائبریری نہایت گراں قدر کتابوں سے مالا مال ہے، اس میں تقریباً ایک ہزار سے زائد قدیم اور قیمتی مخطوطے اور ہزار ہا مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ اگر اس سے کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ کہ لائبریری کی تحسین و تزئین کاری میں سرگرم حضرات ماہر و تجربہ کار اور باذوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس لائبریری سے علم و علما کی خدمت و تعاون کا کام لے اور اس کے ذریعے علم و تحقیق اور بحث و نظر کا پرچم بلند فرمائے اور مجھے اس کی اور آستانہ غوثیت کی بار بار حاضری نصیب فرمائے اور ہم سب کو اس لائبریری اور حضرت قطب زماں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کی برکات سے مستفیض فرمائے، جن کے نام سے یہ لائبریری منسوب ہے۔ آمین۔

اسید الحق قادری (خادم العلم والعلماء: مدرسہ قادریہ، بدایوں شریف، ہند)

۲ مارچ ۲۰۱۳ء

مشمولات

- 03 حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری (مرے بیٹے، مرے بھیا، مرے باپا خدا حافظ (لظم)
- 04 مولانا محمد جلال رضا ازہری (عربی مرثیہ)
- 06 شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری (لظم)
- 08 شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری (تأثر)
- 14 خوشتر نورانی (اداریہ)
- کچھ باتیں
- من شرب كأس الشهادة
- استمداد بخور غوث الثقلین
- عالم ربانی کی آخری تحریر
- کچھ باتیں

روداد غم

- 18 خوشتر نورانی
- 25 خوشتر نورانی
- مرارنگ دروہ پگڑ گیا، مرایا رجمہ سے پھڑ گیا
- (ساختہ شہادت کی روداد صاحبزادہ مولانا عطیہ قادری کی زبانی)

نالہ درد

عالم ربانی کی شہادت پر اہل خانقاہ کے کلمات رنج و غم

- 40 امین ملت پروفیسر سید محمد امین قادری
- 41 رفیق ملت حضرت سید نجیب حیدر لوری
- 42 مفتی محمد عبید الرحمن رشیدی
- 43 حضرت سید شاہ فخر الدین اشرف جیلانی
- 43 شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی
- 44 حضرت شاہ محمد ثقلین میاں قادری مجددی
- 45 مولانا جلال الدین عبد الستار فرنگی محلی
- دنیاے سنیت کا ایک بڑا محقق ہمارے درمیان سے چلا گیا
- خانقاہ برکاتیاہ اپنے چہیتے اور روحانی فرزند سے محروم ہو گئی
- جماعت اہل سنت کا ایک ناقابل حلافی نقصان
- سنیت کا ناقابل حلافی نقصان
- خانقاہ عارفیہ میں ماتم کا ماحول
- ایک بے مثال عالم دین کے جانے سے ساری دنیا سو گوار
- دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے؟

• یہ ہولناک خبر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری

• دل اب بھی یقین کرنے پر آمادہ نہیں

• علم و ادب کا ایک پہاڑ مسمار ہو گیا

• ایک عجیب حجابی کیفیت پیدا ہو گئی

• علامہ بدایونی کی کمی پوری کرنا جماعت کے لیے بڑا چیلنج

• پوری ملت اسلامیہ کا عظیم نقصان

• علامہ اسید الحق ملت اسلامیہ کا سرمایہ افتخار تھے

• موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ انوس

• شیخ اسید الحق شریعت و حقیقت کے سچے طالب تھے

• پروفیسر سید طلحہ رضوی برق

• مولانا شاہ محمد آیت اللہ قادری

• شیخ علی محمد حربی رفاہی شافعی

• حضرت سید شاہ سیف اللہ صفوی مسندی

• حضرت سید شاہ صداقت علی جیلانی

• حضرت سید تنویر اشرف اشرفی جیلانی

• مولانا سید محمد علی قادری الہاشمی معشاد پاشا

• حضرت سید شاہ عبداللہ حسین بادشاہ قادری

• شیخ ڈاکٹر انس محمود خلف

گریہ الم

عالم ربانی کی شہادت پر اہل علم کے کلمات رنج و الم

• مولانا کی ناگہانی رحلت سے سب غم زدہ اور ناامید ہو گئے

• یہ سانحہ دل و دماغ کو ہلا دینے والا ہے

• مولانا کی شہادت ملت کے لیے المیہ

• اہل سنت و جماعت کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں

• میرے رب کریم نے انھیں بہت نوازا تھا

• مولانا اسید الحق کی شہادت پوری ملت کا عظیم نقصان

• مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

• جماعت اہل سنت غم و اندوہ میں ڈوب گئی

• وہ ایک عظیم علمی و روحانی خاتون کے عظیم فرد تھے

• مولانا کا سانحہ ارتحال عالم اسلام کے لیے المیہ ہے

• علامہ اسید الحق قادری کی رحلت جماعت کا عظیم خسارہ

• مولانا اسید الحق قادری ایک عظیم مفکر و مدبر تھے

• یہ ایک فرد کا نہیں پوری ملت کا غم ہے

• مولانا اسید الحق قادری تاریخ رقم کر گئے

• سعیت ایک عظیم مفکر سے محروم ہو گئی

• مولانا اسید الحق قادری علما کے لیے مینارہ نور تھے

• اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

• نئے عہد کا ایک روشن ستارہ غروب ہو گیا

• یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے

• ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں

• مولانا اسید الحق قادری محبوب غوث اعظم ہیں

پس منظر

• خانوادہ عثمانیہ: تعارف و خدمات

• اے سر زمین و جلہ و فرات!

• عالم اسلام میں یہ حادثے کیوں ہوتے ہیں؟

• عالم اسلام میں روحانی اقتدار کے علم برداروں کا قتل

• مفتی محمد حسان رضا عطاری المدنی

• پروفیسر سید حسین الحق چشتی

• مولانا محمد فطانتا بلش قصوری

• مولانا منظر الاسلام ازہری

• مولانا اسید انور چشتی

• مولانا دلشاد احمد قادری

• احمد جاوید

• ذیشان احمد مصباحی

• غلام رسول دہلوی

شخص و عکس

• آئینہ حیات عالم ربانی

• ارباب علم و دانش کے اعترافات

• مولانا اسید الحق قادری: شخص و عکس

• کچھ یادیں کچھ باتیں

• دس سالہ عملی زندگی کے چند یادگار شب و روز

• صاحبزادہ مولانا عزام قادری

• مولانا سید عادل محمود کلیسی

• صاحبزادہ مولانا عطیہ قادری

• ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی

• عبدالعلیم قادری

اظہار و اعتراف

• یہاں سے گزرا ہے ایسے خزانے والا کون!

• اہل سنت کے دو جگر پارے

• اس جوان رعنا کو کس کی نظر لگ گئی!

• مولانا اسید الحق جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں

• یہ صدمہ بھلایا نہیں جاسکتا

• آفتاب قادریت نصف النہار سے پہلے ہی روپوش

• تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا

• حضرت سید محمد اشرف قادری مارہروی

• مولانا یونس اختر مصباحی

• پروفیسر اختر الواسع

• پروفیسر خواجہ اکرام

• ڈاکٹر مفتی محمد کرم احمد نقشبندی

• مفتی محمد نظام الدین رضوی

• صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری

کمالات و امتیازات

248	احمد جاوید	● ایک تھا خامہ تلاش
254	مولانا محمد طفیل احمد مصباحی	● مولانا اسید الحق قادری: ایک عظیم محقق
257	مفتی مطیع الرحمن مظفر رضوی	● علامہ اسید الحق بدایونی اور امام احمد رضا بریلوی
268	مولانا شہباز عالم مصباحی	● مولانا اسید الحق قادری اور جام نور
273	سید تالیف حیدر	● کل وقتی شعری مزاج کا جزوقتی شاعر
280	سید نورین علی حق	● مولانا اسید الحق قادری کی مکتوب نگاری
287	محمد عاقب رضا قادری	● مولانا اسید الحق قادری: محسن رضویات
292	محمد رضا الحسن قادری	● ایسا بھی اک شخص تھا جو ملا نہیں اور محمد مکیا

علمی آثار

305	ارشاد عالم نعمانی	● مولانا اسید الحق قادری اور کتب اسلاف کی تحقیق و اشاعت
336	مولانا ضیاء الرحمن علی	● مولانا اسید الحق قادری کی تصانیف: ایک تعارف
342	مولانا فہیم احمد ثقلینی ازہری	● عالم ربانی کے مقالات و مضامین: ایک تعارف
358	پروفیسر یونس اکاسکر	● عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات: ایک مطالعہ
361	ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی	● مقدمہ تصدیق تان راکستان پر طائرانہ نظر
365	مولانا قلام مصطفیٰ ازہری	● احادیث قدسیہ: ایک جائزہ
368	مولانا ابرار رضا مصباحی	● فرزدق حبیبی کا قصیدہ ہمدیہ: ایک جائزہ

اظہار غم

374	ادارہ	● مجالس تعزیت
381	ادارہ	● تعزیتی فون/ایس ایم ایس

حدیث دل

385	ادارہ	● عالم ربانی مولانا شیخ اسید الحق قادری کا منتخب کلام
397	ادارہ	● نکوس اسناد و اجازات

169	مولانا عبدالمبین نعمانی	● علم و تدبر، فکر و فن اور علم و تحقیق کا پیکر
172	سید صبیح الدین صبیح رحمانی	● ان کی یاد ہمیشہ دل کا زخم بنی رہے گی
173	ڈاکٹر عزیز احسن	● مولانا اسید الحق قادری: ایک کثیر اللسان نابغہ
175	مولانا عبید اللہ خان اعظمی	● علامہ بدایونی کا علم ان کی عمر سے کوسوں آگے تھا
177	ڈاکٹر سید علیم اشرف جاسی	● فکری اصالت اور عصری پیش کش کی نادر مثال
180	مولانا سید رکن الدین اصدق	● ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے
182	پروفیسر فاروق احمد صدیقی	● ایک فرد نہیں، ایک تحریک کی موت
184	پروفیسر عبد الحمید اکبر	● مثالی عالمانہ اکسار اور صوفیانہ افکار کے حامل
186	مولانا صدر الوری مصباحی	● مولانا اسید الحق قادری: ایک بے مثال محقق
189	مولانا نفیس احمد مصباحی	● ایک انسان میں ہزاروں اہل ہمت کا ثبات
196	مولانا مبارک حسین مصباحی	● عزائم اور منصوبوں کے اک جہان کی موت
202	ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی	● علامہ اسید الحق قادری ملک و ملت کا سرمایہ تھے
204	ڈاکٹر سید سراج اجٹلی	● خط بنام اسید خلد تبار
207	ڈاکٹر ممتاز احمد سیدی	● بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
212	مولانا فروغ القادری	● لوگ صدیوں میں اتنا کام نہیں کر پاتے
214	ڈاکٹر غلام زرقانی	● حیات قابل تہریک اور مہمات قابل صدر شک
215	مفتی سید ضیاء الدین نقشبندی	● مولانا اسید الحق قادری: اسلاف شناس محقق
217	ڈاکٹر سید محمد اشرف اشرفی جیلانی	● علامہ اسید الحق قادری نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں
219	ڈاکٹر عبد السلام جیلانی	● عالمانہ وقار اور اسلامی شعار کا پیکر جمیل
222	ڈاکٹر افضل مصباحی	● بے مثال شہرت و مقبولیت کے مالک
224	محمد احمد ترازوی	● ایک ممتاز اسلامی اسکالر
226	مولانا نعمان احمد ازہری	● مجلس احباب کا میر
228	ارشاد عالم نعمانی	● بڑوں کے لیے خیر عصر اور نسل نو کے لیے خیر عصر
231	مفتی ذوالفقار خان نعیمی	● علامہ بدایونی کی علمی سخاوت بے مثال تھی
233	مفتی شمشاد حسین رضوی	● خانوادہ عثمانی کے امتیازات و کمالات کا سچا جانشین
236	مولانا فروز قادری چریا کوٹی	● علامہ اسید الحق قادری عبقری عصر تھے
239	مولانا سید نور الدین اصدق	● علامہ اسید الحق قادری کی ذات مجمع البحرین تھی
242	مولانا حسن سعید صفوی	● ملنے کے نہیں تباہ ہیں ہم
244	مولانا صادق رضا مصباحی	● نسل نو کے سب سے بڑے محسن

کچھ باتیں

”ہم دونوں میں سے پہلے جو بھی اس دنیا سے جائے گا وہ دوسرے کا مرثیہ لکھے گا، میں اگر پہلے دنیا سے چلا گیا تو تم لکھنا اور تم پہلے گزر گئے تو میں لکھوں گا۔“

یہ جملہ میرے عزیز از جاں دوست مولانا اسید الحق قادری نے ایک بار نہیں، پچھلے پانچ برسوں میں متعدد بار مجھ سے کہا تھا۔ گویا ہمارے درمیان یہ ایک معاہدہ تھا، جس کو پورا کرنے کا ہم دونوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا۔ جب وہ مجھ سے اس معاہدے کو دہراتے، میں ہنس دیتا، یہ سوچ کر کہ ابھی تو ہماری عمر ہی کیا ہے؟ ابھی تو ہم دونوں کو بہت سے کام کرنے ہیں، کئی معرکے سر کرنے ہیں اور فکر و قلم کے نئے آفاق تلاش کرنے ہیں۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس معاہدے کو پورا کرے، تاہم اسے کم از کم کئی دہائیوں تک انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن شاید قدرت میری اس سوچ پر ہنس رہی تھی۔ میرا دوست، میرے فکر و عمل کا شریک اور میری زندگی کا لوٹ حصہ مجھے روتا بلکتا چھوڑ گیا، اُس کے اس طرح اور یوں چلے جانے سے دنیا سے دل اچاٹ ہے اور زندگی کی بے ثباتی کا یقین بڑھ گیا ہے، گویا اپنی رخصتی کا اب انتظار ہے۔

لو دوست! آج میں اپنے معاہدے کی تکمیل کر رہا ہوں اور اس انداز سے کر رہا ہوں کہ تمہارے اس مرثیے میں میں نے ہندوپاک کے لاتعداد علماء و مشائخ اور اہل قلم کو شامل کر لیا ہے۔ تمہارے جانے کا یہ پہاڑ جیسا غم میرے اکیسے کا غم نہیں رہا، ملت اسلامیہ کا اجتماعی غم بن گیا ہے۔ تم نے شاید مجھ سے ایک مضمون کی بات کی تھی، تمہارے اس دوست نے سینکڑوں صفحات کا ایک دفتر تیار کر دیا ہے۔۔۔۔۔ مع تم نظر تک چاہتے تھے ہم تو جاں تک آ گئے

۳ مارچ ۲۰۱۳ء کو حضرت شیخ اسید الحق قادری کی شہادت ہوئی، اتفاق سے جام نور کے مارچ کا شمارہ پریس کے حوالے ہو چکا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد تین دنوں تک کچھ ہوش و حواس نہیں رہا۔ ۸ مارچ کو جب حواس کچھ بحال ہوئے تو خیال آیا کہ ان کے چہلم کے موقع پر ”جام نور“ کا ایک نمبر آنا چاہیے، اُس وقت میں بدایوں میں تھا، اس خیال کے آتے ہی میں نے شمارہ مارچ کی اشاعت رکودی اور بدایوں سے ہی اگلے شمارے (اپریل) کے لیے ”ممتاز ناقد و محقق نمبر“ کی اشاعت کا ایک اعلان بنا کر مارچ کے شمارے میں شامل کر دیا۔ یہ شمارہ کتنے صفحات کا ہونا چاہیے؟ کتنے اہل قلم اس شارٹ نوٹس پر مضامین لکھ پائیں گے؟ اور یہ کام ۲۰ دنوں کے اندر کس طرح مکمل ہوگا؟ ان تمام سوالات کے جوابات میرے پاس نہیں تھے۔ بدایوں سے میں ۱۲ مارچ کو لوٹ کر دہلی آ گیا اور آج ۳ اپریل ہے، ۴۰۰ صفحات کا یہ ضخیم نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

جام نور کی اشاعت کے حوالے سے مجھے ۱۲ سال کا صحافتی تجربہ ہے۔ ۱۲ سال کی اس طویل مدت میں میں نے سینکڑوں صفحات پر مشتمل کئی ضخیم نمبر نکالے، مگر ان نمبر کی تیاری اور ان کی اشاعت میں مجھے جن پریشانیوں سے گزرنا پڑا وہ ناقابل بیان ہے۔ کسی نمبر کے نکالنے سے پہلے اس کے لیے کئی مینٹگیں ہوتیں، ایک سال پہلے اس کا اعلان کیا جاتا، اس نمبر کا اعلان سال بھر تک تواتر سے جام نور میں شائع

ہوتا رہتا، پھر اہل قلم کو مضامین لکھوانے کے لیے کم از کم چھ ماہ پہلے دعوت دی جاتی، ان سے بار بار تقاضے کیے جاتے اور پھر اس کی اشاعت کے وسائل کے لیے جدوجہد کا ایک طویل سلسلہ ان سب پر متنازعہ۔ پھر بھی ہم اپنے معیار کے مطابق اس کی اشاعت نہیں کر پاتے۔ زیر نظر نمبر نے خصوصی اشاعت کے حوالے سے میرے اس عملی تجربے کو یکسر غلط ثابت کر دیا۔ اس نمبر کی اشاعت کے تعلق سے نہ کوئی مینٹنگ ہوئی، نہ سال بھر پہلے اعلان کا موقع ملا اور نہ ہی اہل قلم کو مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی۔ ان سب کے باوجود ۲۰ دنوں کے اندر برصغیر ہندوپاک کے مشاہیر اہل علم و قلم، خانقاہوں کے مشائخ، علماء اور محبت کرنے والے احباب نے اس کثرت سے ہمیں اپنے تاثرات اور مضامین لکھ بیچے کہ انتخاب کرنا مشکل ہو گیا کہ کسے شائع کریں اور کسے نہ کریں۔ ۲۰ دنوں کے اندر کسی نمبر کی اشاعت میں قلمی شمولیت کے اس جوش و خروش کی مثال پیش کرنے سے مذہبی صحافتی تاریخ قاصر ہے۔ ایک ہفتے قبل ہم نے ۳۰۰ صفحات پر نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تھا، مگر احساس ہوا کہ اس ضخامت میں بہت سے مشاہیر اہل قلم اور مشائخ کی نگارشات شامل ہونے سے رہ جائیں گی، اس لیے ۳۰۰ صفحات سے بڑھا کر ہم نے ۴۰۰ صفحات کر دیے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے ۴۰۰ صفحات کے اس ضخیم نمبر میں بھی متعدد مشاہیر کے تاثرات اور مضامین شامل ہونے سے رہ گئے۔ ان کے ساتھ ان احباب اور علماء کی تحریریں بھی اس خصوصی شمارے کی زینت نہیں بن سکیں جنہوں نے دل سے شہید بغداد کے لیے اپنی محبت کا اظہار اور ان کی خدمات و کارناموں کا اعتراف کیا تھا۔ ایسی تحریروں کی تعداد بھی ۱۰۰ سے تجاوز ہے۔ وقت ہوتا تو اس نمبر کے لیے ایک ہزار صفحات بھی کم پڑتے۔ یہ نمبر ایک انتخاب ہے جس میں بیشتر معروف اہل قلم، مشاہیر علماء اور مشائخ کی تحریریں ہی شامل کی جا رہی ہیں، اس حیثیت سے بھی مذہبی صحافتی دنیا کا یہ ایک منفرد نمبر ہے۔

عالم ربانی کے لیے احباب اور علماء کے جذبات کو دیکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جام نور کے مئی ۲۰۱۳ء کا شمارہ بھی عالم ربانی کے نام منسوب ہوگا اور اس خصوصی اشاعت میں وہ تمام تحریریں شامل کی جائیں گی جو شائع ہونے سے رہ گئیں۔ ہم ایسے تمام اہل قلم، علماء اور احباب کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور اس نمبر میں ان کی تحریروں کی عدم شمولیت پر معذرت خواہ ہیں۔

”ممتاز ناقد و محقق نمبر“ کے عنوان سے اس خصوصی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا، مگر حضرت مولانا سیدنا امین اختر مصباحی صاحب اور دیگر احباب کے مشورے سے اس کا عنوان تبدیل کر کے ”عالم ربانی نمبر“ کر دیا گیا ہے۔

اخیر میں، میں صاحبزادہ مولانا عطیہ میاں قادری، صاحبزادہ مولانا اعجاز میاں قادری، حضرت مولانا عبد القیوم قادری اور مدرسہ قادریہ بدایوں میں ان کی لائق ٹیم کے افراد، خصوصی طور پر عزیز گرامی عبد العظیم قادری، مولانا دلشاد احمد قادری اور مولانا مجاہد قادری کا ممنون ہوں۔ ان کے تعاون اور اشتراک کے بغیر اس نمبر کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔

میری ٹیم کے سب سے لائق و فائق فرد اور دوست مولانا فیضان احمد مصباحی اور مولانا ارشاد عالم نعمانی کے احسانات اور گراں قدر تعاون کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یہ دونوں حضرات اس نمبر کے لیے دو ہفتوں تک ۲۰-۲۰ گھنٹے میرے ساتھ بے لوث کام کرتے رہے۔ ان کے بغیر اس نمبر کی اشاعت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتا۔ میں اپنے دیگر احباب خصوصی طور پر ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی اور سید تالیف حیدر کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مضامین کی فراہمی میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں عزیزم کوثر سمبانی اور منظر سمبانی کے لیے بھی سراپا سپاس ہوں، جنہوں نے بہت کم وقت میں اسے اشاعت کے مرحلے سے گزار کر آپ تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ لیجیے! عالم ربانی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مطالعہ کیجیے۔ ایک عبقری وقت کے چلے جانے کا ماتم کیجیے اور اللہ سے اس کا فہم البدل پیدا کرنے کی دعا بھی۔

غم زدہ روتے، تڑپتے، سر پختے رہ گئے
تو گیا اور ہم تری صورت کو تکتے رہ گئے

قطعه تارخ شہادت

گرامی دودمان حضرت علامہ اسید الحق قادری بدایونی رحمۃ اللہ علیہ

چہ جانکاه آمد خبر آہ آہ
عجب سانحہ قاصد بود این
اسید الحق قادری شد شہید
جوان سال و علامہ بے نظیر
جہاں سوگوار و فضا ماتی
مقدر نصیبہ و قسمت بگو
الہی بخت بنی فاطمہ
بہ پس ماندگان و پدر محترم
ز حق از پیش بخشش و مغفرت
بہ پائین غوث الوری یافت جا

سرخوش ہاتف جدا کرد و گفت

اسید الحق قادری در بہشت

۱۴۳۵ھ

(از: ہمدرد فیروز علی قادری برقی)

مجاہد نشین: خانقاہ چشتیہ نظامی، شاہ ولی، داتا پور، پٹنہ (بہار)

□□□

(۱)

روداد غم

مرارنگ و روپ بگڑ گیا، مرایا ر مجھ سے بچھڑ گیا

ایک بچہ نے والے دوست کا مرثیہ جس کے بغیر زندگی بے رنگ و نور ہو گئی ہے

قیامت سے گزرنے والے پارا پارا ہونا، دل اپنے پہلو میں دھڑکنے بھول جانا، رگوں کا خون منجمد ہو جانا اور ہوش و حواس کھو دینا۔ اردو کے یہ تمام محاورے ہم اپنے بچپن سے ہی سنتے اور پڑھتے چھ آ رہے ہیں، لیکن ان کے معانی کا ادراک اور احساس پہلی بار ۱۴ مارچ کو ہوا، جب میرے بچپن کا پار، میرا غم گسارا و دراز دار شہادت سے سرفراز ہو کر ہمیشہ ہمیش کے لیے مجھ سے رخصت ہو گیا۔

دنیا نے انھیں ممتاز ناقد و محقق، شاعر صاحب، مولانا اسید الحق قادری، ابوالفیض معینی، اسید میمن، اسید صاحب اور نہ جانے کس کس نام اور لقب سے یاد کیا اور ان کے علمی مرتبے، مقناطیسی شخصیت، منفرد قلم، بلند کردار، یعنی ظرفی، مثالی انلاق اور قہر تلخ نگہ نگاری کے گن گان کیے۔ ان کے فقید المناں کا رناموں کا اعتراف کیا، اہل سنت کے مذہبی مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لیے ان سے بے پناہ توقعات وابستہ کیں اور بالآخر دنیا سے ان کی ناگہانی رخصتی کو اہل سنت، اہل تصوف اور اہل خانقاہ کا ناقابل تلافی نقصان قرار دے کر ماتم بھی کیا۔ مگر میرے لیے وہ بچپن سے اب تک ”بھیا“ ہی رہے۔ اس ایک مختصر سے لفظ سے انھیں پکارنے میں ان کے علمی مرتبے کا اعتراف بھی تھا، ان کے کارناموں پر غور بھی، ان کے مشن پر اترا ہٹ بھی، پاس ادب بھی، معاصرانہ شوخی بھی، محبتوں اور قربتوں کی انتہا بھی۔ ان سے محبت کرنے والوں کی کمی نہ تھی، انھوں نے بھی اپنے ملنے والوں سے ہمیشہ اپنائیت کا اظہار کیا اور حسب مراتب ان کا خیال بھی رکھا، کوئی مشفق اور مرنی استاذ کی حیثیت سے ان سے قریب تھا تو کوئی شاگرد کی حیثیت سے انھیں بہت محبوب تھا، بہت سے ان کے دوست بھی تھے جن سے ان کی بے تکلفی تھی، مگر ان رشتوں کی اپنی نزاکتیں اور حدیں تھیں، جن سے تجاوز کرنا انھیں پسند نہیں تھا۔ تاہم اپنے اہل خانہ کے بعد انھوں نے اگر کسی کو اپنی زندگی کا راز دار بنایا، کسی کو اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی میں بھی دخل کا حق دیا، کسی سے ہر بات شیر کی، کسی سے تکلفات کی ساری حدیں ختم کر دیں، کسی کے گھر کو اپنا گھر سمجھا، کسی کی تحریک اور مشن کو اپنی تحریک اور مشن، کسی کی تعریف کو اپنی تعریف، کسی کی برائی اور مخالفت کو اپنی برائی اور مخالفت جانا تو وہ میں تھا۔

۲۰۱۲ء کے عرس قادری کی محفل میں وہ مہمان مل و مشارح کا تعارف کر رہے تھے، میں مہمان نہیں تھا، اس حیثیت سے خانقاہ میں میں کبھی حاضر بھی نہیں ہوا، ہمیشہ اپنے آپ کو منتظم اور خادم ہی سمجھ، پھر بھی سبھوں کا تعارف کرانے کے بعد جب ان کی نگاہ مجھ پر پڑی تو کہنے لگے ”یہ مولانا خوشتر نورانی ہیں، اب میں ان کا کیا تعارف کراؤں! بس اتنا سمجھ لیجئے کہ لوگ جب ان کی تعریف کرتے ہیں تو میری بھی کرتے ہیں اور جب ان کی برائی ہوتی ہے تو اس میں میں بھی شامل رہتا ہوں۔“

اس وقت ان کے اس مختصر اور جامع تعارف پر پوری محفل مسکرائے بغیر نہ رہ سکی، لیکن اب سوچتا ہوں تو سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ درحقیقت ہمارے جذباتی رشتے کا بے محابا اعلان تھا کہ ہم دونوں الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ انھوں نے مجھ سے اپنی قربتوں کے اظہار میں کبھی تحفظات کا خیال نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں لوگوں کے درمیان ہماری قربتوں کے جڑے زبان زد عام تھے۔ یہاں یہ کہنا فضول اور غیر اہم ہے کہ میری زندگی میں بھی انھیں یہی مقام حاصل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ہزاروں لاکھوں چاہنے والوں میں بہتوں نے انھیں یہ حیثیت دے رکھی ہو۔ اہمیت کی حامل ان کی وہ مخصوص عنایتیں اور قربتیں تھیں جو صرف میرے حصے میں آئی تھیں، جن پر میں اترا تھا، فخر کرتا تھا اور ان کی غیر مشروط دوستی کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتا تھا، ورنہ بقول حالی:

غالب نکتہ وال سے کیا نسبت! خاک کو آسمان سے کیا نسبت!

ہرمیٹھ دو مہینے پر ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں، کبھی وہ دہلی آ گئے، کبھی میں بدایوں چلا گیا، کبھی ہم کسی سیمینار یا کانفرنس میں شرکت کے لیے نکل گئے تو کبھی کسی لائبریری میں کتابوں اور حوالوں کی تلاش میں چس دیے۔ ۲۰۰۳ء میں مصر سے ان کی واپسی کے بعد پچھلے دس برسوں میں شاید ہی ایسا کوئی پروگرام، سیمینار، کانفرنس، علمی یا تفریحی سفر ہو جس میں ہم دونوں ساتھ نہ ہوں۔ لوگ ہمیں ایک ساتھ دیکھنے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ”سایہ“ کہتے تھے۔ ہم دونوں اثر اس بات پر ہستے تھے کہ ہم میں سے کوئی ایک کہیں اکیلا چلا جاتا ہے تو اکثر لوگ دوسرے کو پوچھتے ہیں۔ میں کبھی کہیں اکیلا چلا جاؤں تو اکثر لوگ تعجب سے سوال کرتے کہ ”ارے آپ اکیسے امولانا اسید الحق کہاں ہیں؟“ ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہوتا۔ ابھی چند ماہ پہلے حضرت امین ملت کے صاحب زادے اور ولی عہد حضرت امین میں کی شادی ہوئی اور احباب کی کثرت اور سہولت کے پیش نظر ویسے کی دو تقریب رکھی گئی، ایک مارہرہ اور دوسری علی گڑھ میں۔ دہلی سے علی گڑھ قریب ہونے کی وجہ سے میں علی گڑھ میں مدعو تھا، جب کہ بھیا مارہرہ میں۔ ویسے میں شرکت کے بعد ان کا فون آیا اور بڑی جھنجھلاہٹ سے کہا کہ ”یار! اب ہم ہمیشہ ایک ساتھ ہی کہیں جایا کریں گے، میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، سب خیریت تو ہے؟ اس پر لائے ہی انھوں نے سوال داغ دیا کہ ”میں پروگرام میں شرکت کروں یا یہی جواب دیتا پھروں کہ خوشتر صاحب کہاں ہیں؟“ آج آپ کے یوں تنہا چلے جانے کے بعد میرا پورا وجود آپ سے شکوہ کناں ہے۔ آپ تو کہا کرتے تھے کہ اب ہم ہر جگہ ایک ساتھ ہی جایا کریں گے، پھر آپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟ وہ بھی ایسی جگہ اور ایسے سفر پر جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ زندگی بھر آپ مجھے ساتھ لے کر گھومتے رہے اور جب آخری سفر پر نکلے تو کچھ بتائے بغیر خ موشی سے چل دیے؟ کیا یہی حق رفاقت ہے؟ کیا وہاں آپ سے کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کا کارہ دوست خوشتر کہاں ہے؟ آپ جاتے، ایک دن سبھوں کو جانا ہے اور ایک دوسرے سے بچھڑ جانا ہے، اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے کوئی نہیں آیا، مگر..... مع

تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

سفر بغداد پر جانے سے چندہ دنوں پہلے ۶ فروری ۲۰۱۳ء کو اپنے سب سے عزیز اور سعادت مند شاگرد عبد العظیم قادری کو لے کر بھیا دہلی آئے، کیوں کہ انھیں ۸ فروری کو ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جامعہ سعدیہ، بیڑا جانا تھا۔ حسب معمول میرے گھر پر ہی قیام کیا، دوسرے دن ۷ فروری کی صبح کیرلا کے لیے ان کی فلائٹ تھی، رات دیر تک محفل جی، مذہبی اور مسلکی امور پر خوب گفتگو رہی، مذہب و مسک کی تعمیر و تشکیل کے لیے کچھ نئے منصوبے زیر غور آئے اور پھر میری زیر تصنیف کتاب ”سید احمد رائے بریلوی اور برٹش گورنمنٹ“ پر دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اس کتاب کی تصنیف و اشاعت کے سلسلے میں وہ بہت زیادہ جذباتی تھے، اس پر میں پچھلے دو برسوں سے کام کر رہا تھا اور اب یہ آخری مرحلے میں تھی۔ کتاب کی تمام فصلیں جنھیں میں لکھ چکا تھا، ان کی نظروں سے گزر چکی تھیں۔ گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ ”آپ جتنی جلد ہو سکے اسے فائل کیجیے، بغداد شریف سے لوٹنے کے بعد اس کتاب کا اجرا ”انڈیا اسلامک کالج سینٹر، دہلی“ میں بڑے پیمانے پر کریں گے اور اس میں بڑے محققین اور اہل علم کو مدعو کیا جائے گا۔ میں ان کو دکھانا چاہتا ہوں کہ دیکھو کتاب ایسے لکھی جاتی ہے اور اس موضوع پر تحقیق اس کو کہتے ہیں۔“

دوسرے دن ۷ فروری کی صبح کو وہ کیرلا چلے گئے اور وہاں سے ۹ فروری کی شام کو لوٹ کر دہلی گھر پر آئے، مولانا ذیشان احمد مصباحی بھی ان سے ملاقات کے لیے آ گئے، رات کھانے کے بعد دیر تک علمی و فکری مجلس آراستہ رہی اور مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ دوسرے دن صبح ۱۰ فروری کو مولانا ارشد عالم نعمانی کی معیت میں ہم دونوں ہمدرد یونیورسٹی کی سینٹرل لائبریری گئے اور پورا دن وہاں کتابوں کے درمیان گزرا۔ لائبریری دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ”یار! مجھے ایک بستر اور کھانے کے لیے صبح وشام دور روٹی دے دو اور ایک سال کے لیے مجھے یہاں بند کر دو، یہ ایک سال میری زندگی کے حسین لمحات ہوں گے۔“ شام کو کچھ کتابوں کی خریداری کے لیے ہم لائبریری سے جامع مسجد گئے اور رات کو گھر لوٹ آئے۔ ایک دن پھر باتوں کا دور شروع ہوا، کچھ علمی مسائل میں میں نے استفسار کیا، کچھ ماضی کے تذکرے ہوئے، کچھ مستقبل کے منصوبے بنے اور کچھ تفریح بھی ہوئی، غرض وہ سب کچھ ہوا، جو ہر ملاقات میں ہوا کرتا تھا۔ وہ اکثر ہنس کر کہتے تھے کہ ”یار! ہمارے پاس گفتگو کے لیے کتنا میٹر ہے، ہماری باتیں ختم ہی

نہیں ہوتیں۔“ کسے معلوم تھا کہ دونوں کر چاہنے والے دوستوں کی یہ آخری محفل خن ہے، آخری شب ہے، آخری ملاقات ہے اور آخری دیدار۔ اس کے بعد یہ محفلیں کبھی آراستہ نہیں ہو سکیں گی، وہ اس گھر میں لوٹ کر کبھی نہیں آئیں گے، اس گھر کے بام و دران کے پر نور چہرے کی زیارت کو ترسیں گے، میری یہ بے نور آنکھیں جو انہیں دیکھ کر خوشی سے دمک جایا کرتی تھیں، ہمیشہ کے لیے پتھر جائیں گی، ان کے نفس علم و فکر سے محفل میں جو گرمی ہوا کرتی تھی وہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ ان کے جانے کے بعد احباب پُر سے کے لیے آرہے ہیں، ان کے چھوڑے ہوئے مشن کی تکمیل کے لیے عہد و بیان ہو رہے ہیں، ان کے تذکرہ کی محفلیں سجائی جا رہی ہیں، مگر یہ کیسی دیرانی ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی:

تم نہیں ہو تو میری بزم میں سناٹا ہے
تم بھی خاموش ہو، محفل کی فضا بھی خاموش

ہر مہینے دو مہینے پر ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور درمیان میں ملاقاتوں کے بغیر جو دن گزرتے ٹیلی فون اور ایس ایم ایس ان کا تدارک کرتے۔ پچھلے ارب برسوں میں مجھے یاد نہیں ہے کہ کوئی دن ایسا گزرا ہو جب ہم نے دو یا تین بار فون پر بات نہ کی ہو، ہم میں سے کوئی ہندوستان یا ہندوستان سے باہر کسی جگہ ہو، مکانی فاصلے ہماری قربتوں پر کبھی غالب نہیں آسکے۔ فون کا لڑکی کثرت کو دیکھ کر مولانا ذیشان احمد مزاحاً اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ ”مجھے لگتا ہے کہ آپ دونوں اپنے اہل خانہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔“ ۲۵ دسمبر کو جب سفر بغداد پر بھیا گئے تو بھی یہی معمول رہا، روزانہ ایک یا دو بار ان سے بات ہوتی۔ شہادت سے صرف پندرہ گھنٹے پہلے ۳ مارچ کو ان کا فون آیا، بہت خوش تھے، چمک رہے تھے، حسب معمول مزاج پر سی کے بعد کہنے لگے کہ ”کیا فون کرنے کی ساری ذمہ داری میں نے ہی لے رکھی ہے؟ اس بے تعلقی اور کنجوسی کا بدلہ لوں گا۔“ پھر میرے بغداد آنے کا شکوہ کیا اور کہا کہ ”آپ آتے تو اور بھی مزہ آتا، آپ کو بہت Miss کر رہا ہوں، آپ کو بھی آنا چاہیے تھا۔“ (دراصل اس سفر میں مجھے بھی ساتھ جانا تھا، مگر میرے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہوئی تھی اور رینول میں وقت لگ رہا تھا، پھر یہ کہ زیر تعینف کتاب بھی آخری مرحلے میں تھی، اس لیے میں ان کے ساتھ نہیں جا سکا۔) اس کے بعد بتایا کہ ”میرا عبدالعظیم کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں، مل شام تک وہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا، اپنی کتاب کی فائل پروف ریڈنگ اس سے کروالیں، ۷ مارچ کی صبح وہ دبئی پہنچوں گا۔“ یہ بھی بتایا کہ ۱۰ مارچ کو بنارس میں حضرت شیخ عبدالعظیم آسی غازی پوری کے صد سالہ سیدنا میں شرکت کے لیے ۹ مارچ کا ہم دونوں کا ٹکٹ ہو گیا ہے۔ پھر بغداد، بنوری اور وہاں کے مشائخ اور علمائے ملاقاتوں کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ شیخ المشائخ حضرت سید توفیق الگیلانی (جو پچھلے دو برسوں سے حسن قادری بدایونی میں تشریف لارہے ہیں) سے ملنے کے لیے کل صبح بغداد سے اریٹل جا رہا ہوں۔ اور پھر کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون رکھ دیا۔ کسے پتا تھا کہ یہ آخری بات ہے! اب سوچتا ہوں کہ میری چند گھنٹوں کی بے تعلقی کے جرم میں میرے دوست میرے یار نے ایسا بدلہ لیا ہے اور مجھ سے یوں تاتا توڑا ہے کہ میری زندگی کی ڈور جب تک ٹوٹ نہیں جاتی، قرار نہیں آئے گا۔

فون پر اس گفتگو کے پندرہ گھنٹوں کے بعد ۱۴ مارچ کو شام ۴ بجے عبدالعظیم آ گئے، ہم نے عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر گفتگو کی، اس نشست میں بھیا کا یہ تذکرہ ہوتا رہا، اس کے بعد میں نے اپنی کتاب عبدالعظیم کے حوالے کی اور خود جام نور کے تازہ شمارے کو فائل کرنے میں لگ گیا۔ تقریباً پونے پانچ بجے ہمارے اور بھیا کے مشترکہ عزیز دوست ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی کا علی گڑھ سے فون آیا، احمد بھائی سے ہمارا کافی بے تکلفہ نشست ہے، میں نے سوچا کہ فون اٹھا کر کہہ دوں کہ احمد بھائی ابھی بہت بڑی ہوں، بعد میں بات ہوگی، فون اٹھانے کے بعد اس سے پہلے کے میں کچھ کہتا، احمد بھائی خلاف معمول نہایت سنجیدگی سے مجھ سے پوچھنے لگے کہ خوشتر صاحب! بغداد شریف میں سب خیریت سے تو ہے؟ میں نے ہنس کر کہا کہ جی ہاں! سب خیریت ہے، آپ اتنے سنجیدہ کیوں ہیں؟ کہنے لگے ابھی میرے ایک رشتہ دار نے بدایوں سے فون کر کے بتایا کہ خانقاہ میں خبر آئی ہے کہ بغداد میں بھیا کو گولی لگ گئی ہے۔ ان کی اس بات پر میں ہنسنے لگا اور عرض کی کہ آپ کو مذاق کے لیے کوئی اور بات نہیں ملی؟ کہنے لگے میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، میرے لہجے اور آواز سے آپ محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ میں کتنا خوف زدہ ہوں! میرے ہاتھ ہیر پھول رہے ہیں، آپ بغداد فون کر کے معلوم کیجیے، ان کی اس سنجیدگی سے میرے بدن میں ایک جھر جھری سی آئی اور گز گئی، میں نے فوراً ان سے کہا کہ آپ فون

رکھیے میں ابھی بغداد فون کر کے معلوم کرتا ہوں اور آپ کو بتاتا ہوں۔ میں نے کانپنے ہاتھوں سے بہت جگت میں بھیا کے نمبر پر بغداد فون کیا، مگر ان کے بجائے ان کے چھوٹے بھائی مولانا عطیف قادری نے فون اٹھایا، میں نے سلام و کلام کے بغیر ان سے پوچھا کہ سب خیریت تو ہے؟ آپ نے بھیا کا فون کیسے اٹھالیا؟ انھوں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا کہ ”ابھی کچھ دیر پہلے اریٹل کے راستے میں ہماری کار پر کچھ انتہا پسندوں نے گولیوں سے حملہ کر دیا اور شیخ صاحب شہید ہو گئے۔“ میں زور سے چیخ پڑا، کیا بک رہے ہیں آپ؟ حال اب اس بھیا میں ان سے بات نہیں کرتا۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا کہ ”یہ صحیح ہے۔“ میرے ہاتھوں سے فون گر پڑا، پورا بدن اس دشت ناک خبر سے بری طرح کانپنے لگا اور میں زور زور سے چلانے لگا، میرے پورے گھر میں کھرام مچ گیا۔ کچھ لمحے کے بعد ہی بھیا کے چہیتے بہنوئی سید محمد اکرام رزاقی صاحب کا اورنگ آباد (مہاراشٹر) سے فون آیا، انھوں نے روتے ہوئے چیخ کر پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے؟ میرا ”ہاں“ کہنا تھا کہ وہ دھڑاڑے مار مار کر رونے لگے، بعد میں پتا چلا کہ ان کا بلڈ پریشر اتنا بھائی ہو گیا تھا کہ ان کے ایک آنکھ کی باریک رگ پھٹ گئی۔ اکرام بھائی کا فون رکھا ہی تھا کہ احمد بھائی کا دوبارہ فون آ گیا، پھر وہی آہ و بکا اور چیخ و پکار۔ احمد بھائی کا فون رکھا تو حضرت امین ملت کا فون آنے لگا، میں اپنے آپ میں نہیں تھا، بس اتنا یاد ہے کہ کسی نے مجھ کو مجھ سے کہا کہ حضرت کا فون ہے، اٹھا لے! میں نے فون اٹھا تو حضرت نے نہایت دردناک لہجے میں اس خبر کی تصدیق چاہی، میں پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، حضرت بھی میری اس آہ و بکا میں شریک ہو گئے اور روتے ہوئے بھیا کے کارناموں اور علمی مرتبے کا ذکر کرنے لگے اور مجھ سے عطیف مہاں کا نمبر طلب کیا۔ یہ حادثہ ہندوستانی وقت سے تقریباً ساڑھے چار بجے شام وہاں ہوا تھا اور صرف تین گھنٹے کے اندر اندر اس کی خبر پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ پوری دنیا میں ہماری قربتوں کے چرچے عام تھے، اس لیے دنیا کے گوشے گوشے سے علماء، مشائخ اور احباب کے فون آنا شروع ہو گئے۔ رات ۲ بجے تک میرے موبائل کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی، احباب تعزیت کے لیے میرے گھر آتے رہے، مگر مجھ پر گویا غشی طاری تھی، میں نہ کسی کا فون ریسیو کر سکا اور نہ ہی کسی سے کچھ کہہ سکا۔

رات یوں ہی آنکھوں میں کٹی، صبح تک ہوش آیا تو خیال آیا کہ مجھے بدایوں جانا چاہیے، دل بے چین تھا اور کسی ٹپ قرائت نہیں آ رہا تھا۔ صبح کی پہلی فلائٹ سے اکرام بھائی اپنے اہل خانہ کے ساتھ اورنگ آباد (مہاراشٹر) سے دبئی پہنچ گئے، انھیں لے کر میں اپنی گاڑی سے تقریباً گیارہ بجے بدایوں کے لیے نکل پڑا۔ راستے بھر پوری دنیا سے علماء و مشائخ کے مسلسل فون آتے رہے، وہ بے چین تھے، غم زدہ تھے اور حادثے کی تفصیل جاننا چاہتے تھے، مگر میں ابھی بھی اس حادثے کی خبر دینے اور تعزیتی کلمات سننے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پا رہا تھا، یہ حادثہ رونما ہو چکا تھا، تاہم دل و دماغ اسے قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے جب بھی بدایوں جاتا تھا تو دیدہ و دل فرس راہ کے میرا یا میرا انتظار رہا کرتا تھا، ہر ایک گھنٹے پر ان کا فون آتا تھا کہ ”کہاں پہنچے؟“، ”کبھی شوقی سے کہتے کہ“ کاروان شوق کہاں پہنچا؟“، ”کبھی پوچھتے کہ“ کہاں رکا ہوا ہے قافلہ بہار کا؟“ مگر آج کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، پلکیں بچھائے کوئی انتظار کرنے والا نہیں تھا، سیکڑوں فون تو آرہے تھے، مگر وہ فون نہیں آ رہا تھا جس سے راستے کی مسافتیں اور مکان مٹ جایا کرتی تھیں۔ آج بدایوں کا سفر بہت طویل اور تکلیف دہ ہو گیا تھا۔

مغرب کے بعد ہم بدایوں شہر میں داخل ہوئے تو ایک عجیب ہوکا عالم تھا، پورے شہر کی دکانیں بند تھیں، ماحول پر سناٹا طاری تھا، جیسے پورے شہر میں کرفو لگ گیا ہو، بعد میں پتا چلا کہ دونوں تک پورے ضلع میں ہزاروں گھروں کے چوہے ٹھنڈے پڑے رہے، بہت سے لوگ اس دردناک حادثے کی تاب نہ لا کر ہاسپٹل میں ایڈمنٹ ہو گئے، گویا پورا شہر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ اس شعر کو میں نے زندگی میں بار بار پڑھا اور سنا تھا کہ:

مچھڑا وہ اس ادا سے کڑت ہی بدل گئی
اک محفل سارے شہر کو دیران کر گیا

مگر پہلی بار اس کی عملی تفسیر بھی دیکھ رہا تھا۔ خانقاہ پہنچا تو ایسا لگا کہ پورا شہر خانقاہ کے اطراف میں جمع ہو گیا ہے، ارادت مندوں کا ٹھاٹھے مارتا ہوا سمندر خانقاہ کے اس غم کو اپنے سینے میں جذب کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس سے پہلے جب بھی میں آیا کسی نہ کسی جشن یا خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے آیا، آج جب ملی ہار کسی غم میں شرکت کے لیے آیا تھا اور یہ پہاڑ جیسا وزنی غم ایسا تھا کہ ساری خوشیوں اور سارے جشن مل کر بھی اس ایک

غم کا مداو نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ میں خانقاہ کے صدر دروازے سے جیسے ہی داخل ہوا مدرسہ قدوسیہ کے استاذ مولانا مجاہد قادری مل گئے، مجھے دیکھتے ہی بے تابانہ گلے لگ کر رو پڑے اور کہا کہ ”آج اپنے دوست کو آپ کہاں چھوڑ آئے؟“ ان کے اس جملے نے میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ مجھے لے کر بھیجے کے سب سے چھوٹے بھائی مولانا فضل رسول عزامیوں کے پاس گئے، ان کے سینے سے لگ کر میں بے قابو ہو گیا۔

میں دونوں تک وہاں رہا، اس پنج پوری دنیا کے مدارس، خانقاہوں، تحریکوں، تنظیموں اور دیگر ملی و قدرتی اداروں سے کبار علماء، مشائخ، احباب اور متعلقین کے فون آتے رہے، ہر شخص غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا اور سبھوں کی زبان پر بس یہی تھی کہ ”حضرت علامہ اسید الحق کی شہادت اہل سنت و جماعت، اہل خانقاہ اور علم و ادب کا بہت بڑا خسارہ ہے، جس کی تلافی دہائیوں تک ممکن نہیں۔“ دنیا کے گوشے گوشے میں تعزیتی مجلسیں منعقد کی جا رہی تھیں، ایصالِ ثواب کا اہتمام ہو رہا تھا، ہندوستان کی اکثر زبانوں کے اخبارات ان کی شہادت کی خبروں، تعزیتی مجالس کی رپورٹوں اور تعزیتی پیغامات سے بھرے پڑے تھے، ہندوستان کے مشہور اہل علم و قلم مضامین لکھ رہے تھے، فیس بک، ٹیویٹ اور ذاتی جاگ ماتم کدہ بن گئے تھے اور ہندو بیرون ہند کے متعدد ٹیلی ویژن چینز ان پر خصوصی پروگرام نشر کر رہے تھے۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مشاہیر علماء و مشائخ کو اس دنیا سے جاتے ہوئے دیکھا، مگر میں نے ان کے جانے کا اس قدر ماتم نہیں دیکھا اور نہ عام لوگوں کو اس قدر روتے دیکھا۔ یہ ایسا غم تھا جو اہل سنت اور اہل خانقاہ کا مشترکہ غم بن گیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ ان تمام علماء نے اپنی طبعی عمر گزار کر رختِ سفر باندھا تھا اور اپنی پوری زندگی جی کر ہم سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ لوگ ذہنی طور پر ان کی رخصتی کے لیے تیار تھے۔ لیکن ہمارے بھیانے تو ابھی عمر کی ۳۸ بہاریں ہی دیکھی تھیں اور اس چھوٹی سی عمر میں دین و مسک کی سربندی کے لیے مختلف شعبوں میں جتنا کام کر دیا تھا، دسیوں لوگ مل کر ۸۰ سال جینے کے بعد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ برصغیر کی ہر ری مسلکی تاریخ میں اس کی مثال عنقا ہے۔ اس لیے ہندوپاک میں ماتم صرف دنیا سے ان کی رخصتی کا نہیں تھا، ماتم اس بات کا بھی تھا کہ ان کے جانے کے بعد اس دورِ قحط الرجال میں اب کیا ہوگا؟ کیوں کہ ایسی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت، جسے لغت میں ”نافعہ عصر“ اور ”عبقری دہر“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، خال خال پیدا ہوتی ہے۔

بدایوں میں بغداد کی پل پل کی خبریں مل رہی تھیں، مگر عطیف میاں یہ حضرت شیخ گرامی (زیب سجادہ خانقاہ قادریہ) سے براہ راست مجھے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ۶ مارچ کی صبح کو خبر آئی کہ آج بعد نماز عصر احاطہ غوث اعظم میں بھیجا کی تدفین ہے اور ۷ مارچ کو چل کر حضرت شیخ عطیف میاں، حافظ عبدالقیوم قادری اور حاجی اقبال ظہری والا ۸ مارچ کی صبح ۴ بجے دہلی واپس آ رہے ہیں۔ میں بھیجے کے ماموں جان مولانا سید محمد انور چشتی (پچھونڈ شریف) کے ہمراہ ان حضرات کو ریسو کرنے کے لیے ۷ مارچ کی صبح کو دہلی کے لیے نکل گیا۔ ۸ مارچ کی رات ۲ بجے ہم لوگ ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ حضرت شیخ کی صحت اور حالت کے پیش نظر مریدین و متوسلین کو ان کی آمد کی خبر نہیں دی گئی تھی، بلکہ انھیں روکا جا رہا تھا، پھر بھی چاہنے والوں کو کون روک سکتا تھا! منع کرنے کے باوجود لوگوں کو کہیں سے اڑتی اڑتی خبر مل گئی اور سیکڑوں لوگوں کا ہجوم ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ ہم لوگ ایئر پورٹ کے اندرونی حصے میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد بغداد کا یہ مختصر شکستہ دل قذفا آتا ہوا دکھا۔ حضرت بہت کمزور اور تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے باہر تشریف لارہے تھے۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے انتہائی کرب اور درد کے آثار نمایاں تھے۔ ان کی حالت اور صحت کا خیال کرتے ہوئے لوگوں کو ضبط سے کام لینے کی تلقین کر دی گئی تھی۔ باہر آتے ہی حضرت نے ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا کہ ”سرسے حاضرین کو ضبط کا یہ راندہ ربا اور وہ بلک کر رو پڑے اور حضرت کی حضور غوث اعظم سے بے محابا عقیدت اور ان کی نسبت غلامی پر رشک کرنے لگے۔ حضرت نے گلوگیر لہجے میں آنسوؤں کے ساتھ فرمایا:

”میں اپنی سب سے قیمتی چیز حضور غوثیت مآب میں نذر کر کے آ رہا ہوں، اگر حضور قبول فرمائیں تو میں پوری زندگی اس پر فخر کرتا رہوں گا۔“

حضور غوث اعظم اور ان کے خوادے سے ایسا عشق اور ایسی عقیدت نہ ہم نے دیکھی اور نہ سنی۔ حضرت کی اس گفتگو کو سن کر میں اپنا غم بھول

گیا۔ میں سوچنے لگا کہ اس دنیا میں سب سے بڑا غم اور سب سے بڑا بوجھ بوزھے پاپ کے کاغذوں پر جوان بیٹے کا جنازہ ہوتا ہے اور وہ بھی ایسے بیٹے کا جنازہ جس کے عسی مرتے، قابل تقلید کارنامے اور اعلیٰ کردار و روح پر دنیا رشک کرے، یہ بوجھ کتنی وزنی، کتنی تکلیف دہ اور کتنا درد آگیز ہوگا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ مگر ہمارے حضرت کورب مقتدر نے ایسا صبر عطا فرمایا تھا کہ نہ صرف خود کو سنبھالا، بلکہ ہزاروں ارادت مندوں، جان چھڑکنے والوں اور اہل خانہ کو اپنے دامن کرم میں سمیٹ لیا تھا۔ خدا نخواستہ اگر آپ صبر کھو بیٹھتے تو نہ جانے کتنے چاہنے والوں اور جاں نثروں کے جنازے اٹھتے ہوئے نظر آتے۔

ہماری رفاقت، قربت اور محبت کا دورانیہ دو چار سال نہیں بلکہ ربع صدی پر محیط ہے، گزرے پچیس برسوں میں میں نے انھیں ”بھیا“ سے لے کر ”شیخ صاحب“ تک اور ”اسید میاں“ سے لے کر ”ممتاز ناقد و محقق“ اور ”عالم ربانی“ تک کا سفر طے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ معاشرت کسی معاصر کے بڑپن کے اظہار میں ہمیشہ مانع ہوتی ہے اور کسی سے قربت اس کی کمزوریوں سے متعارف بھی کرائی ہے۔ مگر مجھے برملہ یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ میں ان سے جتن قریب ہوتا گیا، ان کی مقناطیسی شخصیت، عسی مراتب، جذبہ دین پروری، انا بیت الی اللہ، بلند کردار، اعلیٰ ظرفی، حیا، تواضع، اندازِ تعظیم و تکریم، سخن فنی، سخن دینی، سخن سنجی، سنجیدہ و متین بولچہ، زندگی کے ساتھ ان کا رویہ اور طرز عمل کا معترف ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے ڈھب کا ایک مثالی شخص تھا، جسے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے سامنے ”آئیڈیل“ کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا تھا۔ وہ برصغیر میں رہنے والے ہزاروں علماء اور طلبہ کے بے ”آئیڈیل“ بھی تھے۔ میں نے بھی ہمیشہ انھیں اسی حیثیت سے دیکھا اور ان کی قربتوں کو اپنی زندگی کا انمول سرمایہ سمجھا۔ لوگوں نے ہماری قربتوں کو کئی معافی پہنائے اور ان کے مفروضہ مطالب نگاہ سے، لیکن ہماری یہ قربت اور دوستی دین و مسلک کے حوالے سے امت کی فکری تشکیل نو کے لیے اُس مشترکہ سوچ اور ہدف کا نتیجہ تھی جس کے لیے ہم مل کر تگ و دو کر رہے تھے۔

ہاں! اس مشترکہ فکر و عمل کے ساتھ ان کے سر پر ایک اضافی اور بہت بڑی ذمہ داری بھی تھی، اور وہ تھی ”اپنی عظمت رفتہ کی تلاش“ اور اپنے ”بزرگوں کے علمی و فکری قرض سے سبک دوشی۔“ جس کی ادائیگی کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کا سکون و آرام تنج دیا تھا۔ ان کی زبان پر ہر دم اپنا ہی کہا ہوا یہ شعر ہوا کرتا تھا کہ:

اب ایک بل کی بھی فرصت نہیں ہے عاتم کو۔ وہ اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہے۔ یہ شعر نہیں گویا ان کی زندگی کا وظیفہ تھا۔ یہی وظیفہ انھیں ایک لمحے کو بھی سانس لینے کی فرصت نہیں دیتا تھا۔ ہر لمحہ مطالعے میں غرق رہتے، لائبریریوں کی خاک چھانتے، منصوبے بناتے، ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتے، اپنے ادارے کے طلبہ کو مختلف علوم و فنون پڑھاتے، قرآن و حدیث کا درس دیتے، علمی و فکری موضوعات پر توسیعی خطاب کرتے، عصری اور دینی طلبہ کے لیے سرکھانے کا اہتمام کرتے، تحقیقی و علمی مضامین لکھتے، اچھوتے اور علمی موضوعات پر اعلیٰ درجے کی تحقیقات پیش کرتے، کتابیں لکھتے، اکابر خوادہ کی سیزوں تصنیفات کو از سر نو سلسلہ وار مرتب کرتے، ان کی تخریج کرتے، ان پر پیش قیمت حواشی اور مقدمے لکھتے اور ان کی اشاعت کا سامان کرتے، علمی مباحث میں ناقدین کا علمی جواب دیتے، مختلف علمی و فکری موضوعات پر سیمینارز، کنونشنس اور کانفرنسیز کا انعقاد کرتے، خانقاہ اور مدرسے کی تعمیر و توسیع کے لیے نئے منصوبے عمل میں لاتے اور دنیا بھر میں پھیلی عصری و دینی دانش گاہوں میں ہونے والی علمی مجلسوں اور پروگراموں میں شریک ہوتے۔ گویا دس سال کی مختصری مدت میں انھوں نے اتنا اور وہ کچھ کر دکھایا جو اب ہماری دینی و مسلکی تاریخ کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ انہی کاموں نے دنیا بھر میں انھیں وہ مقبولیت اور شہرت بھی عطا کی، جس کے لیے خصالِ علم و فن مدتوں ترستے ہیں۔ اپنی ان تمام کاوشوں کو وہ اللہ رب العزت کا فضل و کرم، حضور غوث اعظم سے نسبت غلامی کا فیضان، حضور آل احمد اچھے میوں کی توجہات و عنایات اور اپنے والد شیخ کی مستجاب دعاؤں اور تعظیم و تربیت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ دین و مسلک کی اشاعت اور اپنی عظمت رفتہ کی تلاش صرف علمی ایقت کے اظہار اور بے شمار کارنامے انجام دے کر نہیں ہو سکتی اور نہ محض ان کے ذریعے اپنے بزرگوں کا سچا وارث اور جانشین بنا جاسکتا ہے، اس کی تکمیل بلند کرداری، علمی اخلاق و محاسن، تواضع اور

غوث اعظم نے شیخ صاحب کو قبول فرمالیا

حضرت غوث اعظم سے خانوادہ عثمانی کی نسبت غلامی اور شیخ اسید الحق قادری کی داستان شہادت مولانا مصطفیٰ قادری کی ربانی

عالم ربانی شہید بغداد علامہ اسید الحق عاصم قادری علیہ الرحمہ کی شہادت کی خبر برصغیر کی عینی، ادبی، مذہبی اور روحانی حقوق میں بجلی بن کر گری، سب حیران و ششدر تھے کہ اتنا بڑا سانحہ کیسے ہوا؟ ہر شخص اس حادثے کی تفصیل جانتا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے شہید بغداد کے برادر عزیز مولانا عبدالغنی محمد عظیم میاں قادری، جو سانحے کے عینی شاہد ہیں، کا تفصیلی انٹرویو کیا۔ اس انٹرویو میں سانحے کی تفصیلات کے ساتھ شہید بغداد کے آخری پسند بغداد کی روداد، خانوادہ قادری عثمانی بدایونی کی غوث اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ اور ان کی آل سے گہری وابستگی، محبت اور شفقت اور خانوادہ قادری بغداد کے ساتھ خانوادہ عثمانی بدایوں کے روابط کی نوعیت اور تاریخ بھی شامل ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کے لیے یہ معلومات نئی بھی ہوں گی اور ایمان افروز بھی۔ (غوث نورانی)

حضرت بابا فرید کو کچھ اشارہ کیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور شاہ عین الحق کا ہاتھ پکڑ کر حضور اچھے میاں کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ خواب دیکھ کر آپ کی آنکھ کھلی اور آپ نے وہیں سے رخت سفر باندھا اور سیدھے مارہرہ شریف حاضر ہوئے اور حضور اچھے میاں کے قدموں پر گر گئے اور مرید ہو گئے اور ایسے مرید ہوئے کہ اپنا وطن بدایوں چھوڑ دیا۔ جب تک شمس مارہرہ اپنی ظاہری حیات کے ساتھ مارہرہ میں رہے، حضرت شاہ عین الحق نے بھی اپنی عمر کا بیشتر حصہ مارہرہ شریف میں گزارا۔ حضور غوث اعظم سے نسبت غلامی کا جو سلسلہ وہاں سے شروع ہوا، اللہ کا شکر ہے کہ وہ آج تک قائم ہے۔ اس میں دو باتیں قابل ذکر ہیں:

پہلی بات تو یہ کہ جس محبت و عقیدت سے حضرت شاہ عین الحق حضور اچھے میاں سے منسلک ہوئے، ان کا دامن تھا اور ان کی غلامی کا پند اپنے گلے میں ڈالا، ہماری چھ تسلیں گزر گئی ہیں مگر آج تک وہی محبت، وہی عقیدت اور وہی رعبہ غلامی مارہرہ شریف سے قائم ہے۔ جس طرح حضرت شاہ عین الحق مارہرہ مطہرہ کے بچے بچے کا، خدام کا، حجازیوں کے والے اور تالی صاف کرنے والے کا ادب کرتے تھے، ویسا ہی ادب آج بھی ہمارے خاندان میں ہے۔ اس میں ہماری کوئی خصوصیت نہیں، یہ شمس مارہرہ کا کرم ہے کہ انہوں نے ہمارے خانوادہ کو ایسا پسند کیا کہ آج تک اپنی غلامی میں رکھا ہوا ہے۔

غوث نورانی: سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کے خانوادہ میں حضرت سیدنا غوث اعظم سے نسبت غلامی کی ابتدا کب سے ہوئی؟
مولانا مصطفیٰ قادری: ہمارے جد اعلیٰ حضرت قاضی دانیال قطری جو حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے مرید و خلیفہ اور سلطان الہند خواجہ غریب نواز کے پیر بھائی تھے، جب ہندوستان تشریف لائے اسی وقت سے ہی ہمارے خاندان میں بیعت و ارادات اور طریقت و تصوف کا سلسلہ رہا ہے۔ جب افضل المعید حضرت شاہ عین الحق مولانا عبدالجید کا زمانہ آیا، آپ بڑھ کر فارغ ہو گئے، علوم سے فراغت کے بعد بیعت ہونے کے لیے آپ کو شیخ طریقت کی تلاش ہوئی۔ اُس زمانے میں تقریباً پورا بدایوں مارہرہ مطہرہ سے مرید تھا اور مارہرہ میں شمس مارہرہ آل احمد حضور اچھے میاں کا دور تھا، ہمارے خاندان کے اکثر لوگ وہاں سے ہی مرید تھے، اس لیے شاہ عین الحق سے بھی کہا گیا کہ مولانا! تم بھی حضور اچھے میاں سے مرید ہو جاؤ، وہ مارہرہ مطہرہ گئے، لیکن علمی طغیانی تھا کہ کوئی لگا ہوں میں چٹا ہی نہیں تھا، اس لیے مرید ہونے بغیر واپس آ گئے اور بدایوں کے مشہور آستانہ ”بڑے سرکار“ میں آ کر قیام کیا، رات میں سو رہے تھے کہ خواب میں آپ نے دیکھا کہ حضور غوث اعظم کا دربار لگا ہوا ہے اور اس میں ایک طرف حضور اچھے میاں بیٹھے ہوئے ہیں، دوسری طرف حضرت بابا فرید بیٹھے ہوئے ہیں، غوث پاک نے

انکساری، جذبہ دین پروری، مثبت فکر و عمل، اعلیٰ ظرفی، خلوص و لہجہ اور دین داری کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ گزرتے وقت کے ساتھ انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو مذکورہ صفات کا حامل بنایا، بلکہ اپنے اعزاء و تلامذہ، مریدین اور احباب کو بھی انہی صفات کا پیکر بننے کی تلقین کرتے۔ نماز پنج گانہ کے ساتھ تلاوت کلام پاک اور اوراد و وظائف کی پابندی کرتے، ہر دم رجوع الی اللہ کی فکر دامن گیر رہتی، ہر چھوٹے بڑے سے جھک کر نہایت عاجزی و انکساری سے ملتے، بڑوں کا حد درجہ احترام کرتے، اپنے سے بڑے عالم و شیخ کی دست بوسی کرنے کی کوئی وجہ تلاش کر لیتے، خانقاہوں میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ حاضر ہوتے، شہزادگان، رہبرہ کا کہنا ماننے اور ان کی جوتیاں سیدی کرنے کو اپنا شرف سمجھتے، اپنے مخالفین کی بھی بدگوئی کرنے سے پرہیز کرتے، مسلکی اختلافات و تباہات سے دور و نفور رہتے، اپنے اوپر کی جانے والی جارحانہ و معاندانہ تنقیدوں اور مہلکوں کا کبھی جواب نہیں دیتے، کسی بھی مسئلے میں تشدد اور غلوئیں کرتے، کام کرنے والوں کو اپنے سے قریب رکھتے اور ان کے کاموں پر خوش ہوتے، جو صلہ افزائی کرتے اور حتی الامکان ہر طرح کی امداد سے دریغ نہیں کرتے۔

یہ وہ صفات تھیں جو انھیں ورثے میں ملی تھیں اور بہت عزیز تھیں، جنہیں ساری زندگی انھوں نے حرز جاں بنائے رکھا۔ غالباً انہی صفات کا حامل ایک عالم، عالم دین سے ”عالم ربانی“ بن جاتا ہے۔ ان کے اس طرز عمل کو دیکھ کر میں اکثر ان سے کہتا تھا کہ ”آپ نے تو اسی عمر میں مشیت کی قربان لی ہے۔“ جواب میں فرماتے کہ ”در اصل انہی صفات کا حامل ایک مسلمان، مومن کامل کہلاتا ہے، تصوف بھی اسی کا نام ہے۔ ہم لوگ دین کے خادم ہیں، اس لیے ہر را کردار اور طرز عمل بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ آج یہ اعتراف بھی دنیا پڑھ لے کہ میرے پاس فکر و عمل کی جو کچھ بھی پونگی ہے، اس کی تعمیر و تشکیل میں ان کی صحبتوں اور رفائقتوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں ان کی فکر و منصوبے اور عملی زندگی کے لمحے لمحے کا گواہ بن کر جیسا اور میں اپنے فکر و عمل کی زمام بھی انہی کو سونپ دی، ایک دوسرے کے بغیر ہم نے عملی زندگی کا تصور ختم کر دیا تھا، ہمارے جذبوں کی شدت نے تمام زمانی اور مکانی فاصلے ختم کر دیے تھے اور ہم نے اپنے آپ کو الگ الگ رکھ کر کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہمارا حال تو یہ تھا:

تو اس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچیں عجیب لگتا ہے
ان کے جانے کے بعد اکثر انھیں مخاطب کر کے کہتا ہوں، روتا ہوں، تڑپتا ہوں کہ آپ کے بغیر یہ پہاڑ جیسی زندگی کتنی بے رنگ و نور ہوگی؟ ہم نے ملت کی تعمیر و تشکیل کے لیے جو منصوبے بنائے تھے وہ کیسے پائے نہیں کو پہنچیں گے؟ وہ بے شمار کتابیں جنہیں لکھتے لکھتے آپ چلے گئے انھیں اب کون مکمل کرے گا؟ آپ نے اپنی خانقاہ اور اداروں کی تعمیر و توسیع کا جو آغاز کیا تھا، اسے انجام تک کون پہنچائے گا؟ یہ عطیہ میاں، یہ عزام میاں، جن کے اچھے کاموں کو دیکھ کر آپ خوشی سے پھولے نہیں ساتے تھے، اب ان کی علمی و فکری رہنمائی کون کرے گا؟ اپنے حضرت کی تنہائی اور صحت کی آپ کو ہمیشہ فکر رہا کرتی تھی، اب ان کا خیال کون رکھے گا؟ یہ عبدالعظیم جسے آپ بے حد چاہتے تھے، اپنے مستقبل کا دست دبا دیکھتے تھے، اب اس کی تعلیم و تربیت کون کرے گا؟ جب بھی ہم ٹھوکریں کھاتے تھے، ہم سے علمی و فکری مغز شیں ہوتی تھیں، آپ ان کی اصلاح کر دیا کرتے تھے، اب ہم پر یہ الطاف کریمانہ کون کرے گا؟ ہمیں ان سوالوں کے جواب نہیں ملتے ہیں اور دماغ، وقف ہونے لگتا ہے تو یہ شکوہ زبان پر آ جاتا ہے:

یہ اپنے چاہنے والوں کا حال کرتے ہوا
کمال کرتے ہو صاحب کمال کرتے ہو
پھر یہ سوچتا ہوں کہ اس دنیا میں جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ہے۔ آج وہ گئے، کل ہمیں بھی جانا ہے، اس تلخ سچائی سے منہ موڑنا مومن کا شیوہ نہیں ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی شکستہ جوصلے پھر سے جڑنے لگتے ہیں۔ سرد ہوتی ہنسون میں پھر سے حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارے بھیا اس دنیا میں ایک شخص نہیں بلکہ تحریک بن کر رہے ہیں، اسید الحق چلے گئے، مگر تحریک زندہ ہے، خانقاہ پر حضرت شیخ کا سایہ سلامت ہے جن کی نگاہ کیسا اثر نے ہی انھیں زمانے بھر میں آفتاب بنایا تھا، ان کے دو جواسل، جواس عزم اور اعلیٰ علم و فکر کے حامل بھائی زندہ ہیں، ان کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ تلامذہ کا وجود ہاتی ہے اور نہ ان دلم اور علم و فکر سے یس احباب کا کارواں موجود ہے۔ ہم سبھوں کو مل کر ان کے چھوڑے ہوئے مشن کی تکمیل کرنا ہے اور اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا ہے، جسے وہ ہمیشہ دیکھا کرتے تھے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ □□□

دوسری بات یہ کہ ہمارے خانوادے کو جو نسبت شمس مارہرہ کے ذریعے حضور غوثیت مآب سے ملی ہے وہ بھی ویسی ہی آج تک قائم ہے بلکہ اس میں ہر دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، جب کہ اس نسبت اور تعلق کی ابتدا کو دو سو سال گزر گئے۔

غوث نورانی: بغداد شریف جانے کا سلسلہ آپ کے خانوادے میں کب سے شروع ہوا؟

مولانا مصطفیٰ قادری: حضرت شاہ عین الحق بیعت ہونے کے بعد زیادہ تر حضور شمس مارہرہ کے پاس ہی رہتے تھے، اس لیے انہیں کہیں جانے کی فرصت ہی نہیں ملی، ان کے بغداد جانے کا ذکر بھی کہیں نہیں ملتا۔ ہمارے خانوادے سے بغداد جانے کی ابتدا، ان ہی کے صاحبزادے اور جانشین سیف اللہ المسلمول سیدنا شاہ فضل رسول سے ہوتی ہے۔ "اکمل التاریخ" میں ذکر ہے کہ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں سیف اللہ المسلمول پہلی بار بغداد شریف حاضر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں کے صاحب سجادہ اور نقیب الاشراف حضرت سید علی الگیلانی تھے۔ سیف اللہ المسلمول کی یہ پہلی حاضری تھی اور خانوادہ غوث اعظم سے کوئی شناسائی نہیں تھی، تاہم وہ شمس مارہرہ کے فیض اور ان کے وسیلے سے وہاں گئے تھے اور غوث پاک کے سچے عاشق بھی تھے، اس لیے وہاں ان پر ایسی نوازشات اور ایسی پذیرائی ہوئی جو بیان سے باہر ہے۔ جب صاحب سجادہ سید علی الگیلانی کو معلوم ہوا کہ ہندوستان سے مولانا فضل رسول آئے ہیں تو آپ اپنی نشست سے اٹھ کر دروازے پر آگئے اور وہاں سے ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لائے اور اپنے برابر میں اپنی نشست اور سجادے پر بٹھالیا، پھر آپ نے انہیں اپنی خاندانی خلافتیں اور اجازتیں عطا فرمائیں اور یہ بھی کہا کہ مولانا! میں چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے سید سلمان الگیلانی کو آپ پڑھائیں اور اجازت دیں۔ حکم کے مطابق سیف اللہ المسلمول نے ولی عہد آستانہ حضور غوث اعظم کو پڑھایا اور اجازت بھی دی۔ پھر تو یہ سلسلہ چل پڑا، اس کے بعد کئی بار سیف اللہ المسلمول بغداد حاضر ہوئے۔ اس کے بعد تاج الخول سیدنا شاہ عبدالقادر کی متعدد بار حاضری ہوئی، ان کے بعد سرکار صاحب الاقدار شاہ عبدالقادر اپنے زمانے میں حاضر ہوئے رہے، پھر ہمارے دادا مفتی اعظم سلطنت آصفیہ شاہ عبدالقدیر مسلسل جاتے رہے، ان کے بعد میرے والد گرامی تاجدار اہل سنت شیخ عبدالحمید محمد سالم القادری کا اب تک یہی معمول ہے۔

غوث نورانی: آپ کے اکابر خانوادہ اب تک کتنی بار بغداد کی حاضری سے شرف ہو چکے ہیں؟

مولانا مصطفیٰ قادری: سیف اللہ المسلمول، حضرت تاج الخول اور سرکار صاحب الاقدار کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ وہ کتنی مرتبہ بغداد حاضر ہوئے، یہ حضرات متعدد بار گئے۔ مگر حاضری کا یہ ریکارڈ ہمارے دادا مفتی اعظم سلطنت آصفیہ مولانا شاہ عبدالقدیر سے بنتا شروع ہوا۔ وہ پینتالیس سال لگا تار بغداد شریف حاضر ہوئے اور ان کے آخری سفروں میں ہمارے والد گرامی بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں ہمارے دادا حضرت کا وصال ہوا اور اس کے بعد سے ہمارے والد حضرت تاج دار اہل سنت کی حاضری شروع ہوئی ہے، جو الحمد للہ آج تک قائم ہے۔ یہ بھی اعزاز شاید کسی کے پاس نہ ہو کہ ۴۵ سال لگا تار ہمارے دادا کی حاضری اور ان کے وصال سے لے کر اب تک والد ماجد کی حاضری ہوتی رہی ہے۔ پھر ہمارے حضرت والد ماجد کے ساتھ ہم بھائیوں اور دیگر اہل خانہ کو بھی متعدد بار حضوری کا شرف حاصل ہوا ہے۔

غوث نورانی: حضور غوث اعظم کے خانوادے سے آپ کے خانوادے کے رشتہ محبت کے بارے میں کچھ بتائیں؟

مولانا مصطفیٰ قادری: اگر اس سوال کی تفصیل میں جاؤں تو ایک دفتر درکار ہے۔ ہمارے خانوادے کا حضور غوث اعظم کے خانوادے سے تعلقات کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ جب حضرت سیف اللہ المسلمول پہلی بار ۱۸۶۱ء میں وہاں حاضر ہوئے تو نقیب الاشراف حضرت سید علی الگیلانی ان کے استقبال کے لیے باہر تشریف لے آئے اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنی نشست گاہ پہ آئے اور اپنے ساتھ سجادے پر بٹھالا، اپنے صاحب زادے اور ولی عہد کو پڑھوایا اور اجازت دلوائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایسا تعلق اور ایسا اعزاز ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے کو حاصل ہوا ہو۔

جب تاج الخول کی ۱۲۹۰ ہجری میں پہلی حاضری ہوئی تو اس وقت حضرت سید علی الگیلانی کا انتقال ہو چکا تھا، آپ کے صاحبزادے حضرت سید سلمان الگیلانی صاحب سجادہ اور نقیب الاشراف تھے، جب آپ آستانے میں حاضر ہوئے تو آپ کا دربار لگا ہوا تھا، حضرت تاج الخول جا کر بیٹھ گئے، آپ نے ادباً سوچا کہ میں دور ہی رہوں مگر جیسے

حضرت سید سلمان الگیلانی کی آپ پر نظر پڑی، آپ نے فرمایا: "انت ابن فضل رسول؟"

(کیا آپ فضل رسول کے بیٹے ہیں؟)

تاج الخول لکھتے ہیں کہ میں اس سوال پر تھر تھر کانپنے لگا، قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے پاس بلایا تو میں قدموں پہ گر گیا۔ تاج الخول فرماتے ہیں کہ وہاں آپ نے ایک شعر بھی پڑھا:

فان فضل رسول الله ليس له

حد فيعرب عنه باطرق بقم

یہ نوازش اور تعلق کی بات ہے۔ پھر تاج الخول کی حاضریاں ہوتی رہیں، صاحبزادگان اور دیگر خاندان والوں سے خوب جان پہچان ہوتی رہی، جب تاج الخول کے بڑے صاحب زادے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر پہلی بار تشریف لے گئے تو آپ کو دیکھتے ہی وہاں کے صاحب سجادہ نے کہا کہ "یہ فضل رسول کے پوتے ہیں، ان کی اور ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں ہے، بس یہ کہ ان کی ڈاڑھی ذرا لمبی ہے۔"

حضرت سیف اللہ المسلمول کے بعد سے یہ ہونے لگا کہ جب بھی ہمارے خاندان کا کوئی فرد وہاں جاتا تو چرچا عام ہو جاتا کہ بدایوں سے شاہ فضل رسول کے خاندان والے آئے ہوئے ہیں، پھر پورے عراق کے علماء و مشائخ اور خانوادہ غوث اعظم کے تمام افراد ملنے آیا کرتے، اپنے گھروں کو لے جاتے اور دعوتیں کرتے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، جب سرکار صاحب الاقدار مولانا شاہ عبدالقادر کا وصال ہو گیا اور ان کے بعد ہمارے دادا مفتی اعظم سلطنت آصفیہ مولانا شاہ عبدالقدیر نے مسند سنبالی۔ صاحب سجادہ بننے کے بعد جب آپ تسلسل کے ساتھ بغداد شریف جانے لگے تو عالم یہ ہو گیا کہ خانوادہ غوث اعظم کا ہر فرد آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ وہاں کے نقیب الاشراف اور سجادگان آپ سے بے حد محبت فرمانے لگے۔ حد یہ ہو گئی کہ حضور غوث اعظم کی درگاہ پر بیٹھنے والے فقیر، درویش، ملنگ، مانگنے والے، خدام، جاروب کش، حتی کہ درگاہ کے آس پاس کے دکان دار ہمارے دادا سے اتنے واقف، مانوس اور شناسا ہو گئے کہ ہر ایک کی زبان پر "مولوی عبدالقدیر، مولوی عبدالقدیر" ہو کر نکتا تھا۔ ہمارے دادا کو "مولوی" کا خطاب دربار غوث اعظم سے ہی ملا۔ ہندوستان سے جب ہمارے دادا جایا کرتے تو بڑے اہتمام سے جاتے، حضور غوث اعظم کے پورے خاندان سے ان کی شناسائی تھی اور

بچے بچے سے وہ واقف تھے، اس لیے جب جاتے تو خاندان کے جو بچے پڑھ رہے تھے ان کے نام سے ڈائری وغیرہ چھپا کر لے جایا کرتے، ہر شہزادے کے لیے ڈائریوں پر الگ الگ نام لکھوا کر لے جاتے اور سکھوں کے لیے تختے تحائف لے جاتے۔ وہاں پہنچ کر آپ تمام خاندان کی بڑی پر تکلف دعوت کیا کرتے۔ خانوادے کے تمام شہزادے بھی فردا فردا اپنے گھروں میں آپ کی دعوت کرتے۔

آپ ہر سال حضور غوث اعظم کے مزار مبارک کے لیے اپنے ساتھ ایک بیش قیمت غلاف تیار کر کے لے جاتے تھے۔ اور یہ شرف بھی مجھے نہیں ملتا کہ کسی اور کو ملا ہو کہ جو غلاف آپ اپنے ساتھ لے جاتے تھے، سال بھر وہی غلاف حضور غوث پاک کے مزار پر چڑھا رہتا تھا، پھر اگلے سال جب جاتے تو نیا غلاف لے کر جاتے، اسے چڑھاتے اور پرانا غلاف اتار کر وہاں جمع کر دیتے۔ یہ سلسلہ ۳۵ برسوں تک چلتا رہا۔ ان کے علم و فضل اور خانوادہ غوث پاک سے اس گہرے تعلق کی وجہ سے بصرہ سے لے کر بغداد تک ہر آدمی آپ کو جانتا تھا، وہاں کے کبار علماء، مشائخ، شعراء، فقہاء، یہاں تک کہ امرا اور وزرا آپ کو جانتے تھے۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، ایک بار ہمارے دادا درگاہ حضور غوث اعظم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فوجی جنرل اپنی وردی میں آیا اور اس نے پوچھا: "مولوی عبدالقدیر کون ہیں؟" تو لوگ گھبرا گئے کہ ایک فوجی یہاں کیوں آیا ہے، مزید یہ کہ اس وقت ہندوستان کے حالات بھی اچھے نہیں چل رہے تھے، تاہم آپ نے فرمایا کہ "میں ہوں عبدالقدیر" یہ سنتے ہی وہ آپ کے قدموں پہ گر پڑا، اور کہنے لگا کہ "میں بہت خواہش مند تھا کہ میں حضور غوث پاک کا مرید ہو جاؤں یا حضور غوث پاک اشارہ فرمادیں کہ فلاں سے مرید ہو جاؤ، چنانچہ مجھے خواب میں حضور غوث پاک نے بشارت دی کہ اگر تم مجھ سے مرید ہونا چاہتے ہو تو مولوی عبدالقدیر سے مرید ہو جاؤ، اس طرح آپ نے اس کو مرید کر لیا۔

اسی طرح حضرت حیدر ابراہیم الگیلانی جو وہاں کے سجادہ نشین اور نقیب الاشراف تھے، ایک بار ان کی طبیعت کافی خراب ہو گئی، اس سفر میں تاج دار اہل سنت بھی شامل تھے، انھوں نے میرے دادا سے فرمایا کہ: "مولوی! میری طبیعت خراب رہتی ہے، تم اپنے غوث پاک سے کہہ دو کہ میں صحیح ہو جاؤں۔" اس پر ہمارے دادا رو پڑے اور عرض کی کہ

’حضور! ہم تو آپ کے غلام ہیں، آپ ہماری سفارش کیجیے نہ کہ ہم آپ کی سفارش کریں۔‘ تو آپ نے فرمایا کہ ”مولوی تم کتنا بھی چھپاؤ مگر میں جانتا ہوں کہ اس وقت روئے زمین پر غوث پاک کی جو نظر تہا رہے اوپر ہے وہ کسی پر نہیں ہے۔“

ہمارے دادا جب بھی بغداد حاضر ہوتے تو آستانہ غوث اعظم کے مہمان خانے میں انھیں ٹھہرایا جاتا تھا، وہیں شہزادگان اور سجادگان کے گھر بھی تھے، اکثر یہ ہوتا تھا کہ خانوادے کا کوئی بزرگ آیا، اس نے اپنے پاس بٹھا لیا، کبھی کوئی نوجوان آیا، اس نے ہمارے دادا کے ساتھ گفتگو چھیڑ دی، یہاں تک کہ خانوادے کے چھوٹے بچے شام کو سائیکل چلانے کے لیے آتے تو اکثر دیکھا گیا کہ چھوٹا بچہ سائیکل چلا رہا ہے اور پیچھے پیچھے مفتی عبدالقدیر اس کی سائیکل پکڑے ہوئے اسے سائیکل چدنا سکھا رہے ہیں یا کھیلنے کھیتے انہوں نے کہہ دیا کہ مولوی صاحب! یہاں کھڑے ہو جائیے، یہاں ہماری گیند آئے تو اٹھا کر ہمیں دے دیں تو ان بچوں کی دل جوئی کے لیے ان کے ساتھ کھیل رہے ہیں، گویا بڑوں کے ساتھ بچوں میں بھی ان کی مقبولیت تھی۔ کبھی گھر یلو باتوں میں بھی انھیں شریک کیا جاتا تھا۔

یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ ہمارے پیر و مرشد اور والد گرامی کی پیدائش سے پہلے حضرت سید سالم انگیلانی صاحب سجادہ اور متولی ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے ہمارے دادا سے پوچھا کہ: ”مولوی! تمہارے کتنے بیٹے ہیں؟ انہوں نے کہا: ”حضور میرے دو بیٹے ہیں“ تو فرمایا کہ ایک تیسرا بھی ہو گا اور اس کا نام میرے نام پر ”سالم“ رکھنا۔ ہمارے حضرت کا یہ نام بھی غوث پاک کے شہزادے اور ان کے سجادہ نے رکھا ہے۔ اہل خانہ نے حضرت والد ماجد کے کئی نام رکھے، مگر یہ غوث پاک کا کرم ہے کہ وہ پوری دنیا میں ”سالم میاں“ کے نام سے پہچنے گئے۔

ہمارے دادا کے بعد حضرت والد ماجد کا دور آیا، حضرت کی پہلی حاضری تو اپنے والد ماجد کے ساتھ ہوئی تھی، پھر ۱۹۶۲ء میں جب آپ سجادہ بننے کے بعد پہلی مرتبہ بغداد حاضر ہوئے تو حضرت پیر ابراہیم گیلانی کا زمانہ تھا۔ حضرت پیر ابراہیم کا معمول یہ تھا کہ اپنے گھر سے جب صبح کو درگاہ تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے درگاہ میں حاضری دیتے، اساتذہ حنفی کا ورد کرتے، سب کے لیے دعا کرتے، پھر اپنی مسند

پر دیوان خانے میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ جب حضرت والد ماجد بغداد شریف پہنچے تو حضرت پیر سید ابراہیم نے فرمایا کہ: ”سالم! گھر پر آنا“ حضرت نے عرض کی کہ ”حضور میں نے آپ کا گھر دیکھا ہی نہیں ہے، آپ سے تو روزانہ یہاں درگاہ شریف میں ہی ملاقات ہو جاتی ہے۔“ تو آپ نے فرمایا: ”میں اپنے ڈرائیور کو بھیج دوں گا“ دوسرے دن صبح کو حضرت کو ڈرائیور بھیج کر اپنے گھر بلوا لیا۔ حضرت پر پیر صاحب کی بے پناہ نوازشات رہیں۔ اپنے ساتھ ناشتہ کراتے، کھانا کھاتے، گھنٹوں گفتگو کرتے، نماز میں شریک رکھتے۔ اسی سفر میں اپنا پہنا ہوا خرچہ اتار کر ہمارے حضرت کو پہنایا اور اپنے خاندان کی وہ باری اجازتیں عطا کیں جو ان تک پہنچی تھیں۔

اس کے اگلے ہی دن حضرت والد ماجد پانی کے جہاز سے سوار ہو کر بصرہ کے راستے بمبئی آئے تو اخبار کے ذریعے معلوم ہوا کہ حضرت پیر ابراہیم گیلانی وصال فرما گئے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمین پر موجودہ عہد میں حضرت پیر ابراہیم صاحب کا آخری خلیفہ اگر کوئی ہے تو وہ حضور تاج دار اہل سنت ہیں۔ اسی سفر میں آپ نے حضرت والد ماجد سے فرمایا تھا کہ میرے دادا حضور غوث اعظم میرے خواب میں آئے اور انہوں نے فرمایا کہ ”مولوی ہر سال بدایوں سے ہمہ دے لیے غلاف لاتا تھا، اب اس کا انتقال ہو گیا ہے تو ان کے بیٹے سالم کو میرے مزار سے غلاف اتار کر دے دو کہ میری طرف سے مولوی کے قبر پر چڑھا دے۔“ حضور غوث اعظم کی یہ بے بہا عنایت بھی ہمارے گھر کے حصے میں آئی۔ حضور غوث پاک اور ان کے خانوادے سے اسی گھرے تعلق اور نوازشات کا نتیجہ ہے کہ حضرت والد ماجد ۱۹۶۲ء سے لے کر اب تک ہر سال مسلسل بغداد شریف جا رہے ہیں، درمیان میں استثنائی طور پر حالات کی خرابی کی وجہ سے ایک دو سال نہیں جاپائے، ورنہ ہر سال انھیں حضوری کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح پچاس سے زائد بار وہ بغداد شریف حاضری دے چکے ہیں۔ وہاں کے لوگ جس طرح ہمارے دادا سے واقف تھے، اسی طرح پورا باب الشیخ حضرت سے واقف ہے۔ جب وہ تشریف لے جاتے ہیں تو ہر شخص کی زبان پر شیخ سالم، شیخ سالم ہوا کرتا ہے۔ حضرت پیر ابراہیم صاحب کے بعد جتنے بھی نقیب الاشراف اور سجادگان ہوئے سب سے حضرت کا گہرا تعلق رہا۔ شہزادگان اور سجادگان ہمارے حضرت کو بے تکلف خطوط لکھتے، آستانے میں تعمیر کے

لسلے میں انھیں جلاتے، کوئی اور کام ہو تو فوراً یاد فرماتے۔ اسی طرح وہاں سے بھی خانوادے کے متعدد افراد اور سجادگان بدایوں تشریف لاتے اور ۲۰۰۰ سے گھر کو عزت بخشے۔ ۱۹۵۶ء میں ہمارے دادا محترم حضرت مفتی عبدالقدیر رحمۃ اللہ علیہ کا فی بیمار تھے تو حضرت پیر علاء الدین طاہر گیلانی ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے، پورے رمضان قیام فرمایا اور عید کی نماز پڑھ کر تشریف لے گئے۔ ان کے بعد بھی سجادگان تشریف لاتے رہے۔ ۱۹۹۸ء میں حضرت تاج اللہ لکھنؤ کا ’صد سالہ جشن‘ منایا گیا تو نقیب الاشراف حضرت پیر احمد ظفر گیلانی تشریف لائے۔ گویا حضور غوث اعظم اور ان کے خانوادے کی عنایتیں، محبتیں اور تعلقات ہمارے خاندان سے بے پایاں ہیں۔ آپ تو ہمارے برادر معظم حضرت شیخ صاحب کو حضور غوث اعظم نے اپنے پاس ہی بلا کر رکھ لیا، تاکہ یہ تعلق اور بھی گہرا ہو۔

خوشنورانی: حضرت شیخ اسید الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ پر حضور غوث اعظم کی کیا عنایتیں رہی ہیں؟

مولانا عطیہ قادری: یہ بہت مشکل سوال آپ نے کیا اور ایک طرح کہا جائے تو آسان بھی ہے۔ حضور غوث اعظم کی ان پر جو عنایتیں رہیں وہ سب پر عیاں ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں ان کی علی لیاقتیں، مختلف علوم و فنون پر گہری نظر، بے شمار خدمات و کارنامے اور علم و قلم کی عالمی شہرت، صرف کسب کے ذریعے ممکن نہیں۔ حضور اچھے میاں کے ذریعے انھوں نے حضور غوث اعظم سے جو نسبت غلامی پائی تھی، یہ سب کا سب اسی کا فیض اور ان کا کرم تھا۔ اس لیے صرف دس سال کے مختصر عرصے میں انھوں نے اتنے کارنامے انجام دیے، جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ بقول حضرت شرف ملت:

”اتنے کم عرصے میں تو لوگ یہ سمجھ پاتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا ہے، اس عرصے میں وہ زندگی کے بے شمار کام کر کے چلے گئے۔“

حضور غوث پاک کی غلامی، ان کا کرم اور ان سے تعلق مارہرہ مطہرہ کے توسط سے ہے، اس لیے وہ اکثر کہا کرتے تھے، بلکہ اس بات کو انھوں نے لکھا بھی ہے کہ ”میں جب مارہرہ حاضر ہوتا ہوں تو اپنی تمام تر علم و تحقیق مارہرہ کی حد سے باہر چھوڑ کر آتا ہوں اور مارہرہ میں جب تک بے حیثیت پھرتا رہوں گا، اس وقت تک دنیا میں میری حیثیت بنی رہے گی۔“ دنیا نے اس کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کیا۔

۱۹۹۲ء میں جب کہ شیخ صاحب حفظہ کرچکے تھے اور درس نظامی کا ابتدائی دور تھا، حضرت والد ماجد ان کو ساتھ لے کر بغداد شریف گئے۔ جب وہاں سے لوٹ کر شیخ صاحب آئے تو رنگ بدلا ہوا تھا اور کسئی میں ہی بزرگی کے آثار دیکھنے لگے تھے۔ رقت قلب، بلند اخلاق و کردار، تصوف و ولایت اور علم و فن سے شغف نمایاں ہو گئے تھے۔ پھر ۱۹۹۳ء، اور اس کے بعد ۱۹۹۶ء میں والد ماجد انھیں اپنے ساتھ لے کر بغداد شریف گئے۔ اُس وقت وہاں حضرت سید یوسف انگیلانی صاحب سجادہ تھے۔ ہمارے حضرت نے ان سے عرض کی کہ حضرت! میں یہ چاہتا ہوں کہ فراغت کے بعد میں اپنے بیٹے اسید الحق کو بغداد کے جامعہ صدام میں داخلہ کروا دوں۔“ تو آپ نے فرمایا: ”شیخ سالم! جامعہ صدام کی بجائے اسید الحق کو جامعہ ازہر، قاہرہ بھیج دو۔“ گویا غوث پاک کے سجادہ نشین کے کہنے پر ہی شیخ صاحب کو جامعہ ازہر بھیج گیا۔ عراق میں سارا بغداد اور خود غوث پاک کا پورا خانوادہ حضرت کا جاننے والا تھا اور پھر غوث پاک کے خانوادے کے افراد وہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز بھی تھے، وہاں داخلے اور تعلیم و رہائش میں کافی حد تک سہولتیں تھیں، جب کہ ہمارے والد ماجد کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جامعہ ازہر میں کیسے داخلہ ہوتا ہے اور نہ کبھی قاہرہ گئے تھے۔ حضرت کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ہندوستان سے جو طلبہ جامعہ ازہر جاتے ہیں وہ یہاں کے الحاق شدہ مدرسوں کی سند لے کر جاتے ہیں، مگر ان کے پاس ایسی کوئی سند بھی نہیں تھی، مگر چون کہ حضور غوث اعظم کے صاحب سجادہ کا حکم تھا کہ ان کا داخلہ جامعہ ازہر میں کرادے، اس لیے حضرت نے انھیں جامعہ ازہر بھیجے کا ارادہ فرمایا۔

۱۹۹۸ء میں حضرت تاج اللہ لکھنؤ کا ’صد سالہ جشن‘ منایا گیا تو نقیب الاشراف حضرت پیر احمد ظفر گیلانی تشریف لائے۔ شیخ صاحب نے امام عہم و فن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب کی درس گاہ سے درس نظامی کی تکمیل اسی سال کی تھی، اس لیے حضرت احمد ظفر گیلانی سجادہ نشین حضور غوث اعظم نے ہی شیخ صاحب کے سر پر دستار فضیلت باندھی۔

شیخ صاحب کی فراغت کے بعد والد ماجد حضرت تاجدار اہل سنت ۱۹۹۹ء میں انھیں اپنے ساتھ لے کر بغداد گئے۔ وہاں انھیں بارگاہ غوث میں پیش کیا اور صاحب سجادہ اور دیگر خانوادے کے افراد سے دعائیں کروائیں اور پھر براہ راست انھیں لے کر بغداد شریف سے قاہرہ پہنچ

گئے۔ وہاں جا کر ایسی آسنیاں پیدا ہو گئیں کہ شیخ الازہر نے خود آکر ہرے حضرت سے ملاقات کی اور بغیر کسی معاوضے اور الحاق کے شیخ صاحب کا وہاں داخلہ ہو گیا۔ پھر مدرسہ قادریہ کا جامعہ ازہر سے الحاق بھی کر دیا گیا۔

وہاں شیخ صاحب نے پانچ سال گزارے اور اپنی پوری تعلیم مکمل کی۔ جامعہ ازہر میں تمام مشائخ، علماء اور محدثین سے آپ کے رابطے ہوئے، دوران میں سے کئی حضرات نے آپ کو اجازتیں عطا کیں۔

اب یہ کہ حضور غوث اعظم نے آپ کو اپنے آپ سے اتنا قریب کر لیا کہ آپ کو اپنے جوار میں قیامت تک کے لیے جگہ دے دی ہے۔ شیخ صاحب عرس قادری کی اپنی تقریر میں پورے جوش و جذبے کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ:

”اس کو نے سے اس کو نے تک جو روشنی دیکھ رہے ہو، جو بلندیاں دیکھ رہے ہو، جو علمی و اشاعتی کام دیکھ رہے ہو، یہ سب کا سب حضور غوث اعظم اور شمس مارہرہ کا فیض اور انہی کے کرم سے ہے۔“

خوشتر لورانی: بغداد شریف میں حضرت شیخ صاحب کی ناگہانی شہادت سے برصغیر ہندوپاک میں کھرام مچ گیا، جہاں ان کے جانے کا لوگوں نے ماتم کیا وہیں لوگ اس شہادت کی تفصیل بھی جاننے کے لیے بھی بے چین ہیں، اس لیے اس حوالے سے چند باتیں آپ سے پوچھوں گا۔ سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ حضرات بغداد کے سفر پر کب روانہ ہوئے اور آپ کے ساتھ کتنے لوگ تھے؟

مولانا صاحب قادری: جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ حضرت تاجدار اہل سنت کا بغداد شریف جانے کا ہر سال کا معمول ہے۔ اس سال جانے کی تیاری ہونے لگی تو حضرت نے فرمایا کہ ”اس سال شیخ صاحب بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔“ کیوں کہ کافی سالوں سے شیخ صاحب نہیں گئے تھے۔ اس موقع پر تمام احباب سلسلہ کی یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ بھی حضرت کے ساتھ ضروری دیں۔ اس طرح ترجمان قادریہ حافظ عبدالقیوم قادری کی نگرانی میں تقریباً چالیس لوگوں کا قافلہ طے ہوا، حضرت اور شیخ صاحب کے ساتھ میں بھی شریک ہو گیا۔

سفر کی ابتدا یوں ہوئی کہ بدایوں سے حضرت اور حافظ عبدالقیوم قادری صاحب کچھ روز پہلے بمبئی چلے گئے۔ میں اور شیخ صاحب ۲۱ فروری ۲۰۱۳ء کو بدایوں سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے، کیوں کہ بمبئی

میں ”جشن قادری“ کے عنوان سے ۲۲ فروری کو احباب سلسلہ نے ایک مرکزی جلسہ رکھا تھا، یہ جلسہ ہر سال ہوا کرتا ہے، یہ اٹھارواں جلسہ تھا اپنی تدریسی، دینی، علمی اور تصنیفی مصروفیات کی وجہ سے شیخ صاحب جلسے میں شریک نہیں ہو پاتے تھے، اس لیے اس بار یہ طے پایا کہ اس جلسے میں شیخ صاحب خطاب فرمائیں گے۔ ورنہ فرماتے تھے کہ میں نے خطابت کا میدان عطیف میاں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ یہ خبر جیسے پھیلی کہ اس بار شیخ صاحب خطاب کریں گے، کافی تعداد میں علماء و دانشور تشریف لائے۔ ناگ دیوی اسٹیٹ بمبئی میں ”جشن قادری“ منعقد کر گیا، اس میں شیخ صاحب کی تقریر پونے دو گھنٹے تقریر ہوئی۔ یہ ان کی آخری تقریر تھی۔ جس جوش و خروش، درد و کرب اور رنگ و آہنگ میں انھوں نے خطاب کیا وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دیر رات جلسہ ختم ہونے کے بعد تاجدار اہل سنت نے فرمایا کہ ”میرے خلیفہ اول، میرے ولی عہد، میرے نور نظر اور میرے تخت جگر میرے بدلے آج آپ سے مصافحہ کریں گے اور یہ سمجھ لو کہ جس نے ان سے مصافحہ کر لیا اس نے مجھ سے مصافحہ کر لیا۔“ اس طرح ہزاروں ہزار کے مجمع نے لائن لگا کر شیخ صاحب سے مصافحہ کیا۔ یہ مصافحہ تقریباً ایک گھنٹہ جلسے کے بعد چلتا رہا اور حضرت تاجدار اہل سنت پیچھے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ قیام گاہ پر آنے کے بعد کئی لوگ آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ ”آج آپ کی بہت اچھی تقریر ہوئی۔“ تو شیخ صاحب نے کہا: ”یہ نہ کہو کہ اچھی تقریر ہوئی، مجھے پسند نہیں ہے۔“ دوسرے دن ۲۳ فروری کو دھارادوی کے علاقے میں جلسہ تھا، وہاں کے لوگوں نے شیخ صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ آپ نے وہاں کرم فرمایا تو دھارادوی کے لوگوں پر بھی کرم فرمائیں۔ مگر خرابی طبیعت کی وجہ سے انھوں نے تقریر نہیں کی، وہاں میرا خطاب ہوا۔ جلسے کے بعد میرا اور شیخ صاحب کا ایک ہی جگہ قیام رہا۔

دوسرے دن ۲۴ فروری کا دن گزرا اور ۲۵ فروری کی صبح ۳ بجے ہماری فلائٹ تھی۔ اس سفر میں حضور غوث اعظم کی نایاب کتاب اور ملفوظات کا مجموعہ ”فیوض ربانی“ ان کے مطالعے میں تھی۔ بدایوں سے کار اور پھر ریل میں بھی اسی کتاب کو پڑھتے رہے۔ دوران مطالعہ راستے بھر فرماتے رہے کہ ”یہ کتاب میں ساتھ لے آیا، پڑھ کر دل کی دنیا بدل گئی ہے۔“ اور فرمایا کہ ”میں غوث پاک کے ارشادات اس لیے پڑھتا ہوں جا رہا ہوں، تاکہ براہ راست ان سے فیض لے سکوں۔“ ان کو

اس سفر کے لیے ایسی بے چینی تھی کہ بار بار پوچھتے کہ کب سفر شروع ہوگا؟ کتنے بجے کی فلائٹ ہے؟ کب ہم لوگ ایئر پورٹ کے لیے نکلیں گے؟ بہر حال ۲۴ فروری کو دیر رات حضرت کی سرپرستی میں ۴۰ افراد کا ہمارا قافلہ ایئر پورٹ کے لیے نکلا اور عرب امارات کی ائر لائن سے دہلی کے راستے ۲۵ فروری کی شام کو ہم لوگ بغداد شریف پہنچ گئے۔

خوشتر لورانی: بغداد پہنچنے کے بعد شیخ صاحب کی مشغولیت اور آپ لوگوں کی سرگرمیاں کیا تھیں؟

مولانا صاحب قادری: وہاں پہنچنے کے بعد ان کی کیفیت کافی بدلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ حضرت تاجدار اہل سنت کے ساتھ ان کا بیٹا آیا ہوا ہے، بلکہ محسوس ہوتا کہ کوئی عقیدت مند مرید ان کے شریک سفر ہے۔ انھوں نے سکھوں سے کہہ دیا کہ حضرت جو پروگرام جس طرح ترتیب دیں گے، وہ سب کو فالو کرنا پڑے گا۔ جو حضرت کے ساتھ حاضر بارگاہ غوث ہونا چاہتا ہے وہ حضرت کے بتائے ہوئے وقت پر تیار رہے۔ وہاں معمول یہ رہا کہ فجر کی نماز باجماعت ہوٹل میں ہوتی، شیخ صاحب امامت فرماتے۔ اوراد و وظائف اور تلاوت کلام پاک سے فراغت کے بعد چائے وغیرہ پی جاتی، ساڑھے آٹھ بجے تک ناشتہ لگ جاتا، ناشتے کے بعد ہم لوگ آستانہ حضور غوث اعظم کے لیے نکل جاتے اور پھر ظہر کی نماز پڑھ کر ہوٹل واپس آ جاتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتے، پھر شیخ صاحب کی اقتدار میں عصر کی نماز باجماعت ہوتی، اس کے بعد پھر ہم لوگ درگاہ شریف کے لیے نکل جاتے اور وہاں سے عشا کی نماز پڑھ کر واپس آتے۔ درمیان میں کربلا، نجف اور دیگر مقامی زیارتیں بھی ہوتی رہیں۔

خوشتر لورانی: بارگاہ غوثیت میں حضرت شیخ صاحب کی حاضری کی کیا کیفیت رہی؟

مولانا صاحب قادری: جیسا کہ میں نے بتایا کہ روزانہ درگاہ حضور غوث اعظم میں حاضری کے لیے ہم لوگوں نے اوقات بنائے تھے، پورا قافلہ حضرت تاجدار اہل سنت کے ساتھ وہاں صبح کو حاضر ہوتا تھا۔ نماز کے بعد واپس آ جاتا، پھر عصر کے بعد جاتا۔ مگر شیخ صاحب ہمیں رک جاتے، ان کی وجہ سے میں اور کچھ احباب بھی وہیں رک جاتے، بعد بھی وہ جالی کے سامنے بیٹھے رہتے، تلاوت کرتے، دیوان قنوت پڑھتے، اور اوراد و وظائف پڑھتے، ہفتوی غوثیہ پڑھتے اور ایک

ایک گھنٹے مراقبہ رہتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ عصر کے بعد شیخ صاحب کے قریب میں بھی بیٹھ گیا، پہلے وہ حضور غوث اعظم کی جالی سے دور بیٹھ کر کچھ پڑھتے رہے اس کے بعد اچانک اٹھے اور جالی کے قریب چلے گئے درود و نوبہاتوں سے جالی پکڑ لی، ان کی آنکھیں بند تھیں، گویا ان پر رقت جاری تھی۔ فیس بک وغیرہ پر اس لمحے کی تصویر بھی ہے۔ اسی حال میں وہ مغرب تک رہے، پھر مغرب سے عشا تک بھی ان کی یہی کیفیت رہی۔ عشا کے بعد وہ ہوٹل آ گئے اور مجھ سے فرمایا کہ ”آج میں غوث پاک سے فیصلہ کروا کر آیا ہوں۔“ میں نے پوچھا کہ کیا فیصلہ؟ تو فرماتے تھے

”میں مدرسہ قادریہ کی تعمیر جدید اور توسیع کرنا چاہتا ہوں۔ اب شمار علمی و دینی کام کرنا چاہتا ہوں، مگر کچھ رکاوٹیں آ رہی ہیں، یہ رکاوٹیں کیسے دور ہوں گی؟ اس لیے میں نے حضور غوث اعظم سے کہا کہ ہم نے سب کچھ آپ سے منسوب کر رکھا ہے، آپ ہی ہماری پیچیدگیاں، ہمارا ادارہ، ہماری خانقاہ، ہمارا سب کچھ آپ کے نام سے وابستہ ہے، اگر آپ کرم نہیں فرمائیں گے تو کون کرم فرمائے گا؟ اگر میرا منصوبہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا تو پھر میں آپ کے نام سے اپنا ادارہ اور اپنی خانقاہ کیوں چل دوں؟ اب لگتا ہے کہ ان شاء اللہ یہ سب کام سوجھ بوجھ اور رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں گی۔“

شیخ صاحب یہاں سے خانقاہ اور مدرسے کی توسیع کے لیے یہ نقشہ بنا کر لے گئے تھے، اسی طرح اپنے دیگر منصوبے کا خاکہ بھی بنانے لے کر گئے تھے، جب وہ جالی پکڑ کر مراقبہ ہوتے تو ان منصوبوں کے نقشے کی فہم ان کی دود میں رکھی ہوتی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ پورا منصوبہ میں غوث پاک کی بارگاہ میں پیش کروں اور ان پر فیصلہ کروں۔ آؤں، اس لیے وہ گھنٹوں وہاں گزارتے، روتے اور فریاد کرتے۔

رات میں انہوں نے ہمیں یہ بات بتائی اور صبح ہم ناشتہ کرنے تیار بیٹھے تھے کہ اب درگاہ شریف جا میں گے، ہندوستان سے ایف فون آتا ہے کہ جو کام برسوں سے رکا ہوا تھا، وہ حل ہو گیا ہے۔ اب آپ موٹ آئیں۔ میں دوڑتے ہوئے شیخ صاحب کے پاس کیا اور بڑے جوش و جذبے سے یہ خبر ان کو سنائی۔ یہ بہت اہم خبر تھی اور ہم سکھوں کے لیے بڑی خوش خبری تھی، مگر شیخ صاحب اسے سن کر چونکے نہیں، بلکہ نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ ”یہ تو ہونا ہی تھا، مجھے تو یقین تھا کہ یہ

کام حضور غوث اعظم کی توجہات اور ان کے فیضان سے ہو جائے گا، مگر یہ امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی فیصلہ ہو جائے گا۔“

خوشنورانی: یہ بتائیں کہ بغداد میں شیخ صاحب کی علمی سرگرمیاں کیا تھیں؟

مولانا صلیح قادری: خوشنور صاحب! آپ ان کے سب سے قریبی دوست، بلکہ رازدار رہے ہیں۔ ان سے میری جتنی گفتگو براہ راست ہوتی تھی اس سے زیادہ گفتگو آپ ان سے فون پر کیا کرتے تھے۔ آپ مجھ سے بہتر ان کی عادتوں اور سررمیوں کو جانتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ اگر ان کو پڑھنے کو کچھ نہ ملے تو انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ کہیں بھی جاتے تو انہیں لاہریری اور جدید و قدیم کتابوں کی تلاش رہتی۔ بغداد شریف میں بھی ان کا یہی حال رہا۔ شیخ صاحب کو معلوم تھا کہ درگاہ حضور غوث اعظم کی بہت قدیم اور بڑی لاہریری ہے۔ اس لیے حاضری سے فراغت کے بعد مجھے لے کر لاہریری چلے گئے۔ لاہریری میں داخل ہونے کے بعد بڑے انہماک سے الماریوں میں رکھی کتابوں کو دیکھتے رہے، کچھ کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے اور کچھ کتابوں سے متعلق تفصیل اور حوالے نوٹ کرتے رہے۔ اس کے بعد لاہریرین کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران رہ گیا کہ لاہریرین نے کتب خانے کے نوادرات اور کتابوں کی تفصیل بتانا چاہی اس سے پہلے شیخ صاحب وہاں موجود کتابوں اور مخطوطوں کی تفصیل بتانے لگے کہ ہاں! آپ کے یہاں یہ یہ کتابیں ہیں اور فلاں فلاں مخطوط ہے، علوم حدیث اور تفسیر پر یہ یہ کتابیں نئی آئی ہیں وغیرہ۔ آدھے گھنٹے کے معائنے میں انہوں نے سب کچھ اپنے مطلب کا دیکھ لیا تھا۔ لاہریرین شیخ صاحب سے بہت متاثر ہوا اور بھاگ کر گیا اور رجسٹر لے کر آیا کہ اس پر اپنا تاثر لکھ دیجیے، شیخ صاحب پہلے تو تیار نہیں ہوئے، مگر میرے اصرار کرنے پر فی البدیہہ ایک صفحہ عربی میں لکھا۔ اس تحریر کا عکس میں نے لے لیا ہے، یہ ان کی لکھی ہوئی آخری تحریر ہے۔

اسی طرح جہاں بھی جاتے، وہاں لاہریری کے بارے میں پوچھتے، اگر وہاں لاہریری ہوتی تو پھر کچھ گھنٹے وہاں گزارتے۔ امام غنیم کی درگاہ میں ایک بہت بڑا فقہ حنفی کا سینہ ہے، اسے بھی انہوں نے دیکھا۔ راستے میں چلتے چلتے کوئی مکتبہ دکھ جاتا تو وہیں کتابوں کو دیکھنے اور خریدنے میں لگ جاتے۔ یہاں تک کہ گلی کوچوں اور درگاہوں کے

سامنے چٹائی پر کتابیں رکھ کر کوئی بیچتا ہوا دکھ جاتا تو وہیں کھڑے کھڑے دیر تک کتاب کی ورق گردانی کرتے رہتے۔ ہمارے احباب سلسلہ شیخ صاحب کی اس عادت سے اس قدر آشنا ہو چکے تھے کہ وہ ان کو مجھ سے کہتے تھے: ”اپنے شیخ صاحب جیسا ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، انھیں ہم نے خالی بیٹھے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، جب دیکھو کسی نہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔“ شیخ صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بغداد سے لوٹ کر یہاں کے کتب خانوں کے متعلق ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ لکھنے پڑھنے سے انھیں عشق تھا، اسی عشق نے ان سے اتنا کام کروایا کہ آج دنیا حیران ہے۔

خوشنورانی: بغداد شریف میں شیخ صاحب کی کن علما اور مشائخ سے ملاقاتیں رہیں؟

مولانا صلیح قادری: بغداد شریف میں کافی علما و مشائخ سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں، اس کی تفصیل تو وہی بتا سکتے تھے، کچھ لوگوں کے نام مجھے یاد ہیں۔ ان میں دکتور محمد انس، جو جامعہ بغداد میں ریجنل الکلیہ ہیں اور آستانہ حضور غوث اعظم کی مسجد کے امام و خطیب بھی ہیں۔ ان سے شیخ صاحب کی علم حدیث پر کافی گفتگو رہی۔ اس گفتگو سے متاثر ہو کر انھوں نے شیخ صاحب کو وہاں کے ایک بڑے محدث شیخ عبداللہ سے ملاقات کرانے کا وقت بھی لے لیا تھا۔

ایک اور عالم دین شیخ علی بن حمود الحری الرفاعی سے بھی شیخ صاحب کی ملاقات ہوئی، یہ بھی جامعہ بغداد میں استاذ ہیں اور آستانہ حضرت مصروف ربی کے نگراں بھی ہیں۔ بڑے عالم، محقق اور محدث ہیں۔ انھوں نے شیخ صاحب کو اپنے گھر چائے پر مدعو بھی کیا، حدیث کے موضوع پر ایک کتاب ”الاربعون النبویہ“ دی اور اسی پر انھیں اجازت بھی لکھ کر دی۔ جس وقت ان کی شہادت ہوئی، اس وقت یہی کتاب زیر مطالعہ تھی۔ اس کتاب پر شیخ صاحب کے خون کے چھینٹے بھی موجود ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی علما اور محدثین سے ان کی ملاقاتیں رہیں جن کے نام مجھے یاد نہیں ہیں۔

خوشنورانی: شیخ صاحب کے آخری سفر کے متعلق کچھ بتائیے؟ یہ حادثہ کیسے اور کب ہوا؟

مولانا صلیح قادری: بغداد محل میں ہماری حاضری ہو چکی تھی اور اب ہم واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لیے پروگرام یہ بنا کہ ہم

کچھ لوگ خانوادہ حضور غوث اعظم کے شہزادے شیخ المشائخ حضرت سید محمد توفیق الگیلانی سے ملاقات کے لیے ”ارتیل“ جائیں گے، جو بغداد سے تقریباً تین سو کلومیٹر کی دوری پر ہے اور بقیہ احباب یہ طریقہ بغداد سے براہ راست ہندوستان لوٹ جائیں گے، پھر ہم چند افراد ارتیل سے ہی دہلی جائیں گے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے انڈیا واپس ہوں گے۔ بغداد سے ارتیل کے راستے میں بہت سے اولیا اور مشائخ آرام فرما ہیں، ان کے مزاروں پر فاتحہ خوانی اور حاضری بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ ۴ مارچ کو ہم پانچ لوگوں کا قافلہ، جس میں والدہ گرامی حضرت تاجدار اہل سنت، حضرت شیخ صاحب، حافظ عبدالقیوم قادری، حاجی اقبال اور میں بذریعہ دین، جو ۱۲ رھیت کی تھی، صبح ساڑھے گیارہ بجے بغداد سے ارتیل کے لیے نکلے، جب کہ بقیہ تمام احباب طریقہ واپسی کے لیے بغداد انٹرپورٹ چلے گئے۔

شیخ صاحب نے فرمایا کہ ”مجھے ۹ مارچ کو خوشنور صاحب کے ساتھ ایک سیمینار میں شرکت کے لیے بتایا جاتا ہے، اس لیے میں دہلی میں نہیں رکوں گا، دہلی کے لیے ۶ مارچ کو میرا ٹکٹ کرادو۔“ ان کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔

دین میں حضرت تاجدار اہل سنت کو سب سے آگے ڈرائیور کے پاس والی سیٹ پر بٹھایا گیا، اس کے پیچھے والی سیٹ پر شیخ صاحب اور حافظ عبدالقیوم صاحب ہو گئے، اس کے پیچھے والی سیٹ پر میں اور حاجی اقبال بیٹھ گئے اور اس سے پیچھے جو سیٹ تھی اس کو فولڈ کر کے وہاں پر سامان رکھ دیا گیا۔ اس طرح بغداد سے ہم لوگ روانہ ہوئے، راستے میں حضرت تاجدار اہل سنت بغداد کی گلیوں اور سڑکوں کے بارے میں بتاتے رہے کہ یہ فلاں سڑک ہے، اس پر فلاں بزرگ کا مزار ہے، یہاں سے تھوڑی دور پر جا کر فلاں شہزادے کا گھر ہے۔ بغداد شہر سے جب ہماری گاڑی نکلی تو شیخ صاحب دلائل الخیرات شریف پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد وہ حدیث کے موضوع پر شیخ علی بن حمود الحری الرفاعی کی دی ہوئی کتاب ”الاربعون النبویہ“ کا مطالعہ کرنے لگے۔ ہم لوگ خاموش بیٹھے رہے، کچھ دیر کے بعد ہم لوگوں کو نیند کے جھومکے آنے لگے۔ بغداد شریف سے ۶۵/۷۰ کلومیٹر کی دوری پر ایک علاقہ ”باقوبا“ کہلاتا ہے، وہاں سے کچھ ہی آگے ہم لوگ نکلیں ہوں گے کہ اچانک ہماری گاڑی پر دائیں بائیں دونوں جانب سے فائرنگ

شروع ہو گئی، یہ عراقی وقت سے تقریباً دو سے ڈھائی بجے دوپہر کے آس پاس کا وقت ہوگا اور انڈیا میں شام کے ساڑھے چار سے پانچ بج رہے ہوں گے۔ کچھ لمحے کے لیے تو ہمیں سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے، ہم لوگوں نے سمجھا کہ چون کہ گاڑی بہت اسپید سے چل رہی ہے، شاید اس کے انجن میں اسپارکنگ شروع ہو گئی ہے اور یہ چٹان چٹان کی آوازیں اسی سے آرہی ہیں، مگر اگلے ہی لمحے سمجھ میں آیا کہ ہم پرفائرنگ ہو رہی ہیں، پھر اچانک حضرت کی آواز آئی ”لگتا ہے فائرنگ ہو رہی ہے، جھک جاؤ“ ہم سب لوگ بہت تیزی سے نیچے جھک گئے۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ گاڑی اور تیزی سے دوڑنے لگی ہے اور ڈرائیور گاڑی کو تھوڑا سا لہرا کر چلا رہا ہے تاکہ گولیوں کی زد سے بچا جاسکے۔ مگر اتنی دیر میں ہماری گاڑی پر سو سے زائد گولیاں آکر لگ چکی تھیں۔ گاڑی کے پورے شیشے ٹوٹ کر گر چکے تھے، شیشوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور کرچیاں ہمارے سروں اور جسموں پر لگے ہوئے تھے۔ جب گولیوں کی آوازیں آتا ہند ہو گئیں تو جھکے جھکے میں نے دیکھا کہ گاڑی کے فرش پر کافی مقدار میں خون ہے، جو بہہ کر ہماری طرف آرہا تھا۔ خون دیکھ کر میں نے سمجھا کہ حافظ عبدالقیوم صاحب کے پیر میں ٹوٹ کر شیشہ لگ گیا ہے، شیخ صاحب کا اتنا خون نکل نہیں سکتا کیوں کہ وہ اتنے کچم شیم نہیں ہیں، جب میں نے اٹھ کر دیکھا تو حافظ عبدالقیوم صاحب کی گود میں شیخ صاحب کا سر تھا اور حافظ صاحب کہہ رہے تھے کہ شیخ صاحب بیہوش ہو گئے ہیں، شیخ صاحب بیہوش ہو گئے ہیں۔

جہاں گولی چل رہی تھی، اتفاقاً وہاں سے ۶۰/۵۰ میٹر آگے پولس چیک پوسٹ تھی، ڈرائیور تیزی سے گاڑی چلائے جا رہا تھا، آگے جب چیک پوسٹ آگئی تو اس نے گاڑی روکی۔ ہمارے اوسان بحال نہیں تھے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے، ہم نے پولیس والوں سے بتایا کہ ہمارے ساتھ ایسا ایسا ہوا ہے، وہیں ایسی پولیس کھڑی تھی، وہ لائی گئی، ہمیں کچھ ہوش نہیں تھا اور نہ اب مجھے یاد ہے کہ ہم گاڑی سے کیسے اترے اور کیسے شیخ صاحب کو ایسولینس میں رکھا گیا۔

خوشنورانی: اس وقت آپ لوگوں کو پتہ نہیں چلا تھا کہ شیخ صاحب کو گولی لگ گئی ہے؟

مولانا صلیح قادری: ہاں! یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ ان کو سر میں گولی لگ گئی ہے، کیوں کہ گولی کا نشان کسی پر دکھ رہا تھا، نشان بتا رہا تھا

کہ انھیں بہت طاقتور گولی لگی ہے اور کپٹی پر ایک طرف سے لگ کر دوسری طرف سے نکل گئی ہے۔ مگر ہمارے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ شہید ہو گئے ہیں اور نہ دل اس بات کو ماننے کو تیار تھا۔ ہم لوگ تو یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح جلدی سے ہاسپٹل پہنچ کر فوراً آپریشن کرائیں گے تو شیخ صاحب صبح ہو جائیں گے۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کیسے شیخ صاحب کو ایسویٹنس میں ڈالا گیا اور کتنی دیر لگی، بس اتنا یاد ہے کہ بہت جلدی ہم لوگ ہاسپٹل پہنچ گئے، کیوں کہ ہاسپٹل ہائیوے کے کنارے ہی تھا، مگر بہت چھوٹا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی پورا عملہ حرکت میں آ گیا۔ میں حضرت کو بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایسویٹنس میں حضرت، شیخ صاحب کو مسلسل آوازیں دیتے رہے کہ بھیا! کچھ تو بولو! بابا کچھ تو کہو! آنکھیں کھولو، آخر تمہیں کیا ہو گیا بابا؟ (حضرت، شیخ صاحب کو پیار سے ”بھیا“ اور ”بابا“ کہتے تھے)

ہاسپٹل والے اسٹریچر پر لٹا کر شیخ صاحب کو اندر لے گئے، میں حضرت کو پکڑ کر ان کے ساتھ رک گیا، حافظ عبد القیوم صاحب شیخ صاحب کو لے کر اندر گئے، وہاں کے ڈاکٹروں نے انھیں دیکھتے ہی کہا: ”یہ تو شہید ہو گئے ہیں“ یہ سنتے ہی عجیب حال ہو گیا، ایسا لگا کہ کسی نے غبارے سے ہوا نکال دی ہو، کھڑے ہو رہے ہیں تو جیر تھر تھر کانپ رہے ہیں، کچھ بولنا چاہ رہے ہیں مگر آوازیں نہیں نکل رہی ہے، حضرت کی بھی حالت اور کیفیت ناقابل بیان تھی۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ عمر کے اس حصے میں جوان بیٹا اور وہ بھی ایسا بیٹا جو ان کا ولی عہد ہے، ان کے خوابوں کی تعبیر ہے، ان کی آرزوؤں کا مسکن ہے، اپنے آبا و اجداد کے علوم و معارف کا وارث و امین ہے، خائفانہ ہونے کے لیے نمونہ عمل ہے اور جماعت اہل سنت کا قیمتی سرمایہ ہے، اس دنیا سے چلا گیا ہے، تاہم حضرت انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ اللہ والوں کی بات ہے ورنہ ایسے موقعوں پر انسان اپنا آپا کھو بیٹھتا ہے۔

حضرت اور حاجی اقبال کو اور مجھے تو کچھ نہیں ہوا مگر ہمارے حافظ عبد القیوم صاحب زخمی ہو گئے تھے، ایک گولی ان کے ہونٹ کے نیچے داڑھی کے پاس اور دوسری گولی سیدھے ہاتھ کے کندھے پر لگی تھی۔ کلانی اور بازو پر بھی زخم تھے۔ ان کی آنکھ پر بھی زخم تھا، گولی آنکھ کو چھوتے ہوئے نکل گئی تھی اور پوری آنکھ سوچ کر سرخ ہو گئی تھی۔ مگر وہ شیخ صاحب کے غم میں اپنی تکلیف بھول گئے۔ حافظ عبد القیوم صاحب کی ڈاکٹر سے اس

بات پر تکرار ہو رہی تھی کہ شیخ صاحب کو دیکھو، ان کو گولی لگی ہے، مگر اس نے کہا کہ نہیں، آپ کو لگی ہے ”یہ تو شہید ہو گئے“ ڈاکٹر بہت زبردستی پکڑ کر ان کو لایا، ان کے ہونٹ کے نیچے سے چھرے نکالے، چیک اپ کیا تو وہ خطرے سے باہر تھے۔

وہاں ہمارے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ زبان اور اجنبیت کا تھا۔ وہ دیہاتی علاقہ تھا جہاں فصیح نہیں بولی جاتی، بلکہ ان کی اپنی مقامی زبان ہے، جو عربی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، ہم ان کی زبان سمجھ نہیں پا رہے تھے اور نہ وہ ہماری، تھوڑی بہت عربی میں بھی جانتا ہوں مگر مجھے اس وقت کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں ان سے کیا کہوں؟ کس کو فون کروں؟ کس سے مددوں؟ بغداد سے تو ہم اچھی طرح واقف تھے، مگر اس سنا سن علاقے سے ہم بالکل بھی شناسا نہیں تھے، ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جہاں ہمارے ساتھ یہ حادثہ ہوا وہ کون سی جگہ تھی، بعد میں اس کی تفصیل معلوم ہوئی۔

خوشخبر دہانی: جب آپ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ شیخ صاحب شہید ہو چکے ہیں تو پھر آپ لوگوں نے کیا کیا؟

مولانا عطیہ قادری: سچ پوچھیے تو ہمیں اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ شیخ صاحب شہید ہو گئے ہیں، ہمیں لگ رہا تھا کہ یہ چھوٹا ہاسپٹل ہے اس لیے یہ ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس لیے حافظ عبد القیوم صاحب نے مجھ سے کہا کہ درگاہ شریف فون کیجیے اور ان سے کہیے کہ بجلی کا پٹر والی ایسویٹنس لے کر آئیں، شیخ صاحب کا ہم بغداد شریف کے کسی بڑے ہاسپٹل میں علاج کرائیں گے۔ میں نے اور حافظ صاحب نے فوراً ٹور آپریٹر امین بھائی کو فون کیا، وہ ہمیں جانے کے لیے پورے گروپ کے ساتھ بغداد شریف ایئر پورٹ پر تھے، بلکہ ان کو بورڈنگ پاس وغیرہ بھی مل چکا تھا، ہم نے ان سے کہا کہ تم کسی بھی حال میں ایئر پورٹ سے باہر نکلنا اور درگاہ شریف پہنچو، یہاں بہت سنگین مسئلہ ہو گیا ہے۔ بورڈنگ ہونے کے بعد باہر نکلنا ممکن نہیں تھا، مگر حضور غوث پاک کا کرم تھا کہ وہ ساری سیکورٹی سے نکل گئے، ایئر پورٹ کے سارے ذمہ داران ان کے ساتھ ہو گئے، ان کا سامان ہوائی جہاز سے نکالا گیا اور اس طرح وہ درگاہ شریف پہنچ گئے۔ مگر جب تک یہ یقین ہو چکا تھا کہ اب ہمارے شیخ صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ یہ خبر جب بغداد پہنچی تو غوث پاک کا پورا خانوادہ زار و قطار رونے لگا اور سب لوگ جمع ہو گئے، درگاہ کا ہر خادم

یہاں تک کہ جو بھیک مانگنے والے ملنگ ہیں وہ تک رونے لگے اور ایک عجیب سناٹا چھا گیا اور ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ شیخ سالم کا لڑکا شہید ہو گیا۔ صاحب سجادہ حضرت پیر سید عبدالرحمن گیلانی نے ضروری کارروائی کے لیے فوراً احکامات جاری کیے اور مسلسل ہمارے رابطے میں رہے۔

اساتے میں وہاں پر کچھ پولس والے قانونی کارروائی مکمل کرنے کے لیے آ گئے اور ایک ایسویٹنس میں شیخ صاحب کے جسد خاکی کو لیا اور ہمیں ساتھ لے کر ایک پولس چھاونی میں آ گئے۔ وہاں کے انچارج نے ہم سے تفصیل معلوم کی اور اسے ایک کانڈر پر لکھ لیا اور ہم سے کہا کہ ہم بڑے شرمسار ہیں کہ ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر پائے، پھر ہم سے پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ تو ہم نے کہا: ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم بغداد شریف حضور غوث پاک کی درگاہ چلے جائیں تو اس نے کہا: ٹھیک ہے اس نے گاڑی منگائی، ہم سب لوگوں کو اس میں بٹھالا اور کہا کہ آپ لوگ بغداد جایے، ہم اس شہید کو ہسپتال بھیج رہے ہیں، صبح ہم ان کو لے کر بغداد شریف آ جائیں گے۔ شیخ صاحب کے جسد مبارک کو چھوڑ کر جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر ہم وہاں کے قانون سے مجبور تھے۔

ہم لوگ جب درگاہ شریف پہنچے تو حضرت پیر سید عبدالرحمن نے سب انتظام کر رکھے تھے اور ہمارے قیام و طعام اور تمام تر سہولیات کے لیے سب کو آڈر جاری کر دیے تھے۔ انہوں نے حکومت کو خط بھی لکھ دیا تھا کہ سب کچھ صحیح طریقے سے ہو۔ درگاہ شریف میں ایک عجیب عالم تھا، ایسا بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ ہم اپنے وطن میں نہیں ہیں۔ بداہوں میں جس طرح لوگ ہم سے تعزیت کرتے، ہمیں سنبھالتے، ہمارا خیال کرتے، بالکل اسی طرح لوگ ہم سے سلوک کر رہے تھے۔ ہر آدمی حضرت کو سنبھال رہا ہے، مجھے سنبھال رہا ہے، دعائیں کر رہا ہے حضرت پیر سید عبدالرحمن ہر ہر منٹ کی خبر لے رہے ہیں۔ وہاں سے لوٹتے ہی حضرت سیدھے حضور غوث پاک کی درگاہ کے اندر گئے اور جالی پکڑ کر صرف اتنا کہا کہ:

”آپ کا شکر ہے حضور، آپ نے میرے لڑکے کو گود لے لیا۔“ اور یہ کہہ کر چلے آئے۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ ”آج میں سمجھا کہ حضور غوث پاک کی نظر میں شیخ صاحب کا مقام مجھ سے بھی اعلیٰ ہے۔“ پھر اس کے بعد ضروری کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ حضور سیدنا غوث پاک، ان کے خانوادے اور ان کے خدام

کے احسانات تو ہم پر ہیں ہی۔ ان کے علاوہ یہاں میں ایک شخصیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے ہم پر بہت احسانات کیے، وہ ہیں محترم عبدالحمین سبحانی۔ یہ ہندوستان کے ہی رہنے والے ہیں، مگر انھوں نے جامعہ صدام (بغداد) سے تعلیم حاصل کی اور اب تجارت کی غرض سے وہیں مقیم ہیں۔ انھیں جب خبر ہوئی تو شام کو ہی وہ درگاہ مصلیٰ پہنچ گئے اور آنے سے پہلے ہی ہندوستانی سفارت خانے کو فون کر دیا اور حادثے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ آپ فوراً اس پر ایکشن لیجیے، یہ ہندوستان کے بہت معزز ترین لوگ ہیں۔ سفارت خانے سے موصوف کے اچھے تعلقات تھے، اس لیے ہندوستانی سفیر مسٹر ریڈی کا میرے پاس فون آیا، انھوں نے تفصیل معلوم کی اور کہا کہ ”میں کہیں باہر جا رہا ہوں، اس لیے اپنے سیکریٹری مسٹر اشوک کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں، آپ بالکل فکر نہ کریں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس طرح کے حادثے میں تعیش ملنے میں وقت لگ جاتا ہے، اس لیے آپ اس کے لیے تیار رہیں، مگر ہم پوری کوشش کریں گے کہ بہت جلد آپ کو نعش مل جائے۔“ میں نے ان سے پوچھا کہ کتنا وقت لگے گا؟ تو انھوں نے بتایا کہ کم سے کم ایک ہفتہ اور زیادہ سے زیادہ تین ماہ۔ یہ سن کر ہم پریشان ہو گئے۔ وہاں کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کے وزرا سے تعلقات ہیں، آپ ہندوستان میں کسی فٹنری کو فون کیجیے، میں نے کہا کہ بچپن سے اب تک یہی سنتے اور پڑھتے چلے آئے ہیں کہ:

کیوں ساکن بغدادی، ہو غیر سے فریادی
مگلتے شہ جیلاں کے ہوتے نہیں ہرجائی
اور اب وقت پڑا تو در بدر دوسروں کے دروازے کھٹکتا میں؟ یہ کام حضور غوث پاک کے حوالے ہے، انہی کی سر زمین میں ہیں، وہ ان شاء اللہ مایوس نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں سبحانی صاحب نے بہت اہم رول ادا کیا، رات دیر تک بیٹھے، صبح جب سفیر کا سیکریٹری آیا تو ان کے ساتھ آئے، ہر جگہ انہوں نے ہماری ترجمانی کی، ہمارے ساتھ رہے، دوڑ دوپ کرتے رہے، ان کی وجہ سے بہت ہمت رہی۔

ان کے علاوہ حضور غوث پاک کا پورا خانوادہ اور خدام اس کام میں لگ گئے، ان سبھوں کی کوششوں سے ہمارے شیخ صاحب کی نعش ہمیں بہت جلد ۶ مارچ کو دودھ پھر تک مل گئی۔ شیخ صاحب کی میت کو لے کر ہم درگاہ شریف آ گئے، درگاہ میں صاحب سجادہ حضرت پیر سید عبد

الرحمن گیلانی صاحب کی سخت ہدایت تھی کہ تدفین کے تعلق سے جیسا شیخ سالم چاہیں، ویسا ہی کرو۔

خوشنورمانی: شیخ صاحب کی تدفین کے حوالے سے کچھ بتائیں؟ حضور غوث اعظم کے جوار میں جگہ کیسے ملی؟

مولانا صلیب قادری: خوشنور صاحب! ایسا نہیں ہے کہ ہم لوگوں نے صاحب سجادہ حضرت پیر سید عبدالرحمن گیلانی سے وہاں تدفین کے لیے گزارش کی، بلکہ ہمارے حضرت والد ماجد نے جیسے ہی انھیں اس حادثے کی اطلاع دی، پیر صاحب نے فرمایا کہ ”تم فکر مت کرو، ہم ان کی آخری آرام گاہ اپنے خاندان کے مخصوص قبرستان میں بنائیں گے۔“ ہمیں تو وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور غوث پاک کے آستانے کے احاطے کے اندر جس قبرستان میں خانوادے کے شہزادے، متولیان اور سجادگان ہی مدفون ہیں وہاں شیخ صاحب کی آخری آرام گاہ بنے گی۔ اتنا بڑا اعزاز صرف انہی کے حصے میں آیا۔

درگاہ شریف میں میت کو غسل دینے کا کمرہ ہے، وہاں شیخ صاحب کو غسل دیا گیا، بڑا انورانی چہرہ تھا، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ انھیں گولی لگی ہے، بس ایسا لگ رہا تھا کہ گہری نیند سو رہے ہیں اور ابھی اٹھاؤ گے تو اٹھ جائیں گے۔ ۵۵ گھنٹے نقش رطبخ جبر میں رکھی رہی، مگر اس کے باوجود جب غسل دے رہے تھے تو جسم بالکل تر و تازہ لگ رہا تھا۔ غسل کے بعد جنازے کو تیار کیا گیا، حضور غوث پاک کی درگاہ کا خادم مخصوص عطر لے کر آیا جو عطر حضور غوث پاک کے مزار شریف پر لگایا جاتا ہے وہ ان کو لگایا گیا۔ اتفاق سے حیدرآباد سے کچھ لوگ زیارت کے لیے آئے ہوئے تھے، ان میں مولانا سید شفیع پاشا قادری حیدرآبادی برادر سجادہ حضرت لاابالی، کرنول اور بہت سے احباب اس موقع پر موجود تھے۔

پھر جنازہ لا کر اس مقام پر رکھ دیا گیا جہاں رکھ کر جنازے کی نماز پڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت حضرت تاج دار اہل سنت نے درگاہ کے خادم سے فرمایا کہ ”میں یہ چاہتا ہوں کہ جب نماز ہو جائے اور ہم تدفین کے لیے جائیں تو اسید الحق کا جنازہ غوث اعظم کے قدموں میں پائنتی لے جا کر رکھ دوں۔“ یہ سن کر وہ گھبرا گئے، کیوں کہ وہاں ایسا ہوتا ہی نہیں ہے اور آج تک کسی صاحب سجادہ کے جنازے کو بھی اندر نہیں لے جایا گیا۔ خادم نے کہا کہ یہ اس کے اختیار سے باہر کا معاملہ ہے، پھر یہ بات حضرت نے درگاہ کے منیجر سے کہی تو انھوں نے فوراً جواب دیا کہ

”آپ جیسا چاہتے ہیں، کریں، آپ کو کسی چیز کے لیے منع نہیں ہے۔“ اس کے لیے ہمیں خاص ہدایتیں دی گئی ہیں۔

۶ مارچ ۲۰۱۳ء کو حضور تاج دار اہل سنت نے عصر کے بعد درگاہ شریف میں شیخ صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی۔ جنازے میں بغداد کے علماء، مشائخ، درگاہ شریف کے سارے خدام، خانوادے کے شہزادگان اور سیکڑوں حاضرین موجود تھے۔ جنازہ تیار کرنے سے پہلے ایسا لگ رہا تھا کہ ایک میت ہمارے ساتھ ہے، مگر جب جنازہ تیار کر کے نماز پڑھنے کے لیے لائے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی دولہا کو لے کر جا رہے ہیں اور ہمارے بدایوں میں ایک رواج یہ بھی ہے کہ دولہا بنانے کے بعد دو رکعات شکرانے کی نفل مسجد میں لے جا کر پڑھائی جاتی ہے اور اس کے بعد بارات روانہ ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا۔ نماز جنازہ کے بعد جنازہ اٹھا کر پائنتی کی طرف سے ہم لوگ درگاہ شریف کے اندر داخل ہوئے، اس وقت درگاہ سے سب کو باہر نکال دیا گیا، اس کے بعد شیخ صاحب کو حضور غوث پاک کے قدموں میں لے جا کر رکھا گیا اور پھر سلام پڑھا گیا:

میرے پیران پیر سلام علیک
اے میرے دستگیر سلام علیک

پھر وہاں سے اٹھا کر دوسرے دروازے سے باہر لے گئے اور پھر قبرستان کی طرف آئے، قبرستان درگاہ کے احاطے میں ہے اور حضور غوث پاک کے گنبد کے بالکل پیچھے ہے۔ گنبد اور قبرستان کے درمیان صرف ایک دیوار کا فاصلہ ہے۔ قبرستان میں جنازہ رکھا گیا، قبر تیار تھی میں قبر میں اترا اور میرے ساتھ قبرستان کا خادم بھی قبر میں اترا، ہم لوگوں نے شیخ صاحب کو قبر میں رکھا۔ اس موقع پر حضرت نے فرمایا کہ شجرہ نہیں ہے، ورنہ اسے قبر میں رکھ دیا جاتا، اس پر میں نے کہا کہ:

”شجرہ میں بتیں صفے ہیں اور یہ دس قدم کی دوری پر ہے، بتیں صفوں کی کیا زحمت کریں گے؟ دس قدم پہنچ ہی موجود ہیں، ان کے قدم کا سایہ ہے، جب سورج نکلتا ہے تو گنبد کا سایہ شیخ صاحب کی قبر پر پڑتا ہے۔“ خیر جنازہ قبر میں اتارا گیا اور مٹی وغیرہ دی گئی پھر اس کے بعد فاتحہ ہوئی، تلقین ہوئی، اور سورہ النہین وغیرہ پڑھی گئی جو وہاں کا معمول ہے۔ اور حضرت پیر سید ابراہیم الگیلانی رضی اللہ عنہ کے مزار پر جو چادر پچھلے ایک سال سے تھی، اسے اتار کر خادم نے دی اور وہ شیخ صاحب کی

قبر پر ڈالی گئی۔

یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ آپ کے جنازے پر وہاں کے علماء مشائخ سے ملاقات ہوئی تو وہ حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ شیخ صاحب کو یہاں کیسے جگہ ملی گئی! وہاں کے مشائخ تمنا کرتے ہیں کہ یہاں دفن کے لیے جگہ مل جائے مگر انھیں نہیں ملتی۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ شہید نہیں بھی ہوتے تو ان کے لیے اس مٹی میں دفن ہونا کافی ہوتا۔

اب میں یہاں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب کو مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں، زندگی میں ان کو ان کے کارناموں کی وجہ سے شیخ صاحب کو ہر لقب مل چکا تھا۔ وہ مدرسے میں پڑھاتے تھے، اس لیے مدرس تھے، وہ کتابیں لکھتے تھے، اس لیے مصنف تھے، وہ بے مثل خطاب کرتے تھے، اس لیے خطیب تھے، وہ یہاں ہمیشہ نماز پڑھاتے تھے، اس لیے امام تھے، وہ پرہیزگار اور دین دار تھے ماس لیے مفتی تھے، حدیث اور تفسیر پر ان کی گہری نظر تھی، اس لیے محدث اور مفسر تھے۔ اسی طرح وہ حافظ تھے، قاری تھے، شاعر تھے، متکلم تھے اور مفتی تھے۔ بس ایک لقب باقی رہ گیا تھا، شہادت سے سرفراز ہو کر وہ شہید بھی ہو گئے۔

خوشنورمانی: کیا شہید بغداد پر ہونے والا یہ جملہ منصوبہ بند تھا؟

مولانا صلیب قادری: مجھے نہیں لگتا کہ یہ حملہ کسی خاص پلاننگ کے تحت ہونے والا حملہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ ایسے سانحے عراق میں ہر دن پیش آتے رہتے ہیں، خود اسی شام کا واقعہ ہے کہ ایک پولس چوکی پر حملہ کر کے دہشت گردوں نے ۹ پولس والوں کو شہید کر دیا۔ معاملہ یہ ہے کہ عالم اسلام کے دیگر ممالک کی طرح مسلکی منافرت وہاں بھی اپنی انتہا پر ہے اور حکومتی نظام مستحکم نہ ہونے کے سبب یہ مسلکی منافرت وہاں نل و غارت کی صورت اختیار کر گئی ہے، بلکہ بعض دفعہ اس طرح کے حادثات میں کہیں نہ کہیں پولس کی سازش بھی شامل ہوتی ہے۔ خود اس سانحے کے حوالے سے ہمارے بعض احباب کو اس کا جوش ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے اندازے کے مطابق شیخ صاحب کو جان بوجھ کر نشانہ نہیں بنایا گیا ہے، حقیقت کیا ہے یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ویسے اس معاملے کو ریکرڈ کر کیا فائدہ؟ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ بس دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ عالم اسلام پر خاص فضل و کرم فرمائے اور مسلمانوں کو تدبیر، حلم، بصیرت اور شعور عطا کرے اور انھیں پر اس زندگی کی توفیق بخشے۔

خوشنورمانی: ان کی شہادت سے خصوصاً خانقاہ قادریہ اور عموماً اہل

سنت و جماعت کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ یہ بہت ہی صبراً آزما اور مشکل گھڑی ہے۔ آپ سے ان کو بڑی محبت اور توقعات تھیں، ہم جاننا چاہیں گے کہ خانقاہ قادریہ کی تشکیل نو کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا، وہ کس طرح مکمل ہوگا اور آپ کے عزائم کیا ہیں؟

مولانا صلیب قادری: دیکھیے! یہ وقت تو ایسا نہیں ہے کہ میں کچھ بیان کروں؟ اس صدمے سے ابھی ہم سب ابھر نہیں پائے ہیں، آپ کی بھی ابھی یہی حالت ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ہماری خانقاہ یا ہم لوگوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم اپنے بل بوتے پر کھڑے ہیں، ہم نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم اللہ کے فضل، حضور شمس مارہرہ اور حضور غوث اعظم کے بل بوتے پر ہیں۔ شیخ صاحب اکثر یہ شعر انہی دونوں بزرگوں کی طرف اشارہ کر کے پڑھا کرتے تھے:

پورے قد سے جو کھڑا ہوں یہ عنایت ہے تری
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا
حضور غوث اعظم اور حضور شمس مارہرہ کی نظر اور عنایت رہیں گی
تو ان شاء اللہ شیخ صاحب کا چھوڑا ہوا مشن جاری رہے گا۔

رہا میرا معاملہ تو میں خاک کا ایک ذرہ ہوں اور وہ ایک درخشاں و تابندہ علم کا سورج تھے، مگر جو بھی خانقاہ کے عزائم اور اس کا مشن ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ رکے گا نہیں۔ خواہ وہ تعینف و تالیف کا ہو یا تحقیق و اشاعت کا یا پھر تعمیر و تشکیل کا۔ شیخ صاحب نے ایک اچھی ٹیم بنائی ہے، وہ ٹیم یہاں موجود ہے۔ میں اسی ٹیم کا حصہ ہوں، ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

شیخ صاحب کی کمی تو ہم پوری نہیں کر سکتے، مگر ہمارے اکابر اور مرشدان مارہرہ کی نگاہ رہی، جیسا کہ ہمیشہ رہی ہے تو یہ مرحلہ شوق بھی طے ہوتا رہے گا۔ آپ خود کہتے ہیں کہ شیخ صاحب ایک شخصیت نہیں، بلکہ تحریک تھے، ان شاء اللہ وہ تحریک زندہ رہے گی۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہر سال ہم بغداد شریف جاتے ہیں تو غوث پاک کے لیے چادر لے جاتے ہیں، مگر ہم اپنے شیخ صاحب کے لیے ہر سال کم از کم دس کتابیں لے جایا کریں گے۔ وہ ہم دفن کے شہدائی تھے اور انہی عنفرت رفتہ کی بازیابی کے خواہاں تھے، یقیناً ان کی روح اس سے خوش ہوگی۔

خوشنورمانی: آپ کا بے حد شکریہ۔
□□□

مجلس فقہ و تصوف کا شہر یار وہی

اُذن ہو کر تو میں اک قصہ جاں کا دکھوں
دل غمناک سے اُٹھتی ہوئی اک آہ لکھوں

درو سے خامہ و احساس بھی چور ہوئے
پردہ عام پہ اک نقش ابھی اُبھرا تھا
اک کلی ایسی کھلی اپنے شجر سے تو سہی
اُس کے انوار برستے رہے ساون بھادوں
وہ کوئی اور نہیں، میرا اُسید الحق تھا
وہ محدث بھی تھا، حافظ بھی، مفسر بھی تھا
نازش شعر و ادب، بزم کی رونق بھی تھا
جو دلی عہد و دلی زادہ و معمار بھی تھا
جو مرکز و محبلی و مصطفیٰ بھی تھا
محفل علم و عمل میں تھا ضیا بار وہی
اُس کی تحریر سے باطل کو پسینہ آجائے
اہل سنت و جماعت کی اُسے جاں کہیے
رہ گیا کون کہ دم خم ہو، اثر ہو جس میں
ہائے افسوس جماعت میں وہ ہل چل نہ رہی
ایسے بے لوث، خدا ترس جیالے نہ رہے
کل جماعت کا جو تھا سب سے گراں سرمایہ
ہم سے بے نور چراغوں کا تو اب کیا ہوگا!
پچھڑے محمود کو کیا چاہیے، بس اُس کا ایاز

غوثِ اعظم ہمنے بے سروساماں مدد سے

قبلہ دیں مددے کعبہ ایماں مدد سے

محمد افروز قادری چریا کوٹی

دلاس یونیورسٹی، کیپ ٹاؤن (افریقہ)

(۲)

نالہ درد

صف ماتم ہے بھی، ہائے وہ کیا دور ہوئے
بڑا دل کش، بڑا کُف، بڑا اُجلا تھا
مسکرا بھی نہ سکی ہائے کہ مرجھا ہی گئی
اُس کی خوش بوئیں مہکتی رہیں ملکوں ملکوں
علم و حکمت کی ہر اک شاخ پہ اُس کا حق تھا
وہ مدرس بھی، مصنف بھی، مدیر بھی تھا
ناقد باصر و ممتاز محقق بھی تھا
اہل سنت کا وہ اک قافلہ سالار بھی تھا
پیکر خلقِ حسین، حامل تقویٰ بھی تھا
مجلس فقہ و تصوف کا شہر یار وہی
اُس کی تقریر سے بے ڈھنگوں کو جینا آجائے
ہاں، اُسے کشتی ملت کا نگہاں کہیے
خضر راہی جماعت کا ہنر ہو جس میں
جس سے نسلوں کو ضیاء ملتی وہ مشعل نہ رہی
ظلمتیں چھانٹ کے رکھ دیں وہ اُجالے نہ رہے
اے مرے غوث اُسے آپ نے بھی اپنایا
بخت کے مارے بے چاروں کا بھلا کیا ہوگا!
ملتمس ہم بھی ہیں یوں آپ سے صد عجز و نیاز

نالیہ درد

عالم ربانی کی شہادت پر اہل خانہ کے کلمات رنج و غم

شہید بغداد، عالم ربانی مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک شہادت سے ملک و بیرون ملک ارباب علم و فکر اور اصحاب شریعت و طریقت کی مجلسوں میں ماتم کا سماں بندھ گیا۔ خانقاہ قادریہ بدایوں اور دفتر ماہنامہ جام نور بدلی میں ہر طرف سے تعزیتی فون، ای میل، ایس ایم ایس اور خطوط آنے لگے، ان میں سے مشائخ کی چند منتخب تحریریں یہاں حاضر کی جاتی ہیں۔ (ادارہ)

دنیائے سنیت کا ایک بڑا محقق ہمارے درمیان سے چلا گیا

امین ملت پروفیسر محمد امین میاں قادری برکاتی

سجادہ نشین: خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ، ایٹھ (یوپی)
۴ مارچ ۲۰۱۳ء یہ ایسی تاریخ ہے جو تاریخ یاد رہے گی۔ میں اپنے چیک اپ کے لیے دہلی میں تھا۔ شام کو عزیزم احمد حقانی صدیقی کا فون علی گڑھ سے آیا، وہ بہت شدت سے رو رہے تھے، بمشکل انہوں نے یہ اطلاع دی کہ بغداد شریف کے پاس ”بھیا“ دہشت گردوں کا شکار ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ اسید میاں بخیر ہیں؟ تو احمد نے بتایا کہ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ مجھے دہلی میں رات گزارنا مشکل ہو گیا، مختلف محکمات سے فون کر کے اسید میاں کے بارے میں معلوم کرتا اور دعا کرتا جاتا تھا کہ سامنے سے جواب آجائے کہ اسید میاں زخمی ہیں اور ایک آدھ ہفتے میں صحت یاب ہو جائیں گے، مگر افسوس کہ ہر جگہ سے شہادت کی ہی اطلاع ملی۔ سارے منظر آکھوں کے سامنے گھومنے لگے، جب بھی ملاقات ہوتی تو فوراً قدم بوسی کے لیے جھک جاتے، میں باہیں پکڑ کر اٹھاتا اور اپنی کبیدگی کا اظہار کرتا تو جواب ملتا کہ حضرت ہمارے موروثی حق سے محروم نہ کریں۔
شمس مارہرہ سیدنا ابوالفضل شمس الدین آل احمد اچھے میاں قدس سرہ العزیز کے بہت چہیتے خلیفہ حضرت شاہ عین الحق مولانا عبد المجید قادری برکاتی آل احمدی کے باغ کے شگفتہ پھول اس راہ پر چل دیے جس پر آگے پیچھے سب کو جانا ہے۔ فارسی والا خوب کہہ گیا:

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

حضرت مولانا عبد الغنی علیہ الرحمہ سے مولانا عین الحق عبد المجید علیہ الرحمہ نے فرمایا ”ہمیں ایک مرشد کامل سے بیعت ہونا ہے“ مولانا عبد الغنی صاحب، حضور اچھے میاں کے مرید و خلیفہ تھے، انہوں نے کہا چلو ہم اپنے پیرو مرشد سے ملا لیں۔ دونوں مارہرہ مطہرہ حاضر ہوئے، کچھ دیر قیام کیا، مولانا عبد الغنی علیہ الرحمہ نے پوچھا کہ بتائیے آپ کا کیا ارادہ ہے؟ مولانا عین الحق عبد المجید بدایوں نے کہا ”صاحب یہاں بھی اونچی دکان اور پھیکا پکوان ہے۔ ہمیں اب مرید نہیں ہونا۔“ رات کو سرکار غوث اعظم کی زیارت ہوئی، سرکار نے مولانا عبد المجید کا ہاتھ پکڑ کے شمس مارہرہ کے ہاتھ میں دے دیا، اب تو حضرت کا یہ عالم تھا کہ جلد از جلد مرشد سے ملاقات ہو۔ خیر ملاقات ہوئی تو سرکار اچھے میاں نے فرمایا کہ مولوی صاحب ہمارے پاس کیا رکھا ہے، یہاں تو اونچی دکان پھیکا پکوان ہے۔ مولانا عبد المجید صاحب حضور اچھے میاں سے لپٹ گئے، مرید کر کے خداوند عطا فرمائی اب تو یہ حال کہ مولانا، مرشد برحق کے قدموں سے دور جان گوارا نہیں کر رہے ہیں۔ مرشد حکم دیتے کہ تم پر بیوی کے حقوق بھی ہیں، چاہو مہینہ الاولیاء بدایوں شریف۔ چند روز بعد حضور اچھے میاں دیکھتے ہیں کہ مولانا بدایوں سے واپس آ گئے اور قدم بوسی کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے اور وہاں بہا کا پہلا رد تحریری طور پر انہوں نے ہی کیا ہے۔ ان کے

فرزند حضور تاج الفخوس مولانا شاہ عبد القادر بدایونی علیہ الرحمہ جن سے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے نہایت عقیدت مندانہ تعلقات تھے، انہوں نے دیوبندیوں اور اس دور کے فتنے ”ندوہ“ کا زوردار رد کیا۔ والد ماجد حضور احسن العلماء نے بہت سے واقعات بتائے جو میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ فاضل بریلوی اپنے مشہور قصیدے میں لکھتے ہیں:

ندوی گھبراتے ہیں کہ دو ہی تو ہیں اسد احمد رضا محبت رسول

اور وہ مشہور شعر:

میں بھی دیکھوں جو تو نے دیکھا ہے روز سخی صفا محبت رسول

حضرت مولانا شاہ عبدالمقتدر علیہ الرحمہ میرے مرشد تاج العلماء سید شاہ اولاد رسول محمد میاں علیہ الرحمہ کے استاذ معظم تھے۔ اسید میاں اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، خاندانی علم، خولجہ علم فن حضرت خولجہ مظفر حسین کی شاگردی اور از ہر شریف کا قیام، گویا سونے پہ سہاگ۔

ان کی میت، اسپتال سے دو دن بعد ملی اور ان کو سرکار غوث اعظم کے خاندانی قبرستان میں جگہ ملی اور وہ بھی اس جگہ جہاں کئی دن پہلے اسید میاں فاتح خوانی کر رہے تھے۔ ہم چاروں بھائی ایک ساتھ کہیں نہیں جاتے، مگر یہاں یہ معاملہ تھا کہ اس شخص سے تعزیت کرنے کے لیے بدایوں شریف ہم سب کو جانا ہے اور اس شخص کو سلی دینا ہے جو ایک دن قبل دنیا کا بہت بڑا وزن اپنے کاندھوں پر رکھ کر آخری منزل پہنچ چکا ہے۔ واقعی جوان بیٹے کا جنازہ بوڑھے باپ کے کاندھوں پر دنیا کا سب سے بڑا بوجھ ہے، برادر بھائی برابر سید محمد اشرف، سید محمد فضل، سید نجیب حیدر بر خوردار سید محمد امان، سید محمد عثمان، سید حسن حیدر، مولوی محمد، حضرت سالم میاں صاحب کے گھر پہنچے۔ واقعی سالم میاں صاحب صبر و استقامت کا پہاڑ بنے ہوئے اس غم کو اندر ہی اندر پی رہے تھے۔ سالم میاں صاحب کو ہم سب کے جانے سے بڑی ہمت ملی، لیکن یہ غم تو وہ ہے جو ساری عمر بھدیا نہیں جاسکتا۔

وے صورتیں الٹی کس ویس بستیاں ہیں اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

دنیاے سنیت کا ایک بڑا محقق، مصنف، نقاد، مؤلف ہمارے درمیان سے چلا گیا:

میت ہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یہ میرے دلی تاثرات ہیں جو فی البدیہہ تحریر کیے ہیں، اللہ تعالیٰ پورے خاندان کو صبر جمیل کا مل عطا فرمائے، اسید میاں کی والدہ ماجدہ اور بیگم (جو ہماری بیٹی بھی ہیں) عطیف میاں، عزم میاں کو وہ قوت عطا فرمائے جو اس کی شان کے مطابق ہو:

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اللہ بس باقی ہوں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

□□□

خانقاہ برکاتیہ اپنے چہیتے اور روحانی فرزند سے محروم ہو گئی

رفیق ملت حضرت سید نجیب حیدروری

سجادہ نشین: مسند نوزیہ، خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ، ایٹھ (یوپی)

میں کیا لکھوں اور کیسے لکھوں سمجھ کام نہیں کر رہی، بس آنکھوں میں اسید میاں کی تصویر گھوم رہی ہے، ان کا مسکراتا ہوا با ادب چہرہ میرے خیالوں میں ہے، پہلے میں انہیں ”بھیا“ ہی کہتا تھا لیکن ملاقاتوں کے بعد دل چاہا کہ شیخ صاحب ہی پکاروں کیونکہ یہ لفظ ان پر چلتا تھا اور وہ اس کے اہل بھی تھے۔ ہم سے محبت کرتے اور ہمارے اپنے بچوں کی طرح ہماری عزت بھی۔ کبھی بھی کوئی کام ہم نے شیخ صاحب سے کہا یا احمد میاں کے ذریعہ کہلایا تو منع کا تو کوئی سوال ہی نہیں بس فوراً بیک کہتے ہوئے نظر آتے۔ ان کی شہادت نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا، اب لگا کہ کوئی زلزلہ سا

آگیا۔ نہ دل یہ بات تسلیم کرتا تھا نہ دماغ کہ کل تک ہنسنے، بولنے، کہنا ماننے والا شریف النفس عالم دین اور ماہرہ کا چہنچہنے والا ہمیں چھوڑ کر اس طرح اچانک چر جائے گا۔

میری ان سے ملاقاتیں تو بہت نہیں ہوئیں لیکن پتا نہیں کیوں ان سے بہت محبت ہو گئی تھی جس کا احساس ان کے وصال کے بعد ہوا، میں ابھی اچانک بیٹھے بیٹھے آبدیدہ ہو جاتا ہوں کہ کیسے کام کا آدمی ہم نے گنوا دیا، اللہ کے حکم کے آگے چہرہ نہیں لیکن دل ہے کہ اس کو قرار نہیں مانتا ہے جب بھی میں بدایوں شریف حاضر ہوتا تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا تھا، اپنے آپ کی کرسی پر مجھے ہٹا کر اپنے مدرسے کے بچوں کو لائسنس میں لگوا کر ان سے مصافحہ کروا دیتے اور دور کھڑے مسکراتے رہتے۔ ماہرہ آتے تو ۲۲ گھنٹے کے لیے ہوائی کھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آتے بلکہ باقاعدہ دودن قیام کرتے، عطیف میاں بھی ساتھ ہوتے۔ ان کے سپہاؤں کے گھر کا کمرہ مخصوص تھا، ان کے قیام ماہرہ میں میں نے ہمیشہ ان کو بہت خوش دیکھا ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہوں۔ آخری ملاقات عرس قاسمی پر ہوئی تھی میں عزیز بی احمد میاں کے ہمراہ شیخ المشائخ سید محمد توفیق الگیلانی کے استقبال کے لیے بیرون ماہرہ حاضر ہوا، اور وہ شیخ المشائخ کے ہمراہ آئے میں نے محسوس کیا مجھے وہاں استقبال میں دیکھ کر وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ درخوش بھی۔ اسید میاں خاندان عثمانیہ کے چشم و چراغ بھی تھے اور ہرے خاندان کے بے حد لاڈلے اور چہیتے روحانی فرزند بھی تھے۔ وہ خانقاہ برکاتیہ کے ان چند تخلصین میں تھے جو قول و فعل سے برکاتی مشن کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ میں نے ان کو کئی مرتبہ خواب میں دیکھا اور ہر بار ایسا دیکھ کر کہہ دو کہیں نہ کہیں خانقاہ کی ہمدردی میں کھڑے ہیں۔ حضرت شیخ سالم میاں صاحب دامت برکاتہم کا یہ علم ہم سب بھائیوں نے ذاتی غم کی حیثیت سے دیا، میں نے اپنے برادر محترم سید محمد افضل میاں کی آنکھ میں بڑے بڑے گھریلو غموں میں بھی آنسو نہ دیکھے لیکن جب وہ بدایوں حاضر ہوئے تو حضرت سالم میاں صاحب سے مل کر وہ بھی آنسوؤں پہ قہقہہ پائے۔ شیخ صاحب غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے سچے عاشق تھے اسی لیے غوث اعظم نے اپنے رب سے نہیں اپنے شہر کے لیے مانگ لیا۔ باقی رہے نام اہل کا۔ ہم سب ان کی علمی، دینی، مذہبی اور روحانی خدمات کے کل بھی قائل تھے، آج بھی ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ شمس ماہرہ کی نگاہ کرم کل بھی خانقاہ قادریہ پر خاص تھی اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گی۔ امید ہے اسید میاں کے بعد عطیف میاں اور غلام میاں اس عثمانی قادری وراثت کو چرچا نہ لگائیں گے اور اپنے والد ماجد کو سرخرو کریں گے۔

میں دعا کرتا ہوں اللہ رب العزت بہ طفیل سید عالم ﷺ ہمارے عزیز روحانی بیٹے مولانا اسید الحق قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر اپنے نور کی تجلیاں فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو پورا فرمائے، حضرت شیخ سالم میاں صاحب اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کا مل عطا فرمائے، آمین۔

□□□

جماعت اہل سنت کا ایک ناقابل تلافی نقصان

مفتی محمد سعید الرحمن رشیدی

سجادہ نشین: خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور شریف (پوٹی) عزیز بی موسوی ابراہیم مصباحی سمدکی زبانی معلوم ہوا کہ عزیز گرامی مورانا اسید الحق قادری بدایونی عراق میں شہید کر دیے گئے۔ پل بھر کے لیے مجھے یقین نہیں ہوا، مگر قدرت الہی کے آگے کس کی چلی ہے؟

اذا جاء اجلهم لا يستقدمون ساعة ولا يستأخرون۔ (جب کسی کی موت آتی ہے تو نہ پل بھر پہلے آتی ہے اور نہ پل بھر دیر سے) مولانا اسید الحق غفر اللہ لہ نے جس جوش اور ولولے سے اپنے اکابر و اسلاف کی علمی و دینی خدمات کو منظر عام پہ لانے اور نوجوان علما کے اندر تحقیقی ذوق اور مزاج پیدا کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، وہ قابل رشک اور لائق صد تحسین تھا اور اہل علم و دانش کے نزدیک بھی ان کی قدرواہمیت

تھی اور ملی و مذہبی امور کی بہتر انجام دہی کے لیے مستقبل میں ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ چنانچہ مولانا کا جانا جہاں اہل خانہ اور احباب و متعقین کے لیے عظیم دکھ کا سبب ہے وہیں جماعت اہل سنت کا بھی ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، نیز یہ مقدم شکر ہے کہ وہ دنیا میں رہے تو انعام الہی کے ساتھ، دنیا سے گئے تو انعام الہی کے ساتھ اور دو گز زمیں پاکی بھی تو انعام الہی کے ساتھ:

اے اس وقت جس قدر سخت آزمائش میں ہیں، اس سے ٹکنا بڑا مشکل ہے، لیکن صبر و ضبط کے سہارے اس بحرِ غم کے موج پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے: فصبر جمیل واللہ المستعان۔ (صبر بہتر ہے اور اللہ ہی مددگار ہے) اللھم ھب لنا ولکم الصبر الجمیل۔ (مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

سنیت کا ناقابل تلافی نقصان

حضرت سید شاہ غفر الدین اشرف جیلانی

سجادہ نشین: آستانہ اشرفیہ، درگاہ کچھوچھو شریف بسکھاری، ضلع امبید کرنگر اخبار کے ذریعے معلوم ہوا کہ مولانا اسید الحق کو شہید کر دیا گیا، جس کا بے حد افسوس ہے۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ مولانا کے انتقال سے سنیت کا ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجے کو بلند کرے اور پسماندگان کو صبر و استقامت کی توفیق فرمائے۔ آمین۔ (مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

خانقاہ عارفیہ میں ماتم کا ماحول

شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی منوی

سجادہ نشین: خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (پوٹی) شہید بغداد مولانا اسید الحق عاصم قادری میرے دل سے قریب تھے۔ موجودہ علما میں جن کو میں بہت زیادہ پسند کرتا تھا، ان میں وہ ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اللہ کے فیصلے پر مجال دم زدوں نہیں، لیکن بشری تقاضے کے سبب ان کے جانے کا بڑا افسوس رہا۔ ان سے مجھے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ میں نے ان کے اندر علمی گہرائی کے ساتھ ادب اور تقویٰ بھی پایا۔ مولانا مرحوم و مغفور ہری خانقاہ میں کئی بار تشریف لائے چکے تھے۔ مجھے ان کی تحریر بھی پسند تھی اور تقریر بھی، ان کا ظاہری حسن بھی مجھے پسند تھا اور ان کے باطنی کمالات بھی قابل تحسین تھے۔ میں نے انہیں قال و حال کا جامع پایا جو موجودہ علما میں عام طور پر مفقود نظر آتا ہے۔

فقیر سے ملاقات کے دوران موصوف نے کئی بار اس کا اظہار کیا تھا کہ کئی الجھنیں ایسی ہیں جن کا ازالہ تحقیق و مطالعے سے اب ممکن نظر نہیں آتا، ان کے لیے فقط دعائیں درکار ہیں۔ میں ان کے لیے آں موصوف سے ذاتی ملاقات چاہتا تھا، لیکن افسوس کہ اس کے لیے موقع نہیں مل سکا اور آئندہ ملنا ناممکن ہو گیا۔ مولانا اسید الحق قادری فقیر سے بڑی محبت فرمایا کرتے تھے۔ بڑے ادب اور سلیقے سے ملتے۔ ان کی دعوت پر بدایوں بھی حاضر ہوا اور ان کے حسن نظم و ضبط کو دیکھ کر ان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ سال گزشتہ شمس ماہ ہرہ حضرت اچھے میاں ماہرہ کی کا دو سو سالہ جشن منایا تو اس میں بھی فقیر کو مدعو کیا تھا۔ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا تھا، لیکن میں اس قرض کی ادائیگی کے لیے اپنے طور پر خانقاہ

قادریہ میں حاضر ہونے کا جلد ہی ارادہ رکھتا تھا۔ اس سبب میں میں نے مولانا ذیشان مصباحی سے بھی گفتگو کی تھی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسے بس آرزو کہ خاک شدہ

مولانا سید الحق قادری شہید کے رائق و فائق قابل احترام والد بزرگوار حضرت شیخ عبدالحمید محمد سام قادری مدظلہ العالی اور ان کے صاحب زادگان میں خانہ اور مولانا شہید مرحوم کی اہلیہ پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹا ہے، اس کا ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔ اللہ کریم سے ان کے لیے صبر جمیل کے لیے دعا گو ہوں۔ ان کے لیے یہ پہلو صبر کا باعث ہوگا کہ مولانا نے اپنی مختصر زندگی میں وہ کام کر دیا جو دوسرے لوگ زندگی بھر میں کرتے ہیں۔ انھوں نے کام کے خطوط بھی متعین کر دیے ہیں، مجھے امید ہے کہ حضرت سالم میاں صاحب کے دیگر صاحبزادگان ان خطوط پر اپنا مشن جاری رکھیں گے۔ کہتے ہیں کہ صبر و شکر سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ مولانا سید الحق شہید کی زندگی خانوادہ عثمانیہ بدیوں کے لیے شکر کا عنوان تھی اور مولانا کی شہادت ان کے لیے صبر کا عنوان۔ مولانا سید الحق قادری سے خانقاہ عارفیہ کا دو طرفہ تعلق تھا۔ ان کی وفات سے خانقاہ میں ایک ماتم کا حوالہ بن گیا تھا۔ دوسرے دن ایصال ثواب کی محفل منعقد ہوئی جس میں جامعہ عارفیہ کے استاذ مولانا ضیاء الرحمن عیسیٰ نے خطاب کیا۔ یہ محفل آہ و بکا کی محفل میں تبدیل ہو گئی۔ فقیر کے ساتھ فقیر کے اہل خانہ اور فرزندوں کو بھی شدید غم لاحق ہوا۔ بڑے بیٹے عزیزم مودنا حسن سعید مصر سے بارہ فون کرتے رہے اور انھیں رنج و غم کرتے رہے۔ ان کا بطور خاص مولانا شہید سے بڑا گہرا قلبی تعلق تھا۔ حسن نے ایک دن مجھے فون پر بتایا کہ انیس حضرت طفیل احمد عیسیٰ صاحب کا یہ شعر بار بار یاد آ رہا ہے

کیسے بھولوں کہ اختیار نہیں پھر وہ بے اختیار یاد آیا

اس کے بعد بار بار میری زبان پر بھی یہ شعر آیا، لیکن رضایہ قضا مومن کا شیوہ ہونا چاہیے اور ہر مومن کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہماری یہ زندگی عارضی ہے، ہماری اصل زندگی اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ مولانا شہید تیاری کے ساتھ دوسری دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں، ہمیں بھی بلاتا خیر پٹی تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ حضرت سالم میاں صاحب قبلہ اور ان کے اہل خانہ کی تعزیت کے لیے دل پریشان رہا۔ بغداد سے ان کے آنے کے بعد سوچا کہ چند دن گزر جائیں تب حاضر ہوتے ہیں۔ اساتذہ جامعہ عارفیہ کے ساتھ ۱۸ مارچ کو سفر کی تیاری بھی شروع ہو گئی تھی، پھر اچانک بعض ناگزیر مصروفیات کے سبب رک گیا۔ ان شاء اللہ عرس چہلم میں ۱۲ اپریل ۲۰۱۴ء کو حاضر ہوں گا۔ آخر میں پھر مولانا شہید کی مغفرت اور رفع درجات اور ان کے اہل خانہ کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہوں۔

□□□

ایک بے مثال عالم دین کے جانے سے ساری دنیا سوگوار

حضرت شامہ عقیلین میاں قادری مجددی

سجادہ نشین: خانقاہ شرافت، بریلی (یوپی)

حضرت علامہ اسید الحق شیخ صاحب ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں جن کو اللہ رب العزت نے ہر نعمت عظمیٰ سے نوازا تھا۔ حسب نسب، عزت، عظمت، بصیرت، خداداد لیاقت و سعادت، کیا ہے جس سے علامہ کا دامن خالی ہو؟ وہی شہادت وہ بھی ایک ایسی شے ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں انعام یافتگان کی فہرست میں نمایاں ہے اور شہادت بھی ایسی شے ہے جس کا ذکر صاحب کے مورث اعلیٰ سیدنا عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اتباع و سنت کے تحت ہوا بیویوں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں ہوئی۔ شیخ صاحب نسبت قادریہ سے کامل طور پر معمور تھے جیسی تو

بچتی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مدم سید الحق شیخ صاحب علیہ الرحمہ کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو بھی صرف بغداد مقدس میں موت ہی ان کی فضیلت کے لیے کافی تھی۔ چہ

جائے کہ مدفن احاطہ غوث الثقلین میں دائمی قربت کی سند لیے ہوئے ہے۔ اہل سنت ان کی موت پر اگر رشک کریں بجائے اور زیب دیتا ہے۔ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو دار فانی سے جاتے جاتے بھی اپنے پاس بلایا اور جالیوں تک قریب کر کے تجلیات ربانی کی جو بارش آپ کے روضہ اقدس پر ہو رہی ہے اس میں شرابور فرما دیا۔ شیخ صاحب نے کم عمری میں وہ کر دکھایا جس سے اہل سنت کے دل باغ باغ، اور حاسدین کے کلیجے داغدار ہو گئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ علامہ کو علمی کاوشوں کا اجر عظیم عطا کرے، آمین۔ ان کے جاننے سے ساری دنیا سوگ منا رہی ہے اور رنج و غم کا اظہار کر رہی ہے۔ خدارحمہ کرے اس عالم پاکیزہ طینت پر۔ شیخ صاحب کی وفات اہل سنت و جماعت کے لیے حزن و ملال کا باعث ہے۔ رب کریم علامہ کے والدین ماجدین، برادران و دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرضی مولانا میں راضی رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم سب اہل آستانہ شرافتہ علامہ کے پس ماندگان کے غم میں شریک ہیں۔

□□□

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے ؟

مولانا جلال الدین عبدالعزیز فرنگی بکلی

۲۳ فرنگی محل لکھنؤ (یوپی)

اس حادثہ جانکاہ کی خبر اخبار سے معلوم ہوئی۔ کیا عرض کروں ”دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے“؟ اسید میاں کو تو شہادت کا مرتبہ حاصل ہوا اور جس متبرک جگہ ہیں اس کا کیا کہنا!

دن ہوں گے ترے کوچے میں خوشی ہے اس کی

آج اترائے ہوئے پھرتے ہیں مرنے والے

اللہ تعالیٰ ان کے طفیل میں ہم سب کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (مکتوب نام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

یہ ہول ناک خبر دل و دماغ پر بجلی بن کر گئی

پروفیسر سید ظہیر رضوی برقی

سجادہ نشین: خانقاہ نظامیہ، دانا پور، پٹنہ (بہار)

آہ صد آہ! اس ہولناک خبر نے دل و دماغ پر کیا بجلی گرائی کہ عزیز گرامی قدر، فاضل بے نظیر جوان اعلیٰ اسید الحق قادری اب ہمارے درمیان نہ رہے۔ واسف! کہ وہ اتنی قلیل عمر لے کے آئے تھے، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اس پیرانہ سالی میں آپ پر کیا گزری ہوگی، سوچ کے دل ٹوٹتا ہے۔ میں کن الفاظ میں آپ کو پرستہ دوں اور تعزیت کروں؟ رب تعالیٰ آپ کو صبر کی طاقت دے:

سر این کلتہ مگر شمع برآرد بڑاں ورنہ پروانہ ندارد بخن پروائے

۲۰۰۸ء میں حج میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، مدینہ طیبہ میں وہ کس والہانہ شہنشاہی سے ملتے تھے۔ آہ! اب یہ یادیں ہی یادیں رہیں، دست

بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

یہاں خانقاہ شریف میں بھی قرآن خوانی ہوئی اور فاتحہ و قل سے ایصال ثواب کیا گیا۔ میں گنہگار عمر کی آخری منزل میں ہوں، امراض کا شکار کمزور ہونا تو اس بمشکل لکھا پڑھا جاتا ہے۔ کہیں زیادہ آنا جانا بھی نہیں ہوتا۔ محترمی حضرت عبدالقیوم راجی صاحب کا بھی فون آیا تھا دل تھم کے باتیں

کر سکا۔ افسوس اللہ تعالیٰ مجھے مرحوم و مغفور کے چہلم شریف میں شرکت نصیب فرمائے، بصورت دیگر سراپا معذرت ہوں۔

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری / ۱۲ مارچ ۲۰۱۳ء)

□□□

دل اب بھی یقین کرنے پر آمادہ نہیں

مولانا شاہ احمد آیت اللہ قادری

سجادہ نشین: خانقاہ مجیبیہ، پھلواڑی شریف، پٹنہ (بہار)
حادثہ جانکاہ یعنی آجئباب کی معیت اور برادر اصغر عطیف میاں قادری و دیگر احباب کی شمولیت میں ہارگاہ غوثیت مآب رضی اللہ عنہ کی حاضری کے بعد حضرت شیخ محمد توفیق گیلانی سے ملاقات کی غرض سے جاتے ہوئے، اہل کردستان عراق میں ایک دہشت گردانہ حملے کی زد میں برادر شاہ اسید الحق عاصم قادری تغمد اللہ بغفرانہ و اعلیٰ درجاتہ کی شہادت کی اندوہناک خبر بذریعہ روزنامہ ”انقلاب“ معلوم ہوئی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اجرہ فی مصیبتی واخلف لی خیر امنھا

انتقال کی دلخراش و جگر سوز خبر سے قلبی صدمہ ہوا، ذہن و دماغ پر حزن و ملال کی ایک ناقابل بیان کیفیت چھا گئی۔ اب تک نہ جانے کتنی بار اس حادثہ جانکاہ کی خبر پڑھ چکا ہوں، مگر دل اب بھی یقین کرنے پر آمادہ نہیں کہ جو کچھ ہوا وہ واقعی ہو چکا ہے، مگر مشیت ایزدی اور قضا و قدر کے فیصلے پر سوائے یقین کرنے کے چارہ ہی کیا ہے۔ ہم مجبور بندے کیا کر سکتے ہیں۔ یہ تو ایسا اندوہناک صدمہ ہے جس کی غم انگیزی الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی، بس آنسوؤں کی دہلی ہوئی آہوں کے ساتھ ایک بار پھر بندگی و پیچرگی کا اقرار کرتے ہیں کہ بیشک ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں، اسی کی امانت ہیں اور منزل مقصود بھی وہی ہے، جانا وہیں ہے۔

شاہ اسید الحق صاحب کی ہمہ جہت شخصیت، قلیل مدت میں ان کے عظیم علمی و تحقیقی کارنامے، خانقاہ میں ان کی تشریف آوری، کچھ دیر خانقاہ میں قیام، ناچیز سے ملاقات، مزاج میں سادگی، اخلاق میں بندگی، اخلاص و ولایت، پھر تعلقات، مراسلت اور مکاتبت، یہ سب یادیں ذہن و دماغ میں گردش کر رہی تھیں اور قلب و روح کو متصفیٰ کیے ہوئے تھیں۔ بالآخر حال معلوم کرنے اور تعزیت کی سنت پر عمل کرنے کے لیے فون سے رابطہ کیا تو مولانا مجاہد صاحب نے آپ کے چھوٹے صاحبزادے سمد سے بات کرائی، فرط غم کی وجہ سے تعزیتی کلمات بھی زبان سے ادا نہیں ہو رہے تھے، بمشکل تمام چند الفاظ لرزتی زبان سے نکل پائے تھے جو ایسی گراں بار مصیبت کی تعزیت کے لیے کالمعدوم کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ برادر شاہ اسید الحق صاحب کی وفات کا غم ایسا شدید ہے جس کے لیے دنیا بھر کے تعزیتی کلمات ناکافی ہیں۔

جواں سال فرزند، پیکر علم و فضل، جن میں صلاحیت و صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوں، جو اپنے اسلاف کرام کے صوری و معنوی کمالات کی مکمل تصویر ہو، اس طرح دہشت گردانہ حملے میں ان کی شہادت آپ کے لیے کتنے غم و اندوہ، رنج و ملال اور قلق و اضطراب کا باعث ہوگا ہمیں اس کا بھٹی طرح اندازہ ہے۔

گر پیر نو سالہ بمیرد عجب نیست
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

مگر صبر و تسلیم و رضا روز اول سے ہی عظیم المرتبت ہستیوں کا شیوہ رہا ہے، اس غمزدہ ماحول میں آپ نے بھی صبر کے وسیع سرہانہ سے ضرور مدد لی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس پیرانہ سالی میں آپ کو یہ بار غم اٹھانے اور برداشت کرنے کی قوت و استقامت عطا فرمائے۔ انہیں اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اپنی بے پایاں رحمتوں سے سرفراز کرے اور پیرانہ سلاسل قادریہ کے ساتھ محشور فرمائے۔ آمین

شاہ اسید الحق تھاروٹن قادری کا چراغ
حسرتا آباد اجل سے ناگہاں وہ بجھ گیا

بارج دے کے جان کی، وہ شاہ جیلاں کا ہوا
راس اس کو آگئی بغداد کی آب و ہوا

۱۳۳۵ھ = ۶-۱۳۳۱

منکسر، خندہ جبین حفظ مدارج کا لحاظ
اپنے حسن خلق سے ہر دل میں وہ گھر کر گیا
تھافراق اس درسے اس کو کیسا آیت ناگوار
جا کے پائے نازش غوث الوری میں سو گیا
علم و دانش سے طبیعت کو تھا اک فطری لگاؤ
نکتہ رس تھا ذہن اس کا فہم تھا معنی رسا
روح پر اس کی رہے باران رحمت صبح و شام
مہبط انوار یا رب! اس کی تربت کو بنا

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

علم و ادب کا ایک پہاڑ مسمار ہو گیا

شیخ علی محمود ربی رفاعی شافعی

خطیب و امام: مسجد حضرت معروف کرخی، بغداد (عراق)

الحمد لله الذي لا يحمد على مكروه سواه والصلوة والسلام على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه اجمعين - قال تعالى ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون
اما بعد: فقد التقيت باخي الحبيب الصالح اسيد الحق قادري يوم الجمعة في مسجد قطب العارفين و امام الواصلين سيدى عبد القادر الجيلاني وعند ما رأيته وكأني اعرفه منذ زمن بعيد وذلك تصديقا لقول الحبيب المصطفى ﷺ (الارواح جنود مجنودة وما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف) رواه البخاري۔

زارنى مع اصحابه الى حضرة سيدنا معروف الكرخي قدس سره وقمنا بالزيارة وذكرنا الله تعالى وبعدھا زارنى فى بيتى واعطيتنى الاجازة لما رأيته اهلاً للعلم ومن اهل الصلاح والتقوى وجدته جلاً عالياً من العلم والادب وصاحب سلوك منهج قويم متادباً باداب اهل الطريقة لا سيما سيدنا ومولانا عبد القادر الجيلاني قدس سره و وجدته الشيخ اسيد الشهيد منور القلب والعقل۔

اسال الله تعالى ان يخلف على امة الحبيب ﷺ رجلاً و علماء مثل الشيخ اسيد الشهيد وان يلهم اياه الصالح الشيخ المربى الشيخ سالم الصبر والسلوان وان يجمعنا مع الشهيد فى مستقر الرحمة۔

وهيئنا لك يا اسيد الشهادة وهيئنا لك الدفن بقرب قطب العارفين عبد القادر الجيلاني قدس سره وهيئنا لك محبة الصالحين لك وداعاً ايها الشهيد وداعاً ايها العالم وداعاً ايها الصالح طبت حياً وميتاً
كتبه بقلمه و قاله بفمه

الشيخ على حمود الحربى الرفاعى الشافعى

الامام والخطيب بجامع سيدنا معروف الكرخي قدس سره، العراق (بغداد)

ترجمہ: تمام تعزیتیں اللہ کے لیے ہیں کہ اس کی وہ ذات ہے جس کی تکلیف کے وقت بھی حمد کی جاتی ہے اور ہمارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ

ات کی سہل اور تمام اصحاب پر درود و سلام نازل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انہیں ہرگز مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس انہیں رزق دیا جاتا ہے۔“ میں نے اپنے نیک اور محبوب بھائی اسید الحق قادری سے بردر جمعہ حضرت قصب العرفین ۱۰۰ م الواصیین شیخ عبد القدیر جیلانی کی مسجد میں ملاقات کی تھی، جس وقت میں نے ان کو دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ گویا میں انہیں عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ بالکل حضور ﷺ کے اس قول کے بہ مصداق: (دنیا میں آنے سے پہلے) روحوں کے جھنڈا لگ الگ تھے، تو جو وہاں پر ایک دوسرے کو پہچانتے تھے، یہاں بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور جو وہاں غیر تھے یہاں بھی جدا جدا رہتی ہیں۔ (رواہ البخاری)

مولانا موصوف نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بارگاہ حضرت معروف کرخی میں مجھ سے ملاقات کی اور پھر ہم نے حضرت معروف کرخی کی زیارت کی۔ زیارت کرنے کے بعد وہ میرے گھر تشریف لائے تو میں نے ان کو عام اور صالح و متقی پاکر اجازت حدیث دے دی۔ میں نے شیخ اسید الحق شہید کو علم و ادب کا بڑا پہاڑ، میخ تویم کا سا مک، اہل طریقت خاص طور سے شیخ عبدالقادر جیلانی کے ادب و آداب سے آراستہ اور روشن دل و دماغ کا مالک پایا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے حبیب کی امت میں شیخ اسید الحق شہید کی طرح عباد و مردان حق کو وارث بنائے اور ان کے نیک و صالح، شیخ و مربی و اندگرای شیخ سالم قادری کو صبر و ضبط عطا فرمائے اور ہمیں اسید الحق شہید کے ساتھ مقام رحمت میں جمع فرمائے۔ اے اسید الحق! تمہیں شہادت مبارک ہو، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے قرب میں دفن ہونا مبارک ہو، تمہیں صالحین سے اپنی محبت مبارک ہو۔ الوادع الوادع! اے شہید! اے عالم! اے صالح! تمہاری زندگی اور موت دونوں بہتر ہیں۔

□□□

ایک عجیب حجابی کیفیت پیدا ہو گئی

حضرت سید شاہ سیف اللہ مغوی مندی

سجادہ نشین: آستانہ مندی، میاں بزار، ضلع پورہ، اناؤ (پوٹی) بعدہ ناچیز کو جب حضرت علامہ شیخ اسید الحق قادری علیہ الرحمہ کی شہادت کی خبر ملی اور تحقیق آپ سے بھی بذریعہ موبائل کا شرف احوال ہوا تو دل میں ایک عجیب حجابی کیفیت پیدا ہو گئی، کیونکہ موصوف کے علوم و فنون سے فقیر آگاہ تھا، ایک طرف جہاں حضرت العظام کی شہادت پر طول تھا، وہیں دوسری طرف ان کے اس قدر نصیب پر نازاں بھی تھا کہ ایک تو شہادت کے جام سے سرفراز ہوئے اور دوسری بارگاہ غوث الوری میں تدفین۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور اپنے قرب خاص میں جگہ عنایت فرمائے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تمام خواص و عوام، مریدین، متوسلین، معتقدین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اس صبر جمیل پر ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

علامہ بدایونی کی کمی پوری کرنا جماعت کے لیے بڑا چیلنج

حضرت سید شاہ صدقات علی جیلانی

سجادہ نشین آستانہ عالیہ قادریہ، ناگور شریف (راجستھان) حضرت علامہ اسید الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر ملال کی خبر سن کر دلی رنج ہوا۔ حضرت کا وصال واقعی اہل سنت و جماعت کا عظیم خسارہ ہے۔ حضرت سے میری پہلی ملاقات میرے زمانہ طالب علمی میں ہوئی، جب میں بدایوں شریف آپ کی درسگاہ میں حصول درس کے لیے حاضر ہوا تھا اور دوسری ملاقات سنہ ۱۹۹۸ء میں حضرت تاج التحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی علیہ الرحمہ کے صد سالہ عرس مبارک کے موقع پر

ہوئی تھی۔ حضرت علامہ بااخلاق، بلند راور نہایت خوش خلق تھے، میری آپ سے اکثر انٹرنیٹ کے ذریعے سے بھی بات چیت ہوا کرتی تھی۔ حضرت بہترین محقق، مفکر، معلم، محدث، ناقد اور مصنف تھے کہ جن کی کمی کو پورا کرنا بلاشبہ اہل سنت و جماعت کے لیے بڑا چیلنج ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا اور آپ کی تدفین بھی ایک مقدس مقام بارگاہ سرکار سیدی الدین عبدالقادر جیلانی غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے احاطہ مبارک میں ہوئی جو خود میں بلند مرتبہ ہونے کی ایک علامت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ حضرت علامہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ کے والدین، احباب و متوسلین و معتقدین کو صبر عطا فرمائے، آمین۔

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

پوری ملت اسلامیہ کا عظیم نقصان

حضرت سید عیسیٰ شرف اثرنی جیلانی

سجادہ نشین: خانقاہ امیر ملت، کچھوچھو شریف، ضلع امبید کرگر (پوٹی)

عزیز القدر حضرت علامہ و مولانا اسید الحق علیہ الرحمہ والرضوان کی شہادت نے دل کو بے چین کر دیا۔ موت العالم موت العالم کے مصداق حضرت علامہ کی شہادت سے نہ صرف خانوادہ بدایوں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا عظیم نقصان ہوا۔ پورے خانوادہ اشرفیہ امیری طرف سے دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

علامہ اسید الحق ملت اسلامیہ کا سرمایہ افتخار تھے

مولانا سید محمد علی قادری الہاشمی مہاراشا

سجادہ نشین: خانقاہ قادریہ جمادیہ، حیدرآباد (دکن)

ولی عہد خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف علامہ اسید الحق عاصم میاں قادری الازہری رحمہ اللہ اہل سنت کے عظیم مفکر، محقق، عربی اور اردو ادب پر یکساں عبور رکھنے والے بہترین اسکالر اور خانقاہی نظام کے روح رواں تھے۔ وہ خانقاہی نظام کو ایک فعال علمی اور تربیتی کردار کا حامل دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے۔ علامہ کی شخصیت پوری ملت اسلامیہ کے لیے بالعموم اور مسلک اہل سنت کے لیے بالخصوص سرمایہ افتخار تھی، جواب جہان رنگ و بو میں باقی نہیں رہے۔ سرزمین عراق پر دہشت گردوں کے حملے میں ہوئی ان کی شہادت سے صرف آپ اور دیگر افراد خانوادہ، وابستگان خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف ہی نہیں بلکہ تمام خانقاہیں اور جمیع اہل سنت سوگوار ہیں۔ جن ظالموں نے ان پر بے ہمانہ حملہ کیا انہوں نے امت کو ایک گراں قدر عالم دین کی شخصیت سے محروم کر کے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کے عظیم مقام پر سرفراز اور سرکار غوث پاک رضی اللہ عنہ کے قدموں میں جگہ عطا فرماتے ہوئے ان کے لیے ابدی نعمتوں کے دروازے کھول دیے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں مقامات عالیہ عطا فرمائے اور آپ کو، دیگر افراد خاندان، متوسلین و معتقدین کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔ (مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

حضرت سید شاہ عبداللہ حسین بادشاہ قادری

سجادہ نشین: درگاہ حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری
لاہالی، کرنول (آندھرا پردیش)

حضرت مورانا محمد اسید الحق عجم نقادری کا سانحہ ارتحال قوم و ملت کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ بالخصوص اہل خانقاہ اور سنی کا زکواس نوجوان محقق صوفی علم دین کی شہادت سے جو نقصان ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ مرنا تو سبھی کو ہے، اس عشق غوث نے کوچہ جاناں میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر کے اپنی امنٹ محبتوں کا ثبوت دیا ہے۔ یہ شہادت قابل رشک ہے، اس لیے بھی کہ جگہ پائی تو غوث پاک کے قدموں میں، بل انھیں گے تو ہرے جھنڈے کے سائے میں انھیں گے، یہ قابل صدر رشک ہے۔ اس سعادت بزور بازو نیست اللہ تعالیٰ حضرت سالم میاں قبلہ اور اہل خانقاہ والی سلسلہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

شیخ اسید الحق شریعت و حقیقت کے سچے طالب تھے

شیخ ڈاکٹر انس محمود خائف

امام و خطیب: جامع الشیخ عبدالقادر الجیلانی، بغداد (عراق)

رئیس قسم الحدیث: الجامعہ العراقیہ، بغداد

السید والد اسید الحق و اخوانہ المحترمین! السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

اعزى نفسی اولاً واعزى یکم ثانیاً، ونقول کما قال سیدنا محمد ﷺ عند موت ابنہ: "ان العین لتدمع وان القلب

لیحزن وانا علی فراقک یا ابراہیم لمحزونون ولا نقول الامایرضی ربنا۔" اسال اللہ ان یکون شافعاً لکم یوم القیامۃ

قبل وفاتہ الشیخ اسید الحق، طلب منی اجازۃ فی حدیث النبی ﷺ وعلومہ، وللہ الحمد والمنا، حصلت لہ اجازۃ

فی احادیث النبی ﷺ بسند متصل الی رسول اللہ ﷺ واجازۃ عامۃ فی علم حدیث النبی ﷺ من علماء بغداد۔

وتکریماً لروح اسید الحق الطاهرة احببت ان ازور کلیۃ القادریۃ بنفسی و اقدم هذه الاجازۃ لہ اولاً ولمن یرثہ

من بعدہ ثانیاً، لاننی کنت تکلمت معہ قبل وفاتہ فی تبادل العلم والمعرفة بین بغداد واهل العلم وکلیۃ القادریۃ

للحدیث النبوی، فیاحبذا نحدد یوما للزیارة۔ ولکم جزیل الشکر۔

شیخ اسید الحق کے والد گرامی و برادران!..... السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے میں خود اپنے آپ کو دلا سہ دیتا ہوں اور پھر آپ لوگوں کی خدمت میں کلمات تعزیت پیش کرتا ہوں۔ اس وقت ہماری زبان پہ

وہی ہے جو ہمارے آقائے کریم جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے کے وصال پر فرمایا تھا۔ "یقیناً آنکھیں نم ہیں، دل رنجور ہے اور اے

ابراہیم! ہم تمہاری فرقت پر بے حد غمزدہ ہیں، لیکن ہم صرف وہی بات کہیں گے جس میں ہمارے رب کی رضا ہوگی۔" میں دعا گو ہوں کہ اللہ کریم

مرحوم کو قیامت کے دن آپ لوگوں کا شفیق بنائے۔

وفات سے قبل شیخ اسید الحق نے مجھ سے حدیث اور علوم حدیث کی اجازت طلب کی تھی، جب کہ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ عمارت بغداد کی

طرف سے متصل سند کے ساتھ انھیں حدیث اور علوم حدیث کی اجازت حاصل تھی۔ میری خواہش ہے کہ شیخ اسید الحق کی پاک روح کی تکریم میں

دارالعلوم قادریہ میں خود حاضر آؤں اور یہ اجازت سب سے پہلے انھیں اور پھر ان کے جانشینوں کو پیش کروں، کیوں کہ ان کی وفات سے قبل بغداد

کے اہل علم اور دارالعلوم قادریہ کے درمیان علمی تبادلے کے سلسلے میں ان سے ہماری گفتگو بھی ہوئی تھی۔ باقی شکر و عنایت!

(۲)

الحمد لله الذي لا يحمد على مكروه سواه، والصلاة والسلام على سيدنا محمد ﷺ.

و بعد: "يقول الله تعالى: "من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فهمهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما

بدلوا تبديلاً۔" لقد تلقينا نبأ استشهاد اخينا وحبينا الشيخ اسيد الحق ببالغ الحزن والاسى، وقد عم هذا الحزن جميع

محبى الشيخ الغوث سيدنا الكيلاني قدس سره۔ لقد تعرفت على الشيخ الفقيه رحمة الله عليه فى حضرة سيدنا الغوث

قدس سره فكان رجلاً مثلاً للادب والتقوى والصلاح، محباً للصالحين والعلماء، كان من طلاب الحقيقة والعلم، ترى

عليه سمات الصالحين وعلامات اهل الله تعالى الاولياء۔

الفقيه السعيد اختاره الله ليكون شهيداً وكانت شهادته فى بلد سيدنا الكيلاني قدس سره، اراد ان يشارك بلد سيدنا

الكيلاني همومهم والامهم فتحمل ما تحملوا، هذا الرجل صدق فى حبه لسيدنا الكيلاني قدس سره، فضحى باغلى ما

يملك و هى نفسه فى سبيل ذلك، فدفن بجوار حبيبہ سيدنا الكيلاني، المكان الذى دفن فيه يتمناه علماء رؤساء ووزراء

فلا يحصلون عليه۔ اقول لحبیبى اسيد الحق والاسى يقطع قلبى، طبت حياؤ ميتا يا اسيد الحق، كما قول لوالديه واخوانه

واهل بيته واحبابه لنا ولكم الله واحسن الله عزائکم، واسال الله ان يجمعنا فى مستقر رحمته، انه يجمع المحبين۔

تمام تقریض اللہ کے لیے ہیں کہ اس کی وہ ذات ہے جس کی تکلیف کے وقت بھی حمد کی جاتی ہے اور سلام و رحمت نازل ہو ہمارے آقا جناب

محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو کچھ بھی نہیں بدل۔"

موت کو گنگے لگا چکے اور بعض اس کے ابھی منتظر ہیں اور انہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو کچھ بھی نہیں بدل۔"

ہمارے عزیز، محبت گرامی شیخ اسید الحق کی شہادت کی خبر بڑے غم و اندوہ کے ساتھ موصول ہوئی اور یہ غم حضرت غوث اعظم جیلانی قدس سرہ

کے تمام محبین کا غم بن گیا۔ مجھے شیخ مرحوم رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی شناسائی بارگاہ غوث اعظم میں ہوئی تھی۔ وہ ادب، تقویٰ اور شرافت میں ایک مثالی

انسان تھے، علما اور صحابہ انہیں گہری محبت تھی، شریعت اور حقیقت کے سچے طالب تھے اور صالحین و اہل اللہ کی علامتیں ان کی پیشانی سے ظاہر تھیں۔

سعادت مند مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے مقام شہادت کے لیے چن لیا اور حضرت غوث اعظم کے شہر میں وہ شہید ہو گئے۔ وہ غوث اعظم کے شہر والوں

کے رنج و غم کو بانٹنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے بھی اسی غم کو گنگے لگا لیا جس سے اس شہر کے لوگ دوچار ہیں۔ انہوں نے حضرت غوث اعظم جیلانی

قدس سرہ کی محبت کو سچا کر دکھایا اور اس کے لیے اپنا سب سے قیمتی سرمایہ یعنی اپنی جان تک کو قربان کر دیا، جس کے صلے میں انہیں حضرت غوث اعظم

کے قرب میں جگہ ملی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دفن ہونے کے لیے بڑے بڑے علم، رؤسا اور وزراتیں میں کیا کرتے ہیں اور نامراد رہتے ہیں۔

ایسے عالم میں کہ غم سے میرا دل پھٹا جا رہا ہے، میں اپنے دوست اسید الحق سے گویا ہوں کہ اے اسید الحق! تمہاری زندگی اور موت دونوں

قابل رشک ہیں۔ اس موقع پر میں ان کے والدین، ان کے برادران، اہل خانہ اور احباب سے یہی کہوں گا کہ ہم سب کا آسرا صرف اللہ کی ذات

ہے۔ میں اللہ دعا گو ہوں کہ وہ ہم سب کو اپنے جوار رحمت میں جمع فرمائے۔ وہی محبت کرنے والوں کو جمع فرمانے والا ہے۔ □□□

اہل علم ودانش سے خصوصی گزارش

مکاتیب علامہ ارشد القادری کی تدوین و ترتیب کا آغاز

(۳)

گریہ الم

قائد اہل سنت رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط کی تدوین و ترتیب کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ تمام علما، مشائخ، اہل دانش، تنظیموں، تحریکوں، مدرسوں کے ذمہ داران اور دیگر متوسلین سے گزارش کی جاتی ہے کہ جن کے پاس بھی حضرت قائد اہل سنت کے خطوط موجود ہوں وہ براہ کرم ان کی فوٹو کاپی کروا کر بذریعہ ڈاک یا اسکین کر کے بذریعہ ای میل درج ذیل پتے / ای میل آئی ڈی پر اولین فرصت میں بھیج دیں۔

نوٹ: وہ حضرات جن سے حضرت قائد اہل سنت کی مراسلت رہی اور اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، ان کے صاحب زادگان اور متوسلین سے التماس ہے کہ وہ اس درخواست پر خصوصی توجہ فرمائیں اور مرحومین کے ریکارڈ فائل سے حضرت قائد اہل سنت کے خطوط بھیج کر اس اہم علمی کام میں تعاون فرمائیں۔

امیدوار کرم

خوشر نورانی

Jaam-e-Noor Monthly

422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-110006

email: jaamenoor@gmail.com

Mob: 09871094760

گریہ الم

عالم ربانی کی شہادت پر اہل علم کے کلمات رنج و غم

شہید بغدادی عالم ربانی مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک شہادت سے ملک و بیرون ملک ارباب علم و فکر اور اصحاب شریعت و طریقت کی مجلسوں میں، تم کا سماں بندھ گیا۔ خانقاہ قادریہ بدایوں اور دفتر ماہنامہ جام نور دہلی میں ہر طرف سے تعزیتی فون، ای میل، ایس ایم ایس اور خطوط آنے لگے، ان میں سے علما کی چند منتخب تحریریں یہاں حاضر کی جاتی ہیں۔ (ادارہ)

مولانا کی ناگہانی رحلت سے سب غم زدہ اور ناامید ہو گئے

مولانا شاہ عبدالحق (سرماء اعلیٰ)

مولانا محمد احمد مصباحی (صدر المدین)

مفتی محمد نظام الدین رضوی (صدر شعبہ ائلا)

الجامعۃ الشریفہ مبارک پور، اعظم گڑھ (یو پی)

جو بھی دنیا میں آیا ہے اسے یہاں سے جانا ہے، مگر کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بندہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ابھی اکیس سے کیا ہو گیا۔ عزیز گرامی مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کا ناگہانی سانحہ ایسا ہی ہے۔ زمانہ طالب علمی ہی سے ان کا علمی شغف، سنجیدہ فکر اور متوازن سوچ اقران اور اصاغر و اکابر کے درمیان معروف تھی۔ جامعہ ازہر سے واپسی کے بعد تعلیم و تبلیغ، تصنیف و اشاعت، حسن تنظیم و انتظام وغیرہ میں ان کے انہماک کے ثمرات بڑے حوصلہ افزا تھے۔ کبھی شخصیں کو ان کی ذات سے طویل عرصے تک ہمہ جہت اور دور رس خدمات کی امیدیں وابستہ تھیں، مگر ان کی ناگہانی رحلت کے باعث سبھی سخت غم زدہ اور بالکل ناامید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

پھر بھی یہ سوچ کر دل کو کچھ تسلی ہوتی ہے کہ عموماً لوگ جتنا کام ایک لمبی عمر میں کر پاتے ہیں، آس عزیز نے تقریباً دس سال میں کر لیے۔

دوسرے یہ کہ انھوں نے شہادت کی موت پائی جس کی آرزو ہزار افراد ہزار بار کرتے ہیں، مگر وہ ان کا مقدر نہیں ہوتی۔

تیسرے یہ کہ انھیں سرکارِ غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جوارِ کرم ملا جو صرف اپنی تمنا اور سعی و تدبیر سے نہیں ملتا، جب تک حسن قسمت کی پوری مدد نہ ہو۔ اس موقع سے محدث اعظم حضرت مولانا سید محمد کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا شعر بار بار یاد آتا ہے:

موت آئے تو در پاک نبی پر سید ورنہ تھوڑی سی زمیں ہوشہ سمنان کے قریب

شہ جیساں کا مقام و مرتبہ، شہ سمنان اور پیش تراولیا قبل و بعد سے بلا نزاع بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ ان کا قرب اگر ہزار دعا و التجا کے بعد بھی میر تو نصیب کی ارجہندی میں کلام نہیں، مگر آں موصوف کو شاید یہ قرب ہے اتجاہت کے خاص نصیب ہوا، فیہ نصیب! سانحہ بہت عظیم ہے اور والدین، اعزہ اقرباء، اہل سلسلہ اور اہل محبت کے لیے غم و الم کا کوہِ گراں، مگر رب تعالیٰ نے اپنے کرم سے اس حادثے میں غم و الم کے ساتھ کچھ صبر و شکر کا بھی سامان پیدا فرما دیا ہے، اس لیے امید ہے کہ کبھی حضرات مرضی مولانا پر راضی ہو کر اپنی عالی ہمتی اور کمال بندگی کا ثبات دیں گے۔

(مکتوب نام: حضرت شیخ عبدالحق محمد سالم قادری ۲۲/۱۱/۲۰۱۳ء)

□□□

یہ سانحہ دل و دماغ کو ہلا دینے والا ہے

مولانا محمد الیاس حصار قادری

امیر تحریک "دعوت اسلامی" کراچی (پاکستان)

ایک اخباری تراشے کے ذریعے مجھے یہ روح فرسا خبر موصول ہوئی کہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے چشم و چراغ حضرت علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری ازہری زیارت مقامات مقدسہ کے لیے قافلے کے ساتھ عراق شریف پہنچے اور کردستان کی راجدھانی "ارمل" جاتے ہوئے راستے میں شہید کر دیے گئے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ قبلہ مولانا خوشتر نورانی صاحب اور شہید مولانا اسید الحق قادری ازہری پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تھے اور اس دوران گنہگار کے غریب خانے "بیت الفنا" پر بھی ورود مسعود فرمایا، خصوصاً مولانا اسید الحق شہید مرحوم و مغفور کے نقوش آج بھی مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہے ہیں اور ان کی خوش گفتاری و سخن آرائی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ مولانا خوشتر نورانی صاحب نے بھی ماشاء اللہ بہت شفقتوں کا مظاہرہ فرمایا۔ آپ حضرات ہزرگوں کی اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔

بہر حال عہد شباب میں مرحوم کی اس طرح اچانک وفات واقعی دل و دماغ کو ہلا دینے والی ہے اور اس کا صدمہ آپ حضرات ہی زیادہ سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ قبلہ مولانا خوشتر نورانی صاحب نے عظیم دوست گنوا دیا اور حضرت مولانا سالم میاں قادری صاحب جوان بیٹے کے سہارے سے محروم ہو گئے۔ موت کا صدمہ باپ سے زیادہ کسے ہو سکتا ہے؟ خدائے رحمن و رحیم عزوجل ان کو غریقِ رحمت فرمائے، مرحوم کی بے حساب مغفرت کرے، ان کے صغیرہ کبیرہ گناہ معاف فرمائے اور جملہ لواحقین کو صبر جمیل پر اجر جزیل عطا فرمائے۔ میں مرحوم کے اعزہ و اقرباء، دوست و احباب اور تمام سگوواروں سے تعزیت کرتا ہوں۔

میں نے اس خبر میں یہ بھی پڑھا کہ مرحوم کا زیارت مقامات مقدسہ کے سلسلے میں ہفتے یا عشرے کا جدول تھا اور چھ مارچ کو آپ کی اپنے وطن ہند میں واپسی تھی، مگر ان کی حیاتِ مبارکہ کی گھڑیاں وہیں پوری ہو گئیں، جہاں ان کی وفات کبھی تھی۔ موت اٹل ہے جو مقررہ وقت اور مقام پر ضرور آئے گی مگر ذوقِ افزائت یہ ہے کہ جسے بعد وفات حضورِ غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جوار میں جگہ نصیب ہو جائے وہ کتنی سعادت مند ہے۔ الحمد للہ عزوجل شہید اہل سنت کو بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ یقیناً آپ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کے بدن میں بخدا معلیٰ کی مٹی ہے۔

(اقتباس از مکتوب نام: حضرت شیخ عبدالحق محمد سالم قادری/خوشتر نورانی/۱۱/۱۱/۲۰۱۳ء)

□□□

مولانا کی شہادت ملت کے لیے المیہ ہے

ڈاکٹر مفتی محمد کرم احمد نقشبندی

شاہی امام: مسجد فتح پوری، دہلی

شہید بغدادی، فدائے غوث اعظم، برادرِ کرم مولانا اسید الحق قادری بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کی المناک شہادت کی خبر سے بہت صدمہ ہوا، جو بیان سے باہر ہے۔ یقیناً یہ ایک عظیم المیہ ہے۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جب ہم لوگوں کو اتنا صدمہ ہے تو آپ کو اور اہل خاندان کو کتنی صدمہ ہوگا۔ آپ کا صدمہ مثالی ہے اور اللہ کے خاص بندوں کی یہی علامت ہے کہ وہ مولیٰ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر صابر و راضی رہتے ہیں۔ انما یوفی الصابرون اجرہم بغير حساب۔ دعا ہے کہ پروردگار عالم اپنے حبیب سرور کائنات ﷺ کے طفیل مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ سے سرفراز فرما کر اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور سب ہمساندگان و اہل

خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے، نیز خانقاہ عالیہ قادریہ کے سب ہی متوسلین و عقیدت مندان نیز جماعت اہل سنت کے ہر محبت کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے۔
مرحوم کی شہادت کی خبر ملتے ہی فتح پوری میں قرآن خوانی کر کے ایصالِ ثواب کیا گیا۔ جمعرات کو مدرسہ مظہر العلوم (لونی) میں احقر کی سرپرستی میں قرآن خوانی کر کے ایصالِ ثواب کیا گیا اور بعد عشاء شاہی مسجد فتح پوری میں ختمِ خواجگان کی محفل کے بعد خصوصی طور پر ایصالِ ثواب کیا گیا۔ بعد نماز جمعہ شاہی مسجد فتح پوری میں ہزاروں نمازیوں نے مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب کیا۔ ۱۱ جمادی الاولیٰ صبح گیارہ بجے جامعہ اسلامیہ مدرسہ مظہر العلوم میں اور بعد نماز عشاء شاہی مسجد فتح پوری کی گیارہویں شریف کی ہانہ محفل میں مولانا مرحوم کے لیے خصوصیت کے ساتھ ایصالِ ثواب کیا گیا اور احقر کے مریدین و متوسلین نے گھروں میں بھی قرآن خوانی اور کلمہ شریف پڑھ کر ایصالِ ثواب کیا اور کرار ہے ہیں۔

مولانا اسید الحق شہادت کے عظیم منصب پر فائز ہو کر بارگاہِ غوثِ اعظم میں ابدی حاضری سے مشرف ہوئے، دنیا میں بھی وہ ہر ایک کے محبوب اور معظم بن کر رہے۔ ان کی علمی خدمات جلیلہ ان کے لیے صدقہ جاریہ اور جنت اہل سنت کے لیے گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اگر عمر وفا کرتی تو بلاشبہ وہ جماعت کے نادر الشال عالم اور عظیم محقق ہوتے۔ ان کی شہادت ملت کے لیے المیہ ہے۔ برادرِ مولانا عطیہ میاں سمہ، محترم مولانا عزام میاں سلمہ اور سب اہل خانہ کی خدمت میں احقر تعزیت پیش کرتا ہے۔ (مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

اہل سنت و جماعت کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں

معنی خلیل احمد

شیخ الجامعہ: جامعہ نظامیہ، حیدرآباد (دکن)
مجھے اخبارات کے ذریعے آپ کے جواں سال فرزند مولانا اسید الحق عاصم القادری کے ایک ناگہانی حادثے میں انتقال کی خبر ملی، جس پر مجھے بے حد ملاں ہوا، اظہارِ تعزیت کے لیے میں نے فون کے ذریعے رابطہ کی کوشش کی، تاہم آپ سے رابطہ نہ ہو سکا، البتہ آپ کے برادرِ زادے سے بات ہوئی۔ عاصم میاں سے اہل سنت و جماعت کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں، ان کی علمی خدمات لائقِ قدر اور قابلِ تحسین تھیں۔

قضا و قدر کے آگے انسان مجبور ہے، سر تسخیم خرم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تاہم اس افسوسناک واقعہ میں یہ سعادت مضمر تھی کہ عاصم میاں نے جامِ شہادت نوش کیا اور حضور غوثِ پاک رضی اللہ عنہ کے قدموں میں ان کی ابدی آرام گاہ بنی، میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین (مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری)

□□□

میرے رب کریم نے انہیں بہت نوازا تھا

مولانا کوکب لورانی اداؤی

سولہ بازار، کراچی (پاکستان)
حرف و لفظ برتنے کا ہنر جب سے سیکھا ہے، پڑھنے، بولنے اور لکھنے کا شغل جاری ہے۔ تیکھے اور تلخ موضوعات بھی مشکل نہ لگے۔ مگر کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے کچھ آتا ہی نہیں، کچھ لکھا جاتا ہی نہیں، انگلیاں اٹھنے ہی لگتی ہیں۔ ایسے ہی کچھ اس وقت احوال ہیں۔ آپ کے ساتھ اسید میاں سے دہلی ایئر پورٹ پر پہلی ملاقات سے ممبئی میں آخری ملاقات کا دورانیہ تین سے چار برس کا رہا ہوگا۔ دوسرے بار کراچی میں ملے آئے۔ اجنبی ہونے کا گمان کیا، پہلی ملاقات ہی میں وہ دل کے قریب ہو گئے تھے۔ تسلیت کیوں یا ہیرا، سعادت مندی چہرے سے ہو یہ اتھی۔ دیکھنے میں ہانکے لگے اور

جانچنے میں گویا سمندر، علم و عمل کے پیکر جمیل، میرے رب کریم نے انہیں بہت نوازا تھا۔ انہیں کتنی عقیدت و محبت تھی وہ آپ سے مخفی نہیں۔ وہ یوں اچانک داغِ مفارقت دے جائیں گے، صدے کا اظہار نہیں کر پاؤں گا۔ اللہ کریم انہیں اعلیٰ درجات عطا فرمائے، آمین۔

آہِ جدا عاشقِ غوثِ پاک

۱۴۳۵ھ

۲۰۱۳ء

□□□

مولانا اسید الحق کی شہادت پوری ملت کا عظیم نقصان

معنی مہا لیم

امیر: دعوتِ اسلامی ہند، ناگ پور (مہاراشٹر)

۴ مارچ کی شام میں اچانک خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے زینِ سجادہ حضرت مولانا سالم القادری کے لائقِ فرزند ممتاز محقق و نقاد مولانا اسید الحق عاصم القادری کی شہادت کی خبر ملی تو ذرا بھی یقین نہیں آیا کہ ابھی جواں سال علالت کی بھی کوئی خبر نہیں۔ پھر اچانک یہ اندوہ ناک خبر ممبئی سے مفتی یحییٰ رضا نے فون کے ذریعے دیا۔ تفصیلی حالات معلوم ہونے پر دیر تک سکتہ رہا اور بے ساختہ زبان پر استرجاع جاری ہوا۔

موت برحق ہے، اس کا وقت متعین ہے۔ مولانا اسید الحق بڑی مختصر عمر لے کر میدانِ علم و عمل میں آئے تھے۔ ان کی دینی، ملی، مذہبی، علمی، فلسفی خدمات کے پیشِ نظر ملتِ اسلامیہ بہت سی امیدیں وابستہ کر بیٹھی تھی۔ مذہب و مسلک اور خانقاہ بدایوں کے بزرگوں کی علمی و دینی خدمات کی ترویج و اشاعت کے قابلِ تعریف اقدام پر اربابِ علم و قلم دیر تک رفاقت کے خواہاں تھے۔ ان کی شہادت پوری ملت کا عظیم خسران و نقصان ہے۔ فکر و قلم کا چودا بھی جو بن پر ہی تھا کہ کفن پوش ہو کر تہہ خاک ہو گیا۔ آج ہی ایک خواب دیکھا: آپ سر راہِ اداس بیٹھے ہیں اور گیند نما کوئی چیز سامنے رکھی ہے۔ میں نے اس کی تعبیر یہ نکالی کہ آپ کا شریک سفر آپ سے رخصت ہو گیا اور آپ ایک اچھے رفیق سے محروم ہو گئے۔ مولیٰ تعالیٰ ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے سجادہ نشین و افرادِ خاندان کے ساتھ ساتھ تمام وابستگانِ سلسلہ کے لیے کڑی آزمائش کی گھڑی ہے۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ قادر و مقتدر ان کے والد بزرگوار و پسماندگان نیز تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے اور انہی کے خاندان میں کوئی ”اسید ثانی“ پیدا ہو، جو اس خلا کو پر کر دے۔ آمین۔ (مکتوب بنام: خوشنورانی/۸ مارچ ۲۰۱۳ء)

□□□

مدتوں روپا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

ڈاکٹر کھیل مٹی

محاذِ کریم الدین پور، گھوسی، منو (پولی)

جان کر مجھلے خاصانِ میخانہ تجھے۔ مدتوں روپا کریں گے جام و پیمانہ تجھے۔
مورخہ ۴ مارچ ۲۰۱۳ء کی شام کو یادِ غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ میں مولانا اسید الحق قادری بدایونی کی شہادت کی خبر سے اہل علم و فن میں غم و اندوہ کا طوفان برپا ہو گیا۔ جیسے ہی مجھے اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی، ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ بہت دیر تک خود کو سنبھال نہ سکا۔ پھر جب حواس قدرے بجا ہوئے تو مرحوم (جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے کچھ منہ کو آتا ہے) سے دیرینہ دوستانہ تعلقات کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ وہ نہ صرف ایک مخلص دوست تھے، بلکہ حق دوستی ادا کرنے کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف تھے۔ موبائل کے ذریعے برابر رابطہ قائم رکھتے،

خبر و فیت معلوم کرتے اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے۔

عہد حاضر میں نوجوان طبقہ علم میں اپنا ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے تھے۔ علوم دینیہ سے شغف رکھنے والے جدید اسکالرز کے یہ سید ہیں تھے۔ ایک مایہ ناز قلم کار، ایک صاحب طرز ادیب، ایک سنجیدہ تنقید نگار، ایک بالغ نظر محقق، ایک اکتفا نگر مدرس و خطیب، ایک خوش فکر و خوش آواز محقق، ایک فیاض معنی کے روپ میں ورکھی اسید الحق عاصم قادری کے رنگ میں اپنے علمی و تحقیقی جواہر پاروں سے دنیائے علم و ادب کو بہرہ ور کرتے رہے۔ گفتگو میں شرافت و ذہانت، لہجے میں حلاوت و لطافت، شخصیت میں جاذبیت و مقناطیسیت اور اس پر مستزاد خاندانی وجاہت و نجابت..... مرجع

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

یہ عالمی ظرف و خوش خصل کہ اختلاف رائے رکھنے و سوں اور حرف گیری کرنے والوں کی تلخ کلامی و تلخ نوا کی کا جواب بھی کبھی جا رحیت، شجاعت و درمیاں ادب و شرافت سے رکر نہیں دیا۔ طرز تحریر شستہ و سنگفتہ، لطیف رنگ ظرفیت، پیچیدہ و ادق علمی مسائل کی تسہیل و تفہیم موصوف و امتیازی شائستگی۔ سچ ہے ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و درپیدا

مولانا موصوف نے کئی بار مولانا خوشتر نورانی کے ساتھ غریب خانے کو بھی شرف بخشا، دلچسپ صحبتیں رہیں، علمی و ادبی مسائل زیر بحث رہے۔ آخری بار ۲۰۱۱ء کو میرے جشن (جشن تکلیف انظمی) میں مولانا خوشتر نورانی کے ہمراہ شریک ہوئے اور ازلہ خصوص و محبت اپنی اور راکین جام نور کی جانب سے توصیف نامہ اور خوش نما فیتی شال پیش کی۔

ابھی ۱۰ مارچ ۲۰۱۳ء کو حضرت آسی سیدنا بنارس میں شرکت فرما کر مولانا خوشتر نورانی کے ساتھ ملاقات کے لیے گھڑی تشریف لانے والے تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

رب کریم و قدیر مرحوم کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے اور جملہ پسماندگان و متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ایں دعا اذن و از جملہ جہاں آمین باد

□□□

جماعت اہل سنت غم و اندوہ میں خوب گئی

پروفیسر غلام محیٰ انجم

صدر شعبہ علوم اسلامی، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

جائے ہوئے کہتے ہو قیامت کو طیس گے کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

تعزیت نامہ لکھتے وقت میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں کہ کس طرح ایک نوجوان، وفا شعار، ہوشیار، صاحب کردار، متمحل و بردبار، محبت و ملسار، میدان تصنیف و تالیف کا شہسوار، چھوٹوں پر شفیق اور بڑوں کی عظمت کا پاسدار، علم و عمل کی دوست سے سرشار، فرزند ارجمند کی شہادت کے زخموں کو کرید اچائے۔ رب کی مشیت کے سامنے کسی کا چہرہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہر فعل و عمل میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے، فعل الحکیم لا یحلو عن الحکمة جس تک بندے کی رسائی نہیں ہو پاتی، اس میں بندہ اضطراب و بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا اسید الحق قادری کی شہادت سے جو صدمہ آپ کو اور آپ کے خواد کے کو پہنچ ہو گا اس کا نہ زہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ مولانا موصوف کی رحمت سے دنیائے غم و اندوہ اور رنج و دالم میں ڈوب گئی، شہادت کی خبر سننے ہی میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑے اور تھوڑی دیر کے لیے میں سکتے میں آیا اور مجھ جیسے نہ جانے کتنے لوگوں کے دلوں پر اس قسم کی کیفیت طاری ہوئی ہوگی، کیوں کہ مرحوم کا تعلق اس طبقہ علماء و مشائخ سے تھا جو اپنی

ایک ہی ملاقات میں لوگوں کو گرویدہ بنا لیتے تھے۔

حضرت مولانا اسید الحق قادری ذی علم تھے، انہوں نے اپنی کم عمری ہی میں اتنا کچھ کر دیا تھا جسے علمی جامعہ پہننے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ جس برق رفتاری سے ان کا قلم چل رہا تھا، وہ بل شبہ ست اسلامیہ بطور خاص اہل سنت و جماعت کے لیے سرمایہ افتخار تھا۔ سادہ اسلوب میں بدل گفتگو کرنے کے عادی تھے، جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ افسوس صد افسوس! خاندانہ قادریہ کا یہ تابندہ چشم و چراغ، خانوادہ قادریہ بغداد کے آغوش میں یہ پیغام دے کر ابدی نیند سو گیا ع

مرائیں ہوں غم نبی میں بس سستی بدل گیا ہے

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبد الحمید محمد سالم قادری/۱۳/مارچ ۲۰۱۳ء)

□□□

وہ ایک عظیم علمی و روحانی خانوادے کے عظیم فرد تھے

ملتی محمد خان قادری

شیخ الجامعہ: جامعہ اسلامیہ، لاہور (پاکستان)

حضرت صاحبزادہ اسید الحق رحمہ اللہ کی شہادت کے حوالے سے عم ہوا تو اس خبر نے سوگوار کر دیا۔ وہ ایک عظیم علمی اور روحانی خانوادے کے عظیم فرد تھے، ان کی بعض علمی اور تحقیقی کاوشیں راقم کی نظر سے گزری ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں ہی تعلیم حاصل نہیں کی، بلکہ جامعہ زہر سے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دینی درسگاہوں اور خانقاہوں سے وابستہ افراد کے لیے یک روش مثال قائم کی۔ آج اگر ہمارے علم اور مشائخ کے صاحبزادے علامہ اسید الحق رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چل پڑیں تو ایک عظیم علمی اور روحانی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

ایسے عظیم بیٹے کی رحمت پر ہم آپ کو کن الفاظ سے تعزیت پیش کریں؟ آپ خود ایک عظیم علمی و روحانی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ انھیں شہادت کی موت اور حضور غوث اعظم کے قدموں میں آرام گاہ نصیب ہوئی۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ، جمد اہل خانہ اور وابستگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ اعظم اللہ اجرکم فی ابکم و متعمک بالصحة والعافیة وحول العمر فی حدمہ الدین۔

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبد الحمید محمد سالم قادری)

□□□

مولانا کا سانحہ ارتحال عالم اسلام کے لیے المیہ ہے

پروفیسر محمد اقبال مجددی

سابق صدر: شعبہ تاریخ، اسلامیہ کالج، لاہور (پاکستان)

مولانا کی شہادت کا سانحہ واقعی نہ صرف پاک و ہند بلکہ عالم اسلام کے لیے ایک بڑا المیہ ہے، موصوف نے اپنے اجداد کرام کی طرح خود کو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بہت کم عمری سے لکھن شروع کیا، جوانی میں ہی کل ۳۹ برس کی عمر میں بغداد شریف کے دہشت گردی کے ماحول کی نذر ہو گئے۔ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے گئے اور ذوق و وجدان کی پُر کیف حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ہندوستان پر برطانوی حکومت کے دور میں جس طرح علماء کو اختلافی مسائل میں الجھا کر ان کو اصل مقصد حیات سے ہٹا کر ایک دوسرے

خلاف کر دیا گیا وراسلام کے بنیادی عقائد سے ان کی توجہ اختلافی امور میں لگا کر انہیں ملت اسلامیہ کی تعمیر و ترقی کی بجائے تخریب کی دلدل میں پھنسا دیا۔ اسلام میں آن گنت غیر اصل مسائل پیدا کر کے انہیں تقلید، عدم تقلید، ختم نبوت، مسلم معاشرے میں مقام نبوت کی قدر و منزلت کو گرانے اور مسمر عقائد میں شکوک و شبہات پیدا کر دینے کی کوشش کی تاکہ یہ آپس میں لکھ کر استے کز دور اور بے حیثیت ہو جائیں کہ حکومتی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ یوں تو فرنگی مکمل (کھنڈو)، خیر آباد، بدایوں اور بریلی ہندوستان کے محض شہر ہیں لیکن وہاں کے علما نے فقہ حنفی کا جس طرح دفاع کیا اس سے نہ صرف برصغیر میں فقہ حنفی کو بقا ملی بلکہ اسلام کے اصل عقائد کی بنیادیں متزلزل ہونے سے پوری طرح بچ گئیں۔ ایسے میں بدایوں کے ایک بہت ہی باوقار و نوادہ عثمانی نے علم کو اس طرف متوجہ کیا اور ہندوستان میں پروان چڑھتی ہوئی وہابیت و خدایت کے عقائد فاسدہ سے آگاہ کیا۔ بدایوں کے حضرت مولانا فضل رسول اور ان کے خاندانہ حوزہ علمیہ نے عقائد حقہ اہل سنت کی بھرپور تحریری تائید کی۔ ہمارے دور میں اس عظیم خاندان کے ایک ارشدہ سترے حضرت اسید الحق محمد عاصم قادری عثمانی بدایونی تھے جن کی گراں بہا کتب اب ہمارے لیے نہ صرف سرمایہ افتخار ہوں گی بلکہ رہنمائی کا ذریعہ بھی بنیں گی۔ رب کریم اس شہید مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں خاص مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

□□□

علامہ اسید الحق قادری کی رحلت جماعت کا عظیم خسارہ

مولانا اسید قرشاہ جہانپوری

قاضی شہر کانیپور (یوپی)

۴ مارچ ۲۰۱۳ء بروز منگل کی شب آپ کے مرید خاص جناب زاہد بھائی نے فون پر اطلاع دی کہ بغداد شریف میں میرے محسن، ولی عہد خانقاہ قادری شہید ہو گئے۔ انا لہذا نا ایدہ راجحوں۔ یہ خبر سن کر گھر کے کبھی افراد پوری رات حضرت کے لیے دعائے مغفرت اور آپ لوگوں کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے رہے۔ ہر طرف مایوسی چھ گئی۔

حضرت عدا مہد اسید حق عاصم القادری کی رحلت اہل سنت و جماعت کا ایک عظیم خسارہ ہے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم علمی خاندان کے روشن چشم و چراغ بلکہ اس کے علمی امین و ورث تھے اور ایک عظیم اسلامی اسکالر تھے۔ پروردگار عالم اپنے محبوب سرکار مدینہ اور غوث اعظم کے صدقہ و طفیل نہیں جنت اغر دوس میں اعلیٰ مقام سوسط فرمائے۔ شہر کانیپور کے تمام مدارس و خانقاہوں میں مسلسل تعزیتی و دعائیہ جلسے ہو رہے ہیں۔ احقر نے بھی شہر کے علماء، ادباء، شعرا اور سماجی شخصیات کی موجودگی میں تعزیتی جلسے کا انعقاد کر کے ایصال ثواب کیا۔ میں بذات خود اور شہر کے تمام اہل سنت و جماعت کے علماء اور آپ سے بے پناہ محبت کرنے والے آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

□□□

مولانا اسید الحق قادری ایک عظیم مفکر و مدبر تھے

مولانا محسن الہدی مصباحی

استاذ: الجملۃ الاشرفیہ مبارک پور، عظیم گڑھ (یوپی)

شہید قادری محبت مکرم حضرت مولانا اسید الحق قادری رحمہ اللہ تعالیٰ ایک متواضع، منکسر المزاج، پختہ قلم کار، مخصوص صلاحیت کے مالک اور جہت حق در در رکھنے والے عظیم مفکر و مدبر تھے۔ خدا تعالیٰ نے شہید قادری کے قلم میں بے شمار برکتیں ودیعت فرمادی تھیں کہ چند ہی سال کے اندر سو سے زائد کتب پر ان کے قلم سیال نے کام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے منصفہ شہود پر جلوہ بار ہو گئیں۔

میں نے انہیں اس وقت بہت قریب سے دیکھا جب ۲۰۰۰ء میں الجملۃ الاشرفیہ کا جامعہ ازہر قاہرہ سے رابطے کی خاطر میرا دورہ ہوا، جب مولانا موصوف رحمہ اللہ تعالیٰ کو خبر ہوئی تو بڑی لگن کے ساتھ حضرت مولانا محمد نعمان ازہری کی معیت میں میرے اہداف کی تکمیل میں مجھے رہے۔ رئیس ازہر اور شیخ الازہر سے ملاقات کے لیے ایک وفد کی تشکیل میں پیش پیش رہے اور رائی قدر ڈاکٹر حازم محفوظ، استاذ جامعہ ازہر کی مساعی جمید بھی ناقابل فراموش ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کے ازہر شریف سے معاو لے کی درخواست جامعہ میں عربی ادب کی تعلیم کے لیے ازہر سے استاذ کی فراہمی، جامعہ کے فضلا کے ازہر میں داخلے کا معاملہ اور کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن کی توثیق وغیرہ وغیرہ کئی امور پر مشتمل درخواست رئیس ازہر کو پیش کی گئیں اور اس کی خبر وہاں ’صوت الازہر‘ اور ’الجمہوریہ‘ وغیرہ اخبار میں شائع ہوئی۔ وہاں ’مدینۃ البعوث‘ میں برصغیر کے ازہری طلبہ کے ساتھ میری ایک اہم میٹنگ ہوئی، اسکندریہ و دسوطا وغیرہ کا بھی دورہ ہوا اور حضرت شہید قادری میرے ساتھ ہرمون پر پوری دلچسپی کے ساتھ مرحرم عمل رہے۔ حتیٰ کہ ہوائی اڈہ پر الوداع کہنے کو بھی موجود رہے۔ بڑے خلیق، ملنسار، علمی وقار، فاضلانہ کردار و گفتار۔ حضرت موصوف کی شہادت سے جماعت میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ خدا عزوجل اپنے کرم خاص سے اس خلا کو پرفرمائے اور جماعت اہل سنت کو حضرت شہید قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہم البدل عطا فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ اہل خانہ اور احباب کو صبر و شکر کی توفیق بخشے، آمین۔

□□□

یہ ایک فرد کا نہیں پوری ملت کا غم ہے

ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی

مدیر اعزاز می: ماہنامہ ماہ نور، دہلی

فخر علم و تحقیق حضرت مولانا اسید الحق عاصم القادری کی زندگی میرے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ ان کی کتاب حیات کو بڑے قریب سے دیکھنے، سننے، پڑھنے کا موقع ملا بلکہ وہ تو میرے قریبی دوستوں میں سے تھے، جماعتی مسائل پر تبادلہ خیال، امت کی اصداغ اور عروج و قیوم کی پرورش میں میں ہر قدم پر ان کے ساتھ رہا، وہ ہمارے حلقہ احباب میں سب سے محترم، قابل قدر بلکہ سرمایہ افتخار تھے۔ قدرت کی فیاضی نے انہیں بہت سے انعامات سے نوازا رکھا تھا۔ بعض لوگ ایسی شخصیت کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں لیکن انہ کے اس بندے کی خوبیوں کا مجھے شروع ہی سے اعتراف تھا، یہی وجہ ہے کہ میں اس عبقری وقت، نیک سیرت انسان کا دل سے احترام کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے اسلاف کی سچی تصویر تھے، ان کی علمی روایتوں اور تہذیبی شرافت کے وارث کامل تھے، اپنے گونا گوں کمالات اور خوبیوں کے باعث اگر ایک طرف اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گئے تو دوسری جانب اکابر علم اور علمی شخصیات کی نگاہ و توجہ و التفات کا مرکز بن گئے تھے۔ دلالت فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

علمی دنیا میں جہاں وہ درس و تدریس کے اعلیٰ علمی عہدے صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے تو دوسری جانب قرطاس و قلم کے میدان میں بھی اپنی بلند پایہ علمی خدمات کا مظاہرہ کیا، درجنوں تحقیقی موضوعات پر علمی اسلوب میں کتب میں تصنیف فرمائیں۔

علم کے لیے عجب و خود نمائی اور خود ستائی ایک ایسی دیمک ہے جو کہ اسے کھوکھلا اور بے جان کر دیتی ہے اور عجزی، انکساری و فروتنی ایسے جامع اوصاف ہیں کہ اسے بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں۔ بجز اللہ مولانا اسید الحق قادری بدایونی جن کے سر پر اپنے اسلاف و اکابر کی دعاؤں کا سائبان تھا ہوا تھا وہ اس موذی و مہلک مرض سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ ان کی شخصیت یقیناً امت مسلمہ کے لیے بے مثال نعمت، انمول جواہر اور سرمایہ افتخار تھی، وہ اختلاف و مخالفت سے بے نیاز ہو کر اپنی علمی تحریکی اور تبلیغی و دعوتی مشن میں لگے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمر عزیز کے نہایت قلیل عرصے میں انھوں نے علم و فن کی جو بے نظیر خدمت انجام دی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ جانے کو تو وہ چلے گئے لیکن پوری امت ’سمد آج ان کے غم میں

سرا پاغزہ بنی ہوئی ہے۔ ایسے ہی حضرات کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے:

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں

اُن کے اچانک سانحہ ارتحال سے علم و تحقیق کی دنیا میں جو عظیم خلا پیدا ہو گیا ہے شاید ایک طویل مدت تک پورا نہ ہو سکے۔ ان کا وصال ملت اسلامیہ ہند کی بے بے نہیں بلکہ عالم اسلام کے لیے ایک اعصاب شکن صدمہ اور مسہم امت کے لیے اس صدی کا سب سے بڑا علمی خسارہ ہے۔ پوری ملت اسلامیہ ان کے غم میں سو گوار ہے، کیونکہ یہ شخص ایک فرد کا غم نہیں، بلکہ یہ پوری ملت اور جماعت کا غم ہے۔

ان کا سانحہ ارتحال اگر طبعی ہوتا تو ہم کچھ دیر کے لیے صبر کر لیتے لیکن وہ متقدمین کی دہشت گردی کے شکار ہوئے ہیں۔ ان کی شہادت پر پوری ملت اسلامیہ شدت غم سے چیخ پڑی ہے۔ ان کی بارگاہ میں ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا خراج عقیدت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان کے یوم شہادت ۲۴ مارچ کو ہر سال بطور ”یوم انسداد دہشت گردی“ کے منایا جائے۔ یہ ان کی روح کے لیے سب سے اہم خراج عقیدت ہوگا، کیونکہ وہ علمی و فکری انقلاب کے ساتھ اتحاد امت کے بھی سفیر تھے۔

آپ کے اچانک سانحہ ارتحال پر گرامی قدر مولانا سید ابوالحسن اشرفی اور محبت گرامی سید ظفر اقبال اشرفی (یو کے) نے راقم الحروف سے گہرے رنج و غم اور صدمے کا اظہار کیا۔ میں ذاتی طور سے علامہ کی شہادت پر ان کے محترم والد گرامی حضرت مولانا شیخ عبدالحمید سالم القادری اور ان کے عزیز بھائی مولانا عبدالغنی عطیف قادری کی خدمت میں، جن کی نگاہوں کے سامنے یہ شہادت ہوئی، اظہار تعزیت کرتے ہوئے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ ان کے بہماندگان اور جملہ احباب و اعزہ خصوصاً ان کی اہلیہ و اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور خانوادہ قادریہ کو ان کا صحیح غم البدل عطا فرمائے، آمین۔

□□□

مولانا اسید الحق قادری تاریخ دہم کر گئے

ملتی آل مصطفیٰ مصابی

جامعہ امجدیہ رضویہ، گھوسی، منو (یو پی)

یہ معلوم کر کے بزرگ و غم لاحق ہوا کہ محبت مکرم مولانا اسید الحق عاصم القادری ولی عہد آستانہ عالیہ قادریہ بدایوں، بغداد شریف میں ایک دہشت گردانہ حملے میں شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا موصوف کا اچانک وصال کر جانہ صرف خاتفہ قادریہ بدایوں کا نقصان ہے، بلکہ یہ قوم و ملت کا بھی بڑا نقصان ہے اور سنیت کا عظیم خسارہ۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ تمامی حضرات خصوصاً صاحب سجادہ خاتفہ قادریہ بدایوں کو صبر جمیل عطا کرے۔

مولانا مرحوم دنیا سے چلے گئے مگر اپنے ساتھ کچھ ایسی خوبیاں بھی لے گئے جو، اب ان کے معاصرین میں نظر نہیں آتیں، وہ اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، جن کے آباؤ اجداد نے دین و سنیت کی خدمت کے حوالے سے عظیم و تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے، وہ خود اس حوالے سے ایک تاریخ رقم کر گئے، وہ کئی بار گھوسی آئے، اپنے زمانہ طالب علمی میں تو متعدد بار اپنے استاذ امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب کے ہمراہ کئی بار جامعہ امجدیہ آئے، زیادہ تر اس فقیر کے یہاں قیام رہتا اور دیر رات تک علمی و فنی موضوعات پر بحثیں ہوتیں۔

مولانا نے ذہانت و خداداد پائی تھی، اس لیے وہ بھی بحثوں میں دل جمعی سے شریک ہوتے، وہ خواجہ صاحب کے تلمیذ رشید نہیں، ارشد تھے، ان کے عہد طالب علمی کی ان ملاقاتوں نے ایک دوسرے کی قدردانی اور محبت پر ہمیز کیا اور کم عمر ہونے کے باوجود ایک ایچھے دوست بن گئے، جب وہ جامعہ امجدیہ گئے تو خیر و خیر، علمی مشاغل اور وہاں کے حالات پر مشتمل خطوط بھی ارسال کرتے رہے، جب مجھے ”الاشاہ والظاہر“ ابن نجیم حنفی کامل

اور رسائل ابن عابدین (شامی) کی ضرورت پڑی تو انہوں نے مصر سے ایک مولانا صاحب کے بدست بھیجا، جس سے کتاب کی تعلیم و تدريس اور فقہی مسائل کے حل میں بڑی مدد ملی، ان کے علاوہ درجنوں کتب و رسائل جو تاج الفحول اکیڈمی کی مطبوعات ہیں انہوں نے بھیجے۔ کئی بار مدرسہ قادریہ بدایوں کی قدیم لائبریری سے چند نایاب کتابوں کے مطالعے کی ضرورت پڑی تو انہوں نے وہ کتابیں بھیجیں۔

جب مسئلہ ”کفایت“ پر ملک کے کثیر الاشاعتی اردو روزنامہ ”راشتر یہ سہارا“ اخبار میں میرے خلاف وہابیوں کے بیانات شائع ہوئے تو جوابی مضمون و بیان کو شائع کروانے میں انہوں نے اپنی کوشش صرف کی، جس سے متعدد اخبار میں وہابیوں کے خلاف میرا جوابی مضمون شائع ہو گیا۔ وہ حضرت سیف اللہ المسلمول و حضرت تاج الفحول و دیگر بزرگوں کے اعراض کے موقع پر بڑے خصوص سے دعوت نامے بھیجتے، مگر میں اپنی حدیم الفرضی کے باعث شریک نہیں ہو پاتا، کم ہی تقریرات میں شرکت ہوگی، جشن صد سالہ حضرت تاج الفحول کے موقع پر انہوں نے بحیثیت خطیب اور سیمینار میں بحیثیت مضمون نگار مدعو کیا، کئی احباب بھی ساتھ تھے اور شرکت ہوئی، اس سال عرس قادری کی دعوت تو بڑے اصرار سے دی، جس میں حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شہزادے حضرت سید محمد توفیق گیلانی مدظلہ العالی بھی تشریف فرما تھے، شاید زیادہ اصرار اس لیے تھا کہ اب آئندہ خاص اُن کی جانب سے دعوت کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ اس بار اتفاق ایسا ہوا کہ مارہرہ مطہرہ کا عرس مبارک بھی انہی ایام میں تھا، اس طرح مختصر وقت میں دونوں عرسوں میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔

وہ ایک اچھے قلم کار بھی تھے، متعدد موضوعات پر ان کے مقالات و مضامین قارئین سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اعلیٰ حضرت، مجددین و ملت امام احمد رضا قدس سرہ پر بھی انہوں نے نراں قدر مضامین و علمی مقدمات لکھے، ابھی حال میں اعلیٰ حضرت کے دو تصدیق ”تفسیر تان راجحان“ جو سیف اللہ المسلمول علامہ شاہ فضل رسول بدایونی قدس سرہ کی مدح میں کہے گئے ہیں، اس کی ایک نئی عربی شرح کا علمی و بدیع تنقیدی جائزہ لیا، جو ہنامہ جام نور میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔

وہ ایک عمدہ ناقد بھی تھے، ”خامہ تلاشی“ کے عنوان سے ماہنامہ ”جام نور“ میں ان کی علمی و ادبی و لسانی تنقیدیں ان کے ایک اچھا ناقد ہونے کا پتہ بتاتی ہیں۔ وہ ایک اچھے محقق بھی تھے اور مصنف بھی اور باصلاحیت مدرس بھی۔ انہوں نے مدرسہ عالیہ قادریہ کے نظام تعلیم و تربیت میں کافی خوش گوار تبدیلی پیدا کی، جس سے یہ ادارہ اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے پھر سے پابند رکاب ہو گیا۔ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کا خاص خیال رکھتے تھے، اہل سنت کے مابین ہونے والے اختلاف سے اپنے کو دور و نفور رکھنے کی کوشش کرتے، ہنی خانقاہوں اور ان کے ارباب حل و عقد کا احترام کرتے، عوام و صلا کی تعظیم و تکریم میں حتی المقدور کمی نہیں ہونے دیتے۔ اب جب کہ وہ بغداد معلیٰ میں ایک دہشت گردانہ حملے میں شہید ہو گئے، تو ان کی یاد کچھ لگتی ہے، ان کے دینی و علمی کارنامے یاد آتے ہیں، ماضی کی سچی مجلس نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہیں، البتہ یہ سن کر اطمینان و خوشی ہوتی ہے کہ اپنے دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کو اچانک چھوڑ کر جدا ہونے والے اس عالم دین کو حضور غوث الثقلین، تاج دار بغداد، سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جوار کرم میں دفن ہونا نصیب ہوا ہے، جو ان کے مغفورہ اور جنتی ہونے کی واضح علامت ہے۔ غالباً رب کریم نے ان کی علمی و دینی خدمات، ان کے خصوص، ان کی محبت اور بزرگوں سے عقیدت و احترام خصوصاً نسبت قدسیت کی پختگی کی وجہ سے انہیں یہ سعادت عطا فرمائی ہے، استاذان میر کا یہ شعر رہ کر یاد آتا ہے:

مرگد مجنوں پہ عقل گم ہے میر کیا دوائے نے موت پائی ہے

ان کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، میں انہیں ان الفاظ میں دعا دیتا ہوں جن الفاظ میں اعلیٰ حضرت مجددین و ملت علیہ الرحمہ نے ان کے جد امجد حضرت سیف اللہ المسلمول کو اپنے تصدیقے میں دعا دی تھی:-

اللہ یجزیہ الجنان کما بنی للدين قصرا جیدا لارکان

□□□

ملفی محمد کرم خان محمود قادری

چیف ایڈیٹر: ماہنامہ جہان محمود، کراچی (پاکستان)

ہزاروں سال نرس اپنی بے نوری پر روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ویر پیدا

ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے جب مولانا اسید الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ ہمارے درمیان موجود تھے۔ ان کی تقریروں، تحریروں سے ہم پاکستان میں بیٹھ کر مستفید ہوا کرتے تھے۔ گا ہے بگا ہے سوشل میڈیا نیٹ ورک کے ذریعے اور براہ راست فون پر ان سے بات ہو جایا کرتی تھی، لیکن ہائے افسوس! اب ہم ان کی اعلیٰ فکر، بلا سوچ اور سنیت کے لیے ان کی دردمندانہ تڑپ سے محروم ہو گئے۔ اس وقت سنیت کو جس اعلیٰ فکر کی ضرورت تھی وہ اعلیٰ فکر مولانا اسید الحق قادری بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود تھی۔

مگر افسوس کہ آج سنیت ایک عظیم مفکر سے محروم ہو گئی۔ جس سانچے سے آپ اور پوری اہل سنت گزری اور گزر رہی ہے اس کو بھلا نا شاید اتنا آسان نہیں۔ لیکن اللہ رب العالمین کو شاید یہی منظور تھ۔ علامہ کے لیے دس کی گہرائیوں سے دعا نکل رہی ہے کہ مولیٰ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرما کر لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور بالخصوص مولانا اسید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ کو جو محبت والفت ان سے تھی اس پر میں صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین (مکتوب بنام خوشتر نورانی)

□□□

مولانا اسید الحق قادری علما کے لیے مینارۂ نور تھے

مولانا محمد انوار احمد قادری

نائب شیخ التفسیر: جامعہ نظامیہ و ایڈیٹر مذہبی سلیمنٹ روزنامہ ”اعتماد“ حیدرآباد (دکن)

آں محترم کے عزیز القدر فرزند اور اہل سنت کے ذی وقار محقق مولانا اسید الحق قادری کو شہر بغداد کے قریب دہشت گردانہ حملے میں شہید کیے جانے کی خبر نے بالخصوص علمائے اہل سنت کو غمزدہ کر دیا۔ برصغیر میں مولانا اسید الحق علمائے اہل سنت کے نوجوان طبقے کے لیے مشعل راہ اور مینارۂ نور کی حیثیت تھے۔ انہوں نے علم و فضل اور نقد و تحقیق کی نئی گریں کھولیں، علما کی نئی نسل کو ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل پر نظر رکھنے کا ہنر سکھایا، ان کی تحریروں نے بعض جزئی امور میں اہل سنت کی روایتی سوچ سے باہر آنے کا مودبانہ سلیقہ دیا۔ ۲۰۱۱ء میں اپنے دورۂ حیدرآباد کے موقع پر جامعہ نظامیہ تشریف لائے تھے، اس وقت احقر کو موصوف سے ملاقات اور بعض تحقیقی امور میں گفتگو کا موقع ملا تھا، وہ جامعہ نظامیہ اور اس کی علمی سرگرمیوں کو از حد پسند کرتے تھے اور شیخ الاسلام حضرت انوار اللہ قادری علیہ الرحمہ اور علمائے جامعہ نظامیہ کی تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

بارگاہِ غوثیت سے تعلق خاطر آپ کے خانوادے کا طرۂ امتیاز ہے، چنانچہ احقر کا یہ احساس ہے کہ حضور پیران پیر علیہ الرحمہ نے مولانا اسید الحق عاصم القادری کو اپنے ”ابدی قرب“ سے سرفراز کر کے نہ صرف ان کو اور خانقاہ قادریہ بدایونی شریف کو اپنی رضا و خوشنودی کی سند عطا کی ہے، بلکہ حضرت غوث اعظم و دیگر علیہ الرحمہ سے محبت رکھنے والے ہند کے تمام علماء و مشائخ پر لطف و کرم کی بارش فرمائی ہے۔ اس موقع پر میں شہید بغداد کے جمیع افراد خاندان اور رفیق خاص مولانا خوشتر نورانی صاحب سے بھی اظہارِ تعزیت کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مولانا محمد عبد الغنی عطیف میاں کی اپنے برادر کلاں کے مشن کو آگے بڑھانے میں مدد فرمائے۔ (مکتوب بنام حضرت شیخ عبد الحمید محمد سالم قادری)

□□□

ملفی محمد حسان رضا قادری المدنی

دارالافتا کتزلایمان، باری چوک، کراچی (پاکستان)

محبت محترم اور شفیق رہنما حضرت مولانا اسید الحق عاصم القادری بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شہادت کے دن عشا کے بعد مجھ سے کسی نے فون پر معلوم کیا کہ یہ بات صحیح ہے کہ اسید الحق صاحب کو شہید کر دیا گیا ہے، اور اس کے sms چدے جارہے ہیں؟ حقیقت حال معلوم نہ ہونے کی وجہ سے میں نے انکار کیا اور کہا ایسے sms ہمارے یہاں بند کے دیگر علاقے کے لیے پہلے بھی چلائے جا چکے ہیں۔ لیکن فون بند کرنے کے بعد دل پر ایک عجیب سی بے چینی طاری ہو گئی، میں نے مولانا حسین مدنی کو فون کیا کہ کیا خبر صحیح ہے؟ جب انہوں نے بتایا کہ یہ خبر درست ہے تو بس اب لگا کہ سینے میں دل دھڑکنا بھول گیا ہو، دل بار بار اس خبر کی تردید کرتا رہا اور میں صبح تک بار بار اللہ تعالیٰ سے اس کے پیاروں کے صدقے ان کی عافیت کے لیے دعا مانگا رہا، لیکن صبح کنفرم ہو گیا کہ وہ شہید ہو چکے ہیں۔ یہ خبر ایسی تھی جس نے دل کو بہت اداس کر دیا۔

میں جام نور کا ابتدا میں قاری نہیں تھا، ایک بار کسی نے پڑھنے کے لیے دیا تو مولانا اسید الحق اور بعض دیگر کی احادیث پر تحقیقات اور مباحث نظر سے گزرے جو بے حد پسند آئے، مجھے علوم حدیث سے شغف ہے، حضرت کے کئی مضامین پڑھے تو ان کا فون نمبر حاصل کر کے ان سے رابطہ کیا، سلام و دعا اور تعارف کے بعد فن حدیث کے حوالے سے کچھ سوالات ذہن میں تھے جو ان سے کیے، اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود بڑی شفقت و محبت کے ساتھ جوابات دیے، یوں ان سے تعلق ہو گیا اور فون ای میلز وغیرہ کے ذریعے رابطہ شروع ہو گیا، خاص طور پر تفسیر و حدیث میں ان سے کئی معاملات میں رہنمائی ملتی رہتی تھی، ہند سے ہمارے بے کتا بوں کا حصول مشکل ہوتا ہے لیکن حضرت سے جب تذکرہ کیا حتیٰ الوسع وہ کتا بیں بھجوا دیا کرتے تھے۔ صحیح البہاری کی تحقیق کے دوران بھی کئی مقامات پر رہنمائی فرمائی اور آخر میں بڑی شفقت فرماتے ہوئے ایک علمی اور تحقیقی مقدمہ بزبان عربی اس پر تحریر فرمایا۔

حضرت دو بار پاکستان تشریف لے کر آئے، دونوں بار اس ناچیز کے غریب خانے پر تشریف لائے۔ پہلی بار پاکستان آئے تو ان کے ساتھ مختلف لائبریریز، مکتبوں پر جانے اور علما سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور کئی باتیں اس حوالے سے بھی ان سے سیکھنے کے لیے ملیں، ان کا علمی شغف مزید ظاہر ہوا، نایاب کتابوں کی تلاش کرتے رہتے تھے، پھر اس حوالے سے جو معلومات ہوئیں ان کے بارے میں بتاتے تھے۔ علما کی بارگاہ میں حاضری کا ادب، بعد میں ملاقات کے دوران ان کے اچھے انداز میں تعریف اور بہت باتیں ان میں دیکھنے کو ملیں۔ میں نے ان سے ملاقات میں جہاں اور بہت سی خوبیاں پائیں وہیں انہیں میں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے خانوادہ کا محبت بھی پایا۔ مجھ سے خود انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان میں ایک سے بڑھ کر ایک عالم گزرے ہیں لیکن تین عالم ایسے ہیں جن کی نظیر نہیں: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا عبدالحی فرنگی لکھنوی، اور امین حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ پھر خود فرمایا کہ میری ایک عالم دین (جو ہند کے مشہور و معروف محقق ہیں) سے بحث ہوئی وہ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اعلیٰ حضرت پر ترجیح دیتے تھے، لیکن میں نے کئی دفعہ ان کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ اعلیٰ حضرت ان سے کئی درجہ بڑے عالم دین ہیں۔

ماہنامہ جام نور میں حضرت کی ”خامہ تلاشی“ نے پاک و ہند میں جو دھوم مچائی تھی وہ بیان کرنے کی حاجت نہیں، جب یہ بات سامنے آئی کہ خامہ تلاشی کوئی اور نہیں بلکہ خود مولانا اسید الحق ہیں تو میں نے انہیں فون پر کہا کہ مجھے جہاں اس پر خوشگوار حیرت ہوئی وہیں دکھ بھی ہوا۔ انہوں نے حیرت سے مجھ سے پوچھا: دکھ کس بات کا؟ میں نے عرض کی کہ جب ”خامہ تلاشی“ پڑھتے تھے اور آپ کے مضامین پڑھتے تھے تو خوشی یہ ہوتی تھی کہ ہماری جماعت میں دو ایسے زبردست عالم دین موجود ہیں جو کثیر علوم میں غایت مہارت رکھتے ہیں، لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ دونوں تو ایک ہی ہیں۔

اب ہمارے پاس تو ایک ہی ایسا عالم رہا۔ اس پر حضرت ہنس دیے۔

لیکن آہ اب وہ ایک بھی ہمارے پاس نہ رہے اور ہمیں افسردہ اور رنجیدہ چھوڑ کر چل دیے۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو دل پر ایک اداسی جاتی ہے۔ ان کے لیے بذات خود تو یہ باعث سعادت ہے کہ شہادت کا رتبہ پایا اور مزارِ غوثِ الوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احاطے میں مدفون ہو۔ جو یقیناً برسی صحیح العقیدہ کے لیے سعادت کی معراج ہے۔ لیکن ہم ان کی ذات سے محروم ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنتِ اعلیٰ درجات اور جنتِ الفردوس میں اپنے حبیبِ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا قرب عطا فرمائے، ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور صبر جمیل اجرِ جہل عطا فرمائے۔ اور ان کے طلبہ اور متعلقین کو ان کے مشن کو جاری و ساری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

□□□

نئے عہد کا ایک روشن ستارہ غروب ہو گیا

پروفیسر سید حسین الحق جی

صدر شعبہ اردو، گندھ یونیورسٹی، بوندہ گیا (بہار)
مولانا اسید الحق کی شہادت سے دل بیٹھ گیا۔ میں نے تو ضیاء الحق کی خبر پر جو پہلا اور فوری تاثر پوسٹ کیا کہ اہل سنت کا ذیشان، کشادہ دل اور کشادہ دماغ نسل کا روشن ستارہ غروب ہو گیا۔ اس میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا اسید الحق شہید خود تو ستارہ تھے ہی انھوں نے اور مولانا خوش نورانی نے ستاروں کی ایک انجمن سجائی تھی اور اس روشن انجمن کا آسمان جامِ نور تھا (اور ہے اور اللہ قیامت تک اسے قائم رکھے)۔ مولانا اسید الحق شہید اور ان کی ٹیم نے جس طرز فکر اور طرزِ سخن کی طرح ڈالی ہے اور شیخ جلالی ہے، بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی لوگم نہ ہو، اس کا خیال رکھیں۔

□□□

یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہے

مولانا محمد شفا تابش قصور

استاذ: جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور (پاکستان)
یہ افسوس ناک خبر ملی کہ آپ کے صاحبزادہ مولانا علامہ اسید الحق عاصم القادری بدایونی علیہ الرحمہ بغداد شریف میں جامِ شہادت نوش فرما گئے ہیں۔ مرحوم بلاشبہ ”موت العالم موت العالم“ کے مصداق ٹھہرے۔ نیز متعدد شہادتوں کے جامع، مسافرت میں وصال، اولیائے کرام کی زیارت بے وطنی میں کوچ، و من ینخرج من بیتہ مهاجراً الی اللہ و رسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ، مرحوم کا سفر توسنِ اولیٰ الآخرہ، اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا و خوشنودی سے ہی عبارت تھی، سو انہیں جو غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ میں شہادت کی صورت میں ہمیشہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

تاہم فطرتاً ان کی فرقت و جدائی اور پھر آخری وقت چہرہ تک نہ دیکھنا، والدہ، بہن، بھائیوں، اور اہل سنت کے لیے عظیم صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس ناقابلِ بیان رُخ پر اپنے کرمِ کام مرہم رکھے، اور دیگر اہل خانہ کو برداشت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ حضرت صاحبزادہ مولانا اسید الحق قادری علیہ الرحمہ کے علمی و قلمی کارناموں سے بندہ اچھی طرح متعارف ہے۔ مجموعہ ”رسائل فضل رسول“ کا ترجمہ، تخریج و ترتیب نے برصغیر پاک و ہند میں خوب شہرت پائی اور اہل علم و قلم نے خوب داد دی، ان رسائل کی اشاعت صاحبزادہ صاحب کا ناقابلِ فراموش اور عظیم الشان کارنامہ ہے جو آپ کی حسنات میں ہمیشہ اضافہ کرتا رہے گا۔

□□□

ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں

مولانا مظہر الاسلام ازہری

ڈاکٹر کٹر: البیج انٹرنیٹ ٹیوٹ، نارتھ کیرولینا (امریکہ)
۲۴ مارچ ۲۰۱۳ء امریکی وقت کے مطابق صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ہندوستان سے رفیق محترم مولانا صاحب فطرتویری قادری کا فون آیا، مگر میں فون ریسپونڈ نہیں کر سکا اور پھر میں نے مولانا کو ڈائل کیا۔ مولانا معمول کے خلاف پریشان لگ رہے تھے، ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ میں نے ان سے پوچھا سب ٹھیک تو ہے؟ جواب نفی میں تھا اور ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ ایک اڑتی ہوئی خبر آ رہی ہے کہ اپنے شیخ صاحب بغداد میں شہید ہو گئے، خبر مصدقہ نہیں ہے، آپ پتہ کیجیے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ یقین کر لیا جائے، اس لیے میں الجھتا رہا، خبر کی تحقیق کا فوراً کوئی اور ذریعہ بھی نہیں تھا۔ ہندوستان سے متعلق جب بھی کسی طرح کا مسئلہ پیش آتا تو میں عام طور پر شیخ صاحب کو ہی فون کرتا تھا، اب چوں کہ یہ خبر انہی سے متعلق تھی، اس لیے کس سے تحقیق کرتا؟ ہند میں اپنے دوست مولانا خوشتر نورانی کو فون کیا، گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر انھوں نے فون نہیں ریسپونڈ کیا، کچھ دیر بعد دوبارہ انہیں فون لگایا تو ان کا موبائل سوئچ آف تھا۔ اب میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بالآخر مدرسہ قادریہ بدایوں فون کیا، شیخ صاحب کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ عزام میاں نے فون اٹھایا، فون اٹھاتے ہی وہ زار زار رونے لگے، میں سمجھ گیا اب کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔

اسی افراتفری میں میں نے ان سے مولانا عطیف قادری سے بغداد شریف میں رابطے کے لیے نمبر مانگا، انہوں نے مجھے نمبر دے دیا۔ میں نے ہمت کر کے صاحبزادہ عطیف میاں کو بغداد شریف فون لگایا، مولانا نے فون اٹھاتے ہی کہا شیخ صاحب ایک دہشت گردانہ حادثے میں شہید ہو گئے۔ اس وقت جو میری کیفیت ہوئی، اس کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

کچھ دیر کے بعد امریکہ میں موجود علمائے کرام کے فون آنے لگے، ہر شخص اس خبر پر رکتے میں تھا۔ کتابوں میں پڑھا ہے کہ خبر متواتر میں شکوک و شبہات نہیں ہوتے، مگر یہ ایسی متواتر خبر ہے کہ آج بھی دل اس کی تصدیق کرنے کو تیار نہیں کہ ایک چلتا پھرتا نیک طینت انسان، عروج و کمال کی بلندیاں جس کے زیر نگین ہو رہی ہوں اور جس کا چرچا چار دانگ عالم میں یکساں بج رہا ہو اور جس کے علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور جس کے آداب و اخلاق کا سورج نصف النہار پر پہنچنے کے بعد اچانک غروب ہو جائے گا۔ میرے ان سے کس قدر گہرے تعلقات تھے اور علمی مراسم تھے ان سب کا بیان یہاں مشکل ہے، اس وقت میرا قلم اتنا کوتاہ اور الفاظ اتنے محدود ہیں کہ میں اپنے جذبات کو تحریر کا لباس پہنانے سے بھی قاصر ہوں۔ بس متنبی کا ایک شعر لکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہوں:

فقدت بفقدك نیراً لا یطلع

من للمحافل والجحافل والسریر

مولائے قدیر تاجدار اہل سنت حضرت مولانا الشاہ سالم میاں قادری مدظلہ العالی، ان کے اہل خانہ، مولانا عبد الغنی عطیف قادری، مولانا عزام میاں قادری اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حضرت علامہ شیخ اسید الحق قادری کا فن تفسیر میں اختصاص تھا اور اس پر گہری نظر بھی، جس پر ان کی اہم کتاب ”قرآن کریم کی سائنسی تفسیر“ شاہد ہے۔ علم تفسیر کے ساتھ علم حدیث پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، پچھلے دس برسوں میں تو اتر کے ساتھ حدیث کے موضوع پر ان کے بے شمار تحقیقی مقالات اور کتابیں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اسی طرح عقیدہ، کلام، فقہ اور تصوف سے متعلق ان کے تحقیقی شاہ پاروں پر اگر نظر ڈالی جائے تو علم حدیث پر ان کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ فن تفسیر میں اختصاص کے باوجود علم حدیث پر ان کا زیادہ کام ہے۔ اپنی علمی زندگی کا آغاز بیک وقت انہوں نے مختلف موضوعات پر تحقیقی مقالے، مضامین اور تصنیفی کام سے کیا۔ جستجو اور تحقیق ان کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ جب بھی کسی کتاب کو پڑھتے تو بڑی گہری اور باریک نظروں سے پڑھتے اور اس پر ان کے ایرادات، افادات یا تبصرے ضرور ہوتے۔ دوران مطالعہ اہم نکات کی طرف ان کی توجہ رہتی۔ علم حدیث سے انہیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا اور جو علم حدیث پر کسی طرح کا بھی کام کرتا اس کی وہ ضرورت تعریف کرتے اور اپنے ازہری تحقیق و تنقید کی روشنی میں دلچسپی کے ساتھ اس تحریر کا مطالعہ بھی کرتے۔

ایسی شخصیات اللہ تعالیٰ کو بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ رب قدیر وقتے وقتے سے ایسی شخصیات کو بھیجتا ہے جو پوری طرح اپنے مشن اور اپنے کام سے آگاہ ہوتی ہیں۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ ”کم وقت میں کام زیادہ“ کرنا ہے۔ علامہ اسید الحق قادری کی زندگی کا سفر بھی ہنگامی انداز سے جاری رہا۔ بحیثیت ناقد، محقق، ادیب، محدث، مفسر اور ماہر لسانیات انہوں نے بے شمار کام یادگار چھوڑے ہیں جو ہم سکھوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ رب قدیر ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

□□□

مولانا اسید الحق قادری محبوب غوث اعظم ہیں

مولانا اسید اور چچی

بانی: جامعہ صدیہ، بھیمونڈ شریف، ضلع اوریا (یوپی)

زبدۂ ارحمن جناب ایڈیٹر صاحب ماہ نامہ جام نور دہلی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ المسجود برکاتہ

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

خیریت موجود عافیت مجھوں اصلا و قطعاً ملت کا ترجمان ماہ نامہ جام نور دہلی کے

۱۴۳۵ھ

۲۰۱۳ء

۲۰۱۳ء

میں اشاعت کے لئے تحفہ مادہ ہائے شہادت محسن العصر ماہ تابندہ غوث لخت جگر اصفا متواضع پاک دامن

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

۲۰۱۳ء

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

اعلیٰ مقام خندہ لب منکر المزاج ماہ ہند شہید بغداد محبوب غوث قطب المحققین

۱۴۳۵ھ

۲۰۱۳ء

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

عرف والی قوم جناب محمد سالم میاں صاحب قبلہ زید مداحہ

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

ابن محبت مولیٰ عالی جناب شیخ عبدالحمد

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

صاحب سجادہ آستانہ عالیہ قادریہ مولوی محمد بلدہ آباد بدایوں شریف

۲۰۱۳ء

۲۰۱۳ء

سن فروزاں تیرہ سو پچانوے ہجری مطابق چھٹی سن انعام انیس سو پچتر عیسوی روز عالم افزہ منگل ایک بجے رات

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

شہادت فرزند بلند نصیب دو جمادی الاولیٰ سن چودہ سو پچتریس ہجری دن نہ شنبہ ہے

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

مطابق چار مارچ سن انقلاب زدہ دو ہزار چودہ عیسوی بنویس بالیقین کل عمر اڑتیس سال نو ماہ ستائیس یوم

۱۴۳۵ھ

۲۰۱۳ء

قال القوی الباسط الا الذین آمنوا و عملوا الصلحت قال بار من صار بالعلم حیا لم یمت ابدا

۲۰۱۳ء

۱۴۳۵ھ

صاحب حسن وجاہ مولانا اسید الحق المعروف ”شیخ صاحب“ لایق فائق صدر المدرسین مدرسہ عالیہ قادریہ مولوی محمد بدایوں

۲۰۱۳ء

۲۰۱۳ء

شہید حکمی محبت سعید عزیز مولانا اسید الحق قادری بدایونی عالم ربانی اسید الحق عثمانی بدایونی جان داد

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

امیر قیامت عزیز مولانا اسید الحق قادری طیب مزاج صاحب ”حدیث افتراق امت“ چل بسا

۱۴۳۵ھ

۲۰۱۳ء

افسوس پاک و صاف مصنف ”احادیث قدسیہ“ چلا گیا عارف حق مصنف ”اسلام جہاد اور دہشت گردی“

۱۴۳۵ھ

۲۰۱۳ء

بھیا کی کتاب ”اسلام ایک تعارف“ دکھائیے ”قرآن کی سائنسی تفسیر“ نامحدود ہائے مصنف ”تحقیق و تفہیم“

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

دندان شکن ”خامہ تلاشی“ کا جواب نہیں صاحب ”خیر ابادیات“ چل بسے صد آہ مظلوم شہید

۲۰۱۳ء

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

آہ فخر خاندان قادری کہاں گیا وہ پاک باطن دیا ر غوث میں سو گیا

۲۰۱۳ء

۲۰۱۳ء

در صنعت زہد و بندگی

متنازع زہد الخلاق عالم اہل سنت صاحب آہ محبوب تاج الخول بدایوں

۲۰۱۳ء

۱۴۳۵ھ

۱۴۳۵ھ

□□□

سستی صحافت اور دینی لٹریچر کے احیاء کے لیے سنگ میل
ملت کے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کی طرف ایک بنجیدہ قدم
مجلد لاہور

حجة الاسلام

مدیر: محمد رضا احسن قادری

- * نظریاتی تخریب کاری، غیر علمی مزاج اور فکری تحکم کے خلاف مستحکم محاذ
- * حساس موضوعات اور گنجلک معاملات پر نباض اہل قلم کی تحریرات سے بھرپور
- * نامور شخصیات اسلام کی خدمات کے اعتراف میں خصوصی نمبرز
- * عالم اسلام میں انقلاب برپا کرنے والی ہستیوں اور تحریروں کے تعارف و اشاعت کا مرقع
- * امت کے داخلی و خارجی مسائل کے موزوں حل کی تلاش میں پُر عزم

دارالاسلام و بان محمد مولانا قادری، اردو بنگالہ، لاہور، پنجاب، پاکستان

(۴)

پس منظر

خانوادہ عثمانیہ: تعارف و خدمات

خانوادہ قادریہ عثمانیہ برصغیر ہندو پاک کا وہ ممتاز و منفرد خانوادہ ہے جس کی دینی و مذہبی، قومی و ملی، مسلکی و مشربی، اور تبلیغی و اصلاحی خدمات کی تاریخ آٹھ صدیوں پر محیط ہے، ان آٹھ سو سالہ تاریخ کے ہر دور میں اس خانوادے کے افراد نے ہر محاذ پر دین و دنیوی کی قیادت فرماتے ہوئے احقاق حق اور ابطل باطل کا اہم فریضہ انجام دیا، ناموس رسالت کی حفاظت و صیانت کے لیے جن علمائے کرام نے تحریراً تقریراً اور عملاً کلیدی کردار ادا کیا، اگر ان کی فہرست تیار کی جائے تو اس خانوادہ عثمانیہ کے افراد کا شمار صف اول میں ہوگا۔ اس خانوادہ میں درس و تدریس، قضا و افتاء، علم و فضل، تقویٰ و طہارت، تصوف و روحانیت خاندانی ورثے کے طور پر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہی ہے۔ بحمد اللہ خانوادہ قادریہ عثمانیہ کے جیالوں نے اپنے اسلاف کی علمی و روحانی میراث کی نہ یہ کہ صرف حفاظت کی بلکہ اس میں شب و روز اضافہ ہی کیا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

تاریخ کے مختلف ادوار میں اس خانوادے میں علماء، فضلاء، اہل اللہ، شریعت و طریقت کے علمبردار، ادبا، شعرا اور قومی قائد پیدا ہوتے رہے اور انہوں نے اپنے اپنے دور میں اسلام و سنیت کی ترویج و اشاعت، نیز قوم و مذہب کی خدمات میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس خاندان میں گذشتہ دو صدیوں میں جو جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخصیات پیدا ہوئیں ہیں، ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

بحرالعلوم ملا محمد علی عثمانی تلمیذ ملا قاضی مبارک (م: ۱۲۷۹ھ)
سیدنا شاہ عین الحق مولانا عبدالحجید بدایونی (م: ۱۲۶۳ھ)
سیف اللہ السلول شاہ فضل رسول قادری بدایونی (م: ۱۲۸۹ھ)
مجاہد آزادی مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (مفقود: ۱۲۷۴ھ)
مولانا نور احمد عثمانی تلمیذ علامہ فضل حق خیر آبادی (م: ۱۳۰۱ھ)

تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی (م: ۱۳۱۹ھ)
سرکار صاحب الاقدار مولانا شاہ عبدالقادر قادری (م: ۱۳۳۳ھ)
مفتی اعظم سلطنت آصفیہ مولانا عبدالقدیر قادری (م: ۱۳۷۹ھ)
مجاہد آزادی مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (م: ۱۳۵۰ھ)
مجاہد ملت مولانا عبدالحمید قادری (م: ۱۳۹۰ھ)
مولانا عبداللہ قادری بدایونی (م: ۱۴۱۵ھ)
یہ اپنے اپنے عہد کی وہ شخصیات ہیں کہ برصغیر ہندو پاک کی عجمی و روحانی، قومی و ملی، دعوتی و تبلیغی اور جماعتی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتی۔

خانوادہ عثمانیہ کے مورث اعلیٰ کی ہندوستان میں آمد:

خانوادہ عثمانیہ کے مورث اعلیٰ، حضرت دانیال قطری علیہ الرحمہ ہیں۔ یہ ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء میں قطر سے ترک وطن کر کے سلطان شمس الدین التمش کے لشکر کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے، ابتداً لاہور میں سکونت پذیر ہوئے، پھر سلطان کے مسلسل اصرار پر بدایوں تشریف لائے، حکومت کی جانب سے عہدہ قضا تفویض کیا گیا، آپ تادم حیات اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ آپ حکومت شمس کے دائرے میں قاضی القضاۃ کے نام سے مشہور ہوئے حضرت دانیال قطری حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے مرید و خلیفہ اور سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز کے برادر طریقت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری علوم کے ساتھ باطنی فیوض سے مستفیض ہوا۔ ۶۱۸ھ میں آپ کا وصال ہوا، پھر مکہ کے جوار میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ آپ کے بعد آپ کی نسل میں ایک سے بڑھ کر ایک علم و فضل، تقویٰ و طہارت، تصوف و روحانیت کا امام پیدا ہوا اور اس نے قوم کی دینی و ملی قیادت و رہنمائی فرمائی۔

خانوادہ عثمانیہ کے بزرگوں کے مفصل حالات جاننے کے لیے

مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے:

- (۱) اکمل التاریخ: مولانا یعقوب حسین ضیاء القادری، مطبوعہ ۲۰۱۳ء
- (۲) طوابع الانوار (تذکرہ فضل رسول) مولانا نور الحق عثمانی، مطبوعہ ۲۰۰۸ء
- (۳) تاج الفحول حیات و خدمات: مفتی عبدالحمید نوری، مطبوعہ ۱۹۹۸ء
- (۴) تذکار محبوب: مولانا عبد الرحیم قادری بدایونی، مطبوعہ ۲۰۰۷ء
- (۵) احوال و مقامات: مولانا محمد عبداللہ قادری، مطبوعہ ۲۰۰۹ء
- (۶) سیف اللہ السلول کا علمی مقام: عبدالعلیم قادری، مطبوعہ ۲۰۱۲ء
- (۷) تذکرہ خانوادہ قادریہ: عبدالعلیم قادری مجیدی، مطبوعہ ۲۰۱۳ء
- (۸) اکابر بدایوں: مولانا احمد حسین قادری گنوری، مطبوعہ ۲۰۱۳ء
- (۹) مولانا فیض احمد بدایونی: پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ ۲۰۰۷ء

خانوادہ قادریہ کا قیام:

خانوادہ عثمانیہ میں علم و فضل، درس و تدریس، تصوف و سلوک کا سلسلہ حضرت قاضی دانیال قطری کے عہد مبارک سے ہی چلا آ رہا ہے، اس خاندان کے مشائخ نے مخلوق خدا کے دلوں کا تزکیہ و تصفیہ کر کے ان کا رشتہ اپنے معبود حقیقی سے مضبوط کیا، خود پرستی کی بیماری میں مبتلا انسان کو خدا پرستی کا راستہ دکھایا، امیر و غریب اور اپنے پرانے سب سے یکساں سلوک اور بلا تفریق مذہب خلق خدا کو فیض رسانی کا سبق دیا۔ اس خاندان عثمانی کے دیگر افراد کے ساتھ شاہ عین الحق عبدالحمید قدس سرہ العزیز قطب زمان قبلہ جسم و جاں سید ابوالفضل آل احمد اچھے میاں مار ہر دو قدس سرہ کے دامن کرم سے منسلک ہوئے، پھر کامل نے جوہر قابل کو اپنی نظر کیا اثر سے رشک جہاں بنا دیا۔ حضرت شاہ عین الحق عبدالحمید شمس مارہرہ حضور اچھے میاں کے چہیتہ مرید و خلیفہ تھے۔ حضرت سید ابوالفضل آل احمد اچھے میاں کے وصال کے بعد شاہ عین الحق عبدالحمید قادری بدایوں تشریف لائے اور ۱۲۳۵ھ میں آپ نے خانقاہ قادریہ کی بنیاد رکھی، جہاں سے قادری و برکاتی فیوض و برکات جاری و ساری ہوئے اور رشد و ہدایت کا آغاز ہوا۔ آج خانقاہ قادریہ کے قیام کو دو سو سال مکمل ہو گئے۔ ان دو صدیوں میں یہاں کے مشائخ و صوفیہ نے دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت، تزکیہ و تصفیہ کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور آج بھی یہ خانقاہ اپنے بزرگوں کے مسلک و مشرب پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے دین و سنیت کی قابل قدر خدمات انجام

دے رہی ہے۔

زیر نظر مقالہ میں میں نے خانوادہ قادریہ میں تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئی ان شخصیات کی دینی و مذہبی اور ادبی و اصلاحی خدمات کا سرسری خاکہ پیش کرنے کی سعی کی ہے جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں درس و تدریس، دعوت و تبلیغ، قضا و افتاء، اصلاح و ارشاد، تزکیہ و تصفیہ کے ذریعے اسلام و سنیت کی خدمات انجام دیں۔

(۱) بحرالعلوم ملا محمد علی عثمانی تلمیذ ملا قاضی مبارک (م: ۱۲۷۹ھ)

آپ کی ولادت ۱۱۳۲ھ/۲۲-۲۱ء میں ہوئی۔ آپ نے اپنے زمانے کے ممتاز علماء سے تحصیل علم کی۔ اس دور میں علامہ قاضی مبارک گوپاموی کا آفتاب علم و فضل نصف النہار پر تھا۔ آپ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ آپ انتہائی ذہین و فطین تھے اور طلب علم کا بے حد شوق رکھتے تھے، آپ کی ذہانت و فطانت دیکھ کر علامہ قاضی مبارک نے انتہائی لگن اور شفقت و محبت سے پڑھایا اور آپ کی خاطر ایک نایاب کتاب تحریر فرمائی جو علمی حلقوں میں ”حاشیہ قاضی مبارک“ کے نام سے متعارف ہے۔ یہ سلم العلوم کی شرح ہے۔ آپ نے اپنے ظاہری و باطنی فیوض سے صد ہا بندگان خدا کو سیراب کیا، حضرت دانیال قطری رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کردہ ”مدرسہ معزینہ“ کا نام ”مدرسہ محمدیہ“ رکھا جو آج زمانے میں ”مدرسہ قادریہ“ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ آپ کا خاص میدان درس و تدریس رہا، بیگزوں تشنگان علوم دینیہ نے اس دریائے ناپیدا کنار سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ۲۵ رجب الثانی ۱۱۹۷ھ/۸۳ء میں یہ علم و فضل کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ آپ کی آخری آرام گاہ شہر لکھنؤ میں عید گاہ کے پاس ہے۔

(۲) مولانا شاہ عین الحق عبدالحمید قادری بدایونی (م: ۱۲۶۳ھ)

آپ حضرت مولانا شاہ عبدالحمید قادری عثمانی (م: ۱۲۳۳ھ) کے بڑے صاحبزادے تھے، ۲۹ رمضان المبارک ۱۱۷۷ھ کو پیدا ہوئے، ”ظہور اللہ“ طے سن ولادت برآمد ہوتی ہے۔ مولانا محمد علی عثمانی، مولانا مفتی شاہ عبدالغنی اور دیگر علمائے کرام سے تعلیمی مراحل طے کیے پھر لکھنؤ جا کر مولانا ذوالفقار علی دہلوی سے علوم اسلامیہ کی تکمیل کی۔ حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا فیہی اشارہ پا کر قبلہ جسم و جاں سید ابوالفضل آل احمد اچھے میاں مار ہر دو کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور

اجازت و خلافت سے نوازے گئے نیز آپ کی بارگاہ سے ”عین الحق“ کا خطاب پایا۔ ۱۲۵۶ھ میں حرمین شریفین کی حاضری سے مشرف ہوئے۔ آپ کو اپنے مرشد برحق حضور شمس مارہرہ ابو الفضل آل احمد مارہروی سے انتہائی والہانہ محبت تھی اور آپ کی جدائی ایک لمحے کو بھی گوارہ نہیں تھی، یہی وجہ تھی کہ جب تک حضور شمس مارہرہ ظاہری حیات میں رہے آپ شب و روز ان کی خدمت میں حاضر رہے، ان کے وصال کے بعد آپ نے بدایوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہاں ”خافقہ قادریہ“ کی بنیاد رکھی، ایک زمانے نے آپ سے فیض پایا۔ ۱۷۱۳ھ میں واصل الی الحق ہوئے اور درگاہ قادری بدایوں میں آسودہ خاک ہوئے۔

قطب زماں شمس مارہرہ حضرت ابو الفضل آل احمد اچھے میاں نے حضرت شاہ عین الحق عبد المجید قادری کے تعلق سے ارشاد فرمایا: ”درویش باید کہ ظاہر ش چوں ابی حنیفہ باشد و باطنش چوں منصور و اس معنی بجز مولوی عبد المجید در دیگر سے ندیدہ ام۔“ (اکمل التاریخ، ص: ۹۹، از مولانا محمد یعقوب خیاء القادری) (درویش کو چاہیے کہ اس کا ظاہر امام اعظم ابو حنیفہ کی طرح ہو اور باطن حضرت منصور کی طرح اور یہ بات سوائے مولوی عبد المجید کے کسی دوسرے میں نہیں دیکھی۔) ایک موقع پر حضور اچھے میاں نے اپنے چہیتہ مرید و خلیفہ کے متعلق فرمایا:

”اگر روز قیامت خداوند کریم کی جناب سے سوال کیا گیا کہ ہماری بارگاہ کے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟ تو میں مولوی عبد المجید کو پیش کر دوں گا۔“

آپ کا اکثر وقت عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ اور ادو و خائف، دعوت و تبلیغ اور وابستگی سلسلہ کی اصلاح و ارشاد میں صرف ہوتا تھا، اس کے ساتھ ہی آپ نے قلمی طور پر بھی دین متین کی خدمت انجام دی، آپ کی قابل ذکر تصنیفات یہ ہیں۔

(۱) مواہب اللسان شرح فارسی جواہر اللسان

(۲) محافل الانوار فی احوال سید الابرار

(۳) ہدایۃ الاسلام در فریقہ اسماعیلیہ و ہابیہ

(۳) سیف اللہ السلول شاہ فضل رسول قادری (م: ۱۲۸۹ھ)

آدی کسی ایک میدان میں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے لیکن بیک وقت مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ حضرت سیف اللہ السلول کی حیات مبارکہ کا یہی پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ آپ کی خدمات کا دائرہ کسی ایک میدان تک محدود نہیں، بلکہ شریعت و طریقت، اصلاح قوم و ملت، قضاء و افتا، تصنیف و تالیف وغیرہ ہر میدان میں آپ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ آپ مختلف علوم و فنون پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تفسیر و حدیث، منطق و فلسفہ، عقائد و کلام، زبان و ادب، شعر و سخن، طب و حکمت، فنون لطیفہ وغیرہ علوم متداولہ کی مستدامت پر مجتہدانہ شان کے ساتھ جلوہ بار نظر آتے ہیں۔ اس خدا داد صلاحیت و استعداد کی بنا پر آپ نے اپنے معاصرین علماء پر ممتاز و نمایاں مقام حاصل کیا، غرض یہ کہ آپ کی ذات ہر زاویہ سے اس قدر مکمل و جامع ہے کہ ایسی جامعیت صدیوں میں کسی کی نہیں نظر آتی ہے۔

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
منٹے نہیں ہیں دہرے جن کے نشان کبھی

آپ کی ولادت ماہ صفر المظفر ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء میں ہوئی، آپ کا تاریخی نام ”ظہور محمدی“ ہے۔ حضور اچھے میاں نے آپ کا نام ”فضل رسول“ رکھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے جد امجد مولانا شاہ عبد المجید قادری سے حاصل کی، گیارہ برس کی عمر میں آپ لکھنؤ تشریف لے گئے، وہاں اپنے وقت کے جید عالم ملا نور الحق فرنگی بکلی (م: ۱۲۳۸ھ) سے جملہ علوم متداولہ میں دسترس حاصل کی۔ محض چودہ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون سے فارغ ہو گئے، پھر حضور اچھے میاں کے حکم سے علم طب کی تحصیل کے لیے حکیم ببر علی موہانی کے سامنے زالوئے تلمذ تہہ کیا، کچھ عرصہ کے بعد اپنے والد اور مرشد برحق شاہ عین الحق عبد المجید قادری بدایونی قدس سرہ کے حکم سے اپنے آبائی ”مدرسہ محمدیہ“ کو ”مدرسہ قادریہ“ کے نام سے موسوم کر کے درس و تدریس میں مصروف ہوئے۔ آپ متعدد بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔

آپ کو غوث اعظم کی ذات سے دیوانگی کی حد تک محبت والفت تھی، ۱۲۷۸ھ میں جب بغداد شریف آستانہ غوث اعظم پر حاضر ہوئے

توقیب الاشراف حضرت سید علی گیلانی قدس سرہ نفس نفیس دروازے پر تشریف لائے اور اپنی مست مبارک پر اپنے پہلو میں بٹھایا، حضور غوث اعظم کی آپ پر بے حد نظر کرم تھی، آپ عین بیداری میں حضور غوث اعظم جیلانی کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ آپ اپنے والد محترم کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، آپ کو ان سے سلسلہ قادریہ کے علاوہ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور ابو الحلائیہ میں اجازت و خلافت حاصل تھی، کبھی آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، اس حالت میں اکثر وقت تنہائی میں جنگلوں میں گزار دیتے تھے۔ قدرت نے آپ کو قلمی صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا، آپ نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کے دور میں بعض لوگ محمد بن عبد الوہاب کے افکار و نظریات سے متاثر ہوئے تو ان کے اسلامی فکر سے متصادم افکار و نظریات کی تردید کرتے ہوئے متحدہ تاریخی اور علمی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مذکورہ تحریک کے رد و ابطال میں ان کتابوں کو اولیت حاصل ہے۔ آپ نے ان مخرف جماعتوں کے خلاف جو بھی کتابیں تصنیف کیں، اس کا حکم بارگاہ الہی سے ملا تھا۔ چنانچہ مولانا یعقوب قادری ”اکمل التاریخ“ میں لکھتے ہیں:

”ایک دن قاضی مولوی شمس الاسلام عباسی مرحوم جو آپ کے والد کے مخصوص مریدوں میں تھے، عیادت کے لیے حاضر تھے حضرت اقدس نے ارشاد فرمایا کہ قاضی صاحب بمختصائے ’و اما بنعمة ربك لحدث‘ آج آپ سے کہتا ہوں کہ دربار نبوت سے فرقہ و ہابیہ نجدیہ کے لیے مامور کیا گیا تھا، الحمد للہ بتائید ایزدی اس فرقہ و ہابیہ ظالمہ اور اس کی ذریات اسماعیلیہ و اسماعیہ کا رد پوری طور پر ہو چکا۔ دربار رسالت میں سعی قبول ہو چکی اور میرے دل میں اب کوئی آرزو باقی نہ رہی، عنقریب اس جہاں فانی سے جانے والا ہوں۔“

آپ نے اعتقادات، درسیات، علم کلام، فقہ و تصوف اور طب میں متعدد کتابیں تصنیف کیں:

(۱) سیف الجبار: (۲) المعتقد المستفاد: (۳) نور المؤمنین بشفاعۃ الشافعیین: (عقیدہ شفاعت) طبع جدید ۲۰۰۹ء (۴) البوارق المحمدیہ:

(۵) اکمال فی بحث شد الرحال (زیارت روضہ رسول) طبع جدید

۲۰۰۹ء: (۶) احقاق الحق و ابطال الباطل طبع جدید ۲۰۰۷ء (۷) تصحیح المسائل (۸) تلخیص الحق: (۹) شرح فصوص الحکم: (۱۰) رسالہ طریقت (۱۱) فصل الخطاب، طبع جدید ۲۰۰۹ء (۱۲) مولود منظوم (اردو) طبع جدید دسمبر ۲۰۰۹ء: (۱۳) حرز معظم (فارسی) طبع جدید ۲۰۰۹ء (۱۴) اختلائی مسائل پر تاریخی فتویٰ طبع جدید ستمبر ۲۰۰۹ء (۱۵) رسالہ در سلوک (۱۶) تثبیت القدیمین (۱۷) حاشیہ میرزا زہد بر رسالہ قطب: (۱۸) حاشیہ میرزا زہد بر ملال (۱۹) طب الغریب (۲۰) شرح احادیث ملقطہ ابواب صحیح مسلم۔

آپ کے تلامذہ کا سلسلہ بہت وسیع ہے جن میں چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(۱) تاج الحول شاہ عبد القادر بدایونی (م: ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)

(۲) مولانا شاہ محمد الدین بن شاہ فضل رسول قادری (م: ۱۲۷۰ھ)

(۳) مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی (مفقود: ۱۲۷۰ھ)

(۴) قاضی القضاۃ مفتی اسد اللہ خاں الہ آبادی (م: ۱۳۰۰ھ)

(۵) مولانا عنایت رسول چر یا کوٹی

(۶) مولانا شاہ احمد سعید دہلوی (م: ۱۳۷۷ھ)

(۷) مولانا کرامت علی جوہوری (م: ۱۲۹۰ھ)

(۸) مولانا عبد القادر حیدر آبادی (م: ۱۳۲۹ھ)

(۹) مولانا سید اشفاق حسین (م: ۱۳۳۸ھ)

(۱۰) مولانا خرم علی بلہوری (م: ۱۲۷۳ھ)

آپ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے اور ”مست“ مخلص فرماتے تھے۔ ۲۰۰۹ء میں تاج الحول اکیڈمی آپ کے کلام کا مجموعہ ”مولود منظوم“ کے نام سے شائع کر چکی ہے۔ ۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۹ھ میں آپ نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ درگاہ قادری بدایوں شریف میں آپ کی آخری آرام گاہ مرجع خلائق ہے۔

(۳) مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (مفقود: ۱۲۷۰ھ)

مجاہد آزادی مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (ولادت ۱۲۲۳ھ

/۱۸۰۸ء) بن مولانا حکیم غلام احمد خانوادہ قادریہ کے چشم و چراغ تھے۔

۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے، جملہ علوم متداولہ اپنے ماموں حضرت

سیف اللہ السلول شاہ فضل رسول قادری سے حاصل کیے، پندرہ سال

کے قلیل عرصے میں فارغ التحصیل ہوئے، اپنے نانا مولانا شاہ عین الحق عبد المجید بدایونی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ آگرہ میں سرشتہ دار ہو گئے۔ درس و تدریس سے شغف رکھتے تھے، اس لیے دوران ملازمت درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، طلبہ اور فقرا سے بے حد محبت کرتے، شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، ”زسوا“ تخلص تھا۔

عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں فکر و سخن کیا کرتے تھے حضرت غوث اعظم کی ذات بابرکت سے بے پناہ محبت تھی۔ غوث پاک کی ذات سے اس قلبی وابستگی پر آپ کا عربی دیوان ”حدیہ قادریہ“ شاہد عدل ہے، اس دیوان میں حضرت غوث اعظم کے مناقب میں ایک ہزار ایک سو گیارہ اشعار ہیں۔ یہ دیوان سرکار صاحب الاقدار حضرت مولانا عبد المتقندر قادری بدایونی کے مقدمے اور حاشیہ کے ساتھ ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا عقد مسنون سیف اللہ المسلمول کی صاحبزادی سے ہوا، جن سے مولانا سراج الحق قادری تولد ہوئے۔

انگریزوں کے خلاف علامہ فضل حق خیر آبادی نے فتویٰ جہاد دیا اس پر اکابر اہل سنت نے دستخط فرمائے۔ اس فتویٰ جہاد پر مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی کے بھی دستخط ہیں۔ جنگ آزادی میں عملاً آپ نے شرکت کی، ترک ملازمت کر کے آگرہ میں آپ نے مجاہدین آزادی کی قیادت و سرپرستی فرمائی، آپ کو تصنیف و تالیف سے بھی شغف تھا، آپ کی اکثر کتابیں زمانہ غدر میں حوادث کی نذر ہو گئیں، جو کتابیں دستیاب ہو سکیں ان میں تعلیم الجاہل، شرح ہدایہ الحکمت، شرح صدرا، التعلیقات علی فصوص القاری، ہدیہ قادریہ اور المقامۃ البعد ادیہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۵۷ء جنگ آزادی کے ہنگامے میں آپ مفقود ہو گئے، بہت تلاش کیا گیا، لیکن کوئی سراغ نہیں ملا، غالب گمان ہے انگریزوں نے آپ کو شہید کر دیا۔

(۵) مولانا نور احمد عثمانی تلمیذ علامہ فضل حق خیر آبادی (م ۱۳۰۱ھ)

حضرت مولانا نور احمد عثمانی بدایونی بن مولانا محمد شفیع عثمانی اس خانوادے کی ایک لائق و فائق شخصیت تھی۔ ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ علوم عقلی و نقلی کی تحصیل حضرت مولانا فیض احمد قادری بدایونی سے کی۔ بعض اعلیٰ کتابیں استاد مطلق علامہ فضل حق خیر آبادی سے پڑھیں، ذہانت و فطانت ورثے میں پائی تھی۔ حضرت

شاہ عین الحق عبد المجید قادری بدایونی کے مرید تھے، درس و تدریس سے طبی شغف تھا۔ تادم حیات درس دیتے رہے اور سیکڑوں تشنگانِ صوفیہ آپ کے بحر علم سے فیض یاب ہوئے۔ غریب، یتیم اور بیواؤں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آپ کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے، جس میں بعض مشاہیر مندرجہ ذیل ہیں:

- (۱) تاج الفحول محبت رسول مولانا شاہ عبد القادر قادری بدایونی
- (۲) مولانا نازح حسین قادری عثمانی (۳) مولانا سراج احمد قادری (۴) مولانا مصاحب علی روسائے محلہ مولوی ٹولہ (۵) مولانا طاہر الدین (۶) مولانا نجم الدین سنبل (۷) مولانا امین الدین خیر آبادی (۸) مولانا اکبر شاہ دلا بختی۔

ان کے علاوہ پنجاب، کابل، فارس و عراق میں آپ سے فیض یاب ہونے والے طلبہ کی تعداد بے شمار ہے۔

”تختہ فیض“ میں حضرت تاج الفحول لکھتے ہیں:

”عمی و استاذی مولانا نور احمد بدایونی کی نظیر دیکھنے میں نہ آئی، بلاشبہ آپ وحید عصر اور یکتائے زمانہ تھے۔ طلبہ کی تعلیم و تدریس اور غربا کی اعانت کے علاوہ شب و روز میں آپ کو کوئی اور کام مرغوب نہ تھا، آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔“

یہ علم و فضل کا آفتاب ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۳ء میں غروب ہو گیا۔

(۶) تاج الفحول مولانا شاہ عبد القادر قادری (م ۱۳۱۹ھ)

تیرہویں صدی ہجری کے اجلہ علما میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ اپنے زمانے میں مرجع علم، کاروانِ سنیت کے علمبردار اور قافلہ تصوف و سلوک کے سالار تھے۔ آپ کی محبت سنیت کی علامت و شناخت سمجھی جاتی تھی۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے جید علما آپ کی علمی عظمت کے معترف تھے اور آپ کو اپنا امام و رہنما تسلیم کرتے تھے۔ آپ کی ولادت ۷۷۱ھ/ ۱۲۵۳ء المرجب ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء میں ہوئی، حضور غوث پاک کے باطنی اشارہ پر آپ کا نام ”عبد القادر“ رکھا گیا، تاریخی نام ”منظر حق“ اور لقب ”شیخ الاسلام فی الہند“ ہے۔ چار سال کی عمر میں آپ کے جد امجد شاہ عین الحق عبد المجید قادری بدایونی نے رسم بسم اللہ خوانی کرائی۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل جد محترم اور والد گرامی حضرت سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول قادری عثمانی کے زیر سایہ طے کیے۔ معقول و منقول کی

اعلیٰ تعلیم استاد العلماء علامہ نور احمد قادری عثمانی اور استاد مطلق علامہ فضل حق خیر آبادی سے حاصل کی۔ اپنے والد گرامی کے زیرِ نگرانی سلوک کے منازل طے کیے۔ تصوف و سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔

آپ نے متعدد بار حج کیا۔ پہلی بار ۱۲۷۹ھ میں زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ اس سفر میں سند لمحہ شین سیدنا شیخ جمال خنی کی سے درس حدیث لیا، پھر شیخ جمال خنی کی علیہ الرحمہ نے اجازت و سند سے نوازا۔ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی الفت و محبت ورثے میں ملی تھی جو آپ کی رگ و پے میں مثل خون سرایت کیے ہوئی تھی۔ درحقیقت آپ فنا فی الغوث کے مقام پر فائز تھے، اس پر غوث اعظم کی شان میں آپ کے چار عظیم الشان دیوان شامہ عدل ہیں، اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ صفا و مروہ پر عالم بیداری میں غوث پاک نے اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔ عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں آپ نے فکر و سخن کیا اور ”فقیر“ تخلص فرماتے تھے۔

استاذ مطلق علامہ فضل حق خیر آبادی آپ کی شان میں فرماتے ہیں:

”صاحب قوت قدیمہ ہر زمانے میں ظاہر نہیں ہوتے۔ وقتاً بعد وقت اور عصر آبد عصر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس زمانے میں کسی کا وجود مانا جائے تو آپ کی طرف اشارہ کر کے فرماتے کہ یہ ہیں۔“

ایک دیگر موقع پر آپ نے فرمایا:

”ان (تاج الفحول) کے ذہن کی جودت و سلاست ابوالفضل اور فیضی کے اذہان ثاقبہ کی جودت کو مات کرتی ہے۔“

علامہ عبد الحق خیر آبادی، مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری، مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور تاج الفحول شاہ عبد القادر قادری بدایونی، یہ چاروں حضرات علامہ فضل حق خیر آبادی کی درس گاہ کے علمی ستون سمجھے جاتے تھے۔ علامہ عبد الحق خیر آبادی ان علمی ستونوں کا درجہ اور طبعی رحمان متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”ہر سہ صاحب کسی خاص فن میں یکتائے عصر اور وحید روزگار ہیں، مگر حضرت تاج الفحول کا تجر اور جامعیت جملہ علوم و فنون میں ہے۔“

(اکمل التاریخ: مولانا یعقوب حسین ضیاء القادری، ص ۳۳۰) نور العارفین سیدنا شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی قدس سرہ نے آپ کے بارے میں فرمایا:

”ہمارے دور میں سنیت کی شناخت محبت مولانا عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ ہرگز کوئی بد مذہب ان سے محبت نہ رکھے گا۔“ (تذکرہ نوری: غلام شہر قادری، ص ۱۲۹)

احقاق حق اور ابطال باطل کا جذبہ اپنے والد گرامی حضور سیف اللہ المسلمول سے ورثے میں ملا۔ آپ کے دور میں بد عقیدگی، گمراہی اور گمراہ گری کے جتنے فتنے اٹھے آپ نے تقریر و تحریر سے اس کا قلع قمع کیا اور ہر فتنے کا دندان شکن جواب دے کر مسلک حق کی حفاظت و صیانت کا عظیم فریضہ انجام دیا۔

عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں آپ کی تصانیف کا ذخیرہ موجود ہے جن میں سے بہت سی کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور بعض ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، جو ان شاء اللہ جدیدہ تخریج و تحقیق اور تہذیب کے ساتھ منظر عام پر آئیں گی۔ حضرت تاج الفحول کی تصانیف میں چند کے اسماء ہیں:

- (۱) الکلام السدید (عربی) (۲) احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام (عربی) (۳) حقیقۃ الشفاعۃ علی طریق اہل السنۃ والجماعۃ در رد مولوی نذیر حسین دہلوی (۴) تختہ فیض (فارسی) (۵) مناصبہ فی تحقیق مسائل المصالح (عربی) (۶) تذکرہ مشائخ قادریہ (قلبی) (۷) شفا السائل تحقیق المسائل (۸) سیف الاسلام علی المناع حمل المولد والقیام (فارسی) (۹) ہدایت الاسلام (در رد و انقض) (۱۰) دیوان نعت عربی (۱۱) دیوان نعت و منقبت (اردو، فارسی)

ساری عمر درس و تدریس، تصنیف و تالیف، رشد و ہدایت اور احقاق حق کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ معاصرین نے آپ کو اپنے زمانے میں ”امام اہل سنت“ اور ”معیار سنیت“ قرار دیا۔ آپ کی درس گاہ سے ایک عالم نے فیض حاصل کیا۔ تلامذہ میں یہ چند نام نمایاں ہیں:

- (۱) سید شاہ ابوالقاسم حاجی اسماعیل حسن مارہروی (۱۳۳۰ھ)
- (۲) سرکار صاحب الاقدار مولانا عبد المتقندر قادری (۱۳۳۳ھ)
- (۳) حافظ بخاری مولانا شاہ عبد الصمد سہوانی (۱۳۲۳ھ)
- (۴) استاذ الاسلام علامہ محبت احمد قادری بدایونی (۱۳۳۱ھ)

(۵) استاذ العلماء مفتی عزیز احمد قادری آنولوی شمل لاہوری

(۶) حضرت مولانا عمر الدین ہزاروی (۱۳۳۹ھ)

(۷) حضرت مولانا فضل مجید قادری فاروقی بدایونی (۱۳۲۵ھ)

(۸) مولانا مفتی حافظ بخش قادری آنولوی (۱۳۳۹ھ)

(۹) مولانا محمد حسن سنہلی (۱۳۰۵ھ)

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء میں آپ کا وصال ہوا۔ درگاہ قادری بدایوں میں اپنے والد ماجد سیف اللہ المسلمول سیدنا شاہ فضل رسول قادری قدس سرہ کے پہلو میں دفن ہیں۔

آپ کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لیے دیکھئے:

(۱) اکمل التاریخ: مولانا ضیاء اللہ قادری بدایونی، مطبوعہ ۲۰۱۳ء

(۲) تاج اللؤلؤ حیات و خدمات: مفتی عبدالحمید نوری، ۱۹۹۸ء

(۳) اہنامہ مظہر حق کا "تاج اللؤلؤ نمبر": ۱۹۹۸ء

(۴) حیات تاج اللؤلؤ: مولانا محمد شہاب الدین رضوی ۲۰۰۷ء

(۵) سرکار صاحب الاقدار مطمح الرسول مولانا شاہ عبدالمتین

قادری بدایونی: (۱۳۳۳ھ)

آپ تاج اللؤلؤ محبت رسول مولانا عبدالقادر قادری بدایونی قدس سرہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۱ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء بروز پیر پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد حضرت سیف اللہ المسلمول نے "مطح الرسول محمد عبدالمتین" نام رکھا۔ تاریخی نام "غلام پیر" اور لقب "سرکار صاحب الاقدار" ہے۔ مولانا حکیم سراج الحق قادری علیہ الرحمہ نے رسم تسمیہ خوانی ادا فرمائی، بچپن سے بزرگی کے آثار ہویدے تھے۔ مکمل تعلیم استاذ الاساتذہ مولانا نور احمد قادری اور تاج اللؤلؤ شاہ عبدالقادر قادری بدایونی کے زیر سایہ ہوئی۔ اپنے والد گرامی تاج اللؤلؤ محبت رسول مولانا عبدالقادر قادری بدایونی علیہ الرحمہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ۲۷ مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، ایک مرتبہ بغداد معلیٰ حضور غوث اعظم کی درگاہ پر حاضری ہوئی۔

تاج اللؤلؤ شاہ عبدالقادر قادری بدایونی اکثر فرمایا کرتے تھے:

"مولانا صاحب میرے شاگرد اور مرید ہیں، لیکن ان کی شان

یہ ہے کہ کاش! میں ان کا مرید ہوتا۔"

جمادی الاخریٰ ۱۳۱۹ھ میں علمائے کرام اور مشائخ کی موجودگی

میں رسم سجادگی ادا ہوئی۔ نور العارفین شاہ ابوالحسن احمد نوری قدس سرہ نے خرقہ مبارک پہنایا اور نذر پیش کی۔ انتہائی منکسر المزاج، عابد و زاہد تھے۔ بچپن سے ہی طبیعت زہد و تقویٰ کی طرف مائل تھی، درس و تدریس سے خاص شغل تھا، بڑے انہماک اور توجہ سے آپ درس دیا کرتے تھے، کبھی کبھی تو ایک مسئلے پر دو تین دن تک بحث ہوتی رہتی تھی۔ آپ سے اکثر ویش تر خوارق عادات بھی صادر ہوتے رہتے تھے۔

مولانا یعقوب حسین ضیاء اللہ قادری بدایونی آپ کے بارے میں اپنے مشاہدات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خدا جانتا ہے کہ جو شان اس نورانی صورت (سرکار صاحب الاقدار) میں دیکھی آج تک دیکھنے میں نہ آئی۔ متقدمین کے مجاہدہ و ریاض، تصرفات و کرامات و خوارق عادات کا نون سے سننے تھے یہاں روزمرہ اشاروں کنایوں میں ان تصرفات و خوارق کی جلوہ نمائی دیکھتے ہیں۔ اوقات شبانہ روز کو دیکھ کر نگاہیں چشمِ سخن گو میں کہتی ہیں کہ اللہ اکبر اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے با خدا موجود ہیں جن کی زندگی کا کوئی لمحہ کوئی ساعت، کوئی آن یا دالھی سے خالی نہیں۔ اس عظمت و منزلت خداداد پر شان تواضع اور رنگ انکساری دیکھنے والے دیکھتے ہیں، جاننے والے جانتے ہیں۔" (ص: ۳۳۷)

عبادت و ریاضت، درس و تدریس اور دیگر دینی مشاغل کی بنا پر تصنیف و تالیف کی جانب زیادہ توجہ مبذول نہ کر سکے۔ ایک ضخیم تفسیر "تفسیر ابن عباس" کا ترجمہ آپ کے قلم سے معرض وجود میں آیا۔

آپ سے اکتساب فیض کرنے والے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، جن میں چھ اسامند درج ذیل ہیں:

- (۱) مفتی اعظم شاہ عاشق الرسول محمد عبدالقدیر قادری (۲) مجاہد آزادی مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (۳) تاج العلماء سید اولاد رسول محمد میاں مارہروی (۴) حضرت سید ارتضائ حسین پیر میاں مارہروی (۵) حضرت سید حسین احمد میاں شاہ جہانپوری (۶) محدث اعظم ہند مولانا سید محمد اشرفی البیلانی (۷) مفتی حسین احمد، مفتی ریاست پہاڑو (۹) مولانا مفتی حبیب الرحمن قادری بدایونی (۱۰) مولانا مفتی ابراہیم قادری بدایونی ابن استاذ العلماء مولانا محبت احمد قادری (۱۱) مولانا

سید عبدالوہاب حیدر آبادی (۱۲) مولانا حافظ عبدالحمید قادری آنولوی (۱۳) مولانا حبیب الہی مارہروی (۱۴) مولانا حکیم عبدالشکور، پٹنہ۔

ان کے علاوہ ہزار ہا متفکرات علوم نبویہ نے اس علم کے بحرِ خار سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ طوالت کی بنا پر ان کے اس حذف کیے جاتے ہیں۔ ۲۵ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ کو نماز فجر میں بحالت عجزہ واصل الی الحق ہوئے۔ عید گاہ کشی میں آپ کے برادر صغیر حضرت عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، درگاہ قادری میں اپنے والد گرامی حضرت تاج اللؤلؤ کے پہلو میں آسودہ خاک ہوئے۔

(۸) عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی (۱۳۷۹ھ)

آپ کی ولادت ۱۱ ریشوال المکرم ۱۳۱۱ھ کو مولوی ٹولہ، بدایوں میں ہوئی۔ آپ کی ولادت سے ۲۸ سال قبل آپ کے جد امجد سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول بدایونی قدس سرہ نے آپ کی پیدائش کی بشارت دی اور "عبدالقدیر" نام تجویز فرمایا نیز ایک تعویذ دیا کہ ولادت کے بعد ان کے گلے میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اسی نام پر حقیقہ ہوا، بعد میں حضرت تاج اللؤلؤ نے "عاشق الرسول" کا اضافہ فرمایا، لہذا آپ کا پورا نام "عاشق الرسول عبدالقدیر" ہو گیا، اس نام میں "محمد" بڑھانے سے سنہ تاریخ ۱۳۱۱ھ برآمد ہوتی ہے۔

جب آپ کی عمر ۸ سال کی ہوئی تو والد محترم حضرت تاج اللؤلؤ کا وصال ہو گیا، برادر اکبر و پیر و مرشد سرکار صاحب الاقدار شاہ مطمح الرسول عبدالمتین قادری بدایونی کے زیر سایہ پرورش پائی، ابتدائی تعلیم مدرسہ قادریہ کے مختلف اساتذہ سے حاصل کی، علامہ محبت احمد قادری، مولانا حافظ بخش قادری سے متوسطات کی تعلیم حاصل کی، پھر سرکار صاحب الاقدار سے تکمیل کی۔ انتہائی زریک و فطین تھے۔ اسی وجہ سے طبعاً معقولات سے زیادہ شغف تھا۔ معقولات کی قدیم کتابیں پڑھنے کے لیے آپ نے ٹوٹک اور رامپور کا سفر کیا۔ علامہ عبدالحق خیر آبادی کے شاگرد حکیم برکات احمد ٹوٹکی اور علامہ سید عبدالعزیز رامپوری سے معقول کی قدیم کتابیں پڑھیں، دوران طالب علمی سے ہی تدریس کا شوق رہا، ٹوٹک اور رامپور میں بھی طلبہ ساتھ گئے اور خالی اوقات میں آپ انہیں درس دیا کرتے تھے۔ رامپور سے واپسی پر باقاعدہ مدرسہ قادریہ میں مسند تدریس پر متمکن ہوئے اور پورے انہماک اور لگن کے ساتھ آپ نے

درس دیا، آپ سے اکتساب فیض کرنے والے طلبہ کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں درج ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:

- (۱) شہزادہ گرامی حضرت سید عادل الگیلانی بغدادی (۲) مولانا فیض الحسن دہلوی (۳) مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (۴) مولانا حیرت بدایونی (۵) مولانا عبداللہ ہادی ہادی القادری (استاذ شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) (۶) تاجدار اہل سنت مولانا شاہ عبدالحمید محمد سالم القادری (زیب سجادہ آستانہ عالیہ قادریہ، بدایوں شریف)

اپنے برادر اکبر سرکار صاحب الاقدار مولانا شاہ عبدالمتین قادری کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ ۱۳۳۳ھ میں سرکار صاحب الاقدار نے اجازت و خلافت سے نوازا۔ آپ نے دوبار حرمین شریفین کی حاضری کا شرف حاصل کیا اور بغداد شریف کی حاضری تو ہر سال کا معمول تھا، اس کے علاوہ شام، فلسطین اور ایران کا دورہ کیا۔ آپ کو مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور مسجد غوث اعظم (بغداد شریف) میں جمعہ کی نماز پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔

محبت غوث اعظم خانوادہ قادریہ کا سرمایہ افتخار ہے، حضرت شاہ عین الحق عبدالحمید قادری سے لے کر تاج ہر بزرگ میں محبت غوث اعظم کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ یہی عقیدت و محبت خانوادہ عثمانیہ کا طرہ امتیاز ہے۔ حضرت عاشق الرسول کو ۳۵ مرتبہ بغداد شریف کی حاضری کا شرف حاصل ہوا جو ایک محبت غوث کے لیے بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ ایک سال بیماری کی وجہ بغداد شریف حاضر نہیں ہو سکے تو صاحب سجادہ آستانہ غوث اعظم حضرت سید طاہر علاء الدین گیلانی کے خواب میں غوث اعظم تشریف لائے اور فرمایا کہ "تم ہندوستان جاؤ مولوی عبدالقدیر بدایونی علالت کی وجہ سے اس سال ہماری بارگاہ میں حاضر نہیں ہو سکے ان کی عیادت کرو۔" چنانچہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ مطابق فروری ۱۹۵۶ء شہزادہ غوث اعظم بدایوں تشریف لائے اور آپ کی عیادت کر کے غوث پاک کا سلام پہنچایا، اتنا ہی نہیں بلکہ جب حضرت عاشق الرسول کا وصال ہو گیا اور آپ کے جانشین تاجدار اہل سنت شیخ عبدالحمید سالم القادری (زیب سجادہ آستانہ عالیہ قادریہ بدایوں) بارگاہ غوثیت میں حاضر ہوئے تو نقیب الاشراف سید پیر ابراہیم گیلانی (جو اس وقت آستانہ قادریہ بغداد شریف کے صاحب سجادہ تھے) نے غوث

پاک کے مزار مبارک کا غلاف حضرت تاجدار اہل سنت کو عطا کیا اور فرمایا کہ میرے جد اعلیٰ حضرت غوث اعظم گئے (خواب میں)۔ مجھے حکم دیا کہ مولوی عبدالقدیر پر سال بدایوں سے میرے مزار کے لیے غلاف لایا کرتے تھے، اب ان کا انتقال ہو گیا ہے، چنانچہ ہماری طرف سے یہ غلاف ان کے مزار کے لیے بھیج دو۔

شعری ذوق اور موزوں طبیعت آپ نے وراثت میں پائی تھی، آپ نے غزل، قطعہ، رباعی تصنیف اور مثنوی تمام اصناف سخن کو برتا، قدر تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا زیادہ تر کلام نعت و مناقب پر مشتمل ہے۔ آپ کا یہ قطعہ زبان زد خاص و عام ہے:

دید اک حقیقت تھی ہجر اک فساد تھا
ہم تھے جب مدینے میں وہ بھی کیا ماند تھا
یاد ہے فقط اتنا ہم تھے اور مجھ سے تھے
آگے بے خودی جانے کس کا آستانہ تھا

جب ملک میں ملی اور قومی تحریکات کا آغاز ہوا تو حضرت عاشق الرسول نے تمام اہم تحریکوں میں حصہ لیا۔ ترک موالات، تحریک خلافت، خدام کعبہ، مسئلہ فلسطین اور بزم صوفیہ جیسی تحریکات میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے ان قومی و ملی تحریکات میں قوم و ملت کی قیادت اور رہنمائی فرمائی۔ بہت سی قومی و ملی کانفرنسیں آپ کی صدارت میں منعقد ہوئیں، جن میں آپ نے خطبہ صدارت پڑھا اور اپنی سیاسی و ملی بصیرت کا ثبوت دیا۔ ۲۰۰۸ء میں تاج الدولہ اکیڈمی نے ”خطبات صدارت“ کے نام سے آپ کے ان تین خطبات کو شائع کیا جو آپ نے قومی و ملی کانفرنس میں بحیثیت صدر دیے۔

آپ سلطنت آصفیہ، ریاست حیدرآباد کی عدالت عالیہ میں مفتی اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۳۶ء سے سقوط حیدرآباد تک مفتی اعظم ریاست حیدرآباد کے عظیم منصب پر متمکن رہے۔

۳ شوال المکرم ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء کو بروز جمعرات آپ کا وصال ہوا۔ آپ کے جسد خاکی کو درگاہ قادری میں آپ کے مرشد برحق سرکار صاحب الاقدار شاہ عبدالقادر قادری بدایونی کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کے بعد آپ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت شیخ عبدالحمید محمد قادری دامت برکاتہم القدسیہ سجادہ نشین ہوئے جو آج بھی

اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو فیض یاب فرما رہے ہیں۔

(۹) مولانا حکیم محمد عبدالقیوم شہید قادری بدایونی (۱۳۱۸ھ)

آپ کی ولادت شوال المکرم ۱۲۸۳ھ میں ہوئی۔ جد محترم سیف اللہ المسلمول نے ”محمد عبدالقیوم“ نام تجویز فرمایا ”ذکر رسول اللہ“ سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ جد محترم سیف اللہ المسلمول کے زیر سایہ پرورش پائی، ابتدائی تعلیم مدرسہ قادریہ کے لائق و فائق استادہ سے حاصل کی۔ فن کی اعلیٰ کتابیں تاج الدولہ مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی سے پڑھیں۔ فن طب اولاً مولانا سراج الحق قادری عثمانی سے حاصل کی پھر اس میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے لیے آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں حافظ الملک ابوسعید حکیم عبدالحمید خاں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور فن طب میں کمال کو پہنچے۔

نور العارفین سید ابوالحسن احمد نوری مارہروی قدس سرہ کے دامن کرم سے وابستہ ہوئے اور آپ ہی نے اجازت و خلافت سے نوازا۔ حضرت تاج الدولہ نے بھی آپ کو تمام سلاسل کی اجازت و خلافت عطا فرمائی۔ فراغت علوم کے بعد آپ نے باقاعدہ درس و تدریس کا آغاز کیا نیز لوگوں کا جسمانی علاج بھی کیا۔ غربا پروری، خدمت خلق اور حاجت مندوں کی حاجت روائی آپ کے اوصاف میں تھے۔

اسلام و سنت کی اشاعت و ترویج کے لیے حضرت تاج الدولہ کی سرپرستی میں ”جامع مسجد شمس“ میں آپ نے ایک عظیم ادارہ قائم کیا، جس نے زمانے میں ”مدرسہ شمس“ کے نام سے شہرت پائی، آپ کے وصال کے بعد آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالماجد قادری بدایونی نے اس مدرسہ کو ایک پر شکوہ عمارت میں منتقل فرمایا اور اس کا نام تبدیل کر کے ”شمس العلوم“ رکھا۔ ایک زمانے تک اس مدرسے نے علوم دینیہ کی خدمات انجام دیں۔ مدرسہ اہل سنت پنڈتہ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے حضرت تاج الدولہ کے ہمراہ پنڈتہ تشریف لے جا رہے تھے، فجر کی نماز کے لیے ریل سے اترے اسی اثنا میں ریل چل دی آپ نے دوڑ کر سوار ہونا چاہا، پاؤں پھسلا اور آپ پلیٹ فارم کے نیچے گر گئے، ریل روکی گئی اور آپ کو ریل کے پھیوں سے بدقت نکالا گیا، کسی طرح پنڈتہ پہنچے علاج شروع ہوا، مگر آپ اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ آخر کار ۱۳ رجب ۱۳۱۸ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا سید امین

الدین فردوسی نے نماز جنازہ پڑھائی، بذریعہ ریل آپ کے جسد مبارک کو بدایوں لایا گیا اور درگاہ قادری میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپ نے ۳۵ رسال کی مختصر عمر میں گونا گوں مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی قابل قدر ذخیرہ چھوڑا، جن میں سے چند کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) رسالہ فضائل الشہور (۲) رسالہ بیان شفاعت (۳) رسالہ بیان غربت اسلام (۴) سطوۃ فی رد ہفوات ارباب دارالاندوہ (۵) رسالہ احکام و اسرار صلاۃ (۶) رسالہ سماع اموات (۷) رسالہ تدابیر معالجات (۸) رسالہ علم عروض (۹) شرح سبوح معلقہ (۱۰) اسلامی ناول (۱۰) مجاہد آزادی مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (۱۳۵۰ھ)

مولانا عبدالماجد قادری خانوادہ عثمانیہ کے چشم و چراغ تھے، ان کی ولادت ۲۳ شعبان المعظم ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء میں مولوی محلہ، بدایوں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولانا مفتی ابراہیم اور مولانا عبدالحمید مقتدری آٹولوی سے حاصل کی، درس نظامی کی اعلیٰ کتابیں استاذ العتما مولانا محبت احمد قادری بدایونی سے پڑھیں اور تکمیل حضرت مولانا عبدالماجد مقتدر قادری سے فرمائی۔ دو سال دہلی میں رہ کر حکیم غلام رضا خاں سے فن طب کی تکمیل کی، آپ کو بیعت و خلافت تاج الدولہ مولانا عبدالقادر قادری بدایونی کے بڑے صاحبزادے سرکار صاحب الاقدار مولانا شاہ عبدالماجد قادری سے حاصل تھی۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کے والد مولانا عبدالقیوم شہید نے جامع مسجد شمس بدایوں میں مدرسہ شمس کی بنیاد رکھی اور اس نے عروج و ترقی کے منازل طے کیے پھر رفتہ رفتہ یہ مدرسہ زبوں حالی کا شکار ہو گیا، مولانا عبدالماجد بدایونی نے از سر نو اس کی آبیاری کی اور ۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء میں ایک عمارت تعمیر کروائی اور مدرسہ شمس کا نام ”شمس العلوم“ رکھ کر اس عمارت میں مدرسے کو منتقل کر دیا۔ مدرسے کی عمارت کے قریب ہی ایک عمدہ دارالاقامہ قائم کیا، پروفیسر ایوب قادری مدرسے کی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”جلدی مدرسہ شمس العلوم نے ملک کی دینی درسگاہوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں سے طلبہ تحصیل علم کے لیے آنے لگے، لائق اور محنتی علمائے حیثیت مدرسین اور اساتذہ مدرسہ سے وابستہ ہو گئے، دستار بندی کے

موقع پر نہایت شاندار جلسے منعقد ہوتے، ان جلسوں میں تمام ہندوستان کے ممتاز اور مشہور علما شریک ہوتے۔“

(مجلہ بدایوں، کراچی مئی ۱۹۹۶ء ص: ۳۸)

آپ نے مدرسے میں ایک عظیم الشان لائبریری قائم کی، مذہب و مسلک کی اشاعت کے لیے مدرسے کے زیر انتظام ”مطبع قادری“ کے نام سے پریس لگوایا اور وہاں سے علمائے اہل سنت کی تحقیقی و علمی اور دعویٰ و اصلاحی کتابیں اور رسال شائع کیے۔ مولانا ایک معروف ملی قائد بھی تھے، آپ نے اپنے دور میں انہی ہر قومی و ملی اور سیاسی تحریک میں حصہ لیا اور کلیدی کردار ادا کیا، جس میں خلافت کمیٹی (۱۹۱۹ء) مجلس خدام کعبہ (۱۹۱۲ء) جمعیتہ العلماء (۱۹۱۹ء) تحریک تنظیم (۱۹۲۳ء) مسلم کانفرنس (۱۹۱۹ء) تحریک ترک موالات (۱۹۲۰ء) ان کے علاوہ دیگر ملی و قومی اور سیاسی کانفرنسوں میں اہم رول ادا کیا۔ پروفیسر ایوب قادری قومی و ملی خدمات کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

”مولانا عبدالماجد نہایت ذہین عالم اور بے مثال مقرر تھے، انھوں نے تحریک خدام کعبہ، خلافت کمیٹی، مسلم کانفرنس اور جمعیتہ العلماء سب میں حصہ لیا، وہ علی برادران کے دست راست تھے، انھوں نے تمام ملک کو چھان مارا اور ملک کی سیاسی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ برصغیر کی سیاست میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے، انھوں نے شدھی اور سنگٹھن کے زمانے میں آگرہ اور بھارت پور کے علاقہ میں ایک جماعت بھیجی، ان کے بعض متوسلین نے آگرہ میں ڈیرے جمادیئے اور ایک رسالہ نکالا“ (مقالہ: ”عہد برطانیہ میں علمائے بدایوں کے سیاسی رجحانات“ مجلہ بدایوں، کراچی، شمارہ جنوری ۱۹۹۴ء)

آپ کی صدارت میں قومی و ملی بے شمار کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر جیسے قد آور قومی قائد موجود رہے، آپ کی صدارت میں منعقد ہونے والی بے شمار کانفرنسوں میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) خلافت کانفرنس ناگ پور ۱۹۲۰ء (۲) خلافت کانفرنس بمبئی ۱۹۲۱ء (۳) خلافت کانفرنس کلکتہ (۴) بہار ڈویژنل خلافت کانفرنس پنڈتہ ۱۳۳۹ھ (۵) خلافت کانفرنس ضلع بیلگام کرناٹک ۱۳۳۹ھ (۶) اجلاس

جمعیت علماء صوبہ راجستھان ۱۳۴۲ھ (۷) اجلاس خلافت کمیٹی بسلسلہ افتتاح شعبہ تبلیغ میرٹھ ۱۳۳۸ھ

مولانا عبدالماجد قادری عثمانی ایک فعال و متحرک اور سیما صفت شخص تھے۔ آپ کی وسیع تر خدمات اور قائدانہ حیثیت ان مناصب سے بھی سمجھ میں آتی ہے جن کو اپنی زندگی میں آپ نے زینت بخشی، مثلاً:

(۱) مہتمم: مدرسہ شمس العلوم بدایوں (۲) مدیر اعلیٰ: ماہنامہ شمس العلوم بدایوں (۳) ناظم: جمعیت علمائے ہند صوبہ متحدہ (۴) رکن: مرکزی مجلس خلافت (۵) رکن: مجلس عاملہ مسلم کانفرنس (۶) صدر: خلافت تحقیقاتی کمیशन (۷) رکن: وفد خلافت برائے مجاز (۸) رکن: انجمن خدام کعبہ (۹) رکن انڈین نیشنل کانگریس (۱۰) بانی دارالتصنیف بدایوں (۱۱) بانی دسر پرست: عثمانی پریس بدایوں (۱۲) بانی مہتمم مطبع قادری (۱۳) بانی رکن: جمعیت علمائے ہند کانپور (۱۴) صدر: جمعیت تبلیغ الاسلام صوبہ آگرہ۔

ان تمام تر مصروفیات کے ساتھ ہی مولانا عبدالماجد قادری کو تالیف و تصنیف سے بھی خاصا شغف تھا۔ آپ نے مذہبیات، درسیات اور سیاسیات ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور تصنیفات کا ایک قابل قدر ذخیرہ چھوڑا جن میں مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

(۱) خلاصۃ المنطق (۲) خلاصۃ العقائد (۳) القول السدید (۴) جذبات الصدقات (۵) فلاح دارین (۶) خلافت نبویہ (۷) فصل الخطاب (۸) درس خلافت (۹) تنظیمی مقالات (۱۰) الاظہار (۱۱) خلافت الہیہ (۱۲) قسطنطنیہ (۱۳) عورت اور قرآن (۱۴) فتویٰ جواز عرس۔

مولانا ایک ناباض اور بالغ نظر خطیب بھی تھے۔ ان کا خطاب سامعین پر جادو کی طرح اثر انداز ہوتا تھا، مجلس میلاد، عرس کی محفل، یا بزم مناظرہ ہو یا سیاسی جلسہ یا کوئی قومی کانفرنس ہر جگہ آپ کی خطابت کی دھمک سنائی دیتی تھی۔ مولانا خلیفہ القادری لکھتے ہیں:

” (آپ کا) وعظ جب روح پر معلومات سے پر، جذبات براہیختہ کرنے والا ہوتا تھا۔ ہندوستان میں آپ عدیم الظہیر واعظ، اور خطیب اعظم تھے۔“ (تذکرہ ماجد، ص ۷۳)

۳ شعبان ۱۳۵۰ھ / دسمبر ۱۹۳۱ء کو آپ نے وفات پائی، درگاہ قادری میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

آپ کی حیات و خدمات کا تفصیلی مطالعہ ”تذکرہ ماجد“ (مرتبہ شیخ اسدالحق قادری) میں کیا جاسکتا ہے۔

(۱۱) مجاہد ملت مولانا عبدالماجد قادری بدایونی، صدر جمعیت علمائے پاکستان (۱۳۹۴ھ)

مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (ولادت ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) بن مولانا عبدالقیوم قادری، ایک جید عالم، شعلہ بیان خطیب، ملی قائد، مصنف اور صاحب طرز شاعر تھے۔ آپ کی تعلیم مدرسہ قادریہ بدایوں، مدرسہ شمس العلوم بدایوں اور مدرسہ کانپور میں ہوئی، آپ کے اساتذہ میں مطبع الرسول مولانا شاہ عبدالقادر قادری، عاشق الرسول مولانا عبدالقادر قادری، استاذ العلما مولانا محبت احمد قادری، مولانا مفتی محمد ابراہیم قادری اور مولانا مشتاق احمد قادری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

سرکار صاحب الاقدار شاہ عبدالقادر قادری بدایونی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور عاشق الرسول شاہ عبدالقادر قادری بدایونی نے اجازت و خلافت سے نوازا۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا مدرسہ شمس العلوم کے نائب مہتمم کی حیثیت سے کی، مسلسل تین سال مکمل انہماک کے ساتھ مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں درس دیا، پھر اپنے بڑے بھائی مجاہد آزادی مولانا عبدالماجد قادری کے ساتھ قومی و ملی تحریکات سے وابستہ ہوئے۔ مسلم لیگ میں شامل ہو کر قیام پاکستان کی جدوجہد میں شریک رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ جمعیت علمائے پاکستان کے صدر بنائے گئے، مختلف مذہبی اور سیاسی موضوعات پر ۲۰ سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں، پاکستان میں دین و مسلک کی اشاعت و ترویج کی غرض سے جامعہ تعلیمات اسلامیہ قائم فرمایا۔

۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء میں آپ کا وصال ہوا، نماز جنازہ سرکار کلاں حضرت سید شاہ مختار شرف اشرفی جیلانی نے پڑھائی اور اپنے قائم کردہ ادارہ ”جامعہ تعلیمات اسلامیہ“ کراچی میں مدفون ہوئے۔ چند سال پہلے حکومت پاکستان نے قیام پاکستان کے لیے آپ کی خدمات کے اعتراف میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔

دینی و مذہبی اور قومی و سیاسی مصروفیات کے ساتھ ہی آپ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے نقوش چھوڑے جو دینی و ملی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل

کتابوں کے اسادر ج ذیل ہیں:

(۱) صحیح العقائد (۲) نظام عمل (۳) الجواب المسکور (۴) اسلام کا ذراعتی نظام (۵) اسلام کا معاشی نظام (۶) انتخابات کے ضروری پہلو (۷) حرمت سود (۸) فلسفہ عبادات اسلامی (۹) دعوت عمل (۱۰) جذبات حامد (۱۱) مشیر الحجاج (۱۲) سفر نامہ ممالک عربیہ و ایران۔

(۱۲) مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (م ۱۴۱۵ھ)

آپ حضرت عاشق الرسول شاہ عبدالقادر قادری علیہ الرحمہ کے سب سے بڑے صاحبزادے، حضرت تاج الحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی کے پوتے اور حضرت تاجدار اہل سنت شیخ عبدالحمید محمد سالم القادری (زید سجادہ خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں) کے برادر اکبر تھے۔ ۱۳۰۳ھ / ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء کو بدایوں میں ولادت ہوئی۔ تعلیمی مراحل اپنے آبائی مدرسہ قادریہ میں حضرت مفتی حبیب الرحمن قادری بدایونی اور مولانا عزیز احمد قادری سے حاصل کی۔ سرکار صاحب الاقدار مولانا عبدالقادر قادری قدس سرہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ والد گرامی کے وصال کے بعد اپنے برادر اصغر حضرت تاجدار اہل سنت کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ عربی، فارسی، اردو و تینوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ نعت و مناقب کے دو مجموعے ”نغمہ قدسی اساس“ اور ”خرابات“ اور بہاریہ شاعری کا ایک مجموعہ ”غنیازہ حیات“ شائع ہو چکے۔ ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ مدرسہ قادریہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور نظام کالج حیدرآباد میں ادب عربی کے استاذ رہے۔ ۱۹۷۸ء میں نظام کالج حیدرآباد کے شعبہ عربی میں ”استاذ ادبیات عربی“ کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

نظام کالج کی ملازمت کے دوران ”الاشع“ نام سے ایک میگزین کا اجرا کیا۔ یہ بیک وقت عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اردو، عربی، فارسی میں آپ کی شعری اور نثری نگارشات کا ایک مجموعہ ”باقیات ہادی“ کے نام سے تاج الحول اکیڈمی سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو مقالات آپ اپنے اصلی نام سے اور عربی نظم و نثر ”صاحب القلم الاحمر“ اور ”الاستاذ الاموی“ کے قلمی نام سے شائع ہوا کرتی تھی۔

۱۱ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۴ء میں آپ کا وصال ہوا اور درگاہ قادری میں سپرد خاک ہوئے۔

(۱۳) حضرت تاجدار اہل سنت شیخ عبدالحمید محمد سالم القادری

(زید سجادہ خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف)

آپ کی ولادت باسعادت ۲۶ شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ / اکتوبر ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ محض آٹھ سال کی عمر میں حافظ عبدالوحید قادری مقتدری سے قرآن کریم حفظ کیا۔ اپنے آبائی مدرسہ قادریہ میں مفتی ابراہیم فریدی سستی پوری اور مفتی اقبال حسن قادری سے علمی تحصیل کی۔ بعض کتابیں اپنے والد گرامی حضرت عاشق الرسول شاہ عبدالقادر قادری مفتی اعظم حیدرآباد سے پڑھیں۔

اپنے والد محترم کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور ۱۳۷۷ھ میں عرس قادری کے مبارک موقع پر خلافت سے نوازے گئے۔ ۶۶ سوال المکرم / ۱۹۶۰ء میں مسند سجادگی کو زینت بخشی، اس وقت سے آج تک اپنے اکابر کے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے رشد و ہدایت، اصلاح و ارشاد و ابستگان سلسلہ کی دینی اور روحانی اور سلسلہ قادریہ کے فروغ کے لیے آپ کی مساعی جلیلہ اور خدمات محتاج بیان نہیں۔ آپ کے عہد زریں میں خانقاہ قادریہ نے تبلیغی، اشاعتی اور تعمیری میدانوں میں نمایاں ترقی کی۔ کتب خانہ قادریہ کی جدید کاری، مدرسہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ اور خانقاہ قادریہ میں جدید عمارتوں کی تعمیر، یہ سب ایسی خدمات ہیں جو خانقاہ قادریہ کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔

قوم و ملت کی فلاح و ترقی، مسلک اہل سنت کی نشر و اشاعت، احباب سلسلہ کی تعلیم و تربیت اور مشرب قادریہ کا فروغ آپ کی حیات مبارکہ کا مشن ہے۔ آپ کی تبلیغی و دعوتی اور اصلاحی خدمات کی تاریخ نصف صدی پر محیط ہے۔ آپ کی شخصیت میں شریعت و طریقت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اعلیٰ ظرفی، توازن و اعتدال، صبر و تحمل اور غفو و درگزر آپ کے اعلیٰ ترین اوصاف ہیں۔ ایک مصری عالم کی کتاب کا ترجمہ ”محبت و برکت اور زیارت“ کے نام سے کیا۔ نعت و مناقب کے تین مجموعے ”نوائے سروش“ (۱۹۹۲ء)، ”معراج تخیل“ (۱۹۹۸ء) اور ”مدینے میں“ (۲۰۰۸ء) تاج الحول اکیڈمی سے شائع ہو چکے ہیں۔ نعت و مناقب کا ایک ضخیم مجموعہ بھی زیر تہیہ ہے۔

□□□

☆ استاذ: مدرسہ قادریہ، مولوی محلہ، بدایوں (پوٹی)

اے سرزمین دجلہ و فرات!

شہید بغداد علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی کی شہادت پر آنسوؤں سے لکھی مئی ایک تحریر

مور ناخوشتر نورانی! سلام و رحمت علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی کی شہادت وہ صدمہ جانکا ہے جو ہمیں بہت دنوں تک بے چین رکھے گا۔ یہ ہر اس شخص کا خسروہ عظیم اور ناقابل تلافی نقصان ہے جس پر اس کریم ابن کریم کا ظل ہم کسی نہ کسی صورت سایہ فگن تھا۔ جس نے بھی اسے کبھی دیکھ سنا اور پڑھا ہوگا، اس طائر جنت آشیانی کو کبھی بھلا نہیں سکتا، اس کے چہرے کے نور اور ہونٹوں کے تبسم میں دلوں کے اندر اتر جانے کی جو بے پناہ قوت تھی، وہ کسی اور میں کہاں نظر آتی ہے! وہ ہم و دانش کا ایک جزو خارجی تھا اور ایک بے مثال خطیب و واعظ بھی لیکن اس کی باتوں میں نہ فلسفے کی خشکی کبھی دیکھی، نہ خطابت کا مہکلو پن کبھی جھلکا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں بھی کبھی کوئی ہلکی بات زبان پر نہ آتی تھی۔ شہید بغداد جن کے بھیاتھے، جن کے شیخ صاحب تھے اور جن کے اسید میاں تھے، ان کے صدمے کو سمجھ پانا کسی غیر کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ خود آپ اور جام نور کے ساتھ علامہ مرحوم کا جو قلبی تعلق تھا اور ان کی ناگہانی رحلت سے جو صدمہ آپ کو اور جام نور کے مشن کو پہنچا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

جانتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ہمیں گے کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور قیامت کی اس گھڑی میں اپنے اندر نہ تو عزت پیش کرنے کا حوصلہ پاتا ہوں، نہ صبر کی تلقین کا یا ر ہے۔ حسب حکم جام نور کے ”عالم ربانی نمبر“ کے ”یہ خدمت تلاشی“ کے حوالے سے کچھ لکھنے کی سعی کر رہا ہوں، حاضر کروں گا۔ فی الحال آپ کے ملاحظہ کے لیے ”اے سرزمین دجلہ و فرات“ ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ شاید آپ کو پسند آئے اور ”جام نور“ میں جگہ پالے۔ والسلام (محمد جاوید)

یہ تیرہویں صدی عیسوی کا بغداد تھا، عباسیوں کا دار الخلافہ، دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے ایک، ترقی و خوشحالی میں اپنی مثال آپ۔ دنیا اپنی تمام تر رعینوں کے ساتھ اس شہر کے گلی کوچوں میں موجود تھی۔ بازار کی رونقیں ایسی کہ اہل دنیا کے دل اس کی طرف کھینچے جاتے، مدارس اور خانقاہیں شائقین علم سے کھچا کھچ بھری ہوئیں۔ عالم اسلام کا مرکز بغداد جس کے دیکھنے والے کہہ سکتے تھے کہ اس کے شباب پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ لیکن زوال آیا اور ایسے دردناک واقعات و لرزہ خیز مناظر کے ساتھ آیا کہ تاریخ کی آنکھیں سات صدیوں سے ان پر خون کے آنسو ریتیں اور بار بار یاد دلاتی ہیں کہ کسی قوم کی شوکت پر اس وقت تک زوال نہیں آتا، جب تک وہ قوم خود اپنی عظمتوں کی دشمن نہیں ہو جاتی اور اس کے افراد خود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہ بن جاتے۔

بغداد کا ہر طبقہ اپنی اپنی دنیا میں مست و خوش تھا۔ حکمران محلوں میں خوش تھے، تاجر بازاروں میں مصروف، اہل صنعت و حرفت اپنی اپنی

خلیفہ اور ہلاکو میں مذاکرات ہوئے۔ ایک مرحلے پر ہلاکو مان گیا اور بعض شرائط کے ساتھ واپس جانے پر راضی ہو گیا، لیکن پھر عین اسی وقت ان وزیروں اور مشیروں نے جو خلافت بنو عباس کے خلاف ہلاکو کی پناہ لے چکے تھے، اس کے کان بھرے اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ خلیفہ کے ساتھ ان تمام علما، فقہاء، امرا اور وزیروں کو قتل کر دیا گیا جو مذاکرات کے لیے آئے تھے۔ مستعصم کو قالین میں لپیٹ کر گھوڑوں سے روند دیا گیا۔ ہلاکو خلیفہ کے محل سے عورتوں اور بچوں کو پکڑواتا اور ایک ایک کر کے ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کراتا۔ سروں کے مینار چنوا دیے، گلیوں اور سڑکوں پر خون کے دریا بہہ گئے، مدرسے، خانقاہیں، مساجد اور کتب خانے تاراج و ویران کر دیے گئے۔ دجلہ کی موجوں نے انسانوں کے خون اور کتابوں کی سیاہی سے اپنا رنگ کھودیا۔ لیکن تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ یہ الف لیلولی شہر اپنی راکھ سے پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسلام کے سچے داعیوں اور اللہ کے مخلص بندوں کی جماعتیں انھیں جن کی آنکھوں کے نور اور سینوں کے گداز کی بدولت کعبے کو صنم خانوں سے پاساں مل گئے۔

اکیسویں صدی کی دہائی پر تاریخ ایک بار پھر دوہرائی گئی۔ یہ صدام حسین کا عراق و بغداد تھا۔ موصل سے بصرہ تک ترقی و خوشحالی کی نئی مثال، دجلہ و فرات کی سرزمین سونے اگل رہی تھی۔ بڑے بڑے ڈیم اور ان سے نکلنے والی نہریں صحراؤں اور ریگستان تک کو گلزار بناتی تھیں۔ بازاروں میں رونقیں ایسی کہ چرس اور لندن کے بازاروں کی چمک دمک کو مات دیں، تعلیم گاہیں، درگاہیں، آستانے اور خانقاہیں آباد تھیں، بازاروں اور گلی کوچوں سے عالیشان ہوٹلوں اور محلوں تک کہیں کوئی خوف و دہشت نہ تھی۔ بین الاقوامی بازاروں میں جس کرنسی کی قیمت سب سے زیادہ تھی وہ عراقی دینار تھا۔ عرب ملکوں کے پڑھے لکھے اور روشن خیال نوجوانوں کی آرزوؤں کی جنت تھا یہ ملک، لیکن پھر اسے دقت کے ہلاکو کی نظر میں لگ گئیں۔ موصل سے بصرہ تک ساری سرزمین دجلہ و فرات تہہ و بالا کی گئی، بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اب یہاں نہ گاؤں کی گلیاں محفوظ ہیں نہ شہر کی شاہراہیں۔ جن ندیوں کا پانی کل تک آب حیات تھا وہی دجلہ و فرات اب دنیا کی آلودہ ترین ندیوں میں سرفہرست ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب بغداد کی پولیس دجلہ

سے چالیس پچاس لاکھ لاشیں نہ نکالتی ہو۔ برسوں بیت گئے یہ شہر، یہ گاؤں اور یہ گلی کوچے اپنے مسیحاؤں کے انتظار میں ہیں۔ منگل (۳ مارچ ۲۰۱۳ء) کی شام بغداد سے میرے عزیز دوست اور معروف ادیب و محقق پیرزادہ علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی کی شہادت کی خبر آئی تو ایک ساتھ تاریخ کے انگشت دھم بھرے ہو گئے۔ وہ بغداد سے ارمل کی طرف جارہے تھے۔ ابھی منزل کی نصف راہ طے کی تھی، دوپہر کا وقت تھا اور ان کی کار شارح سلیمانہ پر دوڑ رہی تھی کہ اس قافلے پر ہندوق برداروں کے ایک گروہ نے اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور پھر وہیں سرکار غوث اعظم سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کے قدموں میں پیوند خاک ہو گئے۔ آہ! سرزمین ہند کا ایک درخشندہ ستارہ بغداد میں غروب ہو گیا۔ ہندوستان اور عراق میں بڑی گہری ممانعتیں ہیں۔ عراق کو دجلہ و فرات اسی طرح شمال و جنوباً مغرب سے مشرق کو بانٹتی ہیں جس طرح وطن عزیز کو گنگا جنا الگ الگ خطوں اور سرسبز و شاداب میدانی علاقوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ ہمارے دو آپہ کی طرح دجلہ و فرات کا دو آپہ بھی دنیا کا زرخیز ترین خطہ ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کی سرزمین ہے۔ میسوپتامیہ (سامرہ اور بابل) کی تہذیبیں دجلہ و فرات کی ان ہی وادیوں میں پروان چڑھیں۔ سرزمین گنگ و جمن پر اسلام آیا تو یہ بغداد سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ یہ اسلام کی عظمتوں کا وہی امیر تھا جو چنگیز و ہلاکو کی تباہ کی ہوئی دولت عباسیہ کی راکھ سے اٹھا تھا۔ جنید و بایزید اور رازی و غزالی کے جانشینوں کے قافلے ساتھ لایا تھا۔ اس لیے ہمارے دینی مراکز کے بغداد سے گہرے اور براہ راست رشتے ہیں۔ بدایوں تو ویسے بھی ہندوستان میں اسلام کے اولین مراکز میں سے ایک ہے اور بدایوں کے خانوادہ عثمانی کے مورث اعلیٰ قاضی دانیال قطری بدایوں کے پہلے قاضی تھے، وہ قطب الدین ایک کی فوج میں شمس الدین اتش کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ان کا سلسلہ علم یقیناً بغداد کے جامعہ نظامیہ اور جامعہ مستنصریہ سے ملتا ہوگا۔ روحانیت کا مضبوط رشتہ تو محتاج بیان ہی نہیں۔ خود شہید اسید الحق عثمانی عرب و عجم میں علمی و روحانی رشتے کی ایک تازہ اور بڑی مضبوط و تابندہ کڑی تھی۔ انہوں نے بغداد اور اراکھ کے علمی سرچشموں سے براہ راست کسب فیض کیا تھا۔ ابھی تو ان کے علم و دانش کی کلیاں کھلنا شروع ہی

ہوئی تھیں کہ سرزمین عراق پر بقا بعض نفرت و دہشت نے اس گورہا بدرا کو ہم سے چھین لیا۔ ہم ایک اسید کے چھن جانے سے اتنے بے چین، مضطرب، مغموم اور سوگوار ہیں، اتنی تکلیفوں اور ایسے درد و کرب میں مبتلا ہیں جن کو الفاظ دینا مشکل ہے تو سمجھ سکتے ہیں کہ خود سرزمین و جملہ و فرات آج کتنی بے چین و مضطرب ہوگی، جس سے ہر دن کئی اسید چھینے جا رہے ہیں۔ تصور کر سکتے ہیں کہ پچھلی ڈیڑھ دو دہائیوں میں تشدد کی وبا اور نسلی و مسلکی منافرتوں کی لہر ملت مظلوم سے کتنے لعل و گہر چھین چکی ہے۔ آہ! اے سرزمین و جد و فرات تیرے سینوں میں کتنے داغ جل رہے اور کتنے زخم سگ رہے ہیں؟

(۲)

ایک عہد وسطی کا وہ بغداد تھا جب چین جن کر اس کے لعل و گہر قتل کیے گئے، اس کے بازاروں کو لوٹا، بخلوں کو تاراج اور دانش گاہوں کو تباہ کیا گیا اور ایک بیادیکسویں صدی کی سرزمین و جد و فرات ہے جب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا یہ گہوارہ تشدد کی دھرتی، خوف و دہشت کی آماجگاہ اور قتل و غارت کی جانی ہوئی ہے۔ دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ آج کے اس بولہ بان عراق کی جاہی کا سہرا کسی چنگیز و ہلاکو اور ان کی وحشی قوموں کے سر نہیں، دنیا کی مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے والی قوموں اور ان کے سربراہان مملکت کے سر ہے۔ بے شک اس بار بھی اس ملک اور اس معاشرے کی جاہی میں اس کے کئی امن و عظمیٰ اور بہت سے ملاحظوں کا ہاتھ ہے۔ اس بار بھی اس کے مستحکم کی غلطیاں اور کمزوریاں، آہستہ آہستہ اور غداریاں دشمنوں کو یہاں لائیں۔ تب بھی خوبی، بھیڑیوں کو اس کی دولت و خوشی کی یہاں لائی تھی اور اس بار بھی اس کی تیل کی دولت نے یہاں انسانوں کے خون کو ارزاں کیا۔ مہماتیں اور بھی ہیں لیکن جو باتیں سب سے زیادہ دلوں کو سالتیں اور دماغوں پر ہتھوڑے برساتی ہیں، وہ تشدد کی یہی اندھی گلیں ہیں جن کا لقمہ ہر دن کئی اسید الحق بن رہے ہیں۔ نہ قاتل آگاہ ہیں کہ مقتول کون ہے اور نہ مقتول جانتے ہیں کہ قاتل کون ہے؟ ان ظالموں کو کیا خبر کہ ان کے بندوق کی گولیاں کس کا خون پی رہی ہیں اور اس ناپاک چکر میں جس کا انجام خون ہی خون ہے ان کو کس امن و صباغ نے ڈالا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔ منافرتوں کا یہ ناسور جو آج سرزمین عراق پر ابل رہا ہے،

یہ اندھے تشدد کے جھکڑ جو دنیا کے عرب کے بیشتر حصوں میں چل رہے ہیں اور یہ لاحقہ صل انتقام در انتقام کی آگ جس نے دوست دشمن، اپنے پرانے، اجنبی اور مسافر تک کی تمیز اٹھا دی ہے، بے شک تاریخ کا ایک سانحہ عظیم ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ بڑا سانحہ یہ ہے کہ ان پر بند باندھنے والے اب بھی نہیں اٹھتے، ان کا رخ موڑنے والوں نے اب تک کمر ہمت نہیں باندھی، دوس میں بہتے دریائے سادہ کے شعلوں کو بجھانے والوں کی جماعتیں کہاں ہیں، کوئی جنید و یزید تو اٹھتا جو رزوں کو ہر بنا دیتا، کوئی عبدالقادر تو ہوتا جس کے ہاتھ پر ڈاکوؤں کا سردار احمد بدوی تا عب ہو جاتا۔ افسوس! احمد بدوی تو آج یہاں اگنت ہیں، قدم قدم پر انسانیت کی گھات میں ہیں لیکن عبدالقادر ایک نہیں۔ پردہ غیب میں کیا اب کوئی محی الدین نہیں؟ کوئی تو اٹھتا جو دلوں سے نفرتوں کو نکال دیتا، تشدد کی آتش سوزاں پر محبت و اخوت کا آب کوثر ڈال دیتا، انسانوں کے خون کے پیاسے انسانوں کو احترام آدمیت کا سبق دے جاتا، کوئی تو ہوتا جس کے سینے کا سوز اور آنکھوں کا نور نفرتوں کے خرمن میں آگ لگا دیتا، کسی کا نالہ رسا تو بھٹکے ہوئے آہوؤں کو پھر سونے حرم لے جاتا۔

عراق دریاؤں، جھیلوں اور نہروں کی سرزمین ہے۔ اس کو دو بڑی ندیاں، درجنوں نہریں، متعدد قدرتی اور مصنوعی جھیلیں سیراب کرتی ہیں، ان ہی ندیوں، جھیلوں اور نہروں کی بدولت عراق نے برسوں کی جان لیوا پابندیوں کا مقابلہ کیا اور یہاں اس دوران غذائی اجناس، پھلوں اور میوؤں کی قلت نہیں ہوئی۔ آپ اگر ترکی سے عراق میں داخل ہوں تو شمال مغرب سے ایک دریا بھی آپ کے ساتھ جنوب مشرق کو بڑھ رہا ہے۔ یہ دجلہ یا دریائے گنگر ہے۔ اس مقدس دریا کا ذرا نیچل میں بھی دو مقامات پر ملتا ہے۔ اسی کے کنارے موصل، بکریت، سامرہ، بلاد، بغداد، الکوت، الامارہ اور القرن جیسے چھوٹے بڑے تاریخی شہر آباد ہیں۔ اسی کی شاخیں مشرق میں اربل، کرکک اور سلیمانہ کو بھی سیراب کرتی ہیں۔ کرکک عراق کا مشہور آئل فیلڈ ہے جب کہ اربل کردستان کا دار الحکومت اور سلیمانہ اس خطہ کا دوسرا بڑا شہر اور صوبہ کا صدر مقام۔ تیل کی دولت سے مالامال یہی خطہ آج عراق کا مخدوش ترین خطہ ہے۔ شام سے عراق میں داخل ہوں تو ایک دوسرا دریا آپ کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ دریا ہے فرات۔ یہ بھی شمال مغرب سے جنوب مشرق کو جاتا ہے۔

اس سے نکلنے والی نہریں صحرائے عراق و شام کے بہت بڑے حصے کو سیراب کرتی ہیں۔ اسی کے کنارے عنا، رمادی، کوفہ، کربلا، حلہ، نجف، ساموہ اور نصیر آباد ہیں۔ یہ دونوں ندیاں خلیج عرب میں گرنے سے پہلے قرن کے مقام پر آپس میں مل جاتی ہیں اور پھر ان کے شط العرب (خلیج) میں سما جانے سے پہلے ان کے آپس میں ملنے سے بننے والے آبنائے شط العرب کے کنارے بصرہ آباد ہے۔ یہ ندیاں اور یہ شہر تقریباً وہی نقشہ پیش کرتی ہیں جو ہماری جہنا کے کنارے دہلی، آگرہ اور الہ آباد اور گنگا کے ساتھ کانپور، بنارس، پٹنہ اور پھر خلیج بنگال کے ساحل پر ملکتے جیسے شہر پیش کرتے ہیں جہاں گنگا اور اس کی معاون ندیاں بحر ہند میں سما جاتی ہیں۔ دجلہ و فرات اپنی معاون ندیوں، نہروں اور جھیلوں کے ساتھ عراق کے مختلف جغرافیائی خطوں اور علاقوں کو تشکیل دیتی ہیں۔ ندیوں کی فطرت سیراب کرنا ہے، یہ بلا امتیاز سب کو سیراب کرتی ہیں، یہ جہاں پیاس اور ڈھلان دیکھتی ہیں اور کھربہ جاتی ہیں، پانی بارش کا ہو یا جھٹے اور جھروں کا سب کو ساتھ لے کر چلتی ہیں، یہ نہیں دیکھتیں کہ ان میں آکر ملنے والا پانی جھٹے کا ہے یا نالے کا، بارش کا ہے یا پہاڑ کا، وہ کدھر سے اور کہاں سے آرہا ہے۔ ان کی اسی خوبی نے ان کی واہیوں کو تاریخ انسانی کی اولین تہذیبوں کا گہوارہ بنایا اور ان کی آغوش میں دنیا کی عظیم قومیں پروان چڑھیں۔ یہ ہمارے سندھ اور مگدھ کی تہذیبیں ہوں یا سامرہ اور بابل کی۔ عہد وسطی کے بصرہ، کوفہ، بغداد اور دمشق و قاہرہ کی چمک دمک ہو یا دہلی اور لاہور کی شان و شوکت، سب ان کی مرہون منت ہیں۔ ندیاں اور نہریں علاقے اور خطے بناتی ہیں، ان کو سیراب بھی کرتی ہیں ان کو آپس میں ملاتی بھی ہیں (بلاشبہ انسانوں اور قوموں کو بھی ان کی یہی خوبیاں عظیم بناتی ہیں) لیکن آج عراق میں یہی خطے اور علاقے لوگوں کو بانٹنے اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنانے کے کام آرہے ہیں۔ اب مشرب و مسلک بھی ایک ہی دریا کی نہریں نہیں رہیں، یہ خون کی نہریں بن چکی ہیں جو ناقابل عبور ہیں۔

انسان اپنے اندر بھی ایک دریا ہے۔ پچھلے تو وسعت کو نین میں سمانے سکے اور سنے تو صرف ایک مشت خاک۔ خدا قلب سلیم دے تو یہ دریا ہے سب کو سیراب کرے گا، ساری نہریں اس میں سما جائیں گی ورنہ اس دجلہ کی موجوں پر بھی لاشیں تیرتی ہیں۔ ذرا ہم اپنے اندر جھانکیں اور جائزہ

لیں کہ ہم نے کتنے بند باندھے ہیں، کتنی رکاوٹیں کھڑی کی ہیں، کس کس طرح اپنے دریا کو آپ ہی کوزہ اور نہر کو جہز بنالیا ہے۔ جانا تو اس دنیا سے ایک دن سب کو ہے۔ شہید بغداد بھی اپنے چاہنے والوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ ایک بڑا گہرا گھاؤ اور بہت ہی دور رس پیغام دے گئے۔ اس جواں مرگ عالم و محقق کی موت کا ماتم ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ملک کی ایک سب سے بڑی خانقاہ کا پیر زادہ تھا۔ پیر زادے تو اور بھی ہیں لیکن اسید الحق اس پر قانع نہیں تھا، وہ تصوف نظری و علمی کا غواص بھی تھا اور علم تزکیہ و سلوک کا شاعر بھی، زبان و ادب اور تاریخ پر بھی اس کی نگاہ تھی، جدید علوم و فنون، سائنس اور ریاضی سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ ایک دو باتیں نہیں ہیں جو اسے اپنے ہم عصروں میں ممتاز بناتی تھیں۔ اگنت باتیں ہیں جن کا رہ کر خیال آتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ نہ تو یہ نوجوان اپنے اجداد کی روایات کا باغی تھا اور نہ اس کی کوئی سیاسی دلچسپیاں تھیں، یہ اپنے عہد کا ابوالکلام آزاد تھا جس کے مطالعے کی وسعت اور فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی اسی عمر میں اچھے اچھوں کو حیران کر دیتی تھی، لیکن پندار علم تھا کہ ہرگز جھلکتا نہ تھا، سادگی اور شائستگی بھی حیران کن تھی۔ اس میں دریا کی وسعتیں بھی تھیں اور صحرا کی پیاس بھی، نہروں کی روانی بھی تھی اور جھیل کی گہرائی بھی۔ وہ ایک ایسی خانقاہ کے صاحب سجادہ کے چشم و چراغ تھے جس کے ارادت مندوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ اور بر عظیم ہندو پاک ہی نہیں دنیا کے دوسرے مختلف ملکوں میں بھی ہے۔ ایک کامیاب و خوشحال زندگی گزارنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ پھر وہ حافظ قرآن اور فاضل درس نظامی بھی تھا لیکن اس نے اسی پر قناعت نہیں کیا، ایک پیاس تھی جو اسے کہاں کہاں لیے پھرتی تھی اور ایک درد تھا جو اسے کیسا بے چین رکھتا تھا، اس کا ثبوت اس کی وہ تحریریں ہیں جو رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں اور جو کتابی صورت میں منظر عام پر آتی رہیں۔ کبھی یہ نوجوان پیر زادہ پچھوند کی خانقاہ میں خطوطات کو کھنگال رہا ہے، کبھی رامپور کی رضا لاہیری میں اور اراق پارینہ سے علم کے موتی چن رہا ہے، کبھی بہار شریف، پھولاری شریف اور پٹنہ کی خانقاہوں اور کتب خانوں کا سفر کرتا ہے تو کبھی لکھنؤ، دہلی، بمبئی اور حیدرآباد کے علمی مراکز میں سرگرداں ہے۔ یہی پیاس اسے مصر اور بغداد میں بھی ایک در سے دوسرے در اور ایک مرکز سے دوسرے مرکز میں لیے لیے پھرتی رہی۔

عالم اسلام میں یہ حادثے کیوں ہوتے ہیں؟

جلد ہاؤس سے ہم تینوں شاہین باغ کے لیے روانہ ہوئے۔ ہماری کوشش تھی کہ جلد سے جلد خوشتر صاحب کے پاس پہنچیں۔ ایک انجانی کشش ہمیں کھینچنے لے جا رہی تھی۔ عجیب ذہنی کیفیت تھی۔ ایک لمحے میں خبر کی صداقت کا یقین ہوتا اور دوسرے ہی لمحے اسی درجے میں اس کے جھوٹ ہونے کا یقین ہو جاتا۔ راستے میں مصر سے مولانا حسن سعید اور علی گڑھ سے ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی کے فون آئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں خوشتر صاحب سے ملنے کے بعد ہی بتا پاؤں گا کہ سائے کی نوعیت اور خبر کی حیثیت کیا ہے۔

خوشتر صاحب کے گھر پہنچے۔ وہ سر اپا حزن و ملال بنے بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی پھٹ پڑے اور ہمیں اب یقین ہو گیا۔ ساکت و ششدر رہم لوگ گھنٹوں بیٹھے رہے۔ اس وقت پھر مجھے یک گونہ شک ہو چکا تھا۔ میں خوشتر صاحب کی زبان سے سننا چاہتا تھا، کیوں کہ مجھے خبروں کی حالت معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک واقعہ کس طرح خبر سے افواہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ”کیا عطیف میاں سے آپ کی بات ہوئی؟“ میں نے خوشتر صاحب سے پوچھا ”جی! میری بات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ شیخ صاحب شہید ہو گئے۔“ اس صراحت کے بعد اب میرے لیے تاویل کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ رات کے تقریباً دو بجے ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر آئے۔

آج ۲۵ مارچ ہے۔ حضرت مولانا اسید الحق جن کو اب مجھے رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے، کی شہادت ہوئے آج ۲۱ دن ہو گئے۔ گزشتہ ۲۱ دنوں میں میں اس شہید بغداد کے لیے کتنی بار چھپ کر اور کھل کر رویا ہوں یہ میرا رب ہی جانتا ہے۔ میری زندگی کا یہ پہلا حادثہ تھا جس کا مجھے اتنا غم ہوا۔ یہ پہلی موت تھی جس پر میں اتنا رویا اور یہ پہلا سانحہ تھا جب تعزیت کے سارے الفاظ، اظہار غم کے سارے شعری مصرعے باقی اور بے معنی لگے۔ خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں جہاں میں رہتا

ایک تاریک شام: ۴ مارچ ۲۰۱۴ء کی شام میری زندگی کی سیاہ ترین شام تھی۔ بعد نماز مغرب میں دارالقلم دہلی کی برکاتی لائبریری میں بیٹھ کر اپنے ریسرچ ورک سے متعلق وضاحتی کتابیات (Annotative Bibliography) لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہی تھا کہ میرے موبائل پر رنگ ہونا شروع ہوا۔ میں نے بے پروائی سے فون اٹھایا۔ دوسری طرف مولانا رفعت رضا نوری تھے۔ وہ بلا تہدید گویا ہوئے: ”کیا مولانا اسید الحق کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟“ ان کے اس سادے جملے میں بے پناہ تنجیدگی تھی۔ میں نے کہا کیا بکواس کر رہے ہیں؟ یہ کہتے ہوئے میں قادری مسجد کے صحن کی طرف بھاگا۔ میں نے کہا کہ میں ابھی خوشتر صاحب کو فون کرتا ہوں۔ خوشتر صاحب کو فون کیا، بتل بجتی رہی، مگر انھوں نے فون ریسپونڈ نہیں کیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ حادثہ بڑا ہے۔ ”اب کس کو فون کروں؟“ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ذہن پر زور ڈالا تو حضرت سید اختر چشتی مدظلہ العالی زب سجادہ آستانہ چشتیہ صمدیہ پچھوند شریف کا خیال آیا۔ میں نے فوراً انہیں کال لگائی۔ وہ زار و قطار زور رہے تھے۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا: ”شیخ صاحب بغداد میں شہید ہو گئے اور میں بدایوں کے لیے گھر سے نکل چکا ہوں۔“ ان کا فون رکھا کہ مرشد گرامی حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی کا فون آ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ”مصر سے حسن کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ مولانا اسید الحق کے ساتھ کوئی سانحہ پیش آیا ہے۔ کیا خبر ہے؟“ میں حضرت سے صرف اتنا کہہ سکا کہ شاید خبر صحیح ہے۔ حضرت نے تفصیل جاننا چاہی۔ میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ میں ایک لفظ نہیں بول سکا۔ ادھر آنسوؤں کی قطار تھی۔ ادھر اظہار زنج و دلم، تلقین صبر اور دعائے مغفرت۔ میں نے اپنے دوست سید تالیف حیدر سے کہا کہ مولانا اشرف الکوثی کو فون کر کے بتائیے اور یہ بھی بتائیے کہ ہم لوگ خوشتر صاحب کے پاس شاہین باغ نکل رہے ہیں، آپ چلنا چاہیں تو فوراً بھلہ ہاؤس پہنچیں۔

بقیہ: عالم اسلام میں روحانی اقدار کے علم برداروں کا قتل

ہمیں امید واثق ہے کہ رب قدیر نے اپنی بارگاہ ذوالجلال میں اپنے اس بندہ نمومن کے قلمی ولسانی جہاد کی مقبولیت کا مظاہرہ فرمانے کے لیے اسے اپنے اولیائے کرام کی سرزمین پر شہادت اور روحانی رشد و ہدایت اور ولایت کے سرچشمہ شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی قبر انور کے جلو میں تدفین سے سرفراز کیا ہے۔ درحقیقت مولانا اسید الحق قادری نے اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری کی نیت سے ہی عراق کا سفر کیا تھا۔ اسے نصیب کی فیروزمندی نہیں تو لور کیا کہا جائے کہ انہیں مزار غوث پاک کے احاطے میں انہیں روحانی اجداد کے درمیان سپرد خاک کیا گیا۔ عالم اسلام میں صوفیائے کرام کی روحانی ورثوں کے امین، حامل و پاسدار علمائے اہل سنت کے بیہمانہ قتل کے اس قسم کے واقعات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ مذہب یا کسی مذہبی عقیدے کے نام پر دنیا کے کسی بھی گوشے میں دہشت گردی میں ملوث ہیں، انہیں صوفی ازم سے کسی بھی قسم کی نظریاتی حمایت حاصل نہیں ہے۔ دہشت گردی کا اسلام کے روحانی و خانقاہی نظام سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ بالخصوص ہندوستان میں تمام تر خانقاہی اقدار و روایات کی بنیاد امن، عالم، انسانیت، نوازی، آفاقی اخوت و بھائی چارگی، معاشرتی فلاح، سماجی عسکری اور مذہبی رواداری پر ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب اسلام کے بنیادی تصورات اور خوبصورت مذہبی معتقدات کا سلفی و وہابی انتہا پسند طبقہ (جو اب مرکزی و حارے میں شامل سنی مسلمان ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرنے لگا ہے) غلط استعمال کر رہا ہے اور ان کی خود ساختہ اور بے بنیاد تفریح رائج کرنے پر تلا ہوا ہے، انسانیت اور امن کے خیر خواہوں کو اسلام کی روحانی تعبیر سے متعارف کرانے کی اذ حد ضرورت ہے، کیوں کہ دنیا بھر میں اہل تصوف ہی حقیقی اسلام کی ترجمانی کر رہے ہیں جو کہ امن پسند، بخشیریت پسند اور اعتدال پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک میں اسلام پسندی کی نام نہاد تعبیر کے ساتھ پیر پار رہے دہشت گردانہ نظریات کے شکار تمام تر فرقوں اور جماعتوں کے بچ صرف اصحاب تصوف اور علمائے اہل سنت ہی ہیں۔ □□

☆ جنک پوری، نئی دہلی grdehlavi@gmail.com

اپنے اس آخری سفر کے دوران بھی جس کی یادیں ان کے چاہنے والوں کو بہت دنوں تک رلائیں گی، وہ بغداد کے علما و مشائخ، دینی و علمی مراکز اور کتب خانوں میں علم و فضل کے گہر ہائے مراد چن رہا تھا۔ وہ ہر دریا، ہر نہر اور ہر چشمے سے پینا چاہتا تھا۔ کبھی امام ابو حنیفہ کے روضے کی چالیوں سے لگا ہے تو کبھی شیخ ابوبکر شبلی کی بارگاہ سے کسب فیض کر رہا ہے، کبھی امام غزالی کے آستانے پر مراقب ہے تو کبھی صحابی رسول حضرت سلمان (رضی اللہ عنہ) کے روضے پر سراپا نیاز اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے قدموں میں تو وہ پیوند خاک ہی ہو گیا۔ صحیح معنوں میں وہ ہمارے زمانے کا مجمع البحرین تھا۔ جام نور کے صفحات پر اس کی خامہ تلاشی، جن کے مطالعہ رہی ہے ان کو بہت دنوں تک یہ یقین نہیں آیا کہ یہ کسی ایک شخص کے قلم کا جوہر ہے۔ خواہ مدیر سے کوئی فروگزاشت ہوئی ہو، خواہ کسی عالم فاضل مضمون نگار یا مبصر نے کوئی غلطی کی ہو، غلطی چاہے وہ تذکیر و تانیث کی ہو یا الفاظ اور محارے کے برتاؤ کی، قرآن و حدیث کا کوئی نکتہ ہو، سائنس یا فلسفہ کی تعبیرات ہوں، یا منظومات میں کوئی عروضی یا لسانی عیب ہو، خامہ تلاش کی نگاہ التفات سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا، سب کے سب حیران تھے کہ کوئی ایک شخص اتنے علوم و فنون اور ان کے اتنے شعبوں کا ایسا جامع کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی کتاب قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ پڑھ جائیں اندازہ ہوتا ہے کہ جدید و قدیم سائنس اور فلسفے پر اس کی کتنی گہری نگاہ تھی، حدیث افتراق امت پر اس کی تحقیق کا مطالعہ کریں حیران رہ جائیں گے کہ اللہ نے اس نوجوان کو علم کی دولت سے کیسا نوازا تھا اور اس کے اندر دریا کو دریا سے ملانے اور نہروں کو نہروں سے جوڑنے کی کیسی تڑپ تھی۔ ”خیر آبادیات“ کے مضامین دیکھ جائیں، نگاہوں کو خیرہ کرتے ہیں کہ حق کی جستجو کا کیسا جذبہ صادق تھا جو اسے بے چین رکھتا تھا۔ کاش! یہ تڑپ ان میں بھی منتقل ہو جائے جن کا در شہید اسید الحق قادری کو بے چین رکھتا تھا، کاش! ان کے خون کے ایک ایک قطرہ سے ایک انقلاب جنم لے اور دلوں کی دنیا کو زیور ہر کر دے، کاش! سرزمین دجلہ و فرات پھر کوئی کروٹ نہ لے اور امن و اخوت کی فصلیں پھر یہاں لہلہا اٹھیں۔

اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ

☆ انچارج ایڈیٹر: روزنامہ انقلاب پٹنہ (بہار)

ہوں، کئی بار وہاں ایسا لگا جیسے یہ حادثہ اسی خانقاہ کا ہو۔ میں نے اپنے احباب سے یہ بات کئی بار کہی کہ میں خود کو سنگ دل سمجھتا تھا کہ اب تک کسی کی موت پر رونا نہیں تھا اور اگر مولانا اسید الحق کی جگہ میرے باپ کی بھی موت ہوئی ہوتی تو شاید مجھے اتنا رنج نہیں ہوتا۔ میری اب تک کی زندگی کا یہ سب سے بڑا غم ہے۔ کیوں ہے؟ اس کے متعدد اسباب ہیں، بعض وہ ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور بعض وہ ہیں جن کو نہیں جانتا یا شاید ان کی تعبیر سے قاصر ہوں۔

یہ حادثہ ہر دن کا ہے: حضرت مولانا اسید الحق شہید، جو میرے دوست بھی تھے اور بہت سے معاملات میں میرے لیے آئیڈیل بھی، ان کی شہادت کے دن سے اب تک میں غم ناک بھی ہوں اور غضب ناک بھی۔ غم ناک ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے، غضب ناک اس لیے ہوں کہ جو واقعہ آج ہمارے سامنے پیش آیا ہے اس قسم کے درجنوں واقعات ہر دن عالم اسلام میں پیش آرہے ہیں۔ ہم آج پریشان اس لیے ہیں کہ یہ واقعہ ہمارے کسی اپنے کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ ہر دن عالم اسلام کے مختلف خطوں میں کتنے ماتم کدے بڑا ہوتے ہیں، کتنی بے گناہ جانیں تلف ہوتی ہیں، کتنے بچے یتیم اور کتنی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں، مسلمانوں کی آنکھوں سے کتنے خواب چھین لیے جاتے ہیں اور مستقبل کی کتنی امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ شہید مرحوم نے آج سے تقریباً دس سال پہلے قاہرہ میں کسی عید کے دن ”نالہ درو“ کے عنوان سے عالم اسلام کا جو مرثیہ لکھا تھا آج وہ خود ان کا مرثیہ بن گیا ہے۔ بعض اشعار آپ بھی دیکھیں:

مجھے سے احباب یہ کہتے ہیں قصیدہ لکھو
عید کا دن ہے مسرت کا ترانہ لکھو
مگر افسوس میں کس دل سے کروں یار کی بات
کس زبان سے میں کروں زلف طرح دار کی بات
مجھ کو آتا ہے فلسطین کے بچوں کا خیال
ان کے سینوں میں اترتے ہوئے نیزوں کا خیال
تو جواں بیٹوں کو روتی ہوئی ماؤں کا خیال
خون سے بھیگی ہوئی ان کی رداؤں کا خیال
غرب اردن کے شہیدوں کا خیال آتا ہے

کبھی غزہ کے یتیموں کا خیال آتا ہے
میرے بغداد پہ چھائے ہیں قضا کے بادل
ظلم کے جور کے وحشت کے جفا کے بادل
میرے گجرات میں انسانوں کے کتنے ہوئے سر
بے کسوں مفلوس مجبوروں کے کتنے ہوئے سر
میرے کشمیر سے رونے کی صدا آتی ہے
میرے قندھار سے آواز بکا آتی ہے
میرے شیعان کی گلیوں میں لہو بہتا ہے

عالم اسلام کی جس ناگفتہ بہ صورت حال کا مرثیہ آج سے دس سال قبل شہید مرحوم نے لکھا تھا افسوس صد افسوس وہ اسی ناگفتہ بہ صورت حال کا خود بھی شکار ہو گئے۔ القدر خیرہ و شرہ من اللہ پر مجھے یقین ہے، لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں عالم اسباب میں ہوں اور میرے خالق و مالک کی طرف سے اچھے اسباب تلاش کرنے اور برے اسباب سے بچنے کا حکم ہے۔ میں لیس انسان الامامی کے سامنے بھی جبیں خمیدہ ہوں۔ اس لیے میرا ایمان واقعات کے ظاہری اسباب پر غور کرنے کی اجازت بلکہ حکم دیتا ہے۔ ہمیں جاننا چاہیے کہ عالم اسلام کی یہ کس میری کیوں ہے؟ کیوں میرے اسید کی طرح ہزاروں قیمتی جانیں ہر روز تلف ہو رہی ہیں، پاکستان سے لے کر جنگ ویش تک، افغانستان سے عراق تک اور اب مصر، لیبیا، شام اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک تک خوف و خون کا ماحول کیوں ہے؟ خون مسلم کی اس ارزانی کا ذمہ دار کون ہے؟ مسیحیت ہے، مسیحیت ہے، ہندو تو اے، اسلام مخالف تو ہیں، مغرب کی ریشہ و انیاں ہیں، مخالفین اسلام کی سازشیں ہیں۔ یہ ہیں وہ اسباب جن سے عالم اسلام تباہ و برباد ہو رہا ہے اور یہ ہے ہم مسلمانوں کا جواب۔ لیکن اس سوال کا جواب کون دے گا کہ مسلمان اپنے مخالفین کی سازشوں کا اس تسلسل سے شکار کیوں ہو رہے ہیں؟ اگر مذکورہ جواب درست ہے تو مسلمان امریکا، یہودی اور سنگھ پر یواری کی سازشوں سے خود کو بچانے میں ناکام کیوں ہیں؟

دو باتیں: میری نظر میں اس کی دو وجہیں ہیں۔ ان وجوہ کو جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمیں اپنی مصیبت کو دور کرنے کے لیے

اپنی حالت کو درست کرنا چاہیے، اپنے دشمنوں اور مخالفوں کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے اور نہ کسی ایسی صبح کا انتظار کرنا چاہیے جب ہمارے سارے دشمن ہمارے خلاف سازش کرنا چھوڑ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم۔ (رعد: ۱۱)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری حالت بدلے تو خود ہمیں اپنی حالت کو بدلنے کی فکر، پھر تدبیر اور پھر عمل کرنا ہوگا۔ اس حوالے سے دو باتیں بہت اہم اور قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے ایک سیاسی ہے اور ایک مسلکی۔

(الف) صحرائے عرب کے خون ریز، جنگ جو اور غیر مہذب ماحول میں ۵۰ء کو اللہ کے آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے۔ آپ نے اپنے حسن نظام اور حسن اخلاق سے بہت جلد پورے عرب کو مسخر کر لیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سالوں تک ایک مثالی انسان بن کر زندہ رہے۔ اس عرصے میں شہر مکہ نے آپ کو امین و صادق کے بطور تسلیم کر لیا۔ ۳۰ سالوں کے بعد آپ نے اعلان نبوت کیا۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے مخالفین کا طوفان امتڈ پڑا۔ ۱۳ سالوں تک آپ نہایت مظلومی کی حالت میں دعوت حق و صداقت دیتے رہے۔ پھر آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی جہاں انصار و مہاجرین کے درمیان رشتہ مواعجات قائم کیا۔ یہود مدینہ کے ساتھ معاہدے کیے، جہاد و قتال فرمایا، صلح حدیبیہ کی اور آخر میں آپ نے مکہ فتح کر لیا اور مدینے میں ایک اسلامی ریاست قائم کر دی جو ایک مثالی خدائی نظام حکومت پر مشتمل تھی۔

۲۳ سال کی عمر میں آپ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ آپ کے بعد آپ کے طریق و مہنہ پر ۳۰ سالوں تک خلافت قائم رہی جسے خلافت راشدہ کا عہد کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کی پیش گوئی کے مطابق کتوں کی طرح لڑنے والی بادشاہت قائم ہو گئی۔

(الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم تکون ملکہاً عضواً۔ رواہ احمد و الحاكم و الترمذی و غیرہم۔) مسلم دنیا پر بادشاہت کے تقریباً ۱۴۰۰ سال گزر گئے۔ اس عہد

میں بعض حکومتیں بہت ہی مثالی اور قابل تحسین رہی ہیں جب کہ بعض نہایت ظالمانہ اور قابل نفرت۔ لیکن خلافت راشدہ کا دور پورے طور پر شاید پھر کبھی نہیں آیا۔ اسی طرح مسلمانوں کی بادشاہتیں بعض اندازوں کے مطابق رومی، ایرانی اور یورپی بادشاہتوں سے بہت بہتر تھیں۔

چوہوں تا سترہویں صدی تک یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور تھا۔ اس نشاۃ ثانیہ میں یورپ بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھو یا۔ نشاۃ ثانیہ کی حصول پایوں میں جمہوریت بھی شامل ہے۔ اس کے مطابق نظام حکومت میں عوام کو خیال مانا گیا ہے اور انہیں حکمرانوں کے انتخاب کا حق دیا گیا ہے۔ موجودہ عہد میں جب کہ ماضی کے بہ نسبت عوام بڑی حد تک باشعور ہو چکے ہیں وہ صد فی صد غلامی اور بادشاہی جبر تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوری حکومت تعلیم یافتہ اور باشعور افراد کے لیے موزوں حکومت ہے۔ آج نظر اٹھا کر دیکھیے دنیا کے تمام باشعور، تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ملکوں کا نظام حکومت جمہوری ہے۔

اس کے برعکس عالم اسلام میں یا تو بادشاہی نظام ہے یا ناقص و بدامن جمہوریت، گزشتہ سوڑھ سو سالوں سے عالم اسلام میں بھی نشاۃ ثانیہ کی فکر کام کر رہی ہے، لیکن افسوس کہ یہ فکر اب تک کوئی صحیح اور کامیاب منہج تلاش نہیں کر سکی ہے۔ نتیجے کے طور پر مسلمان افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ یا تو وہ خلافت راشدہ قائم کرنے کے درپے ہیں یا جابرانہ شخص حکومتوں کے حامی ہیں۔ خلافت راشدہ کے قیام کی خواہش ایک اچھی ترنہ ہے جس کا حصول موجودہ ماحول میں ممکن نظر نہیں آتا، جب کہ جمہوریت اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ شہنشاہیت اور شخصی جابرانہ حکومتوں سے درجنوں بہتر ہے، مگر مسلمان جمہوریت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو اسے شرک اور بے دینی کہتا ہے اور اس کے بالمقابل پوری طاقت و قوت کے ساتھ خلافت راشدہ لانے کے درپے ہے۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کے تشدد اور خون ریزی کا قائل ہے۔ اس طبقے کو اس بات کا ادراک نہیں ہے کہ اس کے اس طرز عمل سے ملکی اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کس قدر نفرت کا ماحول بن رہا ہے۔ اس روش سے اسلام کی خدمت نہیں اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے۔ اسلام کی دعوت میں رکاوٹ اور مسلمانوں کی زندگی میں دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ جمہوریت کو قبول کرنے کے لیے مسلمانوں کا جو ذہن تیار ہے،

عالم اسلام میں روحانی اقدار کے علم برداروں کا قتل

عراق میں مولانا اسید الحق قادری پر دہشت گردانہ حملہ اور دیگر مسلم ممالک میں نامور علمائے اہل سنت کے بہیمانہ قتل کا پس منظر

عیاں ہے۔ موصوف زندگی بھر احسان و سلوک اور تصوف و روحانیت پر مبنی اسلامی معتقدات کی عصری انداز میں ترسیل و تبلیغ کرتے رہے۔ صوفی فکر و مزاج کے حامل اس عبقری عالم دین کو سلفی دہشت گردوں نے اس وقت خودکش حملے سے اڑا دیا جب وہ اپنے شاگردوں کو شام کے شہر دمشق کے مرکزی ضلع مزارا میں واقع مسجد جامع الایمان میں ایک مذہبی دروہانی درس دے رہے تھے۔ اس واقعے کی خبر مشہور عربی و بین الاقوامی چینل الجزیرہ ٹی وی نے جس ہیڈ لائن کے ساتھ نشر کی وہ قابل توجہ ہے: البوطی عالم شہرہ الدین و قتلہ السياسة یعنی شیخ البوطی، جسے دین نے مشہور کیا اور سیاست نے مقتول۔

جدید خواج، سلفی، وہابی اور اس فکر کے دیگر مذہبی انتہا پسندوں کے ذریعے روحانیت پسند اور تصوف و احسان سے نظریاتی و انتہائی رکھنے والے علمائے اہل سنت پر خودکش بم حملے اور ان کا سرعام دردناک قتل آج تک بلا کسی عالمی مزاحمت کے جاری ہے۔ اس ضمن میں ہمارے لیے انتہائی شخصی رنج و الم، ملی درد اور جماعتی قلق کا باعث یہ ہے کہ مولانا اسید الحق عاصم قادری بدایونی، جو عصر حاضر میں مجھ جیسے بہت سے طالب علموں کے لیے علمی دانشوری اور روحانی شیفتگی کی تحریک کا سرچشمہ تھے، اس سال ۲۴ مارچ کو عراق کے شہر بغداد میں اس وقت ایک دہشت گردانہ حملے میں شہید ہو گئے جب وہ صوفیہ کرام، فقہائے اسلام اور اولیائے عظام کے مزارات کی زیارت کے لیے وہاں تشریف لے گئے تھے۔

جدید دور کے تبحر عالم وین مولانا اسید الحق عاصم القادری، جو شیخ صاحب کے نام سے بھی مشہور تھے، علمی کردار، صوفی فکر و نظر اور قلندرانہ مزاج کے حامل ایک ماہر فقیہ، باکمال روحانی شاعر، محقق و ناقد، کثیر التصانیف قلم کار، سماجی مفکر اور ان سب پر ممتزاد ایک عظیم انسان تھے۔ وہ ہندوستان کے صوفیہ کرام اور عظیم مسلم مذہبی و روحانی اساطین کی اقدار و روایات کے امین و پاس دار تھے۔ انہی کے نقش قدم پر چلتے

براہ راست موضوع سے متعلق گفتگو شروع کرنے سے قبل میں انتہا پسندوں کے ہاتھوں علمائے اہل سنت کے بہیمانہ قتل کے دو شرمناک واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا:

(۱) مفتی سرفراز احمد نعیمی، پاکستان کے ایک سنی المسلک اور صوفی المشرع عالم دین تھے، جنہیں اعتدال پسندانہ اسلامی نظریات کی حمایت اور پاکستان میں دہشت گردانہ سرگرمیوں کی زبردست مخالفت کے لیے جانا جاتا تھا۔ ۱۲ جون ۲۰۰۹ء کو انہیں اس وقت ایک خودکش بم حملے میں شہید کر دیا گیا، جب وہ پاکستان کے شہر لاہور کی ایک مسجد میں نماز جمعہ کے بعد اپنے اداے جامعہ نعیمیہ میں لوگوں سے ملاقات کر رہے تھے۔ اس خودکش بم حملے کا نشانہ بنائے جانے سے قبل انہوں نے تحریک طالبان کے دہشت پسند نظریہ سازوں اور ان کی سرگرمیوں کو غیر اسلامی قرار دیا تھا۔

(۲) سنی و صوفی نقطہ نظر کے حامل، تقلید فقہی کے شہرت یافتہ حامی و مبلغ اور عالمی سطح کے ایک بلند پایہ اسلامی محقق شیخ رمضان البوطی رحمہ اللہ علیہ جنہیں عام طور پر معتدل اسلامی اسکالر کے طور پر جانا جاتا تھا، انہوں نے اپنی بے لاگ تحریروں اور بے باک مذہبی خطابات کے ذریعے اسلامی معتقدات و مسلمات کی خود ساختہ سلفی تشریحات کو کھلے طور پر چیلنج کیا تھا۔ سلفیوں کی فکری انتہا پسندی اور دور جدید میں اس کی تباہ کاریوں کی وضاحت کرتے ہوئے سلفی آئیڈیولوجی کی تردید میں انہوں نے بروقت انتہائی اہمیت کی حامل ایک کتاب السلفی مرحل ذہنی مبارک و لبس مذہب اسلامیا (الشفی ایک مبارک عہد ہے، نہ کہ کوئی کتب فکر) تصنیف کی۔ اسی طرح انہوں نے مختلف مسلم ممالک میں سرگرم عمل مذہبی انتہا پسندوں کی عسکریت پسندانہ اور سیاسی نظریات اور عقائد سرگرمیوں کی نظریاتی طور پر زبردست تردید کی تھی، جیسا کہ ان کی ایک کتاب الجہاد فی الاسلام (۱۹۹۳ء) سے

کافی ہیں۔ عالم اسلام میں سیاسی مسائل میں حد سے زیادہ شدت پسندی کے پیچھے بھی مسلکی شدت پسندی کے عناصر کارفرما ہیں۔ شیخ سنی اختلاف وہابی صوفی اختلاف، دیوبندی بریلوی اختلاف، بلکہ ہر گروپ میں جو داخلی اختلافات ہیں، ان میں سے ہر اختلاف قتل و غارت کا عنوان بن چکا ہے۔ اگر بغداد جل رہا ہے، مصر میں گولیاں چل رہی ہیں، افغانستان سے دھواں اٹھ رہا ہے، لیبیا اور شام سے چیخیں سنائی دے رہی ہیں تو اس کے پیچھے امریکا، برطانیہ، اسرائیل اور دیگر خارجی طاقتیں ہی کارفرما نہیں ہیں، اس کی تہہ میں انتہائی سطح کی وہ مسلکی نفرت بھی ہے جو اپنے ہر مسلک مخالف کے قتل و خون کے جواز کا فتویٰ دیتی ہے۔ کاش مسلمان اس نقطے پر سوچتے، اہل علم و دانش، ارباب سیاست و اقدار اور صاحبان فقہ و فتاویٰ اس پہلو پر غور کرتے، تاکہ داخلی سطح پر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے جو عناصر تھے، وہ کم ہوتے رہے خارجی عناصر تو وہ تو رہیں گے ہی اور ان سے ہمارا حکیمانہ جہاد تو جاری ہی رہے گا۔

آشید بغداد: میرے دوست، میرے مشفق، میرے کرم فرما مولانا اسید الحق عاصم قادری ۲۴ مارچ کو بغداد میں اچانک حادثے کا شکار ہو گئے۔ وہ بغداد سے باہر اربیل جا رہے تھے۔ ایک آپ کی کار پر دونوں طرف سے اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں، ایک گولی آپ کے سر میں لگی اور اسی کے ساتھ آپ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ یہ گولیاں چلانے والے کون تھے؟ شیخ صاحب سے ان کی کیا دشمنی تھی؟ دیار غیر میں ایک زائر پر اچانک گولیاں کیوں چلیں؟ یہ اب تک ایک معمہ بنا ہوا ہے، بعض احباب کا اندازہ ہے کہ اس کے پیچھے بھی وہی مسلکی نفرت اور گروہی تشدد پسندی ہے جس کے مطابق ہر مسلک مخالف کی جان لینا کار ثواب ہے۔ کسی کی شکل و صورت اور آؤ بھاؤ سے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ہمارے مسلک کا مخالف ہے تو بس اتنی سی بات ہمارے ہاتھوں اس کی موت کے جواز کو ثابت کر دیتی ہے۔

الفرض مسلکی انتہا پسندی اور سیاسی عدم توازن یہ وہ دو بنیادی عناصر ہیں جن کی وجہ سے آج پورا عالم اسلام شعلوں کی نذر ہے۔ افسوس ملت کے عظیم مفکر، محقق اور معمار مولانا اسید الحق عاصم قادری بھی انہی شعلوں کی نذر ہو گئے۔ فہل من بصیر؟ □□□

استاذ جامعہ عارفیہ، سید سرواں، کوشا، والد آباد (یوپی)

وہ جمہوری تقاضوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ پاکستان کی ناقص جمہوریت اور مصر کی تازہ حکومت ہمارے سامنے مثال ہیں۔ مسلم عوام کا حال یہ ہے کہ جس کے پیچھے خواص کا ہاتھ بھی ہے، زبانی طور پر جمہوریت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی وہ فوراً قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انھیں عوامی جمہوریت اور عوامی بدعنی میں فرق کا ادراک نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلمان صرف بادشاہت کے جبر میں جی سکتے ہیں۔ انہیں جب بھی جمہوریت کی آزادی ملتی ہے، ہر شخص حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی بد حالی، زوال، تباہی اور قتل و غارت کی یہ بڑی وجہ ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان جلد سے جلد اپنی ذہنیت تبدیل کریں۔ وہ تہذیب کا سامنا کریں اور مفروضات میں جینا چھوڑ دیں۔

(ب) اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں ہی مسلکی گروہ بندیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ بعض فرقے بہت شدت پسند قتل و خون کے خوگر اور تکفیر و تصفیل میں عجلت پسند تھے۔ اہل سنت کا نشان امتیاز یہ ہے کہ یہ ہر دور میں مسلمانوں کا بڑا گروہ رہا اور یہ گروہ ہمیشہ ہر معاملے میں وسطیت اور اعتدال پسندی کا خواہاں رہا۔ اہل سنت و جماعت اصول عقائد و مسائل میں اتفاق کے ساتھ فروغ و نغیات میں توسع پر گامزن رہے۔ فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کا وجود اس کا واضح ثبوت ہے۔ علمائے اہل سنت ہر دور میں تکفیر سے حتی الوسع گریز کرتے رہے۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان تشدد پسندوں کو بھی مسلمان سمجھتے تھے جو شدت کے ساتھ آپ کی تکفیر کیا کرتے تھے۔ (مصنف ابن شیبہ، کتاب الجمل، ما ذکر فی الخوارج) اسی طرح وہ دوسروں کے لیے افہام و تفہیم اور دعوت و اصلاح کا رویہ اپناتے تھے۔ بحیر وقت دوسروں پر اپنا موقف مسلط نہیں کرتے تھے۔

آج عالم اسلام کی عجیب صورت حال ہے۔ مسلکی اختلافی مسائل میں طاقت کا استعمال عام ہے۔ اسی طرح فقہی اختلافات کو بھی ناقابل برداشت جرم سمجھا جا رہا ہے بلکہ فقہی اختلافات کو مسلکی اختلافات کی شکل دی جا رہی ہے اور مسلکی اختلافات پیدا ہونے پر ایک دوسرے کے خلاف طاقت و قوت کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس سے مسلمان آپس میں اس طرح سے باہم دست و گریباں ہو چکے ہیں کہ اگر ان کا کوئی دوسرا دشمن نہ ہو جب بھی وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے

ہوئے وہ انسانی فلاح و بہبود اور قیام امن کے لیے سماجی سرگرمیوں میں شبانہ روز مصروف عمل تھے۔ زبردست علمی طمطراق کے باوصف مرحوم حد درجہ منکسر المزاجی، جذبہ سلوک، روحانی معرفت اور تصوف کی طرف اپنے گہرے میلان کے لیے مقبول خاص و عام تھے۔ وہ سرزمین ہند کی فقید المثل علمی و روحانی شخصیت کے حامل ایک نامور اور ابھرتے ہوئے جواں سال محقق و ناقد بھی تھے جن کے نقد و نظر کی مقبولیت عالم اسلام اور بالخصوص ہندوپاک میں روز افزوں تھی۔ محض ۳۹ رسال کی مختصر عمر میں مولانا اسید الحق قادری شہید نے آسمان علم و فکر کی جن بلندیوں کو چھو لیا تھا، ان تک ادنی رسائی کے لیے بھی ایک عرصہ دراز درکار ہے۔ اعلیٰ پیمانے پر ہندوستانی سماج کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی بے لوث خدمات اور انتھک کوششوں کی وجہ سے بھی مولانا بدایونی اپنی خانقاہ کی روشن تاریخ کا ایک لازوال باب بن کر ہمارے دلوں میں ہمیشہ جلوہ گر ہیں گے۔

مولانا قادری بدایونی کا موقف تھا کہ ہندوستان جیسے ایک متعدد اشفاقاں اور کثیر المذاہب ملک میں مسلمانوں کو ایک ایسے نظام حیات کی ضرورت ہے جس سے مسلمان اس ثقافتی تنوع اور مذہبی تعدد کے باوجود اپنی غیر معمولی اہمیت اور انفرادی افادیت کو بحیثیت قوم دوسروں کو محسوس کرا سکیں۔ ان کا یہ یقین تھا کہ گزشتہ صدیوں کی طرح آج بھی تعلیمات تصوف نہ صرف قوم مسلم بلکہ ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی اقوام کو بھی فائدہ بہم پہنچا سکتی ہیں اور ہندوستانی معاشرے کو امن و سکون، مذہبی رواداری اور محبت و ہم آہنگی کا ایک بے مثال گہوارہ بنا سکتی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے زندگی بھر اس امر پر زور دیا کہ اسلام کی روحانی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر ”شانی سمیلن“ کے عنوان سے مولانا قادری کے زیر انتظام اور خانقاہ قادریہ بدایوں کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ ایک تاریخی، عہد ساز اور عظیم الشان اجلاس جماعتی سطح پر ہندوستان میں بین المذاہب ڈائیلاگ کی طرف ایک خوش گوار اقدام تھا جو ملک کی خانقاہی تاریخ میں انمٹ نقش چھوڑ گیا ہے۔ اس تاریخی کانفرنس میں مولانا اسید الحق قادری نے ملک کے نامور علمائے کرام اور دانشوران اہل سنت کو دیگر سماجی و مذہبی رہنماؤں کے ساتھ بین المذاہب مکالمہ اور امن عالم کے فروغ کے لیے پہلی مرتبہ یکجا جمع

کیا، مثلاً معروف عالم دین مولانا نعیم اختر مصباحی، مولانا خوشنورانی، ڈاکٹر خجہ اکرام ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ادبی، اردو اور ہندی کے مشہور شاعر بیکل اتسائی و دیگر۔ اس کانفرنس میں مذکورہ بلند پایہ سنی شخصیات نے غیر مسلم قائدین اور مذہبی رہنماؤں مثلاً ہندو رہنما سوامی اگنی دیش، ڈائریکٹر کمیشن برائے مذہبی ہم آہنگی، واپی Commission of Religious Harmony, Delhi اور ایم ڈی تھامس، پنڈت اٹل شاستری اور سردار گر میت وغیرہ اور مختلف مذاہب کی نمائندہ علمی و سماجی شخصیات کے ساتھ ہم آواز ہو کر ایک اسلامی اسٹیج سے دہشت گردی کی وبا کو مٹانے اور امن و شanti کے قیام کے لیے یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ مولانا قادری کی اس عظیم کوشش نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کے روحانی نظام پر مبنی ہندوستانی خانقاہوں نے ہر دور میں پر امن کوششوں اور بے لوث انسانیت نواز خدمات کے ذریعے ہی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی، جس کی تابندہ مثال بدایوں کی سرزمین پر خانقاہ عالیہ قادریہ ہے۔

مولانا اسید الحق قادری کی شہادت سے قبل ۱۰ افراد روری کوئی دہلی میں جب وہ عراق کے سفر کی روانگی میں مصروف تھے، راقم السطور کو ان سے ایک علمی نشست میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس مجلس میں میں نے مولانا بدایونی کی عمیقی شخصیت کا اس وقت بنظر غائر اور قریب سے خاموش مطالعہ کیا جب مولانا کی گفتگو کا محور ہماری مذہبی و جماعتی مجالس کی دیرینہ روایات سے ہٹ کر خالص علمی، ملی اور دعوتی تھا۔ اس نشست کے اختتام پر مولانا نے مجھ سے ایک شخصی گفتگو کے دوران کوہ ہمالہ کی طرح بلند اپنے ان دعوتی عزائم کا اظہار کیا جو اگر واقعی مجسم حقیقت ہو جاتے تو جدید دور میں ملت اسلامیہ کی تاریخ کی روش ہی بدل جاتی۔

مولانا اسید الحق قادری نے اپنی پوری زندگی اسلام کی پر امن تعلیمات کے فروغ، شدت پسندانہ اور دہشت گردانہ نظریات کی تردید اور اپنے بیش بہا علوم و فنون اور دیگر وسائل و ذرائع کو اسلام، روحانیت اور خلق خدا کی خدمت عام کے لیے صرف کر دیا تھا۔ وہ اپنی ان مومنانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ایک حقیقی مجاہد کی تصویر تھے۔ اسلام کی تاریخ شہادت شاہد ہے کہ راہ حق و فدا کا مجاہد ہمیشہ شہید ہوا ہے۔

بقیہ صفحہ 88 پر ملاحظہ کریں

(۵)

شخص وعکس

آئینہ حیات عالم ربانی

نام:

اسید الحق محمد عاصم قادری

عرفیت:

شیخ صاحب

القاب:

ممتاز ناقد و محقق، عالم ربانی، شہید بغداد

سند ولادت:

۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ / ۶ مئی ۱۹۷۵ء

مقام ولادت:

مولوی محلہ، بدایوں (یوپی)

والد گرامی:

حضرت شیخ عبدالحمد محمد سالم القادری

جد محترم:

مفتی اعظم سلطنت آصفیہ مولانا شاہ عبدالقدیر قادری ابن تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقدیر قادری ابن سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی

بیعت و خلافت:

تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمد محمد سالم القادری سے بیعت و خلافت

نیز وارث و جتن حضرت سید شاہ یحییٰ حسن قادری برکاتی علیہ الرحمہ سے خلافت

شادی:

ہمراہ سیدہ سائرہ قادری (بنت سید محمد نصیر مرحوم، سہوانی ٹولہ، بریلی) ۱۵ اگست ۲۰۰۲ء

ابتدائی تعلیم:

حفظ قرآن کریم (مدرسہ قادریہ بدایوں) از ۱۹۸۶ء تا ۱۹۸۹ء

اعلیٰ تعلیم:

درس نظامی کی تحصیل (مدرسہ قادریہ بدایوں) از ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۳ء

فاضل درس نظامی (دارالعلوم نور الحق، چہرہ، محمد پور، فیض آباد) از ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۷ء

الاجازۃ العالیہ، شعبہ تفسیر و علوم قرآن، جامعہ الازہر الشریف، قاہرہ، مصر، از ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۳ء

تخصّص فی الاوقاف، دارالافتاء المصریہ قاہرہ، مصر از ۲۰۰۳ء تا ۲۰۰۴ء

ایم اے (علوم اسلامیہ)، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، از ۲۰۰۸ء تا ۲۰۰۹ء

اساتذہ:

تاجدار اہل سنت شیخ عبدالحمد محمد سالم القادری، امام علم و فن علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی، مولانا رحمت اللہ صدیقی، فقیہ النفس

مفتی مطہر الرحمن مظفر رضوی، حافظ وقاری کریم اللہ قادری، ڈاکٹر علی جمہ (مفتی جمہوریہ مصر)، پروفیسر علامہ عبدالحی فرماوی،

پروفیسر علامہ جمہ عبدالقدور، پروفیسر علامہ محمود عبدالخالق حلوی، پروفیسر علامہ سعید محمد صالح صوابی، پروفیسر علامہ سید المسیر،

پروفیسر علامہ طہ جیشی، پروفیسر علامہ عبدالحی بیوی

اجازت حدیث:

والد محترم تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمد محمد سالم القادری (صاحب سجادہ آستانہ قادریہ بدایوں)، ڈاکٹر علی جمہ

(مفتی جمہوریہ مصر)، شیخ القراء، نجم القراء، شیخ صلاح الدین التجانی (شیخ القراء، مصر)، شیخ علی بن محمود الحری الرفاعی

(خطیب و امام آستانہ حضرت معروف کرخی و استاذ بغداد یونیورسٹی)، شیخ محمد ابراہیم عبدالباعث (محدث اسکندریہ، مصر)

تدریس:

مدرسہ قادریہ، بدایوں میں از ۲۰۰۳ء تا ۲۰۱۳ء

خصوصی حلقہ:

صاحبزادہ مولانا عظیم قادری، مولانا عزام قادری، مولانا سید عادل محمود کلیمی (صاحب سجادہ خانقاہ کشمیریہ، کٹرہ)، مفتی دلشاد

مناصب:

شیخ الحدیث - (مدرسہ قادریہ بدایوں)

نائب قاضی

(ضلع بدایوں)

ڈائریکٹر

(الازہر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز بدایوں)

ممبر

(عربی پینل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی)

صدر

(الازہر ایجوکیشن ہیومن وٹیفیکیشن سوسائٹی، بدایوں)

سرپرست

(الازہر فاؤنڈیشن، مہاراشٹر)

ٹرنٹی

(نیو انج میڈیا اینڈ ریسرچ سینٹر، نئی دہلی)

خدمات:

مدرسہ قادریہ اور کتب خانہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ، درگاہ قادری مجیدی کی تعمیر و توسیع، مولانا عبدالمجید پبلک لائبریری بدایوں کا

قیام، دینی و عصری طلبہ کے لیے سالانہ سمر کلاسیس کا انعقاد، درس قرآن و حدیث، جامع مسجد کشمیری میں جمعہ کی خطابت و

امامت، قری، ہیلتھ کیپ کا انعقاد، اکابر و اسلاف کی کتابوں کی تحقیق و ترتیب اور اشاعت، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس۔

ہندوستان کے مختلف گوشے میں تقریباً ۱۵۰ موضوعات پر ۳۵۰ سے زائد خصوصی لیکچرز اور خطاب کیا۔

لیکچرز و خطاب:

دینی و علمی موضوعات پر ۵۰ سے زائد "کیو ٹی وی" پاکستان، "ای ٹی وی" اور مختلف مقامی چینلز کے پروگرام میں شرکت

ہفتہ واری محافل فہم دین، دس روزہ محافل فہم سیرت، فہم قرآن ہفتہ، تعمیری و تربیتی ورکشاپ، تعلیمی و تربیتی کیپ برائے

خواتین، روحانی تربیتی کیپ، علامہ فضل حق خیر آبادی کونشن وغیرہ

علمی خدمات:

تقریباً ساٹھ سے زائد علمی و تحقیقی مقالات

تصانیف:

قرآن کریم کی سائنسی تفسیر

۲۰۰۸ء

حدیث افتراق امت: تحقیقی مطالعے کی روشنی میں

۲۰۰۸ء

احادیث قدسیہ

۲۰۰۹ء

خامہ تلاشی

۲۰۰۹ء

(تنقیدی مضامین)

۲۰۰۹ء

اسلام: ایک تعارف

۲۰۱۱ء

عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات

۲۰۱۱ء

خیر آبادیات

۲۰۱۱ء

تذکرہ شمس مارہرہ

۲۰۱۳ء

فرزوق تہی کا قصیدہ ہمسیر: ایک تحقیقی مطالعہ

۲۰۱۳ء

کالم نگاری:

ماہنامہ جام نور دہلی میں اپریل ۲۰۰۵ء سے دسمبر ۲۰۰۶ء تک "خامہ تلاشی" کے عنوان سے یادگار علمی و تنقیدی کالم لکھا۔

ترتیب و تالیف:

(۱) مولانا فیض احمد بدایونی، دسمبر ۲۰۰۷ء (۲) تذکرہ ماجد، جولائی ۲۰۰۸ء (۳) خطبات صدارت، اکتوبر ۲۰۰۸ء (۴)

مثنوی غوثیہ، نومبر ۲۰۰۸ء (۵) طلت اسلامیہ کا ماضی، حال، مستقبل، نومبر ۲۰۰۸ء (۶) مولود منظوم مع انتخاب نعت و مناقب،

دسمبر ۲۰۰۹ء، (۷) احوال و مقامات، دسمبر ۲۰۰۹ء (۸) باقیات ہادی، دسمبر ۲۰۰۹ء (۹) مفتی لطف بدایونی شخصیت اور شاعری

ارباب علم و دانش کے اعترافات

علم و فن کا چراغ روشن کرنے والا ماهر عالم دین

امین ملت پروفیسر سید محمد امین قادری برکاتی

سجادہ نشین: خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مظہرہ، ایبٹ آباد (پوپی)

اپنے اکابر علماء اور مشائخ عظام کی تصنیفات کی دوبارہ اشاعت جدید پیرایہ کے ساتھ کرنے کی سعی عزیزی مولانا سید الحق قادری صاحب کر رہے ہیں اور یہ بڑی سعادت مندی کی بات ہے کہ انہوں نے اب تک تقریباً ۸۰ کتابیں اپنے خاندانی برگوں اور مشائخ کی شائع کی ہیں اور مستقبل میں بھی ان سے بہت سے تخلیقی اور تحقیقی کاموں کی توقعات ہیں۔ (تحقیق التراز: ص ۱۱، تاج الفول اکیڈمی، ۲۰۱۲ء)

اردو کے ایک بڑے ادیب نے لکھا تھا کہ ”جب کوئی تصنیف متعہ شہود پر آتی ہے تو گویا ایک چراغ روشن ہوتا ہے“ میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ یہ چراغ، دی چراغوں کی طرح کبھی بجھتا نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ اپنی روشنی سے علمی ذوق رکھنے والوں کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ عزیز مولا نا سید الحق قادری برکاتی بدایونی ایسے چراغ روشن کرنے میں سرگرداں، ماہر اور کامیاب ہیں۔ (قصیدتان رانکھان، ص ۷، تاج الفول اکیڈمی، ۲۰۱۳ء)

□□□

گویائی اور خاموشی سے فتنوں کی سرکوبی کرنے والا محقق

حضرت سید محمد اشرف مارہروی

چیف انکم ٹیکس کمشنر: کولکاتا (بنگال)

آزادی کے بعد کے دور میں مذہبی صحافت میں تنقید و تبصرے کی روایت تو یقیناً ملتی ہے لیکن جام نور کے صفحات میں مستقل کالم کے طور پر عزیز گرامی قدر مولانا سید الحق محمد عاصم قادری کی ”خامہ تلاشی“ نے قارئین کے دل میں جیسی جگہ بنائی، اس کی مثال عقاب ہے۔ ”خامہ تلاشی“ کے قبول عام میں جن عناصر نے حصہ لیا وہ ہر کس و نا کس کے بس میں نہیں ہیں۔ گہرا علم، وسیع معلومات، سخن فہمی، عمدہ نثر کا استعمال، صحت زبان، منطقی طریقہ کار، طنز کا شائستہ انداز، ظریفانہ ذوق، بے باکی (گستاخی نہیں)، احساس توازن، پاس اعتدال، ”خیال خاطر ابواب“ اور۔۔۔ طرف نگاہ۔ یہ آخری بات کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ سنجیدہ، متین اور علمی تحریر کے افق پر ظرافت کی روپوشی چمک نے ان کالموں کو یادگار بنا دیا ہے۔

(حلیپ: خامہ تلاشی، تاج الفول اکیڈمی، ۲۰۰۹ء)

(”تذکرہ نوری“ کو) بنانے سنوارنے کا کام عزیز گرامی قدر مولانا سید الحق قادری کے اُن ہاتھوں سے ہوا ہے جو باتوں اور معاملات کو الجھاتے نہیں بلکہ پیچ در پیچ معاملات کو سلجھانا اپنی خاندانی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ وہ فتنوں اور فتنہ پروروں سے دور و نفور ہیں اور خالص علمی انداز تحقیق

اگست ۲۰۱۰ء (۱۰) نگارشات محبت احمد، اگست ۲۰۱۰ء (۱۱) تذکرہ نوری، مئی ۲۰۱۳ء (۱۲) اکمل التاريخ، جولائی ۲۰۱۳ء (۱۳) قصیدتان رانکھان، اکتوبر ۲۰۱۳ء

ترجمہ، تخریج، تحقیق:

(۱) احقاق حق، جنوری ۲۰۰۷ء (۲) عقیدہ شفاعت، جنوری ۲۰۰۸ء (۳) مناصحہ فی تحقیق مسائل المصالحۃ جنوری ۲۰۰۸ء (۴) تذکرہ فضل رسول، جنوری ۲۰۰۸ء (۵) الکلام السدید فی تحریر الاسانید، نومبر ۲۰۰۸ء (۶) اکمال فی بحث شد الحال، ستمبر ۲۰۰۹ء (۷) خز معظّم، ستمبر ۲۰۰۹ء (۸) اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ، ستمبر ۲۰۰۹ء (۹) رد و انقض، ستمبر ۲۰۰۹ء (۱۰) فصل الخطاب، ستمبر ۲۰۰۹ء

دیگر مانی ملی کام:

(۱) احکام قبور، جنوری ۲۰۰۸ء (۲) مردے سنتے ہیں، نومبر ۲۰۰۸ء (۳) مضامین شہید، نومبر ۲۰۰۸ء (۴) عرس کی شرعی حیثیت، نومبر ۲۰۰۸ء (۵) فلاح دارین، نومبر ۲۰۰۸ء (۶) عقائد اہل سنت، نومبر ۲۰۰۸ء (۷) ریاض القرات، نومبر ۲۰۰۸ء (۸) شارح الصدور فی احکام القبور، ستمبر ۲۰۰۹ء (۹) عظمت غوث اعظم، ستمبر ۲۰۱۰ء (۱۰) خواجہ غلام نظام الدین، دسمبر ۲۰۱۱ء (۱۱) احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام، مئی ۲۰۱۲ء (۱۲) وہابی تحریک، مئی ۲۰۱۲ء (۱۳) شمس الایمان، مئی ۲۰۱۲ء (۱۴) شیخ ابن تیمیہ کے عقائد و افکار، ستمبر ۲۰۱۲ء (۱۵) تذکرہ خاندان قادریہ، ستمبر ۲۰۱۲ء (۱۶) قصیدہ بانٹ سعادت، نومبر ۲۰۱۲ء (۱۷) اسلام میں محبت الہی کا تصور، ۲۰۱۲ء (۱۸) اظہار و اعتراف، ۲۰۱۲ء (۱۹) سیف اللہ المسلمول کا علمی مقام، ۲۰۱۲ء (۲۰) الجواب مشکور، مارچ ۲۰۱۳ء (۲۱) مسئلہ قیام تعظیص، مارچ ۲۰۱۳ء (۲۲) برکات مارہرہ، اکتوبر ۲۰۱۳ء

سفر حج: پہلا حج مئی ۱۹۹۴ء/۱۴۱۴ھ
دوسرا حج نومبر ۲۰۰۸ء/۱۴۲۹ھ
سفر عمرہ: پہلا عمرہ اکتوبر ۱۹۹۲ء/جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
دوسرا عمرہ اگست ۱۹۹۶ء/صفر ۱۴۱۷ھ
تیسرا عمرہ مئی ۲۰۱۲ء/جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ
سفر بغداد: پہلی مرتبہ ۱۹۹۲ء/۱۴۱۳ھ
دوسری مرتبہ ۱۹۹۴ء/۱۴۱۴ھ
تیسری مرتبہ ۱۹۹۶ء/۱۴۱۷ھ
چوتھی مرتبہ ۱۹۹۹ء/۱۴۲۰ھ
پانچویں اور آخری مرتبہ ۲۰۱۲ء/۱۴۳۵ھ

اعزازات: ”نشان تاج العلماء“ اور مبلغ ۲۱۰۰۰ روپے (من جانب: خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مظہرہ)
”علائقہ فضل حق خیر آبادی ریسرچ ایوارڈ“ (من جانب: بینائی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، لکھنؤ)
”ہدیہ سپاس“ (روٹیری انٹرنیشنل، انڈیا)
”ہدیہ سپاس“ (ای وی اردو، حیدرآباد)

شہادت: ۲/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ/۳/مارچ ۲۰۱۳ء بروز منگل
تدفین: ۳/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ/۶/مارچ ۲۰۱۳ء بروز جمعرات، بمقام احاطہ غوث اعظم بغداد معلیٰ، جس میں قیام الاشراف، متولیان و صاحب سجادگان ہی کی تدفین ہوتی ہے۔ □□□

کے تحت کتب ہائے قدیمہ کو دل پذیر اور عقدہ کشا حواشی اور دیگر معلومات کے اضافوں کے ساتھ منظر عام پر لارہے ہیں۔ یہ کام ان کے ہاتھوں تو آخر کے ساتھ ہو رہا ہے اور اس طرح اپنے علمی خانوادے اور خانقاہ کی نشاۃ ثانیہ کے کام میں اپنے دلگرمی کی سرپرستی میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ ان کا انداز تحریر اور متن ایسا ہوتا ہے کہ ان کے لکھے سے کسی اپنے کو جرات نہیں پہنچتی۔ میراثی مشاہدہ ہے کہ تحریری قوتوں کی سرکوبی میں اس نوجوان عالم دین اور معروف و قدیم خانقاہ کے فروتین نے قلم کا ہتھیار بھی استعمال کیا ہے اور مومنانہ فراست کے پیش نظر خاموشی کا انداز بھی اختیار کیا ہے۔ کچھ نہ کہنا بھی اک انداز بیباں ہوتا ہے (تذکرہ نوری، ص: ۱۶، ۱۵، تاج المجلد اکیڈمی، بدایوں، طبع جدید: ۲۰۱۳ء)

□□□

خیر آبادیات کا مرکز اب بدایوں ہو گیا ہے

مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی

برکات اکیڈمی، کراچی (پاکستان)

آپ نے ”خیر آبادیات“ لکھ کر ایک موضوع اختراع فرمایا ہے، اور بہت سے گم نام، کم نام اور نام و شہرت سے بے نیاز بلکہ گریز اس فضلا کے محاسن کردار کے نادر اور مستند واقعات کو ترتیب دے کر ایک گل دستہ بنا دیا ہے، میں نے کئی باذوق حضرات کو مطالعے کے لیے دی، وہ بہت متاثر ہوئے۔ ہمارے اکابر کی علم دوستی، طالب علم دوستی، کتاب دوستی اور طلبہ پر شفقت وغیرہ نے بہت متاثر کیا۔

اندازہ ہوا کہ خیر آبادیات کا مرکز اب ٹونک، رامپور وغیرہ سے ”بدایوں“ منتقل ہو گیا ہے اور آپ جیسے جواں سال اور جواں بخت حضرات کی رہنمائی میں یہ کاروان فضل و کمال دوبارہ سرگرم سفر ہوگا۔ (مکتوب بنام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۲۰۱۱ء)

□□□

مولانا اسید الحق کو عربی وار موزبانوں کا اچھا ذوق ہے

مولانا سید محمد رابع حسنی عودی

ناظم: ندوۃ العلماء، لکھنؤ (یوپی)

محترم جناب اسید الحق قادری صاحب نے عربی محاوروں کی اردو کے ممتثل محاوروں میں ادائیگی خاصی حد تک کی ہے اور پیش نظر کتاب میں اچھی مثالیں پیش کی ہیں، اس سے دونوں زبانوں کے محاورات سے اپنی فنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے اور اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو دونوں زبانوں کا اچھا ذوق حاصل ہے، اس کو دیکھتے ہوئے عربی اور اردو ادب کی تعلیم اور تعلم کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب قابل قدر ہوگئی ہے۔

(مکتوب بنام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۲۰۱۱ء نومبر)

□□□

عربی محاورات ایک حوالہ کی کتاب ہے

پروفیسر محسن الرحمن قادری

ماہنامہ شب خون، ۳۱۳ ررانی منڈی، اللہ آباد (یوپی)

آپ کی کتاب ”عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات“ ملی، شکر یہ۔ میں نے یہ کتاب جگہ جگہ دیکھی اور اسے بہت خوب پایا۔ ظاہر ہے کہ ایسی

کتاب حوالے کے لیے سرہانے رکھی جانی چاہیے۔ آج کے نام نہاد زبان دان حضرات زبان کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں اس سے مایوسی ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ مستند روزمرہ اور محاورات کو محفوظ رکھا جائے۔ اس کتاب کا قیمتی حصہ یقیناً محاورات پر مبنی حصہ ہے۔ کتاب کا مقدمہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے، اگرچہ بعض جگہ اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔ (مکتوب بنام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۲۰۱۲ء نومبر)

□□□

ابوالفیض معینی کی وسعت نظر اور صلاحیتوں کا معترف ہوں

مولانا محمد مصباحی

صدر المذہبین: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

مولیٰ تعالیٰ ان (مولانا اسید الحق قادری) کے درجات بلند فرمائے اور ہم میں ان کے امثال زیادہ فرمائے۔ میں معینی صاحب (مولانا اسید الحق قادری) کی علمی وسعت نظر اور گونا گوں صلاحیتوں کا عام قارئین سے کچھ زیادہ ہی معترف ہوں، اور ان کی اس خوبی کو بھی بنظر استحسان دیکھتے ہوں کہ نوجوان اہل قلم کی ہمت افزائی اور رہنمائی کے لیے ان کی تحریروں کو خاص توجہ دے کر اپنی مدح و تنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ تنقید کم، تعریف، اصلاح اور حوصلہ افزائی زیادہ ہوتی ہے، تاکہ اس زمانہ قحط الرجال میں جو چند افراد قرطاس و قلم سے وابستہ ہوئے ہیں آئندہ بھی وابستہ رہیں، ساتھ ہی ان کی تحریروں میں پختگی اور جلا بھی پیدا ہو۔ (مکتوب بنام: خوشنورانی، مورخہ ۲۵ شعبان ۱۴۳۷ھ، ۱۹ اگست ۲۰۰۶ء)

□□□

عربی محاورات کی تشریح و تطبیق قابل تعریف کام

ڈاکٹر سعید الاحمدی

مدیر ماہنامہ البعث الاسلامی، لکھنؤ

جناب کا ارسال فرمودہ ہدیہ شمیمہ ”عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات“ ملا۔ سب سے پہلے میں آپ کی اس بندہ نوازی کے لیے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے ذوق عربیت سے مجھے فائدہ پہنچایا۔ کتاب کے اکثر حصے کو بغور پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی توفیق ہوئی، مقام شکر ہے کہ اندھن نے آپ سے قبل تعریف کام کرایا اور عربی محاورات کی تشریح و تطبیق کا ایک اچھا کام آپ نے کیا۔ یوں تو ہم خواہ کسی زبان کا ہو اور خاص طور سے عربی زبان کا ہم تو ایک بحر زار ہے جس کے ساحل تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ (مکتوب بنام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۲۰۱۱ء نومبر)

□□□

بدایوں کی علمی روایت کو از سر نو زندہ کر دیا

پروفیسر سید حنیف احمد نقوی

سابق صدر شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

قیام بدایوں کے دوران آپ کی بھوکائی ہوئی کتابیں مل گئی تھیں۔ اس عنایت خاص کے لیے ممنون ہوں، رفتہ رفتہ سبھی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جی خوش ہوا کہ آپ بدایوں کی علمی روایت کو از سر نو زندہ کرنے میں مصروف ہیں، ورنہ عرصے سے اس قسم کے موضوعات پر کتابوں کی تصنیف و اشاعت کا سلسلہ بند تھا۔ (مکتوب بنام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۱۷ نومبر ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر عصام حمید بنی ابو غریہ

استاذ: شعبہ نحو، صرف، عروض، کلیہ "دارالعلوم" جامعہ قاہرہ (مصر)
سید الحق سے روابط و تعلقات کے دوران میں نے ان کے اندر علم نافع کی تحصیل کے لیے بڑا شوق و جذبہ دیکھا، یہی ان لوگوں کا طریقہ ہے جو علوم تفسیر، حدیث اور فقہ کو اس جذبے کے تحت حاصل کرتے ہیں کہ ان کی صلاحیتیں کامل ہوں، مطالعہ وسیع ہو اور غلطیاں کم ہوں۔
(عربی محاورات: ص: ۱۲/۱۳، تاج الحول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء)

□□□

مولانا سید الحق ماهر لسانیات عالم و محقق

پروفیسر محمد مصطفیٰ شریف

صدر: شعبہ عربی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (دکن)
زیر نظر کتاب [عربی محاورات مع ترجمہ و تفسیرات] ایک ایسے ہی عالم کے نوک قلم سے معرض وجود میں آئی ہے جو الحمد للہ بہ یک وقت دونوں زبانوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، مزید یہ کہ وہ صوفی بھی ہیں عالم بھی، ادیب بھی ہیں ناقد بھی، مترجم بھی ہیں مؤلف بھی اور ہر سانیات بھی، اردو نے تو انہی کے خانوادوں میں انگڑیاں لی ہیں، عربی ادب کی آخری پناہ گاہ (جامع ازہر) میں ان کا قیوم اور وہاں کے عبقری اساتذہ سے ان کا استفادہ اس پر مستزاد۔

مولانا موصوف سے میری پہلی ملاقات شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ میں ہوئی، نورانی متبسم چہرہ اور اندازِ قلم ان کی خاندانی اور ذاتی عمی و جاہت کی گواہی دے رہا تھا، عربی زبان اور بالخصوص محاورات کے سلسلے میں ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف سید الحق ہی نہیں، بلکہ "اسد الادب" بھی ہیں اللہم زد فرد۔ (تقریظ عربی محاورات: ص: ۱۲، تاج الحول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء)

□□□

علوم متداولہ پر گہری نظر رکھنے والا فہم کار

ڈاکٹر فضل الرحمن قریم صہبی

سابق استاذ: طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی
خدمہ تدریس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، اسلوبِ تحریر بڑا دل پذیر ہے، شعر و ادب کے تعلق سے وہ جو بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس شہسور دلائل ہیں اکثر اسے بھی وہ اپنی فہم ناقص کے حوالے کر دیتے ہیں، یوں مخاطب یا مشار الیہ کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے، قارئین رسالہ کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور ہر گمانی بھی راہ نہیں پاتی۔ یہ وصف خاص جسے میں خدمہ تلاش کا بڑا کینہ کہتے ہوں صرف عییم حاصل کر لینے سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ اس خانقاہی نظام تربیت کا ثمرہ ہے جہاں سے آدمی انسان بن کر اور مستر شد اور مرشد بن کر نکلتا ہے۔ (ماہنامہ جام نور دہلی، شمارہ مارچ ۲۰۱۱ء)

□□□

ڈاکٹر ایم ایم محمد ایم ایم

صدر: شعبہ اردو، جامعہ ازہر (مصر)
برادر عزیز سید الحق محمد عصام قادری سے تعارف حاصل ہوا، جو اتر پردیش کے ایک شہر بدایوں سے نسبت رکھتے ہیں، اس شہر نے بے شمار علماء، شعرا اور ادبا پیدا کیے ہیں جن پر برصغیر ہندوپاک کے لوگ بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ سید الحق بھی انہی علم کی صف میں شامل ہوں گے۔ خاص کر جب کہ انہوں نے جامعہ ازہر شریف میں کلیہ اصول الدین کے شعبہ تفسیر سے فراغت حاصل کی ہے، اور پھر کمال ایک سال گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مصری دارالافتا سے اجازت افتا بھی حاصل کی ہے۔ (تقریظ عربی محاورات: ص: ۱۱/۹، تاج الحول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء)

□□□

عربی محاورات اپنے موضوع پر بڑی وقیع اور شاہ کار ہے

مولانا محمد وثیق ندوی

استاذ: کلیۃ اللغة العربیة و آدابها، ندوۃ العلماء، لکھنؤ
باعث تحریر یہ ہے کہ استاذی و شیخی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (حفظہ اللہ و رعاه) ناظم ندوۃ العلماء کے پاس میں نے آپ کی شاہ کار تصنیف "عربی محاورات" دیکھی جو اپنے موضوع پر بڑی وقیع اور پرازمعلومات ہے، حضرت نے بھی آپ کی کتاب کو سراہا ہے اور مقدمہ املا کرانے کے دوران مجھ سے کئی بار فرمایا کہ "یہ کتاب شائقین عربی زبان و ادب کے لیے بڑی مفید ہے"، اس لیے خیال ہوا کہ اگر اس اہم اور مفید کتاب کے چند نسخے اور آجائیں تو اساتذہ اور طلبہ کے لیے استفادہ آسان ہو جائے گا اور حضرت کا بھی یہی خیال ہے۔
(مکتوب ینام: مولانا شیخ سید الحق قادری، ۱۲/۱۲/۲۰۱۱ء)

□□□

مولانا سید الحق قادری نئی نسل کے نمائندہ عالم اور فہم کار

ڈاکٹر سید سلیم اشرف جاسی

استاذ: شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
عزیز القدر مولانا سید الحق نئی نسل کے نمائندہ عالم اور فہم کار ہیں جن کی تصنیفات میں قدیم صحاح اور جدید نافع کا خوب صورت استخراج ملتا ہے، نہیں عمی و تحقیقی کاموں کا شوق بھی ہے اور سلیقہ بھی۔ اس سے پہلے بھی ان کی کئی عمی کاوشیں منظر عام پر آ کر اہل علم سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ فکر میں اصالت، پیش کش میں عصریت اور اصول تحقیق کی رعایت کے ساتھ ساتھ زبان کی سلاست ان کی تحریر کے نمایاں اوصاف ہیں۔ "عربی محاورات" ان کے اہم قلم کا نیا پڑاؤ ہے اور اس بار اس نے بے حد سنگار، رخ اور پُرخطر زمین پر دوڑ گائی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ کام اپنے موضوع پر حرف آخر ہے بلکہ اس موضوع پر اور شاید زبان و ادب کے کسی بھی موضوع پر حرف آخر کی گنجائش ہی نہیں ہوتی ہے، لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ تک کا سب سے جامع اور تحقیقی کام ہے۔ (تقریظ عربی محاورات: تاج الحول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء)

□□□

ڈاکٹر سید امین اشرف

سابق استاذ شعبہ انگریزی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
غالباً دو سال قبل کچھ شریف میں آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ نہایت متوازن، سنجیدہ اور کڑھی ہوئی شخصیت، خدا نے گویا کی کے جوہر سے بھی مالا مال کیا ہے۔ مضمون (کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟) سچا اللہ نہایت جامع اور بغایت ژرف نگاہی سے لکھا ہوا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

(مکتوب نام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۳۰ ستمبر ۲۰۰۷ء)

□□□

’خیر آبادیات‘ علمی دیانت و امانت اور جدید اصول تحقیق پر مبنی کتاب

ڈاکٹر سلیمہ سہول

اسسٹنٹ پروفیسر، بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد (پاکستان)
خیال تھا کہ علامہ محمد فضل حق خیر آبادی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال مکمل ہونے پر ”خیر آبادیات“ از مولانا سید الحق قادری بدایونی مدرسہ بدایوں کی اپنے واجب سے عہدہ برآ ہونے کی محض ایک عقیدت مندانہ کوشش ہوگی۔ مگر مطالعہ کتاب جس قدر بڑھتا گیا، احساسات و خیالات بدستے گئے اور فضل حق پسندوں سے میرا شکوہ و گلہ کم اور غصہ ٹھنڈا پڑتا چلا گیا۔

”خیر آبادیات“ علمی دیانت و امانت اور جدید اصول تحقیق پر مبنی پر خلوص، مفید، معلومات افزا کاوش ہے۔ اس کتاب سے علامہ فضل حق کے علم و فضل کے باب کی بدایونی فصل مکمل ہوئی اور علمی حقائق کے گرد خافین فضل حق کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ اور وقت کی گرد صاف ہوئی، جو علمی ذخائر کے امین و محافظ مدرسہ بدایوں ہی سے ممکن تھا۔ (خیر آبادیات: ص: ۱۷۰ تا ۱۷۱، بدایوں، ۲۰۱۱ء)

□□□

مولانا سید الحق اپنے اجداد کے سچے وارث و امین

مولانا یحییٰ اختر مصباحی

بانی و صدر دارالقلم، ڈاکٹر، نئی دہلی
چشم و چراغ خاندان عثمانیہ بدایوں صاحبزادہ گرامی قدر مولانا سید الحق محمد عاصم قادری بدایونی مرتب ”مجموعہ رسائل فضل رسول“ ہماری پوری جماعت اہل سنت کی طرف سے شکر یہ کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد اور جماعت اہل سنت کے اکابر و اسلاف کی کتب و رسائل کو بڑی محنت و عرق ریزی اور تحقیق و تخریج و تفسیر و ترجمہ کے ساتھ تاج الفحول اکیڈمی بدایوں کے ذریعے منظر عام پر لا رہے ہیں۔

عزیز موصوف علم و حلم، فکر، فہم اور اخلاقی محاسن کے اعتبار سے اپنے آباؤ اجداد کے وارث و امین اور سچے چائین ہیں۔ انہیں جو کام کرنا چاہیے اسے بہ حسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ ان کے عزائم اور حوصلوں کی داد دی جانی چاہیے کہ وہ اس وقت خیر الخلف لخبیر السلف ہیں۔

(مقدمہ مجموعہ رسائل فضل رسول، ص: ۱۷۰، رضا اکیڈمی ممبئی، ۲۰۱۰ء)



”خیر آبادیات“ بدایونی ”فریضہ“ اور خیر آبادی ”حق“ کی ادائیگی کا ایک باوقار روحانی و علمی امتزاج اور احسان شناسی کا پُرخصص نمونہ ہے۔ ساتھ ہی دنیا سے علم و تحقیق میں ”خیر آبادیات“ کے عنوان سے ایک وسیع تاریخی دستاویز کا اضافہ بھی، جس کی ترتیب و پیش کش کا اعزاز حسب زادہ عالی قدر عزیز گرامی مولانا سید الحق قادری بدایونی کو حاصل ہے اور وہ اس اعزاز کے صحیح مستحق بھی ہیں۔ گویا: حق بحق دار رسید۔

(خیر آبادیات: ص: ۱۶۰ تا ۱۶۱، تاج الفحول اکیڈمی بدایوں، ۲۰۱۱ء)

□□□

مولانا سید الحق نے سائنسی تفسیر پر بہت اچھی اور متوازن بحث کی ہے

مولانا محمد رضی الاسلام مدنی

ادارہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ
کئی ماہ قبل آس جناب کی کتاب ”قرآن کریم کی سائنسی تفسیر“ موصول ہوئی تھی اور میں نے وصول کا خط بھی لکھ دیا تھا۔ یہ کتاب موجودہ دور کے بہت اہم موضوع سے بحث کرتی ہے۔ آپ نے موضوع کا بھرپور تعارف کرایا ہے اور بہت اچھی اور متوازن بحث کی ہے۔

(مکتوب نام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۱۴ دسمبر ۲۰۰۸ء)

□□□

مولانا سید الحق نے اپنی علمی قابلیت اور اعتدال پسندی کو منوالیا ہے

سید صفی رحمانی

مدیر: ”نعت رنگ“ کراچی (پاکستان)
”خامہ تلاشی“ جام نور کا دلچسپ سلسلہ ہے، جس طرح ”نعت رنگ“ کو مولانا کوکب نورانی مل گئے جو اس کے مشمولات کا تنقیدی جائزہ شریعت کی روشنی میں لیتے ہیں، اسی طرح آپ کو ابوالفیض معینی صاحب مل گئے ہیں جو گزشتہ شمارے کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کام بہت دشوار ہے لیکن انہوں نے اپنی تحریر کو متوازن رکھ کر اپنی علمی قابلیت اور اعتدال پسندی کو منوالیا ہے۔ (ماہ نامہ جام نور، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

□□□

مولانا سید الحق اردو اور عربی زبان و ادب کے عالم و عارف

پروفیسر کاروق احمد صدیقی

سابق پروفیسر و صدر شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی مظفر پور (بہار)
مولانا سید الحق قادری اردو اور عربی زبان و ادب کے عالم و عارف کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں یگانہ و ممتاز ہیں یعنی وہ مجمع النحرین ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ اردو کے بڑے عالم ہیں یا عربی کے۔ موضوع بڑا خشک اور بے رس تھا، مگر انہوں نے شگفتگی زبان و بیان سے آراستہ کر کے اس کو بے حد آسان اور حلاوت بخش بنا دیا ہے۔

محاورہ مخصوص تقاضوں، رسموں اور موقعوں کے مطابق لفظوں کو بدلے ہوئے سیاق و سباق میں بدلے ہوئے معنوں کے ساتھ استعمال کرنے

مولانا اسید الحق قادری: شخص و عکس

نسب: شیخ صاحب کا سلسلہ نسب خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے، جب کہ والدہ کی طرف سے امام حسین ابن علی تک پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ حضرت سیدہ امیرہ کبریٰ چشتی قدس سرہ (آستانہ قدسیہ، پھونڈ شریف) کی صاحبزادی ہیں۔

شیخ صاحب کا پدری شجرہ نسب یہ ہے:

شیخ اسید الحق محمد عاصم القادری ابن شیخ عبد الحمید محمد سالم القادری ابن مفتی عبد القادر قادری ابن مولانا تاج الحق عبد القادر بدایونی ابن سیف اللہ المسلمول فضل رسول قادری ابن شاہ عین الحق مولانا عبد المجید قادری بدایونی ابن مولانا عبد الحمید قادری بدایونی ابن مولانا محمد شریف ابن مولانا محمد شفیع ابن شیخ مصطفیٰ ابن مولانا عبد الغفور ابن مولانا شیخ عزیز اللہ ابن مولانا مفتی کریم الدین ابن قاضی القضاۃ مولانا حمید الدین معروف بہ شیخ محمد ابن مولانا شیخ معروف ابن مولانا شیخ مودود ابن مولانا عبد الشکور ابن مولانا شیخ محمد راجی ابن مولانا قاضی القضاۃ سعد الدین ابن مولانا قاضی القضاۃ شمس الحق ملقب بہ قاضی رکن الدین ابن قاضی القضاۃ مولانا شیخ وانیل قطری ابن مولانا حاجی شہید ابن مولانا ابراہیم ابن مولانا محمد اسحاق ابن مولانا عبد الکریم ابن مولانا محمد شریف ابن مولانا نور اللہ ابن مولانا عبد الحق ابن مولانا محمد فردوس ابن مولانا انیس محمد ابن مولانا محمد رفیع ابن مولانا عبد الکریم ابن مولانا عبد الرحیم ابن مولانا عبد الرحمن ابن مولانا سیدنا ابوسعید حضرت آبان ابن سیدنا مولانا امیر المؤمنین کامل الحیاء والایمان جامع القرآن حضرت ذوالنورین عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہم ورحمۃ اللہ علیہم۔

حضرت شیخ صاحب اور سیدنا عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے درمیان ۳۶ رواطے ہیں۔

ولادت: شیخ محترم کی ولادت ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ/۶ مئی ۱۹۷۵ء کو مولوی محلہ بدایوں میں ہوئی۔

ہمارے ”مولوی بھائی“ اور ہمارے ”شیخ صاحب“ ممتاز باقد و محقق، عالم ربانی مولانا شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی کی حیات و خدمات بہت وسیع موضوع ہے۔ چند صفحات میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ شیخ صاحب کی سادہ زندگی میں قدرت نے اتنے رنگ بھرے ہوں گے یہ سوچا بھی نہیں تھا، بظاہر سادہ لباس اور سفید ٹوپی لگانے والا یہ نوجوان اپنی زینت کے خاکے میں اتنے رنگ رکھتا تھا، یہ اب سمجھ میں آیا، جب ہم ان کے سوانحی خاکے کو ترتیب دے رہے ہیں۔

شیخ صاحب کی پوری زندگی علم و تحقیق، فکر و قلم، مطالعہ اور درس و تدریس سے عبارت تھی۔ جس شوق و جذبے سے انھوں نے علم حاصل کیا اسی انداز سے مستند درس و تدریس کو زینت بخشی اور علم و قلم کے گوہر آب دار لائے اور صرف ۱۰ سال کی عمر میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ آج زمانہ ان کی رفعتوں اور کارناموں کے اعتراف میں رطب اللسان ہے۔ علم و فن کی وہ کون سی شاخ ہے اور میدان فکر و تحقیق کا وہ کون سا گوشہ ہے جس میں انھوں نے اپنی جولانیت اور لیاقت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کم عمری میں انھوں نے جو علمی نقوش چھوڑے ہیں، وہ ربیعی دنیا تک یاد کیے جاتے رہیں گے اور دنیا سے ان کی اتنی جلد رخصتی پر اہل علم و عرفان کے درمیان ماتم ہوتا رہے گا۔

ذیل میں ان کی پوری حیات و خدمات کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا، جس سے ان کی ذاتی شخصیت سے متعارف ہونے میں مدد ملے گی اور مستقبل میں ان کی ذات یا خدمات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ طور بنسائی کا ذریعہ بنیں گی۔

نام: شیخ صاحب کا پورا نام اسید الحق محمد عاصم القادری ہے۔ والد ماجد انھیں پیار سے ”بھیا“ اور بابا کہا کرتے تھے، گھر کے چھوٹے ”مولوی بھائی“ اور ارادت مند، متوسلین و متعلقین ”شیخ صاحب“۔ مؤخر الذکر عرفیت کو کافی شہرت ملی۔

کا نام ہے۔ ہر زبان میں محاورات کی ایک دین ہوتی ہے جو موقع محل سے بات چیت یا عبارت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ مولانا موصوف نے عربی زبان کو اہل زبان کی طرح اس کی روح میں ڈوب کر اپنی دسترس میں کر لیا ہے۔ عربی محاورات کو اردو والوں سے روشناس کرانا اس قدرت تامہ کا مظہر ہے۔ انہوں نے عربی ادب کے بحر ناپیدا کنار میں غواہی کر کے جوڈ رہائے آبدار نکالے ہیں ان کی آب و تاب میں بہر دور کی آنے کا اندیشہ نہیں۔ عربی مدارس اور عصری دانش گاہوں کے طلبہ و طلبات اس گراں مایہ سرمایہ محاورات سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔

(مکتوب نام: مولانا شیخ اسید الحق قادری، ۱۴ دسمبر ۲۰۰۸ء)

مولانا اسید الحق قادری اسلامیات کے ممتاز اسکالر، اردو زبان و ادب کے ادانش اس اور جدید تنقید و تحقیق کے مزاج اور مست درفتار سے واقف قلم کار کی حیثیت سے ہندوپاک کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ ان کی تحریروں میں گہرائی، تازگی اور تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے عام قارئین کے علاوہ خاصان علم و ادب بھی ان کے ہر جیسے کو چبا چبا کر پڑھتے ہیں اور محفوظ و مستفید ہوتے ہیں۔

□□□

مولانا اسید الحق جامعہ ازہر کے ایک ممتاز فاضل

ڈاکٹر کلید احمدی

کریم الدین پور، گھوسی، ضلع منو (یو پی)

مولانا اسید الحق صاحب جامعہ ازہر کے ممتاز فاضل ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مزاج رکھتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر بے حد شستہ و سنگتہ ہوتا ہے۔ اپنی تحریروں کو پیچیدہ اور گججک نہیں ہونے دیتے۔ تنقیدی اسلوب بھی تلخی و جارحیت سے پاک، خوشگوار، سنجیدہ اور متوازن ہوتا ہے، کہیں کہیں طنز و مزاح کی کیفیت ہوتی ہے، لیکن انتہائی لطیف اور نازک۔ مولانا نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو محسوس کیا اور علمی و فنی حیثیت سے موضوع احادیث پر کلام کیا۔ بیان حدیث میں بے احتیاطی و بے راہ روی اور تساہل پسندی کے سد پاب کی کوشش کی اور ذہن و فکر کے جمود و تعطل کو ختم کرنے کی ترغیب دی۔ امید کہ مقررین و واعظین احتیاط سے کام لیں گے اور بلا تحقیق روایتوں کے بیان کرنے سے گریز کریں گے۔

(ماہنامہ جام نور دہلی، شمارہ نمبر ۲۰۱۰ء)

□□□

مولانا اسید الحق اپنے اسلاف پر فخر نہیں کرتے، اسلاف کا کام کرتے ہیں

ڈاکٹر سید سراج الحق

استاذ شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

لائق اخلاف اپنے اسلاف کے کارناموں پر صرف فخر نہیں کرتے بلکہ انہیں روشناس خلق کرانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں، قابل مبارکباد ہیں عزیز گرامی قدر اسید میاں صاحب کہ انہوں نے اس نیک کام کا بیڑا اٹھایا اور علوم عقلی و نقلی، ادب و شاعری اور مسائل فقہی سے متعلق اپنے خانوادے کے بزرگوں کی تحریروں کی شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ (مقدمہ خیاضہ حیات: ج ۸، تاج الحول اکیڈمی بدایوں، ۲۰۰۹ء)

□□□

تعلیم: شیخ صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ بہت علمی اور روحانی ماحول تھا۔ خانوادہ گیلانیہ بدایوں کی آٹھ سو سالہ تاریخ اپنے علمی اور روحانی ماحول کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ خاندانی روایت کے اعتبار سے چار سال کی عمر میں ۱۱ ریشوال ۱۳۹۹ھ بموقع عرس قادری شیخ صاحب کی تسمیہ خوانی ہوئی اور حضرت اقدس کی سرپرستی میں شیخ صاحب کے تایا حضرت مولانا عبدالبہادی قادری قدس سرہ نے آپ کو قاعدہ بغدادی کا باضابطہ پہلا سبق دیا۔ یہاں باضابطہ لکھنا اس لیے ضروری ہے کہ تسمیہ خوانی سے پہلے والدین نے آپ کو سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص، کلمہ طیبہ، درود شریف یاد کروادیے تھے اور خانوادہ قادریہ بدایوں شریف کے بچوں کو ان مذکورہ چیزوں کے علاوہ دو نام بہت تاکید سے یاد کرائے جاتے ہیں: (۱) قطب ربانی محبوب سبحانی غوث اعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ، (۲) غوثِ زمان، شمس مارہرہ، قبلہ جسم و جاں، فخر خاندان برکاتیہ ابوالفضل آل احمد حضور اچھے میاں صاحب رضی اللہ عنہ۔

ابتدائی تعلیم: گھر کی تعلیم کے علاوہ شیخ صاحب نے جامع مسجد شمس بدایوں کے قریب واقع ”قادری جنت نشاں اسکول“ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ”مشان انگش اسکول“ بدایوں میں زیر تعلیم رہے۔ **حفظ قرآن:** شیخ صاحب نے شوال ۱۹۸۶ء میں ”مدرسہ عالیہ قادریہ“ میں حفظ قرآن کی ابتدا کی۔ مدرسہ قادریہ میں اس وقت شعبہ حفظ و قراءت کے استاذ حضرت قاری کریم اللہ موجود تھے۔ ۱۹۸۹ء میں آپ نے حفظ قرآن مکمل کیا۔ دورانِ حفظ قرآن آپ نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ آپ کو اردو مدرسہ قادریہ کے ایک استاذ مولانا حافظ نور محمد صاحب قبلہ عبد الرحیم نے پڑھائی۔

درس نظامی کی ابتدا: شیخ صاحب نے حفظ قرآن سے فراغت کے بعد شوال ۱۹۹۰ء میں مدرسہ عالیہ قادریہ میں درس نظامی کی ابتدا کی۔ اس وقت مدرسہ قادریہ میں ہندوستان کے ممتاز اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، جن میں امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین رضوی، مولانا شیخ رحمت اللہ قادری، مفتی مطیع الرحمن مظفر پورٹوی، مولانا نیاز احمد قادری، مولانا مفتی شہید عالم رضوی اور مفتی انفاس الحسن چشتی شامل ہیں۔ ۱۹۹۳ء تک آپ مدرسہ قادریہ بدایوں میں تعلیم حاصل کرتے

رہے۔ حضرت خواجہ صاحب کے متعلق یہ بات بہت مشہور تھی کہ وہ کسی مدرسے میں زیادہ نہیں رکتے اور یہ بات صحیح بھی تھی۔ چنانچہ ۶ برس مدرسہ قادریہ میں پڑھانے کے بعد (جو اس وقت تک خواجہ صاحب کی کسی مدرسے میں قیام کی سب سے طویل مدت تھی) آپ بدایوں سے فیض آباد شریف لے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں شیخ صاحب کو آپ کے والد ماجد نے امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین رضوی کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لیے فیض آباد بھیج دیا۔

۱۹۹۷ء میں درس نظامی آپ نے مکمل کیا اور بدایوں تشریف لے آئے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں جشن صد سالہ اعلیٰ حضرت تاج الخلج کے موقع پر صاحب سجادہ بغداد شریف حضرت پیر سید احمد خضر گیلانی (متوفی وسجادہ درگاہ غوث اعظم بغداد شریف) کے مبارک ہاتھوں سے شیخ صاحب کو دستار فضیلت سے نوازا گیا۔

اہل تعلیم: یکم ستمبر ۱۹۹۹ء بروز بدھ شیخ صاحب بدایوں سے روانہ ہوئے اور بغداد معلیٰ حاضری دیتے ہوئے قاہرہ تشریف لے گئے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ شیخ صاحب کے والد ماجد آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بغداد شریف بھیجنا چاہتے تھے۔ جب ۱۹۹۶ء میں بغداد شریف حاضر ہوئے تو وہاں اس وقت غوث اعظم کی درگاہ کے صاحب سجادہ پیر سید یوسف الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ میں اسید الحق کو بغداد بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس پر پیر سید یوسف الگیلانی نے فرمایا کہ اسید الحق کو جو معززہ قاہرہ بھیجو۔ آپ کے حکم پر شیخ صاحب جو معززہ قاہرہ تشریف لے گئے۔

جامعہ ازہر میں کلیہ اصول الدین کے شعبہ تفسیر و علوم قرآن میں داخلہ لیا اور جون ۲۰۰۳ء میں فراغت حاصل کی۔ شیخ صاحب نے ”کلیہ اصول الدین“ سے فراغت کے بعد اگست ۲۰۰۳ء تا جولائی ۲۰۰۴ء دارالافتاء المصریہ میں تربیت افتا کا کورس کیا۔ مصر سے واپسی کے بعد ۲۰۰۸ء تا ۲۰۰۹ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے علوم اسلامیہ میں ایم۔ اے کیا۔

اساتذہ: شیخ صاحب کے سب سے پہلے اور سب سے اہم استاذ آپ کے والد گرامی صاحب سجادہ خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف ہیں، جن کی تعلیم و تربیت نے شیخ صاحب کو ایک عالم سے ”عالم ربانی“

بنادیا۔ شیخ صاحب نے اخلاق و کردار، تواضع و انکساری، صبر و شکر، توکل و قناعت، غنودہ گزر اور تصوف و سلوک کے تمام درس اپنے والد گرامی شیخ طریقت، مربی و رہنما حضرت اقدس الشیخ عبد الحمید محمد سالم القادری (سجادہ نشین خانقاہ قادریہ بدایوں شریف) سے حاصل کیے۔ اس کے بعد شیخ صاحب کے قابل ذکر اساتذہ میں امام علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی (متوفی ۲۰۱۳ء)، حضرت مولانا رحمت اللہ قادری (شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ مدینہ العلوم، بھدوینی)، حضرت علامہ مفتی محمد مطیع الرحمن مظفر پورٹوی، حضرت مفتی انفاس الحسن چشتی (شیخ الحدیث جامعہ مدینہ پھوسند شریف)، حافظ نور محمد قادری (متوفی ۲۰۱۳ء سابق مدرس مدرسہ قادریہ)، حافظ وقاری کریم اللہ قادری (متوفی ۲۰۰۸ء)، پروفیسر علامہ عبدالحی فرماوی، پروفیسر علامہ جمہ عبد القادر، پروفیسر علامہ محمود عبد القالیق حلوی، پروفیسر علامہ سعید محمد صالح صوابی، پروفیسر علامہ سید المسیر، پروفیسر علامہ طحیثی، پروفیسر علامہ عبدالمطیٰ بیوی کے اسما شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تربیت افتا کا ایک سال کورس آپ نے مصری دار الافتا میں سابق مفتی اعظم مصر ڈاکٹر شیخ علی جمہ کی خدمت میں مکمل کیا۔

شادی خانہ بادی: ابھی شیخ صاحب مصر میں موجود تھے کہ بدایوں سے آپ کے والد ماجد کا فون پہنچا کہ ہم نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ ۱۵ اگست ۲۰۰۴ء بروز اتوار سہوانی ٹولہ بریلی کے ایک سید گھرانے میں سیدہ سائرہ قادری بنت سید محمد نصیر مرحوم سے آپ کا عقد مسنون ہوا۔ شادی کی تقریب میں بہت سے علما و مشائخ شریک رہے۔ بالخصوص آپ کے استاذ محترم امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین رضوی اور آپ کے دوست و احباب بالخصوص مولانا خوشتر نورانی، مولانا منظر الاسلام ازہری اور مولانا نعمان ازہری وغیرہ نے شرکت فرمائی۔

پہلا سفر حج: حضرت اقدس والد محترم کے ہمراہ پہلی مرتبہ منی ۱۹۹۴ء/۱۴۱۴ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔

دوسرا سفر حج: نومبر ۲۰۰۸ء/۱۴۲۹ھ اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج و زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ اس سفر میں آپ کے ساتھ ہمبہی سے جناب اشتیاق بیٹی ابن جناب اسحاق بیٹی بھی تھے۔

پہلا سفر عمرہ: جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ/ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں حضرت اقدس والد محترم کے ہمراہ پہلی بار عمرے کی سعادت حاصل کی۔

دوسرا عمرہ: صفر ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء میں حضرت اقدس والد محترم کے ہمراہ دوسری مرتبہ عمرے کی سعادت حاصل کی۔ اس سفر میں آپ کے ساتھ ہمبہی سے حاجی اقبال اور دیگر احباب سلسلہ موجود تھے۔

تیسرا عمرہ: مئی ۲۰۱۲ء/ جمادی الآخر ۱۴۳۳ھ میں تیسری مرتبہ عمرے کی سعادت حاصل کی۔ اس سفر میں آپ کی اہلیہ آپ کے ساتھ تھیں۔

سفر بغداد معلیٰ: بغداد معلیٰ کی حاضری خانوادہ قادریہ بدایوں کے قدیم معمولات میں شامل ہے۔ اس خانوادے کی بارگاہ غوث اعظم میں حاضری اور مقبولیت ایسا امتیاز ہے جو کسی دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ خانوادہ قادریہ بدایوں شریف اور خانوادہ گیلانیہ بغداد شریف کے مراسم بہت گہرے اور پرانے ہیں۔ پونے دو سو برسوں سے خانوادہ عثمانیہ کی بغداد معلیٰ کی مسلسل حاضری اور اس طویل عرصے میں خانوادہ گیلانیہ کے متعدد فرزندانوں اور سجادگان کا خانقاہ قادریہ میں درود مسعود، ان کے درمیان گہرے روابط کی کھلی دلیل ہے۔ اسی سلسلہ محبت اور غوث اعظم سے نسبت غلامی کے اظہار کے لیے شیخ صاحب نے اپنے اسلاف کی طرح متعدد بار بغداد حاضری دی۔

شیخ صاحب پہلی مرتبہ ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۲ء میں حاضر ہوئے۔ دوسری مرتبہ ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء میں، تیسری حاضری ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء میں، چوتھی حاضری ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء میں اور پانچویں اور آخری حاضری ۱۴۳۵ھ/ ۲۰۱۴ء میں ہوئی۔ یہ تمام سفر بغداد حضرت اقدس والد گرامی کے ہمراہ ہوئے۔ آخری سفر بغداد جس میں حضرت شیخ صاحب جام شہادت سے سرفراز ہوئے اور ہم ان کی رفاقت سے محروم ہوئے، راتھ السطور بھی آپ کا ہم سفر تھا۔

بیعت و اجازت: اہل طریقت پر یہ حقیقت واضح ہے کہ بزرگوں سے اکتساب فیض کے لیے کسی شیخ کامل کے دست حق پرست پر بیعت کرنا کتنا ضروری ہے۔ شیخ صاحب کا خانوادہ صدیوں سے مئے کشان شراب معرفت کو جام آل احمدی اور صہبائے قادریت پلا رہا ہے۔ شیخ صاحب کی فکری جب اپنے کمال کو پہنچی تو اپنے والد گرامی شیخ طریقت الشاہ عبد الحمید محمد سالم القادری سجادہ نشین خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف سے ۱۳ نومبر بروز جمعرات ۲۰۰۸ء کو سلسلہ قادریہ میں بیعت ہو گئے۔ پیر و مرشد نے آپ کو تمام سلسلوں کی اجازت و خلافت سے

سرفراز فرمایا اور اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس کے علاوہ آپ کو وارثِ پنجتن سیدنا شاہ سید یحییٰ حسن مارہروی (متوفی: ۲۰۱۱ء، سجادہ نشین آستانہ عالیہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ شریف) سے بھی خلافت و اجازت کا شرف حاصل تھا۔

اجازتِ حدیث: شیخ صاحب کو متعدد مشائخ سے روایتِ حدیث کی اجازت حاصل تھی۔ ان شیوخ کے اسماء ہیں:

- (۱) والد محترم تاجدار اہل سنت حضرت الشیخ عبدالحمید محمد سالم القدوری (صاحب سجادہ آستانہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف)
- (۲) ذاکر علی جمہ (سابق مفتی جمہوریہ مصر)
- (۳) شیخ القراء، نجم الفقہ الشیخ محمد صلاح الدین التجانی (مصر)
- (۴) الشیخ محمد ابراہیم عبدالباہع (محدث اسکندریہ مصر)
- (۵) الشیخ علی بن حمود الحری الرفاعی (خطیب و امام آستانہ حضرت معروف کرنی و استاذ بغداد یونیورسٹی)
- (۶) شیخ محمد ابراہیم الحسنی الکنتانی (مصر)

مدرسہ عالیہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ: مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف کی تباہیوں تو صدیوں پر پھری ہوئی ہے اور فرزندِ ان مدرسہ عالیہ قادریہ کی خدمات اپنی مادر علمی کے وقار اور عظمت و شوکت کی گواہ ہیں۔ لیکن شیخ صاحب جب قاہرہ سے واپس آئے اور اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تو انہوں نے اپنی دیگر اصلاحی اور تعمیری کاموں کے ساتھ مدرسہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ آپ نے از سر نو مدرسے کا خاکہ بنایا، اصول وضع کیے، نصاب و نظام بنایا اور مدرسہ قادریہ کا آغاز فرمایا۔

شیخ صاحب نے اپنے احباب سلسلہ سے کہا: مجھے چندہ نہیں چاہیے، تم اپنے بیٹے کو میرے پاس پڑھنے کے لیے بھیجو۔ اس طرح بالکل ابتدا سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ شیخ صاحب شروع میں فرماتے تھے کہ ابھی مدرسہ نہیں کھلا ہے، مدرسہ تو ۸ سال کے بعد کھلے گا، ابھی تو میں اپنی ”نیم“ تیار کر رہا ہوں۔ جب یہ طلبہ فارغ ہوں گے تب باقاعدہ مدرسے کا آغاز کیا جائے گا۔ یہی وجہ رہی کہ مدرسے میں داخلے کا اعلان عام نہیں کیا گیا۔ شیخ صاحب صرف جماعت اعدادیہ اولیٰ ہی میں داخلہ لیا کرتے تھے۔ اس طرح ہر سال ایک جماعت کا اضافہ ہوتا گیا۔ یعنی جب شیخ صاحب نے درس دینا شروع کیا تو صرف جماعت اعدادیہ ہی تھی۔ اگلے سال جب یہی طلبہ جماعت اولیٰ میں آگئے تو پھر جماعت اعدادیہ میں

نئے داخلے لیے گئے اور پھر اگلے سال اولیٰ والے طلبہ ثانیہ میں اور اعدادیہ والے اولیٰ میں آگئے۔ پھر جماعت اعدادیہ میں نئے داخلے لیے گئے۔ اس طرح پہلا ”بچ“ ۲۰۱۱ء میں فارغ ہوا۔ شیخ صاحب کے ساتھ مولانا انور سہیل قادری، مولانا نبی رضا قادری، مولانا دلشاد احمد قادری، مولانا مجاہد قادری اور مولانا اقبال قادری اور ۲۰۰۸ء سے راقم الحروف نے تدریسی خدمات انجام دیں۔

شیخ صاحب نے مدرسہ قادریہ کے تعلیمی نصاب میں کچھ تبدیلیاں بھی فرمائی تھیں، مثلاً جماعت ثانیہ میں تاج النحل کا رسالہ احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام پڑھانا شروع کیا اور بعد میں یہ خدمت راقم الحروف کے حصے میں آئی اور جماعت ثالثہ کو مدخل الی اصول الحدیث اور جماعت رابعہ کو تفسیر آیات احکام پڑھانا شروع کی اور اسی طرح بہت سی مثالیں ہیں۔

تدریسی خدمات: استاذ محترم امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین رضوی فرماتے تھے کہ ”سمجھنا آسان ہے سمجھنا مشکل اور دونوں کی صلاحیتیں جدا ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ اگر کوئی شخص بہت قابل اور وسیع المطالعہ ہے تو وہ تدریسی خدمات بھی انجام دے اور آخر میں مسکرا کر فرماتے کہ پڑھنا تو سیکھا جاسکتا ہے مگر پڑھانا نہیں سیکھا جاسکتا، یہ تو خدا داد صلاحیت ہوتی ہے۔“

یہی خدا داد صلاحیت شیخ صاحب کے درس میں دکھائی دیتی تھی۔ آپ نے مصر جانے سے پہلے بھی مدرسہ قادریہ میں درس و تدریس کو زینت بخشی تھی۔ جنوری ۱۹۹۹ء سے اگست ۱۹۹۹ء تک آٹھ ماہ درس دیا اور مصر سے آنے کے بعد ۳ دسمبر ۲۰۰۴ء سے ۲۰ فروری ۲۰۱۳ء تک مسلسل درس دیا، جن کتابوں کا درس شیخ صاحب دیا کرتے تھے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

- (۱) صورتِ حیات الصواب، (۲) وحی القلم، (۳) العبرات، (۴) امتنا بنِ قرین، (۵) شرح عقائد، (۶) مرقات، (۷) شرح تہذیب، (۸) اصول التفسیر و مناہج، (۹) الدخیل فی التفسیر، (۱۰) مدخل الی اصول التفسیر، مرتبہ شیخ صاحب (۱۱) تفسیر آیات الاحکام، (۱۲) مؤطا امام محمد، (۱۳) اصول الحدیث، (۱۴) صحیح بخاری، (۱۵) صحیح مسلم، (۱۶) جامع ترمذی، (۱۷) الرفع و التحکیم، (۱۸) تیسیر علوم

الحدیث، (۱۹) الملای الحسنان فی علوم القرآن، (۲۰) قصیدتان راکعتان، (۲۱) قصیدہ بابت سعاد، (۲۲) قصیدہ بردہ، (۲۳) المستند الممتد، (۲۴) مشکوٰۃ شریف، (۲۵) تفسیر بیضاوی، (۲۶) مراح الارواح، (۲۷) شرح مآۃ عامل، (۲۸) نخبہ الفکر۔

علامہ: شیخ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ”میں اپنے مدرسے کے لیے اپنی نیم تیار کر رہا ہوں“ انھوں نے یہ نیم تیار بھی کر دی۔ آپ سے بہت سے طلبہ نے استفادہ کیا، مگر آپ کے چند خصوص تلاذہ کے نام ہم یہاں تحریر کر رہے ہیں جو آپ کی تیار کردہ نیم کا حصہ ہیں:

- (۱) برادر عزیز مولانا فضل رسول محمد عزام میاں قادری (مہتمم مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف)
- (۲) مولانا سید عادل محمود کلیمی (سجادہ نشین خانقاہ کلیمیہ، کٹرہ، شاہجہان پور)
- (۳) مولانا مفتی دلشاد احمد قادری (مدرس مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف)
- (۴) مولانا مجاہد قادری (مدرس مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف)
- (۵) مولانا خالد قادری مجیدی (مدرس مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف)
- (۶) مولانا محمد عاصم قادری مجیدی (مدرس مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف)
- (۷) مولانا بشیر قادری مجیدی (مولانا محمد رضوان قادری مجیدی)
- (۸) مولانا محمد بدر عالم قادری مجیدی (مولانا انور قادری مجیدی)
- (۹) مولانا کاشف نبہا قادری مجیدی (مولانا عبدالعلیم قادری مجیدی)
- (۱۰) راقم الحروف

طی خدمات: درس و تدریس (اگر باقاعدہ ہو تو) اپنے آپ میں آقا بڑا کام ہے کہ اس کے بعد کوئی دوسرا کام کرنا بہت مشکل ہے۔ ہماری اس بات کو وہ اساتذہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جو کسی ادارے سے تدریسی

طور پر وابستہ ہیں۔ لیکن شیخ صاحب کی زندگی دیکھیے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایک مکمل مدرس، باضابطہ منتظم اور ایک خطیب و واعظ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ علمی و تحقیقی کام سے بھی جڑے رہے۔ ہندوپاک کے معیاری رسائل میں آپ کے علمی اور تحقیقی مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے۔ ان رسائل میں ماہ نامہ جام نور سر فہرست ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ مولانا خوشتر نورانی صاحب نے ہی اپنی دوستی کے حق کو استعمال کرتے ہوئے شیخ صاحب کو رسائل کے لیے مضامین لکھنے پر راضی کیا تو غلط نہ ہوگا۔ اسی پر بس نہیں مدیر اعلیٰ مولانا خوشتر نورانی نے جام نور میں ایک منفرد کالم ”خامہ تلاشی“ کے عنوان سے جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ خامہ تلاشی کے لیے ”خامہ تلاشی“ کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے مدیر اعلیٰ کی نظر انتخاب حضرت شیخ صاحب پر ہی جا کر رکی۔ مولانا خوشتر نورانی فرماتے ہیں:

”میں نے سوچا، مذہبی ادب میں نقد و نظر تلوار کی دھار پر چلنے کا فن ہے، اس کے لیے بصیرت، ظرافت، اور گہری نظر کے ساتھ جملہ علوم متداولہ اور زبان و بیان پر درک ہونا چاہیے اور اس دورِ قحط الرجال میں بظاہر ایسی صفوں پر مشتمل شخصیت کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس تعلق سے میں نے بہت غور و فکر کیا، لیکن حیرت ہے کہ جب جب غور کرتا تو گھوم پھر کر ایک ہی شخص ذہن کی اسکرین پر جم جاتا، وہ شخص کوئی اور نہیں اسید الحق تھے۔“ (خامہ تلاشی ص ۸/۹)

خامہ تلاشی کا آغاز اپریل ۲۰۰۵ء کے شمارے سے ہوا اور یہ سلسلہ دسمبر ۲۰۰۶ء تک جاری رہا۔ ہمیں یاد ہے کہ استاذ محترم امام علم وفن فرماتے تھے کہ ”خامہ تلاشی کسی ایک انسان کی کاوش نہیں بلکہ اس کالم کو پوری نیم مل کر تحریر کرتی ہے اور اس نیم میں کوئی علم حدیث کا ماہر ہے تو کوئی علم تفسیر کا، کوئی تاریخ کا اور کوئی شعر و ادب کا۔“ اسی طرح کئی فہرست گنوانے کے بعد فرماتے کہ ”خوشتر نے بڑی محنت سے یہ نیم بنائی ہے۔“ مگر حقیقت یہ تھی کہ مدرسہ قادریہ کی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان صرف ایک دن میں اور کبھی کبھی ایک نشست میں خامہ تلاشی لکھ دیا کرتا تھا۔

ایں سعادت بزرگوار و نیست

دسمبر ۲۰۰۹ء میں خامہ تلاشی کی تمام قسطوں کو ایک کتابی شکل دے دی گئی، جو ادارہ فکر اسلامی دہلی سے شائع ہوئی۔ خامہ تلاشی کے بعد جام نور کے شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء میں ایک نیا کالم شروع کیا گیا جو ”عقاب“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ مصروفیت کی وجہ سے یہ کالم فروری ۲۰۰۷ء تک ہی جاری رہا۔ اس کالم میں ہندوستان بھر میں شائع ہونے والے تمام رسائل پر نظر کی جاتی اور حسن و قبح کو سامنے لایا جاتا۔ شیخ صاحب چونکہ اکابر بدایوں کی تصنیفات کو از سر نو شائع کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے فرصت نہیں ملی اور یہ کالم بند کرنا پڑا۔ اب تو یہ جام نور کے مدیر اعلیٰ خوشنورانی صاحب ہی بتائیں گے کہ شیخ صاحب کی معذرت کرنے کے بعد یا تو اس کالم کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی یا کوئی اور لکھنے والا نہیں ملا؟ شیخ صاحب کے تحقیقی مضامین ان کی علمی خدمات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں اس لیے صرف چند مضامین کا ذکر کر رہا ہوں:

(۱) عربی، اردو محاورات کا تقابلی جائزہ: جام نور جولائی ۲۰۰۴ء
(۲) مصنف ابن ابی شیبہ اور فقہ حنفی: جام نور ستمبر ۲۰۰۴ء
(۳) ہم نامی کا مغالطہ: جام نور اگست ۲۰۰۴ء
(۴) عصر حاضر میں مطالعہ سیرت کی معنویت، اہمیت اور جہت
(۵) نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی آخری آیت: جام نور اکتوبر ۲۰۰۵ء

(۶) متن حدیث کی بازیافت: جام نور نومبر ۲۰۰۵ء
(۷) حدیث عمامہ پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ: جام نور دسمبر ۲۰۰۶ء
(۸) ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام: جام نور اپریل ۲۰۰۶ء
(۹) فقہ حنفی اور عمل بالحدیث: جام نور اپریل ۲۰۰۷ء
(۱۰) کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ صاحب نظر کی تحقیق پر صاحب دل کی تنقید: جام نور جون، جولائی ۲۰۰۷ء
(۱۱) تحفظ توحید کے نام پر کتب اسلاف میں تحریف: جام نور دسمبر ۲۰۰۷ء

(۱۲) کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون، ایک تحقیقی مطالعہ: جام نور جون ۲۰۰۸ء
(۱۳) مطبع اہل سنت و جماعت، تاریخی پس منظر اور اشاعتی مات: جام نور مئی ۲۰۰۹ء

(۱۴) تشہد کے مسئلے میں ایک مغالطے کا تحقیقی جائزہ: جام نور مارچ ۲۰۰۹ء
(۱۵) شمس مارہرہ اور رسالہ آداب السالکین: جام نور جون ۲۰۱۰ء
(۱۶) تقریروں میں موضوع روایات ایک نگہ فکریہ: جام نور اکتوبر، نومبر ۲۰۱۰ء
(۱۷) فضل حق، فضل رسول اور آزرہ: جام نور دسمبر ۲۰۱۰ء
(۱۸) امام زین العابدین کی شان میں فرزدق حبیبی کا قصیدہ مسمیہ: جام نور اگست ۲۰۱۲ء
(۱۹) خانوادہ قادریہ اور خانوادہ علمیہ کے روابط: جام نور اکتوبر، نومبر ۲۰۱۲ء
(۲۰) قصیدہ بانس سعاد تحقیقی مطالعے کی روشنی میں: جام نور فروری ۲۰۱۳ء
(۲۱) ڈاکٹر رشید عبیدی کی شرح ایک تنقیدی مطالعہ: جام نور نومبر، دسمبر ۲۰۱۳ء

اس کے علاوہ درجنوں علمی اور تحقیقی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ شیخ صاحب نے اکابر کی کتابوں کو جدید انداز میں ترجمہ، تخریج، تسہیل، حاشیہ اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ شیخ صاحب کی ان علمی خدمات کو اہل علم بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بغیر کسی تبصرے کے ہم یہاں ان کتابوں کی فہرست پیش کر رہے ہیں:

ترجمہ تخریج، تحقیق (عربی سے):
(۱) مناقبہ فی تحقیق مسائل المصالح: تاج النجول مولانا عبد القادر بدایونی (مطبوعہ محرم ۱۴۱۹ھ/ جنوری ۲۰۰۸ء)
(۲) الکلام السدید فی تحریر الاسانید: تاج النجول مولانا عبد القادر بدایونی (نومبر ۲۰۰۸ء)
ترجمہ تخریج، تحقیق (فارسی سے):
(۳) احقاق حق: سیف اللہ المسلمول مولانا فضل رسول بدایونی (مطبوعہ جنوری ۲۰۰۷ء)
(۴) اکمال فی بحث شد الرحال (جدید نام زیارت روضہ رسول): سیف اللہ المسلمول مولانا فضل رسول بدایونی (مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۹ء)
(۵) حرز معظم: سیف اللہ المسلمول مولانا فضل رسول بدایونی

(مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۹ء)
(۶) اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ: سیف اللہ المسلمول مولانا فضل رسول بدایونی (مطبوعہ شوال ۱۴۳۰ھ/ ستمبر ۲۰۰۹ء)
(۷) رد و دفع: تاج النجول مولانا عبد القادر بدایونی (مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۹ء)
ترتیب حضرت سید شاہ حسین حیدر برکاتی مارہروی
ترتیب و تقدیم:
(۸) خطبات صدارت: مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی (مطبوعہ اکتوبر ۲۰۰۸ء)
(۹) مشکوٰۃ غوثیہ: مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی (مطبوعہ نومبر ۲۰۰۸ء)
(۱۰) مولانا فیض احمد بدایونی: پروفیسر محمد ایوب قادری (مطبوعہ دسمبر ۲۰۰۸ء)
(۱۱) ملت اسلامیہ کا ماضی، حال، مستقبل: مولانا حکیم عبدالقیوم شہید قادری بدایونی (مطبوعہ نومبر ۲۰۰۸ء)
(۱۲) نگارشات محبت احمد: مولانا محبت احمد قادری بدایونی (مطبوعہ اگست ۲۰۱۰ء)
(۱۳) باقیات ہادی: مولانا عبد البہادی قادری بدایونی (مطبوعہ دسمبر ۲۰۰۹ء)
(۱۴) احوال و مقامات: مولانا عبد البہادی قادری بدایونی (مطبوعہ دسمبر ۲۰۰۹ء)
(۱۵) مولود منظوم، سیف اللہ المسلمول کے فارسی اور اردو نعتیہ و منقبیہ کلام کا انتخاب: (مطبوعہ دسمبر ۲۰۰۹ء)
تسہیل و تخریج:
(۱۶) لوز المومنین بشفاعۃ الشافعیین (عقیدہ شفاعت): سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی (مطبوعہ جنوری ۲۰۰۸ء)
(۱۷) طوابع الانوار (تذکرہ فضل رسول): مولانا انوار الحق عثمانی (مطبوعہ جنوری ۲۰۰۸ء)
(۱۸) فصل الخطاب: سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول

(مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۹ء)
ان کے علاوہ تقریباً ۵۰ کتابیں شیخ صاحب نے اپنے تلامذہ سے ترجمہ، تخریج و تسہیل کروا کے شائع کیں۔
شیخ صاحب کی علمی خدمات میں ایک بہت اہم اور تاریخی تحریر قصیدتان رائعتان (مطبوعہ تاج النجول اکیڈمی ۲۰۱۳ء) کا مقدمہ ہے۔ اس کو دیکھ کر ہر صاحب علم و نظر شیخ صاحب کی وسعت علمی، وقت نظر اور تحقیقی اسلوب کا قائل ہوگا۔

تسہیل خدمات: آپ نے ایک درجن سے زائد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں تصنیف فرمائیں اور آپ کا قلم ہر کتاب پر داد تحقیق دیتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ جس تیزی سے آپ کا قلم چل رہا تھا ایسا لگتا تھا کہ اگر شیخ صاحب دس سال اور رہ جاتے تو تقریباً ۵۰ علمی اور تحقیقی کتابوں کے معنی ہوتے۔ یاد رہے کہ شیخ صاحب اپنی کتابوں کے علاوہ اکابر خانوادہ قادریہ کی ۸۰ سے زائد کتابیں شائع کر چکے ہیں جن کی تسہیل، تخریج، ترجمہ، مقدمہ، حاشیہ، ترتیب شیخ صاحب کے قلم کی احسان مند ہے۔ شیخ صاحب کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ”ابھی تو میں اپنے اکابر کا قرض اتار رہا ہوں۔ ابھی میں نے لکھنا شروع نہیں کیا“ اس کے باوجود ان کی نوک خامہ سے درج ذیل کتابیں منصفہ شہود پر آ کر رباب علم و دانش سے داد تحسین و آفریں حاصل کر چکی ہیں۔

(۱) حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعے کی روشنی میں: (طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء/ طبع ثانی مئی ۲۰۰۹ء)
(۲) قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: (طبع اول جنوری ۲۰۰۸ء/ طبع ثانی مئی ۲۰۰۹ء)
(۳) احادیث قدسیہ: (طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء/ طبع ثانی مئی ۲۰۰۹ء)
(۴) قصیدہ فرزدق حبیبی ایک تحقیقی مطالعہ: (مطبوعہ اکتوبر ۲۰۱۳ء)
(۵) تذکرہ شمس مارہرہ: (مطبوعہ اکتوبر ۲۰۱۳ء)
(۶) خیر آبادیات: (مطبوعہ ۲۰۱۱ء)
(۷) عربی محاورات: (طبع اول ۲۰۱۱ء/ طبع ثانی ۲۰۱۲ء)
(۸) اسلام، جہاد اور وحشت گردی

- (۹) اسلام اور خدمت خلق
(۱۰) اسلام ایک تعارف: انگلش، اردو، مراٹھی
(۱۱) خامہ تلاتی
(۱۲) وارثین انبیاء: غیر مطبوعہ
(۱۳) افہام و تفہیم: غیر مطبوعہ

اشاعتی خدمات: حضرت اقدس صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف نے ۱۹۸۳ء میں خانقاہ قادریہ کا اشاعتی ادارہ ”مظہر حق“ قائم کیا۔ ۱۹۹۱ء میں اسی ادارے کا نام بدل کر ”تاج الخول اکیڈمی“ کر دیا گیا۔ اس وقت سے آج تک یہ ادارہ نشر و اشاعت کے ذریعے دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔

شیخ صاحب نے اس ادارے کے زیر اہتمام ایک ماہانہ رسالہ ”مظہر حق“ کے نام سے جاری کیا۔ یہ ماہنامہ ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۵ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ بہت ساری کتب اس ادارے سے شائع ہوتی رہیں جن میں یہ چند کتابیں قابل ذکر ہیں:

- (۱) محبت، برکت اور زیارت:
حضرت اقدس الشیخ عبدالحمید محمد سالم القادری بدایونی
(۲) آئینہ مقالات
مرتبہ ڈاکٹر شاداب ذکی بدایونی (مطبوعہ ۱۹۹۸ء)
(۳) اکابر بدایوں: مولانا احمد حسین قادری گنوری
(۴) تاج الخول حیات و خدمات: مفتی عبدالحمید نور مصباحی
(۵) دیوان تاج الخول: تاج الخول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی
(۶) معراج تخیل مجموعہ نعت و منقبت:
حضرت اقدس الشیخ عبدالحمید محمد سالم القادری بدایونی
(۷) اختلاف علی و معاویہ:

تاج الخول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
شیخ صاحب نے مصر سے واپس آنے کے بعد پہلی کتاب ”احقاق حق“ (تصنیف سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی) کو ترجمہ، تخریج، تحقیق کے ساتھ جنوری ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ پھر تو ایسا لگنے لگا کہ مدرسہ قادریہ میں کتابوں کی بارش ہونے لگی اور نومبر ۲۰۱۳ء تک ۱۰۷ کتابیں شائع ہو گئیں۔

کتب خانہ قادریہ کی نشاۃ الہیہ: خانوادہ عثمانیہ کی تاریخ ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو سال پرانی ہے اور اس خانوادے کو آج خانوادہ قادریہ بدایوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ غرض کہ جتنی پرانی تاریخ مدرسہ قادریہ کی ہے اتنی ہی کتب خانہ قادریہ کی۔ یہ کتب خانہ اپنے مخطوطات کی تعداد کے اعتبار سے بہت قیمتی ہے۔ قادری فقیروں کا یہ کتب خانہ مخطوطات کے اعتبار سے کسی نواب یا کسی بادشاہ کے کتب خانے سے کم نہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی قدس سرہ ریاست حیدرآباد میں مفتی اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے تو آپ کی غیر موجودگی میں کتب خانہ قادری کی دیکھ بھال نہ ہو سکی۔ ستوطا حیدر آباد کے بعد جب آپ بدایوں واپس تشریف لائے اور کتب خانے کی حالت دیکھی تو آپ کو بہت گہرا صدمہ پہنچا۔ نہ ہی فہرست کا پتہ تھا اور نہ ہی کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور نادر و نایاب کتابوں کا کافی ذخیرہ کتب خانے کی الماری سے نکل کر گردش ایام کے حوالے ہو گیا تھا۔ آپ کے وصال فرمانے کے بعد آپ کے جانشین و وارث حضرت الشیخ عبدالحمید محمد سالم القادری بدایونی مدظلہ العالی نے کتابوں کی فہرست مرتب کی جو آج بھی موجود ہے۔ تنہائی اور عظیم ذمہ داری نے اس سے زیادہ کی مہلت نہ دی۔

۱۹۹۵ء میں شیخ صاحب فیض آباد سے بدایوں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اسی دوران پہلی بار آپ نے ارادہ کیا کہ کتب خانے کی حالت کو سدھارا جائے۔ یہیں سے کتب خانے کی صفائی، سہرائی اور بوسیدہ کتابوں کی جلد سازی کا کام شروع ہوا۔ چھٹی ختم ہوئی اور شیخ صاحب کتابوں کی کسی حد تک مرہم پٹی کر کے واپس فیض آباد چلے گئے۔ ۲۰۰۳ء میں قاہرہ سے واپسی کے بعد کتب خانے کا کام پھر سے شروع ہوا۔ نئی کتابوں کے نمبر ترتیب دیے گئے اور جن پرانی کتابوں کی جلد خراب ہو گئی تھی ان کو دوبارہ جلد سازی کے لیے نکالا گیا۔ شیخ صاحب کتابوں کے معاملے میں بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اس لیے جلد ساز کو مدرسے میں بلا کر اپنے سامنے جلد سازی کراتے تھے۔ کتب خانے کا کام جنگی بیانیے پر ہو رہا تھا اور ہر معاملے میں حضرت اقدس کی سرپرستی اور توجہ حاصل تھی۔ اس لیے کسی کام میں دشواری نہیں آئی۔ ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں دن رات کی محنت نے کتب خانے کو پھر سے زندہ کر دیا۔

اب وہ وقت آ گیا تھا کہ کتب خانہ قادری بدایوں شریف اپنی تمام تر علمی وراثتوں کے ساتھ محققین کو دعوت مطالعہ دے۔ ۲۳ اکتوبر بروز بدھ ۲۰۰۷ء بعد مغرب حضرت اقدس کے دست حق پرست سے کتب خانہ قادری کا افتتاح ہوا۔

کتب خانے کی نشاۃ الہیہ میں شیخ صاحب کے رفقاءے کار:

- (۱) مولانا ارشد قادری (مرحوم)
(۲) جناب سید اکرام احمد رزاقی (اورنگ آباد، مہاراشٹر)
(۳) برادر عزیز مولانا فضل رسول محمد عزام قادری
(۴) مولانا شاد احمد قادری
(۵) مولانا خالد قادری مجیدی
(۶) مولانا عاصم اقبال قادری مجیدی
(۷) حافظ گلزار خاں قادری
(۸) حافظ تبیین قادری
(۹) جناب محمد تنویر خاں قادری
(۱۰) حافظ محمد عالم خاں قادری
(۱۱) مولانا اقبال قادری
(۱۲) محمد اشفاق حمیدی
(۱۳) جناب تنسیم حسن قادری
(۱۴) عفان حق قادری
(۱۵) انیس قادری (کارپینٹر)
(۱۶) لالو (جلد ساز)
(۱۷) راقم الحروف عطیف قادری

کتب خانہ مدرسہ شمس العلوم گھنڈہ گھر بدایوں کی نشاۃ الہیہ:

مجاہد آزادی مولانا عبدالماجد بدایونی (متوفی: ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء) کے عظیم کارناموں میں سے ایک مدرسہ شمس العلوم، گھنڈہ گھر، بدایوں کی عظیم الشان عمارت بھی ہے۔ واضح رہے کہ مدرسہ شمس العلوم مولانا عبدالماجد بدایونی کے والد مولانا حکیم شہید عبدالقیوم قادری (ف: ۱۳۱۸ھ) نے صفر ۱۳۱۷ھ میں حضرت تاج الخول کی اجازت سے جامع مسجد شمس بدایوں میں قائم کیا تھا۔ اس کے بعد مولانا عبدالماجد نے اپنے استاذ اور پیر و مرشد کی اجازت سے یہ عمارت تعمیر کرائی۔

اس عمارت میں مولانا بدایونی نے ۱۹۱۹ء میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں ہزاروں کتابیں موجود تھیں اور کتابوں کو رکھنے کا انتظام بہت سلیقے سے کیا گیا تھا، مگر وقت اور حالات بدلنے رہے اور کتب خانہ مدرسہ شمس العلوم بدایوں بھی تقریباً قصہ پارینہ ہو گیا۔

شیخ صاحب کتب خانہ قادریہ سے فارغ ہوئے تو آپ نے ارادہ کیا کہ مدرسہ شمس العلوم کے کتب خانے کی زیارت کر لی جائے۔ وہاں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ موجودہ حالت کے ساتھ اس کتب خانے کی صرف زیارت ہی ممکن ہے، وہ بھی دور سے۔ اسی وقت آپ نے فیصلہ کیا کہ اب اس کتب خانے کو بھی اپنے خلوص و محبت سے حصہ عطا کیا جائے۔ وہاں سے مدرسہ قادریہ بدایوں واپس آئے اور حضرت اقدس سے اجازت چاہی۔ چوں کہ یہ ادارہ بھی حضرت کی سرپرستی میں ہے، اجازت فوراً مل گئی اور اگلے ہی دن سے کتب خانہ مدرسہ شمس العلوم میں شیخ صاحب کی مسند سج گئی اور انہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ روز و شب ایک کر دیے۔ عمارت کی مرمت ہونے لگی، رنگ و روغن کا کام تیز ہوا، کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا فرنیچر بننے لگا اور شیخ صاحب کتابوں کی فہرست و نمبرات کو ترتیب دینے میں مصروف ہو گئے۔ بوسیدہ کتابوں کی جلد سازی ہوئی اور یہاں بھی شیخ صاحب کی نفاست پسندی اور سلیقہ مندی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کتب خانے سے بہت سی نادر کتابیں غائب ہیں۔

کتب خانے کی الماریوں کی مرمت ہوئی اور کتابوں کو اس میں خوب صورتی سے سجایا گیا۔ بہت سی کتابیں شیخ صاحب نے اپنے پاس سے اس کتب خانے کو نذر کیں اور انگریزی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ جناب فرخ فیض قادری نے ابوظہبی سے بھیجا جس کو ان کے دادا ”مولوی فضل حق“ کے نام سے سیکشن بنا کر اس میں رکھا گیا اور بہت سی کتابیں عارف پرویز قادری بدایونی (جو حضرت اقدس سے نسبت ارادت بھی رکھتے ہیں اور شاعر بھی ہیں) نے پیش کیں۔ کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ ڈاکٹر صداقت اللہ خاں بدایونی (مرحوم) نے نذر کیا۔ (ڈاکٹر صاحب بھی خانقاہ قادریہ کے پرانے وابستگان میں تھے۔)

یہ کتب خانہ چوں کہ شہر کے وسط میں قائم ہے، اس لیے شیخ صاحب نے چاہا کہ اس کو پبلک لائبریری بنایا جائے۔ حضرت اقدس

سے اجازت حاصل کی اور اس کتب خانے کے لیے بہت سے اخبارات و جرائد (اردو، ہندی، انگریزی) جاری کروائے۔ حضرت اقدس نے کتب خانے کا نام ”مولانا عبد الماجد پبلک لائبریری“ تجویز فرمایا۔ اس لائبریری میں جدید تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ایک دارالمطالعہ قائم کیا، جس کا نام ”فریدی دارالمطالعہ“ رکھا گیا۔ لائبریرین کے فرائض جناب محمد تنویر خاں قادری کے سپرد کیے۔

۳ شعبان ۱۳۲۹ھ / ۷ اگست ۲۰۰۸ء کو مولانا عبد الماجد بدایونی کے ۱۲۵ ویں یوم ولادت کے موقع پر حضرت اقدس حضور صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ کے مبارک ہاتھوں سے اس کتب خانے کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس موقع پر پروفیسر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، مولانا خوشتر نورانی، مولانا ذیشان احمد مصباحی اور مولانا سجاد مصباحی موجود تھے۔

طی دورے: شیخ صاحب کی مصروف زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے خود کو علم کے حصول اور علم کی خدمت کے لیے کس طرح وقف کر رکھا تھا۔ مدرسہ قادریہ میں درس دینا اور اکابر کی کتابوں کو تخریج و تحقیق وغیرہ کے ساتھ شائع کرنے کے علاوہ آپ کا ذوق مطالعہ اور جستجوئے علم کہاں کہاں لیے پھرتی رہی، یہاں ہم شیخ صاحب کے علمی دوروں کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے:

(۱) کتب خانوں اور لائبریریز کے سفر
(۲) سیمینار اور سیمپوزیم میں شرکت کی غرض سے یا مدارس اسلامیہ میں امتحان کی حیثیت سے یا کسی خاص عنوان پر علمی لیکچر کی غرض سے یا تعلیمی انعامی مقابلوں میں فیصل کی حیثیت سے آپ کے دورے۔

استاذ محترم امام علم و فن فرماتے تھے کہ ”کتب پڑھنے کا شوق الگ ہے اور کتب ڈھونڈنے کا شوق الگ“ اور ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ صاحب میں یہ دونوں شوق بدرجہ اتم موجود تھے۔ شیخ صاحب کو پڑھنے کا شوق بھی تھا اور عادت بھی تھی۔ شیخ صاحب اکثر فرماتے تھے کہ ”میرے لیے سب سے بڑی سزایہ ہے کہ دو دن مجھے کچھ پڑھنے کے لیے نہ دیا جائے“ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ اپنی دلچسپی کے مطابق کسی خاص موضوع پر ہی مطالعہ کرتے ہیں، مثلاً کسی کو سنجیدہ ادب پسند ہے تو کسی کو مزاحیہ، کسی کو تاریخ کے مطالعے سے دلچسپی ہے تو کسی کو

جغرافیائی مطالعے سے شغف ہے اور اگر مطالعہ کا دائرہ اسلامی لٹریچر محیط ہو تو کسی کو علم حدیث میں مہارت ہوتی ہے تو کوئی علوم قرآن کے مطالعے سے اپنی آخرت سنوارتا ہے۔

مگر شیخ صاحب کا حال ذرا مختلف ہے۔ شیخ صاحب کو علم حدیث میں نظر رکھنے والے اس میدان میں وسیع المطالعہ سمجھتے ہیں تو علوم قرآن سے دلچسپی رکھنے والے ان کو اس میدان کا مرد مجاہد جانتے ہیں۔ یہاں بات کو زیادہ طول نہیں دیتا ہے اس لیے صرف اتنا عرض کر کے جائیں گے کہ موضوعات کے تنوع کا اندازہ ”خانہ تلاشی“ پڑھ کر لگ سکتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ شیخ صاحب نے خود اپنے قلم سے اس کا اظہار کیا ہے کہ ”پڑھنے کے معاملے میں ہمارا معیار بہت مضبوط رہا ہے۔ تفسیر کشاف المومنین حبان سے منطوط کی عبرات و نظائر تک اور محمد حسین آزاد کی آب حیات سے لے کر قرۃ العین حیدر کی گردن رنگ چمن تک ہم ہر قسم کا مواد ہضم کر سکتے ہیں۔“

قصہ مختصر شیخ صاحب کو پڑھنے اور کتاب ڈھونڈنے کا شوق بہت سے کتب خانوں کی سیر کرایا۔ جن کتب خانوں اور لائبریریوں میں شیخ صاحب کتابوں کی تلاش میں گئے ان میں سے بعض کتب خانوں کے نام ہم یہاں تحریر کر رہے ہیں:

- (۱) کتب خانہ مدرسہ اعجاز العلوم: کھیتہ سرائے، جو پورہ ۱۹۹۶ء
- ہمراہ مولانا ذاکر مولانا محبوب
- (۲) انجمنی لائبریری: ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۹۶ء
- ہمراہ امام علم و فن خواجہ مظفر حسین و مفتی عبد الحکیم نوری مصباحی
- (۳) خدا بخش لائبریری: پنڈ، ۱۹۹۷ء
- (۴) لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی: لکھنؤ، ۱۹۹۶ء
- ہمراہ امام علم و فن خواجہ مظفر حسین و مفتی عبد الحکیم نوری مصباحی
- (۵) مولانا آزاد لائبریری: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۸ء
- ہمراہ ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی
- (۶) دارالمصنفین: اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۷) مفتی اشرف لائبریری: کچھوچھو شریف، ۲۰۰۷ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی

- (۸) لائبریری آستانہ صدیہ: پچھونڈ شریف ضلع اور یہ، ۲۰۰۸ء
- (۹) کتب خانہ خانقاہ حافظیہ: خیر آباد شریف ضلع بیتا پور، ۲۰۱۰ء
- (۱۰) لائبریری انجمن علمی: کراچی، پاکستان، ۲۰۱۰ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۱۱) بیدل لائبریری: کراچی، پاکستان، ۲۰۱۰ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۱۲) رضا لائبریری: رام پور، ۲۰۱۱ء / ہمراہ تنہیم حسن قادری
- (۱۳) لائبریری عثمانیہ یونیورسٹی: حیدرآباد، ۲۰۱۱ء
- (۱۴) کتب خانہ فرنگی محل: لکھنؤ، ۲۰۱۱ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۱۵) شبلی نعمانی لائبریری: ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۲۰۱۱ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۱۶) دہلی پبلک لائبریری: ۲۰۱۱ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۱۷) نیشنل آرکائیو آف انڈیا: ۲۰۱۱ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۱۸) کتب خانہ جامعہ نظامیہ: حیدرآباد، ۲۰۱۱ء
- (۱۹) مولانا آزاد عربی فارسی لائبریری: نوٹک راجستھان، ۲۰۱۲ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی و مولانا سجاد عالم مصباحی
- (۲۰) کتب خانہ مسجد نبوی: مدینہ منورہ، سعودی عرب، ۲۰۱۲ء
- (۲۱) اسٹیٹ سینٹرل لائبریری: ممبئی، ۲۰۱۳ء
- ہمراہ جناب اسحاق پٹنی
- (۲۲) کریبی لائبریری: ممبئی، ۲۰۱۳ء
- ہمراہ جناب اسحاق پٹنی
- (۲۳) The K.R. Cama Oriental Institute Library, Mumbai دسمبر ۲۰۱۳ء
- (۲۴) لائبریری جامعہ ہمدرد: دہلی، ۲۰۱۴ء
- ہمراہ مولانا خوشتر نورانی
- (۲۵) کتب خانہ قادری: درگاہ غوث اعظم بغداد شریف، ۲۰۱۴ء
- مارچ ۲۰۱۴ء (یہ آخری کتب خانہ ہے جس میں شیخ صاحب اپنی شہادت

سے دو دن پہلے حاضر ہوئے تھے۔)

شیخ صاحب کے دوروں کی دوسری قسم ذرا تفصیل طلب ہے۔ شیخ صاحب کا رجحان عوامی جلسوں سے زیادہ علمی نوعیت کے پروگراموں کی طرف تھا، اسی وجہ سے آپ عوامی جلسوں میں کم دیکھے گئے۔ وابستگان سلسلہ کے بے حد اصرار پر کبھی کبھی جلسوں میں شریک ہوتے اور اکثر جلسوں میں راقم الحروف کو روانہ فرماتے اور یہ کہتے ”میں عطیف صاحب کے حق میں دستبردار ہو گیا ہوں۔“

شیخ صاحب جن پروگراموں میں تشریف لے جاتے وہ یا تو کسی سیمینار یا سیمپوزیم کی شکل میں ہوتے یا خالص علمی و تحقیقی لیکچر کی شکل میں جن میں سوالات کرنے کی عام اجازت ہوتی یا پھر مدارس اسلامیہ کے سالانہ امتحان کے موقع پر ان کو یاد کیا جاتا یا تعلیمی مقابلوں میں حکم کی حیثیت سے ان کی شرکت ہوتی۔

ترقیی خدمات: کسی مفکر نے کہا ہے کہ ”بغیر تربیت کے تعلیم حاصل کرنے سے بہتر ہے کہ انسان تعلیم نہ حاصل کرے۔“ یہ قول کتنا سچا ہے یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے مگر تربیت کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ صاحب کی شخصیت تعلیم و تربیت کی جامع تھی۔ اس لیے آپ تعلیم کے ساتھ تربیت کی اہمیت و ضرورت سے اچھی طرح واقف تھے۔

اس لیے آپ نے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام ”الازہر انشٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز“ رکھا۔ اسی ادارے کے زیر اہتمام آستانہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف میں مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے لیے تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کیا، جس میں طلبہ کو دور حاضر کے چیلنجز اور تقاضوں سے واقف کرایا گیا اور مختلف عنوانات پر لیکچرز دیے گئے۔ یہ ورک شاپ ۱۸ تا ۲۹ جنوری ۲۰۰۶ء تک رانی-۱۲ اردن کے اس ورکشاپ میں ۵۰ سے زائد مدارس اسلامیہ کے طلبہ شریک ہوئے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان ۱۲ دنوں میں قیام و طعام کا جو انتظام کیا گیا وہ مہم نوازی اور سخاوت عثمانی کے حسین امتزاج پر مبنی تھا۔ اس ورک شاپ میں مفتی آل مصطفیٰ مصباحی، مولانا خوشتر نورانی، مولانا نعمان ازہری اور مولانا سجاد مصباحی نے لیکچرز دیے، جبکہ مولانا مظفر الاسلام ازہری نے امریکہ سے بذریعہ فون لیکچر دیا اور نقابل ادیان پر مولانا محمد احمد نعیمی نے لیکچر دیا۔ اس ورک شاپ میں مختلف اقسام کے علمی مقابلے بھی

کچھ یادیں کچھ باتیں

ہماری صف سے ایک ایسا سپاہی چلا گیا جو اس جماعت کے دفاع کے لیے دایہ درے قدمے گئے تیار رہتا تھا

عرفان صدیقی کا شعر یاد آ گیا۔

اک نظر دیکھ کے دنیا تہہ و بال کر دے
ایسی آنکھوں کو تو بیمار نہیں مانتا میں

وہ اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے کافی کچھ کہہ دینے کے ساتھ ساتھ بچھلوں کا پتہ اور انگلیوں کا سراغ بھی دے دیا کرتے تھے۔

مسکراتا ان کی فطرت میں تھا، ان کو اس کام میں مشقت نہیں کرنا پڑتی تھی، وہ اگر خاموش بھی ہوتے تھے تو لگتا تھا کہ مسکراتے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ بخبری اکثر ان کے خوبصورت دہانے سے مل ہی جایا کرتی تھی۔

وہ کم گو تھے لیکن بولنے کے لیے لفظوں کا خزانہ ہر وقت تیار رکھتے تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ یہ جانتے تھے کہ کیا نہیں بولنا ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ جس سے بولنا ہے اس سے کیا نہیں چھوڑنا ہے۔ عام لوگوں سے گفتگو بہت سادہ اور ان کے فہم کے مطابق کرتے، میں نے انہیں بار بار دیکھا وہ بہت ہی سنبھل کر سلیقے کے ساتھ گفتگو کرتے گویا کہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ان کے حلقے میں چند ہی ایسے افراد تھے جن سے وہ کھل کر گفتگو کرتے تھے اور خوب گفتگو کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک خوبی اور بھی تھی کہ وہ بے تکلف حضرات سے بھی گفتگو کرنے میں اپنے ان خطوط سے کبھی تجاوز نہیں کرتے تھے جو انہوں نے اپنی شخصیت کے تحفظ کے لیے متعین کیے تھے۔

اسید میاں بہت بچے تلے قدموں سے چلا کرتے تھے۔ لگا ہیں بچی کیے نہ بہت دھیمے نہ بہت تیز بلکہ بے حد متوازن اور ہادووار طریقے سے مجبوراً ہوتے۔ شیخ صاحب اگر تنہا بھی چل رہے ہوتے تو بھی یہ لگتا تھا کہ ساتھ ساتھ کوئی وزن چل رہا ہو۔ یقیناً وہاں ایک وفد ہی ساتھ ہوتا تھا، جس میں اتحاد ملت کا درد، جماعت اہل سنت کی شیرازہ بندی کی فکر،

تقریباً بیس پچیس برس پیچھے ماضی میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک یادداشت کے منظر نامے پر بدایوں شریف کا جلوس محمدی علیہ السلام ہوا۔ حضرت صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے زیر قیادت جلوس جو خروام ہے۔ صف قیادت میں کالی ٹوپی اور کالی شروانی پہنے ایک صاحب زادے ہاتھوں میں پھول لیے مسکراتے ہوئے بے تکاں متانت کے ساتھ سرکارِ دو عالمؐ کی محبت میں سرشار آگے آگے چل رہے ہیں، لوگ ان کو دیکھ رہے ہیں اور خاص بدایونی انداز میں تعریفیں کر کر کے نظریں لگا رہے ہیں بس، یہیں سے وہ منظر تبدیل ہونے لگے، بیس پچیس سال پہلے کے وہ وجہ صاحب زادے ایک عالم ربانی، ایک صاحب طرز ادیب، قادر الکلام شاعر، ایک مہذب خادم تلاش، حنفی مسلک، صوفی مشرب شخص کا غماز اپنے علم اور کردار کی تابانیاں بکھیرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ ”کم وقت اور کام زیادہ“ کا ہمہ وقت اعتراف کرنے والی وہ شخصیت کم وقت میں زیادہ کام کر کے صرف ۳۸ رسال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی، جس کو کوئی اسید الحق پکارتا تھا، کوئی عاصم میاں صاحب، کسی کے وہ شیخ صاحب تھے اور کسی کے حبیب ”بھیا“۔

وے صورتیں الٹی کسی دیں بستیاں ہیں:

میں ان کی یادوں اور باتوں کو صفحہ قمر طاس پہ لانے کے لیے ان کی حیات کے آئینے میں ان کو تلاش کرتا ہوں تو سب سے پہلے مجھے ایک باوقار اور سنجیدہ وجود میں نہایت ہی حسین و جمیل، پر نور چہرہ نظر آتا ہے جو خوبصورت بھی لگتا تھا اور متبرک بھی۔ سیاہ ریش اس چہرے پر پائی محسوس ہوتی تھی گویا رب کائنات نے اس چہرے کی بناوٹ کے مطابق ہی یہ خوبصورت دائرہ و دیبہ فرمائی ہو، کشادہ پیشانی سے ان کی خاندانی شرافت اور اعلیٰ نسب متعکس ہوتی تھی۔ آنکھیں ایسی کہ

خاص طور سے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور درگاہوں پر مدد رسہ قادریہ کے طلبہ کو بھیجا کرتے تھے۔ ٹھنڈے پانی کے ساتھ ہر آدمی کو اسلام کے تعارف پر مشتمل ہندی زبان میں ایک فولڈر بھی دیا جاتا تھا۔ خدمت خلق کے ذریعے تبلیغ اسلام کا یہ طریقہ خانقاہوں کی پرانی روایت ہے۔ مفت تعلیم: شیخ صاحب چوں کہ خود تعلیم یافتہ تھے، اس لیے تعبیر کی اہمیت سے واقف تھے۔ آپ بہت سے نادار طلبہ کی کفالت فرماتے اور ان کی فیس ادا کرتے تھے۔ ملک اور بیرون ملک کے بہت سے طلبہ شیخ صاحب کی اس صفت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ طلبہ کون ہیں اور کتنے ہیں۔ بعض کو ہم بھی جانتے ہیں، مگر ان کی تاکید کہ ”راز کو راز ہی رہنے دو“ پر عمل کرتے ہوئے خاموش ہیں۔

شاعری: شیخ صاحب نے شاعری کم کی، مگر بے مثال کی۔ فن شاعری پر آپ کی بہت گہری نظر تھی، جس کا ثبوت قصیدتان رانسان کا تحقیقی مقدمہ ہے۔ شیخ صاحب کو اردو، عربی اور فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے جس کا اظہار گفتگو اور تحریر میں جا بجا ہوتا تھا۔

شیخ صاحب کا تعلق جس خانوادے سے ہے، اس میں بہت سے قادر الکلام شاعر گزرے ہیں۔ آپ کے والد، تایا اور آپ کے دادا پروادا اور پروادا کے والد تمام کے تمام نہ صرف بلکہ شاعر گزر رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں شیخ صاحب کا شعر کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

شیخ صاحب کی شاعری پر تبصرہ تو کوئی ژرف نگاہ ناقد ہی کر سکتا ہے، مگر ہم یہاں اتنا عرض کریں گے کہ آپ اپنے پروادا تاج الفحول کے اس شعر کے ذریعے اپنی شاعری پر خود تبصرہ فرماتے تھے:

ان کی مدحت سے غرض ہے شعر اکچھ بھی کہیں

وفات: ۲۵ فروری ۲۰۱۳ء کو زیارت کی غرض سے آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ، جس میں راقم بھی شریک تھا، بغداد مصلیٰ گئے، وہاں ایک دہشت گردانہ حملے کی زد میں آ گئے اور ۳ مارچ ۲۰۱۳ء ۲/رجادی الاونی ۱۴۳۵ھ کو عراقی وقت کے حساب سے دوپہر کے دو بج کر تیس منٹ پر آپ شہید ہو گئے اور ۶ مارچ ۲۰۱۳ء کو بعد نماز عصر حضرت اقدس حضور صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور غوث اعظم کی درگاہ میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ □□□

✽ خانقاہ عالیہ قادریہ مولوی محلہ، بدایوں شریف (یوپی)

ہوئے اور انعامات دیے گئے، طلبہ کو آمد و رفت کا کرایہ بھی پیش کیا گیا۔ دوسری مرتبہ ۸ تا ۱۱ فروری ۲۰۰۷ء میں تعلیمی و تربیتی ورکشاپ کا انعقاد بعنوان ”مقابلہ علوم حدیث“ کیا گیا۔ اس مقابلے کے لیے شیخ صاحب نے علوم حدیث کے نام سے ایک کتاب ترویج دی تھی اور مدارس اسلامیہ میں یہ کتاب مقابلے سے دو ماہ قبل بھیجی گئی تاکہ طلبہ اچھی تیاری کے ساتھ شریک مقابلہ ہوں۔

۱۱ فروری ۲۰۰۷ء کو تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں مارہروی تشریف لائے اور آپ کے مبارک ہاتھوں سے انعامات تقسیم ہوئے۔ اسی طرح اسکول و کالج کے طلبہ کے لیے تعلیمی و تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اسکول و کالج کے طلبہ کی علم دین سے ناواقفیت کو دیکھتے ہوئے شیخ صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت کا ارادہ فرمایا۔ پہلا ورکشاپ ۸ مئی تا ۲۲ جون ۲۰۰۵ء تک رہا اور یہ شمالی ہندوستان میں اہل سنت و جماعت کا منفرد ورکشاپ تھا۔ اس ورکشاپ میں طلبہ کو بنیادی مسائل مثلاً نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ آگاہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ”توحید و شرک“، ”عقیدہ ختم نبوت“ اور ”نکاح و طلاق“ کے عنوانات پر شیخ صاحب نے لیکچر دیے۔ اس ورکشاپ کے لیے انھوں نے نصاب ترتیب دیا اور اساتذہ مقرر کیے اور طلبہ کے لیے تعلیمی مقابلوں کا اہتمام کیا۔

۲۳ تا ۳۰ جون ۲۰۰۵ء ”فہم اسلام ہفتہ“ کے عنوان سے ایک ہفتہ مختلف عنوانات پر مختلف لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں دور حاضر کے عظیم محقق ڈاکٹر سید علیم اشرف جاسی نے ”اسلام اور جہاد“ کے عنوان پر بھرپور لیکچر دیا۔ اسی طرح ہر سال گرمیوں کی تعطیل میں اسکول و کالج کے طلبہ کے لیے تعلیمی و تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کیا جاتا رہا۔

خدمت خلق: شیخ صاحب نے تدیس و تصنیف، تقویٰ و طہارت کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کو بھی بڑی سنجیدگی سے لیا اور اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ شیخ صاحب نے ہزاروں غریب مریمینوں کا علاج کرایا۔ خدمت خلق کے حوالے سے شیخ صاحب کی خدمات کی چند جھلکیاں اس طرح ہیں:

پانی کی سہیلیں: شیخ صاحب شدید گرمی کے موسم میں ہر سال ٹھنڈے پانی کی سہیلیوں کا انتظام شہر کے مختلف حصوں میں کیا کرتے تھے۔

اپنے خاندانی ورثے کی حفاظت کا ذمہ سوا اعظم کے لیے معیاری تحریری مواد فراہم کرنے کی سوچ، اپنے تلامذہ کی شخصیت سازی کا خیال اور سلسلہ قادریہ کی ترویج و اشاعت کا عزم، یہ سب بیک وقت ان کے ساتھ ساتھ ہی تو رہا کرتے تھے۔

وہ پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بے حد شعلیق تھے۔ ان کی پوشاک ان کے کردار ہی کی طرح صاف شفاف ہوا کرتی تھیں۔ ہم نے انہیں کبھی رنگین کپڑوں میں نہ دیکھا۔ علی گڑھ کٹ پانچامہ، بنا گلے کا کرد، مل کی دوپٹی ٹوپی اور خاص خاص موقعوں پر شیروانی اور جناح کپ۔ اپنے یہاں کے اعراس کے موقعوں پر جبہ اور عمامہ، غرض کہ پہننے اوڑھنے میں بھی اپنا ایک نظم برقرار رکھتا تھا۔

محفل کے آداب سے نہ صرف خاطر خواہ آگاہی تھی، بلکہ اپنے طرز عمل سے دوسروں کو بھی اس ادب کو ملحوظ خاطر کرنے کے لیے مائل کر لیا کرتے تھے۔ میں نے ان کو دست خوان پر بھی بے حد سلیقہ شعار اور محتاط پایا، ان کی خوراک ایسی ہی تھی جیسی بزرگوں سے ان کی کتابوں میں منقول ہوا کرتی ہے۔

ان کے اندر ایک اور چیز بہت نمایاں تھی، جس نے ان کو نہ صرف ان کے حلقے میں بلکہ تمام زمانے میں ممتاز کیا، معروف کیا اور چاہتوں کا مرکز بنایا اور وہ تھا ان کا ادب، شائستگی، انکساری اور خوش اخلاقی۔ وہ ادب کرنا اور کرانا دونوں جانتے تھے، میں نے کبھی ان کو غصے کی حالت میں بھی ادب کے دائرے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی ایسا لفظ سنا جو ایک عالم دین کی شان کے خلاف ہو۔ وہ اپنے ہم عمر ساتھیوں، دوستوں، معاصر نو جوان علماء کرام، بزرگ مفتیان عظام اور مشائخ کرام وغیرہم سے حسب مراتب پیش آتے۔

میرا اسید میاں سے بالمشافہ ملاقاتوں کا اور ٹیلی فون کے ذریعے باتوں کا ایک گہرا سلسلہ تھا اور پچھلے دو ایک سالوں میں تو شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو کہ ہم لوگوں نے آپس میں باتیں نہ کی ہوں۔ ہر قسم کی گفتگو نہ ہی، علمی، سماجی اور خانقاہی بھی، لیکن وہ بات چیت میں ہمیشہ ایک معیار قائم رکھا کرتے تھے۔ کبھی اگر یہ محسوس کرتے کہ یہ بات کہیں کچھ زیادہ ہو گئی تو اگلے فون پر پچھلی بات کا تذکرہ کر کے یہ معلوم کر لیتے کہ وہ بات ناگوار تو نہیں گزری، نفی میں جواب ملنے پر تسلی کا اظہار کرتے،

میں نے ان میں ایک بہت امتیازی وصف پایا کہ وہ بہت صابر و شاکر کے شخص تھے، اگر کسی نے بہت زیادہ تعریف کی تب بھی بہت زیادہ مسرت کا اظہار نہیں کرتے، بس ایک جواب کہ ”ارے صاحب فوازش“ اور وہ بات آگے بڑھا دیا کرتے تھے۔ اگر کسی نے کوئی دل آزاری کی بات کی تب رنجیدہ تو ہوتے لیکن اس کا اظہار اس طرح سے نہیں کرتے تھے جیسا کہ عام لوگ غصے اور بدلے کی حالت میں بدزبانی کر کے کرتے ہیں۔ میں اکثر ان سے کہتا تھا کہ آپ کچھ معاملات میں کپے صوفی ہیں، تو جوابا ارشاد ہوتا کہ ”میں صوفی وغیرہ کچھ نہیں ہوں میں صرف قلم کا آدمی ہوں اور مجھے بہت سے چھوڑے ہوئے کام پورے کرنے ہیں۔“ بارہا زور دے دے کر کہتے کہ ”ارے بھائی وقت کم اور کام زیادہ ہے۔“

اسید میاں جتنے اپنے قلمی اور خانقاہی کاموں میں سنجیدہ اور متفرد اساس تھے، اتنے ہی اپنے ذاتی اور خانگی معاملات میں سنجیدہ بھی۔ وہ اپنے والد ماجد مدظلہ کی شفقتوں اور ان کی دی ہوئی تربیت کا ہمیشہ اعتراف کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ہم آج جو کچھ بھی ہیں وہ اپنے ابا کی خاص توجہ کی وجہ سے، انہوں نے ہمارے لیے بڑی قربانیاں دیں اور آج قلم پکڑنے کے قابل بنایا۔ جب ان کے والد ماجد ان کے کسی کام پر خوش ہو کر داد و تحسین دیتے تو بہت خوشی کے ساتھ فون کر کے بتایا کرتے تھے کہ ”ابا آج فلاں کام سے بہت خوش تھے، فلاں بات پر آبدیدہ ہو گئے“ وہ کہتے تھے اگر ہمارے ابا ہماری کسی بات سے خوش ہو جاتے ہیں تو ہماری محنت وصول ہو جاتی ہے، وہ اپنے والد ماجد کے لیے اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

منع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں بغداد شریف جانے کے موقع پر ممبئی سے ان کا فون آیا، کہنے لگے کہ ”بہت پریشان ہوں، ابا کو Spondylitis ہو گئی ہے، ڈاکٹر نے سفر سے منع کیا ہے، لیکن ان کا بہت دل ہے تو حاضری تو ہوگی مگر اب آئندہ خیال رکھیں گے کہ ان کو زیادہ سفر نہ کرائیں۔“ اسی دوران ممبئی میں ”جشن قادری“ بھی تھا۔ مجھ سے فون پر بڑے رنجیدہ انداز میں کہنے لگے کہ ”آج قلب پر بہت بوجھ ہے کہ ابا نے جشن قادری کے بعد

مصافحات کے لیے لوگوں سے یہ کہہ دیا کہ اب آپ شیخ صاحب سے مصافحہ کیا کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور سلامت رکھے، وہی مصافحہ کیا کریں اسی میں ہماری خوشیاں ہیں۔“

اپنے بھائیوں کے تو وہ سردار تھے اور ان کی چاہتوں کے مرکز بھی۔ دونوں بھائی اپنے بڑے بھائی کو اپنا دوست، آئیڈیل اور ہیرو مانتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد عطیف اور عزام دونوں نے بارہا یہ کہا کہ ”ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے بھیا اتنے تھکنے محنت کر کے سارے کام خوش اسلوبی سے کر دیا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو آزاد رکھتے۔“ آج ان کے جانے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ہمیں تو انہوں نے جیسے پلنگ منانے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ درس و تدریس، مدرسہ کا انتظام و انصرام، تعمیرات کے مراحل، کتابوں کی اشاعت، اعراس کے انعقاد، علماء، مشائخ و دانشوران سے تعلقات کی از سر نو تشکیل جیسی ذمہ داریاں وہ کتنی خاموشی اور آسانی کے ساتھ نبھا دیا کرتے تھے۔

علم و ادب کی ترقی و ترقی:
ان کی علمی لیاقت پر میں بھلا کیا گفتگو کروں گا، نہ میں ان کے برابر پڑھا لکھا، نہ ایسا فکر و نظر کا دھنی۔ میں نے جتنا انہیں پڑھا، ذاتی طور پر سمجھا اور پڑھے لکھوں کے منہ سے ان کے بارے میں سنا اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ انہوں نے اتنی کم عمری میں خالص اپنی محنت سے جتنا پڑھ لکھ لیا اور لوگوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کر دیا شاید ایسا کم ہی لوگوں کے حصہ میں آیا ہو اور خاص کر خانقاہی نظام سے متعلق افراد تو ابھی اس جانب توجہ کم ہی رکھتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ میرے برادر عزیز سید محمد امان قادری نے ان (اسید میاں) کے انتقال پر مجھ سے ایک بے حد تجزیاتی جملہ کہا کہ ”احمد بھائی! اسید میاں تمام خانقاہوں کے ولی عہدوں کی آبرو اور پیر زادوں کے لیے نمونہ عمل تھے۔“ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انہوں نے اپنی خانقاہ کی علمی شناخت اور دیرینہ اقدار کا اپنی مسلسل کاوشوں سے تحفظ بھی کیا اور اپنے ذاتی تشخص کو بھی ارباب علم کے درمیان قائم کرنے میں کامیاب سعی کی۔ ان کی یہ بڑی خواہش رہتی تھی کہ تمام خانقاہوں کے صاحبزادگان علمی اور عملی طور پر بے حد مضبوط اور مستحکم ہوں اور اس میں تعاون کرنے کے لیے وہ خود کو صف اول میں رکھا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مدرسے میں کئی

خانقاہوں کے صاحبزادگان کو شایان شان طریقے سے علم دین حاصل کرنے کے لیے دعوت دی اور آج بھی کئی صاحبزادگان خانقاہ مدرسہ قادریہ میں زیر تعلیم ہیں۔

وہ خالص قلم کے آدمی تھے، پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انہوں نے چونکہ درس نظامی سے قبل جدید تعلیم بھی حاصل کی تھی اس لیے ان کی سوچ اور نظریے میں علم، حصول علم اور ترویج علم کے حوالے سے بہت وسعتیں تھیں اور شاید اسی لیے ان کی تحریروں میں جوتنوع ہے وہ ان کے معاصرین میں ہمیں کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

رب العزت نے انہیں علم سے بھرا ہوا سینہ عطا فرمایا تھا، اور ساتھ ہی محنت کرنے کا بے پناہ جذبہ بھی۔ وہ حضور سیف اللہ المسلمون و حضور تاج الحول کے علم و فن کے حقیقی معنی میں وارث تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خاندان عثمانی کی تمام شرافتیں، نجابتیں، مروثیں اور سخاوتیں خوب خوب اسید میاں کو ودیعت فرمائیں تھیں اور پھر حضور جس مارہرہ کی خاص عنایات نے سونے پے سہاگ کا کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی محنت شاقہ کے سبب قلیل مدت میں خود کو سارے زمانے میں متعارف کرانے میں کامیاب ہوئے۔

یہ ان کے سترہ سترہ کھنے مطالعہ کی محنت کا ہی کمال تھا کہ وہ بیک وقت تبحر عالم دین، باشعور فقیہ، ماہر حدیث داں اور مفسر قرآن نظر آتے تھے، اسی لیے ان کا قلم ہر سمت گردش کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ افتا کی زبان بھی لکھنا جانتے تھے اور ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے خاکے و انشائیے، سوانح، تنقید اور تبصرے لکھنا بھی۔ اسید میاں نے بہت سی ایسی کتابوں پر بھی مقدمے، پیش لفظ یا ابتدائیہ رقم فرمائے جن کے موضوعات سے عام لوگ یا تو دلچسپی نہیں رکھتے یا پھر ان کے خالص علمی و تحقیقی و خشک ہونے کا شکوہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ اسید میاں کی دلچسپ اور جمالیاتی تحریر کی کشش ہی کا کمال تھا کہ قاری کی ہمت بندھ جاتی تھی کہ وہ ان کی کتابوں کے ابتدائیہ، مقدمے یا پیش لفظ کی کنار پر چڑھ کر پوری کتاب پڑھنے کی ہمت کر ہی لیتا تھا۔ وہ اپنی کتابوں کو ضخیم بنانے کے لیے القاب و آداب، پیدائش اور رحلت کے آگے پیچھے بھاری بھر کم الفاظ کی باڑھ لگانے سے بے حد پرہیز کرتے تھے، جس کا انہوں نے برملا اعتراف بھی کیا اور ایسا پسند کرنے والوں کے بیجا اعتراضات کو برداشت بھی۔

(عام طور پر پڑھے لکھوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے)۔

وہ داد کی چاہت رکھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ لیکن خود اچھی چیزوں پر داد دینے کے بہت شوقین تھے۔ علم کا پھیلاؤ اسید میاں کا خاص مشغلہ تھا، جو بھی کتاب شائع کرتے اس کو بے حد اہتمام کے ساتھ تمام علم، مشائخ اور مذہبی اداروں میں فوراً ہی سمیٹ لیا اور اگر غفلت کی تو بہت اچھا۔ وہ ان کوئی حصولِ یابی کی رسید دیتا تو اچھا اور اگر غفلت کی تو بہت اچھا۔ وہ ان حضرات تک بھی اپنی علمی کاوشوں کو تسلسل اور تواتر کے ساتھ پہنچاتے جن حضرات نے ان کے اس خلوص کے جواب میں اظہارِ تشکر ادا نہ کرنے حتیٰ کہ جوابی رسید تک نہ دینے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔

جب ان کی ذاتی لائبریری کے افتتاح کے موقع پر میں علی گڑھ سے حاضر ہوا تو افتتاح سے قبل اپنی لائبریری کا ایک ایک سیکشن مجھے دکھایا، حقیقتاً انہوں نے بڑے سلیقے سے اپنے ارمائوں کی دنیا کو لائبریری میں سمجھا دیا تھا، اپنے خانوادے کی تمام کتب اور مخطوطات کو جس طرح انہوں نے محفوظ کیا وہ ایک قابلِ تحسین عمل ہے اور دوسروں کے لیے ترغیب بھی۔

میرا جانا جب بھی بدایوں شریف ہوتا تو اسی لائبریری میں دیر تک ان سے گفتگو ہوتی۔ وہ اپنی نئی تحریرات سے مجھے آشنا کراتے اور مستقبل میں ہونے والے کاموں کی تفصیل بتاتے۔ گفتگوں بات چیت کے بعد بھی دل نہیں بھرتا تھا، ان کے ساتھ ہر نشست ہمیشہ بڑے صحت مند اور خلوص کے ماحول میں برخواست ہوتی اور ہمیشہ ان سے ملنے کے بعد عرفانِ صدیقی کا یہ شعر ذہن میں گونجتا:

گرئی صورت شمشاد قدال آنکھوں سے

شہر کو مصر کا بازار کیا ہے اس نے

جب یہ معلوم ہوا کہ ہمارے عزیز شیخ صاحب ہی خامہ تلاش کے "ابوالفیض معینی" ہیں تب میں نے کچھ نرم نرم سا شکوہ کیا کہ آپ نے یہ راز ہم پہ ظاہر نہیں کیا، یہ تو کوئی اپنائیت نہ ہوئی؟ جواباً ارشاد ہوا "بھائی مزہ خراب تھوڑی کرنا تھا۔" ابوالفیض معینی کے نام سے اور تحریر میں منجیدہ علمی استدلال، خالص ادبی نفاذ، مہذب طرزِ بحث و طلب، مذہبی اور مسلکی اصولوں میں تعلق دیکھ کر شک تو ہوتا تھا کہ یہ چنگاری کہیں اپنے خاکستر ہی کی تو نہیں۔ بہر حال اسید میاں نے اپنے علم و فضل اور ادبی

صلاحیتوں کو وہاں بھی خوب خوب ثابت کیا اور وہ بھی اس شان کے ساتھ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

ان کی کتاب "عربی محاورات" نے بین الاقوامی سطح کی شہرت حاصل کی، صرف اہل سنت و جماعت ہی کے انصاف پسند اور دیانت دار حلقے نے نہیں، بلکہ دوسرے علمی اور ادبی حلقوں میں بھی اس کام کو بے حد سراہا گیا اور عربی تخلیقی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ تصور کیا گیا۔ حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کی حیات و خدمات کے حوالے سے ان کی کتاب "خیر آبادیات" تو حقیقت میں کھوئے ہوئے اور بھلا دیے گئے لوگوں کو پانے کی جگہ میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ پڑھے لکھے حلقوں میں اس کتاب کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ عرسِ قاسمی کے موقع پر اس کتاب کا اجرا اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میرے خال محترم اور معروف ادیب حضرت اشرف میاں صاحب نے فرمایا کہ "یہ اس سال کا بہترین علمی و ادبی شاہکار ہے"، حضرت امین ملت دام ظلہ نے خانقاہ برکاتیہ کی جانب سے اسید میاں کو اس کارنامے کے لیے بطور نذرانہ خلوص ۲۱ ہزار روپے اور "نشان تاج العلماء" (ایوراڈ) عنایت فرمایا۔

اسید میاں کی تصنیف "قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ" ایک ایسی کتاب ہے جو ان حضرات کو بڑا مدلل جواب ہے جو قرآن کریم کی آیات مبارکہ سے کھینچ کر کے اپنے موقف کے مطابق مطلب اخذ کر لیا کرتے ہیں اور اس کو سائنسی تفسیر کا نام دیا کرتے ہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں خالص علمی دلائل سے ان حضرات کی صحیح رہنمائی فرمائی اور قرآن اور علوم قرآن پر اپنی مضبوط سمجھ ہونے کا بھرپور ثبوت بھی دیا۔

۱۰۰ صحیح احادیث کو صحیح ترجمہ اور مأخذ کے ساتھ ایک بہت ہی مفید کتاب "احادیث قدسی" کے نام سے شائع کر لیا جس کا ترجمہ انگریزی میں کروا کر عصری تعلیم کے اداروں میں بھی تقسیم کروایا۔ راقم کو بھی کثیر تعداد میں یہ کہہ کر کتابیں عنایت کیں کہ میں ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسکالرس میں تقسیم کر دوں، حدیث پاک کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے یہ ان کی نہایت ہی خالصانہ کاوش تھی۔

"اسلام اور خدمتِ خلق" اور "اسلام ایک تعارف" یہ دونوں کتب عوام الناس کے لیے بے حد مفید اور معلومات بخش ہیں۔ ان کو

ہندی، گجراتی، مراٹھی میں بھی شائع کروایا۔

مجھے یاد ہے کہ جب حضرت اقدس قبلہ سالم میاں صاحب مدظلہ العالی کو مسندِ سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے ۵۰ سال پورے ہو رہے تھے، اس موقع پر شیخ صاحب کی خوشیاں اوج ثریا پر تھیں، انھوں نے عہد کیا کہ ان کی پچاس سالہ سجادگی کی مناسبت سے اس موقع پر قبلہ حضرت والد ماجد کی خدمت میں اپنے بزرگوں کی پچاس کتابوں کو نئی تحقیق و ترتیب کے ساتھ شائع کریں گے اور ان کی خدمت میں بطور نذر پیش کریں گے۔ وہ عہد اور دھن کے پکے تھے، انھوں نے دن رات محنت کر کے یہ ناقابلِ یقین کارنامہ کر دکھایا اور عرس میں انہوں نے "جشنِ زریں" منعقد کیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے والد ماجد اور مشائخ مارہرہ کے ہاتھوں ان کتابوں کا اجرا کروایا۔

ان کے لکھنے کا انداز بھی نرالا تھا، وہ قلم کا استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ براہِ راست کمپیوٹر پر ٹائپنگ سے کام مکمل کرتے اور کمپیوٹر و انٹرنیٹ پر اپنی مہارت تھی کہ کئی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے میری رہنمائی فرمائی بلکہ مشکل کشائی فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ان کے اس مشن کو ان کے برادران کے ذریعے مزید تقویت دے اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ یونہی دراز رہے۔

اسید میاں کو بہت کم لوگ بحیثیت شاعر جانتے ہوں گے کیونکہ وہ بہت کم کلام کہتے تھے، لیکن جتنا کہادہ ایسا کہا کہ لوگ پڑھتے ہی رہے سنتے ہی رہے۔ شاعری میں نئے نئے تجربات کا بے حد شوق تھا۔ شاندار نظمیں اور غزلیں کہیں، اعلیٰ حضرت کے کلام "یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں" کی زمین پر بے حد شاندار نعتیہ غزل کہی اور آخر میں جب انہوں نے کہا

طرزِ رضا کی پیروی عاقبت یہ تیری شاعری

حسنِ سخن، فکرِ رسا، یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

میں تو یہ شعر سن کر سوچنے لگا کہ یہی وہ بڑے کردار و ذہن کے لوگ ہیں جو جماعت کی شیرازہ بندی میں اپنا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کی کچھ نظمیں مثلاً "دوستی کا ہاتھ" حمد یہ نعت، غوثِ اعظم کی منقبت، منجی بدایونی کے نام منظوم خط تو ایسے ہیں کہ جن کو بار بار پڑھیے اور سوز و گداز اور کیف و جذب کے عالم میں ڈوب جائیے۔ اسی اثنا میں مجھے ایک ذاتی بات یاد آئی کبھی میں ان کو عرفان صدیقی یا کسی اور جدید

شاعر کا شعر سناتا جس میں کوئی نقل لفظ ہوتا تو اسید میاں پورا شعر سن کر خاص اس لفظ کے معنی کے حوالے سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے مطلب ضرور دریافت فرماتے اور اگر ہمیں اس کا مطلب خدا خواستہ پتا نہیں ہوتا تب ان کے چہرے کی بشاشت اور مزاحیہ انداز کو میں فون سے محسوس کر کے اچھا خاصا شرمندہ ہو جاتا، اس سے اندازہ لگایا جائے کہ ان کے مذاق کرنے کا انداز بھی کتنا علمی اور مہذب تھا۔

اسید میاں بہت کثیر المطالعہ اور کثیر المشاہدہ شخصیت کے حامل تھے، جس کا کبھی انہوں نے نہ اظہار کیا اور نہ ہی سامنے والے کو اس وصف سے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ یہ باتیں اس لیے بہت اعتماد سے کہہ رہا ہوں کہ میں ان کی اس عادت کا معنی شاہد ہوں اور معترف اس بات کا ہوں کہ ہمیشہ ان سے ملاقات کے بعد معلومات میں اضافہ ہی کر کے اٹھا۔

تصوف پر جب بھی کبھی ان سے گفتگو ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ یہ بات تو بالکل سامنے کی ہے لیکن ہم نہیں جانتے تھے صوفیہ اور مشائخ طریقت کی حیات و خدمات پر ان کی گفتگو منفرد الجہت اور بے حد معلومات افزا ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی تصوف یا خانقاہی نظام سے متعلق تحقیق کے بغیر نہ گفتگو کیا کرتے اور نہ ہی ایسی کسی بات کو ماننے پر آسانی سے تیار ہوتے بلکہ کسی من گھڑت قصے کو سن کر ایسے مسکرا دیتے تھے کہ سنانے والا خود ہی مایوس ہو کر اپنے ہی سنائے ہوئے قصے کے استناد پر سوالیہ نشان لگ لیتا تھا۔ (خود بھی راقم کئی بار اس عمل سے دوچار ہو چکا ہے) وہ علمائے کرام و مفتیان کرام کا بے حد احترام کرتے تھے، میں نے ہمیشہ ان کو موجودہ دور کے بڑے علما کی تعظیم کرتے دیکھا۔ اپنے استاد امام علم و فن حضرت خواجہ مظفر حسین کی علمی شان اور ان کی شخصیت کی سادگی کے بڑے مداح تھے۔ مجھ سے ان کی بہت باتیں کیا کرتے تھے۔ جب خانقاہ برکاتیہ نے خواجہ صاحب کو اعزاز دیا تو بے حد مسرور تھے، سائے کی طرح استاد کے آس پاس خدمت میں مصروف تھے۔ اکثر اعتراف کرتے کہ خواجہ صاحب نے مجھے بہت دل سے پڑھایا۔

آج بہت سے خطیب اور عالم اعلیٰ حضرت پر اپنی تحقیق اور ان کے علم و فن کے حوالے سے خود کو ماہرِ رضویات تصور کیے بیٹھے ہیں اور اس عمل سے دنیاوی طور پر کافی خوش بھی ہیں۔

میرا دعویٰ ہے کہ اسید میاں کی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر، ان کے عم و فن پر جیسی تحقیقی نظر تھی شاید ایسی عمیق نظر آپ کم ہی لوگوں میں پائے گئے۔ ان کی فقہی بصیرت اور شاعری پر تو کبھی ایسی گفتگو فرماتے کہ ہم حیران رہ جاتے۔ ایک دفعہ ٹیلی فون سے میں نے قصیدہ معراجیہ کے ایک شعر کا مطلب ان سے پوچھا تو اس کے جواب میں بھی انہوں نے ایک پورے قصیدے کے حوالے سے ایک درس سادیا اور کچھ ایسے مطالب اور محال بتائے جو حدائق بخشش کی دوسری شرح میں شاید ہی ہوں۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ ”تورے چندن چندر پر و کنڈل“ سے آپ کہہ سکتے ہیں؟ ہم نے جو سمجھا وہ بتایا لیکن وہ ایسا نہیں نکلا جیسا اسید میاں نے اس سے مطلب اخذ کیا۔ یہ ان کی شاعری پر گہری نگاہ کا اثر تھا۔

وہ حضرت فاضل بریلوی کی عربی دانی اور عربی شاعری سے بہت متاثر تھے اور اس حوالے سے بہت خصوصیت کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں جو اہم کام کیے تھے ان میں ایک ”قصیدتان رائعتان“ کا اردو ترجمہ اور مقدمہ شائع کرنا بھی شامل ہے۔ اس دوران فرمایا کہ ”اعلیٰ حضرت کے اس قصیدے پر عراقی اسکالر ڈاکٹر رشید عبیدی کے اعتراضات کا جواب بھی دے رہا ہوں۔ لیکن صاحب قصیدہ پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ قصیدہ صرف عقیدت کا غماز نہیں، بلکہ عربی ادب کا عظیم شاہکار اور اس پر مقدمہ بھی ایسا لکھنا ہے کہ اس قصیدے کے شایان شان ہو اور ایک عربی کے طالب علم ہونے کے ناطے میرا یہ علمی فریضہ ہے کہ میں مولانا صاحب کے قصیدے پر اعتراضات کے عینی جواب دوں اور ان شاء اللہ جواب ایسے ہوں گے کہ آپ بھائی کو کہیں کم نہیں پائیں گے۔ بس اس پر حضرت امین میاں صاحب کی تقریر ہوئی چاہیے کیونکہ قصیدے کے مصنف اور جن کی شان میں قصیدہ ہر دونوں ہی مارہرہ مقدسہ کی روحانیت اور عقیدت کے اسیر ہیں۔“ پھر جیسا انہوں نے چاہا ویسا ہی ہوا اور کتاب بہت ہی عمدہ طباعت کے مراحل سے گزر کر منصفہ شہود پر آئی۔

ایک دفعہ رات کو فون آیا جو ہم لوگوں کے معمول کا ایک ضروری حصہ تھا، فرمانے لگے یہ بتائیے کہ غالب کی شاعری کو بہت سے ادوار میں دیکھا ہوگا؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، کہنے لگے کیا فرق ہے؟ میں نے کہہ کلام کی پختگی، زبان کا استعمال، مشاہدات وغیرہ وغیرہ کا

فرق ہوتا ہوگا۔ انہوں نے میری یہ بات مان لی اور پھر کلام غالب پر اظہار خیال کیا اور بتایا کہ دیکھیے نوعمری کی غزل ایسی اور درمیانی عمر کی غزل میں یہ فرق اور مصطفیٰ کی غزل میں یہ تغیرات وغیرہ اور ایسے ہی دوسرے شعر کا تذکرہ فرمایا۔ میں نہیں سمجھا کہ یہ تجزیہ کیوں آخر؟ تو کہنے لگے: جناب آپ کو بتانا یہ تھا کہ یہ معاملات آپ فاضل بریلوی کے یہاں نہیں پائے گئے۔ وہ نوعمری میں جو کلام اور تحریر لکھتے ہیں ایسی ہی تحریر اور شاعری وہ عمر کے درمیانی حصے میں اور عمر کے آخری دور میں بھی لکھتے ہیں اور آپ نہ مانتیں تو ثابت کر دوں۔ میں نے کہا کہ اس معاملے میں آپ کی نگاہیں بہت گہری ہیں اور دیانت کی روشنی سے منور ہیں۔ یہی تحقیق میں جتنی ایمان داری اس شخص میں دیکھی ہمیں بڑے بڑے اچھوں کے یہاں نہیں ملی۔ یہ چند سطریں اس لیے لکھی کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے لیکن یہ لوگوں کو پتا رہے کہ عالم ربانی وہی ہوتا ہے جو علم اور علما کا احترام کرے اور اپنے گروہ کا دفاع کرے اور اسید میاں اپنی حق شناسی، حق پسندی اور حق گوئی کے حوالے سے بہت منفرد اور ممتاز رہے اور اس بات سے بے نیاز رہے کہ کوئی ہمارے کام اور ہماری صاف نیت کا معترف ہے یا نہیں، کوئی ہمارا مداح ہے یا نہیں ہے۔

بزاز مكرم صاحبزادہ ڈاکٹر سید عظیم اشرف صاحب سے بے حد متاثر تھے۔ وصال سے تین چار مہینے قبل مجھ سے فرمایا کہ ”احمد بھائی میں نے عظیم میاں صاحب جیسا اسکالر نہیں دیکھا، اگر میں کسی موضوع پر ۱۰۰ کتابوں کا نام لوں اور یہ سمجھوں کہ حق ادا کرو یا تو وہ گیارہویں کا نام بتا دیتے ہیں، ان جیسا حاضر علم والا عالم دین کم ہی دیکھنے کو ملے گا۔“

معروف محقق اور قلم کار مولانا خوشتر نورانی صاحب کے ساتھ ان کی دوستی کا بیان کرنا یہ سمجھ کر کہ قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو جائے گا، ایک خام خیالی ہے اور جام نور کا صفحہ اور قارئین کا وقت برباد کرنا ہوگا۔ کل ملا کر ایسا کہا جاسکتا ہے کہ ایسی دوستیاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں جو خونی رشتوں اور خاندانی نسبتوں پر بھاری ہوتی ہیں، لیکن ان دونوں حضرات کے مابین اس سے بھی عمیق اور مستحکم مراسم تھے۔

تریخوں کا شمار کیا: (اصلاحی سرگرمیاں)

اگر اسید میاں ایک طرف پختہ قلم رکھتے تھے تو دوسری جانب ملت کی اصلاح کا بھرپور عزم بھی۔ بدایوں میں اکثریت الحمد للہ خوش عقیدہ

مسلمانوں کی ہے اور جہاں ہم لوگ اکثریت میں ہوتے ہیں، وہاں ہم اپنی تمام رسومات کے لوازمات کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں، خواہ وہ رسوم ہمارے اسلاف کی تعلیمات سے میل کھاتی ہو یا نہیں یا ان سب پر بدعت کا اطلاق ہوتا ہو۔ اسید میاں نے بہت دانش مندی اور جرأت ایمانی کے ساتھ ان تمام چیزوں میں لوگوں کی دلچسپی کم کرنے کے لیے بہت ہی مخلص تبلیغ کی اور ہم نے بہت قلیل مدت میں اس کے مثبت اثرات بھی دیکھے۔ بدایوں شریف میں شب عاشورا اور یوم عاشورا ایک تیوہار کی طرح منایا جاتا ہے، پورا شہر دہلی کی طرح مہندیوں سے سجا ہوتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا، بس یہ بتا دوں کہ یہ اسید میاں ہی کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے اس طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے عوام کو اصلاحی مواد فراہم کر لیا، محرم الحرام کی فضیلت اور اس کی اہمیت کو سمجھایا، خالص عقیدت مندی کے اظہار کا طریقہ بتایا۔ وہ شب عاشورا میں ذکر شہیدان کر بلا کے حوالے سے محفلیں اور اجلاس منعقد کراتے، قرآن خواندوں کا اہتمام کراتے، تاکہ لوگوں کا دھیان ان تمام خرافات سے ہٹ کر خالص عبادت الہی اور محبت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں لگ جائے۔

ہماری جماعت میں اعراس منعقد کرانے کے کیا آداب ہونے چاہئیں، اس سلسلے میں بھی بہت سنجیدہ فکر رکھتے تھے۔ مختلف اعراس کے موقع پر خصوصاً اجیر شریف اور مارہرہ شریف کے عرسوں پر حضور بڑے سرکار قدس سرہ کی درگاہ پر اہالیان مدرسہ کی تعیناتی کرواتے اور ربانی اور اصلاحی لٹریچر تقسیم کرواتے۔ مجھ سے اکثر کہتے کہ ہم لوگوں کو اعراس اور مذہبی اجلاس کی محافل میں وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ جلسوں میں مانک کور گاہ، خانقاہ یا جلسہ گاہ تک ہی محدود رکھنا چاہیے، شہر کے اندرونی حصوں میں لگانے سے عوام کو بے حد دقت ہوتی ہے۔

اسید میاں امام عید گاہ تھے اور ساتھ ہی جامع مسجد شمس میں نماز جمعہ کے خصوصی خطیب اور امام بھی۔ انہوں نے وعظ و تقریر کو نیا انداز بخشا۔ روایتی موضوعات اور قدیم اسلوب سے ہٹ کر نہایت ہی سادہ سادہ الفاظ میں عوام کی فہم کے مطابق اصلاحی اور مذہبی معلومات پر مبنی تقاریر کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک مرتبہ جمعہ الوداع کے بعد فون آیا کہ آج گرمی بہت تھی صاحب لہذا ہم نے مقتدیوں کی سہولت کے پیش نظر دوا

تین منٹ میں خطبہ مکمل کیا اور چھوٹی چھوٹی سورتوں کے ساتھ جمعہ الوداع کی نماز ادا کرادی۔ آج اگر ایسی سوچ کے قائد اکثریت میں ہو جائیں تو اس قوم کو راہ راست پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

۱۳ شعبان یعنی شب برأت کے موقع پر عام طور سے ہم سنی حضرات پٹاٹے چھوڑنے، سخت حلوے بنانے اور سڑکوں پر گھومنے کو ایک مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں۔ یہ اسید میاں ہی کی سعی جمیل تھی کہ اس رات میں ایک شاندار اجتماع جامع مسجد شمس میں رکھواتے اور خود ہی میر محفل ہوتے۔ اس شب میں فضائل شب برأت پر ان کا تفصیلی بیان ہوتا، نصف رات تک اوراد و وظائف کا دور دورہ چلتا۔ رقت آمیز دعائیں مانگتے اور منگواتے۔ اس کوشش کا اثر یہ ہوا کہ اب شب برأت پر شہر بدایوں میں نہ پٹاٹوں کی آوازیں سنائی دیں گی اور نہ ہی افرا تفری کا عالم دیکھنے کو ملے گا۔

شب قدر میں تو اسید میاں کی کاوشیں دیکھنے کے لائق ہوتی تھیں، کئی دفعہ مجھے دعوت دی کہ ایک بار آ کر تو دیکھیے مزہ آ جائے گا۔ شب قدر میں وہ خصوصی طور پر پورے ضلع کے نوجوانوں کو جامع مسجد میں جمع کر لیا کرتے تھے۔ پوری رات اس شب کی مناسبت سے نوافل اور وظائف پڑھواتے، بیچ بیچ میں خود وعظ فرماتے۔ ہمارے شہر کے لوگوں کو اس شب میں مانگی جانے والی رقت آمیز دعائیں کا بے صبری سے انتظار ہا کرتا تھا۔ اسید میاں کبھی کبھی اس شب کی رواد اور اہم السطور کو بہت تفصیل کے ساتھ سناتے تھے۔

شدید گرمی کے موسم میں مدرسہ کے طلبہ و کارکنان ان کی قیادت میں اندرون اور بیرون شہر ٹھنڈے پانی کی سٹبلیں لگواتے اور اس میں بھی انہوں نے تبلیغ کا ایک پہلو یہ نکالا تھا کہ وہ اسلام اور تعلیمات اسلام کا تعارف بزبان ہندی راہ گیروں کو پانی کے ساتھ تقسیم کرواتے۔

مریضوں کے لیے ہیلتھ کمپ لگوانے کا عزم کیا تو اتنا بڑا ہیلتھ کمپ لگوا یا کہ بدایوں میں اس نوعیت کا کمپ کبھی نہیں لگا ہوگا۔ وہ ہمیشہ سرکار دوعالم ﷺ کی اس حدیث کو سامنے رکھ کر کام کیا کرتے جس میں آقا ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے، اور اس کو اپنے جھنڈ کا حساب دینا ہے، بس اس کو ہی سامنے رکھ کر اسید میاں سب سے پہلے اپنے اطراف میں تبلیغی، اصلاحی اور فلاحی کام شروع کیا کرتے تھے۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کا میلاد منانے کا اتنا بڑا انوکھا طریقہ ایجاد کیا کہ تھا جس کے پیش نظر پورا بدایوں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سیرت مبارکہ کے حوالے سے بارہ دن توسیعی خطبات کا انعقاد کرتے جس میں وہ خود ہی خطیب خصوصی ہوتے تھے۔ پھر شرکائے اجلاس کے لیے ایک سیرت مسابقہ رکھتے۔ انہیں خطبات میں سے سیرت کے حوالے سے سوال مرتب کرتے تھے۔ ان بارہ دنوں میں تمام نوجوان طبقہ یہاں تک کہ خواتین اور بچے بھی ان کی اس تحریک میں محو ہو جایا کرتے تھے۔ ہر طرف ایک ہی ماحول تھا کہ فلاں سوال کا کیا جواب ہے؟ اور فلاں کا کیا؟ اس بہانے لوگوں نے سیرت پر مطالعہ شروع کیا۔ اس مسابقہ میں اول آنے والے کو حج بیت اللہ کے لیے زوروارہ کا انعام ملنے سے لوگوں کے حوصلے میں اور تازگی پیدا ہوئی۔ انہوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی یوم ولادت پر نکلنے والے جلوس محمدی میں خوشگوار ترمیمات کیں اور آگے بھی کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اسی سال مجھ سے فرمایا: آئندہ جلوس دیکھیے گا، لگے گا کہ یہ واقعی سرکارِ دو عالم ﷺ کی بچی پیروی کرنے والوں کا مجمع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ربیع الاول کے مہینے میں حیر کے دن کا روزہ رکھنے کی تحریک چلائی جس پر اہلیان شہر نے خلوص دل سے لبیک کہا۔ عمر کے ہر طبقے کے لوگوں نے اس نوجوان عالم ربانی کی تبلیغ کو سرا آکھوں پہ رکھا۔ ماہ ربیع الاول شریف کے آغاز سے ۱۲ ربیع الاول تک خانقاہ قادریہ میں ایک گوشہ دروہ بنواتے اور تمام اہل سلسلہ اور اہلیان شہر کو دعوت دی جاتی کہ روز اس گوشے میں تشریف لائیں اور سرکارِ دو عالم ﷺ پر یہاں بیٹھ کر درود بھیجیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان تمام کاموں کے لیے انہیں مبارک باد پیش کی تو اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے ”ارے صاحب! ہم کہاں کوئی کام کرتے ہیں۔“ (وہ کبھی کبھی ایسے دروہ بھرے جملے غیر شعوری طور پیدا کر ہی دیا کرتے تھے) میں نے کہا کہ ”میں نے پچھلے بیس سال سے جلوس محمدی ﷺ نہیں دیکھا۔“ فرمایا کہ ”تو ایک دن پہلے آئیے دیکھنا ہی نہیں چلتا بھی ہوگا جلوس میں۔“ میں بدایوں شریف حاضر ہوا تو دیکھا پورا شہر دہن کی طرح سجا ہے۔ ہر گھر میں ایسا لگتا تھا کہ عاشقان رسول اپنے پیارے آقا ﷺ کی محبت میں سرشار ہیں۔ انہوں نے اپنوں کو تو ان کے آقا کے یوم ولادت کی خوشیوں میں شامل کیا ہی، لیکن ایک ایسی

تحریک بھی چلائی جو کہ ہم سب کے لیے عموماً عمل ہے۔ وہ یہ کہ برادران وطن کے درمیان سرکاری سیرت کا ماہ ربیع الاول میں بیان کرنا، اس کے لیے وہ بدایوں شریف کے تمام اسکولوں میں تشریف لے جاتے بلکہ ایسا جوان حوصلہ تھا کہ خالص RSS کے اسکولوں میں بھی مولویوں کا ٹولا لے کر مولوی محلے سے اچھے میاں صاحب کے چہیتے مولوی صاحب کا حقیقی معنی میں مولوی سپوت سیرت مبارکہ کی مشعل اٹھائے ہوئے ان تاریک خانوں میں پہنچا کرتا تھا جہاں کبھی کسی نے بھی سیرت مبارکہ کی روشنی پہنچانے کا تصور نہ کیا تھا۔ وہ ان اسکولوں کے طلبہ کو سرکاری سیرت بتاتے، ہندی میں اسلام کا تعارف تقسیم کرتے، مٹھائی، چاکلیٹ تقسیم کرتے۔ یہ انداز تھا اس حق کے مبلغ اسید الحق کا۔

تو کہاں رکنا حاضرِ مرضی کی آواز سے:

(مدرسہ قادریہ کی نفاذِ ثانیہ)

اسید میاں نے مدرسہ قادریہ کی نفاذِ ثانیہ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مدرسہ قادریہ کی تعلیم و تربیت اور نظم و نسق کو بہتر بنی نہیں بلکہ امتیازی بنانے کے لیے وہ آخری سانسوں تک کوشاں رہے۔ ان کے طلبہ کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت فرحت بخش اور سکون کے ماحول میں محو تعلیم ہیں۔ وہ اپنے طلبہ کو مختلف جہتوں سے بہتر بنانے کے لیے سعی فرماتے تھے۔ ایک دن فرمایا کہ ہمارے طلبہ بھی اخبارات اور ہندوستان کے تمام معروف جرائد کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ اپنے طلبہ کو زندگی کے کسی شعبہ میں محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ چاہے وہ کمپیوٹر کی تعلیم ہو، معلومات عامہ ہو، کھیل کود، صحت و ورزش کے معاملات ہوں۔ طلبہ پر بے حد شفقت و مہربان اور سب سے بڑی بات کہ انہیں اپنا اثاثہ سمجھتے تھے۔ ان کے مدرسے میں بیشتر اساتذہ ان کے شاگرد تھے۔ ہم کبھی کبھی ان سے کہتے کہ آپ تو اتنی کم عمری میں (استادِ اساتذہ) ہو گئے۔ تو بڑا سادہ سا جملہ ارشاد فرمایا کہ ”ارے صاحب چھوڑیے میں کہاں یہ اعتراف کرتے کہ میں واقعی بہت مطمئن ہوں کہ مجھے بے حد سمجھدار اور صاحب فہم اور محنت کرنے والے ساتھی ملے جو نہ صرف یہاں ملازمت کے تقاضے کے تحت کام کرتے ہیں، بلکہ مدرسہ کے معیار کو امتیازی بنانے کے لیے ہمدردت میرا بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ وہ مدرسے میں پابندی اوقات کا بہت خیال رکھتے تھے، جو آج اداروں میں سب سے کم اہمیت کا حامل

سمجھا جاتا ہے۔ لیکن علم بانٹنے کا یہ شوق بھی نرالا تھا کہ رات کے گیارہ بجے بھی فون کر دو معلوم ہوتا کہ شیخ صاحب مصروف تدریس ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور بات یاد آئی کہ وہ شہر بدایوں کے اسکولی طلبہ و طالبات کے لیے سرکمپ لگاتے اور تمام ضروری شرعی مسائل، مذہبی معلومات، عصری اور دینی تعلیم کا نفع بخش تعلق طلبہ اور طالبات کو سمجھاتے۔ آخری روز کسی بڑے عالم کے ساتھ عصری علوم کے اداروں سے کسی باصلاحیت اور مخلص استاد کو مدعو کرتے اور ان سے تربیتی کلمات کے ساتھ اسناد اور انعام تقسیم کرواتے تھے۔ کئی دفعہ اس موقع پر راقم الحروف کے ذریعے بھی ہماری مادرِ درس گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات مدرسہ قادریہ حاضر ہوئے اور اسید میاں اور ان کے کاموں سے بے حد متاثر ہو کر لوٹے۔ سرکمپ کے انعقاد سے ایک یہ بھی فائدہ ہوا کہ نوجوان طبقہ ان کے قریب آیا اور فلاحی اور دینی کاموں میں دلچسپی لینے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ”شانی سمیلن“ میں بدایوں حاضر ہوا تو پورے شہر کے نوجوان اتنے انہماک کے ساتھ اس پروگرام کے انعقاد میں لگے تھے کہ کہنا ہی کیا۔

اسکولی طلبہ کے علاوہ وہ ہندوستان بھر کے مدارس اسلامیہ کے طلبہ کو زوروارہ فراہم کر کر مدرسہ قادریہ میں بلاتے اور علمائے کرام اور دانشوران حضرات کے ذریعے ان کو فنی باتوں اور معلومات سے آشنائی کراتے جس سے ان نوجوان علما کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو، یہی وجہ ہے کہ اسید میاں کی رحلت سے نوجوان علما کا طبقہ ایک سکنتے کے عالم میں ہے۔

اسید میاں کو پڑھانے کا بے حد شوق تھا، بار بار ایسا ہوا کہ شب عرس قاقی یا عرس نوری کے بعد فوراً روٹنگی ہوگئی، رات کو تین یا چار بجے بدایوں پہنچے اور صبح فون آ گیا کہ صاحب خیریت سے پہنچ گئے اور درس گاہ میں بیٹھے پڑھا رہے ہیں۔ کبھی کبھی بے حد اعتماد کے ساتھ یہ فرماتے کہ ”صاحب اللہ کا بے حد شکر ہے کہ مدرسہ قادریہ میں چوکی دار سے لے کر جہنم تک میرے شاگرد اور میرے تربیت کردہ ہیں۔“ اور یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ انہوں نے تربیت ایسی کی ہے کہ مدرسہ قادریہ میں چلے جائے ذمہ دار نہ ہو لیکن ایسا لگے کہ انہیں کوئی دیکھنے یا خیریت پوچھنے والا نہیں ہے، مدرسہ میں کوئی شور شرابا نہیں، بے حد ادب کے

ساتھ سلام کلام کرتے ہوئے صاف سقرے لباس میں طالب علم ہیں گے جن کو دیکھ کر ایسا لگے گا کہ یہ لوگ صرف پڑھنے آئے ہیں۔ وہ اپنے مدرسے کے تعلیمی شیڈول کو بہت ہی منظم اور سنجیدہ طریقے سے چلاتے تھے اور اس میں انہوں نے کبھی کوئی کمپرومائز نہیں کیا۔ امتحان کے پرچے بنانے سے لے کر رزلٹ تک کے تمام مراحل میں خود کو پیش پیش رکھتے۔ تعلیمی معاملے میں پابندی اوقات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ادبی ثقافتی حائل کا انعقاد، کھیل کھود کے مقابلے، توسیعی خطبات غرض کہ ہر اس چیز کا اہتمام کرتے تھے جس سے طلبہ کی شخصیت اور کردار میں نکھار آئے اور ساتھ ہی اپنے سینئر طلبہ کو لکھنے کی طرف راغب کرنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ یہ ان کی تربیت کا ہی ثمرہ تھا کہ ماشاء اللہ مدرسہ قادریہ نے مولانا دشااد قادری، مولانا مجاہد قادری، مولانا عبدالعلیم مجیدی، مولانا خالد مجیدی، ماسٹر تنویر قادری، مولانا غلام اقبال قادری مجیدی، مولانا مشیر احمد قادری مجیدی، مولانا کاشف نہاد قادری مجیدی، مولانا رضوان قادری مجیدی، مولانا بدر عالم مجیدی وغیرہم جیسے اصحاب قلم پیدا کر دیے۔ ان میں سے کچھ حضرات تو ایسے ہیں جن سے مستقبل میں ہمیں بہت امیدیں ہیں۔ میں نے ان کے تمام شاگردوں کو بھی ان کا عاشق زار پایا۔ جب استاد شفقت اور پڑھانے میں ایماندار اور اپنے طلبہ کو اپنے جیسا بنانے کی نیت رکھنے والا ہو تو شاگرد بھی ساری زندگی اس کو اپنے دل میں زندہ رکھتے ہیں۔

بغداد شریف حاضری سے قبل فون آیا Thermodynamic کے اصول آپ کو معلوم ہیں؟ میں حیران ہوا کہ یہ کہاں سے ان کو شوق ہوا کہ اتنا سخت موضوع پوچھ رہے ہیں۔ خیر میں نے کچھ بات چیت کی اس پر کافی مطمئن ہوئے بیچ میں کچھ بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ میں نے اس کی ضرورت دریافت کی تو فرمایا کہ بھائی ایسا ہے کہ میں اپنے طلبہ کو ۵۰۰ توسیعی خطبوں کے ذریعے قرآن اور سائنس کے حوالے سے زمین کے بننے اور اس سے جڑے ہوئے بہت سے معاملات کے بارے میں بتا رہا ہوں کیونکہ اگر کوئی ان تخلیقات میں اللہ کی قدرت دیکھنا چاہے تو اس کو جواب دینے کے لیے ہمارے طلبہ کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے کہ وہ سامنے والے کو یہ سمجھا سکیں کہ جو کچھ بھی ہے وہ رب کائنات کے حکم سے ہے نہ کہ خود سے اور اس کے لیے ان کے بننے اور کام کرنے کا عمل

سائنسی علوم سے سمجھنا ضروری ہے۔

یہ سب سن کر بے حد اطمینان ہوا اور ذہن میں پھر عرفان صدیقی صاحب کا شعر آیا۔

فیصلہ کر کم و بیش تہہ دریا کی نہ سوچ
مسئلہ ڈوبنے کا ہے ابھر آنے کا نہیں

بجز مارہرہ مارہرہ عیدِ حج

اسید میاں صاحب کو اپنے پیر خانے اور اپنے مخدوم اعلیٰ حضور قبلہ جسم و جاں سیدنا شاہ ابوالفضل آل احمد اچھے میاں صاحب قدس سرہ سے غایت درجہ عشق تھا۔ ان کا اپنے مخدومان گرامی سے ملنے کا جواہر ہوتا، وہ خالصتاً ان کی اس عقیدت کی عکاسی کرتا تھا جو ان کو صاحب انہ کات کے آستانے اور قبلہ جسم و جاں حضور شمس مارہرہ سے تھی۔ حضرت امین ملت سے لے کر برادر عزیز محسن میاں تک وہ جس قدر نیاز مہندی اور خاندانی ادب کے ساتھ پیش آتے تھے وہ اوروں کے یہاں عنقا ہے اور غالباً یہ اس تربیت کا اثر ہے جو ان کو ان کے اجداد سے ودیعت ہوئی۔ حضور شمس مارہرہ قدس سرہ نے حضرت مولانا شاہ عین الحق عبدالجید صاحب قدس سرہ کو ۲۵ سال شرف رفاقت عطا فرمایا۔ محرم اسرار خاندان بنایا، انہیں برکاتی وراثتوں کا خزانہ دار بنایا، بڑی چاہتوں سے نوازا تو بدایوں والوں کی خاندان شمس مارہرہ سے یہ عقیدت و انسیت تو گھٹی میں ملی ہے، رگ و پے میں دوڑ رہی ہے، جس کا اثر ہم موجودہ حضرات میں بدرجہ اتم دیکھتے ہیں۔ میں نے اسید میاں کو برکاتیت اور مارہرہ دیت کے حوالے سے بہت ہی حساس پایا، اکثر نشستوں میں اعتراف کیا کرتے تھے کہ میں بہت بڑا برکاتی ہوں۔ نیز یہ کہ میری پڑھائی لکھائی مطالعہ سب اپنی جگہ ہیں شمس مارہرہ کی چوکھٹ دیکھ کر سب بھول جاتا ہوں۔ اکثر فرماتے تھے ”احمد بھائی! ہم جب مارہرہ آتے ہیں تو ساری تحقیق اور مطالعہ بدایوں رکھ کر آتے ہیں، ایک مرتبہ میں نے عرس نوری کے موقع پر خانقاہ میں ان کی آمد پر ان کو تلاش کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ کہاں رہ گئے تھے؟ میں آپ کے کھانے اور ٹھہرنے کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا، تو فرمایا کہ ”آپ یہاں ہماری پرواہ نہ کریں اور اپنے انتظامات کو دیکھیں، ہمیں مارہرہ شریف میں نہ کسی توجہ کی ضرورت ہے نہ ہی کسی حیثیت کی، نیز فرمایا کہ اگر ہم مارہرہ

میں بے حیثیت ہوں گے تبھی تو زمانے میں ہماری حیثیت ہوگی اور اگر مارہرہ مقدسہ میں حیثیت دکھائیں گے تو زمانے میں بے حیثیت کر دیے جائیں گے۔“ خانوادہ برکاتیہ ہے ان کا ادب صرف زبانی اعتراض کی حد تک نہیں تھا بلکہ پچھلے پانچ سات سالوں میں بار بار انہوں نے اپنے عمل سے مشائخ مارہرہ کے ساتھ اپنی عقیدت کا برملا ثبوت دیا۔ اپنی زندگی کے آخری حصوں میں چار کتب تذکرہ نوری، برکات مارہرہ، تذکرہ شمس مارہرہ، آداب السالکین وغیرہ خانوادہ برکات کے حوالے سے شائع فرمائیں، ان کتب کے شائع ہونے کے مراحل میں بے حد خوشی کا اظہار فرماتے، بڑے بڑے اور لمبے لمبے سلاموں کے ساتھ فون پر گفتگو ہوتی، ایک ایک چیز کا جزوی و تفصیلی بیان فرماتے۔ کبھی کوئی ایسا انکشاف کسی مکتوب یا مخطوطے کے حوالے سے ہوتا جس میں بدایوں اور مارہرہ کے عمیق رشتے کا بیان ہوتا تو خوشیاں دوگنی ہو جاتیں۔ ایک کام بغداد شریف کی حاضری سے قبل شروع کیا تھا ”وہ اپنے اکابر کے نام دیگر مشائخ اور علمائے کرام کے خطوط کی تدوین“ اس دوران شیخ صاحب کی خوشیوں کو ہم نے پام عروج پر پایا، ایک ایک خط بزرگان مارہرہ کا فون پر پڑھ کر سن کر کرتے تھے اور دائم کومیل بھی کیا کرتے تھے۔ کئی ایسے مواقع آئے کہ ان سے کسی بات پر کوئی علمی حوالہ مانگا اور کہنے ہی بھر کی دیر ہوئی کہ ای میل پر سلام کی تحریر کے ساتھ مقصود مواد فراہم ہو گیا۔ ”اہل سنت کی آواز“ کے لیے پچھلے کچھ سالوں سے مستقل طور پر جامع اور علمی مضمون ارسال فرما رہے تھے۔ ہمارے قارئین بھی اسید میاں کو اور ان کی قلمی نگارشات کو بے حد پسند کرتے تھے، کیونکہ ان کی تحریر میں کبھی کسی کی دل آزاری، اختلاف کی بو، بیجا تفاخر کا اظہار، مشکل اصطلاحات، الفاظ کا گھماؤ وغیرہ نہیں ہوتا تھا، سیدھی سیدھی علمی باتیں، بے حد مستند حوالہ جات کے ساتھ اور ساتھ ہی تحریر میں جمالیاتی حسن کی آمیزش بھی بقدر ضرورت (جو کم و بیش ان کے ہر مضمون میں پائی جاتی ہے) موجود رہتی ہے۔

مجھے ان کی عقیدت کا ایک اور واقعہ یاد آیا، جب وہ پہلی مرتبہ عرس قاسمی شریف کے موقع پر تشریف لائے اور حویلی شریف سجادگی میں رسم خرقة پوشی میں شریک تھے۔ خال محترم مرشد گرامی حضور امین ملت جب ملبوسات بزرگان دین زیب تن فرما کر دیدار عام کے لیے اللہ اللہ کے فلک بوس نعروں کے درمیان جلوہ افروز ہوئے، اس وقت میری نظر

شیخ صاحب پر گئی، وہ زار و قطار رو رہے تھے اور حضرت کے چہرے کو نکلے جاتے تھے اور ان کی یہی کیفیت راقم نے خال محترم حضرت رفیق ملت سید نجیب میاں صاحب کی رسم سجادگی کے موقع پر دیکھی کہ جب حضرت شرف ملت ان کو عمامہ شریف باندھ رہے تھے تب بھی شیخ صاحب زار و قطار رو رہے تھے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو ان کے سچے برکاتی ہونے پر دال ہیں۔ میں تو یہ بڑے وثوق سے کہوں گا کہ مارہرہ اسید میاں کی کمزوری تھی۔

حضور شمس مارہرہ حضور سیدنا آل احمد اچھے میاں صاحب سے ان کی محبت اور عقیدت کا تو عالم ہی نہ لانا تھا۔ بس حضور اچھے صاحب ہی کی باتیں تذکروں میں رہا کرتی تھیں۔ گزشتہ سال عرس قادری میں شمس مارہرہ کا نفرنس منعقد کی اور بہت طویل اور جذباتی خطاب فرمایا جس میں بہت سے موضوعات شامل تھے۔ اس تقریر میں شمس مارہرہ قدس سرہ کو تادیب یاد کیا، فرمانے لگے کہ ”یہ شمس مارہرہ کا اشارہ ہی تو ہے کہ ان کے عرس دو سو سالہ کے موقع پر ان کے نام کی پہلی کانفرنس مولوی عبد المجید بدایونی کے خادم کریں اور دو سو سال میں پہلی ان کی مطبوعہ سوانح کی اشاعت بھی ان کے مولوی صاحب کی گلی میں جھاڑ دینے والا خادم اسید الحق کرے گا۔“ اور پھر ایک نہایت ہی جذبول سے بھرا جملہ کہا ”ہمارے یہاں اس کو نے سے اس کو نے تک باب مجیدی سے لے کر دیوان خانے اور وہاں سے ننگر خانے کی آخری دیوار تک جو کچھ ہے وہ حضرت اچھے میاں کے تلوؤں کا صدقہ ہے۔“ یہ تو ایک دیوانے اور مستانے کی صدا تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ مشائخ دعا تو فرماتے ہی ہیں اور اپنے فیضان تصرف سے حصہ بھی عطا فرماتے ہیں۔ لیکن دعائیں لگتی بھی انہی کو ہیں جو محنت کرتے ہیں اور ان تمام کاموں اور ترقیوں کے پیچھے دعاؤں کے ساتھ ساتھ اسید میاں کی انتھک محنت کا بھی کلیدی کردار ہے۔ وہ مرشد گرامی حضرت امین ملت کے حوالے سے جب بھی گفتگو فرماتے تو ان کی طبیعت کے بارے میں یہ جملہ ضرور کہتے کہ ”مجھے حضرت کو سست دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے وہ خوش رہتے ہیں اور طبیعت کی بحالی کے ساتھ ہوتے ہیں تو پوری محفل ہشاش بشاش رہتی ہے“ وہ اور مولانا خوشتر صاحب ایک اور بات مشترکہ طور پر کہا کرتے تھے کہ ”پیروں میں خطیب ہم نے حضرت امین ملت ہی کو پایا۔“

خال محترم حضرت اشرف میاں صاحب کے وہ بڑے مباحثوں میں سے تھے، بلکہ یوں کہوں گا کہ ان کی شخصیت کے دیوانے تھے۔ جھ سے بار بار کہا کرتے تھے کہ ”میں نے ان کی ذات سے بہت کچھ سیکھا اور شرف ملت پر جب فقیر لکھے گا تب آپ دیکھیں گا کہ کیسے کیسے نکلے ان کی شخصیت کی چمک دمک، گفتگو اور ان کے عمل کے حوالے سے اپنی تحریر میں اٹھ اٹھ گا۔“

البرکات علوم اسلامیہ کے ادارے کے لیے ایک مشاورتی میٹنگ میں وہ البرکات آئے۔ بہت سارے اہم مشورے دیے اور خود یہ ذمہ داری لی کہ میں ادارے کے مقابلہ جاتی امتحان کا پرچہ اور طلبہ کو منتخب کرنے کا طریقہ کار اور اس کے علاوہ نصاب کے کچھ اور ضروری حصے تیار کروں گا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بے حد محنت کی اور اگر آج وہ باحیات ہوتے تو یقیناً اس ادارے کا انٹرویو لینے والوں میں اہم کردار ادا کرتے۔

اگر اسید میاں مارہرہ والوں سے محبت کرتے تھے تو مارہرہ والے بھی اسید میاں کو کم نہیں چاہتے ہیں اور شاید یہ ان کی سعادت مندی اور محبت ہی کی وجہ تھی کہ ان کی شہادت کی خبر سے پورا خانوادہ برکات غم میں ڈوب گیا۔ تمام برکاتی برادری سو گوار ہو گئی، ای میل، فیس بک اور واٹس اپ پر ہمارے تمام برکاتی احباب و متوسلین ٹپ ٹپ کر اسید میاں کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔ کافی دنوں تک ہم سب صرف اسید میاں کو یاد کرتے رہے اور ان کی محبتوں اور سعادت مند یوں کا تذکرہ کرتے رہے اور شاید یہ بھی پہلا ہی موقع ہو کہ کسی کی تعزیت میں پورا خانوادہ بدایوں گیا ہو۔ حضرت اقدس سالم میاں صاحب قبلہ کی بغداد شریف سے واپسی پر حضرت امین ملت، حضرت شرف ملت، حضرت رفیق ملت، حضرت افضل میاں صاحب، برادر عزیز سید محمد امان، سید محمد عثمان، سید حسن حیدر سلمہ، ڈاکٹر نسیم عثمان صدیقی صاحب، برادر محمد اکبر قادری اور راقم السطور بدایوں شریف حاضر ہوئے۔ اسٹے غم اور صدمے کے ماحول میں بھی ذمہ داران خانقاہ قادریہ نے فرزند ان شمس مارہرہ کے ساتھ نیاز مندی اور دیرینہ روایتوں کی پاسداری کا جو نمونہ پیش کیا وہ ان حضرات کا موروثی و طبرہ ہے۔

حضرت امین ملت دام ظلہ نے بیخ آیت اور شجرہ برکاتیہ پڑھ کر اسید میاں علیہ الرحمۃ والرضوان کو ایصال ثواب کیا اور رقت آمیز طریقے

سے دعائے مغفرت فرمائی۔ حضرت شرف ملت نے خانوادہ برکات کی طرف سے حضرت سالم میاں صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں تعزیتی کلمات پیش کیے اور دو اشعار ایسے اسید میاں کی رحلت کے حوالے سے پڑھے کہ حاضرین صبر نہ کر سکے اور فضا میں سسکیاں ہی تھوڑی دیر گردش کرتی رہیں۔ یہ کیسا دل دہلائے والا منظر تھا، اس کی گواہی وہی لوگ دے سکتے ہیں جو وہاں موجود تھے۔ حضرت اقدس سالم میاں صاحب اپنے اچھے صاحب کے فرزندوں کو دیکھ کر پرلا فرمانے لگے کہ مجھے آپ حضرات کو دیکھ کر یوں لگ رہا ہے کہ جیسے حضور شمس مارہرہ ہی خود کرم فرمانے چلے آئے ہوں۔ اب اس مادی دنیا میں جن لوگوں میں یہ نیاز مندی اور اعتراف قائم ہے انہی سے طریقت کے اصول زندہ ہیں ورنہ تو سب اپنی اپنی جگہ خود کفیل اور سمجھ دار ہو چکے ہیں۔

اب اسے دیکھو چرخ دیار کے

اسید میاں ایک قدیم خانقاہ کے ولی عہد تھے، لیکن ان میں پیرزادوں والی تزک بھڑک، نخرے، ناز و نعم کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔ میں نے متعدد دفعہ دیکھا کہ صحت یابی کروانے سے کچھ ابھن میں آجاتے اور ہاتھ تیزی سے پیچھے کھینچ لیتے۔ دعوتوں، دوروں اور شادی کی تقریبات میں شمولیت سے تو تقریباً پرہیز کرتے تھے، میں نے کہا کہ تقریبات میں تو ہوا یا کریں، فرمانے لگے میرا وقت بہت برباد ہوتا ہے اور کھانا ویسے بھی کم اور سادہ کھانے کا شوقین ہوں۔ ہمارے گھر سے کسی نہ کسی کی شمولیت ہو جائے کافی ہے۔

ان کی رحلت کے بعد ہر وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ واقعی ہم اپنے کیا چیز کھودی۔ کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اسید میاں کو بے حد یاد کرتا ہوں۔ ان سے گفتگو، ان کے ساتھ ہنس، علمی و دینی مذاکرات، فی الہدیہ شعر و شاعری کی باتیں اور خاص طور سے پرانی باتیں یاد کرتا۔ اسید میاں یادداشت کے بڑے دھنی تھے، نہ جانے کب کب کی کہیں کہاں کی باتیں ان کو یاد آتیں۔ ہماری اور ان کی اکثر باتیں اس زبان سے کی ہو کر رہیں کہ جب ہم اہل سال اور وہ بزرگوں کے ہوا کرتے ہوں گے، لیکن لگتا ایسا تھا کہ جیسے باپ کی گھٹلی پر رکھ کر ہماری بات چیت چل رہی ہو۔ وہ پرانی پرانی رسومات کا تذکرہ بہت مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔ وہ اس قسم کی گفتگو شروع کرنے کے

لیے مصرعہ دیتے اور میں پوری پوری غزل کہتا تھا۔ کسی بھی چیز کی منظر کشی میں وہ مہارت ہی نہیں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور اس سلسلے میں رانم کو بھی داد دیا کرتے۔ اکثر اوقات مختلف دوروں اور اجلاس کے بعد ہم لوگ تادیر آنکھوں دیکھا حال ایک دوسرے کو نشر کیا کرتے تھے۔

بعد اوشرف جانے سے قبل حضرت شرف ملت مدظلہ العالی کے نام ۳۵ صفحے کا ایک خط لکھا۔ ان کو اس سال کرنے سے قبل مجھے ای میل کر کے فون کیا کہ آپ اس کو فوراً پڑھیں اور بتائیے کہ کیسا خط ہے۔ مجھ سے اس خط کے ایک ایک عنوان اور پیرا گراف پر طویل گفتگو کی اور پھر شرف ملت کی خدمت میں اس سال کیا۔ کہنے لگے لوٹ کر آؤ، اب کب کب فرصت ہے اس پر بات ہوگی اور پھر حضرت امین ملت کی خدمت میں پیش کر دیں گا۔ ہم کو ہرگز یہ یگانہ نہ تھا کہ اسید میاں اپنی طرح ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ بعد اوشرف جانے سے قبل میری ان سے بہت باتیں ہوئیں اور بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ روانگی سے پہلے مجھ سے فون کیا کہ اپنے لوگ بارگاہ غوثیہ میں حاضر ہوتے ہیں تو قصیدہ غوثیہ وغیرہ مناجات پڑھتے ہیں، ہم اس بار بارگاہ غوثیہ میں بیٹھ کر ان کے وہ نصاب تلاوت کریں گے، جہاں پہنچے صابز ان سے کو عنایت فرمائے تھے۔ پھر دوسرے روز فون آیا کہ خدا ایک اقدیر سماعت کیجئے کہ کہیے کہیے روکنے کھڑے رہاں، خاص طور پر ان کے لیے جو صاحب اقامت اور مسند ارشاد کا خود کو حامل سمجھتے ہیں۔

بعد اوشرف جانے کے بعد کچھ دن تک گفتگو میں توقف رہا تو میں حسبِ حاجت دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ بارگاہ غوثیہ میں گئے، کبھی قیس یک کے بیچ یا کبھی ان کے بیچ دیکھے۔ اپنا بعد اوشرف جانے کا کمرہ یاد اور آخر میں لکھا کہ آپ کی بہت یاد آ رہی ہے، میں نے جو اس میں شعر لکھا کہ

آنگھوں کو انتظار کے لچاوت ہوئے کہ

فرمانے لگے جناب میں ہی فون کر رہا ہوں اور دیا رغوث سے آپ کو فون کر رہا ہوں، خبریت بتائیے۔ خوب باتیں کیں، میں نے کہا کہ بھئی آپ نے البرکات علوم اسلامیہ کے نصاب کا ایک بڑا حصہ تیار کیا تھا اب اس کو شروع کرنا ہے تو دو ایک دن کے لیے یہاں علی گڑھ رہنے آجائیے تاکہ اس کو Final Shape دے دیں۔ بڑے انبساط سے بولے ”ارے صاحب! خادموں کی طرح حاضر ہو جائیں گے“ پھر اچانک کہا کہ ”آپ حضرت امان میاں صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہہ دیجیے گا“ اس وقت بھی ہم لوگوں نے خوب ہنس کر باتیں کی۔ بس یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ ان سے میری آخری بات چیت ہے۔ ان کی ہندوستان آمد کا بے صبری سے انتظار تھا کہ واپس آئیں گے تو باتوں کا سارا کوہ پورا کریں گے، لیکن بس وہ انتظار انتظار ہی رہا اور اس کے بدلے یہ روح فرسا خبر ملی کہ اسید میاں تو ہمیشہ کے لیے انتظار کا خانہ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بقول حضرت شرف ملت کے ”کچھ ساکت کر رہ گیا۔“ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، کبھی تنہا رو لیتے تھے، کبھی ان کے اور اپنے مشترکہ دوستوں سے بات کر کے رو لیتے تھے۔ آج بھی یقین نہیں ہوتا کہ ہمارے بھیا دنیا میں نہیں ہیں۔ آج بھی ان کو یاد کر کے اکثر آنکھیں پھر آتی ہیں، ابھی بھی وہ نظروں اور خیالوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ بارگاہ غوثیت سے کیسی سچی عقیدت تھی کہ سراپا نذرانہ ہی بن کر اس بارگاہ میں پیش ہو گئے۔ سرکار غوث اعظم کو بھی اپنے اس چہیتے اور مورٹی غلام سے ایسی الفت کی کہ اپنے یہاں بلا میں اور اپنے رب سے اس کو اپنے دربار کے لیے ہمیشہ کے لیے مانگ لیں اور اپنے شہزادوں کے درمیان ابدی آرام گاہ عطا فرمادیں۔ یہ سب منشاء ایزدی ہے اور ہم سب قانون

بقیہ عربی محاورات مع ترجمہ و تفسیر: ایک مطالعہ: بلکہ اساتذہ بھی مستفیض ہو سکیں گے۔ خصوصاً ہندو پاک کے عربی مدارس اور جامعات کے عربی شعبہ جات میں زبان و بیان کے نکات اور ترجمے کے آداب و طریقہ کار کی تفہیم و تدبیر کے لیے اس کتاب کو شامل نصاب کیا جانا چاہیے۔ ممکن ہے میری اس تجویز کو بعض اصحاب حسن ظن پر محمول کریں، ان سے میری گزارش ہوگی کہ مرحوم مصنف نے قرآن وحدیث، قدیم وجدید عربی شعر و ادب نیز انگریزی اور اردو ادب، اور بول چال سے، ماخوذ محاورات اور مجازی معنوں کے حامل مظہرات کی مثالیں دے کر اور ان کی تفہیم یا ترجمے میں پیش آنے والی دشواریوں اور سرزد ہونے والی لغزشوں کی نشان دہی کرتے ہوئے جو عمومی گفتگو کی ہے اس کا بالائتجاہ مطالعہ کریں اور اس کے بعد فیصلہ صادر فرمائیں۔ □□□

اس کے بعد فیصلہ صادر فرمائیں۔ □□□

قدرت کے تابع ہیں، وہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ باقی رہنے والا نام بس اللہ کا ہی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں اسید میاں کے مرقد کو اپنی رحمتوں کے پھولوں سے بھر دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ ہم سب خانوادہ قادریہ کے اس غم میں برابر کے شریک و سہم ہیں اور اسید میاں کا پر سار صرف ان کے اہل خاندان ہی کو نہیں بلکہ پوری اہل سنت و جماعت کو پیش کرتے ہیں کہ ہماری صف سے ایک ایسا سپاہی چلا گیا جو اس جماعت کے دفاع کے لیے داہے درے قدم قدم چلے گئے تیار رہتا تھا۔ رب کریم خانقاہ قادریہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور ان کے برادران سے ان کے والد ماجد مدظلہ العالی کی سرپرستی میں دین و سنیت کے وہ سب کام لے جو عالم ربانی، شہید راہ بغداد، شمس مارہرہ کے عاشق صادق، مجیدی خاندان کے چشم و چراغ، وارث علوم فضل رسول، جگر گوشہ تاج الفحول، در شہوار صاحب اقتدار، مظہر عاشق رسول، اپنے ابا حضرت کے چہیتے بابا، بھیا اور شیخ صاحب، عطیف میاں اور عزام میاں کے مولوی بھائی یعنی حضرت علامہ الحاج اسید الحق محمد عاصم القادری عثمانی برکاتی از ہری ادھورے چھوڑ کر ہم سب کو خیر آباد کہتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو گئے ہیں۔ آمین

مضمون کے آخر میں یہ شعر ان کی حیات و ممات کی نظر کر کے قلم رکھتا ہوں:

ورق ورق سوزن قلم سے قبائے جاں اپنی سی رہے ہیں
نہ مار پائے گی موت ہم کو کہ ہم کتابوں میں جی رہے ہیں

□□□

□□□

دس سالہ عملی زندگی کے چند یادگار شب و روز

مولانا شیخ اسحاق محمد عامر قادری کی ڈائری کے حوالے سے ان کی علمی و عملی زندگی کے چند یادگار لمحات

استاذ گرامی، عالم ربانی علامہ شیخ اسحاق محمد عامر قادری بدایونی علیہ الرحمہ نے ۲۰۰۴ء میں جامعۃ الزہرہ سے واپسی کے بعد اپنی علمی و عملی زندگی کا باضابطہ آغاز کیا۔ ۲۰۰۴ء سے ۲۰۱۴ء تک ان کی دس سالہ زندگی یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی سچی تصویر تھی۔ ان دس سالوں میں انہوں نے تعلیم و تربیت، تنظیم و منصوبہ بندی، تحقیق و تصنیف اور تفکیر و تعمیل کے حوالے سے جو تاریخی کام کیا ایک زمانہ اس کا معترف ہے۔ استاذ گرامی کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو انہیں معاصرین سے ممتاز کرتا ہے، وہ ہے ان کی زندگی کا حسن نظم۔ ان کی شخصیت کے داخلی و خارجی تمام عناصر میں حسن نظم و ترتیب کا نہایت خوب صورت اور باسیقہ عکس جھلکتا ہے، جس کا ایک زندہ ثبوت ان کی ڈائریز بھی ہیں۔ شیخ صاحب کی ڈائریز پڑھنے سے ان کی شخصیت کی وہ بہت سی داخلی جہات سامنے آتی ہیں جو عام نگاہوں سے مخفی ہیں۔ ان کی ڈائریز اس لائق ہیں کہ انہیں باضابطہ طور سے علاحدہ شائع کیا جائے۔ ان کی ڈائریز پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس محقق اور منتظم اسید الحق کو دنیا نے دیکھا ہے اس سے درجوں بڑے مفکر اور مصلح اسید الحق کو کسی نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ایک اور بڑی ممتاز خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی کے اکثر علمی و تحقیقی واقعات، سیمینار، سپوزیم اور کانفرنسیز میں شرکت کے واقعات، کانفرنسیز کے موضوعات، ان کے اہم شرکا اور ان میں پیش کردہ اپنے مقالے یا موضوع خطاب کو اختصار و جامعیت سے ایک ڈائری میں لکھا کرتے تھے۔ وہ اپنے علمی سفر حیات کی یادگار منزلوں کو کس طرح منظم رکھتے تھے، اس حوالے سے بھی ان کی شخصیت اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتی ہے۔ ذیل میں ان کی ڈائری کے حوالے سے تاریخی ترتیب کے ساتھ ان کی دس سالہ عملی زندگی کے اہم واقعات قلم بند کیے جاتے ہیں۔ یہاں ان جلسوں یا پروگراموں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو شہر بدایوں یا اس کے مضافات میں خانقاہ عالیہ قادریہ یا اس کے ذیلی اداروں کے زیر اہتمام ہوتے تھے، اگرچہ ان کا ریکارڈ بھی ان کی اس ڈائری میں موجود ہے۔ البتہ جو ریکارڈ یا سمر کلاسیز بدایوں میں منعقد کیے جاتے تھے ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

اس ڈائری کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے کہ:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

نیز اسی کے نیچے مرقوم ہے:

شعارنا الوحيد الی الاسلام من جدید

اب تاریخی ترتیب کے ساتھ اہم واقعات نذر قارئین ہیں۔

۲۰۰۴ء

۱۵ مارچ ۲۰۰۴ء کو ممبئی یونیورسٹی شعبہ عربی کے زیر اہتمام ”ابو الریحان البیرونی کی حیات و خدمات“ پر دوروزہ سیمینار ہوا جس میں پروفیسر مہدی الحق، پروفیسر پرویز ازگانی (تہران یونیورسٹی، ایران)، اور ڈاکٹر محمود الرحمن (سابق وائس چانسلر، علی گڑھ) شریک تھے۔ حضرت شیخ صاحب

نے ”ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی“ کے عنوان سے ابو الریحان البیرونی پر مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ بعد میں رسالہ ماہ نامہ مظہر حق بدایوں، جام نور دہلی اور مفت روزہ اصول پونہ میں شائع ہوا۔

۲۰۰۵ء

۳۰ جنوری ۲۰۰۵ء کو رورٹی انٹرنیشنل کے زیر اہتمام کل مذاہب اجلاس (سرودھرم سیمینار)، مہمان خصوصی، پندھاری پو دو (ڈی ایم بدایوں) بمقام میونسپل پارک، بدایوں

• ضیاعی خاں اشرفی کی حیات و خدمات پر منعقدہ سیمینار میں شرکت۔ بمقام نئی سرائے بدایوں۔

۲۳ تا ۲۹ جولائی ۲۰۰۵ء کو حضرت شیخ صاحب، حضرت مولانا خوشتر نورانی کے ہمراہ بنارس، بھدوی، گھوٹی، فیض آباد اور مبارک پور کے دورے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں جامعہ اشرفیہ مبارک پور، جامعہ حمیدیہ بنارس، دارالعلوم ضیاء البیان بنارس، دارالعلوم بھدوی، دارالعلوم امجدیہ گھوٹی اور مدرسہ شمس العلوم کے طلبہ سے خطاب بھی فرمایا۔

• ۲۸ نومبر ۲۰۰۵ء کو اسبلی حال، اعظم کیمپس پونہ میں ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں حضرت شیخ صاحب نے ”بنیادی انسانی حقوق اور اسلام“ اور ”ذکر الہی اور اطمینان قلب“ کے عنوان پر لیکچر دیا۔

۲۰۰۶ء

• ۲۵ مارچ ۲۰۰۶ء کو نیشنل اسلامک فاؤنڈیشن، بمقام اسلامی جم خانہ کلب ممبئی کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام میں حضرت شیخ صاحب نے ”اسلام، جہاد اور آئینہ“ کے عنوان پر لیکچر دیا۔ اس میں صدارت تاج دار اہل سنت حضرت اشرف عبدالحمد محمد سالم القادری کی رہی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے کلیان جی ساؤلا اور ڈاکٹر فرانس سوامی نے شرکت کی۔

• بمقام جامعہ صوفیہ کچھوچھو شریف میں ۲۵ مارچ اور ۲۶ فروری ۲۰۰۶ء کو صوفی فاؤنڈیشن کے زیر انصرام ”صوفی سپوزیم“ میں حضرت شیخ صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔ اس سپوزیم میں حضرت ڈاکٹر شمیم احمد ممبئی (سجادہ نشین خانقاہ معصیہ، پٹنہ)، فیض الاقطاب (انگلینڈ)، ڈاکٹر امین اشرف (علی گڑھ) اور پروفیسر مسعود انور علوی کا کوروی (علی گڑھ) سے ملاقات بھی رہی۔

• ۳۰ جون ۲۰۰۶ء کو دارالعلوم علمیہ، حمہ اشاہی (بستی) کے سالانہ تعلیمی مقابلہ برائے طلبہ میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشتر نورانی نے بہ حیثیت فیصل شرکت فرمائی۔

• ۵ جون ۲۰۰۶ء کو حضرت شیخ صاحب نے مرکز تربیت افتاء اوجھاسنج، بستی کا دورہ فرمایا۔

• ۶ جون ۲۰۰۶ء کو دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف میں مجلس العلوی نے ”شعیب الاولیاء النعمی مقابلہ“ کا انعقاد کیا جس میں توسیعی خطبات حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشتر نورانی نے پیش کیے۔

• ۶ اکتوبر ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۶ء کو اعظم کیمپس پونہ کے زیر اہتمام منعقدہ اجلاس میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشتر نورانی نے شرکت کی اور توسیعی خطبات پیش کیے۔ اس میں ۶ اکتوبر کو حضرت شیخ صاحب نے ”اسلام اور خدمت خلق“، ۷ اکتوبر کو مولانا خوشتر نورانی نے ”طلاق کا اسلامی تصور“ اور ۹ اکتوبر کو حضرت شیخ صاحب نے ”توبہ“ کے موضوع پر خطاب کیا۔

• ۶ نومبر ۲۰۰۶ء کو حضرت شیخ صاحب جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی کے داغہ امتحان میں بحیثیت ممتحن شرکت فرمائی۔ اس میں ان کے ساتھ مولانا خوشتر نورانی بھی شریک رہے۔

• ۱۹ دسمبر ۲۰۰۶ء کو حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشتر نورانی دارالعلوم وارثیہ، لکھنؤ تشریف لے گئے اور توسیعی خطبہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت حضرت سید محمد اختر میاں چشتی مودودی (سجادہ نشین آستانہ صدیقیہ، پھولپور شریف) نے فرمائی۔

۱۲ نومبر ۲۰۰۶ء کو حضرت شیخ صاحب بمعیت مولانا خوشنورانی عرس قاسمی کے ضمن میں منعقدہ سیمینار بموقع عرس قاسمی میں شرکت کے لیے مارہرہ شریف حاضر ہوئے اور ”تہذیبوں کی کشاکش، دنیا کا مستقبل اور امت اسلامیہ“ کے موضوع پر مقالہ بھی پیش کیا۔

۲۰۰۷ء

● خانقاہ عابدیہ قادریہ بدایوں شریف کے زیر اہتم ۸/۱۱ تا ۱۱/۱۱ فروری ۲۰۰۷ء کو ”مقابلہ علوم حدیث“ منعقد کیا گیا جس میں حضرت شیخ صاحب نے متعدد خطبات پیش کیے۔ ۱۱/۱۱ فروری کو تقسیم انعامات کے لیے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (کمر نیکس کشنر، دہلی) تشریف لائے۔

● ۲۶/۱۱ اپریل ۲۰۰۷ء کو بمقام ناسک ”جشن غوث اعظم“ میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشنورانی تشریف لے گئے۔ اس اجلاس میں حضرت سید سبطین حیدر قادری برکاتی (مارہرہ شریف)، حضرت سید علی اشرف (صاحبزادہ سرکار کلاں کچھوچھو شریف)، الحاج سعید نوری اور مولانا عبید اللہ خان اعظمی بھی شریک تھے۔ اگلے دن ۲۷/۱۱ اپریل ۲۰۰۷ء کو حضرت شیخ صاحب نے مفت آئی کیپ کا افتتاح فرمایا جس میں پولس کشنر ناسک اور مسر شہر ناسک بھی موجود تھے۔

● ۳۰ مئی ۲۰۰۷ء کو دارالعلوم سلطنت الہند، فتح پور شیواجی، راجستھان میں ”سرکار مدینہ کانفرنس“ میں حضرت شیخ صاحب نے شرکت فرمائی۔ اس کانفرنس میں مولانا خوشنورانی، علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری، قاری صغیر احمد جوگن پوری، مفتی شفیق احمد شریفی، مفتی شیر محمد (راجستھان) اور مولانا محمد عمر نورانی بھی شریک تھے۔

● ۱۱ مئی ۲۰۰۷ء کو بمقام جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں ایک نصابی میٹنگ رکھی گئی، جس میں حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی، مولانا نعمان ازہری، مولانا ڈاکٹر سجاد احمد مصباحی اور مولانا انوار احمد بغدادی بھی موجود تھے۔

● دارالعلوم فیضان اشرف ناگور، راجستھان میں ۱۹ مئی ۲۰۰۷ء کو تحریری و تقریری مقابلے میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشنورانی نے شرکت کی اور توسیعی خطبات پیش کیے۔

● ۲۷ جون ۲۰۰۷ء کو جامعہ صدیہ پھونڈ شریف کے ایک تربیتی کیمپ کے اختتامی اجلاس میں حضرت شیخ صاحب نے شرکت فرمائی اور خطاب بھی فرمایا، نیز اسی سفر میں ۵ جون ۲۰۰۷ء کو جامعہ صدیہ کے طلبہ سے بھی ”علوم حدیث“ کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

● ۱۷ جون ۲۰۰۷ء کو حضرت شیخ صاحب بمعیت مولانا خوشنورانی تھیں ناڈو پنچنے اور جامعہ غوث الوری کے افتتاح کی تقریب میں خطاب فرمایا۔ اس میں مولانا خوشنورانی (باندہ) بھی شریک تھے۔ اسی سفر میں ۱۸ جون ۲۰۰۷ء کو بمقام آثار شریف خانقاہ تھوڑ میں جلسہ استقبالیہ ہوا جس میں حضرت شیخ صاحب کو سپاس نامہ اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹ جون ۲۰۰۷ء کو خانقاہ قادریہ شطریہ بمقام کٹی میں جلسہ استقبالیہ واعزاز یہ میں شرکت فرمائی۔

● ۳۰ اور ۳۱ جولائی ۲۰۰۷ء کو حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی کے ہمراہ عرس محدث اعظم ہند، کچھوچھو شریف تشریف لے گئے۔ اسی موقع پر جامع اشرف میں استقبال ہوا۔ اس سفر میں شیخ الاسلام حضرت سید محمد مدنی میاں اشرفی، حضرت سید محمد ہاشمی میاں اشرفی، حضرت سید اظہار اشرف اشرفی البجلیانی، حضرت سید حسن عسکری میاں اشرفی، حضرت سید نورانی میاں اشرفی، حضرت سید احسن میاں اشرفی، حضرت سید قاسم اشرفی اشرفی، حضرت سید غوثی تھان اشرفی، حضرت سید تویر میاں اشرفی و دیگر حضرات سے ملاقات ہوئی۔

● ۳ ستمبر ۲۰۰۷ء کو مدرسہ جمید یہ اظہار العلوم، رامپور، یو پی کے جلسہ دستار فضیلت میں حضرت شیخ صاحب تشریف لے گئے۔ اس میں مولانا محمد جمعی، مولانا فاضل اطہر اشرفی، در حضرت مفتی محبوب علی خاں وجہی (شیخ الحدیث مدرسہ فرقانیہ، رامپور) بھی موجود تھے۔

● ۱۰ نومبر ۲۰۰۷ء کو دارالعلوم دارشیعہ تھوڑ میں مولانا یسین اختر مصباحی کی زیر صدارت ”علامہ فضل حق خیر آبادی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء“

پر سیمینار ہوا۔ اس سیمینار میں شیخ صاحب نے شرکت فرمائی۔

● دیگر شرکا: حضرت سید محمد اختر میاں چشتی مودودی (سجادہ نشین آستانہ عالیہ صدیہ پھونڈ شریف)، بحر العلوم مفتی عبدالحق اعظمی گھوسی، مولانا خوشنورانی، مولانا ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی، ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، مولانا ادریس ہتوتی، قاری مظہر، مولانا غلام عبدالقدوس دہلوی (براؤن شریف) اور ڈاکٹر خجے سنگھ (سابق مرکزی وزیر)۔

● ۱۶/۱۱ نومبر ۲۰۰۷ء کو عرس قاسمی مارہرہ شریف میں حاضری ہوئی۔ ۲۶ نومبر کی شب پروفیسر ابو الحسن حق کی صدارت میں مشاعرہ ہوا، جس میں حضرت شیخ صاحب نے ”خمت شب میں اچانک دل تیرہ چمکا“ نظم پیش کی۔ ۱۷ نومبر کو سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، عجیب کی حیثیت سے اس پروگرام میں حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی، مولانا یسین اختر مصباحی (دارالقلم، دہلی) اور مفتی نظام الدین مصباحی (صدر مفتی الجامعۃ الاشرفیہ) موجود تھے۔

۲۰۰۸ء

● یکم جنوری ۲۰۰۸ء کو ماہ نامہ جام نور کے آفس میں ”میڈیا سینٹر“ کی پہلی میٹنگ شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (انکم نیکس کشنر، دہلی) کے زیر صدارت منعقد ہوئی، جس میں حضرت شیخ صاحب کے علاوہ مولانا خوشنورانی، ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، ڈاکٹر مظہر سید، مولانا ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی (اسسٹنٹ پروفیسر پریزیڈنسی یونیورسٹی، کوکاتا)، مولانا ڈیویشن احمد مصباحی (استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں الہ آباد) بھی شریک تھے۔

● ۹ مارچ ۲۰۰۸ء کو امین ملت حضرت سید محمد امین میاں قادری برکاتی (سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف) کے زیر سرپرستی، شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (انکم نیکس کشنر دہلی) کے زیر صدارت اور ماہنامہ جام نور کے زیر اہتمام ”نیشنل میڈیا کنونشن“ منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر سید علیم اشرف جاسی (حیدرآباد)، مولانا یسین اختر مصباحی (دارالقلم، نئی دہلی)، پیر ستر اسد الدین اویسی (ممبر آف پارلیمنٹ، حیدرآباد)، پروفیسر شافع قدوائی (علی گڑھ)، مفتی محمد مکرم احمد نقشبندی (شاہی امام جامع مسجد، دہلی) نے خطاب فرمایا۔ خطبہ استقبالیہ مولانا خوشنورانی نے اور بدیہ شکر حضرت شیخ صاحب نے پیش فرمایا۔

● ۱۲ مارچ ۲۰۰۸ء کو عرس فریدی بدایوں شریف میں حضرت شیخ صاحب نے تقریر فرمائی۔ اس میں مفتی مطیع الرحمن مظہر پوری، مولانا سلطان بریلوی، مولانا قمر شاہ جہانپوری اور مولانا ڈاکٹر یسین علی عثمانی موجود تھے۔

● ۲۶ جون ۲۰۰۸ء کو مولانا غلام نبی صاحب کی شادی کے جشن میں مولانا خوشنورانی کے ہمراہ شیخ صاحب کلیر شریف تشریف لے گئے۔ اس میں امین ملت حضرت سید محمد امین میاں قادری برکاتی (زیب سجادہ خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف)، مفتی آل مصطفیٰ مصباحی (جامعہ امجدیہ، گھوسی)، مولانا صغیر اختر بریلوی اور الحاج سعید نوری بھی شریک تھے۔

● ۲۶ جون ۲۰۰۸ء کو جامعہ عارفیہ سید سراواں الہ آباد میں ”جشن حجۃ الاسلام امام غزالی“ منعقد کیا گیا جس میں حضرت شیخ صاحب نے ”ایمان، اسلام اور احسان“ کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

● ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی میں داخلے کے امتحان میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا نعمان ازہری امتحان کی حیثیت سے شریک رہے۔

● ۱ نومبر ۲۰۰۸ء کو مدرسہ اصدقیہ محمد شرف، بہار شریف، مانندہ میں حضرت مولانا سید رکن الدین اصدق (صاحب سجادہ خانقاہ اصدقیہ، بیر بیکہ، بہار) کی سرپرستی میں، ”کل ہند تعلیمی کانفرنس“ کا انعقاد ہوا۔ دن میں ”اسلام اور امن عالم“ کے عنوان پر سیمینار ہوا جس میں حضرت شیخ صاحب نے لیکچر دیا۔ اس موقع پر حضرت سید محمد اشرف میاں قادری (انکم نیکس کشنر دہلی)، مولانا محمد احمد مصباحی (صدر مدرسین الجامعۃ الاشرفیہ)،

مولانا خوشنورانی، مولانا عبدالمبین نعمانی، پروفیسر سید طلحہ رضوی برقی، پروفیسر فاروق احمد صدیقی، ڈاکٹر امجد رضا امجد اور ڈاکٹر نوش دعا لم چشتی (علی گڑھ) بھی موجود تھے۔ رات کو بعد نماز عشاء عوامی اجلاس شرف ملت حضرت سید اشرف میاں قادری برکاتی (انکم ٹیکس کشن دہلی) کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں حضرت شیخ صاحب نے تقریر فرمائی۔

● ۲ نومبر ۲۰۰۸ء کو مولانا خوشنورانی کے ہمراہ حضرت شیخ صاحب خانقاہ متعمیہ، پنڈہ اور خانقاہ مجیدیہ پھلواری شریف، تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرت ڈاکٹر سید شمیم احمد متعمی (صاحب سجادہ خانقاہ متعمیہ، پنڈہ)، حضرت شاہ آیت اللہ قادری ٹیکھی (صاحب سجادہ پھلواری شریف)، مولانا منہاج الدین قادری ٹیکھی (برادر محترم حضرت شاہ آیت اللہ قادری ٹیکھی)، ڈاکٹر فتح اللہ قادری اور مولانا بدر احمد ٹیکھی سے ملاقات رہی۔

۲۰۰۹ء

● ۳ جنوری ۲۰۰۹ء کو حضرت سید محمد اکبر میاں چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی فاتحہ چہلم کی محفل میں خانقاہ صدیہ پھوند شریف میں حضرت شیخ صاحب کا خطاب ہوا۔ اس موقع پر مولانا محمد احمد مصباحی (صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور)، مولانا نصر اللہ مصباحی، مولانا نفیس احمد مصباحی، مولانا صدر اور میاں مصباحی، مولانا عبدالمبین نعمانی، مولانا مسعود احمد برکاتی، مولانا رحمت اللہ صدیقی اور مولانا مجاہد حسین جیبی (الہ آباد) موجود تھے۔

● ۲۵ جنوری ۲۰۰۹ء کو بمقام ناؤن ہال، احمد آباد گجرات میں The Holy Quran: a Guidanec for all Humankind (قرآن کریم پوری انسانیت کے لیے ہدایت ہے) کے موضوع پر حضرت شیخ صاحب نے خطاب فرمایا۔ اس اجلاس میں مولانا نعمان احمد ازہری (استاذ البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی، علی گڑھ) نے بھی خطاب کیا۔

● ۲۵ جنوری ۲۰۰۹ء (بعد عشاء) بمقام بالاسور اڑیسہ "صلوٰۃ و سلام کمیٹی" کے زیر اہتمام کانفرنس منعقد کی گئی جس میں حضرت شیخ صاحب اور حضرت سید مخدوم جامی اشرفی (خانقاہ شہبازیہ، بھاگل پور) نے خطاب فرمایا۔

● ۱۱ مارچ ۲۰۰۹ء کو بمقام آئودھ حضرت سید مصباح الحسن چشتی رحمۃ اللہ علیہ (پھوند شریف) کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عین التیم چشتی کے عرس کے موقع پر حضرت شیخ صاحب نے خطاب فرمایا۔

● ۲۲ مارچ ۲۰۰۹ء کو البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام "عظمت رسول ﷺ کانفرنس" بمقام کنڈی ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ حضرت شیخ صاحب نے خطاب فرمایا، جس میں امین ملت حضرت سید محمد امین میاں قادری برکاتی (صاحب سجادہ خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف) کی صدارت رہی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پی کے عبدالعزیز (وٹس چانسر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، ڈاکٹر لیاقت معینی، ڈاکٹر مسعود انور علوی (کاکوروی) (صدر شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، شاہ عبدالحمید باقوی اور مفتی قمر الدین (اندور) شریک تھے۔

● ۹ اپریل ۲۰۰۹ء کو عرس آستانہ شریف، تنجاور (تمل ناڈو) میں شرکت کے لیے مولانا خوشنورانی کے ہمراہ حضرت شیخ صاحب تشریف لے گئے۔ ۱۰ اپریل ۲۰۰۹ء کو آستانہ پستق کی مسجد کا افتتاح ہوا، جس میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشنورانی نے خطاب کیا۔

● ۲۶ اپریل ۲۰۰۹ء کو احمد آباد، گجرات میں "منصوبہ بندی اسلامی ورکشاپ" کے لیے میٹنگ ہوئی، جس میں شیخ صاحب نے شرکت فرمائی۔

● ۴ مئی ۲۰۰۹ء: میٹنگ برائے "منصوبہ بندی اسلامی ورکشاپ" بمقام دولت خانہ شرف ملت حضرت سید اشرف میاں قادری برکاتی شرکا: حضرت شیخ صاحب، مولانا عطیہ میاں قادری، مولانا خوشنورانی اور ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) ● ۷ مئی ۲۰۰۹ء: میٹنگ تربیتی کیمپ برائے ائمہ مساجد بمقام دارالعلوم وارشہ، لکھنؤ۔

شرکا: حضرت شیخ صاحب، حضرت مولانا عطیہ میاں قادری، مولانا اقبال احمد (لکھنؤ)، قاری ابوالحسن (مہتمم) اور قاضی خطیب عالم۔

● ۲۴ مئی ۲۰۰۹ء: میٹنگ تربیتی ورکشاپ برائے خطباء بمقام جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، عظیم گڑھ، یوپی۔

شرکا: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی، مفتی نظام الدین رضوی (صدر مفتی جامعہ اشرفیہ)، مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر اعلیٰ

اہلنامہ اشرفیہ) اور مولانا غیاث الرحمن علی (استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد)

● ۲۵ مارچ ۲۰۰۹ء کو عرس عزیزی مبارک پور میں حضرت شیخ صاحب نے شرکت فرمائی۔

● ۲۷ جون ۲۰۰۹ء کو بمقام احمد آباد، گجرات "فہم اسلام ہفتہ" منایا گیا، جس میں حضرت شیخ نے درج ذیل عنوانات پر خطبہ فرمائے۔

۲ جون ۲۰۰۹ء: عقیدہ توحید (بمقام ٹیکور ہال، احمد آباد)

۳ جون ۲۰۰۹ء: عقیدہ رسالت و آخرت (بمقام ٹیکور ہال، احمد آباد)

۴ جون ۲۰۰۹ء: اسلام کا تصور علم (بمقام سورت)

۵ جون ۲۰۰۹ء: تقریر و خطبہ جمعہ

۶ جون ۲۰۰۹ء: کائنات اور ہماری ذمہ داریاں

۷ جون ۲۰۰۹ء: تزکیہ نفس (بمقام ناؤن ہال، احمد آباد)

☆ ۱۸ جون ۲۰۰۹ء: "جشن حجۃ الاسلام امام غزالی" خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد میں شیخ صاحب نے خطاب فرمایا، ان کے علاوہ پروفیسر اختر الواسع (استاذ: جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے بھی خطاب کیا۔

☆ ۴ جولائی ۲۰۰۹ء کو عرس نوری مارہرہ شریف کے مشاعرے میں حضرت شیخ نے شرکت کی۔

صدارت: ڈاکٹر سید امین اشرف (استاذ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

شرکا: شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (انکم ٹیکس کشن، دہلی)، افسر امر وہوی، حضرت سید منظر میاں چشتی (خانقاہ صدیہ پھوند شریف)، میکائیل ضیائی اور قاسم جیبی وغیرہ۔

● ۱۲ جولائی ۲۰۰۹ء تربیتی ورکشاپ برائے ائمہ مساجد بمقام دارالعلوم وارشہ، لکھنؤ۔

صدارت: شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (انکم ٹیکس کشن، دہلی)

خطاب: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی، مولانا یعقوب قادری (دہلی)، مولانا مبارک حسین مصباحی اور مولانا اقبال احمد (لکھنؤ)

● ۱۶ جولائی ۲۰۰۹ء کو مشاورتی میٹنگ برائے اجرا پندرہ روزہ اردو انگریزی میگزین "نیو تاج ویشن" بمقام دولت خانہ شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (انکم ٹیکس کشن، دہلی)

شرکا: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی اور ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

☆ ۲۰ جولائی ۲۰۰۹ء: دورہ پاکستان

۲۰ جولائی ۲۰۰۹ء: ایئر پورٹ پر حضرت سید حکیم اشرف جاسی (صاحب سجادہ: خانقاہ اشرفیہ، جاس، رائے بریلی) اور مولانا سید جمال اشرف جاسی سے حضرت شیخ کی ملاقات ہوئی۔

۲۱ جولائی ۲۰۰۹ء: مولانا محمد حسین عطاری، مفتی شاہد عطاری اور مفتی حسان عطاری سے ملاقات ہوئی۔

۲۲ جولائی ۲۰۰۹ء: مرکز تحریک دعوت اسلامی "فیضان مدینہ" کراچی کا دورہ۔

۲۳ جولائی ۲۰۰۹ء: صاحبزادہ تسلیم احمد صابری، خلیل وارثی، قاسم جلالی اور حاجی رؤف (مالک QTV) سے حضرت شیخ کی ملاقات ہوئی،

نیز اسی دن صاحبزادہ تسلیم احمد صابری نے QTV پر شیخ صاحب کا لائیو انٹرویو لیا۔

۲۵ جولائی ۲۰۰۹ء: مولانا کوب نورانی سے ملاقات۔

۲۶ جولائی ۲۰۰۹ء: حکیم سید محمود احمد برکاتی (نبیرہ حضرت مولانا سید حکیم برکات احمد ٹوکی) سے ملاقات۔

۱۹ اگست ۲۰۰۹ء کو پندرہ روزہ میگزین ”نیو ایج ویژن“ کی میٹنگ ہوئی۔

شرکا: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی، ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) اور مولانا ذیشان احمد صاحب (استاذ جامعہ غازیہ، اندھا آباد)۔

۲۹ اکتوبر ۲۰۰۹ء: میٹنگ ہوئی پکا سو، دہلی

مہمان خصوصی: حاجی عبدالرؤف (QTV)

شرکا: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی، اور ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

۶/۶/۲۰۰۹ء اور ۸ نومبر عرس قاسمی مارہرہ شریف میں شرکت کے لیے شیخ صاحب تشریف لے گئے۔

۶ نومبر کو حضرت شیخ صاحب نے منقبت پڑھی اور ”نومبر کو“ فکر و تدبیر کانفرنس“ میں خطاب فرمایا۔

۲۲ نومبر ۲۰۰۹ء کو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے زیر اہتمام قلمی بے ادبی کی شہ عری پر سیمینار، بمقام ضلع پنجیت ہل، بدایوں۔

۱۵ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ (نظامت: ڈاکٹر شمس بدایوں)۔

مہمانان خصوصی: حضرت شیخ صاحب، ادیب لطیف بریلوی اور ڈاکٹر کجج بدایوں۔

۳۰ دسمبر ۲۰۰۹ء کو ”آل انڈیا مدرسہ کلمۃ اللہ“ کی قیادت میں ملتان میں ایک سیمینار ”مدرسہ کلمۃ اللہ“ کے قیام کی حمایت میں جناب کل سب (وزیر: انسانی وسائل، حکومت ہند) کو پیش کیا گیا، جس کی قیادت میں ملتان میں حضرت سید محمد امین میاں قادری برکاتی (صاحب سہیل) نے شرکت کی اور حضرت شیخ صاحب نے مولانا خوشنورانی، مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر اعلیٰ: ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور)، ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) اور ڈاکٹر نعیم احمد صدیقی (کوآرڈینیٹر: جامعہ البرکات، علی گڑھ) و دیگر رکن کی حیثیت سے شامل تھے۔

(۲۰۱۰ء)

۲۴ جنوری ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

۲۳ جنوری ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

۲۳ جنوری ۲۰۱۰ء کو دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

۲۳ جنوری ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

خطاب: حضرت شیخ صاحب، ڈاکٹر سید عظیم اشرف جاسی (حیدر آباد) اور مولانا نعیم احمد صدیقی (مدیر اعلیٰ: ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور)۔

۱۶ جنوری ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

۱۶ جنوری ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

خطاب: حضرت شیخ صاحب، مولانا نعیم احمد صدیقی (مدیر اعلیٰ: ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور) اور مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر اعلیٰ: ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور)۔

۶ فروری ۲۰۱۰ء کو جلسہ دستار فضیلت، بمقام دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

۱۶ جنوری ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار ہوا۔

مقررین: حضرت شیخ صاحب، مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر اعلیٰ: ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور)، مفتی نظام الدین رضوی (صدر مفتی جامعہ الاشرفیہ، مبارک پور) اور مولانا ہاشم کانپوری۔

۱۶ جنوری ۲۰۱۰ء: ”مجلس تہذیبی“ کے عنوان پر سیمینار، جامعہ دارالعلوم دیوبند، گجرات میں ہوا۔

شرکا: حضرت سید محمد اختر میاں چشتی مودودی (صاحب سجادہ آستانہ صدیہ، پھونڈ شریف) حضرت شیخ صاحب، مولانا نعیم احمد صدیقی (دارالقلم، دہلی) اور مولانا خوشنورانی۔

۱۷ اپریل ۲۰۱۰ء کو میٹنگ برائے منصوبہ بندی ”البرکات اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ“ بمقام جامعہ البرکات، علی گڑھ۔

شرکا: حضرت شیخ صاحب، امین ملت حضرت سید محمد امین میاں قادری برکاتی (صاحب سجادہ خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف)، شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (انکم ٹیکس کمشنر، دہلی)، مولانا محمد احمد مصباحی (صدر المدینین الجامعہ الاشرفیہ، مبارک پور)، مولانا نعیم احمد مصباحی (دارالقلم، نئی دہلی)، مفتی نظام الدین رضوی (صدر مفتی الجامعہ الاشرفیہ، مبارک پور)، ڈاکٹر سید عظیم اشرف جاسی (حیدر آباد)، ڈاکٹر غلام نبی انجم (جامعہ ہمدرد، نئی دہلی)، ڈاکٹر احمد جعفری صدیقی (جوائنٹ سکریٹری، البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی، علی گڑھ)، حضرت سید محمد ان میاں قادری برکاتی (ولی عہد خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف)، ڈاکٹر نعیم عثمان صدیقی، مولانا ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی (اسسٹنٹ پروفیسر پریزیڈنسی یونیورسٹی، کولکاتا)، مولانا نعمان احمد ازہری (استاذ: جامعہ البرکات، علی گڑھ)، مولانا تاج محمد ازہری، مولانا ضیاء الرحمن علی۔

● یکم مئی ۲۰۱۰ء کو ”اقرا تعلیمی کانفرنس“ بمقام فتح پور، سوا، زیر اہتمام شمس العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی۔

خطاب: حضرت شیخ صاحب اور ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی (علی گڑھ)

● ۲۳ مئی ۲۰۱۰ء کو ”مثالی شوہر اور مثالی بیوی“ کے عنوان پر سیمینار، بمقام ڈاکٹر ہال، احمد آباد گجرات، زیر اہتمام الاخلاص فاؤنڈیشن احمد آباد۔

خطاب: حضرت شیخ صاحب اور مولانا ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی (استاذ: پریزیڈنسی یونیورسٹی، کولکاتا)

● ۶ جون ۲۰۱۰ء کو عرس چہلم حضرت شہو میاں، بمقام خانقاہ صفویہ، صفی پور شریف، ضلع انانڈ، یوپی۔

تقریر: حضرت شیخ صاحب، مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر اعلیٰ: ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور)، مولانا عبدالحق مصباحی (استاذ: الجامعہ الاشرفیہ، مبارک پور)، مولانا نعیم مصباحی (صاحبزادہ سربراہ اعلیٰ الجامعہ الاشرفیہ، مبارک پور) اور مولانا عرف اقبال مصباحی (مہتمم: دارالعلوم تاج الشریعہ، مدھوینی، بہار)۔

● ۱۰ جون ۲۰۱۰ء ملاقات سید صبیح الدین صبیح رحمانی (پاکستان) بمقام دولت خانہ مولانا خوشنورانی، دہلی۔

● ۱۹ ستمبر ۲۰۱۰ء کو ”کل مذاہب اجلاس“ بمقام گرین وڈ اسکول بدایوں (اسن و شائق برقرار رکھنے کے لیے)

شرکا: مختلف مذاہب، مسالک اور سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ حضرت شیخ صاحب نے خطاب فرمایا۔

● ۲۹ ستمبر ۲۰۱۰ء کو ”مارہرہ شریف میں شرکت“۔ ۳۰ اکتوبر کو ”فکر و تدبیر کانفرنس“ میں حضرت شیخ نے مختصر تاثر پیش کیا۔

● ۲۲ نومبر ۲۰۱۰ء کو ”مسافر پاکستان“ ہمارا مولانا خوشنورانی۔

اہم شخصیات سے ملاقات: مولانا الیاس عطار قادری (امیر دعوت اسلامی) مولانا کوب نورانی اکاڈمی، مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی، مولانا محمد حسین گردیزی مولانا ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر (صدر: جمعیت علمائے پاکستان) قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی (شہزادہ صدر الشریعہ) سید صبیح الدین صبیح رحمانی، صاحبزادہ تسلیم احمد صابری، حاجی عبدالرؤف (مالک کیوٹی وی) وغیرہ

۲۰۱۱ء

● ۱۳ جنوری ۲۰۱۱ء کو ”الاخلاص فاؤنڈیشن“ کے زیر اہتمام سیمینار (احمد آباد، گجرات) میں شرکت۔

خطاب: ڈاکٹر سید عظیم اشرف جاسی (حیدر آباد) اور حضرت شیخ صاحب، بعنوان محبت الی

● ۱۶ جنوری ۲۰۱۱ء کو ”سادات ایسوسی ایشن“ کے زیر اہتمام منعقدہ اجلاس میں شرکت۔

خطاب: حضرت شیخ صاحب بعنوان ”سادات کے حقوق و فرائض“

- ۲۱ جنوری ۲۰۱۱ء کو مولانا خوشنورانی کے ہمراہ جمشید پور میں عرس قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ میں شرکت۔
خطاب: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی و دیگر۔
- ۲۲ جنوری ۲۰۱۱ء کو تحریک ”پیغام اسلام“ جمشید پور کے نام سے خصوصی اجلاس۔
خطاب: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی اور مولانا سید سیف الدین اصدق چشتی۔
- ۱۳ فروری ۲۰۱۱ء کو ”شافعی سمین“ بمقام اسلامیہ انٹر کالج، بدایوں
زیر صدارت: تاجدار اہل سنت حضرت الشیخ عبدالحمید محمد سالم القادری
شرکا: حضرت شیخ صاحب، حضرت مولانا عطیہ میاں قادری، مولانا یونس اختر مصباحی (دارالقلم دہلی)، پروفیسر اختر
واسع (دہلی)، ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، جناب بیکل اتسانی، سوای آگنی ویش، پنڈت انیل
شستری، سردار گر میت سنگھ اور قادرا ایم ڈی تھامس۔ ناظم اجلاس ڈاکٹر حفیظ الرحمن۔
- ۱۷ مارچ ۲۰۱۱ء: جلسہ غمگین اعظم، بمقام مغل پورہ پلے گراؤنڈ، حیدرآباد، زیر اہتمام اتحاد سوسائٹی حیدرآباد۔
زیر صدارت: حضرت سید قبول پاشا حسینی چائین کمال
مقررین: حضرت شیخ صاحب (مقرر خصوصی)، مولانا ظہیر الدین علی صوفی اور مولانا محمد اولیا حسینی مرتضی پاشا۔
- ۱۹ مئی، بمقام گھوٹی، ضلع مٹو، ”جشن تکبیل اعظم“، نعتیہ مشاعرہ۔ صدارت: جناب بیکل اتسانی۔
تاثرات: مفتی نظام الدین رضوی (صدر مفتی الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور)، مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر اعلیٰ ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک
پور) اور مولانا زاہد سلامی (استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور)
مہمن خصوصی: حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشنورانی۔
- ۱۷ مئی ۲۰۱۱ء کو ہمراہ مولانا خوشنورانی خیر آباد و لکھنؤ کا سفر۔
ملاقات: حضرت سید فرقان میاں (زیب سجادہ خانقاہ حافظیہ، خیر آباد) جناب نوح الحق خیر آبادی (نمبر۶ علامہ فضل حق خیر آبادی) اور مولانا
عبدالحق خیر آبادی و مولانا فضل امام خیر آبادی کے مزارات پر حاضری۔
- ۱۸ مئی ۲۰۱۱ء کو قبرستان ”باغ مولوی انوار اللہ“ میں واقع عمارت فرنگی محل کے مزارات پر شیخ صاحب نے حاضری دی اور مولانا جلال
امدین عبدالحقین، ڈاکٹر نذرت فاطمہ اور ڈاکٹر ولی الحق انصاری سے ملاقاتیں فرمائیں۔
- ۲۹ مئی تا ۳۱ جون ۲۰۱۱ء سفر حیدرآباد۔
۲۹ مئی ۲۰۱۱ء: ”تصوف اور اہل تصوف“ پر سیمینار میں شرکت۔
صدارت: ڈاکٹر سید شاہ عبدالحمید اکبر (ڈین فیکلٹی آف آرٹس گلبرگ یونیورسٹی)
مقابلہ: حضرت شیخ صاحب بعنوان ”تصوف اور مستشرقین“
- ۳۰ مئی ۲۰۱۱ء: دورہ جامعہ نظامیہ اور مفتی خلیل احمد نقشبندی (شیخ جامعہ نظامیہ) سے ملاقات۔
- ۳۱ مئی ۲۰۱۱ء: دورہ شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر مصطفیٰ شریف (صدر شعبہ عربی) سے ملاقات۔
- ۲۱ جون ۲۰۱۱ء: لاہور میں عثمانیہ یونیورسٹی کا دورہ۔
- ۳ جون ۲۰۱۱ء: دورہ ”ابوالحسنات ریسرچ سنٹر“ اور ”الہدایہ آرمینز ٹرینیشن“، مولانا ضیاء الدین احمد نقشبندی (بانی ابوالحسنات ریسرچ سنٹر)
اور مولانا حبیب احمد نظامی سے ملاقات۔

- ۱۳ تا ۱۵ جون ۲۰۱۱ء عرس نوری مارہرہ شریف میں شیخ صاحب نے شرکت فرمائی۔
● ۱۳ جون کو حضرت شیخ صاحب نے نظم پڑھنی۔
● ۱۵ ستمبر کو حضرت سید بیگی میاں قادری برکاتی علیہ الرحمہ کی فاتحہ چہلم میں شرکت۔
● ۱۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو حضرت شیخ صاحب نے مولانا خوشنورانی کے ہمراہ ”علامہ فضل حق خیر آبادی نیشنل کانفرنس“، زیر اہتمام فضل حق اکیڈمی
دہلی و بینا سی ایجوکیشنل سوسائٹی، لکھنؤ میں شرکت کی۔

دیگر مہمانان و مندوبین: دگ و بے سنگھ (میدر کانگریس و مرکزی وزیر)، سلمان خورشید (میدر کانگریس و مرکزی وزیر)، پروفیسر اختر اوسع،
مولانا عبید اللہ خاں اعظمی، مولانا خالد رشید فرنگی محلی، ظفر یاب جیلانی (ایڈووکیٹ)، مولانا توقیر رضا خاں (خانقاہ رضویہ، بریلی)، مولانا یونس اختر
مصباحی (دارالقلم، نئی دہلی)، مولانا ادریس بستوی۔ اس کانفرنس میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشنورانی کو علامہ فضل حق خیر آبادی پر تحقیقی کام
کرنے کے سلسلے میں توصیفی سند اور اعزاز سے نوازا گیا۔

- ۲۸ تا ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو عرس قاسمی، مارہرہ شریف میں حضرت شیخ نے شرکت فرمائی۔
● ۲۸ اکتوبر کو شرکت، ۲۹ اکتوبر کو فکر و تدبیر کانفرنس میں ”جماعت اہل سنت کی شیرازہ بندی“ کے عنوان پر حضرت شیخ صاحب کے علاوہ دیگر
۷ افراد کی گفتگو، ۲۹ اکتوبر کی شب کو حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشنورانی کو علامہ فضل حق خیر آبادی کے سلسلے میں علمی و تحقیقی تصنیف پر خانقاہ
برکاتیہ کی طرف سے مبلغ ۲۱۰۰۰ روپے، توصیفی سند اور شیلڈ پیش کی گئی۔

- ۲۶ نومبر ۲۰۱۱ء: ”مشائخ طریقت کانفرنس“ بمقام اسلامیہ انٹر کالج، بریلی، زیر اہتمام شاہ ثقلین اکیڈمی، بریلی۔
سرپرستی: حضرت شاہ ثقلین میاں قادری مجددی (صاحب سجادہ خانقاہ شرافتیہ، بریلی)
صدارت: حضرت سید محمد اشرف میاں کچھوچھو (صدر: آل انڈیا علما و مشائخ بورڈ، لکھنؤ)
حضرت شیخ صاحب نے تاثرات پیش فرمائے۔

- ۳۱ دسمبر ۲۰۱۱ء: ”جشن خواجہ نظام الدین“، زیر اہتمام صلوٰۃ و سلام کمیٹی، بمقام بالاسور، اڑیسہ۔
صدارت و خطابت: حضرت شیخ صاحب، ساتھی مقرر حضرت مولانا سید محمد مظہر میاں چشتی (خانقاہ صدیقیہ، پچھونڈ شریف)

● ۲۰۱۲ء

- ۲ جنوری ۲۰۱۲ء کو دارالعلوم مجاہد ملت، دھام نگر، اڑیسہ میں شیخ صاحب کو استقبال دیا گیا اور آپ نے طلبہ سے خطاب فرمایا۔
خطبہ: استقبال: مولانا نوشاد عالم مصباحی (پرنسپل: دارالعلوم مجاہد ملت)، مولانا حنیف مصباحی (شیخ الحدیث: دارالعلوم مجاہد ملت)
● ۱۶ تا ۱۷ جنوری ۲۰۱۲ء: سفر ٹونک (راجستھان) ہمراہ مولانا خوشنورانی اور مولانا ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی (۱۸ جنوری کو حاضری امیر شریف۔
● ۲۳ جنوری ۲۰۱۲ء کو ”امام احمد رضا سیمینار“ (جامعہ درہ مظہر العلوم، علی پور ضلع کلیا چک، بنگال) میں مولانا خوشنورانی کے ہمراہ حضرت
شیخ صاحب نے شرکت فرمائی۔

صدارت: مفتی مطیع الرحمن مظہر رضوی۔

خطاب: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی۔

- ۲۹ جنوری ۲۰۱۲ء کو ”علامہ فضل حق سیمینار“ بمقام بیہونڈی، ضلع تھانہ، مہاراشٹر۔

صدارت: پروفیسر صاحب علی (صدر شعبہ اردو مہم یونیورسٹی)

شرکا و مقررین: حضرت شیخ صاحب، مولانا خوشنورانی، مولانا یونس اختر مصباحی (دارالقلم، دہلی)، ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل

● جلوس سیرت اکیڈمی ہدایوں کے زیر اہتمام بمقام جامع مسجد شمس ہدایوں میں ۱۰ اپریل ۲۰۰۵ء "محافل فہم سیرت" کے عنوان پر دس خطبات رکھے گئے، جس میں حضرت شیخ صاحب نے سیرت کے مختلف گوشوں پر مکمل دس خطبات ارشاد فرمائے۔

● ملی مسائل کے پیش نظر ۲۳ تا ۳۰ جون ۲۰۰۵ء کو خانقاہ عالیہ قادریہ کے زیر اہتمام "فہم قرآن ہفتہ" منعقد کیا گیا۔

● جس میں ۲۷ جون کو ڈاکٹر سید علیم اشرف جی (استاذ شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) اور دشاوند کو بہ حیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا گیا جس میں انہوں نے جہاد پر گفتگو کی۔

● ۲۸ جون کو حضرت مولانا خوشتر نورانی اور ڈاکٹر قمر الہدی فریدی (علی گڑھ) کو مدعو کیا گیا جس میں ان کا موضوع "طلاق" تھا۔

● ۲۹ جون کو حضرت شیخ صاحب اور پندھاری یادو (سابق ڈی ایم ہدایوں) نے "انسانی حقوق" کے موضوع پر خطاب کیا۔

● آخر میں ۳۰ جون کو تقسیم انعامات رکھا گیا جس میں سعید الزماں صدیقی (ڈسٹرکٹ جج) کو مدعو کیا گیا۔

● طلبہ مدارس اسلامیہ کے لیے الازہر انسٹی ٹیوٹ ہدایوں کے زیر اہتمام ۱۸ تا ۲۹ جنوری ۲۰۰۶ء "تعلیمی و تربیتی ورکشاپ" رکھا گیا جس میں حضرت شیخ صاحب نے خطبات ارشاد فرمائے۔

● ۸ اپریل ۲۰۰۶ء کو بمقام مگر پارک کیوٹی ہال ہدایوں میں الازہر انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ اجلاس میں حضرت شیخ صاحب اور مولانا ڈاکٹر سید عالم مصباحی نے لیکچر دیے۔ اس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے برجنند راوتھی کو مدعو کیا گیا۔

● الازہر انسٹی ٹیوٹ ہدایوں کے زیر اہتمام بمقام ادھیانی تین روزہ اسلامی تربیتی ورکشاپ رکھا گیا جس میں حضرت شیخ صاحب نے توحید و شرک، عقیدہ نبوت اور نکاح و طلاق کے عنوان پر گفتگو فرمائی۔

● بمقام ادھیانی ہدایوں شریف میں الازہر انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲۰ تا ۲۳ مئی ۲۰۰۸ء کو تعلیمی و تربیتی ورکشاپ منعقد کیا گیا جس میں مسلسل حضرت شیخ صاحب نے خطبات ارشاد فرمائے۔

● الازہر انسٹی ٹیوٹ ہدایوں شریف کے زیر اہتمام بمقام نقویہ گرلس کالج ہدایوں شریف "تعلیمی و تربیتی کیمپ" رکھا گیا جس میں حضرت شیخ صاحب نے درج ذیل موضوعات پر خطاب فرمایا۔

۸ جون ۲۰۰۸ء: عقیدہ توحید

۹ جون ۲۰۰۸ء: عقیدہ رسالت

۱۰ جون ۲۰۰۸ء: عقیدہ آخرت

۱۱ جون ۲۰۰۸ء: قرآن مجید کیوں؟

۱۲ جون ۲۰۰۸ء: قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے؟

۱۳ جون ۲۰۰۸ء: تصور نکاح و طلاق

۱۴ جون ۲۰۰۸ء: حقیقت تصوف

اس کے علاوہ ۱۵، ۱۶، ۱۷ جون ۲۰۰۸ء کو طالبات کے درمیان خطاب فرمائے۔

۱۹ جون ۲۰۰۸ء کو سعد طیب (علی گڑھ) کا خطاب ہوا۔

● ۶ اگست ۲۰۰۸ء کو بمقام گھنڈہ گھر ہدایوں شریف میں "بزم منظور" کے نام سے ایک مشاعرہ رکھا گیا جس میں اظہر عنایتی (رام پور) و جہیہ اکرم امرہوی، ڈاکٹر سید سراج الدین اجملی (علی گڑھ) اور حضرت سید منظر میں چشتی (پچھونڈ شریف) موجود تھے۔

● ۷ جون ۲۰۰۸ء کو تاج دار اہل سنت حضرت الشیخ عبدالحمید محمد سالم القادری کے زیر صدارت قاضی دانیال قطری انسٹی ٹیوٹ اور مولانا

عبدالماجد بدایونی پبلک لائبریری کے افتتاح میں حضرت شیخ صاحب نے خطاب فرمایا۔

اس افتتاح میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) مدعو تھے۔ ان کے علاوہ مولانا خوشتر نورانی، مولانا ذیشان احمد مصباحی (مدرسہ جامعہ عارفیہ سید سراج، الدہ آباد) اور مولانا ڈاکٹر سجاد مصباحی (اسسٹنٹ پروفیسر پریزیڈنسی یونیورسٹی، کولکاتا) بھی موجود تھے۔ آخر میں مولانا قمر احمد اشرفی (ناظم: جامع اشرف کچھوچھو شریف) نے خطاب فرمایا۔

● ۱۰ اپریل ۲۰۰۹ء کو روحانی تربیتی کیمپ بمقام دولت آباد، ضلع اورنگ آباد (مہاراشٹر)۔

● ۲۱ تا ۳۰ جون ۲۰۰۹ء: الازہر انسٹی ٹیوٹ، ہدایوں کے زیر اہتمام ورکشاپ میں خطبات۔

● ۲۱ تا ۲۸ جون ۲۰۱۱ء: سالانہ ورکشاپ زیر اہتمام الازہر انسٹی ٹیوٹ، ہدایوں۔

● ۱۸ ستمبر ۲۰۱۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کنونشن، بمقام انصاری آڈیٹوریم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی،

زیر اہتمام: خانقاہ قادریہ، ہدایوں شریف۔

● بہ اشتراک و تعاون: ماہنامہ جام نور دہلی، ڈاکٹر ڈاکٹر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی۔

سرپرستی: شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی (اکمل ٹیکس کمشنر، دہلی)

صدارت: تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم القادری

قیادت: مولانا یحییٰ اختر مصباحی (دارالعلوم، دہلی)

نظامت: ڈاکٹر حفیظ الرحمن

کنوینر: حضرت شیخ صاحب اور مولانا خوشتر نورانی

نعت: ڈاکٹر احمد یحییٰ صدیقی (جوائنٹ سکریٹری البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی، علی گڑھ) اور ہدیہ تشکر حضرت مولانا عطیف میاں قادری

شرکا: مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر اعلیٰ: ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور) پروفیسر اختر الواسح (استاذ: جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) ڈاکٹر غلام زرقانی (مقیم امریکہ)، مفتی مکرم احمد نقشبندی (شاہی امام، شاہی مسجد فتح پوری، دہلی)، مولانا سید محمد دہلوی (حیدرآباد)، خواجہ شجاع الدین انصاری (حیدرآباد)، ڈاکٹر خواجہ اکرام (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، ڈاکٹر فکریل حسن شمس (ایڈیٹر: روزنامہ انقلاب، دہلی) پروفیسر ضیاء الدین (پرووائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)۔

● ۱۸ تا ۲۵ مئی ۲۰۱۲ء: سالانہ ورکشاپ، زیر اہتمام الازہر انسٹی ٹیوٹ، ہدایوں۔

حضرت شیخ صاحب نے مندرجہ ذیل موضوعات پر خطاب فرمایا:

توحید، رسالت، آخرت، شفاعت اور آسمانی کتابیں۔

● ۳ نومبر ۲۰۱۲ء کو بمقام مدرسہ قادریہ میں جلسہ استقبال۔

صدارت: تاجدار اہل سنت حضرت الشیخ عبدالحمید محمد سالم القادری

خطبہ استقبال: حضرت شیخ صاحب

مہمانان: امام علم و فن حضرت خواجہ مظفر حسین رضوی (شیخ الحدیث: دارالعلوم نورالحق، چڑھ پور، فیض آباد) مولانا خوشتر نورانی، مولانا ہدائین نعمانی (مہتمم: دارالعلوم قادریہ، چڑھ پور، کوٹ، مٹو)، مولانا نفیس مصباحی، مولانا صدر الوری مصباحی، مولانا اختر حسین فیضی (اساتذہ جامعہ شریف، مبارک پور، اعظم گڑھ) □□□

☆ مدرسہ عالیہ قادریہ مولوی محلہ، ہدایوں (پولی)

یہاں سے گزرا ہے ایسے خزانے والا کون!

عربی زبان و ادب، حدیث دینی اور فقہی معاملات میں ان کی تہا ذات ایک ادارے جیسی تھی

میرے قبضے سے سوٹ کیس لیا اور نیچے اتر کے اپنے خاندان کے روایتی اور قدیمی طریقے سے رخصت ہوئے۔ سرکاری افسران اور عملہ تصویر حیرت بنے کھڑے رہے، اس درمیان اسید میاں ان کے ساتھ رہے، ان کے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم تھا لیکن اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں تھا کہ ان کے بزرگ والد کسی کا سوٹ کیس اٹھا کر چل رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اس خدمت پر مصر ہیں تو سوٹ کیس اپنے بیٹے کو دے دیں، فرمایا ”اپنے حصے کی خدمت میں کسی کو شریک نہیں کروں گا“۔ اس جملے پر بھی اسید میاں مسکرائے۔ میں اس پورے معاملے میں شرمندگی سے ہیکٹا رہا۔ بزرگوں سے سنا تھا اس دن تجربہ ہوا کہ سجادگان بدایوں افراد مارہرہ کے ساتھ کس نیاز مندی سے پیش آتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے ان باپ بیٹے نے دل پر قبضہ جمالیا اور یہ قبضہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی رہا، رقبہ کے اعتبار سے بھی اور گرفت کے لحاظ سے بھی۔

اسید میاں ”الازہر“ تعلیم حاصل کرنے کے واسطے چلے گئے۔ اس کے بعد جب آئے تو پھر ایک نیا دور شروع ہوا۔ خاندان مجیدی کی علمی روایت کا نیا دور، صوفی مشرب کے عمل پہلو کا نیا دور، مدرسہ قادریہ کا نیا دور، تصنیفی اور تحریری کارناموں کا نیا دور، مختلف رسومات کی اصلاح کا نیا دور اور مارہرہ مطہرہ اور بدایوں شریف کے دیرینہ تعلقات کا نیا دور۔ اسید میاں اس نشاۃ الثانیہ کے مرکزی مسند نشین تھے۔

ان سب کی تفصیلات لکھوں تو کتاب تیار ہو جائے۔ اس وقت تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔ یہ کام مجھ سے بہتر دوسرے اصحاب قلم کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ عزیز ی ڈاکٹر احمد جتینی صدیقی نے اسید میاں کی زندگی پر ایک محرکہ الا را مضمون لکھا ہے۔ وہ مضمون یوں تو کئی اعتبار

اسید میاں کو پہلی مرتبہ ۱۹۹۹ء میں ممبئی سے مٹھرا کے سفر کے دوران ریل کے ڈبے میں دیکھا۔ میں الیکشن آیز روور کے طور پر مٹھرا کے الیکشن کا معائنہ کرنے آ رہا تھا اور اسید میاں اپنے والد محترم کے ساتھ ممبئی سے سوار ہوئے تھے۔ اس سفر کا ایک منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ دوران سفر حضرت سالم میاں صاحب اپنے فخرزاد اکبر کا تعارف کرا چکے تھے اور یہ دونوں باپ بیٹے مجھ سے اس طرح مل چکے تھے جیسے بدایوں شریف کے خاندان قادریہ کے حضرات صاحبزادگان مارہرہ مطہرہ سے ملتے ہیں اور یہ ملنا ملنا دس بیس برس یا پچاس سو برس کا نہیں ہے، اس تعلق پر کئی صدیاں صدقے ہو چکی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ باپ نے بیٹے سے ملاتے وقت کہا تھا کہ ”یہ حافظ صاحب ہیں، حافظ اسید الحق۔“

چہرے بدن کے صبیح چہرہ، سیاہ ریش، متبسم لب اور کم گو اور چہرے پر ایک خاص چمک جو نو جوانی کے تقوے کی غماز تھی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہ نو جوان (اس وقت چوبیس سال کے ہوں گے) قبیلے کی آنکھ کا تارا ہے، لیکن ان کی ”نگاہ کی بے باکی“ اور ”ضرب کے کاری“ ہونے کا اندازہ نہیں ہو سکا، کیوں کہ وہ دوران ملاقات آنکھیں جھکائے رہے تھے۔ ان دونوں خصوصیات کا مشاہدہ بعد کے پندرہ برسوں میں ہوا تھا۔ جس منظر کا میں نے پچھلی سطروں میں ذکر کیا وہ یہ تھا کہ مٹھرا جینکشن پر میرے استقبال کو مٹھرا کے ایس ڈی ایم، تحصیل دار اور پردو کول کے دوسرے افسران اور عملہ موجود تھا۔ لیکن گاڑی رککنے سے پہلے حضرت سالم میاں میری نشست کے قریب آئے اور میری بھاری اپنی اٹھائی، میں ہاں ہاں ہی کرتا رہا اور انہیں بتاتا رہا کہ اسٹیشن پر مٹھرا کا عملہ بھی ہے اور قلی بھی۔ تبسم کے ساتھ فرمایا کہ ”اس خدمت کے لیے آپ کو ہم سے اچھا قلی کوئی نہیں ملے گا“۔ انہوں نے تقریباً زبردستی

(۶)

اظہار و اعتراف

سے اہمیت کا حامل ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس مضمون میں اسید میاں سرتا پا زندگی نظر آتے ہیں۔ جذبوں سے تھر تھراتے ہوئے، تحریر و تقریر میں مصروف، اہل سنت و جماعت کی شیرازہ بندی میں مشغول، انکسار و ادب کا مجسمہ بنے لیکن حوصلے کا پرچم اٹھائے رواں دواں۔ لوہار جب گھن پر ہتھوڑا مارتا ہے تو چنگاریاں سی اڑتی نظر آتی ہیں۔ یہ چنگاریاں تخلیق و تعمیر کی نشان دہی کرتی ہیں۔ نرم و دم گو اسید میاں کی شخصیت کے چاروں طرف ایسی ہی روشن چنگاریاں اڑتی نظر آتی تھیں۔ اسید میاں سے محبت کرنے والوں کو چاہیے کہ احمد میاں کے مضمون کو حرافہ پڑھیں۔

پٹنہ کے سفر میں وہ اور خوشنورانی میرے ہم سفر تھے۔ راستے میں کھانا آیا اور مسافروں نے کھانا کھایا۔ برابر کی نشست پر ایک بوڑھے آدمی نے کھانا کھا کر باقی ماندہ کھانا اور ٹرے نیچے رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کسی ضرورت کے تحت برتھ سے نیچے اترا چاہتے تھے لیکن ٹرے کی وجہ سے پیر رکھنے کی جگہ نہیں مل پاری تھی، انہیں اس مصیبت میں گرفتار دیکھا تو اسید میاں نے لپک کر ٹرے اٹھائی اور کسی مناسب جگہ پر رکھ آئے۔ وہ بوڑھا شخص اپنی ضرورت پوری کر کے آیا اور ان سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے مختصر اپنے بارے میں بتایا۔ بوڑھے شخص نے کہا کہ وہ بہار کی اسمبلی کا M.L.A ہے اور اس نے آج تک شیروانی میں ملبوس کسی شخص کو کسی دوسرے کے جھوٹے برتن اٹھاتے نہیں دیکھا۔ اسید میاں خفیف سا مسکرائے اور اس تبسم میں ایک اطمینان کا پہلو تھا۔ کیوں کہ پچھلے کئی برسوں سے ہم لوگ اس موضوع پر کچھ تفصیلی کچھ مختصر گفتگو کرتے رہے تھے کہ مسلمانوں کو عموماً اور اہل طریقت سے وابستہ افراد کو خصوصاً تصوف کے عملی پہلو پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اخلاق، انکساری، فردقی، بے ریا، اخلاص اور خدمت خلقی — تصوف کے عملی پہلو کے تجربے سے جب بھی وہ شاداں فرحان گزرتے، مجھ گنگو گار کو فون پر اطلاع دیتے اور دعائیں لیتے۔ مجھے یقین کمال ہے کہ الانہر سے بدایوں شریف واپس آنے کے بعد انہوں نے اپنے خاندان کے مریدین و متوسلین کو تصوف کے عملی پہلو کے اجزائے ترکیبی کی طرف ضرور راغب کیا ہوگا۔ جو لوگ ان سے قریب رہے ہیں انہوں نے اس کی شہادت دی ہے۔ یوں بھی تصوف کا عملی پہلو دیکھنے کے لیے انہیں

خانوادہ مجیدی کا آنگن اور شمس مارہرہ کا گھن کافی تھا۔

عرس قاسمی برکاتی کی شب خرقہ پوشی کا منظر بے حد روحانی ہوتا ہے۔ سانس گزشتہ کی شب خرقہ پوشی کی برکتوں میں مزید اضافہ ہوا جب اسید میاں اور عطیف میاں شہزادہ غوث اعظم کو لے کر مارہرہ آئے۔ شہزادے بدایوں شریف کے عرس میں مہمان تھے، لیکن جب اسید میاں نے دیکھا کہ عرس قاسمی برکاتی بالکل متصل ہے تو انہوں نے اجازت چاہی کہ شہزادے کو لے آئیں، ہم لوگوں نے حضرت امین ملت سے اجازت طلب کی تو انہوں نے مسرت کا اظہار کیا۔ رات کو جب وہ کثیر در کثیر جمع کے بیچ میں سے شہزادہ غوث اعظم کو حلقے میں لے کر آ رہے تھے تو میں خانقاہ شریف کی بالائی منزل سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ برادر عزیز رفیق ملت بھی شہزادہ غوث اعظم کے استقبال کے واسطے قصبے کے باہر تک گئے تھے۔ وہ بھی اس حلقے میں تھے، اس حلقے کی طرف زائرین کی بڑی پورش تھی، خرقہ پوشی میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، اس روحانی اور بابرکت تقریب میں شہزادہ غوث اعظم کو ”نشان شمس مارہرہ“ حضرت امین ملت کے دست مبارک سے پیش ہوا۔ عطیف میاں کی بہت عمدہ تقریر ہوئی۔ امین ملت اور رفیق ست نے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ مگر یہ کیا اسید میاں کچھ مغموم نظر آ رہے تھے۔ بعد میں عقدہ کھلا۔ بدایوں شریف واپس جا کر فون کے ذریعے انہوں نے اپنے ایک عزیز دیرینہ دوست کو مطلع کیا کہ جب ہم بوگ حلقے میں شہزادہ غوث اعظم کو لے رہے تھے تو جمع کے پورش اور دباؤ سے تنگ آ کر میں نے عرس کے زائرین میں سے دو ایک لوگوں کو تادیب کی خاطر کچھ سخت کلمات کہہ دیے تھے۔ تب سے غمگین ہوں کہ بدایوں کے ”مولوی“ کی اول و حضور شمس مارہرہ کے دربار کے مریدوں کو سخت دست کہنے کی ہمت کیسے کر سکا۔ جب یہ بات مجھ سے بیان کی گئی تو میں کئی لمحوں تک ایک دکھ بھری سرشاری میں ڈوبا رہا۔ اپنے اجداد کے پیر خانے سے عقیدت و محبت کا یہ عالم کہ ہمہ وقت اس بات کی فکر کہ ہری وجہ سے مارہرہ مطہرہ سے متعلق کسی شخص کو تکلیف نہ ہو۔

اکثر اپنی کتابوں کی تقریظ لکھنے کے لیے مجھ سے فرماتے۔ میں عرض کرتا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہیں، میری تقریظ یا پیش لفظ آپ کی تصنیف کا کچھ بھلا نہیں کرے گا۔ مسکرا کر چپ ہو جاتے اور ایک ہی

جملہ کہتے ”میری خواہش ہے کہ آپ ہی لکھیں“۔ تب میں مجبور ہو جاتا لیکن مسرور ہو کر کچھ لکھ دیتا جسے دیکھ کر وہ میرا دل رکھنے کے لیے بہت خوشی کا اظہار کرتے۔ ان کے علم، اکتسابات اور علمی امتیازات کے بارے میں علمائے کرام اور وہ بھی بڑے علمائے کرام زیادہ تفصیل اور قطعیت سے بتا پائیں گے کہ اہل سنت و جماعت کی معاصر دنیا میں ان کی کیا علمی حیثیت تھی۔ میں نے ان کی تصنیف کردہ، ترجمہ کردہ کتابیں اور تالیفات بہت شوق سے پڑھی ہیں۔ میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ عربی زبان و ادب، حدیث دانی اور فقہی معاملات میں ان کی تنہا ذات ایک ادارے جیسی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا مطالعہ درسی کتابوں اور حوالے کی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم و فنون میں اس قدر تھا کہ ان سے گفتگو کرتے وقت کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ہم اس وقت ان سے جس موضوع یا کتاب یا شخصیت پر بات کر رہے ہیں ان کے بارے میں وہ پہلے سے ہی مطالعہ نہیں کر چکے ہیں۔ اردو ادب کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا اور کبھی کبھی اس حوالے سے بھی ان کے ساتھ دلچسپ اور معنی خیز گفتگو ہوتی۔

اسید میاں بہت عمدہ نثر لکھتے برقرار تھے۔ وہ کئی طرح کی نثر آسانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے، علمی اور تحقیقی نثر کے ساتھ شستہ اور سلیس نثر کے نمونے ان کے قلم سے بڑی تعداد میں ارزاں ہوئے ہیں۔ وہ جب چاہتے تب موضوع اور موقع کی مناسبت سے نثر میں فرحت و طافت پیدا کر دیتے۔ ان کا مزاج بہت شائستہ تھا۔ راکت اور ابتذال سے ان کی تحریریں پاک تھیں، وہ طنز سے بھی کام نہیں لیتے تھے تاکہ اس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ جب روح کے اندر خیالات بے حد مثلاًطم ہو جاتے تو طنز کو مزاج کی ملاحظت میں لپیٹ کر پیش کر دیتے کہ ضرب تو لگے لیکن زخم کا نشان نہ نظر آئے۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والے حضرات اس بات سے واقف ہوں گے کہ اکثر ایسے مقامات آتے تھے جب وہ آسانی کے ساتھ سخت جملے لکھ سکتے تھے لیکن ایسے تمام موقعوں پر انہوں نے احتیاط اور ادب کا دامن سنبھالا، میں ان کی تحریر پڑھتے وقت اکثر ان کے ضبط کی داد دیتا تھا۔

اسید میاں جمیل تھے اور جمال کو پسند کرتے تھے۔ جمال کے لیے نظم و ترتیب کے اجزا لازمی ہیں۔ تحریر، تقریر، تعمیر اور خیالات ان

چاروں میدانوں میں انہوں نے نظم و ترتیب کا بہت خیال رکھا۔ وہ خوب صورت تحریر، دل نشیں تقریر، کتابوں اور وسیع اور کشادہ حسین عمارتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ کتابوں کو بہت خوب صورت انداز میں شائع کراتے تھے اور پڑھنے والوں تک بہت فیاضی کے ساتھ بھیجا کرتے تھے، بلکہ نہ پڑھنے والوں تک بھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت اعلیٰ طرف عطا کیا تھا۔ ظرف اعلیٰ بھی میرے خیال میں جمال کا ایک پہلو ہوتا ہے، شاید لازمی پہلو۔ ایسا لازمی کہ اچھے سے اچھا جمال ظرف کی کمی کی وجہ سے زوال آباد ہو جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے حسین و وسیع آڈیٹوریم میں جب اسید میاں نے مولانا فضل حق خیر آبادی پر سیمینار کرایا تو اس کے انتظام و انصرام میں ایسی نفاست تھی کہ اس دن یہ موازنہ کرنا مشکل تھا کہ یہ آڈیٹوریم باہر سے زیادہ خوبصورت ہے یا اس کے اندر برپا ہونے والا سیمینار اپنی افادیت، نظم و ضبط، حسن و ترتیب اور سلیقے کے باوصف زیادہ خوبصورت ہے۔

اسید میاں کے کارناموں پر نگار ڈالیں تو ان کا ایک معتد بہ حصہ نکھوئے ہوؤں کی جستجو پر مشتمل تھا۔ اپنے خانوادے کے عظیم علما کی کتابوں یا ان سے متعلق کتابوں کی اشاعت بھی اسی جستجو کی کڑی تھی۔ وہ سواد اعظم کے تشکیلی عناصر میں تصوف اور خانقاہوں کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اہل سنت کے عقائد کا دفاع کرنے والے علمائے کرام میں صرف ہندوستان یا برصغیر ہی نہیں تمام دنیا کے ان علمائے کرام کا اعتراف کرتے تھے جنہوں نے ان عقائد صحیحہ کا دفاع اپنے عمل یا تحریر سے کیا ہے۔ اہل سنت کے دائرے کی اس وسعت کو ماننے اور منوانے والے صاحب طریقت حمائے کرام میں ان کی شخصیت بہت ممتاز تھی۔ ان کی ترغیب اور محبت نے سواد اعظم میں اس نچ کے مطالعات کا ذوق پیدا کرنے میں بہت واقع کام کیا۔ اس بڑے کام میں ان کے کئی بزرگ اور احباب بھی شامل تھے۔

اسید میاں نے امام احمد رضا خان قادری برکاتی قدس سرہ کے علمی کارناموں کو بہت وقت نظر کے ساتھ پڑھا تھا۔ ایک علم شناس ہونے کی حیثیت سے یہ ان کا فرض بھی تھا اور حق بھی۔ دوران گفتگو وہ اکثر فاضل بریلوی کی فقہی بلند یوں اور شعری امتیازات کے ان نکات کی طرف اشارہ کرتے جو عموماً علمائے کرام بیان نہیں کرتے ہیں۔ میں اس بات

سے بھی ذاتی طور سے واقف ہوں کہ ان کے بزرگوں کی تحریر میں اگر امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ کا نام ”مولوی“ یا ”مولانا احمد رضا“ ہوتا (جیسا کہ آج سے ۸۰-۹۰ برس پہلے کے علما کی تحریروں میں اکثر ہوتا تھا) تو کتاب کی ہزار اشاعت کے وقت ترمیم کر کے القاب بڑھا دیتے تھے۔ اس بات سے میرے علاوہ بہت کم لوگ واقف ہیں، الا ماشاء اللہ۔

ڈاکٹر رشید عبیدی جیسے ماہر زبان و ادب عربی اور استاد الاساتذہ نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کے قصیدہ رانگنات پر جو تفصیلی بحث کی ہے اس سے اعلیٰ حضرت کی عربی شاعری کی عظمت، حضرت سیف اللہ اسلول قدس سرہ کی عبقری شخصیت اور ان سے اعلیٰ حضرت کے تعلق کی نوعیت کو برصغیر سے باہر عربستان کی وادیوں اور دانش کدوں تک پہنچا دیا۔ خانوادہ برکات کے ایک خادم کی حیثیت سے میں ڈاکٹر رشیدی کا ممنون ہوں کہ مداح اور ممدوح دونوں کا تعلق عقیدت مارہرہ مطہرہ سے واسطہ ہے، اسی احساس امتنان کا ذکر اسید میاں نے اپنے طویل و بسیط مقدمے کے آخر میں کیا ہے۔ اس مقدمے کو پڑھنا اور سمجھنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں۔ بڑے اور عسقی علمی کارناموں تک یوں بھی ہر کس و نا کس کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ علامہ اسید الحق نے ڈاکٹر رشیدی کے علم و فہم کا اعتراف کرنے کے بعد، اعلیٰ حضرت کے عربی کلام کے بعض حصوں کو سمجھنے میں جو تسامحات اور فاش غلطیاں ہوئی ہیں ان پر نہایت علمی، تحقیقی، تجزیاتی اور خالص لسانی سطح پر جو گرفت کی ہے وہ لا جواب ہے۔ ایک ہندی نے ایک عربی کی خالص علمی گرفت کی اور ایسا کوئی میدان نہیں چھوڑا کہ اعلیٰ حضرت کی عربی دانی کے دفاع میں جس کی خاک نہ چھان لی ہو۔ اس مقدمے کی روشنی میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ علامہ اسید الحق نے جن جن مورچوں سے اعلیٰ حضرت کی شاعری اور عربی دانی کا دفاع کیا ہے، معاصرین میں اس بیج سے لکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اگر اس مقدمے کا عربی زبان میں ترجمہ کر کے بلا و عرب کی دانش گاہوں کے نصاب میں داخل کر دیا جائے تو اہل عرب عیش و عشرت کریں گے کہ تنقید پر تنقید کی ایسی روشن مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں:

حریف تنق ستم گر تو کر دیا ہے تجھے
اب اور مجھ سے تو کیا چاہتا ہے سر میر سے

ہم ڈاکٹر رشید عبیدی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے عالم عرب تک ان قصائد کی تشریح پہنچائی اور ان سے زیادہ اسید میاں کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر رشید عبیدی کی تنقید کے مخدوش اور مشکوک مقامات کی حلاش کی اور بے حد علمی اور تحقیقی انداز سے ان تمام باتوں کا کافی و دشانی جواب دیا جنہیں ڈاکٹر رشیدی اعلیٰ حضرت کی عربی شاعری میں عیب کی طرح بیان کرتے ہیں۔

اسید میاں کے بارے میں چند نکات لکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی تفصیل کا وقت نہیں ہے:

۱- انہیں پارٹی بندی والی سیاست سے ابھرنے ہوتی تھی، لیکن ملک اور دنیا کی سیاست پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔

۲- علم تفسیر میں ان کا تخصص تھا، جس پر ان کی بہت اہم کتاب ”قرآن کریم کی سائنسی تفسیر“ ہے۔ مگر انہوں نے علم حدیث پر نسبتاً زیادہ کام کیا، لیکن انہیں قرآن عظیم اور قرآنی علوم سے بڑی محبت تھی۔

مارہرہ مطہرہ میں جامعہ احسن البرکات کے قیام کے وقت انہوں نے فرمایا کہ درس نظامی کے مدارس تو ہماری جماعت میں کافی ہیں۔ کاش جامعہ احسن البرکات میں قرآن عظیم، قراءت، تجوید اور تفسیر پر امتیازی کام ہو۔ وہ خود بھی قرآنی علوم پر خوب کام کرنا چاہتے تھے۔

۳- اسید میاں طبعاً حلیم اور منکسر المزاج تھے۔ لیکن قوت ارادی کے بہت مضبوط اور صاحب عزم انسان تھے۔ اپنے موقف کو بیان کرنے میں علم اور منطق کی پوری مدد دیتے تھے۔ صرف جذباتی انداز نہیں اختیار کرتے تھے جو عام وطیرہ ہے۔

۴- اپنے خاندان اور خانقاہ کے اٹائے کو بہت عمدہ طریقے سے محفوظ کرنا چاہتے تھے اور بڑی حد تک اس کام کو مکمل کر لیا تھا۔

۵- آقائے دو عالم حبیب کریم ﷺ سے بہت محبت تھی۔ ربیع الاول شریف میں یہ محبت نوع بہ نوع انداز سے سامنے آتی تھی۔ بدایوں شریف کے عصری اسکولوں، کالجوں میں (جو اکثر ٹیچر آرائیں ایس۔ والوں کے ہیں) جا کر سیرت نبی ﷺ پر تقریر کرتے اور ان سب میں بھی چاکلیٹ یا منگائی تقسیم کرتے اور کہتے کہ ان لوگوں تک اپنے نبی کی سیرت ہم نہیں پہنچائیں گے تو تبلیغ کا فریضہ کیسے ادا ہوگا۔ جب اس قسم کا کوئی کام کرتے تو مجھے ضرور مطلع فرماتے۔

۶- وہ چہ و دستار اور صرف نذرانے اور دست بوسی والی طریقت کے مقابلے میں اس تصوف کو پسند فرماتے تھے جس میں عشق رسول اور اخلاقی حسن کا درجہ سب سے بلند ہوتا ہے اور اخلاقی حسن میں خدمت خلق، اخلاص، انکسار اور تواضع لازمی طور پر شامل رہتے ہیں۔ ان کی اسی روش نے انہیں مارہرہ مطہرہ کے موجودہ ذمہ داروں کے دلوں کے قریب کیا۔

۷- اسید میاں میں مذموم رسومات کی اصلاح کا بہت ذوق تھا۔ اس کام کو وہ پوری ہمت اور حکمت سے انجام دیتے تھے۔

۸- وہ طبعاً فیاض تھے اور دام و درم کو صرف اتنی حیثیت دیتے تھے جس سے ضروریات زندگی پوری ہو سکیں۔

۹- نظم و ضبط اور صبر و شکر کے عناصر راہبان کی شخصیت کے تشکیلی عناصر میں ممتاز تھے۔

۱۰- انہیں اپنے اجداد کے پیر خانے اور حضور شمس مارہرہ سے عشق کی حد تک عقیدت تھی۔

۱۱- یوں تو ہم چاروں بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے لیکن برادر عزیز سید نجیب حیدر برکاتی سے انہیں بہت الفت تھی، شاید اس لیے بھی کہ سید نجیب میاں اس گدی کے سجادہ نشین ہیں جس پر خاتم الاکابر ہند حضرت نور میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیٹھ کر محبت کا سبق دیا تھا۔

۱۲- یوں تو ہر شخص کو عام طور پر اپنے باپ سے محبت ہوتی ہے لیکن اسید میاں کو حضرت سالم میاں صاحب مدظلہ العالی سے بے حد محبت تھی کہ وہ والد بھی ہیں، مربی بھی اور مرشد بھی۔

حضرت سالم میاں صاحب مدظلہ العالی کے پاس اس سائے پر فہم کرنے اور کرتے رہنے کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن سامان ہیکیبائی بھی کم نہیں ہیں۔ یہ بات بھی کیا کم باعث شکر ہے کہ اللہ رب العزت نے انہیں انتالیس برس تک ایک نعمت عظمیٰ سے سرفراز رکھا، ایک ایسا

فرزند جو میدان علم کا بھی شہسوار تھا اور راہ طریقت کا حیز روسا فر بھی تھا۔ جو انتظامی کاموں میں بہت مشاق تھا اور جس نے اپنے خاندان سے، خانقاہ اور مدرسے کی عزت و وقار کی بازیابی کی خدمت جلیلہ ادا کی۔ جس نے بدایوں سے لے کر برصغیر کے گوشے گوشے میں اہل سنت و جماعت کا وقار بلند کیا اور جس نے اپنے عمل اور کردار سے سواد اعظم کو غور و فکر اور مطالعے کے بہت سے بہتر اور نئے میدان مہیا کیے۔ جو ایک صوفی باصفا کی طرح جیا اور جس نے شہید کی طرح موت کو گلے لگایا اور جو رغوٹ اعظم میں جا کر جو آرام ہوا۔ میں نے یہ مضمون غفلت میں لکھا ہے لیکن یہ ارادہ کر کے شروع کیا تھا کہ اس مضمون میں اسید میاں کی موت کا ذکر نہیں کروں گا۔ لیکن میں نے تو شہید کا ذکر کیا ہے اور شہید کے زعمہ ہونے پر قرآن کریم شاہد ہے۔

اسید میاں! تم زندہ ہو اپنے والدین، بھائیوں اور اہل خاندان کے لیے اور اپنے خاندان کے مریدین و متوسلین کے لیے اور دوستوں اور ہی خواہوں کے لیے اور اپنے تمام چاہنے والوں کے لیے اور میں اشرف برکاتی بھی تمہیں بے حد چاہنے والوں میں ایک ہوں۔ اور میری خواہش بھی ہے اور دعا بھی کہ تم مجھے ہمیشہ زندہ محسوس ہو۔ اپنی خانقاہ قادریہ میں، اپنے مدرسہ قادریہ میں، اپنے شہر بدایوں شریف میں، اپنے شمس مارہرہ کے مارہرہ مطہرہ کے اعراس کی محفلوں میں، سواد اعظم کے عقائد کے تحفظ میں اور اپنے چاہنے والوں کی محفلوں میں اور اپنے والدین کے آغوش محبت میں اور اپنے پیارے بھائیوں کے سروں پر دست شفقت رکھنے میں۔

اسید میاں! تم روحانی دنیا کے انسان ہو۔ یہ کام تمہارے لیے کچھ مشکل نہ ہوگا۔ □□□

☆ چیف ایگمنٹس کٹر کوکا تا (ویسٹ بنگال)
خانقاہ برکاتیہ، بڑی سرکار، مارہرہ مطہرہ، ضلع لہ (یوپی)

ماہنامہ جام نور آن لائن پڑھنے کے لیے کلک کریں

www.khushtarnoorani.in www.nafseislam.com

www.facebook.com/monthly Jaam e Noor

اہل سنت کے دو جگر پارے

مولانا اسید الحق بدایونی اور مولانا عبدالحق فرنگی بھلی کے درمیان حیرت انگیز مماثلت تھی

متحدہ ہندوستان کے عظیم و قدیم دینی و علمی خانوادوں میں خطہ اودھ کا خانوادہ فرنگی بھلی، لکھنؤ اور خطہ روہیل کھنڈ کا خانوادہ عثمانیہ قادریہ، بدایوں، یہ دونوں خانوادے اپنی مثال آپ ہیں جن کی درخشاں تاریخ، صدیوں پر محیط ہے۔

یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ عہد اخیر میں خانوادہ فرنگی بھلی، لکھنؤ کے معروف حنفی فقیہ، ابوالحسنات مولانا محمد عبدالحق فرنگی بھلی لکھنوی (وصال: ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) اور خانوادہ عثمانیہ قادریہ بدایوں کے معروف نوجوان عالم و فاضل مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری، معروف بہ مولانا اسید الحق قادری بدایونی (ولادت: در بدایوں ۲۳ ربیع الآخر ۱۳۹۵ھ مطابق ۶ مئی ۱۹۷۵ء/ شہادت: در بغداد ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ مطابق ۴ مارچ ۲۰۱۴ء) حیات مستعار کی چالیس بہاریں بھی نہ دیکھ سکے اور اپنی ہستی مسکراتی یادوں اور گراں قدر دینی و علمی خدمات کے ربط مسلسل کو موقوف کر کے بزم عالم سے اس طرح اٹھ گئے کہ اہل علم و اہل ذوق اور اہل محبت و تعلق کو ان کی اچانک رحلت کا یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ دم بھر میں آخر یہ کیا ہو گیا؟

عجب دست اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
پہن سے پھول لینا اور ویرانے میں رکھ دینا

بہر حال! جو ہونا تھا وہ ہوا، اور مشیت ایزدی میں کسی کے لیے صبر و شکر کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے؟ جو کچھ ہے وہ خالق و مالک عز و جل ہی کا ہے اور سب کو اسی کی بارگاہ عظمت و جلال میں پیش ہونا ہے اور اسی کی رحمت و مغفرت کا سب کو سہارا اور آسرا ہے۔

ابوالحسنات مولانا محمد عبدالحق فرنگی بھلی لکھنوی کا وصال ہوا تو ان کی عمر اسیالیس (۳۹) سال تھی اور مولانا اسید الحق قادری بدایونی کی عمر بھی بوقت شہادت اسی اسیالیس (۳۹) کے آس پاس تھی۔

دونوں مرحومین کے درمیان، حیرت انگیز مماثلت تھی۔ دونوں

کا ذوق و مزاج، خالص دینی و علمی تھا۔ دونوں کو تحقیق و تصنیف و تالیف سے غایت درجہ دل چسپی تھی۔ ان کے شب و روز کتابوں کے درمیان ہی گزرتے تھے۔ اگر قضا و قدر کی طرف سے کچھ اور مہلت ملتی تو اہل سنت کے ان ”دونوں جگر پاروں“ کے مزید ”جوہر پارے“ منظر عام پر آتے۔ لیکن: مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ!

صاحب زادہ گرامی قدر مولانا اسید الحق قادری بدایونی کے محترم دادا، شیخ الاسلام حضرت مولانا شاہ عاشق الرسول محمد عبدالقدیر بدایونی (متوفی ۳ رشتوال ۱۳۷۹ھ/۳۱ مارچ ۱۹۶۰ء) رحمۃ اللہ علیہ کے معظم و کرم پردادا، حضرت مولانا شاہ عین الحق عبدالحق قادری برکاتی بدایونی (متوفی ۱۷ محرم الحرام ۱۲۶۳ھ/جنوری ۱۸۴۷ء) اپنے عہد و عصر کے اکابر علماء و مشائخ اہل سنت میں سے تھے۔

ایک طرف شمس مارہرہ حضرت سید شاہ آل احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی (متوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۴۰ء) رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ارشد تھے تو دوسری طرف حضرت مولانا شاہ نور الحق فرنگی بھلی لکھنوی (متوفی ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء) کے تلمیذ ارشد تھے۔

حضرت مولانا شاہ عین الحق عبدالحق عثمانی قادری بدایونی ان اکابر علمائے اہل سنت میں تھے جنہوں نے شاہ محمد السخیل دہلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/۱۸۳۱ء) کی ”تقویۃ الایمان“ کے خلاف اُس کے مؤلف کی حیات ہی میں ”ہدایت الاسلام“ کے نام سے ایک ایمان افروز تحقیقی و تردیدی کتاب لکھ کر احقاق حق و ابطال باطل کا گراں قدر فریضہ انجام دیا۔ آپ نے بحر العلوم مولانا محمد علی بدایونی تلمیذ قاضی مبارک گویا مٹوی، مؤلف ”قاضی مبارک“ اور علامہ ذوالفقار علی، ساکن دیوبند، اودھ (ضلع بارہ بنکی، اتر پردیش) تلمیذ ملا نظام الدین سہالوی فرنگی بھلی، بانی ”درس نظامی“ سے خصوصی تعلیم پائی تھی۔

خانوادہ عثمانیہ قادریہ، بدایوں ایک طرف خانقاہ قادریہ برکاتیہ،

مارہرہ مطہرہ کے تصوف و روحانیت کا وارث و امین ہے تو دوسری طرف خانوادہ فرنگی بھلی لکھنؤ کے علم و فضل کا حامل اور نمائندہ و ترجمان ہے۔ سیف اللہ المسلمول حضرت مولانا شاہ فضل رسول عثمانی قادری بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۲۷ اگست ۱۸۷۷ء) خلف الصدق حضرت مولانا شاہ عین الحق عبدالحق قادری برکاتی بدایونی بھی خانوادہ فرنگی بھلی ہی کے تعلیم یافتہ و تربیت یافتہ اور حضرت مولانا شاہ نور الحق فرنگی بھلی (متوفی ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء) کے شاگرد و رشید تھے۔

مولانا اسید الحق قادری بدایونی کے پردادا، محبت رسول، تاج الحول، حضرت مولانا عبدالقادر عثمانی قادری بدایونی (متوفی ۱۳۱۹ھ/۱۸۰۱ء) علیہ الرحمۃ والرضوان، امام حکمت و کلام، علامہ فضل حق خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کے مخصوص و ممتاز شاگرد اور اس کے ساتھ ہی اپنے عہد کے سرخیل اکابر علمائے اہل سنت بھی ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار، اہل اہل سنت، مولانا شاہ احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (متوفی ۲۵ صفر ۱۳۳۰ھ/اکتوبر ۱۹۱۲ء) نے اس طرح فرمایا ہے:

وَقَدْ وَدَّ جَمْعُهُمْ تَاجَ الْفُحُولِ
وَمَا أَذْرَاكَ مَتَاجِ الْفُحُولِ

اور آپ کو ”معیار سنیت“ قرار دیتے ہوئے اپنے قصیدہ ”چراغ اُلس“ میں فرمایا ہے کہ:

ٹھیک ”معیار سنیت“ ہے آج
تیری حب و ولا، محبت رسول

سچی صفا و مردہ کے دوران حضرت محبت رسول، تاج الحول بدایونی کو جو عظمت علمی میسر آئی کہ آپ زیارت سیدنا غوث اعظم جیلانی بغدادی رضی اللہ عنہ سے سرفراز ہوئے۔ اس جہاں قادریہ کی زیارت سے انہادیدہ دل روشن کرنے کی فقیہ اسلام، حضرت مولانا احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اپنے قصیدہ ”چراغ اُلس“ میں جس قلبی آرزو کا اظہار کیا ہے اُس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد یعقوب ضیاء القادری بدایونی (متوفی ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء) تحریر فرماتے ہیں کہ:

”منزل قرب میں اس درجہ اتصال اور ذوق وصال، آپ (محبت رسول، تاج الحول بدایونی) کو حاصل تھا کہ نظروں سے تجاہات اٹھ کر بے پردہ جلوہ گری کا شمار آنکھوں میں ہر لحظہ

کیف انگیز تھا۔

اس روایت بے جہانی کا تذکرہ مولانا الحاج احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے اپنے قصیدہ ”چراغ اُلس“ کے ایک شعر میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

میں بھی دیکھوں جو تونے دیکھا ہے
روز سنی صفا، محبت رسول
صفا مردہ پہ تونے جو دیکھا
وہ مجھے بھی دکھا، محبت رسول
ہاں! یہ سچ ہے کہ یاں وہ آنکھ کہاں؟
آنکھ، پہلے ولا، محبت رسول

(ص: ۳۳۳، مکمل التاريخ، مؤلفہ مولانا ضیاء القادری، ترتیب جدید، مولانا اسید الحق قادری بدایونی، طبع اول جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ/مارچ ۱۹۱۶ء، طبع جدید: رمضان ۱۳۳۳ھ/جولائی ۲۰۱۳ء، تاج الحول اکڈمی، بدایوں)

جس معیار اور جس رفتار کے ساتھ مولانا اسید الحق قادری بدایونی اپنے کاروان علم و فضل کی قیادت کرتے ہوئے اُسے منزل بہ منزل آگے کی طرف بڑھا رہے تھے، اگر انہیں دس پندرہ سال کا مزید موقع مل جاتا تو اپنے اکابر خانوادہ کی دینی و علمی خدمات اور خود اپنے قلمی شہ پاروں کے ذریعے وہ مذہب اہل سنت کی نہایت و قیچ خدمت انجام دینے کے ساتھ اپنے باوقار خانوادے کی عظمت و رفعت کو بڑی حد تک بحال کر سکتے تھے اور عہد حاضر میں بھی بدایوں کی عظمت و اہمیت کا شہرہ برصغیر ہندو پاک کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے دور، بہت دور تک پہنچ جاتا۔

مولانا اسید الحق قادری بدایونی مجھ سے بہت مانوس اور بہت قریب تھے۔ انھیں میں نے پایا کہ:

حسن اخلاق، شیرینی گفتار، عظمت کردار، بلندی فکر، طبع رسا، فکر صائب اور متانت و سنجیدگی کا خوبصورت اور پرکشش مرقع ہیں۔

کچھ اپنی تصانیف کے ساتھ اپنے اکابر خانوادہ اور بالفاظ دیگر اکابر علمائے اہل سنت کے کتب و رسائل جس خوبی و خوبصورتی کے ساتھ اہل علم اور اہل ذوق کے سامنے لانے اور انہیں فردوس نگاہ بنانے کے مسلسل عمل میں مصروف تھے، اُس سے جماعت اہل سنت کے ذخیرہ علمی میں زبردست اضافہ ہو رہا تھا۔

مجھے اُن کی ذات سے بہت زیادہ توقعات وابستہ تھیں کہ یہ آگے چل کر عظیم پیمانے پر دین و مذہب کا کام کریں گے اور اپنی نگرانی میں اپنے مدرسہ قادریہ بدایوں کے کچھ نوجوان علما کی صحیح تربیت کر کے ان سے بھی بہت سا کام لیں گے۔

بعض دینی و علمی مسائل و معاملات میں گاہے گاہے مجھ سے مشورہ کرنے میں وہ کوئی تکلف نہیں کرتے تھے۔ اہل سنت و علمائے اہل سنت کے درمیان خوشگوار باہمی روابط و تعلقات کے وہ دل سے خواہش مند تھے۔ کسی اختلاف کی خلیج کو وسیع کرنے کی طرف نہیں بلکہ ایسی کسی خلیج کو پائے بلکہ اس کے نشانات مٹانے کے بھی وہ متمنی تھے۔ وہ بلند فکر و نظر کے مالک تھے۔ عام لوگوں کی طرح الجھنے الجھانے کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔

مولانا اُسید الحق قادری اس وقت اپنے خانوادہ عثمانیہ قادریہ مجیدیہ بدایوں کی علمی آبرو اور اُس کی شان تھے اور اتنا ہی نہیں بلکہ سادات مارہرہ مطہرہ کی نظر میں بھی وہ محبوب و مقرب تھے اور جماعت اہل سنت کے بہت سارے علمائے کرام اُن کی دینی و علمی و اخلاقی خوبیوں کے معترف اور مداح تھے۔

”سیف الجبار“ مولفہ سیف اللہ المسلول علامہ شاہ فضل رسول عثمانی قادری بدایونی کی تحقیق و تخریج و تفسیر کا کام پایہ تکمیل تک پہنچا چکے تھے۔ حضرت سیف اللہ المسلول کی نہایت اہم تصنیف ”بوارق محمدیہ“ کی تحقیق و تخریج اور پھر اس کی طباعت و اشاعت کی طرف وہ خصوصی طور پر متوجہ تھے۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا کہ:

”عام طور پر لوگ ”سیف الجبار“ کو حضرت سیف اللہ المسلول کی سب سے اہم اور وسیع کتاب سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی سب سے اہم اور وسیع تصنیف ”بوارق محمدیہ“ ہے۔“

مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی اس نہایت اہم کتاب ”بوارق محمدیہ“ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

اعلیٰ حضرت، تاج الحول (مولانا عبدالقادر بدایونی) قدس سرہ ”تحفہ فیض“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضور اقدس (حضرت علامہ فضل رسول بدایونی) دہلی میں

حضرت خواجہ خواجگاں، قطب الاقطاب (خواجہ قطب الدین بختیار کاکی) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ دیکھا کہ: حضرت خواجہ کھڑے ہیں اور دونوں ہاتھوں پر اس قدر کتابیں رکھی ہیں کہ آسمان تک بلند ہو گئی ہیں۔“

عرض کیا: حضور خواجہ! یہ تکلیف کتابیں اٹھانے کی حضور نے کیوں فرمائی؟

جواب میں ارشاد ہوا: تمہارے لیے مولوی فضل رسول اللہ، ان کتابوں کو لو اور ان کی مدد سے فقہ شیطین دفع کرو۔“

اس کے بعد ہی بہ جلد، حضور (علامہ فضل رسول بدایونی) نے کتاب مذکور ”بوارق محمدیہ“ تصنیف فرمائی، جس میں اصول کلیہ و ہابیہ باطل کیے گئے۔ زبان فارسی ہے۔“

(ص: ۲۸۳، اکل التاريخ مولفہ مولانا ضیاء القادری بدایونی) دہلی کے سفر میں گاہے گاہے دارالافتاء بھی وہ آتے جاتے رہے۔ اپنے سفر بغداد مقدسہ سے ایک دور و ز پہلے انھوں نے فون پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ:

”اب سفر بغداد مقدسہ سے واپسی کے بعد ملاقات و گفتگو ہوگی۔“ یہ انتظار، ظاہر ہے کہ اب وعدہ فردائیں بلکہ وعدہ قیامت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس ملاقات میں اور باتوں کے ساتھ ایک خصوصی پہلو جا گر کرنے کے لیے اسید میاں سے کہوں گا، جس کا ذکر کسی سابقہ ملاقات میں بھی کر چکا تھا۔ وہ خصوصی پہلو یہ ہے کہ:

”مدرسہ قادریہ“ بدایوں متحدہ ہندوستان کا غالباً واحد ایسا دینی و علمی ادارہ ہے جو سب سے قدیم ہونے کے ساتھ آج بھی زندہ اور باقی ہی نہیں بلکہ سرگرم عمل بھی ہے۔ اس دینی درس گاہ کا نام پہلے ”مدرسہ محمدیہ“ تھا۔ حضرت سیف اللہ المسلول جب تکمیل علوم و فنون کر چکے تو اسی مدرسے میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے اور اس کا نام ”مدرسہ قادریہ“ رکھا۔ اس طرح اس مدرسے کی تاسیس و قیام پر تقریباً دو سو سال (۲۰۰) گزر چکے ہیں اور اس قدامت کا کوئی ادارہ برصغیر ہندوپاک میں غالباً کوئی دوسرا نہیں ہے۔

خانوادہ عثمانیہ بدایوں کے بھر عالم، حضرت مولانا محمد علی بدایونی

(ولادت ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۲ء-۱۷۲۱ء/۱۷۲۰ء) وصال ۲۵ ربیع الآخر ۱۱۹۹ھ/مارچ ۱۷۸۳ء) تلمیذ قاضی مبارک گویا مسمی (متوفی ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء-۱۷۴۸ء) مولف ”قاضی مبارک“ شرح شلم العلوم، کے تعارف و تذکرہ میں مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی لکھتے ہیں کہ:

”اسی طرح رؤسائے شیخ پور (بدایوں) نے (جوفریدی فاروقی خاندانی رئیس تھے اور آپ سے ارادت و تلمذ رکھتے تھے) باصرار تمام ایک وسیع قطعہ زمین مسجد و مدرسہ و مکان کی تعمیر کے لیے نذر گزارا۔ مسجد قدیم، دو بارہ بارہ تعمیر ہو کر ”مسجد خرم“ مشہور ہوئی۔ مسجد کی محراب و سطحی میں ایک پتھر پر یہ قصیدہ تعمیر کنندہ ہے:

بنائے مسجد زیباے حاجی الحرمین
زین القفل روشن چو آفتاب شدہ
بہ جستجوے شدم سال از مرمت او
خرد بکشت، چو مسجد مثال کعبہ شدہ
۱۰۹۳ھ

حضرت مولانا کے زمانے کی حرمت کا پتھر، جو اندرون مسجد نصب ہے، اُس میں ۱۱۸۱ھ (۶۸-۱۷۶۷ء) کندہ ہے۔

مدرسے کا نام ”مدرسہ محمدیہ“ قرار پایا تھا، جو اب ”مدرسہ عالیہ قادریہ“ کے نام سے موسوم ہے۔“

(ص: ۶۸، ۶۹، اکل التاريخ مولفہ مولانا ضیاء القادری بدایونی) اگر مولانا اُسید الحق قادری سے بعد سفر بغداد کوئی ملاقات، مقدور ہوتی تو اُن سے یہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی اہم باتیں ہوتیں۔

اپنے خصوصی استاذ، حضرت مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی پورنوی (متوفی ۱۲۱۴ھ/۱۸۳۳ھ/۲۰ اکتوبر ۱۲۱۳ء) علیہ الرحمہ کا جب کبھی وہ ذکر کرتے تو بے حد عقیدت و احترام کے ساتھ ذکر کرتے۔ اسی طرح برادر کرم مولانا محمد احمد علی مصباحی کی شخصیت اور آپ کے علم و فضل کے ساتھ آپ کی فکری و علمی صلاحیت اور تحریری بلاغت و جامعیت کے قائل تھے۔ ایک بار آپ کی کسی تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ:

”حضرت مصباحی صاحب کی تحریر بڑی نپلی تلی ہوتی ہے، جس میں کوئی جملہ یا لفظ نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم۔ جیسی اور جتنی ضرورت

ہوتی ہے، بس اتنے ہی الفاظ اور جملوں کا استعمال ہوتا ہے۔“

خانقاہ قادریہ اور مدرسہ قادریہ کو اُس کی مستحکم بنیادوں پر اپنی نئی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے ساتھ جن خطوط پر مولانا اُسید الحق قادری چلانا اور اسے بڑھانا چاہتے تھے اور نہایت کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا رہے تھے، وہ بے حد حوصلہ افزا تھے۔

اتنی بات تو سب کو معلوم ہے کہ خطہ روئیل کھنڈ کے دونوں معروف روحانی مراکز طریقت، یعنی سلسلہ قادریہ برکاتیہ مجیدیہ، بدایوں اور سلسلہ قادریہ برکاتیہ رضویہ، بریلی اور بالفاظ دیگر، علمائے بدایوں و علمائے بریلی، دونوں از ابتدا تاسیس دم، ہم مذہب و ہم مسلک اور اپنے مرکز عقیدت خانقاہ عالیہ قادریہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ سے منسلک ہیں۔

اس وقت خانوادہ عثمانیہ قادریہ اور بالفاظ دیگر علمائے بدایوں کا جو عمل، طرز عمل اور ان کی جو روش ہے وہ میرے علم و اطلاع کے مطابق، کچھ اس طرح ہے:

(۱) اپنے قدیم ”مدرسہ قادریہ“ بدایوں کے فروغ و استحکام و ترقی میں مصروف ہیں۔

(۲) کتب و رسائل خانوادہ عثمانیہ قادریہ کی جدید طباعت و اشاعت کی طرف وہ اپنی خصوصی توجہ مبذول کیے ہوئے ہیں۔

(۳) ”الذان ہانی“ کے قصبے کو نہ اُچھال رہے ہیں، نہ اسے چھوڑ رہے ہیں۔ نہ اس سے متعلق کسی نئی تحریر کا کوئی جواب دہ رہے ہیں۔

(۴) فقیہ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی یا خانوادہ قادریہ برکاتیہ رضویہ، بریلی اور بالفاظ دیگر علمائے بریلی کے خلاف وہ کوئی انگشت نمائی، کوئی نازیبا تبصرہ، نہ ہی کسی قسم کی محاذ آرائی کر رہے ہیں۔

(۵) عرس قاسمی برکاتی، مارہرہ مطہرہ میں شریک ہو رہے ہیں۔

(۶) ہر طبقہ اور ہر حلقے کے علماء و مدارس اہل سنت کے ساتھ خوش سگوار تعلقات و روابط کے خواہش مند ہیں۔

موجودہ علمائے بدایوں کے ”مکین جرائم“ کی مکمل فہرست میری معلومات کے مطابق یہی ہے، جس کی سزا کبھی ”مسند الفقہاء“ کبھی ”مفاہیض طیبہ“ کبھی کسی کتابچے کی طباعت و اشاعت اور اُس کی مفت تقسیم، اور کبھی کسی مضمون کے ذریعے دے کر بزم خویش تحفظ مذہب و مسلک کا پختہ انتظام“ کرنے یا علمائے بدایوں کو سرنگوں کرنے

ہوتی ہے، بس اتنے ہی الفاظ اور جملوں کا استعمال ہوتا ہے۔“

خانقاہ قادریہ اور مدرسہ قادریہ کو اُس کی مستحکم بنیادوں پر اپنی نئی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے ساتھ جن خطوط پر مولانا اُسید الحق قادری چلانا اور اسے بڑھانا چاہتے تھے اور نہایت کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا رہے تھے، وہ بے حد حوصلہ افزا تھے۔

اتنی بات تو سب کو معلوم ہے کہ خطہ روئیل کھنڈ کے دونوں معروف روحانی مراکز طریقت، یعنی سلسلہ قادریہ برکاتیہ مجیدیہ، بدایوں اور سلسلہ قادریہ برکاتیہ رضویہ، بریلی اور بالفاظ دیگر، علمائے بدایوں و علمائے بریلی، دونوں از ابتدا تاسیس دم، ہم مذہب و ہم مسلک اور اپنے مرکز عقیدت خانقاہ عالیہ قادریہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ سے منسلک ہیں۔

اس وقت خانوادہ عثمانیہ قادریہ اور بالفاظ دیگر علمائے بدایوں کا جو عمل، طرز عمل اور ان کی جو روش ہے وہ میرے علم و اطلاع کے مطابق، کچھ اس طرح ہے:

(۱) اپنے قدیم ”مدرسہ قادریہ“ بدایوں کے فروغ و استحکام و ترقی میں مصروف ہیں۔

(۲) کتب و رسائل خانوادہ عثمانیہ قادریہ کی جدید طباعت و اشاعت کی طرف وہ اپنی خصوصی توجہ مبذول کیے ہوئے ہیں۔

(۳) ”الذان ہانی“ کے قصبے کو نہ اُچھال رہے ہیں، نہ اسے چھوڑ رہے ہیں۔ نہ اس سے متعلق کسی نئی تحریر کا کوئی جواب دہ رہے ہیں۔

(۴) فقیہ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی یا خانوادہ قادریہ برکاتیہ رضویہ، بریلی اور بالفاظ دیگر علمائے بریلی کے خلاف وہ کوئی انگشت نمائی، کوئی نازیبا تبصرہ، نہ ہی کسی قسم کی محاذ آرائی کر رہے ہیں۔

(۵) عرس قاسمی برکاتی، مارہرہ مطہرہ میں شریک ہو رہے ہیں۔

(۶) ہر طبقہ اور ہر حلقے کے علماء و مدارس اہل سنت کے ساتھ خوش سگوار تعلقات و روابط کے خواہش مند ہیں۔

موجودہ علمائے بدایوں کے ”مکین جرائم“ کی مکمل فہرست میری معلومات کے مطابق یہی ہے، جس کی سزا کبھی ”مسند الفقہاء“ کبھی ”مفاہیض طیبہ“ کبھی کسی کتابچے کی طباعت و اشاعت اور اُس کی مفت تقسیم، اور کبھی کسی مضمون کے ذریعے دے کر بزم خویش تحفظ مذہب و مسلک کا پختہ انتظام“ کرنے یا علمائے بدایوں کو سرنگوں کرنے

ہوتی ہے، بس اتنے ہی الفاظ اور جملوں کا استعمال ہوتا ہے۔“

خانقاہ قادریہ اور مدرسہ قادریہ کو اُس کی مستحکم بنیادوں پر اپنی نئی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے ساتھ جن خطوط پر مولانا اُسید الحق قادری چلانا اور اسے بڑھانا چاہتے تھے اور نہایت کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا رہے تھے، وہ بے حد حوصلہ افزا تھے۔

اتنی بات تو سب کو معلوم ہے کہ خطہ روئیل کھنڈ کے دونوں معروف روحانی مراکز طریقت، یعنی سلسلہ قادریہ برکاتیہ مجیدیہ، بدایوں اور سلسلہ قادریہ برکاتیہ رضویہ، بریلی اور بالفاظ دیگر، علمائے بدایوں و علمائے بریلی، دونوں از ابتدا تاسیس دم، ہم مذہب و ہم مسلک اور اپنے مرکز عقیدت خانقاہ عالیہ قادریہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ سے منسلک ہیں۔

اس وقت خانوادہ عثمانیہ قادریہ اور بالفاظ دیگر علمائے بدایوں کا جو عمل، طرز عمل اور ان کی جو روش ہے وہ میرے علم و اطلاع کے مطابق، کچھ اس طرح ہے:

(۱) اپنے قدیم ”مدرسہ قادریہ“ بدایوں کے فروغ و استحکام و ترقی میں مصروف ہیں۔

(۲) کتب و رسائل خانوادہ عثمانیہ قادریہ کی جدید طباعت و اشاعت کی طرف وہ اپنی خصوصی توجہ مبذول کیے ہوئے ہیں۔

(۳) ”الذان ہانی“ کے قصبے کو نہ اُچھال رہے ہیں، نہ اسے چھوڑ رہے ہیں۔ نہ اس سے متعلق کسی نئی تحریر کا کوئی جواب دہ رہے ہیں۔

(۴) فقیہ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی یا خانوادہ قادریہ برکاتیہ رضویہ، بریلی اور بالفاظ دیگر علمائے بریلی کے خلاف وہ کوئی انگشت نمائی، کوئی نازیبا تبصرہ، نہ ہی کسی قسم کی محاذ آرائی کر رہے ہیں۔

(۵) عرس قاسمی برکاتی، مارہرہ مطہرہ میں شریک ہو رہے ہیں۔

(۶) ہر طبقہ اور ہر حلقے کے علماء و مدارس اہل سنت کے ساتھ خوش سگوار تعلقات و روابط کے خواہش مند ہیں۔

موجودہ علمائے بدایوں کے ”مکین جرائم“ کی مکمل فہرست میری معلومات کے مطابق یہی ہے، جس کی سزا کبھی ”مسند الفقہاء“ کبھی ”مفاہیض طیبہ“ کبھی کسی کتابچے کی طباعت و اشاعت اور اُس کی مفت تقسیم، اور کبھی کسی مضمون کے ذریعے دے کر بزم خویش تحفظ مذہب و مسلک کا پختہ انتظام“ کرنے یا علمائے بدایوں کو سرنگوں کرنے

یاعلمائے بریلی کو سر بلند و سرفراز کرنے میں ہمارے "بعض عاقبت ناندیش افراد" اور "نادان دوست" مصروف رہتے ہیں۔
ایسے افراد، انجانے میں ہی سہی، علمائے بدایوں نہیں بلکہ درحقیقت، علمائے بریلی کو نشانہ بنارہے ہیں۔

میں بڑی صراحت و وضاحت اور ذمہ داری کے ساتھ اس سلسلے میں اپنے تاریخی مطالعے کی روشنی میں یہ اثناء دینا چاہتا ہوں کہ:
تحریری ریکارڈ کے مطابق حضور مفتی اعظم ہند و حضرت صدر الشریعہ، حضرت صدرالافاضل و حضرت محدث اعظم ہند و حضرت مجاہد ملت و دیگر اکابر علمائے اہل سنت علیہم الرحمۃ و الرضوان نے جس قضیہ (مضامی) بعد میں مسکذاً ان غانی کے سلسلے میں اختلاف اور اس کے ناخوش گوار نتائج و اثرات کو عملاً ختم کر دیا تھا اور متعدد جلسوں و کانفرنسوں کے اسٹیج پر ایک ساتھ بیٹھ کر اس کا عملی حل اپنی زندگی ہی میں پیش کر کے اسے بے اثر اور کاہنہ مقرر کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ حضور مفتی اعظم ہند نے "مفروضہ قضیہ سالمی" کو بھی اپنے عمل کے ذریعے بے جان اور بے اثر کر دیا تھا ان دونوں قضیوں میں سے کسی بھی قضیہ کو چھیڑنا اور اسے ہوا دینا:

اولاً: تو ایک سوئے ہوئے فتنہ کو بیدار کرنا ہے اور کسی سوئے ہوئے فتنے کو بیدار کرنا، ایک مذموم عمل اور بدترین جرم ہے۔
ثانیاً: اسے چھیڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی وقت ان "نادان دوستوں" اور وار کرنے والوں کا دار، خود ان پر پلٹ پڑے گا جس کا دفاع کرنا بہت مشکل اور بھاری پڑ جائے گا۔
چوتھے قوسے کے بے دانسی کرد

نہ، کہہ رہا منزلت ماندہ رہا
قدیم تاریخ نہیں بلکہ ۱۹۵۰ء کے بعد کے ہی چند حقائق و واقعات پر نظر ڈالی جائے تو اس چھیڑ چھاڑ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، جس کا ارتکاب، ہمارے ہی بعض یاران طریقت و تقواً وقتاً کرتے رہتے ہیں۔
زیادہ تحقیق و تفصیل نہیں بلکہ سرسری طور سے صرف ۱۹۵۰ء کے بعد سے ۱۹۸۱ء کی تاریخ کا جائزہ کچھ اس طرح ہے:

(۱) آل انڈیا تبلیغ سیرت کانفرنس، منعقدہ اسلامیہ ہال پٹنہ، صوبہ بہار ۱۹۵۴ء کی صدارت، شیخ الاسلام حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبدالقدیر عثمانی قادری بدایونی نے فرمائی۔ اس کانفرنس میں مجاہد ملت،

مولانا الشہ محمد حبیب الرحمن قادری اڑیسوی و مفتی اعظم کان پور، مولانا الشہ مفتی رفاقت حسین مظفر پوری جیسے اکابر علمائے اہل سنت شریک تھے۔ اس تبلیغ سیرت کی تائیس و تکمیل حضرت محدث اعظم ہند، محمد محدث اشرفی پٹنہ چھوٹی و حضرت ملک العلماء مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی عظیم آبادی کے مشورے و تحریک پر ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء میں مسجد ثلث شاہ، فیض آباد (یونی) میں ہوئی اور اس کے پہلے صدر مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حبیب الرحمن قادری عباسی اڑیسوی (متوفی ۱۹۸۱ء) اور پہلے ناظم اعلیٰ مفتی آگرہ، حضرت مولانا محمد عبدالحمید حفیظ حقانی (متوفی ۱۹۵۸ء) خطیب و امام شاہی مسجد، آگرہ منتخب ہوئے تھے۔
پٹنہ کانفرنس ۱۹۵۴ء کی تفصیلات ماہنامہ پاسبان الہ آباد وغیرہ کی فائل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

(۲) حضرت مولانا سید محمد اکبر جشتی پھپھوندی علیہ الرحمہ کی جلسہ دستار فضیلت پھپھوند شریف ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۷ء کی صدارت، حضرت مولانا شاہ عاشق الرسول محمد عبدالقدیر عثمانی قادری بدایونی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں سیدی و مرشدی حضور مفتی اعظم ہند، مولانا الشہ مصطفیٰ رضا نوری بریلی و صدر العلماء، حضرت مولانا سید غلام جیلان میرٹھی و مفتی اعظم کان پور حضرت مولانا شاہ مفتی رفاقت حسین مظفر پوری و حضرت مولانا قاضی احسان الحق نعیمی بہرائچی و حضرت مولانا مشتاق احمد نظامی الہ آبادی و حضرت مفتی رجب علی نانپاروی حامدی وغیرہم جلیل القدر علماء و مشائخ بھی شریک تھے۔

اسی اجلاس ۱۹۵۷ء میں حضرت مفتی اعظم کان پور کے فرزند اکبر حضرت مولانا محمود احمد قادری رفاقتی مظفر پوری کی دستار حفظ کی تقریب سعید بھی انجام پذیر ہوئی۔ حضرت مولانا رفاقتی صاحب اس اجلاس کی تفصیلات کے راوی ہی نہیں بلکہ عینی شاہد بھی ہیں۔ "ملفوظات مصابح القلوب" مؤلفہ مولانا ظہیر السجاد کان پوری، مطبوعہ مکتبہ صدیہ، پھپھوند شریف میں اس اجلاس کی مطبوعہ روداد موجود ہے۔

(۳) جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی کی ایک نہایت اہم اور فائدہ مند کانفرنس، بھوج، ریاست کچھ، موجودہ حصہ صوبہ گجرات (انڈیا) میں ۲۷/۲۹ اپریل ۱۹۶۰ء کو ہوئی، جس کے مدعو علم و مشائخ اہل سنت کے آسامے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مفتی اعظم مولانا الشہ مصطفیٰ رضا نوری بریلی، برہان ملت مفتی محمد عبدالباقی برہان الحق رضوی جبل پوری، محدث اعظم ہند سید محمد محدث اشرفی پٹنہ چھوٹی، شیخ الاسلام عاشق الرسول محمد عبدالقدیر بدایونی، سید العسما مولانا سید آل مصطفیٰ مارہروی، مجاہد ملت مولانا محمد حبیب الرحمن قادری اڑیسوی، مولانا نور اللہ شاہ حسینی حیدر آبادی، مفتی رضوان الرحمن فاروقی اندوری، مولانا محبوب علی خاں رضوی، بمبئی، مولانا مشتاق احمد نظامی الہ آبادی وغیرہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین (مارچ ۱۹۶۰ء ہی میں حضرت مفتی عبدالقدیر بدایونی کے وصال کی وجہ سے اپریل ۱۹۶۰ء کی کانفرنس میں آپ کی شرکت نہ ہو سکی)

اس کانفرنس میں جنرل الیکشن ۱۹۶۲ء کو مد نظر رکھتے ہوئے علماء و مہندسین کانفرنس نے ایک اہم تجویز کو متفقہ طور سے منظور دی تھی:
"ایک ریزولیشن کے ذریعے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ: آنے والے ۱۹۶۲ء کے جنرل الیکشن کے لیے کسی پارٹی امیدوار کو ووٹ دینے کا وعدہ نہ کریں، بلکہ ہر ایک کو یہ صاف جواب دے دیں کہ وہ اپنی مرکزی جماعت رضائے مصطفیٰ کے حکم کے مطابق ووٹ کریں گے۔"

(ص: ۳۵، ماہنامہ "نوری کرن" بریلی، شمارہ جون ۱۹۶۰ء/۱۳۷۸ھ)
مذکورہ بالا کانفرنس کی صدارت، سیدی و مرشدی حضرت مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ نے فرمائی تھی۔

(۴) حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبدالقدیر عثمانی قادری بدایونی سے حضرت مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمن قادری عباسی اڑیسوی کو صلحدیت اور سند خلافت، دونوں حاصل تھیں۔ حضرت مجاہد ملت کی ہدایوں و حاضری آپ کے معمولات میں شامل تھی۔

(۵) حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبدالقدیر بدایونی کے وصال (شوال ۱۳۷۹ھ/مارچ ۱۹۶۰ء) کے بعد فاتحہ سوم میں حضرت مفتی اعظم ہند اور مفسر اعظم حضرت مولانا ابراہیم رضا جیلانی بریلیوی بھی شریک ہوئے تھے۔ (ص: ۳۶، مردان خد، مؤلفہ مولانا فیاض علی خاں اشرفی، ناشر: دارم شوقین بک ڈپو، بدایوں)

(۶) سید العلماء سید شاہ آل مصطفیٰ قادری برکاتی مارہروی (ف: ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۳ء) نے پرزور تقریقی بیان جاری فرمایا، جو ایک مطبوعہ

کتابچہ میں شامل ہے۔ (روایت حضرت مولانا محمود احمد قادری رفاقتی)
(۷) حضرت مولانا مشتاق احمد نظامی الہ آبادی نے حضرت مولانا بدایونی کے وصال پر زبردست تقریقی مضمون لکھا جو ماہنامہ پاسبان الہ آباد میں مطبوع و موجود ہے۔ بعض دیگر مواقع پر بھی نظامی صاحب نے آپ سے متعلق شایان شان تحریریں ماہنامہ پاسبان الہ آباد کے مختلف شماروں میں شائع کی ہیں۔

(۸) سیدی و مرشدی حضرت مفتی اعظم ہند کا ایک دستاویزی مکتوب ملاحظہ فرمائیں، جسے آپ نے شیخ الاسلام، عاشق الرسول محمد عبدالقدیر بدایونی کے وصال (۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء) سے تین چار سال پیشتر آپ کے نام تحریر فرمایا تھا:

اثر بریلی: ۲۸ رمضان ۱۳۷۵ھ
حضرت رفیع الدردجہ، مولانا المکرم الحرم، ذی الحجہ والکرم، عاشق الرسول، یٰ ذیلت مغلّٰہ!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام سنت سلام عرض مرام، طالب خیر بچہ تعالیٰ مع الخیر ہے۔
ابتداءً رمضان مبارک بلکہ اس سے بھی قبل او آخر شعبان سے نزولہ بخار میں مبتلا ہے۔ چناب کا مزاج گرامی اب کیسا ہے؟ سنا ہے کہ پھر کچھ ناسازی زیادہ ہوگئی۔ مولیٰ تعالیٰ صحت کامل و شفاء عاجل عطا فرمائے۔ شاہزادہ سرکار غوثیت کا ورود مستود بدایوں معلوم ہوا۔
آپ کی قسمت، قابل ہزار رشک ہے۔ اس سال معذوری سے حاضری نہ ہوئی تو سرکار غوث مدار آقا سے نامدار رضی اللہ عنہ نے یہ کرم فرمایا کہ شاہزادہ والا تبار کو بھیج دیا۔ آپ نے کتنی عظیم دولت گھر بیٹھے پائی۔

آپ کی عنایت مہذول ہوئی اور شاہزادہ سرکار قادری کا کرم تو ان شاء اللہ تعالیٰ فقیر بے توقیر، ادنیٰ گدا کے کوئے حضور پر نور غوث اعظم رضی اللہ عنہ بھی اس سرکاری کرم سے محروم نہ رہے گا اور گھر بیٹھے ہی اس نعمت زیارت سے مستفیض ہو سکے گا۔ وہ مجھ پر کرم فرمائیں گے۔
مزار پاک اعلیٰ حضرت قدس سرہ پر فاتحہ خوانی فرمائیں گے تو اعلیٰ حضرت، امام اہل سنت، مجدد دین و ملت، خادم سرکار غوثیت کی روح کو مسرت بے نہایت ہوگی۔ مجھے حضرت کا ورود معلوم ہوا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کب تک بدایوں میں تشریف رکھیں گے؟ پھر کب واپسی کا ارادہ فرمائیں

اس جوان رعنا کو کس کی نظر لگ گئی!

مولانا اسید الحق نے کم عمری میں وہ کمالات علمی ممکن کر دکھائے جس کے لیے عام طور پر برسوں کا مطالعہ اور دیدہ ریزی درکار ہوتی ہے

اشتراک سے بڑے پیمانے پر ”علامہ فضل حق خیر بادی کنونشن“ کا اہتمام کیا گیا۔ اس دوران ان کے اندر دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا جو جذبہ خیر سالی تھا، جو توسع اور تواضع تھی، اس کا اندازہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ ہم صدم پیدا کرتا ہے، مولانا اسید الحق اس کے سچے عملی پیکر تھے۔

ان کا ایک اور وصف ان کا صاحب اسوب ہونا بھی تھا۔ انھوں نے علوم شریعت و طریقت کے ساتھ ہی زبان و ادب کی بھی غواصی کی تھی اور جام نور میں ابولفیض معینی کے قلمی نام سے ان کا کالم خامہ تلاشی اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، جس میں حسن مزاج بھی ہے اور انتہائی مہذب انداز سے طنز بھی۔ برسوں تک وہ چھپتے بھی رہے اور چھپتے بھی۔ لوگوں کو کتنے تجسس تھا، کیسا اشتیاق تھا، کیسی بے چینی تھی کہ وہ خامہ تلاشی لینے والے تک پہنچ سکیں۔ مگر وہ باوجود انتہائی مقبولیت کے کبھی کھل کر سامنے نہ آئے اور یہ بات بہت بعد میں جب ان کا کالم بند ہو گیا تو لوگوں کو پتہ چل سکی کہ یہ حق پسند تخریریں مولانا اسید الحق کی تھیں۔

نثر کے علاوہ شعر گوئی میں ان کا شوق اور مزاج بھی کم عمری میں انتہائی پختگی کا حامل تھا۔ نعت اور مقبلیت میں خاص طور پر ان کے جوہر دیکھنے والے تھے اور کیوں نہ ہوتے، انھیں عشق رسول اور صحابہ اور اولیائے کرام سے محبت نہ صرف درشتے میں ملی تھی بلکہ انھوں نے اپنے خون دل کی آمیزش سے ایک نئی توانائی بخشی تھی۔

جو آیا ہے سو جائے گا بھی، لیکن اتنی جدی مولانا اسید الحق جیسے لوگوں کا چلا جانا امت کے حق میں نہایت غم ناک بات ہے۔ ایسی تاریخی شخصیتوں سے عوام و خواص نہ جانے کیسی کیسی امیدیں اور توقعات وابستہ کر رکھی ہوتی ہیں اور ان سے استفادے کا کتنے لوگوں کو اشتیاق رہتا ہے۔ مگر ہم کچھ بھی کہیں، کچھ بھی سوچیں، راضی بہ رضا ہی رہنا ہے؛

کیوں کہ اپنی مشیت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ □□□

☆ چیف کمشنر اقلیتی اسیات، حکومت ہند، نئی دہلی

نقد و قدر کے مالک نے ہر انسان کی موت کا وقت اور جگہ متعین کر رکھی ہے۔ زندگی کی سب سے اہل حقیقت اگر کوئی ہے تو وہ موت ہے، لیکن یہ سب جاننے اور مانتے ہوئے بھی کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنوں کے لیے جتنا بڑا سناخہ ہوتی ہیں اس سے کم غیروں کے لیے بھی نہیں ہوتیں۔ ایسی ہی موت اس جوان رعنا کی تھی جو عالم دین بھی تھا اور صاحب طریقت بھی۔ جس کے ایک ہاتھ میں جام شریعت تھا تو دوسرے میں سندان عشق۔ جس نے کم عمری میں وہ کمالات علمی ممکن کر دکھائے جس کے لیے عام طور پر برسوں کا مطالعہ اور دیدہ ریزی درکار ہوتی ہے۔ پتہ نہیں مولانا اسید الحق عاصم قادری کو کس کی نظر لگ گئی۔ ان کے حصے میں تو شہادت آئی اور غوث الاعظم کے جوار میں قیامت تک آسودہ خاک ہونے کی سعادت ملی لیکن خدا کسی باپ کو یہ دن نہ دکھائے کہ وہ اپنے ہی کاندھے پر اپنے جوان بیٹے کا جنازہ اٹھائے۔

مولانا بدایونی سے میرا تعلق حالیہ چند برسوں پر محیط تھا۔ وہ ال زہر سے پہلے ہی فضیلت پا چکے تھے، لیکن حصول علم کے شوق میں انھوں نے جامعہ اسلامیہ سے اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس حوالے سے ان سے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔ بعد میں خانقاہ عارفیہ سید سراواں کے جشن امام غزالی میں ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا اور ان کی علمی خطابت سے بہت متاثر ہوا۔

بدایوں میں بھی انھوں نے میلاد النبی ﷺ کے موقع پر امن و شہنتی کے حوالے سے ایک کانفرنس بعنوان ”شانتی سمیں“ کی تھی جس میں سوامی اگنی ویش اور دیگر حضرات کے ساتھ مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ اس موقع پر ان کی انتظامی صلاحیت کا اندازہ ہوا۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے ڈیڑھ سو سالہ یوم وفات کے حوالے سے مولانا اسید الحق عاصم قادری اور عزیز گرامی مولانا خوشتر نورانی کی تحریک پر ڈاکٹر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کے

رکھ کر بہت کچھ لکھنا چاہ رہے تھے اور کچھ لکھنا شروع بھی کر دیا تھا۔

جب بھی اس طرح کی کوئی کتاب یہاں تک کہ کوئی اہم گوشہ تحقیق اُن پر واضح ہوتا تو وہ بڑی خوشی کے ساتھ عام طور پر مجھ سے اس کا ذکر کرتے اور میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کوئی مناسب رائے دیتا۔ مولانا اسید الحق قادری بدایونی چوں کہ مثبت ذہن و فکر کے حامل اور معاملہ فہم و دراندیش تھے۔ حالات زمانہ کی مناسب رعایت کے ساتھ مستقبل کی طرف ان کی نظر ہوا کرتی تھی۔ منصوبہ بندی اور حکمت عملی پر بھی وہ خاصی نگاہ رکھتے تھے، اس لیے وہ جو کچھ کرتے تھے، بہت سوچ سمجھ کر مضبوط و مستحکم قدم اٹھایا کرتے تھے۔

ایک اچھوتے پہلو پر بھی انھوں نے کام کیا جس سے غفلت و بے نیازی عام ہے، وہ یہ کہ اہل وطن کو تعلیمات اسلام سے آگاہ کیا جائے۔ دعوتی نقطہ نظر سے ان کے سامنے تعلیمات و ہدایات اسلام پیش کی جائیں، اس کے لیے انھوں نے بدایوں میں چھوٹے بڑے کئی ایک پروگرام کیے اور آسان ہندی زبان میں اہل وطن کے درمیان لڑچکر کی تقسیم کی۔

عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس موقع پر بھی انھوں نے عام لوگوں کے درمیان مختلف قسم کے تحائف تقسیم کر کے انھیں اسلام کے حسن اخلاق کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس طرح کے متعدد کام کر رہے تھے اور مزید کرنا چاہ رہے تھے، مگر:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مختصر عرصے میں انھوں نے دینی و علمی و اخلاقی محاسن کا اچھا اور بہت اچھا نقش بے شمار لوگوں کے دلوں پر چھوڑا۔ دلوں پر مرسوم ہونے والا اُن کا ہر نقش بڑا ہی جاذب و دل کش اور دل آویز ہے۔ وقت ملتا تو یہ نقش اور بھی گہرا ہوتا۔ اس کی چمک دمک اور بھی بڑھتی اور بڑھتی ہی چلی جاتی۔ مگر اب حسرت و افسوس کے ساتھ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینا ہی تقاضا صبر و تکلیب ہے کہ: خوش درشید و لعل حلائے مستجبل بود

اللہ رب العزت اپنے فضل و کرم اور احسان و انعام سے حصہ وافر عطا فرماتے ہوئے شہید بغداد اسید میں کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے اور جنت الفردوس میں انھیں بلند مقام عطا فرمائے۔ □□□

☆ پانی: دارالہق، قادری مسجد، جوگ پانی ایسٹیشن، اوکھلا، نئی دہلی

۲۰۱۱ء میں امام حکمت و کلام قائد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، علامہ فضل حق خیر آبادی (متوفی ۱۲ صفر ۱۳۷۸ھ/۲۰۲۰ء رگست ۱۸۶۱ء) کے ڈیڑھ سو سالہ یوم وصال کی مناسبت سے جب زور و شور کے ساتھ ”تحریک فضل حق شناسی“ شروع ہوئی تو مولانا اسید الحق قادری بدایونی نے اسے بے حد پسند کیا اور میری خواہش کے مطابق ایک نہایت اہم اور معرکتہ آلا کتاب بنام ”خیر آبادیات“ لکھ کر انھوں نے اہل علم و تحقیق سے داد و تحسین حاصل کیا۔

”سلسلہ خیر آباد“ کے آخری ”اصیل“ نمائندہ عالم و محقق، حکیم سید محمود احمد برکاتی نوکی (کراچی) نے ”خیر آبادیات“ کا مطالعہ کر کے ایک حوصلہ افزا مکتوب مولانا اسید الحق قادری بدایونی کے نام لکھا جس میں اپنے کچھ اس طرح کے تاثرات انھوں نے ظاہر کیے کہ سلسلہ خیر آباد کا پرچم آپ جیسے نوجوانوں نے سنبھال لیا ہے۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ پرچم اسی طرح بلند رہے گا۔“ وغیرہ وغیرہ۔

اس موقع پر ایک اور اہم تحقیقی و تاریخی خدمت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ”علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات“ کے نام سے مولانا خوشتر نورانی نے بھی ایک نہایت گراں قدر کتاب لکھ کر شائع کی، جسے ”قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی“ نے بھی ابھی چند ہفتے پیشتر شائع کر کے اس کی اہمیت میں خاصا اضافہ کر دیا ہے۔

اس حقیقت کا اظہار کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ تحقیقی و قلمی طور پر اس پوری ہم اور تحریک میں مذکورہ دونوں نام اب تک سرفہرست ہیں۔

اکابر خانوادہ قادریہ عثمانیہ کی بیشتر کتب و رسائل ”الحقائق حق و ابطل باطل“ اور ردوہابیہ پر مشتمل ہیں، جنہیں رفتہ رفتہ مولانا اسید الحق قادری بدایونی بڑے خوبصورت اور موثر انداز میں منظر عام پر لا رہے تھے۔ اپنے آبا و اجداد کی طرح ردوہابیہ سے انھیں خاصی دل چسپی تھی مگر علمی و تحقیقی انداز سے وہ یہ کام کر رہے تھے اور آگے بھی اسی طرح کرنا چاہ رہے تھے۔ شور و ہنگامہ سے وہ طبعاً دور رہتے تھے، اس لیے اس خدمت کو بھی وہ نہایت سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ محض حقائق و دلائل کی بنیاد پر کرنا چاہتے تھے اور کر رہے تھے۔ وہ بڑی سرگرمی کے ساتھ ایسی کتابیں تلاش و جستجو کر کے جمع کر رہے تھے جو تقویۃ الایمان کی تردید و ابطل میں دور اول ہی میں لکھی گئی تھیں اور وہ ان کتابوں کو سامنے

مولانا اسید الحق جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں

ہمیں "اسید الحق ریسرچ سینٹر" قائم کرنا چاہیے، اور اہل علم کو اس سے جوڑنا چاہیے

کیا لکھوں؟ کیسے لکھوں؟ اب تک یقین نہیں آیا۔ مولانا اسید الحق قادری بدایونی، ہمارے اسید صاحب، ہم سب کے محترم، دل سے قریب، ذہن سے قریب اس طرح اچانک ہمارے درمیان سے چلے گئے، دل مانے کو تیار نہیں اور ذہن قبول کرنے کو راضی نہیں، لیکن مشیت الہی یہی تھی، واللہ ہم سب کو صبر جمیل عطا کرے اور شہید بغداد کو اللہ جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

ہمارے درمیان سے جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ کیا تھے؟ ان کی شہادت کی خبر نے ساری دنیا کو جس طرح سوگوار کیا، اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا کہ ان کی شخصیت اتنی مقبول اور اتنی جاذب تھی کہ ملک کے طول و عرض کے علاوہ پوری دنیا یہ خبر سن کر سکتے میں آجائے گی۔ ذرا اندازہ کریں کہ انھوں نے ۲۰۰۴ء میں فراغت کے بعد عملی میدان میں قدم رکھا اور اس شان سے کہ جلد ہی علمی، ادبی، مذہبی، مسلکی اور خانقاہی نظام میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ اتنی جیزی سے اسید الحق صاحب نے مقبولیت حاصل کی یہ ان کی شخصیت کا ہی کمال تھا۔ تدبر، تحمل، دانشوری، حسن اخلاق جیسے صفات ان کی ذات سے اس طرح متصف ہو چکے تھے کہ ان سے الگ کر کے ان صفات کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ دس سال کی رفاقت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کو کبھی ملول اور افسردہ دیکھا ہو۔ بہر وقت روحانی مسکراہٹ ان کی چہرے پر ایک خاص رونق بکھیرتی تھی، جس سے ملنے جلنے والے ایسا مسحور ہوتے کہ کبھی ان کو بھول نہیں پاتے۔ دوستوں سے ملنے کا انداز ایسا تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا کہ اسید الحق صاحب سب سے زیادہ انہی سے قریب ہیں۔

سچائی یہ ہے کہ صدیوں میں اسید الحق صاحب جیسی شخصیت وجود میں آتی ہے۔ ذرا غور کریں! دس سال کے وقفے میں انھوں نے تقریباً

بلکہ اسی ملاقات میں عملی اقدامات پر انھوں نے گفتگو کی، ساتھ میں خوشتر نورانی صاحب نے لاکھ عمل کے حوالے سے روشنی ڈالی۔ میری حیرت بڑھتی ہی رہی اور میرے اندر غلط فہمیوں کے بت ٹوٹنے رہے، کیونکہ ہم یونیورسٹی والے بھی ایک حصار میں بند رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ روشن خیالی ہماری جاگیر ہے۔ میں اس پہلی ملاقات میں ہی ان کی روشن خیالی اور اولوالعزمی کے سبب ان کا مرید ہو گیا، حالانکہ اسید صاحب ہمیشہ ایک دوست کی طرح پیش آتے تھے، لیکن میں نے ہمیشہ احترام و عقیدت کی نگاہ سے ان کو دیکھا، مجھے آج تک یاد نہیں کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور انھوں نے اس پر تنبیہ کی ہے غور نہ کیا ہو۔

دو سال قبل کی یہی بات ہے کہ میں نے انھیں ایک سرورہ عالمی سیمینار دہلی میں آنے کی دعوت دی تو تمام مصروفیات کو چھوڑ کر وہ تشریف لائے اور سائے کی طرح ساتھ رہنے والے ہمارے دوست خوشتر نورانی نے بھی ہماری دعوت پر شرکت کی۔ یہ عالمی سیمینار جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس سیمینار کا موضوع "سفر ناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی" تھا۔ خوشتر نورانی صاحب کے مشورے سے میں نے دوسرے دن ایک پورا سیشن "صوفیائے کرام کے سفر ناموں" کے عنوان سے مختص کر دیا تھا۔ اس سیمینار میں سات سکون کے مندوبین کے علاوہ پورے ہندوستان سے اردو، فارسی اور عربی زبان کے ماہرین اور اساتذہ موجود تھے۔

اس موقع پر اسید الحق صاحب اور خوشتر نورانی صاحب نے جس انداز سے گفتگو کی اسے تمام حاضرین نے نہ صرف سراہا، بلکہ اکثر لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ ایسے بھی مذہبی اسکالرز موجود ہیں جو تحریر و تقریر پر نہ صرف عبور رکھتے ہیں، بلکہ بھرپور اہلیت کے مالک ہیں۔ اس سیشن کے اختتام کے بعد اکثر مندوبین نے ان سے رابطہ کیا اور آئندہ ملاقات کی آرزو کی۔ (آج بھی میرے پاس وہ سی ڈی موجود ہے جس میں ان کی روحانیت اور علمیت جھلکتی ہے۔)

اس کے بعد اسید الحق صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، ہر ملاقات میں خوشتر نورانی صاحب موجود رہتے۔ ہم لوگوں نے کئی منصوبے بنائے، کچھ پر عمل بھی ہوا اور کئی ابھی تک تکمیل ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اسید الحق صاحب کا ایک منصوبہ تھا کہ سوشل اور

الیکٹرونک میڈیا کو تبلیغ و ارشاد اور اصلاح معاشرہ کے لیے استعمال کرنا ہے۔ اس سلسلے میں "کیو ٹی وی" پاکستان کے مالک حاجی عبدالرؤف صاحب سے بھی ان کی گفتگو ہوئی تھی اور جب وہ ہندوستان آئے تو اس حوالے سے ایک منصوبے کے تحت ہم تینوں نے ان کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ اس میٹنگ میں اسید الحق صاحب کے مشورے سے ایک منصوبہ بنا تھا کہ قرآن کریم میں حیوانات کے حوالے سے جو آیات کریمہ ہیں ان کو پروڈ لائز کیا جائے۔ اسی طرح کے اور بھی کئی انوکھے کنسپٹ نوٹ تھے۔ یہ سب کے سب اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھے جو انفوٹیمینٹ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اللہ کرے کوئی بندہ خدا اس کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

اسید الحق صاحب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے عربک ہینٹل کے اہم ممبر بھی تھے۔ اس ہینٹل کے تحت انھوں نے کونسل کو کئی اہم مشورے بھی دیے، ان میں ایک اہم منصوبہ "اسلامی انسائیکلو پیڈیا" کی تیاری بھی تھی۔

اسید الحق صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کے جانے سے جو غلا پیدا ہوا ہے اس کو پورا کرنا ناممکن ہے۔ انھوں نے ایک دہائی میں جو کام کیا وہ کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اتنی مقبولیت، شہرت، عزت اور سرگرمیاں اسید صاحب کی زندہ کرامات ہیں۔ وہ ہمیشہ لوگوں کے ذہن و دل میں موجود ہیں گے لیکن ان کی یاد میں ہم لوگوں کو کوئی ایسا کام ضرور کرنا چاہیے جو ان کے منصوبے کی تکمیل کی سمت میں ایک کوشش ہو سکے۔ میں چاہتا ہوں کہ "اسید الحق ریسرچ سینٹر" قائم کرنا چاہیے، جس سے تمام اہل علم کو جوڑنے کی کوشش کی جائے تو شاید یہ ان کے لیے ایک بڑا خراج عقیدت ہوگا۔ اس سلسلے میں میں ان کے سب سے زیادہ قریبی اور بے لوث چاہنے والے دوست خوشتر نورانی صاحب سے ہی گزارش کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں قدم بڑھائیں، ہمیں وہ اپنا معاون پائیں گے۔ مذہبی حلقے میں ایسے ریسرچ سینٹر کی بڑی شدید ضرورت بھی ہے۔

□□□

پروفیسر خواجہ اکرام

یہ صدمہ بھلایا نہیں جاسکتا

مولانا اسید الحق قادری اپنے معاصرین میں سب سے بلند مقام پر فائز تھے، دنیا ان کو صدیوں تک یاد رکھے گی

شہیدائے بغداد شریف، فدائے حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ، شہید قادریت علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت نے عالم اسلام کو شدید صدمہ میں مبتلا کر دیا۔ کسے معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے رخصت ہو جائیں گے اور داغِ مفاتح ہمیں برداشت کرنا پڑے گا۔ مرضی مولیٰ ان کی علمی، ادبی اور روحانی خدمات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوئیں اور انہیں شہادت کا عظیم رتبہ حاصل ہوا، آج وہ بارگاہِ غوث اعظم رضی اللہ عنہ میں ابدی آرام گاہ میں انوار و تجلیات سے فیض یاب ہو رہے ہیں اور روزِ محشر خانوادہ قادریہ بدایوں کے اس شہزادے کی حاضری حضرت غوث اعظم کے قافلے کے ساتھ ہوگی اور وہ اپنے خاندان والوں، عقیدت مندوں اور محبین کے لیے آخرت میں مغفرت کا سامان ہوں گے۔ ہم سب کی دعا ہے کہ پروردگار عالم اپنے حبیب سرکار کائنات فخر موجودات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے طفیل انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ یقیناً یہ ایسا صدمہ ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ پیر طریقت مرشد برحق حضرت مولانا شاہ عبدالحمید سالم القادری دامت برکاتہ العالیہ کو اور سب اہل خاندان کو صبر عظیم کی دولت سے نوازے، آمین۔

سنہ ۱۳۸۶ھ میں مولانا قادری مرحوم کے وفد کا بغداد کا سفر ختم کے قریب تھا کہ یہ شدید المناک حادثہ شہادت پیش آگیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس کا آخر وقت جہاں لکھا ہوتا ہے وہیں اس کا انتقال ہوتا ہے، اسباب ایسے بن جاتے ہیں کہ وہ شخص وہاں پہنچ جاتا ہے، مولانا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ عاجز تو بغداد شریف دو مرتبہ حاضر ہو چکا ہے اور حضرت غوث اعظم کے دربار سے دو چادریں بھی عطا ہوئی ہیں۔ یہی دیکھا کہ پورا بغداد چھاؤنی بنا ہوا ہے۔ ایئر پورٹ پر شدید سیکورٹی ہے اور وہاں پرائیویٹ گاڑیوں کی آمد و رفت پر سخت پابندی عائد ہے، وہاں یہی سننے کو ملتا رہتا ہے کہ فلاں جگہ فائرنگ میں اتنے لوگ شہید ہو گئے اور فلاں جگہ دھماکے میں اتنے شدید زخمی ہو گئے۔ ایک مرتبہ تو نامعلوم کیوں اچانک ملٹری کی دو گاڑیوں نے ہمارا محاصرہ کر لیا تھا۔ ایک گاڑی آگے اور ایک گاڑی ڈرائیور کی جانب، کافی دور وہ ساتھ چلتی رہیں پھر اچانک غائب ہو گئیں۔

مولانا قادری مرحوم کی شہادت ملت اسلامیہ کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ انہیں اپنے مشن سے قلبی لگاؤ تھا، وہ بہت مستعدی کے ساتھ علمی خدمات میں مصروف تھے۔ تیس کے قریب بہت معیاری تصنیفات و تالیفات منظر عام پر آچکی تھیں اور متعدد کتابیں مسودات کی شکل میں ہیں جن کو عنقریب ہی طبع ہونا تھا۔ علمائے کرام کی عظمت اور ان کی جلیل القدر خدمات کو باوقار انداز میں نئی نسل کے سامنے پیش کرنا ان کا مقصد تھا اور وہ اپنے مشن میں کامیاب تھے۔ آئی لگن میں انھوں نے اپنی جان عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی شہادت کی خبر ملتے ہی ہر طرف غم و اندوہ کا ماحول چھا گیا۔ فقہوری مسجد میں ہر جمعہ، اتوار اور جمعرات کو محفل ذکر ہوتی ہے، اس میں بھی مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب کیا گیا۔ قرآن خوانی کر کے بھی ایصالِ ثواب کیا گیا، جمعہ کی نماز کے بعد بھی دعائے مغفرت کی گئی۔ مدرسہ اہل سنت جامعہ اسلامیہ مظہر العلوم لونی میں بھی قرآن خوانی کر کے ایصالِ ثواب کیا گیا۔ ۱۱ جمادی الاولیٰ کو بھی گیارہویں شریف کی محفل میں جامعہ اسلامیہ مظہر العلوم اوشاہی مسجد فتحپوری میں بالخصوص مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب کیا گیا اور ان کے فضائل و مناقب کا بیان ہوا۔ احقر مریدین اور عقیدت مندوں نے بھی اپنے طور پر گھروں میں قرآن خوانی کر کے اور کلمہ شریف پڑھ کر ایصالِ ثواب کیا ہے۔

بلاشبہ اہل سنت پر ان کا بڑا احسان ہے، اپنی خداداد علمی صلاحیت اور بلند پایہ اخلاق و کردار کی وجہ سے انھوں نے عالمی طور پر مقبول

حاصل کر لی تھی۔ ہر طرف ان کی تحریروں کی دھوم تھی، اگر عمر وفا کرتی تو وہ مزید بڑے بڑے کام کرتے۔ مرحوم نے اہل سنت کے دلوں میں گھر بنالیا تھا، یہ ان کی بڑی سعادت تھی۔ وہ اچانک چلے گئے، اتنی خاموشی سے جتنی خاموشی سے پھولوں سے خوشبو چلی جاتی ہے۔ آج وہ دلوں کی دہلیز میں جلوہ فرما ہیں۔ میر نے کہا۔

دل میں رہ دل میں کہ معمار قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکان کوئی بنایا نہ گیا

دل سے اور کون سا مکان اچھا ہو سکتا ہے۔ ان کی مفارقت ایک عظیم المیہ ہے، وہ سراپا اخلاص و محبت تھے، ان کا علم بہت وسیع تھا، ان کا معائنہ بہت گہرا تھا، ان کی فکر بہت بلند تھی اور ان کی تحریر شائستہ اور موثر تھی۔ نایاب علمی ذخائر کی تلاش میں وہ ہمہ تن مشغول رہتے تھے اور اس تلاش میں وہ ہر وقت سرگرم رہتے تھے، وہ کوئی بھی مضمون یا مقالہ سرسری طور پر نہیں لکھتے تھے، انھوں نے ہمیشہ نقد و تحقیق کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا، جو ان جیسے جو اس سالہ فضلا میں نایاب ہے۔ مولانا خوشتر نورانی اس مشن میں ان کے دست راست تھے۔ ماہنامہ جام نور میں اور دیگر ادبی و ملی ماہناموں میں ان کے تحقیقی مقالات شائع ہوتے رہتے تھے اور وہ تشنگانِ علوم و فنون کی پیاس بجھاتے رہتے تھے۔ میرا قلم ان کے علم و فضل کو کما حقہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اپنے اس بیان کی دلیل کے طور پر میں ان کے تین مقالے پیش کر سکتا ہوں:

ماہنامہ جام نور شمارہ جون ۲۰۱۳ء میں ان کا بہت مفید مقالہ شائع ہوا تھا، جس کا عنوان ہے ”مولانا حیدر علی فیض آبادی: تیرہویں صدی کی ایک گم نام شخصیت۔“ (ص: ۲۱)

ماہنامہ جام نور شمارہ اپریل ۲۰۱۳ء میں مولانا قادری مرحوم کا ایک نہایت مفید، پر فخر مقالہ شائع ہوا تھا، جس کا عنوان ہے ”مولانا عبدالعزیز بریلوی اور تحریک تحفہ گنبد خضریٰ۔“ (ص: ۱۱)

یہ مقالہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، گنبد خضریٰ کے تحفظ کے لیے علمائے اہل سنت نے کیا تحریکیں چلائی تھیں، اس مقالے کے مطالعے سے وہ سارا منظر سامنے آ جاتا ہے۔

دہلی میں شاہی مسجد فتحپوری سے حضرت مفتی اعظم شاہ محمد مظہر اللہ (۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) اور مولانا مفتی محمد احمد (م ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) نے

بھی اس تحریک میں حصہ لیا تھا اور ایک رسالہ بھی مفتی اعظم نے شائع کیا تھا، جس کا عنوان ہے: کشف الحجاب عن مسئلۃ البناء والقباب مطبوعہ دہلی، ۱۹۲۵ء۔

ماہنامہ جام نور شمارہ مئی ۲۰۱۳ء میں مولانا قادری مرحوم کا ایک اور بہت مفید مقالہ شائع ہوا تھا، جس کا عنوان ہے: ”شش ماہ ہرہ حضور اچھے میاں اور سراج المہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی: علمی و روحانی روابط۔“ (ص: ۵۱)

چھ صفحات پر مشتمل یہ بھی علمی و روحانی انوار و برکات سے معمور ایک مقالہ ہے، جس سے دہلی اور ماہرہ مطہرہ کے اولیاء اللہ کے علمی و روحانی روابط پر واقفیت حاصل ہوتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خانقاہی روابط کس طرح کے ہونے چاہئیں اور مریدین و عقیدہ مندوں کے آداب کیا ہوتے ہیں۔

مولانا قادری مرحوم کی خصوصی توجہ قدیم علمی ذخائر کو منظر عام پر لانے کی طرف تھی اور وہ علمائے اہل سنت کے علمی و روحانی عظیم کارناموں کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ان کی تصانیف اور مقالات عالمی طور پر مقبول ہو چکے ہیں۔ حضرت سید شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی قدس سرہ کے مفصل حالات پر مشتمل ایک صدی پرانی مستند و نایاب کتاب ”تذکرہ نوری“ مولانا قادری مرحوم کی ترتیب و تقدیم کے ساتھ منظر عام پر آچکی ہے۔ میری اس مختصری تحریر سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا قادری مرحوم کی نظر ہر طرف تھی، وہ ہدایوں شریف کی خانقاہ عالیہ قادریہ کے ولی عہد سجادہ نشین تھے، جن کی تربیت حضرت سالم میاں دامت برکاتہ نے قدیم خانقاہی روایات کے مطابق فرمائی تھی۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے، ہر خانقاہ کا وہ ادب و احترام کرتے تھے اور ہر بزرگ کی خدمات کو منظر عام پر لانا ان کا مشن تھا اور اسی وجہ سے ان کی مقبولیت اہل سنت کے ہر طبقے میں تھی۔ وہ اپنے معاصرین میں سب سے بلند مقام پر فائز ہیں اور دنیا ان کو صدیوں تک یاد رکھے گی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور اس پر انوار و تجلیات کی بارش ہوتی رہے، آمین۔

□□□

شاہی امام: مسجد فتحپوری، فتح پوری، دہلی۔ ۶

آفتاب قادریت نصف النہار سے پہلے ہی روپوش

مولانا بدایونی کی شخصیت بہت کم عمر سے میں اہل حق ہند پر روشن تارے کی طرح چمکنے لگی تھی اور اس کی روشنی کا دائرہ دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا

خانقاہ قادریہ بدایونی سے علم و تعلیم اور رشد و ہدایت کے بڑے بڑے تاج دار پیدا ہوئے اور دنیا کو فیا سے علم سے روشن و منور کیا۔ ماضی قریب میں دو عظیم نام سیف اللہ المسلمول حضرت علامہ معین الحق فضل رسول قادری عثمانی بدایونی (۱۲۱۳ھ-۱۲۸۹ھ) اور تاج الحول، مظہر حق عبدالقادر محبت رسول عثمانی (۱۲۵۳ھ-۱۳۱۹ھ) رحمہم اللہ تعالیٰ کے ممتاز اور نمایاں ہیں جن کے علم و فضل کا سوتا کسی نہ کسی حیثیت سے آج بھی جاری و ساری ہے۔ یہ وہی بزرگان دین ہیں جن کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت مجدد دین و ملت امام احمد رضا قادری برکاتی (۱۲۷۲ھ-۱۳۳۰ھ) نے ان کی شان میں قصائد لکھے ہیں۔ مثلاً حضرت تاج الحول کے بارے میں فرمایا:

وقدوة جمعہم تاج الفحول
وما ادرک ما تاج الفحول
اور اپنے نصیذہ چراغ انس میں فرمایا:
ٹھیک معیار سنیہ ہے آج
تیری حب و ولا محبت رسول
یہ اکابر ہمارے لیے سند و حجت ہیں۔

شہید راہ بغداد حضرت مولانا اسید الحق محمد حاتم قادری عثمانی بدایونی مرحوم و مغفور (۱۳۹۵ھ-۱۴۳۵ھ) کا تعلق بھی اسی عظیم علمی خانوادے سے تھا، جنہوں نے اکیسویں صدی عیسوی میں خانقاہ قادریہ بدایونی کو ایک نئے سرے سے متعارف کرا کے اپنے آباؤ اجداد اور اکابر اہل سنت کی عظمت اور علمی خدمات کو زندہ کیا۔ آپ خانقاہ بدایونی کے چشم و چراغ اور اپنے آباؤ اجداد کی علمی وراثت کے امین تھے۔ مختلف علوم و فنون کے جامع ہونے کے ساتھ بڑے وسیع الطرف، متواضع، خلیق اور منساہت تھے۔ اس کا احساس صرف مجھے نہیں بلکہ شہید مولانا اسید الحق عثمانی سے گفت و شنید کرنے والے ہر شخص کو ہوگا۔ مختلف مقامات پر

مختلف نشستوں میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ یادداشت کے مطابق عرس قاسمی برکاتی مارہرہ شریف، عرس عزیزی مبارک پور، دارالعلوم ربانیہ باندہ، جامعۃ البرکات علی گڑھ، امام اعظم سیکنڈا رو کا نفرنس کھنٹو اور روہت ہڈل سپوزیم دارالخیر، جیسر شریف میں خوش گوار ملاقاتیں رہیں۔ مولانا جہاں ملے، بڑی خندہ پیشانی اور ادب و احترام کے ساتھ ملے۔ ان کی گفتگو میں ان کے مکارم اخلاق کے جلوے نظر آتے تھے۔ ایک عظیم خانقاہ سے وابستہ ہونے کا احساس، نہ پدرم سلطان بود کا اظہار۔

شہید راہ بغداد اخلاقی خوبیوں کے ساتھ بہترین و مشفق استاد، جامعہ ازہر مصر کے فارغ التحصیل، باصلاحیت، وسیع المطالعہ، عالم و فاضل اور قلم و قسطاس کے شہنشاہ تھے۔ آپ کے مضامین میں علمی اسلوب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ تحقیق و تنقید، خامہ تلاشی، خیرآبادیات، عربی محاورات ان کی وسعت مطالعہ کی عکاس اور تحقیق و جستجو کی آئینہ دار ہیں۔ خامہ تلاشی کے ذریعے مذہبی صحافت میں نقد و نظر اور تنقید و تبصرہ کا ایک منفرد اسلوب اختیار کر کے روایت و درایت دونوں کا حق ادا کر دیا۔ مولانا شہید مرحوم کی ذات میں بیک وقت ایک محقق و مصنف، ایک مبصر و ناقد، ایک شاعر و سخن فہم، ایک مورخ و ادیب، ایک مترجم و مرتب کے کمالات و اوصاف یک جا نظر آتے ہیں۔ آپ کی متنوع اور کثیر المطالعہ شخصیت بہت کم عمر سے میں اہل ہند پر روشن ستارے کی طرح چمکنے لگی تھی اور اس کی روشنی کا دائرہ دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ اچانک آفتاب قادریت نصف النہار سے پہلے ہی روپوش ہو گیا۔ شہید مرحوم نے اپنی علمی خدمات کی بدولت بہت سے اہل علم کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔

قلبی خدمات کے علاوہ آپ کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد حضرت شیخ الحاج مولانا الشاہ عبدالحمید سالم قادری بدایونی مدظلہ العالی سجادہ نشین آستانہ قادریہ مجیدیہ بدایونی شریف کے عہد سجادگی کے

پچیس سال مکمل ہونے پر شوال ۱۴۲۹ھ/مارچ ۲۰۱۰ء میں پچاس سالہ جشن کو جشن اشاعت کتب کے طور پر منایا اور خانقاہ قادریہ کے علمائے کرام کی پچاس کتابوں کو شائع کر کے اس گولڈن جوبلی کو ایک یادگار جشن بنادیا۔ یہ جشن اشاعت کتب کی حیثیت سے سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

ان علمی و دینی خدمات سے آپ کی علمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وقت کی قدر و قیمت کا احساس جتنا آپ کو تھا اگر ہر ذی علم کو ہو جائے زکا رہا ہے نمایاں انجام دینے والوں کی فہرست بہت طویل ہو جائے۔ شہادت کے وقت بھی آپ کے ہاتھوں علم حدیث کی مقدس کتاب الاربعون النوویہ تھی جس کے مطالعہ میں مستغرق تھے کہ کسی ظالم کی گولی کا شکار ہو کر دارفانی سے دار جاودانی کی جانب کوچ کر گئے۔ حضرت سیدی محدث اعظم ہند کچھوچھو رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی آرزو کا اظہار یوں فرمایا تھا:

موت آئے تو در پاک نبی پر سید
ورنہ تھوڑی سی زمیں ہوشہ سناں کے قریب

اور حضرت مولانا اسید الحق صاحب مرحوم و مغفور کی آرزو انھیں الفاظ کے ساتھ تھی۔ مولانا شہید مرحوم کی شہ جیلاں کے قریب مدفون ہونے کی آرزو دل میں اگلا نیایاں لے رہی تھی اور غوث الاغواث رضی

بقیہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا

کس قدر جگر سوزی کی اور برصغیر پاک و ہند کے کونے کونے سے احواس و آثار جمع کرنے کی جدوجہد کی ہے اور رہتی دنیا تک اپنے لیے صدقہ جاریہ کا اہتمام کر گئے۔ صد افسوس کہ عالم اسلام کا یہ معروف و جوان اسلامی اسکراور مقبول عام ادیب و محقق جن کی اپنی، مدری زبان اردو کی طرح عربی لسان و لغت پر بھی گہری نظر تھی۔ اپنے والد گرامی، حضرت مولانا شیخ عبدالحمید سالم میاں قادری دامت برکاتہم العالیہ (سجادہ نشین خانقاہ عالیہ قادریہ بدایونی شریف) اور برادر اصغر مولانا محمد عبدالغنی عطیف میاں قادری زید مجدد اور چند دیگر احباب کے ساتھ حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار اقدس بغداد شریف پہ حاضری کے بعد حضرت شیخ محمد توفیق گیلانی دامت برکاتہم العالیہ سے شرف ملاقات کے لیے ان کے دولت کدے پر اربل (کردستان، عراق) جا رہے تھے کہ اسلام دشمن دہشت گردوں کے حملے میں شہید ہو گئے اور سیدنا امام حسین عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سنت پر عمل پیرا ہو کر گل گون قبالباس میں احاطہ آستانہ سیدنا غوث اعظم شیخ سیدی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں آسودہ خاک ہو کر خلد آشیان ہو گئے۔

قادری بودن رضا رامفت باغ غلداد

اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ حضرت صاحب سجادہ سالم میاں زید مجددہ اور دیگر متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہمیں ان کا فم البدل عطا فرمائے۔ □□□

☆ صدر: ادارہ تحقیقات امام احمد رضا (انٹرنیشنل)، کراچی (پاکستان)

اللہ تعالیٰ عنہ نے باب الشیخ کی زمین انھیں آرام فرمانے کے لیے سپرد فرمادی۔ سنا ہے کہ مولانا شہید مرحوم نے کسی موقع پر یہ کہا تھا کہ: جینے کے لیے مدینہ اور مرنے کے لیے بغداد پسند کرتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مولانا شہید مرحوم کو یہ عظمت نسبت قادریت کی برکت سے حاصل ہوئی اور شہادت کی سعادت نسبت عثمانی کی برکت سے۔ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلاوت قرآن حکیم میں مستغرق تھے اور جام شہادت نوش فرمایا اور آپ کی اولاد و امجاد سے نسبت رکھنے والے اسید عثمانی مطالعہ حدیث میں مستغرق تھے اور جام شہادت نوش کر کے باب الشیخ بغداد میں ابدی نیند سو گئے۔ قابل رشک ہے یہ صدقہ اور قابل افتخار ہے جو مرغوث پاک۔ آپ کی شہادت سے اہل سنت و جماعت کا بڑا نقصان ہوا ہے اور خانقاہ قادریہ جس کی مولانا مرحوم کی کوششوں سے نشاۃ ثانیہ ہو رہی تھی آج بھی اس کے درو دیوار سو گوار ہیں۔

میں آپ کے والد ماجد حضرت شیخ مولانا الشاہ عبدالحمید محمد سالم قادری مدظلہ العالی اور پسماندگان و متوسلین و معتقدین کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین □□□

☆ صدر: شعبہ افتاء، جامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

بقیہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا

کس قدر جگر سوزی کی اور برصغیر پاک و ہند کے کونے کونے سے احواس و آثار جمع کرنے کی جدوجہد کی ہے اور رہتی دنیا تک اپنے لیے صدقہ جاریہ کا اہتمام کر گئے۔ صد افسوس کہ عالم اسلام کا یہ معروف و جوان اسلامی اسکراور مقبول عام ادیب و محقق جن کی اپنی، مدری زبان اردو کی طرح عربی لسان و لغت پر بھی گہری نظر تھی۔ اپنے والد گرامی، حضرت مولانا شیخ عبدالحمید سالم میاں قادری دامت برکاتہم العالیہ (سجادہ نشین خانقاہ عالیہ قادریہ بدایونی شریف) اور برادر اصغر مولانا محمد عبدالغنی عطیف میاں قادری زید مجدد اور چند دیگر احباب کے ساتھ حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار اقدس بغداد شریف پہ حاضری کے بعد حضرت شیخ محمد توفیق گیلانی دامت برکاتہم العالیہ سے شرف ملاقات کے لیے ان کے دولت کدے پر اربل (کردستان، عراق) جا رہے تھے کہ اسلام دشمن دہشت گردوں کے حملے میں شہید ہو گئے اور سیدنا امام حسین عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سنت پر عمل پیرا ہو کر گل گون قبالباس میں احاطہ آستانہ سیدنا غوث اعظم شیخ سیدی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں آسودہ خاک ہو کر خلد آشیان ہو گئے۔

قادری بودن رضا رامفت باغ غلداد

اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ حضرت صاحب سجادہ سالم میاں زید مجددہ اور دیگر متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہمیں ان کا فم البدل عطا فرمائے۔ □□□

☆ صدر: ادارہ تحقیقات امام احمد رضا (انٹرنیشنل)، کراچی (پاکستان)

تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا

مولانا سید الحق قادری نے برصغیر میں پہلی بار مذہبی ادب میں صالح اور اصلاحی نقد و نظر کی بنیاد ڈالی

۳- مدرسہ و خانقاہ کی قدیم لائبریری کی جدید خطوط پر فہرست بندی اور کمپیوٹر سیزیشن۔

(واضح ہو کہ مدرسہ قادریہ بدایوں کی لائبریری میں اسلامی علوم، فنون پر جدید و قدیم کتب و مخطوطات کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے، جس پر فراخ دلی کے ساتھ محققین کی مدد کی جاتی ہے۔)

۴- تاج اللہ اکید کی قیام اور اس کے تحت اپنے بزرگوں کی تقریباً سو (۱۰۰) تصانیف (عربی، اردو اور فارسی) کی جدید ترتیب، تخریج، تفسیر اور قدیم و ترے کے ساتھ شاعت۔

ان کی ان علمی، فنی اور تحقیقی کاوشوں نے نئی نسل کے علما میں ایک حرکی قوت پیدا کر دی۔ اہل سنت و جماعت میں جدید خطوط پر تحقیق و تصنیف کے عمل کی تشویق و ترغیب پیدا ہوئی اور نئے لکھنے والوں کی ایک اچھی نیم سے آئی، جو مستقبل میں ان شاء اللہ اعزیز ان کے چھوڑے ہوئے علمی و تحقیقی کام کو آگے بڑھاتی رہے گی۔

۵- انھوں نے برصغیر میں پہلی بار مذہبی ادب میں صالح اور اصلاحی نقد و نظر کی بنیاد ڈالی، محترم شخصیات سے عقیدت و محبت رکھتے ہوئے بھی غیر جانب دار اور معروضی رویہ اپنی تحریروں میں برقرار رکھا۔

۶- ان کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے برصغیر کے معروف شہروں، خیر آباد، رامپور، بریلی، مراد آباد، میرٹھ، بدایوں، لکھنؤ، آہاد اور ٹونک کے مدارس کی اہم علمی شخصیات اور ان کے علمی تاثر پر تحقیقی اور علمی کام کیا اور اسے تاریخ کا حصہ بنایا۔ اس ضمن میں ان کی ایک کتاب ”خیر آبادیات“ پر خیر آبادی علم و فضل کے احوال و احاطہ پر لکھی گئی ہے، آپ مطالعہ فرمائیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت محقق علیہ الرحمہ نے مجاہد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور ان کے اسلاف و اخلاف اور ان کے علمی تاثر کو اکٹھا کرنے کے لیے ————— بقیہ صفحہ نمبر 167 پر

فاضل جمیل، عالم ذیل، حضرت مولانا سید الحق قادری عثمانی، ولی عہد خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف کی شہادت کی خیرین کراہل سنت و جماعت کا ہر فرد دل گرفتہ اور افسردہ ہے، ہر آنکھ ان کی جدائی کے غم میں نم ناک ہے۔ انھوں نے اپنی عمر مستعار کے مختصر عرصے میں تحقیق و تصنیف، تالیف و تدقیق، تسہیل و تخریج اور ترتیب و تقدیم کے میدان میں جو گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں وہ ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے جو سہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ وہ بلاشبہ نئی نوجوان نسل میں علم و تحقیق کی دنیا کی ایک ہی ناز اور معتبر شخصیت تھے۔ ایک بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل انسان تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ نوجوان علم و فضلا کی ایک مثالی (آئیڈیل) شخصیت تھے تو یقیناً بے جا نہ ہوگا۔

صبیعت میں سنجیدگی، متانت، تواضع اور انکسار کا طرہ امتیاز تھا، وہ عالم اسلام کی عظیم و قدیم جامعہ ”جامعہ الازہر الشریف“ کے برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے نوجوان فارغ التحصیل فضلا میں ایک انفرادی اور امتیازی شان کے مالک تھے۔ تحریر ہو یا تقریر، تدریس ہو یا وعظ و خطابت وہ ہر میدان کے شہسوار تھے، انہی خوبیوں کی بنا پر وہ ہر حلقے میں ہر دل عزیز تھے۔ امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین رضوی رحمۃ اللہ علیہ کے سرفہرست خاص شاگردوں میں آپ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

۵۰ سے زیادہ مقالات (عربی، اردو، فارسی) ۱۲ سے زیادہ (عربی اردو) کتب کے مصنف اور ۵۵ سے زیادہ عربی، اردو، فارسی کتب کی تحقیق، تسہیل، ترتیب و تفسیر کے علاوہ آپ کا عظیم کارنامہ۔

۱- اپنے آبائے کرم قدس سرہم کی ۸۰۰ سالہ خانقاہ قادریہ کے روحانی اقدار کی از سر نو بحالی۔

۲۰- ۲۰۰ (۲۰۰) مدرسہ قادریہ کی جدید خطوط پر نشاۃ ثانیہ۔

حلم و تدبر، فکر و فن اور علم و تحقیق کا پیکر

اس قدر کم عمر میں ایسا اچھا عالم میں نے نہیں پایا، اسلاف میں تو اس کی مثالیں ملتی ہیں، مگر عصر حاضر میں بالکل نایاب ہیں

کر دار کے حامل تھے، مولانا سید الحق بھی انہی کی روش پر گامزن تھے، اور ان کے سچے وارث۔

آپ اہل سنت و جماعت کے درمیان اتحاد کے داعی تھے اور کسی فرعی مسئلے کو ہوادے کر سنیوں کے اندر اختلاف و انتشار کی فضا قائم کرنے کے قائل نہ تھے۔

علامہ سید الحق ”پدرم سلطان بود“ پر کار بند نہ تھے، اسی لیے آپ نے اپنے اندر ہر طرح کی علمی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ امام علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں رہ کر خوب خوب استفادہ کیا۔

فقیر انفس حضرت علامہ مفتی محمد مطیع الرحمن رضوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کے خوان علم سے بھی فیض یاب ہوئے۔ پھر جامعہ الازہر مصر جا کر تخصص فی التفسیر کی ڈگری حاصل کی، شعر و شاعری اور اردو ادب سے بھی جا بجا شغف تھا، تنقید کے فن سے بھی بطور خاص واقف تھے، غرض اس قدر کم عمر میں ایسا اچھا عالم میں نے نہیں پایا، اسلاف میں تو اس کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن عصر حاضر میں تو بالکل نایاب اور نہ کے برقرار ہیں۔

اسی دنیا میں عالم دین تھے، سنجیدگی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وقار و مہکتی بھی تھا، مگر تواضع کے ساتھ، علما و اکابر کی خوب قدر کرتے، جن سے ملنے ٹوٹ کر ملتے، تکبر سے دور اور بہت دور تھے، جنھوں نے صرف انھیں سنا تھا وہ شاید انھیں پورے طور سے نہیں سمجھ سکتے مگر جنھوں نے ان سے براہ راست رابطہ رکھا، ملاقاتیں کیں وہ ان کی عالی شان خوبیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ کم عمر ضرور تھے مگر اسلاف کرام کے نقش قدم کو اپنایا، آپ نے چھٹ پنے میں بزرگوں کی

یادگار اکابر بدایوں، محقق و مدقق، ادیب و مفکر حضرت مولانا سید الحق عاصم القادری بدایونی کی اچانک شہادت کی خبر مورخہ ۲۴ مارچ ۲۰۱۲ء بروز شنبہ اس وقت ملی، جب راقم الحروف اپنے تبلیغی دورے پر مالے گاؤں (ضلع ناسک) گیا ہوا تھا۔ طبیعت کسی طرح اس خبر پر یقین کرنے کو تیار نہ ہوئی، ایسا لگا کہ شاید یہ خبر صحیح نہیں، دوسری کسی اچھی خبر کا انتظار کرنے لگا۔ مگر متعدد فون اور دیگر ذرائع نے اس خبر وحشت اثر کی جب تصدیق کر دی تو یقین کیے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔ اسی روز ”مسجد تاج الشریعہ“ مالے گاؤں میں ناچیز کا ”مسجد اور ہماری ذمہ داریاں“ کے عنوان سے بیان ہوا تھا، اختتام محفل پر ایصال ثواب اور تعزیتی نشست کا اہتمام ہوا جس میں شہید بغداد مولانا سید الحق قادری بدایونی کو خراج عقیدت اور تعزیتی کلمات پیش کیے گئے۔

شہید بغداد مولانا سید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ حلم و تدبر کے پیکر تھے اور فکر و فن، علم و تحقیق گویا آپ کی کھٹی میں پلائے گئے تھے، اختلاف و انتشار سے کڑھنا اور راہ اعتدال پر جاہد پیر رہنا آپ کی طبیعت کا یہ تھی۔

حساس شخصیتیں عمر کے آخری حصے میں کہا کرتی تھیں کہ ”وقت کم ہے اور کام زیادہ“ لیکن آپ نے جوان عمر ہی میں اس مقولے کو صرف یہی نہیں کہ کہا بلکہ برتا بھی، جیسا کہ مدت قلیل دس بارہ سال میں آپ کی تبلیغی و تصنیفی نیز تحقیقی مساعی پر نظر ڈالنے سے واضح ہے، اس قلیل مدت میں نہایت عمدہ اور معیاری انداز سے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر سو سے زائد کتب و رسائل کی اشاعت کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ تھلب فی الدین اور استقامت علی الحق آپ کا شیوہ تھا، آپ کی شائع کردہ کتابیں اس پر شاہد عدل ہیں۔ اکابر بدایوں رو بندہ یہاں میں نمایاں

مثال قائم کی جب کہ اس کی مثال بہت مشکل سے ملا کرتی ہے، آج وہ ہم میں نہیں مگر ان کی ایک ایک ادایا آتی ہے۔ مبارک پورا آتے مجھ سے پتہ لگا کر ملتے، مارہرہ شریف جاتے، تلاش کر کے ملاقات کرتے، نیک مشوروں کی درخواست کرتے، کوتاہیوں کی نشاندہی کے لیے کہتے۔ حالانکہ میں کچھ نہیں، پھر بھی میں جو کچھ کہتا، بغور سنتے اور شکر گزار ہوتے، آج ذرا سا علم ہو جاتا ہے تو لوگ آسمان چھونے لگتے ہیں، دماغ عرش پر چد جاتا ہے، پاؤں زمین پر نہیں پڑتا۔ ان کی صلح پسندانہ طبیعت کا ذکر کرتے ہوئے ”تذکرہ نوری“ کے حالیہ ایڈیشن میں شرف ملت ادیب عصر حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی مارہروی مدظلہ العالی نے جو تقریظ سپرد قلم کی ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، بڑے جاوے سے اشرف میاں خامہ طراز ہیں:

”تذکرہ نوری“ (مدارج حضور نور) میں مولانا قاضی غلام شہر صاحب (بدایونی) نے جس شخص، ترتیب اور تاکید کے ساتھ خانوادہ برکات کا اجمالی اور اس خاندان کے گل سرسبد حضرت نوری میاں صاحب قبلہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے وہ پہلے بھی اہل دل و اہل نظر سے داو لے چکا ہے اور اس اشاعت جدیدہ میں مزید قابل تحسین ہو گیا ہے کہ اسے سنوارنے کا کام عزیز گرامی قد رمولانا سید الحق قادری کے اُن ہاتھوں سے ہوا ہے جو باتوں اور معاملات کو الجھتے نہیں، بلکہ سچ و درج معاملات کو سلجھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ فتنوں اور فتنہ پروروں سے دور و فطور ہیں اور خالص علمی انداز تحقیق کے تحت کتب قدیمہ کو دل پذیر اور عقدہ کش حواشی اور دیگر معلومات کے اضافوں کے ساتھ منظر عام پر لارہے ہیں۔ یہ کام ان کے ہاتھوں تو اتار کے ساتھ ہو رہا ہے اور اسی طرح اپنے علمی خانوادے اور خانقاہ کی نھاۃ ثانیہ کے کام میں اپنے والد کی سرپرستی میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔

ان کا انداز تحریر اور متن ایسا ہوتا ہے کہ ان کے لکھے سے کسی اپنے کو جرات نہیں پہنچتی۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ تحریری فتنوں کی سرکوبی میں اس نوجوان عالم دین اور معروف و قدیم خانقاہ کے فرد متین نے قلم کا ہتھیار بھی استعمال کیا ہے اور مومن نہ فراست کے پیش نظر خاموشی کا انداز بھی اختیار کیا ہے۔ ...

کچھ نہ کہنا بھی اک انداز بیاں ہوتا ہے

مرشدان مارہرہ کی دعائیں اور خود ان کے بزرگوں کی بڑائی ان کے ساتھ رہتی ہے جو انھیں بار بار ترغیب دیتی ہے کہ کھوئے ہوئے سروں کو تلاش کرو، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑو، پرانے زخموں کی نمائش نہ کرو، ان پر صبر کا ٹھنڈا ٹھنڈا مرہم رکھ لو، تاکہ قافلہ سواد اعظم کی دراڑیں ختم ہوں اور سواد اعظم کا ہر فرد یہ محسوس کرے کہ وہ آپس میں ایسے شیر و شکر ہیں کہ جیسے بدن کے مختلف اعضا آپس میں وابستہ ہوتے ہیں۔ تاکہ سواد اعظم کا روحانی، علمی اور سماجی سفر ایک نئی امنگ، نئی امید اور ایک نئی تیاری کے ساتھ ایسے راستے پر گامزن ہو جس کی منزل اہل سنت و جماعت کی عظمت رفتہ کی ہا زیا بی ہو۔“

(تقریظ تذکرہ نوری، ص: ۱۵-۱۶، تاج المجلد اکیڈمی بدایوں، ۲۰۱۳ء)

حضرت شرف ملت کے مذکورہ کلمات حضرت اسید میاں کی عظمتوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی درس عبرت ہیں۔ اسید میاں تو اب ہم میں نہ رہے، لیکن فکر و فن اور علم و تحقیق کی انھوں نے جو جوت جگائی ہے وہ آئندہ نسلوں کے لیے ضرور مشعل راہ ہے۔

عربی دانی کے اعتبار سے بھی مولانا سید الحق کا مقام بڑا بلند تھا۔ ”عربی محاورات“ نامی ان کی کتاب دلیل کی حیثیت سے پیش کی جاسکتی ہے جو ایک عمدہ پیش رفت ہے اور اس کی خوبیوں کا اہل علم نے برملا اعتراف کیا ہے۔

”قصیدتان راکتان“ جو مدارج فضل الرسول اور مجاہد فضل الرسول کا مجموعہ ہے، یہ دونوں قصائد اعلیٰ حضرت، امام اہل سنت محدث بریلوی قدس سرہ (م ۱۳۴۰ھ) نے سیف اللہ المسلمول حضرت معین الحق فضل رسول عثمانی بدایونی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۲۸۹ھ ۱۲۸۷ھ) کی شان میں کہے، جو عربی زبان میں ہیں اور تین سو تیرہ (۳۱۳) اشعار پر مشتمل ہیں اور دونوں نام تاریخی ہیں (۱۳۰۰ھ) جن میں حضرت سیف اللہ المسلمول کی دینی و اصلاحی خدمات اور ان کی عظمتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور ان سے اپنے گہرے لگاؤ کا بھی اظہار کیا ہے۔ ان قصائد سے اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی عربی زبان و ادب پر قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے، ان قصائد کے قلمی نسخے کا کس لے کر شائع کرنے کا شرف سب سے

پہلے ”المجمع الاسلامی“ مبارک پور کو حاصل ہوا۔ یہ خطی نسخہ خانقاہ قادریہ بدایوں سے فراہم ہوا تھا اور اصل اب بھی وہاں محفوظ ہے۔

مولانا سید الحق قادری نے ان دونوں قصیدوں کی کئی حیثیت پر بڑا پر مغز مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو تقریباً سو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ ترجمہ و تشریح کا کام مولانا نے مدرسہ قادریہ بدایوں کے ایک قابل استاذ مولانا عاصم اقبال مجیدی بدایونی سے کرایا ہے، جس میں موصوف کی گرامی اور توجہ ضرور رہی ہوگی، اصل کام تو ترجمہ و تشریح کا ہے جسے مترجم و شارح نے بحسن و خوبی انجام دیا ہے، جسے اہل علم ہی محسوس کر سکتے ہیں مگر مولانا سید الحق مرحوم کا مقدمہ بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ مولانا نے مقدمے میں ہر ہر حیثیت سے ان قصیدوں کے مقام و مرتبے کو اجاگر کیا ہے، فن عروض کے اعتبار سے بھی ان کی حیثیت متعین کی ہے، موضوعات پر بھی بحث ہے، تحقیق و تلاش کے بعد مولانا نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ دونوں قصیدوں کے تین سو تیرہ اشعار میں قافیہ کہیں بھی مکر نہیں اور اگر کہیں ہے تو صورتاً ہے، معناتاً نہیں، پھر ان اشعار کو پیش کر کے مکر الفاظ کی تشریح کر دی ہے اور بتا دیا ہے کہ دونوں مقامات پر کون کون سے معنی مراد ہیں۔

مزید برآں لسانی جائزہ، قرآنی اقتباسات، حدیثی اشارات، امثال و محاورات، و جوہ بلاغت، اسرار نحو و لغویہ کے عنوانات قائم کر کے بھی ان قصائد کا جائزہ لیا ہے۔ اس مقدمے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر رشید عبیدی بخدادی نے قصیدتان راکتان کی جو شرح لکھی ہے اس کے تسامحات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور شارح نے جہاں جہاں غلطی کی ہے ان کی دلائل کی روشنی میں نشاندہی کی ہے، ڈاکٹر عبیدی کی کل اکتالیس (۳۱) مقامات پر پائی جانے والی لغزشوں پر تنبیہ کرنے کے بعد آپ نے لکھا ہے۔

”سر دست یہ اکتالیس مقامات ہیں جو غور فکر اور نظر ثانی کے

مقتضی ہیں، ان کے علاوہ چند ایک مقامات اور ہیں جہاں فاضل بخدادی نے شعر کی زبان یا عروض پر اپنے تامل کا اظہار کیا ہے، لیکن وہاں بھی صورت حال وہی ہے جو آپ نے ان اکتالیس مقامات میں ملاحظہ فرمائی اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ... مع

عیب دے جملہ بکفقی ہنرش نیز بگو

یہ لکھنا ضروری ہے کہ کسی فنی شہ پارے کے تحقیق و تعلیق کا جو رائج علمی طریقہ ہے، فاضل بخدادی ڈاکٹر رشید عبیدی کی زیر نظر شرح و تحقیق (چند تسامحات کے استثناء کے ساتھ) اس پر پوری اترتی ہے، انھوں نے بڑی باریکی اور فنی مہارت سے قصیدوں کا مطالعہ کیا، زبان کا تجربہ کیا، عروضی و قوافی پر غور کیا، شعریت اور حسن ترسیل کو پرکھا پھر جو خوبیاں یا خامیاں ان کو محسوس ہوئیں انھوں نے سب سے کم و کاست خالص علمی پیرایے میں ان کو زینت قرطاس کر دی۔

ان کی اس شرح و تحقیق سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عرب بالخصوص عراق کے علمی حلقوں میں ان قصیدوں کے ممدوح حضرت سیف اللہ المسلمول اور ناظم، حضرت فاضل بریلوی کے علمی مقام و مرتبے کا تعارف ہوا۔“ (مقدمہ قصیدتان راکتان، ص ۹۷-۹۸، تاج المجلد اکیڈمی، بدایوں)

اس مقدمے کے ذریعے حضرت مولانا سید الحق قادری نے بہت سے اہم گوشوں کو واضح کیا ہے جن پر عام قاری، بلکہ محقق کی بھی نظر نہیں جاسکتی تھی، مولانا کا یہ بھی ایک بڑا علمی اور فنی کارنامہ ہے جس کی داد دی جانی چاہیے۔ مولانا پر لکھنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے، مگر وقت کی قلت دامن گیر ہے، اس لیے انہی سطروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ □□□

جہاں جہاں: دارالعلوم قادریہ، چریا کوٹ، ضلع مولوی

ان کی یاد ہمیشہ دل کا زخم بنی رہے گی

مولانا اسید الحق کا جانا ہندوستان کے علمی تاج سے کوہ نور چھن جانے کے مترادف ہے

ہندوستان کے علمی تاج سے کوہ نور چھن جانے کے مترادف ہے۔ علم و فضل کے جوہر سے متصف افراد جو کچھ کھاتے ہیں وہ تو ہمارا اثاثہ ہے ہی، مگر جو ہزار کتابیں اور بے شمار حکایتیں ان کے لبوں کی جنبش اور نگہوں کی حلاوت سے لے کر ان کی نشست و برخاست کے پہلو و انصاف میں مضمر ہوتی ہیں، ان کا نو کون کھڑے رکھ رہے؟ اسید الحق کی جدائی سے ان کی شخصی مدارات اور مجوسی تبرکات سے محرومی کا احساس بحیثیت دوست مجھے ہمیشہ رہے گا اور ان کی یاد ہمیشہ دل کا زخم بنی رہے گی۔

مولانا اسید الحق کی زندگی کی طرح ان کی شہادت بھی یادگار ہو کر رہ گئی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار گہر بار میں حاضری ملی جو دائمی حضور کی بدلی گئی۔ خانقاہ قادریہ ہندوستان میں حدیقہ قادریت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں سے قادری فیض کے چشمے جاری دسری ہیں۔ مولانا اسید الحق اور ان کے خانوادے کے تمام بزرگوں نے حضور غوث اعظم سے اپنی نسبت غلامی پر فخر کے اظہار کو اپنی زندگی کا سرنامہ بنائے رکھا اور شاید اس اظہار غلامی کی قبولیت ہی کا ایک اشارہ ہے کہ آج دربار غوث اعظم کے احاطے میں خانقاہ ہدایوں کی غلامی کا ایک با عظمت نشان قائم ہوا ہے، جسے لوگ تربت مولانا اسید الحق قادری کہتے ہیں۔ ربانی دنیا تک عقیدت کے جتنے کارواں بارگاہ غوث الاعظم میں حاضری دیں گے۔ وہ اس ”ہمد غوثیت“ کی قبر اطہر پر بھی چند لہجوں کے لیے رک کر اس کی لوح پر درج اس عبارت کو پڑھیں گے۔

”العلامة المرحوم الشهيد عاصم القادری ابن الشیخ سالم البدایونی ابن المفتی عبدالقدیر البدایونی“

اور مولانا اسید الحق اور ان کے خانوادے کے شرف غلامی پر رشک کریں گے۔ کیا عجب کہ ان میں سے بعض خالص خدا کو اس تربت کے ذرے ذرے سے اتھک ہوئی اسید شہید کی یہ صدا بھی سنائی دے جائے:

غوث اعظم کی غلامی عاصم اپنی پہچان ہے کیا ہونا ہے
ملازم: نعت رنگ، 306-B بلاک 14، گلستان جوہر، کراچی (پاکستان)

انسان مرحوم ہو جاتے ہیں، مگر یادیں نہیں ہوتیں، وہ پس ماندگان کو ترپاتی بھی ہیں اور بہلاتی بھی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا فرات ہے کہ جہانے دلے کے محاسن کا تذکرہ کیا کرو اور حق یہ ہے کہ یاد کا یہ حسن جانے والے کے لیے خود بخود دعا کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ مولانا اسید الحق قادری مجھے کئی نسبتوں سے عزیز تھے۔ علم، تہذیب، شائستگی، اخلاق، مروت، وضع داری، شرافت اور خاندانی و چاہت کے کتنے ہی رنگ ان کی شخصیت سے وقار کو نمایاں کرتے تھے۔ مولانا اسید الحق نے مختصر عمر پائی مگر علمی، دینی اور ادبی موضوعات پر ان کی کتب کی تعداد دیکھ کر ہم سب کو حیرت ہوتی ہے کہ تدریسی ذمہ داریوں اور محافل و مجالس میں خطابات کے ساتھ ساتھ یہ تحریری کام کس طرح ممکن ہوا۔ انہوں نے اپنے خانوادے کی علمی میراث کو جس طرح تازہ کیا اور اس میں جتنے اضافے کیے وہ تائید الہی کے بغیر ممکن نہ تھے۔ مجھے ان کی صلاحیتوں اور توفیقات پر ہمیشہ رشک آتا تھا۔ مولانا خوشتر نورانی اور وہ جس طرح ہندوستان کی علمی دنیا میں مصروف کار رہے اور جتنے محاذوں پر بہرہ آزا ہوئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ”جام نور“ جیسے زندہ رسالے سے ان کی وابستگی بھی ہماری علمی دنیا کو فکری آسودگی فراہم کرتی رہی۔ کتنے فراموش شدہ عنوانات اور شخصیات پر کام کے ڈول ڈالے گئے۔ کتنے دعوتی، علمی اور تحقیقی کاروانوں کو نئی کیمتیں میسر آئیں۔ اس کی زندہ گواہی جام نور کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا اور بہت کم وقت میں۔ اپنے معاصرین میں اپنی ایک عددہ شہرت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بالخصوص جام نور میں خدمت تاشی کے عنوان سے ان کے ایک مستقل مضمون نے بہت شہرت حاصل کی، جس میں ان کی ادبی اور تنقیدی صلاحیتیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آئیں اور ان کی ذہانت اور جملہ طرازی کے جوہر بھی کھلے۔

محمد حسن عسکری نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ہمارے درمیان بڑے آدمی کی موجودگی ایک تہذیبی قوت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسید الحق قادری کی شہادت پر بھی اس تہذیبی قوت سے محروم ہو جانے کا شدید احساس

مولانا اسید الحق قادری: ایک کثیر اللسان نابغہ

وہ ایک وقت ایک محدث، ایک مفسر، ایک منطقی، ایک فلسفی، ایک تاریخ دان، زبان و بیان پر عبور رکھنے والے ادیب اور عالم تھے

میرا خیال تھا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات اکثر ایک رتے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ صرف دین کے ہو جاتے ہیں اور سوائے چند دینی معومات کے کچھ اور نہیں جانتے۔ یا اگر وہ دین کے بارے میں معومات رکھتے ہیں تو اس میں اس قدر کھوجاتے ہیں کہ اسد ف پر طعن و تشنیع کا دروازہ کھول دیتے ہیں اور اپنا سکہ جمانے کے لیے دین کی آڑ میں دنیا کمانے کے لیے پیٹرے بازی سے کام لیتے ہیں۔ پھر ان میں زیادہ تر لوگ خطابت کے مرد میدان ہوتے ہیں، علم و فکر اور فن و ادب سے ن کا صرف واجبی سعلق ہوتا ہے۔ اپنے خطبات میں جب اشعار پڑھتے ہیں تو انہیں بھی بے وزن کر دیتے ہیں۔ لیکن ہر کچے میں کچھ مستثنیات ضرور ہوتے ہیں، اس لیے دینی خدمت کرنے والے بہت سے لوگوں پر اس تاثر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پھر بھی ایک بات کہ بغیر اس نہیں رہ سکتا کہ دینی مدارس سے وابستہ حضرات میں بیشتر تقریر کے میدان کے شہسوار ہوتے ہیں، قلم کے دھنی نہیں ہوتے اور اگر قلم کے دھنی ہوں بھی تو ان کی تحریریں عالمانہ تمکنت تو پائی جاتی ہے، ادبیانہ شان نہیں ہوتی۔ لاکھوں علمائے دین میں ابورکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دہلوی جیسے قلم کے دھنی خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی جو عمر میں مجھ سے اٹھائیس برس چھوٹے تھے، کیوں کہ ان کی پیدائش ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی اور مجھے پانے آب و گل میں قدم رکھنے کا حکم ۱۹۷۷ء میں ملتا تھا۔ اس لیے جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو میرے پندار بزرگی نے اسید الحق کو مدرسے کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے دکھایا۔ لیکن میں نے ان کی آنکھوں کی ذہانت اور گفتگو میں وہ متانت پائی کہ اقبال کا مصرع یاد آ گیا: مع جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

چنانچہ ان سے مل کر میرا سنی بزرگی کا زعم یک لخت ختم ہو گیا۔ صلیح رحمانی ایک نوجوان ہیں، جن کی ذہانت اور دنیائے نعت

سے ہمہ جہتی وابستگی نے مجھے ان کا گردیدہ بنا رکھا ہے۔ ان کی ہمشیرہ کی شادی تھی۔ انہی دنوں مولانا خوشتر نورانی اور مولانا اسید الحق کراچی آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان دونوں حضرات سے میری بھی ملاقات ہوئی۔ پھر میں نے ان دونوں کو اپنے غریب خانے پر آنے کی دعوت دی۔ ہفتہ ۲۷ رزی الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۲۰۱۰ء کی شام میں مولانا خوشتر نورانی تو اپنی کسی دوسری مصروفیت کے باعث نہ آ سکے لیکن مولانا اسید الحق، صلیح رحمانی کے ہمراہ ہر وقت پہنچ گئے۔ ان سے گفتگو کرنے کے دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ دینی مدارس سے تعلیم پانے والے لوگوں میں بھی حس مزاج ہوتی ہے اور ذہانت کے لمحات بھی پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے میرا چھوٹا سا کتب خانہ بھی دیکھا جو بے ترتیب تھا۔ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ترجمے کو انہوں نے خصوصی دلچسپی سے ملاحظہ کیا۔ معلوم ہوا تفسیر کے مترجم حضرت مولانا شاہ محمد عبدالقادر قادری بدایونی، اسید الحق صاحب کے جد ہیں۔ پاکستان میں اس تفسیر کی طباعت پر انہیں خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔

ان دنوں پاکستان سے ایک مذہبی ٹی وی چینل کیو ٹی وی QTV سے ”خوشبوئے حسان“ کے عنوان سے نعت پر ایک ہفتہ وار پروگرام نشر ہوتا تھا، جس کے میزبان صاحبزادہ تسیم صابری تھے۔ مولانا خوشتر نورانی اور مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کو اس پروگرام میں بھی دیکھا۔ مولانا لطف بدایونی کی نعتیہ شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دونوں مہمان حضرات لطف بدایونی کی شاعری کے محاسن بیان کرنے میں بھرپور تنقیدی بصیرت اور شعور و نقد کا اظہار کر رہے ہیں۔ مولانا اسید الحق قادری صاحب کی ذہانت وہاں بھی نمایاں اور جداگانہ رنگ میں ظاہر ہو رہی تھی۔

پاکستان سے واپس جا کر مولانا اسید الحق نے ”جام نور“ میں اپنا سفر نامہ لکھا۔ اس سفر نامے کی خواندگی سے کھلا کہ وہ نوجوان کس قدر ذہین ہے۔ اس سفر نامے میں جزویات کو بھی کھل کر اور تفصیل کے ساتھ

علامہ بدایونی کا علم ان کی عمر سے کوسوں آگے تھا

علامہ کی شہادت نے ہمیں ایک عظیم دینی دانشور، جلیل القدر عالم دین اور صوفی باصفا سے محروم کر دیا

شہید و مہاجر بغداد علامہ اسید الحق قادری بدایونی بھی ایک ایسی ہی پاکمال شخصیت کا نام ہے جس کو قدرت نے بطور خاص منتخب کیا تھا اور ان کی ذات کو ان ساری صفات محمودہ و فاضلہ سے آراستہ کر دیا تھا جو جہاد علم و عمل میں مردان حق کا سرمایہ امتیاز ہوتی ہیں۔ ان کا علم ان کی عمر سے کوسوں آگے تھا اور ان کا عمل ان کے علم کے شانہ بشانہ نئے امکانات کی دریافت کرنے میں ہمہ وقت کوشاں و سرگرداں رہتا تھا۔ مجھے جب ان کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو کچھ دیر کے لیے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سامنے سے روشن مستقبل کو چرا لیا ہو۔ علامہ اسید الحق صحیح معنوں میں اہل سنت و جماعت کے درخشاں مستقبل کے ضامن تھے۔ بدایوں شریف کو کون نہیں جانتا اور اس کی خاک سے اٹھنے والے استقامت کے جہاں، غیر وحیت کے پیکر، عزم صمیم کے عملی نمونے، ملی و فاداری و محبت گھٹی میں لے کر پیدا ہونے والے علمائے حق کی خدمات نے اہل سنت و جماعت کے اعتقادی حقانیت کو جس مضبوطی کے ساتھ ثابت کیا ہے اس سے کون سا ایسا صاحب بصیرت شخص ہے جو واقف نہ ہو۔

بدایوں شریف کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے اسی لیے درج ہے کہ اس نے ملت کو بہت سے ہیرے اور جواہرات عطا کیے ہیں اور اسید الحق قادری بھی تاج اللہ حضرت مولانا عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمۃ والرضوان کے اسی کثر علم و عمل کا ایک گہر نایاب تھے اور ابھی اپنی چمک بکھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ موت کے منحوس اندھیرے نے انہیں اپنا اسیر کر لیا اور وابستگان قادریہ بدایوں شریف سمیت پوری ملت اسلامیہ کو آبدیدہ اور غم زدہ کر دیا۔

مورخہ ۱۴ مارچ کی شب کو جب یہ منحوس خبر سننے کو ملی تو اس پر یقین

انسان کی زندگی کی ڈور قدرت کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور دست قدرت ہی اسے حرکت و جمود اور سعی و عمل کے مرحلے سے گذارتا اور ہمکنار کرتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض افراد بہت کم عمری میں وہ سب کچھ انجام دیتے ہیں جن کو دوسرے عمر عزیز کا سارا حصہ طے کر کے بھی نہیں کر پاتے ہیں۔ سن و سال کی بہتات الگ چیز ہے اور علم و عمل کی فراوانی الگ۔ انسانی تاریخ میں ایسے بہت سی نظیریں اور شواہد موجود ہیں کہ ایک جواں سال نے پہاڑوں جیسے بڑے کام اتنی تیزی اور تندہی سے کر دیا جیسے ایک سیل آب نے کناروں کو توڑ ڈالا ہو یا بجلی کی ایک کوند ہو جس نے ایک لمحہ گریزاں کے اندر زمین و آسمان کا گوشہ گوشہ منور کر دیا ہو۔ جب کہ اس کے برعکس پوری مدت عمری صرف کر کے بھی کچھ لوگ بسم اللہ کی منزل پر جو ٹھہرے تو ایسے ٹھہرے جیسے زمین نے ان کے قدموں کو پکڑ لیا ہو اور وہ شل ہو گئے ہوں۔

ایسی مثالوں سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ اس کے لیے صرف صلاحیتوں کا ہونا ہی ناگزیر نہیں ہوتا بلکہ توفیق الہی اور قدرت کا یہ انتخاب و فیصلہ کہ کس فرد خاص سے خدمات لینی ہے اور اسے ان منزلوں تک رسائی عطا کرنی ہے، جہاں پہنچنے کی اجازت ہر ایک کو مرحمت نہیں ہوتی ہے۔ عقل کو حیرت میں ڈالنے والے اکثر کارنامے ایسے ہی معرض وجود میں آئے ہیں۔ میں نے اپنے ۴۰ سالہ دور خطابت میں بہت سی بڑی شخصیتوں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کے دامن میں پوشیدہ حشمہ فیض سے سیراب ہوا ہوں اور میرا ماننا ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں نمایاں کارکردگی کی آسانی نوید حاصل ہوتی ہے وہی ایسے کام کر جاتے ہیں جن کے بارے میں دوسرے زندگی بھر محض سوچ اور منصوبے ہی بناتے رہ جاتے ہیں۔

کہ انہیں کسی نے شہید کر دیا۔ ”اَنَا لِّلّٰہِ وَاَنَا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ“ صبح نے بتایا کہ یہ اطلاع پاکر میں نے پہلے کو کب نورانی صاحب کو فون کیا اور اب آپ کو اطلاع دے رہا ہوں!

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ آج میں صبح رحمانی کی یاد دہانی پر اسید الحق شہید کی لمحات ملاقات کی یادوں کو سیٹنے بیٹھا تو میں نے وہ کتاب (خامہ تلاشی) نکالی جو شہید مظلوم نے مجھے ۲۴ ستمبر ۲۰۱۰ء کو دی تھی، مولانا اسید الحق شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا تھا: ”میدان تنقید کی قدآور شخصیت جناب عزیز احسن صاحب کی خدمت میں۔“ مولانا اسید الحق نے جب وہ کتاب مجھے دی تھی وہ دنوں میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری میں مصروف تھا اس لیے میں نے کتاب پر سرسری نظر ڈال کر اسے الماری میں رکھ دیا تھا۔ لیکن آج جب میں نے اسے نکالا تو کچھ تحریریں پڑھ کر ہی اندازہ ہوا کہ شہید مظلوم کو اللہ رب العزت نے کس قدر علمی شغف دیا تھا، کتنی کی کتنی اعلیٰ صلاحیت سے نوازا تھا، کتنا اچھا حافظہ مرحمت فرمایا تھا، بر محل اشعار کا حوالہ دینے کی کتنی نادر قابلیت عطا فرمائی تھی۔ بے شک وہ بیک وقت ایک محدث، ایک مفسر، ایک منطقی، ایک فلسفی، ایک تاریخ دان، زبان و بیان پر عبور رکھنے والا ادیب اور شعر و سخن سے خلاقانہ وابستگی رکھنے والا کثیر اللسان نابغہ (Genius) یا عبقری تھا۔

میں دعا گو ہوں کہ اللہ کریم شہید مظلوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اہل خانہ، قرابت داروں اور ان کے ارادت مندوں اور متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے مولانا خوشتر نورانی ایک ذہن اور فطرت دوست اور اچھے لکھاری سے محروم ہو گئے ہیں، میں ان کے لیے بھی دعا گو ہوں کہ اللہ کریم انہیں بھی یہ صدمہ سہنے کی ہمت دے۔ (آمین) موت ہر ذی نفس کو آتی ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہر ایمان ہے کہ موت کا مقررہ وقت بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ تاہم اپنے احساس کو زبان دینے کے لیے غالب سے ایک شعر مستعار لے کر نام کی تجدیدی کے ساتھ لکھنے پر مجبور ہوں:

ہاں اسے فلک پیر جواں تھا ابھی عاصم
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

☆ 12-8، بلاک 13، گلستان جوہر، کراچی (پاکستان)

بڑی شگفتہ زبان اور بذلہ سنجی کے لطیف ہیرائے میں بیان کیا گیا تھا۔ کچھ ماہ پیشتر صبح رحمانی نے میرے لیے ”فیس بک“ پر ایک اکاؤنٹ کھول دیا۔ میں نے اس میں کچھ چیزیں ملاحظہ کیں تو مولانا اسید الحق کی ایک نعت بھی نظر سے گزری جو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زمین میں تھی۔ نعت پڑھ کر میری رگ تنقید پھڑکی اور میں نے لکھ دیا کہ قافیہ پیا کی تو اچھی ہے لیکن شاعری نہیں ہے۔ اس پر مولانا اسید الحق کے بہت سارے مرید میرے پیچھے پڑ گئے۔ کسی نے کہا ”خود لکھ نہیں سکتے تو دوسروں پر تنقید کرنے لگتے ہیں“ کسی نے کہا اعلیٰ حضرت کی زمین میں لکھی ہوئی نعت کو پامال“ زمین کہہ کر عزیز احسن نے اعلیٰ حضرت کی توہین کی ہے۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ صبح رحمانی نے مجھ سے کہا کہ آپ نے ”فیس بک“ کا صحیح استعمال نہیں سیکھا۔ یہ پلیٹ فارم ایسی تنقیدی رائے لکھنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں نے کہا کیا کروں میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ پھر یہ ہوا کہ مولانا اسید الحق میدان میں کود پڑے اور انہوں نے اپنے ارادت مندوں سے کہا کہ ”عزیز احسن صاحب ہمارے بزرگ ہیں، ان کی تنقیدی رائے درست ہے۔“ (میں اصل الفاظ نہیں، اپنی یادداشت میں محفوظ متن کا حوالہ دے رہا ہوں) مولانا اسید الحق صاحب کی یہ اعلیٰ ظرفی دیکھ کر میں پانی پانی ہو گیا۔ بعد ازاں انہی معترضین میں سے کسی نے میری وہ منقبت ڈھونڈ نکالی جو میں نے اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شعر کی تفسیر کے طور پر رقم کی تھی۔ حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ منقبت پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ اسید الحق صاحب کے میدان کی بات کا کتنا پاس کرتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک دودن سے جو لوگ مسلسل میرے خلاف غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے وہی اب میری دل جوئی کی خاطر تلاش و جستجو سے میری تحریر نکال کر ”فیس بک“ پر درج کر کے مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوا مولانا اسید الحق کے متوسلین کو اسی قسم کی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنے کا درس دیا جاتا ہے۔

منگل ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۴ مارچ ۲۰۱۴ء رات دس بجے انسٹنٹ منٹ پر صبح رحمانی نے فون کیا۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں گھبرا گیا، کہنے لگے: ”ابھی کچھ دیر قبل“ ”فیس بک“ پر مولانا اسید الحق کا پیغام پڑھا تھا کہ وہ بغداد میں ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد یہ اطلاع آ گئی

فکری اصالت اور عصری پیش کش کی نادر مثال

یہ ایک ایسے ہونہار، باعث افتخار اور مایہ ناز نوجوان کا غم ہے جس پر پوری جماعت کی نگاہ تھی

پڑا۔ اگلے دن امان میاں صاحب سے عزیزی عطیف میاں قادری کا عراق کا ٹیلیفون نمبر لیا تاکہ حضرت سالم میاں صاحب قبلہ مدظلہ العالی سے تعزیت کر سکیں، لیکن نہ اس وقت ہمت پڑی اور نہ آج تک ہمت ہوئی پایا ہوں۔ آخر کلمات تعزیت اور شدت غم میں کوئی تو نسبت ہونی چاہیے۔ ان کا غم صرف ایک پیرانہ سال والد کا غم نہیں ہے جس نے اپنا جوان سال بیٹا کھویا ہے، بلکہ یہ ایک ایسے ہونہار، باعث افتخار اور مایہ ناز بیٹے کا غم ہے جس کی ذات سے خاندان ہی نہیں پوری جماعت کی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ ایک ایسے فرزند دل بند کا غم تھا جس کی صورت میں انھیں ایک تاب ناک ماضی رکھنے والے اپنے خاندان کا روشن مستقبل نظر آ رہا تھا، جس کی ذات میں وہ اپنے بزرگ خاندان کی نشاۃ ثانیہ کو ملاحظہ کر رہے تھے، جس کی ہستی میں انھیں اپنے سلالہ علیہ کی فصل رفتہ اور بہار گزشتہ کا احیا نظر آ رہا تھا۔

بھلا ایک ایسے باپ سے اس کے عزیز از جان بیٹے کی تعزیت کا حق ادا بھی کیسے کیا جاسکتا ہے، بے جان لفظوں میں وہ قوت کہاں جو ان کے فرط غم کی تفسیر کر سکیں، وہ فصاحت کہاں جو ان کے رنج و غم کی تعبیر کر سکیں۔

لله ما اعطى وله ما اخذ وكل شئ عنده باجل مسمى۔ اللہ والہ والہ واجعون۔

میرا ان سے پہلا تعارف استاذ گرامی حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ کے ذریعے ہوا تھا۔ میں مارنیش میں تھا اور حضرت اپنے خطوط کے ذریعے ان کی تعلیمی سرگرمیوں، ان کی ذہانت و فطانت اور ان کے ذوق و شوق سے مطلع فرماتے تھے، جس کے پیش نظر ذہن میں ان کی ایک تصویر بن گئی تھی اور جب چرامحمد پور (فیض آباد) میں

مسجد سے واپس آ کر مغرب کی سنتیں ادا کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میرے ایک عزیز سید نجیب اشرف نے فون اٹھایا اور گفتگو کی۔ میرے سلام پھیرنے پر انھوں نے جلدی سے بتایا کہ علی گڑھ سے کسی سید امان صاحب کا فون تھا، ان کے لب و لہجے اور آواز کے ارتعاش سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی خبر دینا چاہ رہے ہیں، زبان سے بے ساختہ نکلا کہ: خدا خیر کرے! اور ذہن اوہام و خدشات سے بھر گیا۔ افق ذہن پر مختلف امکانات طلوع و غروب ہونے لگے۔ فکر کی سطح پر مختلف صورتیں ابھرنے اور ڈوبنے لگیں۔ طائر خیال کچھوچھ، مارہرہ، بریلی اور نہ جانے کہاں کہاں پرواز کرنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے امان میاں کو فون لگایا اور پھر انھوں نے جو روح فرسا اور جگر خراش خبر سنائی کہ سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ خبر تمام امکانات سے مختلف، سارے اوہام و خدشات سے الگ اور ہر ظن و تخمین سے جدا تھی۔ خبر کیا تھی خرمن جان کو خاکستر کر دینے والی بجلی تھی۔ صبر و حکیم کا ہر باندھ توڑ دینے والا سیلاب تھا اور وجود کے تار و پود منتشر کر دینے والا دھماکہ تھا۔ بار! لہا! یہ کیا ہوا، یہ کیا امتحان ہے! جماعت کی امید کا مرکز خانقاہ قادریہ بدایوں کی آرزوؤں کا محور اور اپنے والد گرامی کے خوابوں کی تعبیر، یوں دارغ مفارقت دے جائے گا، کبھی حافیہ خیال میں نہیں آیا تھا۔

حسبک لکل حاجۃ حسابا و ما کانت وفاتک فی حسابی
آخی نم فی جوار الفوت و انعم
لما قدمت من حسن الثواب

اس کے بعد امان میاں نے کیا کیا کہا اور محبت گرامی ڈاکٹر احمد مجتبیٰ نے اس حادثے پر اپنے غم و الم کا کیسے اظہار کیا، کچھ نہیں سنائی

”شناختی سمیلن“ کے عنوان سے ایک عظیم الشان کانفرنس کا انعقاد کر کے یہ پیغام دیا تھا کہ خانقاہوں نے ہر دور میں انسان کو انسان سے مربوط اور امن و سلامتی اور خیر سگالی کے جذبے کو بے پروا و ادینے کا کام کیا ہے اور ان کے اس اخلاق کریمانہ کی بدولت ہی اسلام کو سرزمین ہند میں اس درجہ مقبولیت عام نصیب ہوئی ہے اور دشمنوں نے بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا کلمہ پڑھا ہے۔ جدید ہندوستان کی خانقاہی تاریخ کا یہ ایک نادر واقعہ ہے جو شہید اسید الحق قادری کی سوچ اور فکری وسعت کی پیداوار تھا۔ وہ ہمارے اس بھر دور میں ایک بے حد زرخیز زمین کے فقید المثال عالم دین تھے جن کی مقبولیت عالم اسلام بالخصوص اہل تصوف کے درمیان تھی۔ ۳۹ سال کے اس نوجوان عام نے آسمان علم و فکر کی ان بلندیوں کو چھو لیا تھا اور سوچ تریپانے پر ہندوستان کے مشترکہ معاشرتی ڈھانچے کی بہتری اور فلاح کے لیے اپنی مستقل کوششوں اور بے بہا خدمات سے خانقاہ قادریہ بدایوں کی تاریخ میں ایک لازوال باب کا اضافہ کر دیا تھا۔

ان کی علمی اور تحقیقی نظر کی وسعت کے پیش نظر ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں اور جس تیز رفتاری کے ساتھ یہ اپنے علمی کاموں کی انجام دہی میں دیوانہ وار جڑے ہوئے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ یہ دور، ان کے نام سے ہی منسوب ہوگا۔ یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ ان میں وہ جو ہر بدرجہ اتم موجود تھے جس کو بروئے کار لا کر وہ تاج الفحول کے بدایوں کو ہندوستان میں علم و عرفان کے طلب گاروں کے لیے سیراب و فیضاب ہونے کا مرکز اول بنا سکتے تھے۔ آج یہ سوچ کر قلم رک جا رہا ہے اور ذہن بو جھل ہو جا رہا ہے کہ علامہ اسید الحق قادری ازہری جنھوں نے ابھی اپنے علمی امکانات کا اظہار شروع ہی کیا تھا کہ ان کو موت نے ہم سے چھین لیا اور امت ایک عظیم دینی دانشور، جلیل القدر عالم دین اور صوفی باصفا سے محروم ہو گئی۔ ان کی شہادت پر دل انتہائی افسردہ اور غم زدہ بھی ہے مگر ساتھ میں رشک بھی ہے کہ شہر بغداد کی گلیوں میں شہید ہوئے اور سرکار شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان کے قدموں میں جگہ پائی۔ □□□

☆ سابق ممبر آف پارلیمنٹ، نئی دہلی
maulanaobidullahkhan@gmail.com

نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی یہ خدشہ جارہا تھا کہ کہیں دشمنوں کی نظر نہ لگ گئی ہو اور ہوا بھی ایسا ہی۔ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے چشم و چراغ اور ایک انتہائی ہونہار اور مکتبہ رس اسلامی دانشور علامہ اسید الحق قادری ازہری بغداد میں دہشت گردانہ حملے کا شکار ہو گئے اور محض ۳۹ سال کی عمر میں ہی اس دنیا سے دارالبقا کے لیے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسید الحق قادری بدایوںی عصر حاضر میں دینیات اور صوفی روایات کے طلبہ کے لیے علمی دانشوری اور روحانی شیفتگی کی تحریک کا سرچشمہ تھے۔ ۲۷ مارچ ۲۰۱۳ء کو عراق کے شہر بغداد میں اس وقت ایک دہشت گردانہ حملے کی زد میں آ گئے جب وہ صوفیائے کرام، فقہائے اسلام اور اولیائے عظام کے مزارات کی زیارت کے لیے عراق کے مختلف شہروں کے دورے پر تھے۔ مولانا اپنے والد گرامی حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری اور اپنے چھوٹے بھائی مولانا عطیف قادری کے ہمراہ ۲۷ افراد پر مشتمل ایک روحانی کارواں کے ساتھ سمرقراق پر تھے جو بغداد میں اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دینے کے لیے ۲۵ فروری کو ممبئی سے روانہ ہوا تھا۔ ۶ مارچ کو واپسی تھی۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، عراق میں جب وہ بغداد سے اربیل جا رہے تھے تو نامعلوم مسلح دہشت گردوں نے ان کے کار پر آتش اسلحوں سے حملہ کر دیا اور سر میں گولی لگنے سے مولانا جانے واردات پر ہی شہید ہو گئے۔ دوسرے دن مولانا کے جسد خاکی کو بغداد لایا گیا اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی درگاہ کے احاطے میں مدفون کیا گیا۔

جدید دور کے ایک جید اور تبحر عالم دین مولانا اسید الحق قادری، جنہیں لوگ شیخ صاحب کے نام سے بھی جانتے تھے، صوفی فکر و مزاج کے حامل ایک ماہر فقیہ، روحانی و عرفانی شاعر، محقق و ناقد، کثیر التصانیف قلم کار، سماجی مفکر اور ان سب پر مستزاد ایک عظیم انسان اور ہندو پاک کے عظیم صوفیہ اور روحانی بزرگوں کے اقدار و روایات کے امین و پاسدار تھے اور انھیں کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے انسانی فلاح و بہبود اور قیام امن کے لیے ساری سرگرمیوں میں شب و روز مصروف عمل رہتے تھے۔ زبردست علمی طمطراق کے باوجود ان کا فطری میلان احسان و سلوک، حقیقی معرفت اور تصوف و روحانیت کی طرف تھا۔ اپنے اسی گہرے میلان کی وجہ سے انھوں نے بدایوں میں عید میلاد النبی کے موقع پر

حضرت خواجہ صاحب کے پاس ہی ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ مجھے اپنی ذاتی تصویر سے زیادہ خوب رو لگے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ حضرت نے خلاف عادت کریمانہ ان کے اوصاف کے بیان میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ شاید انھوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں فرمائی تھی۔

ابتدا میں حضرت خواجہ صاحب کی ذات ستودہ صفات سے تلمذ ہی ہم دونوں کے درمیان قدر مشترک تھا۔ رفتہ رفتہ غم جاناں اور غم دوراں کے نہ جانے کتنے پہلو اس میں شامل ہو گئے۔ جماعت کی زبوں حالی، انتشار و افتراق، تکفیر کی کثرت اور تفکیر کی قلت، جماعت میں اصالت و عصریت کا فقدان، بحث و تحقیق کی کمی اور تقریر و تقریر میں انحطاط، خانقاہوں کا محول و ذہول اور درگاہوں کا محمود و رکود وغیرہ وغیرہ۔ میں ان کے افکار و اقوال میں ہمیشہ بولے ہم نفسی محسوس کرتا تھا۔

اکثر مسئل میں اتفاق ہونے کے باوصف بعض امور ایسے بھی تھے جن میں ہم ایک رائے نہیں رکھتے تھے اور یہ ایک قدرتی امر تھا۔ فطری تقاضا تھا۔ ہم جتنی اتفاق صرف کوئی جاہل اور احمق ہی کر سکتا ہے بلکہ اس کا تقاضا بھی اسی پائے کا کوئی انسان کر سکتا ہے، لیکن وسائل و ذرائع کے یہ اختلافات مقاصد و اہداف کے اتفاقات پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے تھے اور ہوتے بھی کیسے حق اختلاف کی بازیابی ہی ہمارا سب سے بڑا فکری ایجنڈا تھا۔ ”کل یوخذ منہ و یؤد علیہ“ ہی ہمارا سب سے بڑا شعار تھا، لیکن یاد بخیر! وہ اپنے اختلاف کا اظہار اتنے سلیقے اور ایسی گفتگو اور شائستگی سے کرتے تھے کہ سیکڑوں اتفاقات ان پر قربان۔ خوش لباسی و خوش فکری، خوش روئی و خوش خوئی، سب ان کی ذات میں مجتمع ہو گئی تھیں۔

فکری درستگی اور پیش کش کی جدیدیت ان کا سب سے نمایاں وصف تھا، جس نے چند ہی سالوں میں ہزاروں ہزار کو اپنی جانب ملتفت کر لیا تھا اور جماعت میں تصنیف و تالیف کی سمت اور رفتار دونوں کو گہرائی تک متاثر کیا تھا۔ فکر سدید ان کا ورثہ تھی اور پیش کش کی عصریت از ہر شریف کا عطیہ تھی لیکن ان دونوں پر مستزاد وہ طبع اخاذ اور ذہن و قادت تھا، وہ دیدہ وری اور ژرف نگاہ تھی جن سے قدرت نے انھیں خوب خوب نوازا تھا۔ ان کے ان ذاتی مواصفات نے ”ورثہ اور

عطیہ“ دونوں کو آب و تاب بخشا، ورنہ جماعت میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جنھیں ایسی نعمتیں حاصل ہیں، نہ پدرم سلطان بود کے دعوے داروں کی کمی ہے اور نہ فضلاء از ہر و بغداد کی قلت ہے، جن میں سے اکثر پر حضرت سعدی کا وہ مشہور و معروف شعر صادق آتا ہے جو اس ضمن میں اکثر پڑھا جاتا ہے۔ لہذا ان کی شخصیت کی تعمیر میں خاندانی و ازہری نسبتوں سے زیادہ ان کی شخصی خوبیوں کا دخل تھا، ورنہ بقول شاعر

ما نفع الخیل الکرام ولا القنا

إذا لم یکن فوق الکرام کرام

ہماری رو برو ملاقاتیں کم ہوتی تھیں۔ اس کا بنیادی سبب میری تدریسی مشغولیات اور دور افتادگی تھی، لیکن پہلے تعارف کے بعد سبکی و لاسبکی ملاقاتوں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ اکثر علمی کاموں سے پہلے ہم باہم گفتگو کیا کرتے تھے اور پیش نظر موضوع پر مختلف جہتوں سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ ”حدیث افتراق امت“ سے لے کر ”جدید عربی محاورات و تعبیرات“ تک ان کے متعدد مقالوں اور مؤلفات کے جزئی یا کلی مسودات اب بھی میرے پاس ہوں گے۔ وہ اپنے کثرت کار، جوش عمل اور تنوع موضوعات سے ہمیشہ درطہ حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ ان کا ہر کارنامہ امیدوں کا ایک نیا چراغ جلاتا تھا اور میرا یہ یقین چلتے ہو گیا تھا کہ ”خیر آبادیات“ کا یہ مصنف جماعت کے لیے کسی بشارت خیر سے کم نہیں ہے، جو اپنے سلسلہ زریں اور مدرسہ خیر آباد دونوں کی تجدید کا کام کرے گا۔ ”لکن قدر اللہ و ماشاء فعل۔“

مدینۃ الاولیاء بدایوں شریف چار بار حاضر ہوا اور ہر سفر کا باعث ان کی ذات تھی۔ پہلی بار ان کی دستار فضیلت میں حاضر ہوا۔ یہ تقریب جس کو دفتر سے منعقد ہوئی وہ اپنی مثال آپ تھی، بلکہ اس کی تقلید میں ”صد سالوں“ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ صرف ان کی تقریب دستار نہیں تھی بلکہ اس عظیم مدرسہ و خانقاہ کی نشاۃ ثانیہ کا جشن تھا۔ دوسری بار ان کی شادی میں شرکت کے لیے حاضر ہوا اور دو بار ان کی دعوت پر بدایوں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ ہم اخلاص فاؤنڈیشن احمد آباد کے جلسوں میں بھی ملتے تھے۔ ممبئی، کچھوچھو اور حیدر آباد میں بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ لیکن ہماری سب سے زیادہ ملاقات دہلی میں ہوتی تھی، جہاں ماہ نامہ جام نور کے مدیر مولانا خوشتر نورانی بھی ہمارے شریک

ہوتے تھے، بلکہ زیادہ درست تعبیر یہ ہے کہ میں ان دونوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ کبھی جام نور کے دفتر میں اور کبھی مولانا خوشتر کے گھر پر ہم جمع ہوتے تھے، جہاں ہم اجتماعی طور پر جماعت کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ ذاتی سرگرمیوں سے لے کر بین الاقوامی امور پر غور و فکر کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں مجھ جیسے دور افتادہ اور کم آسیر شخص کو جماعتی ”اپ ڈیٹ“ حاصل ہوتا تھا جو سراپا شہر آشوب ہوتا تھا۔

ایسی ہی کسی ایک ملاقات میں انھوں نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا کہ کسی ایک شخصیت کو لے کر جیسی حساسیت ہماری جماعت میں ہے وہ دنیا کی کسی جماعت میں نظر نہیں آتی، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اور جماعت کی اس غیر معمولی حساسیت کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ شخصی اور مادی وجوہ کے علاوہ اس کے پس پشت ایک اہم نفسیاتی وجہ کارفرما ہے اور اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، کیوں کہ ہم ہنگامہ برپا کرنے کے بجائے صورت بدلنا چاہتے ہیں۔ محض الزام تراشی اور بہتان بازی اس کا حل نہیں ہے۔ ہماری جماعت اسباب و علل سے قطع نظر، پورے طور پر یک قطبی جماعت ہے۔ صرف اس کی حساسیت ہی بے مثال نہیں بلکہ اس کی یک قطبیت بھی بے نظیر ہے۔ پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہ ملے گی اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی بھی گھر اگر ایک ستون پر قائم ہوگا تو اس کے تین گھر والوں کا یہی رویہ ہوگا، جو فطری بھی ہے اور بڑی حد تک درست بھی؛ کیوں کہ گھر کے انہدام کا خطرہ مول لینے کو کوئی تیار نہیں ہوتا ہے اور اس کا ایک ہی مداوا ہے کہ گھر کا دار و مدار ایک ستون پر نہ رہے بلکہ اس میں کئی ستونوں کا اضافہ کر دیا جائے تو اہل خانہ کی اس ستون کے تین حساسیت و جذباتیت خود بخود ختم ہو جائے گی جیسا کہ دوسرے گھروں کا حال ہے اور ان ستونوں کو بھی کہیں باہر سے لانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسی گھر کے ”گودام“ میں دفن و تدفین موجود ہیں۔

ان سے میری آخری ملاقات دسمبر کے اواخر میں ہوئی۔ میں مطالعہ اسلامیات کے نصاب کی تیاری کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ ورکشاپ میں شرکت کے لیے دہلی میں مقیم تھا۔ بن اسلامیات کے ”ماہرین“ کے ساتھ گزرتا تھا ورشام میں اعزاء و احباب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اس ضمن میں

ایک شام میں مولانا خوشتر نورانی کے گھر تھا کہ صاحب خانہ کے پاس ان کا فون آیا۔ غالباً وہ کہیں دہلی کے قریب میں ہی تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میں بھی وہیں فروکش ہوں تو وہ بھی تشریف لے آئے۔ ہم تینوں رات کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ میں نے حسب سابق اپنے قدیم اصرار بلکہ ”الحاج“ کا اعادہ کیا اور ان سے جلد از جلد پی ایچ ڈی مکمل کرنے اور میٹ کے امتحان سے سبک دوش ہونے کو کہا۔ اس بار میرا تقاضا کچھ زیادہ ہی شدید تھا، چون کہ روزانہ ”اسلامی اسکالرز“ سے مراد آزمانی کر رہا تھا اور تپ کر رہا تھا۔ عدد کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور اپنا وزن ہوتا ہے جب کہ ان اسکالرز میں سے کسی ایک ہمارے ”فضلاء از ہر و بغداد“ جیسے بھی نہیں تھے اور انھوں نے حسب عادت مسکراتے ہوئے جد ہی اس مہم کو پائے تکمیل تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ میرے اصرار کا صرف یہ مقصد ہوتا کہ ان کے فضل و کمال سے صرف امت ہدایت ہی مستفیض نہ ہو بلکہ امت اجابت و دعوت کو بھی اس کا فائدہ پہنچے۔ اسی ملاقات میں مولانا خوشتر نورانی نے بطور ریسرچ اسکالرز اپنے رجسٹریشن کی تکمیل کی خوش خبری سنائی۔ صرف انہی دونوں پر انحصار نہیں میں جماعت کے نوجوان فضلاء اکثر کہا کرتا ہوں کہ اگر ان کے پاس علم و حوصلہ ہے تو ان کی ایک جگہ یونیورسٹی ہے، جہاں وہ اپنے لیے بھی فائدہ مند ہو سکتے ہیں اور جماعت کے لیے بھی۔ کیوں کہ ہمارے مدارس اور خانقاہیں تعلیم و تربیت کا تو کام انجام دے سکتے ہیں لیکن تبلیغ و دعوت کے امکانات وہاں اتنے وسیع نہیں ہیں۔ وہاں صرف اپنے آتے ہیں اور بے حد محدود پیمانے پر آتے ہیں، جب کہ کلیات و جامعیت میں سب آتے ہیں اور مدارس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعداد میں آتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک دوسری جماعتوں نے بہت پہلے کر لیا اور ان جماعتوں کے افکار و معتقدات کی جیسی اشاعت عصری جماعت سے ہوئی ہے، ویسی ان کے مذہبی اداروں اور تنظیموں سے بھی نہیں ہوئی۔

ان سے آخری ٹیلیفونی گفتگو ان کے سفر بغداد سے چند دن قبل ہوئی۔ انھوں نے مہاراشٹرا کے کسی شہر سے فون کیا تھا اور ان کی ظاہری حیات میں ان کا آخری بار ذکر اس دن کیا تھا جس دن انھوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ ڈاکٹر شجاع قادری نے فون کر کے جون میں ہونے والے اپنے مجوزہ سیمینار ”بقیہ صفحہ 183 پر ملاحظہ کریں

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

مولانا سید الحق قادری اپنے اجداد کے علوم و معارف اور اقدار و روایات کے سچے وارث تھے

محقق عصر علامہ اسید الحق بدایونی، اس بطل جلیل کا نام تھا جو سواد اعظم اہل سنت کی آنکھ کا تارا بن چکا تھا اور ہندوستان کے شرق و غرب میں جس کے علم و تحقیق کا طوطی بول رہا تھا، جو ہندو پاک کے اہل علم کو اپنی دینی خدمات کا مستحق بنا چکا تھا۔ سرزمین اتر پردیش میں امام علم و فن حضرت خواجہ مظفر حسین پورنوی کا علمی جانشین تھا اور جو عربی زبان و ادب کا شاہکار ادیب اور جامعہ الازہر مصر کا فارغ التحصیل تھا۔

اسید الحق بدایوں کی مٹی سے سراپا ہونے والا وہ فرزند جلیل تھا، جو اپنے اکابر علماء کی دینی و علمی خدمات سے علمی دنیا کو باخبر کرنے کا بیڑا اٹھا چکا تھا، جو اپنے اجداد کے علم کا وارث بن کر ان کی علمی کاشت میں نکھار پیدا کرنے کی ہر ممکن تدبیر میں مصروف عمل تھا، جو اپنے والد کی روحانی گلدی کا قائم مقام اور ان کے جہان امید کا گل سرسبد تھا، جو مدرسہ قادریہ بدایوں کے روشن مستقبل کی علامت تھا اور اپنے خاندانی حلقہٴ ارادت کا امین تھا۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالہ حیات

تا یکے دانائے راز از زمین آید بروں

علماء کو ان کے علم کا پندار اور مشائخ کو ان کی مشیخت کا خمار عموماً اخلاقی پستی میں گرا دیتا ہے اور انکسار کی سرحد ان سے بہت دور رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ ان کا علم اپنا مقناطیسی اثر کھودیتا ہے اور عوام کے دلوں پر ان کی گرفت مضبوط نہیں ہو پاتی ہے۔ دیکھا بھی گیا ہے کہ جن علماء کے پاس علم کا پندار پھٹک نہ سکا اور جن صوفیہ کے گرد مشیخت کا خمار راہ نہ پاسکا، وہ محبوب خلق ہوئے ہیں زندگی میں بھی اور مرکز عقیدت رہے ہیں بعد وصال بھی۔

اسے گرامی منزلت حضرت شیخ سالم میاں صاحب مد فیوضہ کی خانقاہی تربیت کا فیضان ہی کیسے کہ اس کم عمری میں قبول عام حاصل ہو جانے کے باوجود حضرت مولانا شاہ اسید الحق قادری اخلاقی پستی سے

محفوظ رہے اور پندار کا آسیب ان تک کبھی راہ نہ پاسکا۔ نہ خانقاہی نہ رکھاؤ کا دماغ میں سودا تھا اور نہ علمی غمطراق کی ذرا بھی نمائش تھی۔ خانقاہی اخلاق کے چکر تھے اور تو واضح کا خاندانی انداز رنگ و پے میں بسا تھا۔

۲۰۰۸ء میں وہ مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف کی کل ہند تقسیم کانفرس میں مولانا خوشتر نورانی مدیر جام نور دہلی کے ہمراہ بہار شریف تشریف لائے تھے اور دو روز ہمارے مہمان رہے تھے۔ کانفرس کے روح رواں مولانا سید نور الدین اصدق تھے، لہذا ان ایام میں مذکور واسطہ تو ان ہی کو پڑا۔ مجھ سے تو مختصر ملاقات رہی۔ لیکن ۲۰۱۲ء میں حضرت سالم میاں صاحب سجادہ نشین خانقاہ قادریہ کی دعوت پر عزیز مولانا نور الدین اصدق کو ساتھ لے کر میں صد سالہ عرس مقتدری میں بدایوں شریف حاضر ہوا اور دو روز قیام کیا۔ ان ایام میں مولانا کا اخلاقی جوہر گھر گھر سامنے آیا اور ان کی سعادت مندی کا ابرجھوم جھوم کر برس۔ عالمانہ لباس، خادمانہ انداز، طالب علمانہ نیاز مندی، شادمانہ مقدی۔ غیر معمولی مصروفیات کے باوجود ہر ایک سے مسکرا کر ملنا۔ مشائخ کی پذیرائی میں پیش پیش رہنا۔ میرے کمرے میں بار بار بیٹھنا اور حسن عقیدت کے ساتھ ”جام شہود“ کے ادارے پر اظہار سرت کرنا۔ ان ہی دنوں میرا مقبول ہر خاص و عام ادارہ ”دل کے بھانڈے“ غالب یہ خیال اچھا ہے، شائع ہوا تھا۔ آج ایک ایک ادا لے دل سامنے آ کر یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے.....

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

مولانا اسید الحق بدایونی کی ہمہ جہت شخصیت کا اعتراف تمام سواد اعظم اہل سنت کو تھا اور سبھی کی آپ سے مستقبل میں زریں خدمات کی توقع وابستہ تھی، اس لیے ۲۳ مارچ کو عراق میں آپ کی حادثاتی موت پر پورا ملک سوگوار ہو گیا اور ہر طرف سے فون اور پیکیج کے ذریعے تعزیتی

پیامات کا تانتا بندھ گیا۔ ملک بھر کے سنی ادارے اور تمام مرکزی شخصیتوں نے اسے جماعت اہل سنت کا نقصان عظیم قرار دیا اور لاریب، مدت قریب میں اس خلا کا پرکھ جان ممکن نہیں ہے۔

بحر العلوم مفتی عبدالمنن اعظمی، مفتی راجستھان مولانا اشفاق حسین جوہپوری، امام علم و فن مولانا خواجہ مظفر حسین پورنوی ہماری جماعت کے ساتہین میں تھے اور بلاشبہ ان کی موت بھی ہمارے لیے نقصان عظیم ہے۔ لیکن یہ حضرات اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ ان کا قوائے جسمانی جواب دے چکا تھا اور ان کے زبان و قلم کا دائرہ سمٹ چکا تھا، جب کہ مولانا اسید الحق بدایونی کا بالکل عہد شباب تھا اور ان کی علمی خدمات کا گل خوش رنگ اب کھلنے ہی کو تھا کہ دست اجل نے اسے آدو پچا اور امیدوں کا باغ اچانک اجڑ گیا۔

پھول تو دو دن بہار زندگی دکھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مر جائے

مولانا اسید الحق اپنے مخالفین پر ریک حملوں کے قائل نہ تھے۔ اپنے بزرگوں کی حرمت پامال کرنے والوں سے گریزاں تھے۔ مخالف جماعتوں پر بھی سب و شتم کا مزاج نہ تھا۔ کسی کی سطحی باتوں پر کان نہ دھرتے، علم و تحقیق سے واسطہ تھا، اپنے بڑوں کے پاس ادب میں علم کا پندار بھی آڑے نہ آتا۔ نیاز مندی کا عجب اچھوتا انداز ہوتا۔ اپنے معاصرین سے ملنے کا انداز بھی محبت آمیز تھا۔ اپنے خاندانی بزرگوں کے علمی سرمایہ کو نئے اسالیب اور جدید ترتیب کے ساتھ اہل علم کے احوال تک پہنچانا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور یہ حق فرزند ادا کرنے کی سب سے بہتر راہ ہے۔ علم کی روشنی دکھانے اور عقیدت کی خوشبو پھیلانے کی اہمیت اگر تسلیم شدہ ہے تو اگر کوئی اپنے ہی گھر کا چراغ لے کر شاہراہ پر کھڑا ہے اور ایک شخص اپنے ہی باغ کا عطر نچوڑ کر کوچہ و بازار کو عطر بیز کر رہا ہے تو یہ سراپے جانے کے قابل خدمت ہے۔ اس میں کسی کو اپنے دکھ کا سامان کیوں نظر آ رہا ہے؟ یہ تو دودھ ہرے فاندے کا کام ہے کہ روشنی پھیلے زمانے میں تو میرے گھر کا اجالا بھی دنیا کی نظر میں نہائے۔ ہر علمی خانوادے کو سب سے زیادہ نیاز یہ سعادت نصیب فرمائے۔

وہابی ازم کا طوفان، سنائی کی طرح تیزی سے ہماری آبادی کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہمیں اب تک اس کی ہولناکی کا اندازہ نہیں ہے۔ کیا

یہ مقام حیرت نہیں ہے؟ اگر ہماری ہر تنظیم، ہماری ہر تحریک، ہمارا ہر ادارہ، ہماری ہر خانقاہ اور ہماری ہر انجمن اور جماعت اہل سنت کے تمام شعور مند افراد، دیوار میں چنی ہوئی اینٹ کی طرح متحد نہیں ہوئے تو ہماری آبادی کو یہ سنائی بہا لے جائے گا اور ہماری خود نمائی کا پہاڑ ریت کی طرح ڈھ جائے گا۔ ملکی حالات میرے پیش نظر ہیں۔ بنگال کی کھانڈی سے لے کر کنیا کماری تک پورے ملک میں اہل سنت رو بہ زوال ہے، جہاں بھی ہیں گٹروں میں بٹے ہوئے ہیں اور نفرت کی دیوار پتھر میں حائل ہے۔

ادھر چند سالوں سے ہماری جماعت میں جو اتھل پھٹل کا ماحول ہے۔ جماعت سے کٹ جانے کا یا کاٹ کر الگ کر دیے جانے کا جو مزاج پیدا ہو رہا ہے یہ جینے کی راہ نہیں ہے، بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ ہماری تنگ دامانی کو دیکھ کر غبار کی باجھیں کھل اٹھی ہیں۔ ہماری تاریخی سے ان کا حوصلہ بلند ہو رہا ہے اور ہم ہیں کہ خواب خرگوش سے سر اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔ کاش! اب بھی قائدین جماعت کی آنکھوں سے خود بینی کا غبار اتر جائے اور وہ آنے والی نسل کے جینے کی راہ ہموار کرنے میں جٹ جائیں۔

افسوس تو اسی بات کا ہے کہ آج پڑھے لکھے جاہلوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ہر کی شکل میں ریزنوں کی ٹولی گھوم گھوم کر ہر روز ایک نئے فتنے کو جنم دے رہی ہے اور مقام حیرت تو یہ ہے کہ جماعت کے اساطین اور عوام کے ایک معتد بہ طبقے پر گرفت مضبوط رکھنے والے قائدین ان فتنوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ یا کم از کم نہ کٹھی اختیار کر کے چپ کا روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ دنوں راہ حساسہ عمل کی ہے اور ہم ایک دن جواب کے لیے شہرے میں کھڑے کیے جائیں گے۔

ایسے دور کساد میں کسی قیمتی جان کا ضیاع پوری ملت کے لیے دیر پا المیہ ہے۔ مولانا کریم بکر حبیبہ النبی الکریم علیہ التحیۃ والتسلیم مولانا اسید الحق بدایونی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے والدین کریمین اور احباب و اقارب کو صبر جمیل مرحمت فرمائے۔ سواد اعظم اہل سنت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

موت اس کی ہے، کرے جس کا زمانہ افسوس

یوں تو دنیا میں کبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

☆ سجادہ نشین خانقاہ اصدقیہ چشتیہ، چن پیر بیک، بہار شریف (بہار)

ایک فرد نہیں، ایک تحریک کی موت

پورے برصغیر میں مولانا اسید الحق قادری کے ہم عصروں میں کوئی ان کا حریف و مقابل نہیں تھا

۱۱ مارچ ۲۰۱۳ء کی صبح مسجد نبوی شریف میں نماز فجر ادا کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ (مدینہ پاک کی یہ حاضری غرے کے سلسلے سے تھی۔) نمازیوں کے ازدحام کثیر میں ایک فارغ اثر فیہ مولانا اختر رضا مصباحی سے متعارف ہوا، جو ایک روز قبل ہندوستان سے آئے تھے۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے بڑے درود کرب کے ساتھ مولانا اسید الحق بدایونی کی الم ناک شہادت کی روح فرسا خبر سنائی۔ میں ذہنی طور پر اس خبر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے ان سے بار بار یقین دہانی کر رہا تھا۔ انہوں نے مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ بتایا کہ یہ حادثہ فجر بعد اشریف میں ایک دہشت گردانہ حملے کے نتیجے میں ہوا، لیکن پتہ نہیں کیوں یہ خراب بھی میرے لیے ناقابل یقین تھی۔ اس لیے نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے پہلی فرصت میں عزیز گرامی مولانا خوشتر نورانی سے رابطہ قائم کیا، وہ شدت غم سے نڈھال تھے، فوراً پھٹ پڑے اور میری آنکھوں نے بھی شہید ملت کو آنسوؤں کا بھر پور خراج پیش کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ خوشتر صاحب کی حانت قابل رحم تھی۔

گچی بات یہ ہے کہ میں اپنی پوری زندگی میں اپنے کسی عزیز کی موت پر بھی اتنا غمزدہ نہیں ہوا تھا؛ کیوں کہ وہاں ایک فرد کی موت تھی اور یہاں شہید ملت کی صورت میں ایک فرد نہیں ایک ادارے کی موت تھی۔ ایک تحریک کی موت تھی۔ ایک دینی اور تعلیمی مشن کی موت تھی اور ایک ایسے عالم رہائی کی موت تھی جس کو عالم کی موت کہا جاتا ہے۔ تصنیف و تالیف کے حوالے سے درجنوں علمی اور تحقیقی کتابوں کی منصوبہ بندیاں ان کے ذہن میں تھیں جن کا تذکرہ وہ ٹیلی فون پر اور کبھی سیمیناروں میں ملاقات کے موقع پر کیا کرتے تھے، اس لیے ان کی شہادت بلاشبہ ملت کا ناقابل حوائی نقصان ہے۔

شہیدیت سے میری پہلی نصف ملاقات تو مقررہ ماہ نامہ ”جام نور“ کے ذریعے ہی ہوئی۔ انہوں نے اپنی گرامی مایہ نریوں سے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور پھر جب وہ خامہ تلاش کا کالم لکھنے لگے تو ان کی ہمہ دانی نے واقعی رطہ حیرت میں ڈال دیا۔ حالاں کہ یہ کالم وہ ابوالفیض معینی کے قلمی نام سے لکھتے تھے، اس وقت تک یہ پتہ نہیں تھا کہ کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ بہت دنوں تک حضرت مفتی مطیع الرحمن صاحب مظفر پور لوی اور ارقم السطور کا گمان تھا کہ یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں کہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، سیر اور شعر و ادب کے حوالے سے اتنے ماہرانہ گفتگو کر سکے لیکن جب یہ انکشاف ہوا کہ ابوالفیض معینی کوئی اور نہیں بلکہ مولانا اسید الحق قادری ہیں تو ان کی علمیت، ذہانت و فطانت، ژرف نگاہی اور بالغ نظری نے اس مشہور عربی شعری صداقت پر میرے اعتماد کو اور بھی محکم کر دیا کہ واقعی لبس علی اللہ بمنسکر

ان بجمع العالم فی واحد
مولانا اسید الحق قادری سے میری پہلی بالشفہ ملاقات حضرت مولانا سید رکن الدین اصدق مدظلہ کے ذریعے منعقدہ سیمینار کے موقع پر ۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو بہار شریف میں ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات ایک سال بعد عرس قاسمی مارہرہ شریف میں ہوئی۔ تیسری ملاقات فقیہ النفس مفتی مطیع الرحمن صاحب کے مدرسوہ واقع بنگال کے ایک سالانہ پروگرام میں شرکت کے موقع پر ہوئی۔ وہ اور مولانا خوشتر نورانی دہلی سے جس ٹرین سے آرہے تھے حسن اتفاق سے پٹنہ سے میرا ریزریشن بھی اسی اے سی کوچ میں ہو گیا تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ شہیدیت کی گفتگو کا انداز اتنا پیارا تھا، وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اس سفر میں مختلف موضوعات و مسائل پر جی بھر کر باتیں ہوئیں۔

ان سے آخری ملاقات ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو اس وقت ہوئی جب وہ اور مولانا خوشتر نورانی خواجہ علم وفن کے جنازے میں شرکت کی غرض سے بذریعہ طیارہ دہلی سے پٹنہ پہنچے اور وہاں سے کار کے ذریعے خواجہ علم وفن کے گاؤں پورنیہ براہ مظفر پور جانا تھا۔ انہوں نے پٹنہ سے فون کیا کہ وہ اور مولانا خوشتر نورانی پٹنہ سے مظفر پور پہنچ رہے ہیں، اگر میں شریک ہو جاؤں تو کیا کہنا ہے۔ ان کی اس مخلصانہ پیش کش پر میں نے فوراً لیک کہا اور ان کی رفاقت کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اسی کار سے خواجہ علم وفن کے جنازے میں پہنچا۔ راستے میں خواجہ علم وفن کی جلالت علمی کا تذکرہ ہوتا رہا۔ چون کہ حزن یہ ماحول تھا، اس لیے اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہو سکی۔ بہر حال یہ سفر بڑا یادگار اور تاریخی رہا۔ ”جام نور“ کے شمارہ جنوری ۲۰۱۳ء میں انہوں نے اس سفر کی روداد بھی بڑے تفصیل کے ساتھ

بقیہ نگری اصالت اور عصری پیش کش کی نادر مثال:

عصر حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت کے لیے شمالی ہندوستان سے دس نام طلب کیے تھے تاکہ انھیں اس سیمینار میں مدعو کیا جاسکے۔ طویل گفتگو کے بعد ہم نے دس لوگوں کی فہرست بنی جن میں نو نام چشتی خاندانوں سے وابستہ و مختلف یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات انجام دینے والے سینئر پروفیسرز کا تھا اور دسواں نام جو سرفہرست تھا وہ ایک قادری کا نام تھا۔ ڈاکٹر شجاع سے بہت دیر تک ان کی باتیں کرتا رہا۔ بدایوں کا پتہ بھی لکھو یا اور انھیں تاکید کی کہ آپ دعوت نامہ تو فوراً بھجوادیں، ورنہ چار دن بعد جب ان کی واپسی ہو تو ان سے گفتگو بھی ضرور کر لیجیے گا اور جب اسی شجاع صاحب نے پروفیسر مسعود انور علوی کا کوری اور پروفیسر سید ظہیر امین صاحب ان کے ٹیلی فون نمبروں کے لیے رابطہ کیا تو میں نے ان سے کہا کہ مدعوین کی فہرست سے ان کا نام الگ کر دیجیے۔ وہ ہماری اور آپ کی دسترس سے بہت دور چکے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ اخیر میں اپنے احساسات و جذبات کی تعبیر کے لیے ایک سوڈانی شاعر کے بعض اشعار معمولی تصرف کے ساتھ پیش ہیں۔

اکذا انفارقنا بغیر وداع
یا محور البصار والاسماع
یا صاحب الوجه الجمیل وعامل
العمل الجلیل وقمة الإبداع
اکذا تفارق "والجماعة" لم تزل
تجتاح بین ثعالب ورعاع
ازمعت عنایا اسید مکرم
لینا ولكن لات حین ذماع
نم فی جوار الغوث و انعم یا اخی
بکرم مصطحب وحسن متاع

☆ شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد (دکن)

لکھی ہے جو قابل مطالعہ ہے۔

میں پوری ایمان داری کے ساتھ اس حقیقت کا برملا اعتراف کر رہا ہوں کہ پورے برصغیر میں ان کے ہم عصروں میں تو کوئی ان کا حریف و مقابل تھا ہی نہیں، بلکہ بہت سارے نام نہاد اکابرین پر بھی وہ بھاری تھے۔ اچھے اچھوں کی کوران کے سامنے دقتی تھی۔ حالاں کہ انہوں نے اپنی ذاتی اور خاندانی شرافت کا پاس و لحاظ دار کھتے ہوئے کبھی کسی کے خلاف خفیف الحرج کی نہیں کی۔ تہذیب و شائستگی کے ساتھ تقویٰ و طہارت اور اخلاص و ولہیت کی مظہر کامل تھی ان کی ذات والا صفات۔ مولیٰ تعالیٰ اس شہید ملت کی تربت پر رحمت و نور کی موسلا دھار بارش برسائے۔ آمین!

□□□

☆ سابق صدر: شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور (بہار)

مثالی عالمانہ انکسار اور صوفیانہ افکار کے حامل

جب اس حادثہ جانکا، کی خبر ملی تو میں بے قابو ہو گیا اور زار و قطار رونے لگا

قادری عثمانی بدایونی کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔
بچھڑے آٹھ دس سالوں سے مولانا اُسید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ کی عقائد اسلامی پر تحریر کردہ مختلف کتابیں، اپنے اجداد کرام کی عربی و فارسی کتابوں کے ترجمے اور دوسری اہل سنت کے افکار و نظریات پر مبنی کتابیں جو مولانا شہید کے ابتدائے، ترتیب و تقدیم، تخریج و تہذیب کے ساتھ انہی کی نگرانی میں شائع ہوتے رہے۔ تاج الخول اکیڈمی بدایوں سے شائع شدہ تمام کتابیں تحقیق و تنقید کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔
راقم الحروف ان کتابوں کے حوالے سے مولانا اُسید الحق قادری سے واقف ضرور تھا اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں سے بہت متاثر بھی۔

چنانچہ پہلی بار Q.T.V پر انٹرویو دیتے ہوئے میں نے انہیں دیکھا تھا اور اُس وقت میرا یہ احساس تھا کہ یا انہی خانوادہ بدایوں شریف کے اس ہونہر چشم و چراغ حضرت مولانا اُسید الحق قادری کس قدر اپنی علمیت، روحانیت اور نورانیت سے ناظرین کو سرفراز فرما رہے ہیں۔
غالباً اس کے دوسرے ہی سال یعنی اب سے کم و بیش تین سال قبل حیدر آباد میں سید امرا اللہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ مشعل پورہ حیدر آباد کے آستانے پر منعقدہ سمینار میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ آستانہ مذکور کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ اسرار حسین رضوی المدنی چشتی دامت برکاتہم کی اجازت سے مجھے مولانا اُسید الحق عاصم القادری کے مختصر تعارف کی سعادت نصیب ہوئی۔ تعارف میں جن باتوں کو پیش کیا گیا تھا ان کا ذکر کیا یہاں مناسب سمجھتا ہوں۔

حضرت مولانا اُسید الحق قادری عثمانی بدایونی کا تعلق بدایوں کے روحانی و علمی خانوادے سے ہے۔ ان کے جد کرم سیف اللہ المسلمول علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے وہابیہ کے رد میں ایک کتاب ”سیف الجبار“ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی ولادت سے قبل لکھی تھی

مولانا اُسید الحق قادری بدایونی اہل سنت و جماعت کے علم بردار، نہایت علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ تصوف و عرفان کے حوالے سے بھی خانوادہ بدایوں کی شہرت عالم گیر ہے۔ سیف اللہ المسلمول علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ اپنے وقت کے جید عالم اور صوفی تھے جن کا ذکر ہندو بیرون ہند کے اکثر علمائے کرام کے یہاں ہوتا رہتا ہے۔
مذہبائیت میں حضرت کی معرکہ آرا کتاب ”سیف الجبار“ بہت معروف ہے۔ اسی کتاب کو نئے زاویے سے تہذیب و ترتیب دے کر مولانا اُسید الحق علیہ الرحمہ کا یہ پروگرام تھا کہ اس اہم کتاب کو شائع کر کے دہلی میں ایک کانفرنس بڑے پیمانے پر بلائی جائے جہاں سے اس کتاب کی رسم اجرا انجام دی جاسکے، اس طرح پورے ہندوستان اور دیگر ملک تک اسے پہنچایا جاسکے، مگر کاتب تقدیر نے مولانا اُسید الحق قادری بدایونی کے پورے خاندان و اسلاف کے مرکز عقیدت تاجدار بغداد کی سرزمین پر ان کی شہادت و تدفین لکھ دی تھی۔ گشت قادریہ بدایوں شریف کے کل تر اپنی عمر کی کوئی ۳۹ بہاریں ہی دیکھ سکے اور ناگہانی روح فرسا حادثے کی زد میں آ گئے اور شہید ہو گئے۔ خود مولانا اُسید الحق تو بحمد اللہ و برحمۃ رسول اللہ حضور غوث اعظم و دیگر کے طفیل جنت اغر دوس میں اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہو گئے ہیں، مگر ان کے والد بزرگوار حضرت علامہ شاہ عبدالحمید سلم میاں قادری مدظلہ النورانی پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی اور تسلی و رخصا کی وہ کون سی منزل ہوگی کہ حضرت نے صبر و ضبط سے کام لیا اور اپنے تمام اہل خانہ و دیگر متوسلین کو بھی تھمے رکھا۔ کن کن ارمائوں سے حضرت نے اپنے اس شہید فرزند کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل فرمائی تھی، انہیں حافظ قرآن بنایا، عالم و فاضل بنایا پھر دنیا کی سب سے عظیم اسلامی یونیورسٹی جامعۃ الزہر قاہرہ سے علم تفسیر و دیگر علوم کی تحصیل کا انتظام فرمایا۔ اللہ رب العزت حضرت علامہ شیخ عبدالحمید سلم میاں

ان کے اہم ترین مندرجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی تحقیق و تدقیق کو خراج تحسین پیش کیا۔

بعد ازاں اپنی تقریر میں مولانا اُسید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ:

پروفیسر عبدالحمید اکبر صاحب نے میرے اسلاف کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ صد فیصد درست ہے۔ البتہ میرے بارے میں جو باتیں انہوں نے کہی ہیں یہ ان کی محبت ہے۔
مجھے اُس وقت محسوس ہوا کہ دورِ حاضر کے ایک دانشور، محقق اور ناقد اپنی اس علمی اعلیٰ استعداد رکھنے کے باوجود بھی کتنی سادہ اور سنجیدہ گفتگو فرما رہے ہیں، یہ سب ان کے عالمانہ انکسار اور صوفیانہ افکار پر دلالت کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں شرفِ نیاز کے بعد مولانا اُسید الحق قادری شہید علیہ الرحمہ سے ممبئی یونیورسٹی کے ایک سمینار میں ملاقات ہوئی۔ سمینار سے پہلے اور سمینار کے بعد بھی مولانا مرحوم و مغفور سے گفتگو کے دو بہت ساری باتیں سیکھنے کو ملیں۔ اس کے بعد بھی فون پر رابطہ رہا۔ ایک مرتبہ فون پر اپنے ایک سمینار میں بھی مجھے دعوت دی تھی، لیکن مجھے معذرت چاہنی پڑی، اس لیے کہ اُن ہی تواریخ میں یعنی ۲ مارچ ۲۰۱۳ کو میرے فرزند کی شادی مقرر تھی۔ فون پر یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات رہی۔ جب اس حادثہ جانکا کی خبر ملی تو میں بے قابو ہو گیا اور زار و قطار رونے لگ گیا تو گھر کے سارے افراد پریشان ہو گئے۔ پھر میں نے یہ روح فرسا خبر انہیں سنائی تو یہ بھی مغموم ہوئے، پھر فاتحہ پڑھ کر انہیں ایصالِ ثواب کیا گیا۔

دعا ہے کہ حضرت علامہ اُسید الحق قادری عثمانی بدایونی ازہری شہید علیہ رحمۃ الہاری کی دینی، علمی، ادبی، سماجی اور قلمی کاوشیں بارگاہِ رب المقتدر میں بظفیلِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شرف قبول پا جائیں اور حضرت علامہ شہید علیہ الرحمہ کے صدقے میں اللہ رب العزت ہمارے گنہوں کی مغفرت فرمائے، آمین۔

خدا رحمت کندا میں عشقانِ پاک طینت را

□□□

☆ استاذ شعبہ اردو، فارسی، گجراتی یونیورسٹی، لکھنؤ (کرناٹک)

جن کا اثر اور وزن پورے ہندوستان میں محسوس کیا گیا۔ علامہ فضل رسول کے فرزند جلیل حضرت تاج الخول علامہ عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ نے ایک رسالہ ”تقویۃ الایمان“ کے رد میں لکھا ہے جو غیر مطبوعہ ہے، اس کے علاوہ میلاد شریف اور مسائل فقہ میں کچھ رسائل یادگار ہیں۔
تاج الخول علامہ عبدالقادر بدایونی وہ مبارک ہستی ہیں کہ ندوۃ العلماء کے ایک اجلاس کا کسی انگریز سے افتتاح کروایا جا رہا تھا، اُس وقت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے بھی حضرت تاج الخول کے ساتھ ندوۃ العلماء کے اجلاس کا بیکٹ کر دیا اور فاضل بریلوی کو ندوہ کے رد میں کتابیں لکھنے کی طرف مائل کیا اور دماغ، دماغ، دماغ ہر طرح سے ان کی مدد فرمائی۔

حضرت تاج الخول کے فرزند اصغر حضرت علامہ عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ نے پہلے شخص ہیں جنہوں نے پٹنہ بہار کے ایک جلسے میں مولانا امام احمد رضا فاضل بریلوی کے ”مجدد“ ہونے کا اعلان فرمایا۔ حضرت تاج الخول کے فرزند اصغر حضرت علامہ عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ، میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ ہفتم حیدرآباد کے زمانے میں سنی اعظم کے اہم عہدے پر فائز تھے۔ جامعہ نظامیہ کے بانی مولانا شاہ نواز مراد قادری علیہ الرحمہ سے بھی ان کے روابط تھے۔ علامہ عبدالقادر کے فرزند اول مولانا عبدالہادی بدایونی علیہ الرحمہ حیدرآباد ہی میں نظام گانہ عثمانیہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد رہے۔ جب کہ فرزند دوم حضرت علامہ عبدالحمید شیخ سلم میاں قادری بدایونی سجادہ نشین آستانہ عالیہ بدایوں شریف مدرسہ قادریہ بدایوں کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اسفار میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے اجداد کی سنت ادا کرتے ہوئے ہرسال بغداد اعلیٰ سلطان الاولیا حضور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے بارگاہِ مبارک میں دیوانہ وار حاضری دیتے ہیں۔

نئی حضرت علامہ عبدالحمید سلم میاں قادری بدایونی کے فرزند علامہ حضرت مولانا اُسید الحق عاصم القادری بدایونی ہیں جو چار معاذ ہر سال فارغ التحصیل ہیں آج ہماری اس مجلس مذاکرہ میں جلوہ افروز ہیں۔
اس سبب خوش نصیب ہیں کہ گلستانِ دیوان بدایوں کے ایک گلِ نورانی سے بیدار سے مشرف ہو رہے ہیں۔ مولانا اُسید الحق قادری بدایونی نے گجراتی میں کوئی دس کتابوں کا ایک سہرا اجرا کروایا ہے اور تصنیف و تہذیب کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ راقم الحروف نے ان کی کتابوں اور

مولانا اسید الحق قادری: ایک بے مثال محقق

احادیث پر تحقیقی نظر، نقد رجال میں مہارت، وقت نظر اور غایت درجہ وسعت مطالعہ کے حامل تھے

لله ما اعطى ولله ما اخذ وكل شئ عنده بمقدار (اللہ ہی کا ہے جو اس نے دیا اور جو اس نے لیا اور ہر شے کی اس کے یہاں ایک مقدار مقرر ہے)

گذشتہ ۲۴ مارچ ۲۰۱۴ء منگل کی شام بڑی ہی کرب ناک رہی جس کے درد و کرب سے دنیا چیخ اٹھی اور اس شب میں ایک وحشت ناک خبر سن کر عجیب سا سناٹا چھ گیا، ہر طرف غم کی لہر دوڑ گئی۔ اس انہونی کون کر پہلے تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا مگر مشیت ایزدی کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی تھا۔ زبان پر انا لله وانا اليه راجعون تھا اور صبر و شکر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

ہوا یہ کہ ۲۴ مارچ منگل کو مغرب کی نماز سے فارغ ہوا جب کہ موبائل خاموش Silent تھا اور کچھ دیر تک اسی حالت میں رہا پھر یکایک اسکرین پر نظر پڑی تو دیکھا کہ مسلسل کئی Missed کالیں موبائل میں پڑی ہیں، پھر انھیں کھول کر دیکھا تو دو بڑی اہم شخصیتوں کی کالیں تھیں جن میں ایک شخصیت شہزادہ والا تاجار حضرت سید محمد امان میاں برکاتی کی تھی اور دوسری شخصیت حضرت مفتی انفاس الحسن چشتی کی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ ابھی میں ادھر سے حضرت امان میاں کو ڈائل کرنے ہی جا رہا تھا کہ ادھر سے دوبارہ فون آ گیا۔ سلام کے بعد ایک بڑی وحشت ناک خبر سننے کو ملی کہ ”اسید میاں بغداد شریف میں ایک دہشت گردانہ حملے میں شہید ہو گئے، کسی دہشت گرد نے ان کے سر میں گولی مار دی اور موقع واردات پر ہی وہ انتقال کر گئے۔“ اب تو کیا تھا زبان پر کلمہ ترجیح اور ایسا لگ رہا تھا جیسے نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اسی رنج و الم میں ڈوبا تھا کہ حضرت مفتی انفاس الحسن چشتی کا بھی فون دوبارہ آیا، نہایت درد انگیز آواز میں بڑی افسردگی کے ساتھ انھوں نے بتایا کہ ”ابھی ابھی حاجی میاں (مولانا سید محمد نور چشتی) نے بتایا کہ بھیا

بغداد شریف میں شہید ہو گئے۔“ مولانا اسید الحق قادری کا نہال چھپوند شریف میں واقع ہے اور حضرت حاجی میاں ان کے سگے ماموں ہوتے ہیں، وہاں عام طور سے انھیں بھیا ہی کہا جاتا ہے۔ پھر میں نے شیخ الجامعہ حضرت علامہ محمد احمد مصباحی صاحب کو فون پر خبر دی کہ ابھی ایسے ایسے فون یہ کہ مولانا سید الحق قادری کا انتقال ہو گیا اور وہ بغداد میں شہید ہو گئے، حضرت نے کلمہ ترجیح پڑھنے کے ساتھ ان کی خوبیں اور صلاحیتوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ”ان کی رحلت ایک جماعتی خلا ہے۔ کم عمری میں انھوں نے بہت کام کیا گویا ان کے آنے سے مدرسہ قادریہ اور خانقاہ بدایوں کی نشاۃ ثانیہ ہو گئی۔“ پھر حضرت ہی نے فرمایا کہ ”بعد نماز عشاء ایک تعزیتی محفل اور مجلس ایصال ثواب ہونی چاہیے۔“ چنانچہ بعد نماز عشاء عزیز المساجد جامعہ اشرافیہ میں ایک تعزیتی محفل منعقد ہوئی، جس میں جامعہ کے اساتذہ، طلبہ سبھی شریک رہے، قرآن خوانی ہوئی اور شہید بغدادی کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا اور مغفرت و رفع درجات کی دعا کی گئی، پھر بعد نماز عشاء رفیق ملت حضرت سید نجیب حیدر نوری قبلہ کا بھی فون آیا کہ:

”اسید میاں بغداد شریف کی شارع سلیمانہ پر شہید ہو گئے، وہ بڑے قیمتی عالم تھے۔ ان کے انتقال سے جماعت کا بڑا نقصان ہوا۔“ حضرت رفیق ملت بھی بہت ہی مغموم اور رنجیدہ خاطر تھے، حضرت نے دوران گفتگو یہ بھی بتایا کہ تدفین بغداد شریف میں ہی ہو گئی۔!

مولانا اسید الحق قادری بدایونی یقیناً بہت بڑے عالم تھے، اللہ رب العزت نے انھیں اتنی خوبیوں سے نوازا تھا کہ بیک وقت وہ خوبیاں کسی عالم میں کم ہی نظر آتی ہیں، بصوری حسن و جمال اور معنوی محاسن و کمالات کے ایسے حسین عکس تھے کہ تھا وہ ایک انجمن تھے، علوم عقلیہ میں مہارت کے ساتھ دینی علوم میں بھی بڑی گہری نظر رکھتے تھے، مروجہ علوم

و فنون میں کون سا ایسا علم ہے جو ان کی دسترس سے باہر تھا، علوم عربیہ ہوں کہ فنون ادبیہ، یوں ہی علوم عقلیہ ہوں یا کہ علوم دینیہ کون سا علم ہے جس کی انھوں نے سیاحت نہیں کی۔ احادیث پر تحقیقی نظر، نقد رجال میں مہارت، زبان و قلم میں سلاست، وقت نظر اور غایت درجہ وسعت مطالعہ یہ سب ان کی وہ خوبیاں ہیں کہ ہر وہ شخص ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے جو ان کی شخصیت سے آگاہ ہے۔ ایک بڑی خانقاہ کا فرزند ہونے کے باوجود مزاج ہمیشہ تحقیقی و علمی ہی رہا۔ درس گاہ میں بیٹھ کر باضابطہ درس دینا، تحقیق، تصنیف، ترجمہ نگاری وغیرہ یہ سب ان کے محبوب مشاغل تھے، صاف فکر اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ بے جا عصبيت اور اختلاف سے دور رہتے، جس کی شہادت خود اکابر نے دی ہے، چنانچہ شرف ملت حضرت سید محمد اشرف قادری برکاتی ”تذکرہ نوری“ از مولانا غلام شہر قادری بدایونی پر نگہات تقریظ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”اسے بنائے سنوارنے کا کام عزیز گرامی ڈر مولانا اسید الحق قادری کے ان ہاتھوں سے ہوا ہے جو باتوں اور معاملات کو الجھاتے نہیں بلکہ سچ در سچ معاملات کو سلکھانا اپنی خاندانی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ وہ فنون اور فتنہ پروروں سے دور و نفور ہیں اور خالص علمی انداز تحقیق کے تحت کتب ہائے قدیمہ کو دل پذیر اور عقدہ کشا حواشی اور دیگر معلومات کے اضافوں کے ساتھ منظر عام پر لا رہے ہیں۔ ان کا انداز تحریر اور متن ایسا ہوتا ہے کہ ان کے لکھے سے کسی اپنے کو جراحت نہیں پہنچتی۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ تحریری فنون کی سرکوبی میں اس نوجوان عالم دین اور معروف و قدیم خانقاہ کے فرد متین نے قلم کا ہتھیار بھی استعمال کیا ہے اور مومنانہ فراست کے پیش نظر خاموشی کا انداز بھی اختیار کیا ہے۔“

کچھ نہ کہنا بھی اک انداز بیاں ہوتا ہے مرشدان مارہرہ کی دعائیں اور خود ان کے بزرگوں کی بڑائی ان کے ساتھ رہتی ہے جو انھیں بار بار ترغیب دیتی ہے کہ کھوئے ہوئے سروں کو تلاش کرو، نوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑو، پرانے رنجوں کی نمائش نہ کرو، ان پر صبر کا ٹھنڈا ٹھنڈا امرام رکھ لو، تاکہ قافلہ سواد اعظم کی دراڑیں ختم ہوں اور سواد اعظم کا ہر

فرد یہ محسوس کرے کہ وہ آپس میں ایسے شیر و شکر ہیں کہ جیسے بدن کے مختلف اعضاء آپس میں وابستہ ہوتے ہیں۔ تاکہ سواد اعظم کا رو جانی، علمی اور سماجی سفر ایک نئی امنگ، نئی امید اور ایک نئی تیاری کے ساتھ ایسے راستے پر گامزن ہو جس کی منزل اہل سنت و جماعت کی عظمت رفتہ کی بازیابی ہو۔“ (ص: ۱۵، ۱۶)

مولانا اسید الحق قادری اس قدر آدھ محقق کا نام ہے جس کی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع تھا، احادیث کی اسانید کے ساتھ درایت احادیث کے میدان میں بھی ان کا قدم بڑا رواں دواں تھا، روایت و درایت دونوں زاویوں سے ان کی تحقیقات رسائل و مجلات کی زینت بن چکی ہیں اور مستقل کتابی شکل میں بھی قارئین سے داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

مولانا اسید الحق قادری اس ”خامہ تلاش“ ناقد کا نام ہے جس کی تنقید اور خامہ تلاشی مختلف اصناف سخن کو محیط ہوتی اور ہر کوئی اس خامہ تلاش نقاد کی تحریر پڑھنے کے لیے بڑی شدت کے ساتھ ماہ نامہ ”جام نور“ کے اگلے شمارے کا منتظر رہتا اور رسالہ آنے کے بعد بڑے شوق سے پڑھتا اور محفوظ ہوتا۔

مولانا موصوف کے اندر ایک بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ وہ اپنے سینے میں بہت کشادہ دل رکھتے تھے، کسی نے کوئی علمی و تحقیقی کام کیا تو پوری وسعت ظریفی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے اور گرام قدر نگہات تحسین لکھ کر اسے روانہ بھی کر دیتے، خود میں نے جب ”التنبیہ المسدد علی ما فی التعليق الممجد“ کا کام کیا جس میں مولانا عبدالحی فرنگی بھٹی کی طرف سے مذہب حنفی پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات کتاب وسنت کی روشنی میں دیے اور کتاب منظر عام پر آنے کے بعد ان تک پہنچی تو برجستہ انھوں نے مجھے خط لکھا، جس میں تحریر کیا:

”آپ کی کتاب میں نے دیکھی اور اتنی پسند آئی کہ اول تا آخر اسے پڑھا، بڑی تحقیق کے ساتھ آپ نے سارے شبہات کے جوابات دیے ہیں، احتیاف پر جو ایک قرض تھا آپ نے اسے ادا کر دیا، پوری جماعت احتیاف کی طرف سے آپ لائق تحسین و تبریک ہیں۔“

اس وقت تک میں نے صرف رسائل و مجلات میں انھیں پڑھا تھا باقی میری کوئی ان سے ہنوز ذاتی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی ایسا

ایک انساں میں ہزاروں اہل ہمت کا ثبات

مجھے علامہ اسید الحق کے عہد طالب علمی میں یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی جائیسی کا حق ادا کریں گے

خبر وحشت اثر جنگل کی آگ کی طرح موہاں اور انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل گئی۔

جامعہ اشرفیہ میں کیا طلبہ، کیا اساتذہ، سبھی کے چہروں پر غم، افسوس اور اداسی کے آثار صاف نمایاں تھے، ہر طرف ایک ہوا عالم تھا، ہر زبان پر مولانا اسید الحق کا ذکر اور چہ چاہتا۔ نماز عشا کے فوراً بعد تعزیت اور ایصالِ ثواب کی تقریب ہوئی، جس میں کثیر تعداد میں طلبہ اور اساتذہ نے شرکت کی، قرآن خوانی کے بعد حضرت مولانا مسعود احمد برکاتی استاد جامعہ اشرفیہ نے مختصر تعزیتی خطاب کیا، جس میں خانوادہ قادریہ عثمانیہ بدایوں شریف کے اکابر کی دینی و علمی خدمات اور علمی و دینی کارناموں پر روشنی ڈالی، پھر صلاۃ و سلام، ایصالِ ثواب اور دعا پڑھ کر تعزیتی جلسے کا اختتام ہو گیا اور شاہد علامہ اسید الحق کے سانحہ ارتحال پر ہونے والا یہ سب سے پہلا تعزیتی جلسہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ بظاہر جامعہ اشرفیہ سے مولانا اسید الحق قادری کا کوئی رشتہ نہ تھا، نہ وہ کبھی یہاں کے طالب علم رہے، نہ استاد، نہ یہاں کے کسی استاد یا ذمہ دار سے ان کا کوئی نسبی رشتہ تھا، مگر جامعہ کے دروہام اور مسجد کے محراب و منبر پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی، گویا وہ سب خانوادہ عثمانیہ بدایوں شریف کے غم میں برابر کے شریک، زبان حال سے مرثیہ خواں اور بتلائے آہ و فغاں ہیں اور حال کچھ یوں تھا:

حتی المحارب تبکی وہی جامدہ

حتی السمنابر ترئی وہی عیدان

(محرابیں گر یہ کتاں ہیں، حالاں کہ وہ جمادات سے ہیں اور منبر مرثیہ خواں ہیں جب کہ وہ خشک لکڑیوں کے بنے ہوئے ہیں)

پتا چلا کہ جامعہ اشرفیہ اور اس کے متعلقین سے مولانا موصوف

ممتاز ناقد و محقق، عالم ربانی حضرت علامہ شیخ اسید الحق قادری عثمانی بدایونی رحمۃ اللہ علیہ، جنہیں ”رحمۃ اللہ علیہ“ کہتے ہوئے کیجا منہ کو آچاہتا ہے۔ دیارِ غوثِ اعظم میں شہادت کی موت پا کر لازوال سعادتوں اور خوش بختیوں سے ہم کنار ہو گئے، ان کی موت کے سانچے نے پوری جماعت اہل سنت کو حنہ چھو کر رکھ دیا۔

مولانا مفتی محمد اسرائیل مصباحی خیر آبادی، استاد جامعہ صدیہ، پچھوند شریف نے ۳ مارچ کو بعد مغرب فون پر اطلاع دی کہ حضرت مولانا اسید محمد انور میاں مودودی چشتی اور حضرت مولانا مفتی محمد انقاس الحسن چشتی کے ذریعے ابھی معلوم ہوا کہ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی از ہری بغداد شریف سے کچھ دور ایک دہشت گردانہ حملے میں شہید ہو گئے، میں نے یہ جان کاہ خبر سننے کے بعد ”ان اللہ وانا الیہ راجعون“ تو ضرور پڑھ لیا، مگر اپنے کانوں پر اعتبار نہیں ہو رہا تھا، کبھی محسوس ہوتا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، کبھی دل کو اس طرح تسلی دیتا کہ بہت سی خبریں غلط اور خلاف واقع ہوتی ہیں، خدا کرے یہ خبر بھی ایسی ہی ہو۔ لیکن خبر کا ذریعہ ان کے ماموں جان حضرت مولانا اسید انور میاں چشتی، پچھوند شریف کی ذات تھی، اس لیے پہلی فرصت ہی میں میں نے حضرت مفتی محمد انقاس الحسن چشتی کو فون کیا، انھوں نے روتے ہوئے گلوگیر لہجہ میں خبر کی تصدیق کی اور فرمایا کہ خبر بالکل صحیح ہے۔ خبر کی تصدیق کے بعد ذہن و دماغ ایسے متاثر ہوئے کہ ان سے آگے کی کوئی تفصیل معلوم کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا۔

پہلی فرصت میں استاذ گرامی حضرت علامہ محمد احمد مصباحی، صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، حضرت علامہ یسین اختر مصباحی، دارالقلم دہلی اور اپنے اسٹاف کے بہت سے علمائے کرام اور دیگر اہل تعلق کو جلدی جلدی فون سے یہ الم ناک خبر سنائی، تھوڑی ہی دیر میں یہ

چہرے کا حسن و جمال، سنجیدہ لب و لہجہ، صالح فکر، متوازن گفتگو، معلومات افزا بیان، بزرگوں کا پاس و ادب، اقران و معاصر کا احترام، تواضع و انکساری یہ سب ان کے نمایاں اوصاف تھے۔

دومرتبان کی دعوت پر بدایوں شریف حاضری کا موقع ملا۔ ماشاء اللہ وہ اعزاز و اکرام جس کی یادیں آج بھی دل میں تازہ بنی ہوئی ہیں، عرس قادری میں زائرین کا اژدہام، تقریبات عرس کا نظم و ضبط اور نمازوں کا اہتمام یقیناً قابل دید تھا، صبح فجر کی نماز میں تاحند نظر مصلیوں کی صف ہی صف نظر آ رہی تھی، صبح صادق طلوع ہوتے ہی ہر طرف سے نماز کا اعلان ہو رہا تھا۔

یوں تو ہر دن دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں جاتے ہیں، مگر ان کے آنے سے نہ دنیا کو خوش ہوتی ہے نہ جانے سے کوئی غم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ بندگانِ خدا وہ ہوتے ہیں جن کا آنا باعثِ مسرت ہوتا ہے اور دنیا سے جانا رنج و الم کا سبب ہوتا ہے اور ان کی رحلت سننے بے شمار آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، دل رنجیدہ ہو جاتے ہیں، مولانا اسید الحق قادری بھی انہی بندوں میں سے ایک تھے جن کی رحلت بے شمار دلوں پر غموں کا پہاڑ ثابت ہوئی، قہر و جگر مجروح ہوئے، آنکھیں اشکبار ہوئیں اور جماعت اہل سنت میں ایک عظیم غلا پیدا ہوا اور ایک کبرام برپا ہو گیا، بدایوں کی گلیوں میں سناٹا چھا گیا، بازاروں کی رونق ختم ہو گئی۔

دعا ہے اللہ رب العزت ان کی قبر پر رحمت و غفران کی بارش نازل فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور دینی خدمات قبول فرمائے اور پس ماندگان کو صبر و شکر کی توفیق عطا فرمائے اور قوم کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین □□□

☆ استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (پوئی)

تعارف تھا، جب کہ اس دور میں آدمی اس طرح کا خط اسی کو لکھتا ہے جس سے شناسائی ہوتی ہے اور اس سے دیرینہ تعلقات ہوتے ہیں۔ یہ ان کی کشادہ ظرفی کی بلاشبہ ایک بین دلیل ہے۔

اسی طرح کہ کوہِ تحقیق و تنقید میں ان کا ایک مقام تھا، مگر کبھی بھی وہ اپنی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اپنے موقف پر نظر ثانی اور قبولِ حق کے لیے ہمیشہ تیار رہتے، حدیثِ افتراق امت کے موضوع پر اپنی تحقیق کو جب کتابی شکل دینی ہوئی تو مکمل وسعتِ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر کیا:

”مجھے نہ ہمہ دانی کا زعم ہے اور نہ ہی دعویٰ عصمت، عوم اسلام کا ایک معمولی طالب علم ہوں جس سے ہر قسم کی غلطی کا صد فی صد امکان ہے، لہذا اگر کوئی سنجیدہ اور علمی تنقید سامنے آتی ہے تو مجھے مقالے پر نظر ثانی کرنے اور غلطی واضح ہونے کی صورت میں اپنی خطا کے اعتراف اور قبولِ حق میں کوئی تاثر نہیں ہوگا۔“ (حدیثِ افتراق امت، جس کے حرف آغاز)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اسید الحق قادری نے اپنی کم عمری میں وہ کام کیا جو بڑے بڑے اہل علم اپنی پیرائہ سالی میں بھی نہیں کر پاتے۔ ان کی تحقیق، تجزیہ، تعلیق و تنقید، تہذیب و تنقیح، اور ترجمہ نگاری کے ساتھ شائع ہونے والی کتابوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جب کہ تصانیف ان کے علاوہ ہیں اور تاج الفحول اکیڈمی کے تحت ان کی نگرانی میں جو کام ہو رہا تھا اور جدید و دل کش انداز میں ماضی کے بزرگوں کی کتابیں جو منظر عام پر آ رہی تھیں وہ بھی یقیناً آپ کا بڑا کارنامہ تھا۔

مارہرہ مظہرہ میں عرس قاسمی برکاتی کی مناسبت سے ”فکر و تدبیر کانفرنس“ میں ان کی گفتگو بڑی نئی تلی ہوئی تھی۔ سارے شرکاء گوش برآواز ہوتے اور شرکائے کانفرنس میں ان کی اپنی ایک شناخت ہوتی۔

امام اہل سنت، محقق علی الاطلاق، محدث کبیر، عاشق رسول

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی

کی حیات و خدمات پر ماہنامہ ”جام نور“ دہلی کا ایک ضخیم علمی و تحقیقی ”شیخ محمد نمبر“ جلد ہی منظر عام پر آ رہا ہے۔

A/c No:10177246529, A/c Name: Khushtar Noorani

State Bank Of India, Branch: Zakir Nagar, New Delhi

کے اگرچہ یہ ظاہری رشتے نہ تھے، مگر ایک ایسا رشتہ ضرور تھا جو ان سارے رشتوں سے زیادہ گہرا، مضبوط اور مستحکم تھا، وہ رشتہ تھا دینی، ایمانی، مسلمانوں، روحانی اور پُر خلوص محبت کا۔

اس رات صبح طریتے پر مجھے نیند نہ آئی، رہ رہ کے وہ یاد آتے اور میں ایک لٹے پٹے بے سہارا اور مجبور مسافر کی طرح ان کی یادوں کی بھیڑ میں کھو جاتا۔ ان کا ہنستا، ٹٹکھلاتا ہوا پرکشش چہرہ، علمی ایتقان اور روحانی عرفان سے لبریز سنجیدہ اور مدلل گفتگو کا طریقہ، موثر انداز مخاطب، مقصدیت سے پُر عالمانہ بات چیت اور صدیوں کے کامیاب خاندانی پس منظر کی پشت پناہی کے باوجود بے تکلف اور بے ساختہ تواضع اور انکسار، سب کچھ نگاہوں کے سامنے پھرتا رہا اور بار بار یہ شعر یاد آتا رہا:

ایک سینے میں ہزاروں دلوں کی کائنات

ایک انسان میں ہزاروں اہل ہمت کائنات

ان کی یادوں کے ہجوم میں میں ماضی کی طرف پلٹنا تو حافظے نے یاد دہانی کرتے ہوئے یاد دلایا کہ ان سے سب سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ امام علم و فن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی پورنوی علیہ الرحمہ سے دارالعلوم نورالحق چہرہ محمد پور (ضلع فیض آباد یوپی) میں پڑھتے تھے اور میں دارالعلوم علیہ، جہاد شاہی، (ضلع ہمتی یوپی) میں خدمت تدریس پر مامور تھا۔ اتفاقاً ایک سال پہلے ہی دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں جزوی ترمیم ہوئی تھی اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی علیہ الرحمہ کے لکھے ہوئے دو ترمیمی عربی قصائد ”مدائح فضل الرسول“ اور ”حمائد فضل الرسول“ درجہ خامسہ میں شامل نصاب ہوئے تھے، یہ دونوں قصیدے الحیح الاسلامی، مبارک پور کے زیر اہتمام ”قصیدتان رائعتان“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ قصیدے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، سیف اللہ المسلول علامہ شاہ فضل رسول بدایونی اور ساتھ ہی ان کے فرزند ارجمند تاج اللہ علامہ شاہ عبد القادر بدایونی علیہما الرحمہ اور ان کے اہل خاندان کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی تدریس کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں کاندھوں پر تھی، ان کے حل کے لیے نہ کسی زبان میں کوئی شرح تھی اور نہ کوئی معاون کتاب، بہت سے اشعار میں باریک اشارے، لطیف کنایے اور تلمیحات تھیں۔

کچھ باذوق طلبہ کے اصرار پر میں نے پڑھانے کے ساتھ ساتھ

ترجمہ اور مختصر تشریح و توضیح کا کام بھی شروع کر دیا تھا، لیکن خانوادہ بدایونی شریف کے اکابر و مشائخ کے احوال و آثار سے کیا حقد و اقیقت نہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ مجھے اس کتاب کا درس ایک دن کے لیے روکنا پڑا، جب دارالعلوم نورالحق چہرہ محمد پور میں مولانا سید الحق قادری صاحب سے ملاقات ہوئی اور تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ آپ امام احمد رضا قادری بریلوی کے مجددین گرامی کے خاندان سے چشم و چراغ ہیں تو میں نے ان سے گزارش کی کہ مجھے ”اکمل التاریخ“ کی ضرورت ہے جو آپ کے خاندان کے اکابر و متعلقین کے احوال، آثار کی تاریخ ہے، اور ادھر کہیں دستیاب نہیں ہے، لہذا آپ براہ مہربانی کسی بھی طرح اس کی فوٹو کاپی عنایت فرمائیں۔ مولانا موصوف نے نہ صرف پوری کشادہ ظرفی کے ساتھ اس کے پیچھے کا وعدہ فرمایا، بلکہ اپنی قدیم خاندانی رہبری ”کتب خانہ قادریہ“ سے اس کی فوٹو کاپی کرا کے بہت جلد مجھے بھیج دی اور ساتھ ہی متعلقہ معلومات پر مشتمل ایک شاندار خط بھی ارسال فرمایا جس میں ”قصیدتان رائعتان“ کے تعلق سے بہت سے اہم ادبی اور تاریخی گوشوں پر روشنی ڈالی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا کہ خط کا متن بھی قارئین کرام کی بارگاہ میں پیش کر دوں تاکہ علامہ موصوف کی فطری صلاحیت، حیرت انگیز فہانت اور ماضی الضمیر کی ادائیگی پر پھر پور قدرت کا کچھ اندازہ ہو سکے، خط کا متن یہ ہے:

مکرمی و محترمی..... سلام مسنون

الحمد لله علی کل حال

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا!

حسب وعدہ ”اکمل التاریخ“ حاضر خدمت ہے۔ ان قصائد کے متعلق چند اہم امور بھی ملاحظہ فرمائیں:

(۱) یہ دونوں قصیدے ۱۳۰۰ھ میں تصنیف کیے گئے، جیسا کہ ان کے تاریخی ناموں سے ظاہر ہے۔

(۲) ان میں سے آخر والا یعنی والیہ ممدوح کے عرس منعقدہ ۱۳۰۰ھ میں خود فاضل مصنف نے عرس کی ایک محفل میں پڑھا۔

اس قصیدے کے آخر میں اس عرس کی تاریخ بھی بطور تلخیص ہے:

یا فضل عرس اما جدد

(۳) پہلے قصیدے یعنی نوبیہ کا اصل نام مدائح فضل الرسول

ہے اور دوسرے کا اصل نام ”حمائد فضل الرسول“ ہے۔

(الف) حضرت ملک احمد مولانا ظفر الدین بھاری نے فاضل بریلوی کی تصانیف کی ایک فہرست ”المجمل المعداد لتالیفات المجدد“ کے نام سے مرتب کی تھی، اس میں ان دونوں قصائد کے نام ہیں۔ حمائد کے آگے مطبوعہ اور مدائح کے آگے مہیضہ تحریر ہے۔

(ب) عرس یعنی ۱۳۰۰ھ میں پڑھا جانے والا سارا کلام ”ماہ تابان اوج معرفت“ (۱۳۰۰ھ) کے نام سے شائع کر دیا گیا تھا۔ (اس کے بعض صفحات کا عکس بھی حاضر خدمت ہے) اس میں قصیدہ والیہ بھی مطبوع ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ حمائد فضل الرسول یہی والیہ ہوا اور مدائح (جو غیر مطبوعہ تھا) نوبیہ ہوا۔

(۳) بہتر یہ ہے کہ اس بار یہ قصائد اپنے اصل نام سے شائع ہوں۔ سرورق پریوں بکھاجائے
قصیدتان رائعتان یعنی مدائح فضل الرسول و حمائد فضل الرسول۔

(۵) قصیدہ اولیٰ میں دعا کے بعد حضرت ممدوح کے صاحب زادہ و جانشین حضرت تاج اللہ محبت رسول مولانا عبد القادر قادری بدایونی، قدس سرہ (والد گرامی کے حقیقی دادا) کی مدح کی طرف سے اس شعر سے گریز کیا گیا ہے:

تم الدعا فار جمع غلبا غانما

واقصد سمي السيد البعدانی

حاشیہ میں حضرت تاج اللہ کی بھی سوانح آنا ضروری ہے جو اکمل التاریخ میں موجود ہے۔ مزید دیکھیں فتاویٰ رضویہ جلد ششم ص: ۳۶۶، ۳۶۷، اور جلد دو از دہم ص: ۱۳۰، ۱۳۱ (رضا اکیڈمی) اور المستمد والمستمد ص: ۱۲۱ (ترکی)

(۶) حضرت تاج اللہ کی شان میں حضرت فاضل بریلوی نے ایک مستقل قصیدہ اردو میں ”چراغ انس“ (۱۳۱۵ھ) کے نام سے لکھا ہے ان شاء اللہ اس کو بھی ارسال کروں گا۔

(۷) قصیدہ اولیٰ کے اخیر میں ایک مصرع ”و محبہ و مطیعہ بحنان“ بھی ہے۔ اس میں لفظ محبت سے کنایہ حضرت تاج

اللہ کی طرف ہے (ان کا نام محبت رسول تھا کما مر) اور لفظ مطیع سے کنایہ حضرت تاج اللہ کی صاحب زادہ قدوۃ السالکین حضرت مولانا عبد القادر مطیع الرسول (میرے دادا کے بڑے بھائی) کی جانب ہے۔

اس کے علاوہ بھی اگر کسی شعر میں شبہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ خط کے جواب اور کتاب کی وصول یابی سے ضرور مطلع فرمائیں۔

شکریہ

فقط

بدنام کنندہ کو نامے چند

اسید الحق

احقر طلبہ مدرسہ عالیہ قادریہ

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۷ء

پس نوشت: قصیدہ ثانیہ میں ایک شعر ہے:

”انظر بوارقه اذا برقت بعليا فرقد“

اس میں حضرت ممدوح کی ایک کتاب ”بوارق محمدیہ ترجمہ الشیاطین النجدیہ“ کی طرف اشارہ ہے۔ قصیدہ اولیٰ میں بھی ایک جگہ ”بوارق“ کا لفظ آیا ہے، وہاں بھی یہی معادہ ہے۔

”فضل الرسول مؤید“ (۱۲۸۹ھ) اس مصرعے حضرت ممدوح کی تاریخ وصال برآمد ہوتی ہے۔

اسید الحق

اس خط کو میں نے کئی بار پڑھا، ہر مرتبہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کے لیے دعائیں نکلیں اور میں نے محسوس کیا کہ موصوف، حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے قول:

”ہلاے سرش زہوش مندی

می یافت ستارہ سر بلندی“

کے سچے مصداق ہیں اور ان شاء اللہ یہ مستقبل قریب میں اپنے خاندان کے کی مزید نیک نامی کا ذریعہ بنیں گے اور اپنے آپ واجد اللہ کی جانشینی کا حق ادا کریں گے۔

۱۰ جنوری ۱۹۹۸ء کو میں شعبہ عالیہ کے استاذ کی حیثیت سے

جامعہ اشرفیہ مبارک پور آگیا، اسی سال اکتوبر کے آخری عشرے میں تاج الخول اکیڈمی، خانقاہ قادریہ، بدایوں شریف کے زیر اہتمام ”جشن صد سالہ تاج الخول“ کا انعقاد ہوا۔ مقالہ نویسی اور سیمینار میں شرکت کے لیے مجھے بھی دعوت نامہ ملا، ایک مختصر سا مقالہ بہ عنوان: ”حضرت تاج الخول، ارباب علم و دانش کی نظر میں“ لکھ کر میں بھی سیمینار اور دیگر تقریبات جشن میں شریک ہوا، مولانا موصوف نے دیگر علمائے کرام کے ساتھ میرا بھی بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا، نہایت خوش اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا اور توقع سے کہیں زیادہ خاطر تواضع کی۔ اس جشن صد سالہ کے اجلاس عام میں آپ کو نقیب الاشراف فضیلۃ الشیخ احمد ظفر گیلانی، سجادہ نشین خانقاہ قادریہ، بغداد شریف اور دیگر علماء و مشائخ کے ہاتھوں دستِ فضیلت سے بھی نوازا گیا۔ اس موقع پر آپ کے ماموں جان حضرت سید محمد منظر چشتی نے اپنی لکھی ہوئی ایک تہنیتی نظم بھی پڑھی تھی، جس کے کچھ اشعار اس طرح تھے:

خدا کے فضل کا سر پر تھیں سہرا مبارک ہو
نبی کے علم سے پایا ہے جو حصہ مبارک ہو
شبہ بغداد کے الطاف کا سایہ مبارک ہو
کرم بھی ہند کے سلطان کا بھیتا مبارک ہو
مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو۔

شہر برکات کی برکات بے حد تم نے پائی ہیں
ہوائیں روح کی تسکین کا سامان لائی ہیں
برسنے کو گھٹائیں رحتوں کی آج آئی ہیں
تھیں سالم میاں عالم ہوا بیٹا مبارک ہو
مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو۔

ضیاء علم سے تابندگی ہے اس گھرانے میں
تمہارے علم کی بھی ہوگی شہرت اب زمانے میں
میں کہنا چاہتا ہوں تم سے یہ اپنے فسانے میں
نیابت اعلیٰ حضرت کی تھیں پانا مبارک ہو
مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو۔

ضیاء علم سے روشن تھیں دنیا ہے فرمانی
مدد فرمائیں گے ہر جا تمہاری غوثِ صدائی
یہ عبد المقتدر سرکار کی ہے نور افشانی
یہ سہرا علم کا اسے قادری دولہا مبارک ہو
مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو۔

یہ سچا قول ہے تاریخ دہرائی ہے اپنے کو
بہت بے چین ہے باو صبا یہ بات کہنے کو
کہ تم نے کر دیا پورا میاں سالم کے سنے کو
تھیں گزری ہوئی تاریخ دہرائی مبارک ہو
مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو۔

اس کے بعد مولانا موصوف نے اعلیٰ تعلیم کے لیے عالم سب سے عظیم اور قدیم یونیورسٹی جامعہ الازہر الشریف، قاہرہ مصر سے داخلہ لیا اور کئی سال وہاں رہ کر تفسیر و علوم قرآن کی تعلیم حاصل کی اور اس میں تخصص کیا۔

پھر جب وہ جامعہ ازہر سے علم و تحقیق کے اسلحوں سے سنبھلا
تحریر و تنقید اور بحث و تحقیق کی رزم گاہ میں اترے تو ماہ نامہ ”جام نور“ کی
کے پلیٹ فارم سے حیرت انگیز برق رفتاری کے ساتھ اپنی مقبول
سفر شروع کیا، ان کی تحریریں زبان و بیان، تحقیق و تخصص، اعتبار و
توازن ہر زاویے سے اہل علم اور ارباب ذوق کے لیے جاذب و
باعث بنیں، ان کے چند وقیع مضامین اور پرکشش مقالوں کے پڑھنے
کے بعد میں بھی ان کے حلقہ نگوشوں میں شامل ہو گیا۔

”خامہ تلاشی“ جام نور کا ایک بڑا اہم اور مفید کالم تھا جو ”ابوالفیض
معینی“ کے نام سے لکھا جاتا تھا، جام نور میں اس کالم کا آغاز اپریل ۲۰۰۵ء
سے ہوا اور دسمبر ۲۰۰۶ء تقریباً پونے دو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا
برکت چلا۔ جام نور اپریل ۲۰۰۶ء کے ”تحریری مباحثہ“ کے کالم
ایک بار میں نے بھی قلمی شرکت کی تھی جس کا عنوان تھا: ”کیا مدارس
عربی کی تدریس اصلاح کا تقاضا کرتی ہے؟“ یوں تو جام نور سلسلے
بعد ادارہ یہ اور خامہ تلاشی کے کالم سب سے پہلے پڑھا کرتا تھا، مگر اس

اشتیاق کچھ زیادہ ہی تھا کہ دیکھیں ابوالفیض معینی صاحب کے خامہ
زرنگار اور تیسرے تنقید نے میرا کیا حشر کیا ہے؟ مگر جب اس کالم کو پڑھنا
شروع کیا تو ابوالفیض معینی کی گونا گوں صلاحیتوں کے ساتھ ان کے
فکری اعتبار و توازن، انصاف پسندی اور حوصلہ افزائی کا قائل ہو گیا،
انہوں نے لکھا تھا:

”اس مرتبہ ”تحریری مباحثہ“ کا عنوان ہے: ”کیا مدارس میں
عربی کی تدریس اصلاح کا تقاضا کرتی ہے؟“ اس میں مولانا
..... بغدادی، مولانا نفیس احمد مصباحی اور مولانا ذکی اللہ
مصباحی نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مولانا.....
صاحب کے نام کے ساتھ ”بغدادی“ کی نسبت سے اندازہ
ہوتا ہے کہ وہ غالباً عراق کے کسی جامعہ سے فارغ ہیں اور شاید
ابھی ”تازہ وار و بساط عشق“ ہیں، ان کے قلم کی کاٹ، غضب
ناک لہجہ اور خطرناک تیور اس بات کی گواہی دے رہے ہیں
کہ وہ عربی زبان و ادب کی تعلیم میں ہندوستان کے مدارس
اسلامیہ کو بھی بغداد و سامری کے عربی جامعات کے ہم پلہ
دیکھنا چاہتے ہیں، البتہ مولانا نفیس احمد مصباحی صاحب کی
تحریر میں اعتدال و توازن کا عنصر غالب ہے، مولانا نے تمہید
میں مدارس اسلامیہ کے موجودہ نصاب کی غرض و غایت کا
حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے، اور آخر میں تحریر بھی قابل مطالعہ
ہے۔“ (خامہ تلاشی، ج: ۸۸، ادارہ فکر اسلامی دہلی، دسمبر ۲۰۰۹ء)

حیدر آباد، دکن کا پتا دیکھ کر کافی دنوں تک میں اور میرے احباب
بکلی سمجھتے رہے کہ ابوالفیض معینی صاحب، حیدر آباد، دکن کی کوئی ہمہ
جہت اور ہر فن مولانا شخصیت ہیں۔ لیکن دل کو اس پر مکمل اطمینان نہیں ہوتا
تھا کیوں کہ اسلوب تحریر، پیرایہ ادا اور زبان و بیان کا رنگ و آہنگ پکار
پکار کے کہتا تھا کہ ”خامہ تلاشی“ کا تعلق جنوبی ہند سے نہیں ہے بلکہ وہ
صوبہ اتر پردیش ہی کا کوئی ماہر، تجربہ کار، ہمہ جہت صلاحیتوں کا مالک
دیدہ و ناقد اور محقق قلم کار ہے۔ پھر ”خامہ تلاشی“ کا کالم بند ہونے کے
چھ مہینے کے بعد جام نور کے جولائی ۲۰۰۷ء کے شمارے میں ”مدیر جام
نور“ ابوالفیض معینی سے ملاقات کے عنوان سے ان کا انٹرویو شائع ہوا
جس سے سب پر ظاہر ہو گیا کہ ابوالفیض معینی کوئی اور نہیں، جام نور کے

مشہور قلم کار، خانوادہ عثمانیہ بدایوں کے چشم و چراغ، فاضل جامعہ ازہر،
مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری ہی ہیں۔

میں کیا؟ اور میری حقیقت کیا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ بڑے بڑے
دیدہ و علماء، محققین، ادبا اور زبان و ادب کے نکتہ رس حضرات بھی ابوالفیض
معینی کی صورت میں مولانا اسید الحق بدایونی شہید سے متاثر
ہوئے، اپنی بات کی تصدیق کے لیے میں یہاں دو چوٹی کے دیدہ و
ناقد و محقق قلم کاروں کے تاثرات پیش کرتا ہوں:

صدر العلماء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی، صدر المدینین جامعہ
اشرفیہ، مبارک پور فرماتے ہیں:

”مولانا تعالیٰ ان (ابوالفیض معینی) کے درجات بلند فرمائے
اور ہم میں ان کے امثال زیادہ فرمائے..... میں معینی صاحب
کی علمی وسعت نظر اور گونا گوں صلاحیتوں کا عام قارئین سے
کچھ زیادہ ہی معترف ہوں، اور ان کی اس خوبی کو بھی بنظر
استحسان دیکھتا ہوں کہ نوجوان اہل قلم کی ہمت افزائی اور رہنمائی
کے لیے ان کی تحریروں کو خاص توجہ دے کر اپنی مدح و تنقید کا
نشانہ بناتے ہیں، بلکہ تنقید کم، تعریف، اصلاح اور حوصلہ افزائی
زیادہ ہوتی ہے، تاکہ اس زمانہ قحط الرجال میں جو چند افراد
قرطاس و قلم سے وابستہ ہوئے ہیں، آئندہ بھی وابستہ رہیں،
ساتھ ہی ان کی تحریروں میں پختگی اور جلا بھی پیدا ہوا۔“

(مکتوب بنام مولانا اختر شورتوری مدیر جام نور، مورخہ ۲۵ شعبان ۱۴۲۷ھ
مطابق ۱۹ اگست ۲۰۰۶ء)

شرف ملت حضرت سید محمد اشرف قادری برکاتی (خانقاہ برکاتیہ،
بڑی سرکار، مارہرہ مظہرہ) فرماتے ہیں:

”آزادی کے بعد کے دور میں مذہبی صفحات میں تنقید و تبصرے
کی روایت تو یقیناً ملتی ہے، لیکن جام نور کے صفحات میں
مستقل کالم کے طور پر عزیز گرامی قدر مولانا اسید الحق محمد عاصم
قادری کی ”خامہ تلاشی“ نے قارئین کے دل میں جیسی جگہ بنائی،
اس کی مثال عقاب ہے۔ ”جلی“ کے کالم ”مسجد سے مے خانے
تک“ کا موازنہ بے سود ہے کہ اس کالم میں قاری کے لیے
دلچسپی کا سبب وہ عناصر تھے جنہیں سنجیدہ اور متین ادب میں

احسن نہیں تصور کیا جاتا، مثلاً شخص جملے، ذاتی عناد، براہمی اور بھلو پن۔

”خامہ تلاشی“ کے قبول عام میں جن عنصروں نے حصہ لیا وہ ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہیں۔ گہرا علم، وسیع معلومات، سخن فہمی، عمدہ نثر کا استعمال، صحت زبان، منطقی طریقہ کار، طنز کا شائستہ انداز، نظریات ذوق، بے باکی (گستاخی نہیں) احساس توازن، پاس اعتدال، ”خیال خاطر احباب“ اور.... ظہر ف نگاہ۔ یہ آخری بات کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے، سنجیدہ متین اور علمی تحریر کے آفق پر ظرافت کی روپوشی چمک نے ان کا سون کو یادگار بنا دیا ہے۔

مندرجہ بالا عناصر کہیں یکجا بھیجائیں تب بھی بات نہیں بنتی جب تک سینے میں آگ نہ روشن ہو۔ جذبے کی یہی گرمی تو ایسے جاندار اور معنی خیز الفاظ بنتی ہے جو ہمیں اس تحریر میں نظر آتے ہیں جو سید شمیم گوہر کے تھمرے پر راجہ رشید محمود کی برہمی کے جواب کے طور پر معرض وجود میں آئی۔

مدیر جام نور مولانا خوشتر نورانی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کے پیہم اصرار پر فاضل مصنف نے یہ کالم سپرد قلم کیے جواب ہماری مذہبی صحافتی تاریخ کا خوبصورت اور بامعنی حصہ ہیں۔

ان دلکش تحریروں کے مصنف خانقاہ قادریہ، بدایوں شریف کے فرزند جلیل مولانا سیدالحق قادری کے لیے بے شمار دعائیں کہ ابھی انھیں بہت سے چراغ روشن کرنا ہیں۔“

(پشت کتاب: ”خامہ تلاشی“ ادارہ فکر اسلامی، دہلی، ۲۰۰۹ء)
فون پر کبھی بکھارا ان سے تبادلہ خیال بھی ہوتا تھا۔ ۲۰۰۹ء کے اواخر میں ایک دن فون پر گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ”مارچ ۲۰۱۰ء میں والد گرامی حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری (زیب سجادہ خانقاہ قادریہ، بدایوں شریف) کے عہد سجادگی کو پچاس سال مکمل ہونے جا رہے ہیں، اس دورانی حضرت کی گونا گوں زریں خدمات کے تسلسل کو دیکھتے ہوئے بعض وابستگان سلسلہ قادریہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس موقع پر نہایت تزک و احتشام سے ”پچاس سالہ جشن سجادگی“ منایا جائے، اور اس زریں موقع پر اکابر خانقاہ قادریہ اور علمائے مدرسہ قادریہ

کی پچاس کتابیں جدید آب و تاب اور موجودہ تحقیقی و اشاعتی معیار کے مطابق شائع کی جائیں، تاکہ یہ پچاس سالہ جشن یادگار بن جائے اور خانقاہ قادریہ کی اشاعتی خدمات کی تاریخ میں یہ جشن ایک سنگ میل ثابت ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ اشاعتی منصوبہ منظور ہو گیا ہے، اور اس وقت اسی کی تکمیل کے لیے شب و روز ایک کرنے پڑ رہے ہیں۔“

یہ سننے کے بعد میں نے حوصلہ افزائی کے لیے کچھ تعریفی کلمات کہے، اور پیشگی مبارک باد دی اور دل ان کی فکری عظمت، مومنہ ذہانت اور قائدانہ بصیرت کا پیہ سے کہیں زیادہ معترف ہو گیا، اور پھر دنیائے یہ بھی دیکھ کہ اس دھن کے کچھ مرد مجاہد نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ صرف منصوبہ ہی نہ رہا بلکہ وہ عملی شکل میں دنیا کے سامنے آ گیا، اور ۲۰۱۳ء مطابق ۲۰۱۰ء میں پچاس کتابوں کی اشاعت کا مقررہ ہدف تکمیل آٹھ ہو گیا۔ پھر تین سال بعد ۲۰۱۳ھ / ۲۰۱۳ء میں حضرت علامہ شاہ مٹھال الرسول محمد عبدالقادر قادری بدایونی علیہ الرحمہ کے وصال کے موسم مکمل ہونے پر ان کے صد سالہ عرس کے موقع پر تاج التحول اکیڈمی کے اشاعتی سفر کی سوزنیں پوری ہو گئیں اور اکیڈمی سے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد سو تک پہنچ گئی۔

یوں تو مولانا موصوف کی ساری تحریریں دل کش، معیاری اور متاثر کن ہیں لیکن درج ذیل کتابوں نے مجھے کچھ زیادہ ہی متاثر کیا:
☆ خیر آبادیات، ☆ عربی محاورات، ☆ قرآن کریم کی سائنسی تفسیر، ☆ خامہ تلاشی، ☆ مقدمہ ”قصیدتان رائعتان“۔
میں نے خاص طور پر موصوف کی شخصیت میں جو متاثر کن امتیازی اوصاف دیکھے وہ کچھ اس طرح ہیں:

- (۱) حقائق کی تلاش و جستجو اور تحقیق و تفتیش کے بعد بات کہنے کی عادت۔
- (۲) مافی الضمیر کی آسان عصری اسلوب میں تعبیر و تریل۔
- (۳) دل کش پیرایہ اور پُر اعتماد لہجے میں اپنی رائے کا اظہار۔
- (۴) جدید نافع کے ساتھ قدیم صالح کے دامن سے مضبوط وابستگی۔
- (۵) تحریر و تقریر دونوں میں اعتدال، توازن، اور انصاف پسندی۔
- (۶) غیروں کے ساتھ اپنوں کی اصلاح کی بھی خلصانہ جدوجہد۔

- (۷) علم و عقل اور معرفت و بصیرت کی خوش گوار جامعیت۔
- (۸) ہر لمحہ احساس توازن، پاس اعتدال اور خیال خاطر احباب۔
- (۹) اصغر کی حوصلہ افزائی، اکابر کا احترام اور احباب کی دلجوئی اور آرام۔

(۱۰) اپنے خانوادے کی دیرینہ روایت کے مطابق شہنشاہ بغداد سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے والہانہ عقیدت اور ان کی اولاد اور چانشینوں سے مسلسل رابطہ۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں انھیں اس والہانہ تصدق اور حسن عقیدت کا یہ مدد عطا فرمایا کہ دیر غوث اعظم میں نعمت شہادت سے سرفراز فرما کر ہمیشہ کے لیے سرکار غوث اعظم کے قدموں میں جگہ عنایت فرمادی۔ موصوف کی یہ سعادت ایسی قابل رشک ہے کہ اس پر ہزاروں سعادتیں قربان ہیں۔

یہ شہادت ان کے لیے ضرور باعث صد سعادت ہے، لیکن اس سائے نے پوری جماعت اہل سنت کو چھوڑ کر رکھ دیا، خاص طور سے جوان اور نوجوان علما اور قلم کاروں کو جن کے لیے آپ کی ذات ایک آئینہ دل اور نمونہ عمل تھی، ان کی رحلت سے ایک آباد انجمن ویران ہو گئی۔ بقول حماسی شاعر ہشام بن عقبہ عدوی:

نَعُوْا بِاَسَقِ الْاَفْعَالِ لَا يَخْلُقُوْنَ
نَكَادُ الْجِبَالُ الشَّمُّ مَهْ تَصَدَّعُ
خَوَى الْمَسْجِدُ الْمَعْمُورُ بَعْدَ ابْنِ ذُلْهَمِ
وَأَمْسَى بِأَوَّلِي قَوْمِهِ قَدْ تَضَعَّضُوا

(آنے والوں نے ایسے بلند کارناموں کے حامل نوجوان کے موت کی خبر سنا لی جس کے وہ نائب و جانشین نہیں ہو سکتے، قریب ہے کہ اس کی وجہ سے سخت اور مضبوط پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔
ادنیٰ ابن ولہم کے بعد آباد مسجد ویران ہو گئی اور اس سائے سے اس کی قوم میں بھونچال آ گیا۔)

اس کا سانچہ ارتحال بلاشبہ ”موت العالم موت العالم“ کا مصداق ہے اور بقول حماسی شاعر عبدہ بن الطیب:

لَمَّا كَانَ قَيْسٌ هَلْكَهَ هَلْكَ وَاحِدٍ
وَلَكِنَّهُ بَيَانُ قَوْمٍ تَهْتَمُّ

(قیس بن عاصم کی موت فرد واحد کی موت نہیں، بلکہ وہ قوم کی عمارت تھے جو ڈھ گئی۔)

آخر میں ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب کے وہ اشعار ان کی بارگاہ میں پیش کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں جو انھوں نے شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی شان میں کہے تھے:

تیرے علمی کارنامے بخشش گے تجھ کو دوام
آپ زریں سے لکھے گاہ گل مورخ تیرا نام
تو نے نسل نو کو بخشا ہے شعور علم و فہم
ہے تری ذات گرامی لائق صد احترام

□□□

☆ استاذ اجماعہ الشریف، مبارک پور، مظہر گڑھ (پولی)

بقیہ حیات قابل تحریک اور مہمات قابل صد رشک: اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ محبوب کرم بھی ایسے ہیں، جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ عطف و کرم اور بے پایاں نوازش و عنایت سے وقار و ایت کے اوج تریا پر فائز ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ حضور غوث اعظم رضی اللہ عنہ سے شہید بغداد پر تاجدار مدینہ کے فیوض و برکات کی بارشیں برآمد ہو رہی ہیں۔ کیا قسمت پائی ہے، ہم تو روضہ انور کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس رہے ہیں اور وہ ہیں کہ جو کہ نور کی تابانیوں سے نکالیں مٹی ہی نہیں کہ دوبارہ دیکھنے کی نوبت آئے اور میرا وجدان تو پکار رہا ہے کہ اب وہ وہاں ہیں، جس سے شہر مدینہ کا فاصلہ بھی گھٹ کر چند زمرہ گیا ہے۔ چمک چمکتے کبھی ریاض الجنۃ کی سرسبز و شاداب وادی میں اور کبھی اپنے مستقر اصلی میں نہیں۔ بدایوں رخ گھبرا اور جوہ محبوب سے شد و کام ہو گئے اور، را سارخ گھمایا اور مرکز عقیدت کو مین کے جلوہ ہائے تاباں کی زریں رت سے کھل اٹھے۔ یہ اور بات کہ یہ حساس ہمارے ہوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا کہ ہم کفار و مشرکین کے درمیان مکہ میں محفوظ رہے و تم مدینہ جہ کے شہید ہو گئے۔
وہ رہے سیدنا حق ایہ حیات تھی؟ کیا مہمات تھیں؟ بہتوں کی حیات پر لوگ ناز کرتے ہیں اور بہتوں کی مہمات پر بھی ناز کرنے والے کم نہیں۔
☆ استاذ اجماعہ الشریف، مبارک پور، مظہر گڑھ (پولی)

عزائم اور منصوبوں کے اک جہان کی موت

مولانا اسید الحق قادری نے اپنے علم و فن اور اخلاق و کردار سے ایک جہاں کو اپنا شیدائی بنا لیا تھا

۱۴ مارچ ۲۰۱۳ء کو بعد نماز مغرب خانقاہ قادریہ بدایوں کے چشم و چراغ حضرت مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کے تعلق سے یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ وہ بغداد شریف کے قریب دہشت گردوں کے حملے میں شہید ہو گئے۔ یہ خبر سن کر پہلے تو یقین نہیں آیا لیکن مختلف مقامات سے جب یہی فون آنے لگے اور اطمینان خاطر کے لیے ہم نے بھی مختلف مقامات پر فون کیے تو یقین ہوا اور زبان سے آیت استرجاع دوہرائی۔ مولانا تعالیٰ تنقید و تحقیق کے اس ابھرتے ستون کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

افسوس راقم سطور دینی اور فکری طور پر بے حد محزون و مغموم ہے، مضامین کے انبار ہیں مگر دل و دماغ انتخاب کرنے سے قاصر ہیں کہ کیا لیا جائے اور کیا چھوڑا جائے۔ اب تو صرف ایک ہی بات بار بار دل و دماغ میں گشت کر رہی ہے کہ مولانا تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے طفیل شہید مکرّم کو حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے خوشہ چینوں میں شامل فرمائے اور والدین کریمین، اہل تعلق اور اہل محبت کو صبر و شکر کی توفیق سے سرفراز فرمائے۔ آمین

راقم سطور بدایوں شریف متعدد بار حاضر ہوا، لیکن کبھی خانقاہ قادریہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا، یہ شاید جشن صد سالہ ۱۹۹۸ء سے پہلے کی بات ہے کہ اپنے ایک عزیز کے ساتھ خانقاہ عالیہ قادریہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، اس وقت آفس میں علامہ اسید الحق قادری، مفتی عبد الحکیم نوری، جناب یسین علی عثمانی وغیرہ موجود تھے، یہ حضرات اس خادم کو دیکھ کر پھڑک گئے، مولانا اسید الحق قادری نے واقعی اپنی محبت کا حق ادا کر دیا، ناشتے اور کھانے سے فراغت کے بعد آپ مجھے بدایوں کے معروف مزارات پر لے گئے، خانقاہی اکابر سے آپ کے تعلقات دیکھ کر ہم بے پناہ متاثر ہوئے اور خاص طور پر جب آپ اپنی خانقاہ کے

میں تدریس شروع فرمائی اور اپنے خاص انداز اور امتیازی نصاب سے طلبہ کو فارغ کیا۔ آپ عظیم محقق، بلند پایہ ناقد اور حیرت انگیز ترجمہ نگار تھے، آپ تصنیف و تالیف میں بھی امتیازی مقام رکھتے تھے، مطبوعہ کتب و رسائل کی تعداد کثیر ہے، جب کہ متعدد کتب غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ پچاس سے زیادہ مقالات و مضامین ہندوپاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتابیں اس وقت زیر ترتیب و تصنیف تھیں، جن میں اکثر پرکافی کام ہو چکا ہے۔ (۱) امثال القرآن (۲) مطالعہ بخاری (۳) تیرہویں اور چودھویں صدی کے علمی معرکے (۴) مشاہیر کے خطوط خانوادہ عثمانیہ کے نام۔

ان کے علاوہ آپ نے عربی، فارسی کی کتابوں کے ترجمے، تحقیق اور تخریج فرمائی اور اپنے آبا و اجداد کی کتابوں کو جدید ترتیب و تخریج اور تقدیم کے ساتھ شائع کیا۔ خانقاہ عالیہ قادریہ کے مشائخ اور مدرسہ قادریہ کے اکابر کی اب تک ۱۰۰ سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مارچ ۲۰۱۰ء میں تاج دار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زبیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے عہد سجادگی کو پچاس سال مکمل ہوئے، بعض وابستگان سلسلہ قادریہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس موقع پر پچاس سالہ جشن منایا جائے، لیکن مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری نے فرمایا کہ اس جشن کو ہم جشن اشاعت کے طور پر منائیں گے۔ اس موقع پر اکابر خانقاہ قادریہ اور علمائے مدرسہ قادریہ کی پچاس کتابیں جدید آب و تاب اور موجودہ تحقیقی و اشاعتی خدمات کی تاریخ میں شائع کی جائیں گی تاکہ یہ پچاس سالہ جشن یادگار بن جائے اور خانقاہ قادریہ کی تاریخ میں یہ جشن سنگ میل ثابت ہو۔ حضرت صاحب سجادہ کی سرپرستی اور مولانا اسید الحق قادری کی محنت و جستجو سے یہ جشن اشاعت منایا گیا اور مجھہ تعالیٰ اب تک سو سے زیادہ کتابیں جدید رنگ و آہنگ کے ساتھ منظر عام پر آ گئیں۔

مولانا اسید الحق قادری ایک ہا کمال مدرس تھے، آپ نے درجنوں طلبہ کو درس دیا، اور انھیں اعلیٰ کتابیں بھی پڑھائیں اور خاص بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے تلامذہ کو قرطاس و قلم کا بھی خور بنایا۔ ان مطبوعہ کتب میں بعض کتابیں آپ کے تلامذہ نے بھی مرتب فرمائیں۔ مولانا عظیم محقق و ناقد بھی تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر تحقیق و تنقید کا حق ادا

کر دیا۔ مولانا محمد حنیف خاں رضوی بریلوی نے امام احمد رضا محدث بریلوی کی کتابوں سے احادیث اور تفاسیر کا ذخیرہ اخذ فرمایا اور حق یہ ہے کہ تحقیق و تدوین کا حق ادا کر دیا۔ ایک مقام پر ایک حدیث کا ترجمہ تو ملا مگر اس حدیث کا متن نہیں ملا، یہ ان کی دیانت داری تھی کہ انھوں نے اس مقام پر بیاض چھوڑ دی کہ اگر کسی محقق کو حدیث مل جائے تو اسے رقم کر دیں اور مرتب کو مطلع فرمادیں۔ اس پر مولانا اسید الحق قادری کی نظر پڑی، آپ نے مضمون محنت سے اس حدیث کو تخریج کیا اور اسے ماہ نامہ ”جام نور“ دہلی میں بغرض اشاعت بھیج دیا۔ حیرت و مسرت یہ ہے کہ صرف سرسری طور پر نہیں بلکہ باضابطہ مولانا محمد حنیف رضوی کی محنت کو سراہا، انھیں مبارک باد دی اور اسی حوالے سے عالم عرب اور جامعہ ازہر مصر کا حوصلہ افزا رویہ بھی ظاہر کیا۔

جامع الاحادیث کے مرتب نے اپنے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے: ”پوری کتاب میں صرف ایک حدیث ایسی ہے جس کا متن مجھے نہیں مل سکا، اس کے لیے بیاض چھوڑ دی گئی ہے کہ اگر کسی صاحب کو وہ متن مل جائے تو اپنے نسخے میں تحریر کر لیں اور ہمیں مطلع فرمائیں، ہم شکریہ کے ساتھ آئندہ ایڈیشن میں شائع کر دیں گے۔“

(جامع الاحادیث، مقدمہ ص: ۱۳، ۱۴، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی)

مولانا اسید الحق قادری لکھتے ہیں:

”یہ عہد پڑھ کر میں مرتب کی کشادہ قلبی اور علمی امانت و دیانت کا قائل ہوں، ہاں نہیں رہ سکا، اگر وہ سرے سے اس حدیث کا ذکر ہی نہیں کرتے تو کون ان سے ہاز پرس کر سکتا تھا کہ ایک حدیث آپ نے درج نہیں کی ہے اور پھر فطری طور پر مجھے یہ تجسس بھی ہوا کہ آخر وہ کون سی حدیث ہے جو ایسے وسیع المطالعہ مرتب کی نگاہ سے بھی اوجھل رہی، تھوڑی سی تلاش کے بعد آخر وہ مقام مل گیا جہاں متن کے لیے بیاض خالی چھوڑی گئی ہے، جس حدیث کا متن نہیں مل سکا، وہ یہ ہے:

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، فرشتہ جو رحم زن پر مومل ہے جب نطفہ رحم میں قرار پاتا ہے اسے رحم سے لے کر اپنی

تھیلی پر رکھ کر عرض کرتا ہے: اے رب میرے! بنے گا یا نہیں؟ اگر فرماتا ہے نہیں، تو اس میں روح نہیں پڑتی اور خون ہو کر رحم سے نکل جاتا ہے اور اگر فرماتا ہے ہاں، تو عرض کرتا ہے اے میرے رب! اس کا رزق کیا ہے؟ زمین میں کہاں کہاں چسے گا؟ کیا عمر ہے؟ کیا کام کرے گا؟ ارشاد ہوتا ہے: لوح محفوظ میں دیکھ کہ اس میں نطفہ کا سب حال پائے گا، پھر فرشتہ وہاں کی مٹی لاتا ہے جہاں اس کو دفن ہونا ہے، اسے نطفہ میں ملا کر گوندھتا ہے، یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ زمین ہی سے ہم نے تمہیں بنایا اور اسی میں پھر ہم تمہیں لے جائیں گے۔“

(جامع احادیث، ج ۲۰، ص ۲۵۰)

مولانا اسید الحق قادری نے اس کی تلاش میں کچھ محنت کی اور اس کا متن مل گیا۔ مولانا لکھتے ہیں، اگر درست ہو تو آئندہ ایڈیشن میں شامل کر لیا جائے۔ حدیث درج ذیل ہے:

ان المملک الموکل بالارحام یاخذ النطفة من الرحم، فیضعها علی کفہ ثم یقول یا رب مخلقة أو غیر مخلقة؟ فان قال مخلقة قال ما الرزق؟ ما الاثر؟ ما الاجل؟ فیقال: انظر فی ام الكتاب فینظر فی اللوح فیجد فیہ رزقه واثره واجله وعمله ثم یاخذ التراب الذی یدفن فی بقعته فیعجن به نطفته فذلک قوله الکریم منها خلقتکم و فیها نعیدکم.

حکیم ترمذی نے اپنی کتاب نوادر الاصول میں حدیث پاک کا ذکر فرمایا ہے۔ (نوادر الاصول فی احادیث الرسول، ج ۱، ص ۳۶۷، دار التخیل، بیروت، الطبع الاول ۱۴۱۲ھ)

حدیث کا متن ذکر فرمانے کے بعد مولانا قادری لکھتے ہیں: اس حدیث کو حکیم ترمذی ہی کے حوالے سے امام سیوطی نے بھی ابوالالی المصنوع، ج ۱، ص ۲۸۴، ۲۸۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، الطبع ۲۰۱۷ء میں نقل کیا ہے۔

امام قرطبی نے بھی اس حدیث کو اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی)، ج ۶، ص ۲۸۸، ۲۸۹، دار الشعب القاہرہ، المطبوعۃ الثانیہ ۱۳۷۲ھ میں حافظ ابویعیم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

فرمایا ہے۔

مولانا اسید الحق قادری اس تفصیل کے بعد لکھتے ہیں

حکیم ترمذی اور ابویعیم دونوں نے اس حدیث کو یدنا بن مسعود سے بطریق مرہ روایت کیا ہے، جامع الاحادیث میں نقل کردہ ترجمہ میں یہ جملہ بھی ہے کہ اگر فرماتا ہے نہیں، تو اس میں روح نہیں پڑتی اور خون ہو کر رحم سے نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا اسید الحق قادری لکھتے ہیں۔

ہم نے اوپر جو متن نقل کیا ہے اس میں یہ جملہ نہیں ہے، قرطبی والی روایت میں بھی یہ جملہ نہیں ہے، اصل یہ جملہ ایک دوسری روایت میں موجود ہے جس کا ترمذی حدیث ترمذی نقل کردہ حدیث کے ہم معنی ہے، ترمذی آخری حصہ، مختلف ہے، اس کو امام ابن جریر طبری نے حضرت ابن مسعود سے بطریق سند روایت کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

النطفة اذا استقرت فی الرحم اخذها ملک بکفه فقال یا رب مخلقة أو غیر مخلقة فان قبل غیر مخلقة لم تکن نسمة وقذفها الارحام دما وان قبل مخلقة قال ای رب ذکر او انثی شقی أو سعید، الی آخر الحدیث۔ (تفسیر الطبری، ج ۷، ص ۷۷، دار الفکر، بیروت ۱۴۰۵ھ)

حافظ ابن کثیر نے بھی اس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریر طبری کے حوالہ سے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۰۸، دار الفکر، بیروت ۱۴۰۱ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا ہے: اسنادہ صحیح

وهو موقوف لفظاً (فتح الباری، ج ۱، ص ۳۱۱، دار المعرفہ، بیروت ۱۳۷۹ھ) اس حدیث کو حافظ ابن رجب علی جنبل نے بھی نقل کیا ہے (جامع الصوم والحکم، ج ۱، ص ۵۰، دار المعرفہ، بیروت، الطبعة الاولى ۱۴۰۸ھ)

(تحقیق و تفسیم، ص ۱۴۳، ادارہ فکر اسلامی، دہلی) مولانا اسید الحق قادری کی روح کا اضطراب تھا کہ انھوں نے اس حدیث کے متن کا استخراج کیا، کیوں کہ ان کے غیر میں جس مٹی کو گوندھا گیا تھا وہ حضرت غوث اعظم بغدادی کے قبرستان کی مٹی تھی۔

مولانا اسید الحق قادری علم و روحانیت کے ماحول میں پروان چڑھے، علوم و فنون میں ان کی خانقاہ اور درس گاہ صدیوں سے مشہور ہے، تاریخی شواہد کی روشنی میں ان کی خانقاہ قادریہ ۸۰۰ سالہ قدیم ہے اور پورے تسلسل کے ساتھ یہ خانقاہ علم و روحانیت کی خدمات انجام دیتی رہی ہے۔ ان کے آباء و اجداد میں ایک سے ایک فضلاء روزگار گزرے ہیں، یہ اہل علم صرف اہل علم ہی نہیں بلکہ عشق و عرفان اور تصوف و روحانیت کے میدانوں میں بھی کیتاے روزگار تھے، اس عثمانی خاندان کی عقیدت و محبت کا رشتہ صدیوں سے خانقاہ عالیہ عالیہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ سے ہے، مولانا ایک بلند پایہ محقق اور عظیم مصنف ہونے کے باوجود تصوف و روحانیت کے معاملات میں بھی امتیازی مقام رکھتے تھے۔ ماہ نامہ ”جام نور“ دہلی کے علمی مباحثوں میں بھی آپ نے گھر پور لکھا، ایک بار جام نور کا عنوان تھا: ”دعوت و تبلیغ کے لیے خانقاہ ہی نظام کتنا موثر ہے؟“ مولانا اسید الحق قادری نے ہندوستانی خانقاہوں کا سرسری جائزہ دیتے ہوئے لکھا:

اگر ہمارے یہاں کے خانقاہی نظام کا تقابل مصر کے خانقاہی نظام سے کیا جائے تو یہ ہوش رہا حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو ایک چتے پھرتے انسان اور ایک بے جان مردہ جسم میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں یہاں چند باتوں کی طرف سرسری اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

(تحقیق و تفسیم، ص ۲۴۳، ادارہ فکر اسلامی، دہلی)

مولانا نے مصر کے خانقاہی نظام کے آٹھ امتیازات شمار کرائے ہیں، ہم ذیل میں ان کی تفصیل رقم کرتے ہیں:

(۱) مصر کے مشائخ طریقت ذی علم ہوتے ہیں، آج تک مولانا کی ملاقات کسی ایسے شیخ سے نہیں ہوئی جس کو علم ظاہری کے بجائے علم مدنی کا دعویٰ ہو۔

(۲) ہر خانقاہ میں نہایت پابندی سے اذکار اور ادائیگہ ہفتہ وار مجالس منعقد ہوتی ہیں اور یہ خصوصیت صرف قاہرہ مصر کی نہیں بلکہ دیگر مقامات پر بھی باضابطہ روحانی مجالس کا انعقاد ہوتا ہے۔

(۳) بعض خانقاہوں میں ہفتہ وار درس قرآن، درس حدیث اور درس تصوف بھی ہوتا ہے۔

(۴) خانقاہوں میں باہم کوئی چپقلش نہیں بلکہ حسب حیثیت ایک دوسرے کی تعظیم و توقیر کرتے ہیں۔

(۵) خانقاہی علم و مشائخ خود کو واجب التعظیم نہیں سمجھتے اور نہ دست بوسی اور قدم بوسی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، ایک دوسرے کا جھوٹا پانی تبرک پینا اور ایک دوسرے کے لیے تعظیماً کھڑے ہو جانا ان کی عادت میں شامل ہے۔

مولانا اس کی مزید تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ سنئے، مکن کے ایک بزرگ ہیں، شیخ حبیب علی البحراری، یہ جید عالم ہیں اور بہترین خطیب ہیں، مصر میں ان کے ہزاروں مریدین ہیں اور تقریباً ہر سال مصر کا دورہ کرتے ہیں، جب بھی مصر آتے ہیں تو مختلف خانقاہوں میں ان کے درس اور تقریریں ہوتی ہیں، متعدد بار یہ دیکھ کر مجھے ماضی کے صوفیہ یاد آگئے کہ جس خانقاہ میں ان کے درس کی محفل تھی اس خانقاہ کے صاحب سجادہ نے اپنی خانقاہ میں آئے ہوئے بیسیوں لوگوں کو ان کا مرید کر دیا، کیا ہندوستان میں کسی ایسے منظر کا آپ تصور کر سکتے ہیں؟ ہمارے یہاں تو حال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ دو شیر کسی طرح ایک جنگل میں رہنے پر مجبور نہ کر لیں، مگر دو چیز ایک حلقے میں نہیں رہ سکتے۔

(تحقیق و تفسیم، ص ۲۵۵، ادارہ فکر اسلامی، دہلی)

(۶) مصر میں مرید ہونے کے بعد اس میں واضح تبدیلی آ جاتی ہے آپ کسی مسجد میں باجماعت نماز ادا کریں، نماز کے بعد جو شخص تسبیح پڑھنا شروع کر دے، یا چھوٹا بیچ سورہ نکال کر پڑھنا شروع کر دے تو آپ سمجھ لیں کہ یہ کسی کامرید ہے۔

(۷) یہاں خانقاہ میں رذہ ہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کرتی ہیں، ایسی بہت سی خانقاہیں ہیں جہاں سے ازہر شریف کے مصری اور غیر ملکی طلبہ کے سب سے ماہ وار وظیفے مقرر ہیں۔

قاہرہ سے تقریباً آٹھ سو کلومیٹر دور جنوب میں ایک شہر ہے، الاقصر، وہاں مولانا اسید الحق قادری نے دو بار قیام فرمایا۔ ایک بار ۲۵ روز اور ایک بار ۱۲ روز۔ الاقصر میں تین بڑی خانقاہیں ہیں، خانقاہ طیبہ، خانقاہ رضوانیہ اور خانقاہ جینا نیہ، وہاں زمین و جانداد کے جھگڑے ہوں یا

گھریلو مسائل، عدالتوں اور پکھریوں میں مقدمہ بازی کے بجائے اس قسم کے زیادہ تر مسائل کا تصفیہ خانقاہی سطح پر کر دیا جاتا ہے۔

مولانا اسید الحق قادری کی نظر تاریخ و سیر پر بھی بہت گہری تھی اور یہ تحقیقی نظر صرف اپنے خانوادے کے اکابر تک محدود نہیں تھی بلکہ اہل سنت کی تاریخ ان کی نگاہوں میں رہتی تھی، گزشتہ دنوں جب استاد مطلق علامہ فضل حق خیر آبادی کا بڑھ سوا سالہ جشن منائے جانے کا منصوبہ بنا تو مولانا نے ”خیر آبادیات“ کے عنوان سے ایک انتہائی دقیق کتاب لکھی، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا یسین اختر مصباحی لکھتے ہیں:

زیر نظر کتاب ”خیر آبادیات“ ایک محققانہ، فاضلانہ اور مؤرخانہ دستاویز ہے، جسے ہندو پاک کے اہل علم و فضل نہ صرف قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے بلکہ اسے خیر آبادیات کا ایک گراں قدر مجموعہ اور بیش قیمت مرقع قرار دیں گے۔

(خیر آبادیات، ص: ۱۶، تاج اللؤلؤ اکیڈمی، بدایوں)

اس کتاب میں مصنف نے خانوادہ خیر آباد کے متعدد گوشوں پر تحقیق فرمائی ہے، تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس کا ایک ذیلی عنوان ہے: ”خانوادہ خیر آبادی اہل علم خواتین“ مولانا نے اس عنوان کے ضمن میں تین اہل علم خواتین کا تذکرہ بڑی خوب صورتی سے فرمایا ہے۔ یہ خواتین واقعی معقول و مقول اور علوم ادبیہ میں خاصا درک رکھتی تھیں، ان خواتین کا ذکر عام طور پر یک جا نہیں ملتا، بلکہ متعدد مقامات پر ضمن ذکر آ گیا ہے، مولانا نے انتہائی محنت سے ان تین خواتین کے حوالے سے شواہد کی روشنی میں تحریر فرمایا ہے۔ اب ہم ذیل میں مصنف کی تحقیقات کا خلاصہ رقم کرتے ہیں:

(۱) بی بی سعید النساء خیر آبادی: انھوں نے درسیات کی تکمیل اپنے والد ماجد علامہ فضل حق خیر آبادی سے کی، انھیں کے بارے میں مولانا عبدالحق خیر آبادی اکثر فرمایا کرتے تھے: اچھا ہوا سعید النساء بہن ہوئیں ورنہ ان کے سامنے ہمیں کون پوچھتا؟

(ہاشمی ہندوستان، ص: ۳۳۳)

بی بی حرمات خیر آبادی ایک بار نو تک تشریف لے گئی تھیں، علامہ حکیم برکات احمد ٹوکی کے صاحب زادے مولانا حکیم سید محمد ٹوکی اپنا مشاہدہ تحریر فرماتے ہیں، ہم ذیل میں اس تاثر کا آخری حصہ نقل کرتے ہیں:

مجھے اور میرے خاندان کو یہ عزت حاصل ہوئی، مجھے اچھی مرصہ یاد ہے اور آج بھی وہ تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے کہ استاد البندوبار برکات احمد صاحب قبلہ بی بی صاحبہ کے سامنے گردن جھکائے مؤدب ایک بے علم انسان کی طرح بیٹھے ہیں اور ان کے جوش تقریر کا یہ عالم کہ کسی موضوع پر نہیں رکتیں، ضعیف القوی تھیں، کبیر سن تھیں، اعضا میرے عرشہ تھا، مگر معلوم ہوتا تھا تمام قوتیں قوت باطلہ میں منجذب ہو گئی ہیں۔ کیا تقریر تھی، کیا اتار چڑھاؤ تھا، کیا جھٹکتی تھی، کیا برجستگی تھی، کیا پر عجب آواز تھی۔ (مولانا حکیم سید برکات احمد، سیرت اور علوم، ص: ۱۰۳، ۱۰۴)

حضرت حرمات خیر آبادی کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ ان کی اردو اور فارسی شاعری کے کچھ نمونے مولانا عبداللہ شاہد خاں شیروانی نے ہاشمی ہندوستان میں اور مفتی نجم الحق خیر آبادی نے ”خیر آبادی ایک جھلک“ میں محفوظ کر دیے ہیں۔

(۲) حضرت ہاجرہ بی بی خیر آبادی: آپ مولانا عبدالحق خیر آبادی کی زوجہ محترمہ ہیں۔ مولانا برکات احمد ٹوکی مولانا عبدالحق خیر آبادی کی درس گاہ میں پڑھ رہے تھے تو ان کو احساس ہوا کہ اب وہ عالم ہو گئے مگر حالات کے پیش نظر مولانا عبدالحق خیر آبادی سے اجازت لینے میں خوف محسوس ہوا تو آپ اجازت لینے کے لیے ان کے گھر پہنچے۔ بی بی صاحبہ نے پردے کے پیچھے سے پوچھا، بیٹا کتنا پڑھ لیا؟ مولانا نے ادب سے عرض کیا کہ نصاب درس کی تکمیل کر لی ہے اور میرزا ابراہام مور عامہ تک پڑھ لیا ہے۔ امور عامہ کا نام سن کر ہنستے ہوئے فرمایا: بھئی! امور عامہ تک پڑھ کر خود کو فارغ اور فاضل سمجھ رہے ہو؟ کیا میں امور عامہ کے متعلق کوئی سوال پوچھ سکتی ہوں؟ بیٹے امور عامہ تک تو اس خاندان کی مستورات بھی شد بد رہتی ہیں، اس گفتگو کے بعد مولانا نے عرض کیا، میں اپنے فیصلے پر نادم ہوں، آپ سے استقلال کی دعا کی درخواست ہے۔

(مصباح: مولانا حکیم سید برکات احمد، سیرت اور علوم، ص: ۱۵۴، ۱۵۵)

(۳) بی بی رقیہ: آپ مولانا عبدالحق خیر آبادی کی صاحبزادی تھیں، یہ عالمہ اور فاضلہ تھیں، ان کی ایک کتاب جس کا آج تک کسی نے ذکر نہیں کیا: تفسیر طبیات بیہات معروف بہ صراط مستقیم ہے۔ کتاب کا نام مولانا برکات احمد ٹوکی نے رکھا ہے۔ اس کتاب پر تصدیق و تقریب علامہ برکات احمد ٹوکی اور مولانا بشیر احمد خاں رام پوری نے لکھی۔

مولانا اسید الحق قادری اس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

اس تفسیر کا ایک نایاب قلمی نسخہ خانقاہ صدیہ پھونڈ شریف (یو پی، انڈیا) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کا عکس کتب خانہ قادریہ بدایوں میں ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، یہ تفسیر بڑی تقطیع پر ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے، جلی خط میں ہر صفحہ پر پندرہ سطریں ہیں، اس نسخے کے کاتب ثار احمد خیر آبادی بن مشیر احمد ابن بشیر احمد خان بہادر ہیں۔

مولانا اسید الحق قادری مزید لکھتے ہیں:

کتاب کی زبان نہایت آسان ہے، ترجمہ بہت سادہ الفاظ میں کیا گیا ہے، تاکہ عام آدمی سمجھ سکے، تفسیر میں کسی قسم کے علمی مباحث کو نہیں چھیڑا گیا ہے، آیت کریمہ سے جو ایک عمومی مفہوم مستفاد ہوتا ہے، جس کا براہ راست تعلق فرد یا معاشرے کی اصلاح سے ہے اس کو داعیانہ اور مصلحانہ اسلوب میں بڑی سادگی سے بیان کر دیا گیا ہے، کہیں کہیں اودھ کی عام بول چال کا اسلوب بھی نظر آتا ہے اور بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف آپ کے رو برو بیٹھ کر گفتگو فرما رہی ہیں۔

(خیر آبادیات، ص: ۳۲، تاج اللؤلؤ اکیڈمی، بدایوں)

مولانا اسید الحق قادری نے جامعہ ازہر مصر کے دوران تعلیم اپنے منصوبوں کی ایک ڈائری بنائی تھی، ان میں خاص طور پر بریلی سے اختلافات بھی مد نظر تھے، آپ نے اس میں لکھا تھا کہ کوئی بھی اختلاف طرفین کی فہم قدمیوں سے ہوتا ہے، اگر سامنے والا اپنی روش سے باز نہ آئے تو اختلاف ختم کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک فریق اپنے بلند کردار و عمل کا مظاہرہ کرے اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنے مثبت کاموں پر نظر رکھے۔ حضرت حافظ ملت کا مشہور قول ہے ”ہر مخالفت کا جواب کام ہے۔“

مولانا اسید الحق قادری نے اس پر عمل بھی کیا اور اپنے خاندان اور تربیت یافتگان کو بھی اسی نچ پر چلنے کی تلقین فرمائی۔ آپ نے ہزار اختلافات کے باوجود رضویات کے حوالے سے بھی تحریریں لکھیں اور بڑی آسانی کے ساتھ اپنے مقصد اور منزل کی جانب رواں دواں رہے اور خاص بات یہ ہے کہ جو کام ہو جاتے اس پر نشان لگا دیتے کہ یہ کام بحسن و خوبی ہو گیا، آپ کے چند کارنامے اور منصوبے ہم ذیل میں رقم کرتے ہیں:

(۱) خانقاہ عالیہ قادریہ کی توسیع: اس رخ پر آپ نے بھرپور توجہ دی، جدید عمارتیں بنوائیں اور مزید بنوانے کا ارادہ تھا، اب ارادہ یہ تھا کہ خانقاہ کا گیٹ سیدنا غوث اعظم عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے گیٹ کی طرح خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں کا گیٹ بھی تعمیر کرائیں، اس سلسلے میں انجینئروں سے بھی رابطہ شروع کر دیا تھا۔

(۲) مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں کی نشاۃ ثانیہ: فرمائی، مولانا کا ارادہ تھا کہ بیرون شہر وسیع زمین حاصل کی جائے، اس سمت میں آپ نے کام شروع کر دیا تھا، وسیع زمین خرید لی تھی اور مزید زمین حاصل کرنے کا ارادہ تھا، مولانا نے باضابطہ تدریس کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ تین چار عتیس ۲۰۲۰ طلبہ کی سند فراغت بھی حاصل کر چکی تھیں اور یہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری تھا۔ مولانا نے اب تک جن جماعتوں کو فارغ کیا تھا، انھیں اعدادیہ سے دورے تک خود پڑھایا اور قرطاس و قلم کی بھی تربیت دی۔

(۳) ترقی کا کالج (مراۓ خاتون): بدایوں شہر میں پہلے ہی ت چل رہا تھا، آپ نے اس جانب بھی بھرپور توجہ دی، اس میں قریب دو ہزار بچیاں زیر تعلیم ہیں، اس کالج کا بھی ضلع بھر میں نمایاں کردار ہے۔

(۴) الادب ہر انشائی ٹیٹ آف اسلامک اسٹڈیز: اسے ہندوستان کی دو بڑی یونیورسٹیز سے ملحق کر لیا، اس میں ہر سال اسکول اور کالج کے طلبہ کی دیٹی اور علمی تربیت فرماتے اور آگے بڑھانے کی مسلسل کوشش فرماتے، اس طرح آپ نے عصری علوم و فنون کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

(۵) مدرسہ شمس العلوم ہدایوں: یہ ادارہ ان کے آبا و اجداد کی محنتوں کا نتیجہ ہے، اس میں ایک بڑی لائبریری بنام ”مولانا عبدالماجد ٹپلک لائبریری“ کا قیام فرمایا اور عام طلبہ کے لیے ایک باضابطہ کمپیوٹر شعبہ قائم کیا۔

(۶) طبی مراکز اور ورک شاپ: مدرسہ عالیہ قادریہ کے زیر اہتمام مدارس کے طلبہ کے درمیان علمی مباحثے کراتے، اس میں دیگر مدارس کے ساتھ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے طلبہ بھی شریک ہوئے۔ ان پروگراموں میں اہل علم و دانش کے موضوعاتی خطابات بھی ہوتے۔

بقیہ صفحہ 216 پر ملاحظہ کریں

علامہ اسید الحق قادری ملک و ملت کا سرمایہ تھے

علامہ اسید الحق کے لیے ہمارا سب سے بڑا خراج یہ ہوگا کہ ہم ان کے علمی مشن کو زندہ رکھیں

ہر شخص کو وقت معینہ پر اس جہان سے جانا ہے، ایک لمحہ پہلے نہ ایک لمحہ بعد۔ اس اہل حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود کم عمری، کم سنی یا جوانی کی موت دل حسرت زدہ کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے، کاش تھوڑی سی مہلت اور مل جاتی، کچھ دلوں اور جی لیتے، کچھ اور کہہ لیتے، کچھ اور سن لیتے! ابھی تو بہت سی باتیں رہ گئیں، ابھی تو بہت سے کام رہ گئے۔ محبت مکرّم علامہ اسید الحق قادری کے حوالے سے بھی ایسے خیالات مدقوں آتے رہیں گے ہڑپاتے رہیں گے عزیزوں کو بھی، احباب کو بھی اور دنیاے علم سے وابستہ اُن افراد کو بھی جن کے لیے درخشندہ کارشتہ، رہنما جاں سے زیادہ عزیز اور محترم ہوتا ہے۔

اُن سے میرا غائبانہ تعارف ماہ نامہ ”جام نور“ نئی دہلی میں چھپنے والے اُن کے مضامین کے ذریعے ہوا۔ پختہ شعور، رچا ہوا ادبی ذوق، متوازن انداز فکر، لفظوں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا تبحر علمی اور اذعانیت سے عاری طرزِ تکلم اچھا لگا اور ان کی شخصیت کا ایک خاکہ سا ذہن میں بن گیا۔ پھر ملاقاتیں ہوئیں اور وقفے وقفے سے ہوتی رہیں اور اس خاکے میں حقیقت کا رنگ بھرتا چلا گیا۔ وہ ایسے ہی تھے جیسا کہ ایک شریف، خلیق اور محبت سے بھرپور انسان اور عالمِ باعمل کو ہونا چاہیے۔

جامعہ ازہر سے فراغت کے بعد انھوں نے بہت تیزی سے علمی حلقے میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ ان کے بعض تحقیقی نتائج سے عدم اتفاق کا بھی اظہار کیا گیا، لیکن اختلاف کی نوعیت سراسر علمی رہی۔ خود موصوف کا موقف یہی تھا کہ ہماری فکر حرف آخر نہیں ہے۔ ہم پڑھتے لکھتے ہیں چیزوں کو سمجھنے کے لیے نہ کہ اپنے تصبیّات کو دوسروں کے سر منڈھنے کے لیے۔ درج ذیل اقتباس سے اُن کے طلب علم، انداز فکر اور طریق کار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

”یہ غالباً ۲۰۰۲ء کی بات ہے جب میں ازہر شریف (مصر) میں تفسیر و علوم قرآن کا طالب علم تھا، محبت گرامی مولانا منظر

الاسلام ازہری نے پروفیسر محمد احمد میر صاحب کی کتاب ”تفسیر التفسیر فی الفکر الاسلامی“ مطالعے کے لیے عنایت کی۔ اس کتاب میں مصنف نے دیگر مباحث کے ساتھ افتراق امت پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے جو موقف اختیار کیا ہے، اس پر مجھے تھوڑا تامل ہوا، کچھ احباب سے تبادلہ خیال کیا، مگر مسئلہ واضح نہ ہو سکا..... حق کی تلاش و جستجو بالآخر مجھے مطالعے کی میز پر لے آئی۔ میں نے اس موضوع پر تحقیقی مطالعے کا آغاز کر دیا، رفتہ رفتہ گہری کھلتی گئیں، حقائق منکشف ہوئے، شک و تردد ختم ہوا..... پھر جب ذرا فرصت ہوئی تو اپنے حاصل مطالعہ کو مقالے کی شکل میں قلم بند کر دیا مگر اگلے کی سانس تک مقالے کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔“ (حرف آغاز، حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں، ص ۶۰، ہدایوں، نومبر ۲۰۰۸ء)

یہ مقالہ ۲۰۰۵ء میں، ممبئی تا اگست جام نور کے چار شماروں میں قطعہ وار شائع ہوا۔ مضمون نگار کے نتائج فکر سے بعض حضرات نے بے اطمینانی ظاہر کی۔ چنانچہ مصنف نے اپنے موقف پر مزید غور و فکر کو ضروری خیال کیا۔ یہی مقالہ اضافے کے ساتھ نومبر ۲۰۰۸ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا تو اسید الحق صاحب نے حرف آغاز میں یہ وضاحت بھی کر دی کہ:

”جام نور میں مقالے کی اشاعت کے بعد بعض احباب نے اس میں اختیار کردہ موقف پر تشویش کا اظہار کیا، لہذا میں نے پوری سنجیدگی اور کشادہ قلبی کے ساتھ مقالے پر نظر ثانی کی اور اس موضوع پر مزید مطالعہ کیا، جتنا مطالعہ کرتا گیا اتنا ہی اپنے اختیار کردہ موقف پر اطمینان میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے مقالے میں بہت سے نئے حوالوں اور کچھ نئے مباحث کا

اضافہ کیا، جن مقامات پر غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی ان کو اور واضح کیا، اب کامل اطمینان کے بعد یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ پوری نیک نیتی اور خلاص کے ساتھ اہل علم کی بارگاہ میں عرض ہے کہ مجھے نہ ہمہ دانی کا زعم ہے اور نہ ہی دعویٰ عصمت۔ علوم اسلامیہ کا ایک معمولی طالب علم ہوں جس سے ہر قسم کی غلطی کا صدقہ امکان ہے، لہذا اگر کوئی سنجیدہ اور علمی تنقید کرنے آتی ہے تو مجھے مقالے پر نظر ثانی کرنے اور منشی واضح ہونے کی صورت میں اپنی خطا کے اعتراف اور قبول حق میں کوئی تامل نہیں ہوگا۔“ (حدیث افتراق امت، ص ۶۰-۷۱)

بیش نظر کرتے ہیچے کے مندرجات کی تصدیق یا تردید سے قطع نظر، مدبرِ بالا اقتباس کے ذریعے مصنف کے علمی انکسار اور خصوصیت کی جانب توجہ دینا مقصود ہے۔ یہی انداز فکر اُن کی دوسری علمی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ بلند بانگ دعوے ان کی تحریروں میں نظر نہیں آتے۔ وہ ریاضتِ دلالت سے کہتے ہیں، دلیلوں کی مدد سے کہتے ہیں اور زیر بحث موضوعات تک گفتگو کو محدود رکھتے ہیں۔ درمیان میں اگر کوئی وضاحت طلب بات ہے تو اسے غیر ضروری طور پر پھیلانے کے بجائے مختصراً بیان کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا کتابچے میں ایک موقع پر طاعی قاری (شرح فقہ اکبر) اور علامہ سعد الدین نقاشزانی (شرح مقاصد) کے اقتباسات میں ”اہل قبلہ“ کی تعریف میں ”ضروریات دین“ کی اصطلاح آئی تو اسید الحق صاحب نے اس کی وضاحت کر دی کہ ضروریات دین سے کیا مراد ہے:

”ضروریات دین کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں بڑی طویل بحثیں علما نے اپنی کتب میں لکھی ہیں، ہم ان بحثوں میں پُرکار خواہ مقالے کو طویل کرنا نہیں چاہتے۔ بس اتنا اشارہ کافی سمجھتے ہیں کہ ضروریات دین میں صرف وہی مسائل شمار کیے جائیں گے جو قطعی الثبوت قطعی الدلالة ہوں۔ رہے وہ مسائل جو قطعی الثبوت تو ہوں مگر قطعی الدلالة ہوں یا پھر قطعی الدلالة ہوں مگر قطعی الثبوت ہوں یا قطعی الثبوت بھی ہوں اور قطعی الدلالة بھی ہوں، ایسے مسائل ضروریات دین میں شمار نہیں ہوں گے۔“ (حدیث افتراق امت، ص ۶۲)

اسید الحق صاحب کے علمی اکتسابات پر تفصیل سے اظہار خیال

کرنائی الحال ممکن نہیں۔ تاہم ان کے زورِ قلم اور ادبی ذوق کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اس کا اظہار مذہبی مضامین میں بھی ہوا ہے لیکن زبان و بیان پر اُن کی دسترس کا اصل نمونہ تحریریں ہیں جو ”خامہ تلاشی“ کے عنوان اور ابوالفیض معینی کے قلمی نام سے جام نور میں ایک مدت تک مسلسل چھپتی رہیں اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ افسوس کہ خواہش کے باوجود ہمیں اس گفتگو کو بھی کسی آئندہ موقع کے لیے اٹھا رکھنا ہوگا۔ اب مجھے آخر میں ان کے تعمیری انداز فکر کے حوالے سے ایک بات کہہ کر اس مضمون کو ختم کرنا ہے۔

شوال ۱۴۳۹ھ / مارچ ۲۰۱۰ء کو خانقاہ عالیہ قادریہ ہدایوں شریف کے موجودہ صاحبِ سجادہ تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری مدظلہ کی عہد سجادگی کے پچاس برس مکمل ہونے کی خوشی میں بعض وابستگانِ سلسلہ نے ”جشن ۷۵“ منانے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا اسید الحق صاحب نے اس تقریب کو لفظی خراج عقیدت تک محدود رکھنے کے بجائے یہ تجویز پیش کی کہ:

”اس جشن کو ہم جشنِ اشاعت کے طور پر منائیں گے۔ اس موقع پر اکابرِ خانوادہ قادریہ اور علما سے مدرسہ قادریہ کی پچاس کتابیں جدید آب و تاب اور موجودہ تحقیقی و اشاعتی معیار کے مطابق شائع کی جائیں گی، تاکہ یہ پچاس سالہ جشن یادگار بن جائے اور آستانہ قادریہ کی اشاعتی خدمات کی تاریخ میں یہ جشن ایک سنگ میل ثابت ہو۔“

(مشغی غوثیہ، ص ۳۰، ہدایوں، ص ۲۰۰۸ء)

منصوبہ کو عملی شکل دینے میں تاج الفحول اکیڈمی، ہدایوں شریف کا ہر فرد دہمتن مصروف ہو گیا اور یکے بعد دیگرے کتابیں شائع ہوتی چلی گئیں۔ ملک و ملت کے کام آنے والے اس دنیا سے رخصت ہو کر بھی دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ان کی یاد منانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اُن کے مشن کو آگے بڑھایا جائے۔ علامہ اسید الحق کے لیے بھی ہمارا سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ان کی خواہشات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ تصنیف و تالیف، اصلاحِ معاشرہ اور فروغِ علم میں اپنی سی کوشش کی جائے۔ ہوائی باتوں کے بجائے ٹھوس تعمیری کام کیے جائیں اور دلوں کو توڑنے کے بجائے جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ □□□

☆ استاذ شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

خط بنام اسید خلد تبار

۲۰۱۴ء

عزیز گرامی قدر و شہید والا مرتبت اسید میاں صاحب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی حیات ظاہری میں کبھی یہ توفیق نہ ہو سکی کہ آپ کو چند سطور تحریر کرتا۔ اس میں کچھ اپنی کاہلی، کچھ عدیم الفرستی اور کچھ موہاں کی ایجاد کو دخل رہا ہے۔ اکثر فون کے ذریعے باتیں ہو گئیں اور تفصیلی مراسلت کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھا۔ کبھی یہ خیال میں نہیں آیا کہ آپ سے مکانی فاصلہ اتنا بڑھ جائے گا اور آپ اس فانی دنیا سے اپنی ابدی اور باقی قیام گاہ کو مراجعت فرما جائیں گے۔ ایسے ہی کسی موقع کے لیے ہرے شعر نے کہا ہے:

تھے پاس جب تو قیامت کا لطف آتا تھا
ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے

اور اب یہ حال ہے کہ واقعتاً یادوں کا حشر برپا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ جب مجھ جیسے دور افتادہ مداح کی دلی کیفیت ایسی ہے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو آپ کے سفر و حضر کے ساتھی اور ہم نوالہ وہم پیالہ تھے۔ پھر جب آپ کے قریبی لوگوں اور عاشقوں مثلاً احمد مجتبیٰ صدیقی، اشفاق جمیدی، مظفر حسین رومی گورکھ پوری، خوشتر نورانی اور قمر الہدیٰ فریدی کی حالت دیکھتا یا ان کے بارے میں سنتا ہوں تو ان کا خیال آتا ہے جن کی امیدوں کا مرکز اور آنکھوں کی ٹھنڈک اور بازوؤں کی قوت آپ کی ذات والا صفات تھی، غرض:

بقدر پیہ نہ تعلق ہر ایک دل میں ہے سوگ تیرا

میری تو ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ آپ کے والد محترم مخدوم گرامی حضرت سالم میاں صاحب کی خدمت میں کلمات تعزیت نذر کروں، عطیف میاں کو، کچھ چھوٹے ہیں، علی گڑھ کے واسطے سے ان سے ایک خاص رشتہ ہے اور کئی وجوہ سے مجھے بے حد عزیز ہیں، چند سطور لکھ کر بھیج دیں۔ اس درمیان جس جس سے آپ کا ذکر ہوا اور جس کس کا

برادر ہرہ شریف میں۔ جہاں آپ اپنی پوری عالمانہ شان کے ساتھ خالص خانقاہی رنگ میں رنگے نظر آئے۔

خانقاہی رنگ پر یاد آیا کہ آپ کو مراد اسم خانقاہ اور روایات صلہ رحمی و موانست بھانے میں بھی کمال حاصل تھا، جس کا اعتراف آپ کا ہر مداح کرتا ہے۔ اللہ آباد کے سفر کے موقع پر میری غیر موجودگی کے باوجود آپ کا دائرہ شاہ اجمل تشریف لے جانا اور میری خانقاہ میں تھوڑی سی وقت گزاری کا ایک ایک لمحہ میرے برادر عزیز ضیا میاں سلمہ کے حافظے میں تازہ ہے۔ ان سے تو آپ کی وہی پہلی اور آخری ملاقات تھی لیکن وہ (ضیا احمدی سلمہ) اور میرے گھر کے سبھی لوگ آپ کی خبر پر رنج و غم کی ایک ناقابل بیان کیفیت سے دوچار ہوئے اور سب نے آپ کے سفر دائرہ شاہ اجمل کو یاد کیا۔ آپ کی تعزیت اور ایصالِ ثواب کے لیے جلسہ کیا اور آپ کے اہل خاندان کے غم میں شرکت کی۔

اسید میاں! آپ کی شخصیت میں اتنی اعلیٰ درجے کی جاذبیت اور کشش کا سبب اب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ ہے تواضع، فروتنی اور بے نفسی کی خانقاہی روایت اور بار علم سے جھکے ہوئے (مثلاً شاخ ثمر دار) علمائے ربانی کی روایت کا انضمام کہ جس نے آپ کو ہر طبقہ معاشرہ کے لیے پسندیدہ اور مقبول خاطر بنا دیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کم عرصے میں آپ نے بڑے علمی موضوعات سے عہدہ بردار ہونے کی مثال قائم کی۔ جس روز آپ کی شہادت کی خبر آئی، اتفاق سے مجھے ایم اے کی ایک کلاس میں اموی دور کی عربی شاعری کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔ میں نے کلاس کو آپ کے ذکر سے شروع کیا اور پھر آپ کا مرتبہ قصیدہ مسہرہ مصنفہ فروق (درمدح امام زین العابدین علیہ السلام) آپ کے ایصالِ ثواب کے غرض سے پڑھا کر کلاس ختم کر دی۔ آپ یقین کریں کہ آپ کی بھیجی ہوئی کتابوں میں سے اکثر شعبہ میں میری بیز پر اور الماری میں موجود ہیں اور ہر لمحہ آپ کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ یہ ان کتابوں کی بات ہے جو تاریخ، سیرت، ادب اور روایات سے متعلق ہیں کہ جن سے تھوڑا سا شغف مجھے بھی ہے ورنہ آپ کی وہ کتابیں جو فقہ، حدیث اور علوم نقلی سے متعلق ہیں اور جن پر آپ کی شہرت کا دار و مدار ہے، میری دسترس میں نہیں۔ حیات ظاہری کی مکمل چار دہائیاں بھی نہ ملنے پر اتنا بڑا کارنامہ انجام دینا صرف آپ ہی کے بس کی بات ہے۔

یقیناً یہ کارنامہ آپ کے نام کو اس فانی دنیا میں ان شاء اللہ تادیر باقی رکھے گا اور آپ کی دائمی زندگی کا انتظام تو اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں کے ذریعے آپ کو جام شہادت نوش کروا کے کر ہی دیا ہے، جنھوں نے سرزمین عراق پر آپ کو مثال علی اکبر ابن الحسین علیہ السلام شہید کیا۔

اسید میاں! وہاں کے حالات کا یہاں سے کیا مقابلہ! یہاں تو ایک بے چینی، ایک کک اور اضطراب کی ایک صورت جو جوہ مستقل ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ان کیفیات میں یہاں کے معاملات و حالات کو بہت دخل ہے جو روزاندہ نئی نئی صورتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک صورت عزیزوں اور رفیقوں کی رخصتی بھی ہے، جن میں سے بہت سی بے حد غیر متوقع ہوتی ہیں۔ مثال میں اپنے یار عزیز اور بہترین آرٹسٹ خالد بن سہیل یا شاعر دوست خواجہ جاوید اختر کا نام پیش کر سکتا ہوں اور ان سب کے مقابلے سب سے واضح اور نمایاں مثال خود آپ کی ہے۔ آپ کی روانگی جس قدر غیر متوقع ہے اسے بس دل ہی جانتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں احباب سے خدا کرے آپ کی بھی وہ ملاقات ہو اور اللہ انھیں جنت کے اس حصے کی سیر کی بھی توفیق بخشے جہاں آپ تشریف فرما ہیں۔ آپ ہی کے حصے میں ۱۹۹۷ء میں رخصت ہونے والے شہید مکروہ غامبر آقا نے نعمت حضرت مولانا سید افضل احمدی رحمۃ اللہ علیہ سابق سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل بھی ہیں۔ ملاقات ہو تو سلام عرض کیجیے گا اور دائرہ شاہ اجمل میں اپنی حاضری کا ذکر کر کے وہاں کے تازہ حالات سے انھیں مطلع کر دیجیے گا۔

جملہ شہدائے اسلام کی خدمات بابرکات میں ہدیہ سلام پیش کر کے ہمارے لیے دعاؤں کی درخواست کیجیے گا اور سرکار بغداد و سید الافراد سیدنا و شینا ابو محمد محی الدین عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی جناب میں قدم بوسی عرض کیجیے گا۔

اسید میاں! جو اس سرکار غوث پاک میں ابدی آسودگی اور سرزمین عراق پر سنت علی اکبر ابن الحسین علیہ السلام کی ادائیگی کی سعادت کے سبب سے آپ پر بہت رشک آتا ہے۔ اس کا اظہار میں نے ایک قطعہ میں بھی کیا ہے جو آپ کی شہادت اور جلسہ چہلم کی تاریخ کی مناسبت سے قطعہ تاریخ بھی ہو گیا ہے۔

اسے ملاحظہ کریں:

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

میری آرزو ہے کہ حضرت اسید الحق قادری کی یاد میں ایک ریسرچ جرنل جاری کیا جائے

آبروئے قلم، باضی عصر، محترم و مکرم مولانا خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اگرچہ ٹیلیفون کے ذریعے آپ سے علم و عمل کے پیکر، شعور و آگہی کے نور سے آراستہ محقق اور سراپا اخلاص دوست علامہ اسید الحق قادری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کے حوالے سے تعزیت کر لی تھی، مگر اب بھی آپ کو حضرت صاحبزادہ صاحب کی ڈھیروں یادیں سنائے اور آپ سے سننے کے لیے جی چلتا ہے، مجھے مصر میں اُن کی ایک محدود رفاقت میسر رہی، اُن کی رحلت سے قبل مجھے خبر ہی نہ تھی کہ اُن کی محبت میری روح کی گہرائیوں میں اس قدر رچی بسی ہے، آپ کے ساتھ تو اُن کی حویل رفاقت رہی، بہت سے سہینار زور کا نفرنسز میں آپ اکٹھے شرکت کیا کرتے تھے، علمی اور تحقیقی کاموں میں بھی آپ ایک دوسرے سے مشاورت کیا کرتے تھے، اللہ ہرے اس عظیم دوست کے درجات بلند فرمائے، آپ کو صحت و سلامتی اور حوصلوں کی مزید بلندیاں عطا فرمائے، آپ کی گونا گوں صلاحیتوں کو امت کے لیے اور زیادہ نفع مند بنائے۔

میری آرزو ہے کہ حضرت اسید الحق قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایک خالص تحقیقی مجلہ جاری فرمائیں، اس سے بہت لوگوں کا بھلا ہوگا اور یہ امر حضرت اسید الحق قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی روح کے لیے باعث تسکین بھی ہوگا، ہرے یہاں پاکستان اور ہندوستان میں ایسے مجلات کی بہت کمی ہے، ان مجلات میں شائع ہونے والے تحقیقی مقالات کے ذریعے یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو ترغیب ملتی ہیں، بلکہ ہمارے ہاں پی ایچ ڈی اسکالرشپ کی معیاری تحقیقی مجلے میں ایک تحقیقی مقالہ لازماً چھپوانا پڑتا ہے، ہمارے اساتذہ اور پی ایچ ڈی اسکالرز کو تحقیقی مجلات میں اپنے علمی مقالات چھپوانے میں انتہائی دشواری ہوتی ہے، اگر آپ اس حوالے سے قدم اٹھائیں تو میں بعد میں مزید گزارشات عرض کروں گا۔ ہندوستان میں وسعت علم و فکر کے حامل ڈاکٹر سید عظیم شرف جاسی صاحب سے بھی اس حوالے سے رہنمائی لی جاسکتی ہے جو کہ میرے علم کے مطابق آپ سے اور حضرت اسید الحق قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے بے لوث محبت کرنے والوں میں سے ہیں۔ ویسے بھی علمی، ادبی اور صوفی دینی میں آپ کا ایک وسیع حلقہ احباب موجود ہے، آپ اس ریسرچ جرنل کے حوالے سے مجھے جو خدمت سونپیں گے میں اُس کے لیے حاضر ہوں۔

ممتاز احمد سیدی (لاہور، پاکستان)

ملا مال فرمایا تھا، اُس ہمدردیہ کی محبت اور دوستی جس قدر باعث تسکین جاں تھی، اُس رونقِ حُفْل کی اچانک رحلت اُسی قدر صبر و قرار کو چھین لینے والی تھی، وہ زندہ رہے تو اس شانِ دلربائی کے ساتھ کہ قلوب و اذہان میں اُن سے ملاقات کی تڑپ اور آنکھوں میں اُن کی دید کی پیاس تھی، اچانک اُن کی شہادت کی خبر سننے ہی اُن سے ادنیٰ سی شناسائی رکھنے والے شخص کی آنکھوں سے بھی اشکوں کا سیل رواں جاری ہو گیا، میں نے علامہ اسید الحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شہادت کے بعد اُن کے حوالے سے کچھ لکھنے کی جب بھی کوشش کی تو میں نے جتنے بچتے

چھلواتی دھوپ اور لُق و دُوق صحرا جیسی زندگی میں بعض لوگ ہاؤ بہاؤ کا خوشگوار جھونکا بن کر داخل ہوتے ہیں تو تن بدن کو جھلساتی دھوپ کی تمازت میں کمی کا احساس ہوتا ہے، مشام جاں محبت کی بے لوث خوشبو سے مہک اٹھتا ہے، بے کل اور بے قرار دل کی گہرائیوں میں راحت اور امنیت کا احساس اترتا چلا جاتا ہے، بغداد شہر میں شہادت کا رتبہ اور حضرت غوث اعظم کے قدموں میں آرام گاہ پانے والے ہمارے فاضل دوست علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ کو دوستِ ندرت نے علم کے نور، اخلاقِ فاضلہ کی جلوت اور خوں و لُٹاؤزی سے

بقیہ: بڑوں کے لیے غرور اور نسل نو کے لیے خرم

اخیر میں اس حقیقت کے اظہار میں بھی کوئی باک نہیں کہ نئی کا علم حدیث و تفسیر کی جانب خصوصی رجحان اور نئی نسل کے اندر مزاج کے نشوونما پانے میں آپ کی شخصیت کا کلیدی رول ہے۔ اور علمی موضوعات پر متوسط ماہنامہ 'جام نور' آپ سے تحقیقی مقالات بڑے موثر کن ثابت ہوئے۔ ۲۰۱۱ء میں قائد جنگ آزادی ہند و برصغیر جن خیر آبادی پر جب پورے ہندوستان میں علامہ کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کی تقریبات منائی جا رہی تھیں آپ نے اور آپ سے علمی خاص مولانا خوشتر نورانی نے اس تحریک کے روح رواں ۱۰۰ سالہ اختر مصباحی کی تحریک پر بالترتیب 'خیر آبادیات' اور 'علامہ فضل خیر آبادی: چند عنوانات' کے نام سے نہایت علمی و تحقیقی کتابیں تصدیق فرمائیں جو اسی وقت منظر عام پر بھی آئیں اور برصغیر کے معارف و مستند علمی حلقوں کو متاثر کیا۔ مصباحی صاحب نے آپ کے علمی و ادبی دونوں حضرات کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ 'اگر اسید الحق اور خوشتر نورانی جیسے اور بچے پھلا سب قدم پیدہ ہو جائیں تو ہماری جماعت میں تحقیقی و علمی سرچر کا رونا نہیں رو دیا جائے گا۔'

ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے کہ رقم اعروف سے ایک عاقدت میں شیخ صاحب نے نئی نسل کے دو چہرہ صاحبان فکر و فہم کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا تھا: 'ارشاد صاحب! اپنی جماعت میں تحقیقی موضوعات پر اچھے صاحبِ قلم کی کمی تو ضرور ہے لیکن نئی نسل میں مولانا شہان مصباحی اور مولانا ضیاء الرحمن علمی جیسے اصحابِ قلم کی نگارشات کو میں پڑھتا بھی ہوں اور ان حضرات کی شگفتہ اور علمی تحریک کا قائل بھی ہوں۔' اسے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شیخ صاحب ہمارے دوستان سے گئے تو ضرور ہیں لیکن افراد کی کمی کا مرثیہ لے کر نہیں بلکہ انھوں نے نئی نسل کے اندر اپنے تحقیقی کام کا جھشم خود ملاحظہ کیا۔ میرا تو دل یہ کہہ رہا ہے کہ ان کی روح آستانہ غوث اعظم میں آسودگی خواب پر مسرور ہو ہی ہوگی کیوں کہ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے حبابِ دلتا نہ کی ایک بڑی جماعت چھوڑی ہے جو ان کے کام اور مشن کی تکمیل ضرور کرے گی۔

ممتاز احمد سیدی (لاہور، پاکستان)

تاریخ شہادت بھائی اسید

۲۰۱۳ء

اے میرے اسید اے گل گلزارِ بدایوں
کر کے میرے دل کشت کو بر باد ہے تو دفن
ہر ذرہ خاک آج ترے شہر کا پیارے
مصدق بن ماک فرید ہے تو دفن
ہر پل متبسم وہ ترا ہوئے دل آرا
ہراک کو دلاتا ہے تری یاد ہے تو دفن
جو لوگ کہ ہیں واقف اوصاف و خصائل
دل ان کا تری یاد سے آباد ہے تو دفن
ہر صاحبِ علم آج یہ کہتا ہے بھد غم
تا بندہ ترا ایک اک ارشاد ہے تو دفن
ہو خلد میں تو شاد شہیدوں کے جلو میں
قاتل ترا تا حشر ہو ناشاد ہے تو دفن
دنیاے دلی غم میں ترے بال بکھیرے
اندھیرے اے نازش زہاد، ہے تو دفن
کہتی ہے ہمیشہ تھی تری عاشق صادق
اور کہتی ہے تجھ کو ستم ایجاد ہے تو دفن
جی بھر کے ہوا رشک سراج عجی کو

زیر قدم سید بغداد ہے تو دفن

۲۰۱۳ء - ۲۰۱۴ء

اللہ تبارک و تعالیٰ بطفیل مطلع قصیدہ آدمیت و مقطع سلسلہ نبوت
صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسم آپ کے درجات میں روز افزون ترقی
فرمائے اور آپ کی طرح زندگی گزارنے کی اور جان سے گزر جانے کی
توفیق جملہ فرزندانِ توحید کو کرامت فرمائے۔ آمین!

بہت جلد آپ سے ملاقات اور خدمت میں حاضری کا امید اور
اتمس دعا کے ساتھ رخصت۔ خاکد ر
سراج احمدی

☆ استاذ شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو پی)

الفاظ اور مسلسل الجھٹے ہوئے تخیلات کے سامنے خود کو بے بس پایا، مجھے ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ الفاظ میرے قلم سے روٹھ گئے ہیں، میں جب بھی لکھنے بیٹھا کبھی ماضی کی خوشگوار یادوں میں کھو گیا اور کبھی ایک نئی سچائی محفل کی اچانک دنیائی میں الجھ گیا، میری بے بسی کی حالت کچھ یوں تھی:

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب سہ تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

علامہ اسید الحق قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے میں جب بھی کچھ لکھنے بیٹھا تو مجھے بے بسی کی ایک عجیب کیفیت کا سامنا کرنا پڑا، شعور کی گہرائیوں سے زلفظوں کے موتی ابھر کر اوپر آئے نہ ہی معانی اور افکار کا نزول ہوا، مگر اشکوں کا سیل رواں مجھے میری تمام تر بے بسی اور بیوقوفی کے ساتھ اپنے بہاؤ کے شکنجے میں لپیٹ کر بہت دور حسرت و یاس کی وادی میں لے گیا، قاتل شغافی کے بقول:

اڑتے اڑتے آس کا پتھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

جب مجھے حضرت صاحبزادہ اسید الحق صاحب کی شہادت کی اندوہناک خبر ملی تو کئی احباب سے تصدیق کرنے کے باوجود دل و دماغ اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ اتنا بڑا سانحہ ہو گیا ہے، پھر حضرت مولانا سالم میاں مدظلہ العالی سے تعزیت کرنے کا حوصلہ نہیں مل رہا تھا، مگر ایک دن میں نے ہمت کر کے مولانا مجاہد صاحب کے ذریعے حضرت سالم میاں مدظلہ العالی سے بات کی تو میں اُن کے صبر، اُن کے جذبہ تسلیم و رضا اور اُن کی استقامت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا، زبان سے کسی کو صبر کی تلقین کرنا بہت آسان ہے مگر آزمائش کے وقت عملی طور پر صبر کے سانچے میں ڈھلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، میں اب بھی سوچتا ہوں تو گھبرا اٹھتا ہوں کہ ہمارے مخدوم و محنتم حضرت سالم میاں مدظلہ العالی کے سامنے آپ کے عظیم بیٹے کی شہادت ہوئی، آدابِ فرزندگی سے آگاہ ایک ایسا سراپا سعادت بننا اُن سے بچھڑا جولا کھوں میں ایک تھا، مگر آپ شدید کرب کے اُن لحوں میں بھی استقامت کے کوہِ گراں بنے رہے، فقہ و قدر کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کیے رہے، میرا وجدان کہتا ہے کہ حضرت سالم میاں مدظلہ العالی کو یقیناً اُن نبوی کلمات کا لہزن حاصل تھا جو آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ

السلام کی رحلت پر فرمائے تھے، آقا کریم کی چشمانِ مبارک سے اشکوں کا سیل رواں جاری تھا، مگر آپ نے اس کیفیت میں بھی اُمت کی تربیت کے لیے فرمایا: ان العین لتدمع وان القلب لیجزع و انما لفراقک لمحزونون یا ابراہیم، ولا نقول الا ما یرضی اللہ عزوجل، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے حضرت سالم میاں مدظلہ العالی سے جب اپنی بے تابی اور بے قراری کا اظہار کیا تو آپ نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے عظیم فرزند حضرت صاحبزادہ اسید الحق صاحب کے حوالے سے فرمایا: ”ایک تو وہ شہادت کا جام نوش کر کے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں اور پھر انہیں حضور غوثِ پاک کے قدموں میں آرام گاہ ملی ہے۔“ حضرت نے مزید فرمایا: ”میں نے مولانا خوشتر نورانی صاحب سے بھی کہا تھا اور آپ کو بھی کہ رہا ہوں، اب اگر مولانا اسید الحق اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو ہمارے ساتھ تعلق نہ توڑ دینا۔“ میں نے عرض کیا ”آپ سے جو تعلق خاطر پیدا ہو چکا ہے وہ ان شاء اللہ کبھی نہیں ٹوٹے گا، آپ بھی ہمیں اپنے بچوں کے ساتھ دعاؤں میں شامل رکھیں۔“

قاہرہ میں آٹھ سال قیام کے دوران نہ بھولنے والے جن محدود و چند لوگوں سے ملاقات ہوئی، اُن میں سے ایک صاحبزادہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں ایک روز جناح الازہر کی طرف سے مسجد سیدنا الحسین کی طرف جانے والے زیزین راستے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ آتے جاتے مصریوں کے درمیان دو روشن ہندوستانی چہرے نظر آئے، اُن چہروں کی کشش نے مجھے رکے پھر آگے بڑھ کر ملنے اور متعارف ہونے پر مجبور کر دیا، مدرسہ قادریہ بدایونی شریف اور حضرت علامہ فضل رسول بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خانوادے سے نسبت کا علم ہوا تو میرا پورا وجود خوشی کی کیفیت سے سرشار ہو گیا، شیخ طریقت حضرت مولانا عبدالحمید سالم میاں بدایونی مدظلہ العالی اور اُن کے نورِ نظر صاحبزادہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ کو جب میں نے اپنا تعارف کروایا تو صاحبزادہ صاحب نے فرط مسرت سے فرمایا: ”تو آپ ہیں سیدی صاحب؟ آپ حضرت شرف صاحب کے صاحبزادے ہیں؟ ہندوستان سے چلتے ہوئے ہمارے دوست نوشاد عالم صاحب نے آپ کا تذکرہ کیا تھا۔“ حضرت صاحبزادہ صاحب کی

زبان سے یہ محبت بھرے کلمات سن کر مجھے مزید خوشی ہوئی، صاحبزادہ صاحب نے والد گرامی حضرت علامہ محمد عبدالحمید شرف قادری (رحمۃ اللہ) کی خیر و عافیت و دیانت کی تو میں نے اُنہیں بتایا کہ چند روز میں والد گرامی اور حضرت سید و جاہت رسول قادری صاحب قاہرہ تشریف مار رہے ہیں، اس پر دونوں حضرات نے نہایت خوشی کا اظہار کیا، ان دونوں حضرات کے ہمراہ کچھ مزارات پر حاضری دی، پھر جب والد گرامی اور حضرت سید صاحب قاہرہ تشریف لائے تو یہ دونوں حضرات حضرت سالم میاں اور صاحبزادہ اسید الحق سے ملاقات کے لیے ہوٹل میں تشریف لے گئے، تب دونوں طرف سے ایک دوسرے کے لیے محبت اور احترام کے جذبات دیکھ کر میری آنکھیں ٹھنڈی ہو رہی تھیں، بعد میں علامہ اسید الحق صاحب کے ساتھ ملاقاتیں جاری رہیں اور ہر ملاقات کے بعد اُن سے محبت اور اُنسیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ حضرت والد گرامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلی ملاقات کے حوالے سے حضرت صاحبزادہ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا تھا:

”ستمبر ۱۹۹۹ء میں ازہر شریف میں میرا دماغ کھلنے کے لیے والد گرامی قدر حضرت شیخ عبدالحمید سالم قادری مدظلہ مجھے مصر لے گئے، ازہر شریف میں سب سے پہلے جس اردو بولنے والے طالب علم سے ملاقات ہوئی وہ فاضل جلیل ڈاکٹر ممتاز احمد سیدی صاحب تھے، تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ آپ علامہ عبدالحمید شرف صاحب کے فرزند ہیں اور یہاں ازہر میں علامہ فضل حق خیر آبادی کی عربی شاعری پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، اُن سے ملاقات کر کے مجھے اپنائیت کا احساس ہوا، اور لاشعور میں اجنبی ملک میں تنہا رہنے کا جو ایک خوف سا تھا وہ ممتاز صاحب سے ملاقات کر کے اطمینان میں تبدیل ہو گیا، ممتاز صاحب نے بتایا کہ چند روز میں پاکستان سے شرف قادری صاحب اور حضرت سید و جاہت رسول قادری صاحب تشریف لانے والے ہیں، میرے لیے یہ اطلاع کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی، بہر حال یہ دونوں حضرات مصر تشریف لائے اور ایک دن اچانک ممتاز صاحب دونوں حضرات کو لے کر ہمارے ہوٹل پہنچ گئے، یہ شرف صاحب سے والد گرامی

کی بھی پہلی ملاقات تھی اور میں بھی پہلی بار اُن کی زیارت کر رہا تھا، اُن کو دیکھ کر اور اُن کی گفتگوں کو کر جو پہلا تاثر میرے ذہن پر قائم ہوا وہ یہ تھا کہ.....

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

اس سفر میں اُن سے مزید چند بار نیاز حاصل ہوا، اُن کی کسر نفسی، تواضع، اخلاق اور خوردہ نوازی نے بے حد متاثر کیا، علم و فن کی ہمالیائی بلندیوں پر فائز ہونے کے باوجود ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کے لیے بھی انکسار، تواضع اور شفقت بھرا سلوک کرنا، عظمت کا یہ پہلو یا تو میں نے اپنے استاد گرامی امام علم و فن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب میں دیکھا یا پھر اس کی جلوہ نمائی حضرت علامہ شرف صاحب میں نظر آئی۔“

حضرت والد گرامی علامہ محمد عبدالحمید شرف قادری حضرت صاحبزادہ اسید الحق صاحب سے مل کر کئی وجہ سے بہت خوش ہوتے تھے، ایک بات تو یہ تھی کہ حضرت صاحبزادہ صاحب حضرت مولانا شاہ عبدالقدیر بدایونی ابن تاج الفحول حضرت شاہ عبدالقادر بدایونی رحمہما اللہ تعالیٰ کے پوتے ہیں، اس خاندان سے حضرت والد گرامی کو کئی وجہ سے نہایت محبت تھی، ایک وجہ تو اس خاندان کی علمی اور دینی خدمات تھیں، دوسری وجہ یہ تھی کہ تاج الفحول شاہ عبدالقادر بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ براہِ راست علامہ فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد تھے، تیسری وجہ یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس علمی اور روحانی خاندان کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے، چوتھی وجہ یہ تھی کہ اُن کے سامنے ایک عظیم علمی اور روحانی خانوادے کا ایک عظیم فرد نہ صرف علم کا نور اپنے دامن میں سینے ہوئے موجود تھا بلکہ اپنی پیشانی پر عجز و نیاز کا جھومر سجائے ہوئے تھا، وہ صرف مریدین سے احترام کروانا ہی نہیں بلکہ اپنی فطری سعادت مندی کے باعث اہل علم کا احترام کرنا بھی جانتا تھا۔ میں نے اُنہیں حضرت والد گرامی کے ساتھ جس محبت اور احترام سے ملتے ہوئے دیکھا وہ اُن کی سعادت مندی اور خاندانی عظمت کی واضح دلیل ہے، اُن کا حضرت والد گرامی صاحب جسے ایک درویش منش آدمی سے جھک کر ملنا اور اُن کے سامنے غایت محبت کے ساتھ دوزانو ہو کر بیٹھنا مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔

جن دنوں میں الازہر یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہا تھا علامہ اسید الحق صاحب نے مجھے بتایا کہ مدرسہ قادریہ بدایوں شریف کی لائبریری میں علامہ فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قصائد کا ایک مجموعہ موجود ہے، میں نے جھٹ سے گزارش کی کہ مجھے اس کی کاپی عنایت ہو۔ حضرت صاحبزادہ صاحب ہندوستان سے واپس آئے تو انہوں نے علامہ خیر آبادی کے قصائد کی فوٹو کاپی عنایت فرمائی۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو انہوں نے بڑی آہستگی سے فرمایا: ”یہ کئی وجہ سے تو میرا فرض تھا۔“ ہمارے فاضل دوست محترم ثاقب رضا صاحب نے بھی راقم کو بتایا کہ علامہ اسید الحق صاحب ان کو بھی انٹرنیٹ کے ذریعے بعض اہم کتابیں مہیا فرمائیں۔ جناب ثاقب رضا صاحب نے مجھے علامہ اسید الحق صاحب کے حوالے سے کچھ ایسی اہم باتیں بتائیں جو ان کی فراخ دلی، تحمل، برداشت اور رواداری پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں لاہور میں ایسے کئی علم دوست احباب ہیں جن کے ساتھ صاحبزادہ مولانا اسید الحق صاحب کا معاملہ بہت مشفقانہ رہا ہے۔ خاص طور پر وہ کسی کے ساتھ بھی علمی تعاون سے گریز نہیں کرتے تھے، بلکہ انھیں اتنا نوازتے تھے جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

قاہرہ میں قیام کے دوران کئی مرتبہ حضرت مولانا عبدالحمید سالم میاں مدظلہ العالی سے نیاز حاصل ہوا، آپ جب بھی وہاں تشریف لائے میں ہر دفعہ ان کی شفقتوں اور دعاؤں سے مالا مال ہوا، میں جب بھی ان سے ملا ان کی خاندانی وجاہت اور پھر بدایوں شہر کی طرف نسبت کے باعث آپ سے بہت زیادہ انسیت ہوئی، بدایوں شریف محبوب الہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمہ اللہ تعالیٰ کا شہر ہے، ان دونوں نسبتوں کی وجہ سے حضرت مولانا سالم میاں اور ان کے سراپا ادب فرزند ارجمند صاحبزادہ اسید الحق صاحب سے ایک خاص محبت اور انسیت تھی اور ہمیشہ رہے گی۔

حضرت علامہ اسید الحق قادری بدایونی نے ہندوستان میں رہ کر دینی علوم نہایت توجہ اور محنت سے حاصل کیے اور خیر آبادی نسبت کے زیر اثر امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین رحمہ اللہ تعالیٰ سے منطق و فلسفہ میں خصوصی استفادہ کیا، آپ کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالحمید سالم میاں مدظلہ العالی نے اپنے اس سراپا سعادت بیٹے کی اس عمدگی

سے تربیت فرمائی کہ حضرت صاحبزادہ صاحب کے دل میں اہل علم سے استفادہ کا ذوق و شوق کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ روایتی صاحبزادوں و ذہنیت پیدا ہی نہیں ہوتے دی، علامہ اسید الحق صاحب ہندوستان میں تعلیم حاصل کر چکے تو انہیں الازہر یونیورسٹی میں داخلہ دلویا، یہ علامہ اسید الحق کا ذوق و شوق تھا کہ انہوں نے الازہر یونیورسٹی سے علوم القرآن میں گریجویشن کرنے کے بعد مصری دارالافتاء سے فتویٰ لوسی کی ایک سالہ عملی تربیت حاصل کی۔

علامہ اسید الحق قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ کی والد گرامی حضرت علامہ محمد عبدالحمید شرف قادری رحمۃ اللہ سے ۱۹۹۹ء میں ایک ملاقات ہو چکی تھی، ۱۵ فروری ۲۰۰۴ء میں حضرت والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ دہرا مصر تشریف لائے تو علامہ اسید الحق صاحب بہت اہتمام کے ساتھ حضرت والد گرامی سے ملنے کے لیے تشریف لاتے رہے۔

عموماً ہوتا یوں ہے کہ ہم کسی بھی پیر خانہ کے بزرگ سے چھوٹے فرد تک کے لیے تو پچھتے چلے جاتے ہیں، کسی حد تک اپنے ان اساتذہ کا بھی احترام کرتے ہیں جن سے ہم نے دینی علوم کا آکسب کیا ہے، مگر ہمارے ہاں ان دور شنوں اور ناطوں کے بغیر کسی ذی علم شخصیت سے عقیدت، محبت اور احترام کا وہ تعلق پیدا نہیں ہوتا جو عموماً مشائخ اور پیر کسی حد تک اساتذہ سے استوار ہوتا ہے، مگر دینی مدرسے کے ایک شیخ الحدیث کا ہاتھ چومنے کی کوشش اور اس قدر محبت کا اظہار علامہ اسید الحق قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسا سراپا ادب اور پیکر سعادت انسان ہی کر سکتا ہے، ہر کسی کو یہ ذوق میسر نہیں آتا۔ ایک پیر زادہ کسی عالم دین کی لفظی اللہ اس قدر تعظیم کرے! یہ معمولی بات نہیں، یہ حضرت صاحبزادہ صاحب کی عظمت اور ان کے گھر کی عمدہ تربیت کی علامت ہے۔

حضرت علامہ اسید الحق قادری کی شہادت کا سانحہ رونما ہوا تو کئی دن تک یوں محسوس ہوتا رہا کہ جیسے صبر و قرار چھن گیا ہے، ہنسنا مسکراتا تو دور کی بات ہے کسی سے بات کرنے سے بھی طبیعت بیزار رہی، ایک دن صبح کی نماز کے بعد والدہ صاحبہ کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا تب میں نے ان کی خدمت میں اپنی یہ کیفیت عرض کی تو انہوں نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے سامنے سر جھکانا سیکھو، تم کیا جانو کہ حضور غوث پاک کے قدموں میں مجھ آ رام تمہارے دوست کی تربت پر انوار

جلالت کی کیسی بارشیں برس رہی ہوں گی۔ ہر آدمی کی دنیا سے واپسی کا ایک وقت مقرر ہے، پھر یہ بھی دیکھو کہ ان کا خیر حضور غوث پاک کے احاطے سے اٹھایا گیا تھا، جہاں کی منی تھی اپنے مقررہ وقت پر وہیں پہنچ گئی۔“ مجھے والدہ صاحبہ کے ان کلمات سے قدرے صبر و قرار نصیب ہوا۔

گوچرہ سے ہمارے فاضل دوست حکیم عظمت اللہ نعمانی صاحب کو حضرت اسید الحق قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ سے غایت درجے کی محبت تھی، حکیم صاحب حضرت صاحبزادہ صاحب کو دفعتاً نو کال کرتے رہتے تھے حضرت صاحبزادہ صاحب ان کے محبت بھرے کلمات سے نہایت محظوظ ہوتے، حکیم صاحب نے مجھے بتایا کہ حضرت صاحبزادہ صاحب نے وصال سے کچھ عرصہ قبل از خود ان کو کال کی اور تقریباً سولہ منٹ تک شفقت بھری گفتگو فرماتے رہے، انہوں نے فرمایا: ”عموماً آپ ہی کال کیا کرتے ہیں، میں نے سوچا کہ آج میں بھی آپ کو کال کروں۔“ یہی نہیں بلکہ حادثے والی رات میں حضرت صاحبزادہ نے حکیم صاحب کو خواب میں یہ اشارہ دے دیا تھا کہ اب ہم اس دنیا میں نہیں رہے ہیں اور اگلے دن حکیم صاحب پر اس وقت رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب انہیں حضرت صاحبزادہ صاحب کی شہادت کی خبر ملی۔

بیقراری کے عالم میں گزشتہ دنوں میں اپنے سراپا شفقت دوست پروفیسر دلاور خان صاحب کے ساتھ حضرت علامہ اسید الحق صاحب کے حوالے سے بات کر رہا تھا تو انہوں نے فرمایا: ”حضرت اسید الحق صاحب عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اہل سنت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کوشاں تھے، انہوں نے روایتی جود کو توڑنے کے لیے علمی اور فکری کاڈوں پر کام کیا، وہ اہل سنت کو عالمی سطح پر منظم کرنے کے لیے عرب مشائخ سے بھی رابطہ کر رہے تھے۔“

حضرت والد گرامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وصال سے کچھ عرصے پہلے ہمارے چھوٹے بھائی حافظ ثار احمد صاحب سے فرمایا تھا کہ ۲۰۰۷ء میں علامہ فضل حق خیر آبادی کی شہادت پر ڈیڑھ سو سال مکمل ہو جائیں گے، اس موقع پر اور کچھ نہیں تو آپ کی تصنیف ”الثورة الہندیہ“ کا اردو ترجمہ ”بانی ہندوستان“ ہی شائع کر دو اور اس کتاب کی پیشانی پر لکھنا: ”ڈیڑھ سو سالہ یوم جنگ آزادی کی مناسبت سے جدید اشاعت“ شوشی قسمت سے یہ کتاب حضرت والد صاحب کے وصال سے پہلے شائع نہ

ہو سکی بلکہ بعد میں طبع ہو کر آئی، ۲۰۰۷ء میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے حوالے سے پاکستان میں تو سمینارز کا اہتمام نہ کیا جاسکا مگر ہندوستان میں منفرد اسلوب نگارش کے حامل علامہ خوشتر نورانی اور حضرت علامہ اسید الحق قادری کی کوششوں سے کئی سمینارز منعقد ہوئے، ان دنوں حضرات نے علامہ فضل حق خیر آبادی کے حوالے سے باقاعدہ ایک تحریک کو از سر نو منظم کیا اور دونوں حضرات نے ”علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات“ اور ”خیر آبادیات“ کے ناموں سے علمی ترتیب و قیام، علمی اور منفرد لب و لہجہ کی کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں پاکستان میں بھی شائع ہوئیں۔ علامہ اسید الحق صاحب نے اپنی کتاب پر مجھے کچھ لکھنے کے لیے حکم فرمایا تو ساتھ یہ بھی فرمایا: ”کوشش کریں کہ کتاب کے حوالے سے ہی لکھیں، میرے حوالے سے کچھ نہ لکھیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ بہر حال میں نے وہ ایک مختصر تبصرہ لکھ کر ای میل کے ذریعے ارسال کر دیا جسے انہوں نے نہ صرف پسند فرمایا بلکہ اسے کتاب کے ساتھ شائع بھی فرمایا اور اس پسندیدگی کا تسلسل تھا کہ انہوں نے اہام زین العابدین کی مدح میں فرزدق حبیبی کے قصیدے پر کچھ کام کیا تو ہمارے عزیز دوست جناب رضاء الحسن کے ذریعے مجھ خاکسار کو اس رسالے پر تقریظ لکھنے کے لیے فرمایا، حضرت کی اس محبت کی برکت سے ایک مختصر مگر خوبصورت تقریظ ضبط تحریر میں آئی جو ہندوستان سے شائع ہونے والے اس کتابچے کا حصہ بنی ہے۔

علامہ اسید الحق قادری بدایونی صاحب جیسے دوست کی محبتوں کا قرض فقط ایک مضمون کے ذریعے چکایا نہ جائے گا، ان شاء اللہ آئندہ بھی اس حوالے سے لکھتا رہوں گا۔ ایک وقت میری زندگی میں ایسا بھی آیا تھا جب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ سے روشنیاں روٹھ گئی ہیں، میرے چاروں طرف تاریکیوں کا ڈیرہ ہے، میرے سر سے سائیاں اٹھ گیا ہے اور میں کسی لائق و ذوق صحرائیں کڑی دھوپ کی تمازت سے تھک رہا ہوں۔ جی ہاں مجھ پر یہ کیفیت والد گرامی حضرت علامہ محمد عبد حکیم شرف قادری کی رحلت کے وقت طاری ہوئی تھی جس سے میں اب بھی باہر نہیں نکل سکا۔ علامہ اسید الحق قادری کی رحلت سے پھر وہی کیفیت بنی ہوئی ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو صبر عطا کرے۔ □□□

☆ اسٹنٹ پروفیسر: منہاج یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)

لوگ صدیوں میں اتنا کام نہیں کر پاتے

ایسا عالم، محقق، مجتبیٰ، فلسفی، عاشق رسول، علوم شریعت کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے

فاضل علوم شرقیہ، حضرت الافاضل، جامع معقول و منقول، وارث علوم تاج الحول، محقق عصر، علامہ الدھر حضرت مولانا اسید الحق قادری عثمانی بدایونی کے سانچہ ارتحال اور حادثاتی موت پر جس قدر طبعی رنج اور قلبی تکلیف پہنچی وہ میرے ضبط بیان سے باہر ہے۔ اس عظیم ملی قومی نقصان پر جتنا بھی اظہار افسوس کیا جائے وہ کم ہے۔ علوم و معارف کے جواہرات سے آراستہ اس طرح کی جامع الصفات شخصیات آفاق و انفس کی دستوں میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسا عالم، عارف، شارح، مجتبیٰ، فلسفی، عاشق رسول، علوم شریعت کا بے باک ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اور شاید پھر صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ قدرت نے انھیں اس جواں سالی میں جس علمی وقتی اختصاص سے نوازا تھا، اس حوالے سے ان کے معاصرین میں دور دور تک کوئی اور نظر نہیں آتا، انھوں نے کم عمری میں جس وسیع پیمانے پر عملی و قلمی کارنامہ انجام دیا ہے لوگ صدیوں میں اتنا کام نہیں کر پاتے۔ افسوس کہ ملت اسلامیہ کے اضطراب میں ڈھڑکنے والا دل ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ رازی و غزالی کی درس گاہ فیض کی آبر و ہم سے اچانک رخصت ہو گئی، قوم و ملت کا یہ غم خوار، عالم ربانی اب عرش الہی کے سایے میں محو خواب ہے۔ قبول و مغفرت کے پھول اور ملکوتی فرشتوں کی ہزار ہا جنتیں ان کے وجود پاک پر برسائی جا رہی ہوں گی۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جواماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو، ترے غنودہ نواز میں

علامہ اسید الحق قادری نور اللہ مرقدہ صرف برصغیر ہندو پاک ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ اور عالم انسانیت کا مشترکہ سرمایہ اور گراں قدر علمی میراث تھے۔ وہ ایک نادرد ہر مفکر، بے باک ناقد، فکر انگیز خطیب، باصلاحیت مدرس، وقت طراز قلم کار، زمانہ ساز مدیر، حیات آفریں شخصیت اور اس عہد جدید میں ہزاروں نوجوان عمار اور باب علم و دانش

میں، ایک وسیع اور جامع تصور پیش کیا ہے۔ ان کا دل مذہب و مسلک کے حوالے سے حد درجہ پر غلوں اور حساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مسلک اہل سنت کے موجودہ انتشار کے نتیجے میں دل گیر اور کبیدہ خاطر بھی تھے۔ ان کی تحریروں میں باضابطہ وضاحت اور صراحت تھی۔ وچپیدگی اور ابہام کا دور دور تک کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ آپ کی ہر تصنیف اپنے پورے ربط و ضبط کے ساتھ کسی زندہ مسنے اور اہم علمی واقعے سے بحث کرتی ہے۔ ان کی ہر کتاب میں رہنمائی، ماخذ و مراجع، مثبت تنقید اور تعمیری لوازمہ موجود ہے۔ ان کے وسیع و عمیق مطالعے اور تجزیے نے عصر حاضر کے ارباب قلم کو ایک نئی شاہراہ حیات سے آشنا کیا ہے، انھوں نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ شاید اسی لیے ہی لکھا کہ قضا و قدر کے فیصلے انھیں بہت جلد ہم سے دور لے جانے والے تھے۔ سرعت تحریر میں مجھے ان کے معاصرین میں کوئی اور ان کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔

علامہ اسید الحق قادری بدایونی کی تحریری خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے موقف کی بنیاد موروثی توہمات و تخیلات کے بجائے مشاہدات و تجربات پر رکھی ہے۔ انھوں نے ایک جانب مظاہر قدرت کو آیات الہیہ کا تقدس عطا فرمایا اور افراد انسانی خصوصاً دینی درگاہوں کے طلبہ کو کتاب فطرت سا متفکک مطالعے اور مشاہدے کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اور دوسری جانب سر منطق کو استخراج کی تنگنا یوں سے نکال کر استقرائی و سحتوں اور پنہائیوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کی محققانہ درسی و غیر درسی تصنیفات اور عملی کاوشوں کو زمانہ یاد رکھے گا۔ وہ اسلام کا غیر فانی افشا بن کر ہمارے دلوں کی کائنات میں بہت دیر تک زندہ رہیں گے۔ ان کی شرحیں لکھی جائیں گی۔ ان سے نظریات تشکیل دیے جائیں گے۔ اسے زر نگار ہاتھوں سے سنوارا جائے گا۔ ان کی اہم جہت عملی شخصیت اور فی کارناموں کو مستقبل کے ارباب قلم مختلف حوالوں سے دیکھیں گے۔ گزرتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ مذہبی محنت میں ان کی تنقید نگاری اور تحقیق کی پرتیں کھل کر سامنے آئیں گی۔

ابھی تو علم و فن کے ہام و دران کے کارنامہ بے حیات اور زہی دہان کی کے انوار سے مزید روشن ہونے والے تھے۔ ابھی تو یہ ابر باران کس برس بھی نہ تھا۔ ابھی تو کشت دیراں پر فصل بہاری آئی بھی نہ تھی۔ ابھی تو مرغ شہرت نے آفاق و انفس کی دستوں میں بال و پر پیدا بھی

نہیں کیے تھے۔ مجھے حد درجہ یقین تھا کہ امام علم و فن، استاذ ذمّن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی علیہ الرحمتہ کے وصال سے جو مسند ارشاد خالی ہو گیا ہے، وہ علامہ اسید الحق قادری سے پر ہو جائے گا۔ مگر ہائے رے گردش ایام کی ستم ظریفی! کہ وہ دانائے راز بھی ہم سے اچانک غیر یقینی حالات میں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

علامہ اسید الحق قادری اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے ہندوپاک کے ارباب علم و دانش میں یکساں تعارف رکھتے تھے، اس طرح کی شہرت کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ وہ اپنی گراں قدر قلمی خدمات کے ساتھ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

مر کے کب ٹوٹا ہے یہ سلسلہ قید حیات
ارباب دعوت و عزیمت موت کے پردوں میں چھپ کر بھی اپنے عشاق کے دلوں پر حکومتیں کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رب قدیر دین و سنت کی خدمت کے لیے انہی میں سے ان کے امثال پیدا فرمائے گا۔ علامہ اسید الحق قادری کے علمی تاثر کی حفاظت اور ان کے فکری تسلسل کی بقا کے لیے، ان کے قائم کردہ تاج الحول اکیڈمی بدایونی اور الازہر انشٹی ٹیوٹ کو مزید محرک ہونے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ کاروان علم و فن اپنی منزل آگہی کی جانب رواں دواں رہے۔ برطانیہ و یورپ کے علمائے اہل سنت نے بھی اس عظیم سانحے پر اپنے گہرے رنج و غم اور ملی صدے کا اظہار کرتے ہوئے ان کی موت کو ملت اسلامیہ اہل سنت و جماعت کا عظیم نقصان قرار دیا ہے۔

ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ کے جملہ قائدین خصوصاً مفکر اسلام مولانا قمرالزماں اعظمی، مانچسٹر، مولانا شاہد رضا نعیمی، لندن، مولانا قاری محمد اسماعیل مصباحی، راجڈیل، مولانا ممتاز احمد اعظمی، بریڈ فورڈ، مولانا محمد میاں مالیک، برمنگھم، مولانا محمد ارشد مصباحی، مانچسٹر، اور مولانا غلام یزدانی مصباحی، لندن نے اپنے مشترکہ بیان میں علامہ اسید الحق قادری کی حادثاتی موت کو پوری علمی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ دعا ہے کہ مولیٰ اس شہید عشق و محبت کی قبر پاک پر رحمتوں کے پھول برسائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین □□□

ہذا ورلڈ اسلامک مشن، کونن جیری اوین، گلاسگو (انگلینڈ)
email:mfquadri@hotmail.co.uk

حیات قابل تبریک اور مہمات قابل صدر شک

مولانا اسید الحق قادری جب تک زمین کے اوپر رہے ہمارے مرکز توجہ رہے اور اب نگاہ غمیت کبریٰ کے حصار میں ہیں

علامہ اسید الحق عاصم القادری سے یوں تو سرسری طور پر میری ملاقات چار پانچ سالوں پیشتر ہوئی تھی، تاہم پچھلے سال ۲۰۱۲ء میں اپنے بھتیجے عزیز منظر سبحانی کی تقریب شادی کے موقع پر آپ کے ساتھ قدرے تفصیل سے کئی نشستیں ہوئیں۔ موصوف مولانا خوشنورانی کے دولت کدے پر پڑھ رہے ہوئے تھے اور میں اپنے بڑے بھائی جناب غلام ربانی صاحب دامت برکاتہ کے کمرے میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ شادی اور پھر دعوت ولیمہ، دونوں تقریبات میں شرکت کرنے کی وجہ سے موصوف کا قیام دو تین دنوں تک کھینچ گیا تھا۔ اس درمیان لوگ انتظام وانصرام میں مصروف رہتے تھے اور ہم بہت دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ انہیں سنجیدہ لب و لہجے اور ناپ تول کر گفتگو کرنے پر قدرت تھی۔ علمی طنز و مزاح کے دوران ہاتھیں کھل جاتیں، تاہم بے ہنگم قبضہ سے گریز کرتے۔ علوم و فنون پر دسترس کے باوجود وہ ہمیشہ دوسروں سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ کہنے کو تو وہ ایک بڑی خانقاہ کے شہزادہ اور ولی عہد بھی تھے، لیکن برصغیر کی خانقاہوں کے شہزادوں کے برعکس، آپ میں نخوت و غرور، تکبر و تعلیٰ اور بڑائی نام کو نہ تھی، بلکہ یہ کہیں کہ طلب و نیاز اور عجز و انکساری کے جذبات انگ انگ سے عیاں رہتے تھے۔

خیال رہے کہ یہ بات میں حسن عقیدت کے نشے میں نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اپنے ماتھے کی آنکھوں سے کیے ہوئے مشاہدات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ گئے ہاتھوں سن ہی لیجیے، ہم سب شادی کے لیے تیار کیے ہوئے رضی ہال میں بیٹھے محو گفتگو تھے کہ اتنے میں شرف ملت حضرت محمد اشرف مارہروی (چیف اگم ٹیکس کشنر، کوکناٹہ) تشریف لے آئے۔ جوں ہی آمدی اطلاع کانوں تک پہنچی، میں نے دیکھا کہ موصوف بھاگتے ہوئے صدر دروازے پر پہنچے۔ فرط عقیدت و محبت سے حضرت شرف

مت کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور نہایت ہی سرعت کے ساتھ قدم بوی کے لیے جھک گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے میں سیکے میں آگیا کہ عمر کے لحاظ سے بہت چھوٹے سہی، لیکن علوم و فنون کے پس منظر میں اپنی طبعی عمر سے سالوں بڑے، پھر خانوادے کی نسبت سے نائب سجادہ، پھر عالمی شہرت و عزت کے حامل، اور عاجزی و فروتنی کا یہ عالم کہ ہزاروں کے سامنے اپنے مخدوم گرامی کی قدم بوی میں کوئی عار نہیں۔ کہنے دیجیے کہ بلاشبہ ہزار کمالات و حسنات کے باوجود اپنے بزرگوں کی بارگاہ محمودیت میں نیاز مندانہ جذبات نے انہیں اپنے ہم عصروں میں بہت ممتاز کر دیا تھا۔ لوگ افسردہ ہیں کہ وہ بہت جلد ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے۔ ٹھیک ہے، یہ حقیقت ہے اور اسے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں، لیکن جو بات قابل رشک ہے وہ یہ کہ جب تک وہ زمین کے اوپر رہے، ہمارے مرکز توجہ رہے اور اب جب کہ زمین کے نیچے ہیں تو وہ غمیت کبریٰ کی نگاہ توجہ کے حصار میں ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ لوگوں کے نزدیک وہ اس لیے قابل تعریف ہیں کہ انہوں نے کئی کت میں تصنیف کیں اور ان کی کوششوں سے پچاسوں نئے تحقیق و ترتیب کے ساتھ شائع ہوئے، تاہم میری نگاہوں میں وہ تمام خدمات جلیلہ بہت ہی زیادہ تحسین و ستائش کے لائق ہی کیوں نہ سہی، مگر شرف شہادت اور وہ بھی اپنے محبوب کی چوکھٹ پر، سارے کمالات و اعزازات پر سبقت لے گیا ہے۔ ارے کسی کو ایک شرف مل جائے تو وہ قابل رشک ہو جاتا ہے، اور یہاں ایک نہیں، دو نہیں، تین تین شرافتیں اکٹھے ہو گئی ہیں۔ شرف شہادت، شہر محبوب میں پرواز روح اور بارگاہ غمیت کی چوکھٹ میں تدفین۔ شرف شہادت کی عظمت و بزرگی کا اعلان قرآن مقدس کر رہا ہے اور دوسرے اور تیسرے شرف کی رفعت و بلندی خوش عقیدہ علمائے اسلام کے ارشادات سے ثابت ہو رہی ہے۔ بقیہ صفحہ 195 پر دیکھیں

مولانا اسید الحق قادری: اسلاف شناس محقق

وہ ایک وسیع النظر، منصف مزاج عالم و فاضل تھے، جو جعفر انبائی سطح پر عقیدت و محبت کی تقسیم کے قائل نہ تھے

میڈیا کے ذریعے اشاعت اسلام کا یہ کام وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہے۔“

سلف صالحین کے علمی سرمایے سے نوخیز نسل کو واقف کروانے میں بڑی دلچسپی تھی۔ تاریخ ہندو متذکرہ اولیا و علما میں بھی آپ کو مہارت تھی، شرق و غرب، شمال و جنوب کی تفریق کے بغیر تمام اہل اللہ اور اہل علم سے آپ کو بڑی محبت تھی، ہر صاحب فضل کے فضل کا اعتراف کرنا وہ اپنی علمی دیانت و ادبی سمجھت تھے، چنانچہ حضرت مولانا عبدالوہاب بہاری رحمہ اللہ اور مولانا معین الدین اجمیری رحمہ اللہ کے درمیان منطقی قضیہ کے مقولات ثانویہ میں ہونے یا نہ ہونے کی نسبت مناظرہ کی نوبت آئی تو مولانا عبدالوہاب بہاری رحمہ اللہ نے اس شرط پر مناظرہ کی دعوت قبول کی کہ اس مناظرے کے حکم شیخ الاسلام حضرت علامہ مولانا محمد انوار اللہ قادری، بانی جامعہ نظامیہ ہوں، اس پر مولانا معین الدین اجمیری راضی ہو گئے، جیسا کہ مولانا اسید الحق ذکر کرتے ہیں:

اس دعوت کو فقیر بالرأس والحق قبول کرتا ہے، بہتر ہے حیدر آباد چلیے، حضرت مولانا محمد انوار اللہ صاحب دامت برکاتہم جو ہم بھی حکم تسلیم کرتے ہیں، اب آپ کو اس معاملے میں غلط کرنا چاہیے، جس وقت روٹنگی کا ارادہ ہو فقیر کو بذریعہ تار مطلع فرمائیے اور بہتر ہو کہ جناب براہ اجمیر شریف حیدر آباد تشریف لے جائیں تاکہ دونوں کا ساتھ ہو جائے، سفر کی منزلیں بخدا لطف کے ساتھ طے ہوں گی، الغرض فقیر ارشاد کی تکمیل کے لیے حاضر ہے۔“ (کمل چٹھی کا خلاصہ خط: بحوالہ مولانا معین الدین اجمیری کردار و افکار، ج ۱: ۶۷، ۶۸)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اسید الحق رقمطراز ہیں:

”مولانا کی اس تحریر میں دو باتیں خاص طور سے قابل غور ہیں ایک تو اس سے شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ

خانقاہ قادریہ بدایوں کے چشم و چراغ ”مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ“ کی رحلت سے علمی دنیا میں ایک عظیم خلا واقع ہو گیا، مختصر مدت میں علامہ نے علم و تحقیق کی روشنی سے ایک عالم کو منور کر دیا تھا۔ مولانا ایک دور اندیش عالم، عظیم مفکر، بلند پایہ محقق تھے، انہوں نے اپنی زندگی بحث و تحقیق، تصنیف و تالیف اور فروغ دین و سعادت کے لیے وقف کر دی تھی، ایک بندہ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کیے بغیر کوئی سبیل نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شہادت مقدس فرمادی تھی، مولانا نے ایک مبلغ اور داعی کی حیثیت سے زندگی گزاری، اور شہادت کی نعمت سے سرفرازی حاصل کی، کرم بالائے کرم یہ کہ سید الاولیا قطب الاقطاب غوث اعظم و شہیر رضی اللہ عنہ کے قدیم کریمین میں دفن ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔“

مولانا اسید الحق قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کا تعلق بیک وقت خانقاہ سے بھی تھا اور درس گاہ سے بھی، انہوں نے جامعہ ازہر سے فراغت حاصل کی اور قلیل عرصے میں تحقیق و تالیف کے ذریعے عظیم خدمات انجام دیں۔ مولانا کی فکر یہی رہی کہ نوخیز نسل کو زیور علم سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے، اور تعلیم یافتہ طبقے کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے۔

آپ کو جامعہ نظامیہ اور بانی جامعہ سے موروثی و روحانی وابستگی تھی، آپ کے جد امجد حضرت مفتی عبدالقدیر بدایونی علیہ الرحمہ جامعہ نظامیہ میں مہتمم بالشان منصب پر فائز تھے۔ چنانچہ چند سال قبل جب مولانا کا حیدر آباد دورہ ہوا تو جامعہ نظامیہ کا تفصیلی دورہ فرمایا، بارگاہ حضرت بانی جامعہ میں حاضری دی، کتب خانہ اور بانی جامعہ کے نوادرات کا معائنہ فرمایا۔ مولانا شاہ فصیح الدین نظامی کے ہمراہ ”ابوالحسن اسلامک ریسرچ سنٹر“ پر تشریف لائے، ziaislamic.com ویب سائٹ کے تمام گوشوں کو با تفصیل ملاحظہ کر کے فرمایا کہ:

”ادارے کی مختلف علمی، تحقیقی خدمات اور بطور خاص اکثر ایک

علامہ اسید الحق قادری نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں

اگرچہ عمر کم تھی، لیکن اس کم عمری میں علوم جدید و قدیم پر انھیں ماہر اند سترس حاصل تھی

ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بیٹی کے سسرال والے بدایوں سے تعلق رکھتے ہیں لہذا نکاح کی تقریب میں خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں کے سجادہ نشین حضرت علامہ سالم میاں قادری بدایونی دامت برکاتہم العالیہ کے صاحبزادے جو ان کے ولی عہد بھی ہیں، علامہ اسید الحق قادری بدایونی بھی تشریف لارہے ہیں۔ راتم جب نکاح پڑھانے کے لیے ہال میں پہنچا تو ایک نوجوان شیروانی، پاجامہ اور جناح کیپ میں مبوس کھڑے تھے۔ ثار صاحب نے تعارف کرایا کہ آپ بدایوں سے تشریف لائے ہیں۔ آپ کا نام اسید الحق ہے اور شیخ صاحب کی عرفیت سے مشہور ہیں۔

معانقہ اور مصحف کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ راتم نے انھیں بہت ہی منکسر المزاج پایا، نکاح کے لیے جب ہم اسٹیج پر گئے تو ہم نے ان سے کہا کہ نکاح آپ پڑھائیں، عاصم میاں نے فوراً فرمایا کہ جب اولاد غوث ال عظیم موجود ہو تو ہم یہ جرات نہیں کر سکتے، چنانچہ راتم نے نکاح پڑھایا، نکاح کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی میز پر کھانا کھایا، اس دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، انھوں نے خانقاہ بدایوں میں ہونے والی روحانی تبلیغی خدمات اور اس کے تحت چلنے والے اداروں کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ اسی طرح راتم نے بھی درگاہ عالیہ اشرفیہ میں ہونے والی تقریب علمی، روحانی اور تہنیتی میں لٹریچر اور دیگر کاموں کے متعلق بتایا اور ساتھ ہی ان کو درگاہ شریف آنے کی دعوت بھی دی جو انھوں نے قبول کر لی اور طے یہ پایا کہ دوسرے دن دوپہر کا کھانا وہ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ اسی دوران تیز بارش ہو گئی، شدید کیوں کہ اوپن ایئر میں ہو رہی تھی، اسی لیے ہم بارش سے بچنے کے لیے ہال کے آفس میں آ گئے۔ ثار احمد اشرفی صاحب نے فوراً واپسی کے لیے گاڑی کا انتظام کیا اور ہم عاصم میاں سے ملاقات کر کے گاڑی میں روانہ ہو گئے، وہ ہمیں چھوڑنے کے لیے بارش کے باوجود گاڑی تک آئے۔ اس ملاقات نے میرے ذہن پر ان کے متعلق بہت اچھا تاثر چھوڑا اور

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے ہم روزانہ ملتے ہیں، لیکن جب وہ دنیا سے جاتے ہیں تو ان کی یادیں بھی ان کے ساتھ چلی جاتی ہیں اور مرورایام کے ساتھ ساتھ نسیا نسیا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے ہماری ملاقات چند مرتبہ ہی ہو لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں اور اخلاق حسنہ کی بدولت وہ اپنے گہرے نقوش ہم پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسی ہی عظیم شخصیتوں میں سے ایک خانقاہ بدایوں شریف (انڈیا) کے سجادہ نشین تاجدار اہل سنت حضرت علامہ سالم میاں قادری بدایونی مدظلہ العالی کے فرزند و جانشین ولی عہد حضرت علامہ صاحبزادہ اسید الحق عاصم میاں قادری بدایونی شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے جو گذشتہ دنوں اپنے والد، بھائی اور دیگر مریدین کے ہمراہ بغداد شریف حاضر ہوئے مزارات مقدسہ پر حاضری دی اور وہیں سفر کے دوران ایک حادثے کا شکار ہو کر جام شہادت نوش کر گئے۔

موصوف بڑی خوبیوں کے حامل تھے، جید عالم دین، بہترین مقرر، فقیہ اور کم و بیش ایک درجن کتابوں کے مصنف اور تقریباً ایک سو کے قریب اپنے بزرگوں کی کتابوں کے مترجم، محقق، مجتہد اور مترجم تھے۔ اگرچہ عمر کم تھی، لیکن اس کم عمری میں علوم جدید و قدیم پر ماہر اند سترس حاصل تھی۔ ۳۹ رسال کی عمر میں درس نظامی بھی مکمل کیا، جامع ازہر سے ڈگری بھی حاصل کی اور کتا ہیں تصنیف فرمائیں اور اپنے بزرگوں کی کتابوں کی تحقیق و ترجمہ بھی کیا۔ قدرت نے ان سے یہ تمام کام اسی لیے کہ ان کو جلدی بلانا تھا۔ میری ان سے صرف تین مرتبہ ملاقات ہوئی، لیکن ان تین ملاقاتوں میں انھوں نے اپنی یادوں کے گہرے نقوش ذہن پر چھوڑ دیے۔

راتم کے والد گرامی اشرف المشائخ حضرت ابو محمد شاہ سید احمد شرفی اشرفی الجیلانی قدس سرہ کے مرید ثار احمد اشرفی کی صاحبزادی کا نکاح ہونا تھا، انھوں نے راتم سے نکاح پڑھانے کی درخواست کی اور

بقیہ عزائم اور منصوبوں کے اک جہان کی موت

(۶) الادھر انشی ٹیوٹ بدایوں کی شاخیں: اس انشی ٹیوٹ کی ہونے اور ادھرتک آبادیہ راشرفیہ میں مختلف شاخیں بھی قائم کیں، جو اپنے اپنے حلقہ اثر میں بڑی تندی کے ساتھ خدمات انجام دے رہی ہیں۔

(۷) مصری علوم کے طلبہ کا دینی ورگ شاپ: گرمیوں کی تعطیل کلاں میں اسکول اور کالجوں کے طلبہ کو باضابطہ علمی اور دینی معلومات فراہم کراتے۔ اس میں ہائی اسکول سے ایم۔ اے تک کے سیکڑوں طلبہ شریک ہوتے۔

(۸) جامع مسجد محشی بدایوں میں خطاب: اس جامع مسجد میں آپ ہر جمعہ کو خطاب فرماتے اور ہفتہ وار درس قرآن، درس تصوف اور درس حدیث بھی دیتے۔

(۹) شخصیات انسائیکلو پیڈیا: اس عظیم کام کے لیے مولانا کا منصوبہ یہ تھا کہ آبا و اجداد کی کتابوں کی اشاعت کے بعد ایک ”عالمی شخصیات انسائیکلو پیڈیا“ مرتب فرمائیں، مولانا کا کہنا تھا کہ اس قسم کے کام عالم عرب میں ہوئے ہیں مگر افسوس برصغیر کی شخصیات کا اس میں کوئی ذکر نہیں اور اگر ہے بھی تو غلط طور پر ہے، اس کی اصلاح وقت کی بنیادی ضرورت ہے۔ مولانا کا فرمانا تھا کہ اس کام کو تنہا نہیں بلکہ ایک ٹیم ورک کے طور پر مکمل کیا جائے گا۔

(۱۰) انٹرنیشنل صوفی کانفرنس: دہلی کے رام لیل میدان میں جمعہ ہی ایک انٹرنیشنل صوفی کانفرنس کا انعقاد بھی ان کے منصوبے میں شامل تھا۔ اس کے لیے باضابطہ پچس لاکھ روپے کا تخمینہ تھا اور اس سلسلے میں بھی کام شروع ہو چکا تھا۔ مولانا اسید الحق قادری بدایونی عزائم اور منصوبوں کا ایک جہان نے کر دینا سے چلے گئے، مولانا نے اپنے کردار و اخلاق سے ایک جہان کو اپنا شہیدائی اور فدائی بنالیا تھا۔ ان کی رحلت کے بعد مختلف مقامات سے بے شمار تعزیتی فون آئے اور بڑی اہم شخصیتوں نے اظہار تعزیت بھی فرمایا، ان سب کی تفصیلات کا موقع نہیں۔

دعا ہے مولانا تعالیٰ ان کی خدمات کو عام فرمائے، ان کے والدین کریمین اور اہل تعلق اور اہل ارادت کو صبر عطا فرمائے آمین۔ □□□

☆ مدبر اعلیٰ: ہنامہ اشرفیہ مبارک پور، عظیم گڑھ (پوئی)

کا علمی مقام و مرتبہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صرف مقولات ہی کے امام نہیں، بلکہ مقولات میں بھی اس درجہ بلند مقام کے حامل تھے کہ منطق کے ایک الجھے ہوئے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اگر فریقین کسی کے علم اور دیانت و امانت پر اعتبار کر کے فیصل اور حکم ماننے پر آمادہ ہیں تو صرف آپ کی ذات گرامی ہے۔

دوسرے اس عبارت سے مولانا معین الدین اجیری کے خلوص اور کشادہ قلبی کا پتہ چلتا ہے کہ جس شخصیت سے آپ علمی میدان میں برسر پیکار ہیں اسی کو اس محبت کے ساتھ اپنا ہم سفر بنانے کی خواہش کر رہے ہیں، گویا ان کے درمیان کوئی اختلاف ہی نہ ہو، یہ ہے علمی مباحثے میں ہمارے اکابر و اسلاف کا کردار!

قصہ مختصر یہ کہ حیدرآباد کے سفر کی ٹوہٹ ہی نہیں آئی اور اسی درمیان میں العسما مولانا عبدالوہاب بہاری صاحب کا سانحہ ارتحال پیش آ گیا، ان کی اچانک وفات سے یہ معاملہ کسی فیصلہ کن موڑ پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچا۔“

(خبرآبادیت، جس ۲۱۵، ۲۱۶)

بہر حال مولانا اسید الحق قادری ایک وسیع النظر، منصف مزاج عام و فاضل تھے، جو جغرافیائی سطح پر عقیدت و محبت کی تقسیم کے قائل نہ تھے بلکہ ”الحب فی اللہ“ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی کو وہ اپنے قلبی تعلق اور وابستگی کے لیے اساس و بنیاد سمجھتے تھے۔

آپ کا سانحہ ارتحال امت مسلمہ کے لیے بڑا خبرہ ہے، جب شہادت کی خبر عام ہوئی تو عالم اسلام کے مختلف طبقات کیا عطا کیا صلحا سب کے درمیان رنج و غم اور کرب و الم کی لہر دوڑ گئی، عوام و خواص نے اظہار تعزیت کے جلسے منعقد کیے، دین کی خدمت میں لیل و نہار گزارنے والے اس جان ثار کو زمانہ رحمتی دنیا تک یاد رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات کو بلند فرمائے، ان کے والدین کریمین اور جملہ اہل خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ □□□

☆ شیخ الفہم: جامعہ نظامیہ، ہائی ابو الحسنات اسلامک ریسرچ سنٹر، حیدرآباد (دکن)

عالمانہ وقار اور اسلامی شعار کا پیکر جمیل

شیخ صاحب آداب زندگی سے خوب واقف تھے، ہر شخص سے بڑے خلوص، اخلاق اور تواضع سے پیش آتے

شیخ صاحب طبعا بہت سنجیدہ تھے۔ ان کی یہ سنجیدگی ان کی تقریر اور گفتگو میں صاف دکھائی دیتی تھی اور موجودہ تحریروں اس کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ سچی، ہنسی اور جذباتی گفتگو نہیں کرتے تھے اور نہ کبھی اپنی بات پر اڑتے تھے۔ عموماً کے درمیان گفتگو کرتے تو انتہائی سنجیدگی و متانت سے اپنے دلائل رکھتے۔ عموماً کرام ان پر غور کرتے اور قبول کرتے اور عام لوگوں کے درمیان باتیں کرتے تو قدیم اہل تصوف کے انداز میں آسان زبان میں کرتے کہ مخاطب کو پوری بات سمجھ میں آجاتی۔ قہقہہ لگا کر کبھی نہیں ہنستے، ہاں! کسی بات پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے تو زیر لب مسکرا دیتے۔

شیخ صاحب آداب زندگی سے خوب واقف تھے۔ وہ پورے طور پر عالمانہ شان اور اسلامی شعار میں رہتے تھے۔ لوگوں سے ملتے تو ان کی عمر اور ان کے مرتبے کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ملتے اور اسی انداز میں باتیں کرتے۔ کسی نا آشنا شخص سے بھی ان کی ملاقات ہو جاتی تو اسے نا آشنا کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ ہر شخص سے بڑے خلوص، اخلاق اور تواضع سے پیش آتے اور پہلی ہی ملاقات میں لوگوں کے دلوں پر اپنا دیر پا نقش چھوڑ جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ علماء اور عوام دونوں کے درمیان یکساں طور پر مقبول تھے۔

راقم الحروف کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے اپنا گرویدہ بنایا۔ اس کے بعد ٹیلی فون کے ذریعہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ویسے ان سے میری بالمشافہ چار ملاقاتیں ہوئیں: پہلی ملاقات جامعہ صوفیہ کچھ چھ شریف کے زیر اہتمام ایک سیمینار (۲۰۰۶ء) میں ہوئی۔ حسن اتفاق سے ہم دونوں نے ایک ہی نشست میں اپنا اپنا مقالہ پیش کیا۔ بعد ازاں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔

بدایوں موجودہ صوبہ اتر پردیش کا ایک ضلع ہے، اس کی سرزمین قدیم زمانے سے بڑی زرخیز اور مردم خیز رہی ہے۔ اس سرزمین سے علم و ادب، تاریخ و تمدن اور رشد و ہدایت کے ایسے ایسے گل و لالہ، سمن و شہلا اور زکس و چپ کھلتے رہے ہیں کہ ان کی خوشبوؤں سے ہند اور بیرون ہند کے بیشتر حصے ممکن رہے ہیں۔ عصر حاضر میں اسی سرزمین سے عم و ادب اور رشد و ہدایت کی ایک کھلی (یہ شکل علامہ اسید الحق قادری) کھلی جو پھول بنے اور خوشبو بھرتے ہوئے پہلے ہی مرجھ گئی۔

غموں پر آنسو بہنا، مصیبتوں پر بے چینی و پریشانی ظاہر کرنا اور گم شدہ چیزوں پر رنج و غم کا اظہار کرنا فطری بات ہے اور جو چیز جتنی اہم اور عزیز ہوتی ہے اس کے کھوجانے کا غم اور افسوس بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ علامہ اسید الحق کی شہادت سے علم و حکمت، قوم و امت اور اہل سنت کا جو نقصان ہوا ہے وہ یقیناً بہت بڑا نقصان ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نقصان کا غم اور افسوس بھی لوگوں کو بہت زیادہ ہوا ہے۔

علامہ اسید الحق قادری عثمانی بدایونی ملقب بہ عاصم القادری معروف بہ شیخ صاحب ایک ذی استعداد عالم، باخلاق، منکسر المزاج و صالح فکر کے حامل انسان تھے۔ وہ کم عمری میں ہی علوم اسلامیہ پر دست رس پا کر اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اتنے سارے علمی، ادبی، تبلیغی اور اصلاحی کام کر گئے کہ جن کی وجہ سے درجہ ضرر کے جید علماء اور اپنی پاکیزہ طبیعت کی وجہ سے زمرہ صوفیہ میں شمار ہوئے۔

میانہ قد، سیاہ چشم، کشادہ پیشانی، غنچہ لب، گھنی داڑھی اور متبسم چہرہ نے ان کے پیکر کو جمل اور وسعت علمی، تیرہنہی، صاف گوئی، عجز و انکساری، علو ہمتی، بلند فکری اور حسن اخلاقی نے ان کی سیرت کو درجہ کمال پر پہنچ دیا تھا۔

ہر حاضری کے بعد ہم سے ملاقات کی اور اپنی کئی کتب پیش کیں۔ یہ ہماری ان سے تیسری ملاقات تھی، بارہ بجے تک وہ درگاہ شریف میں رہے۔ اس مرتبہ وہ کچھ جلدی میں تھے، انھوں نے بتایا کہ یہاں سے جانے کے بعد کئی کتب جو تیار ہیں وہ منظر عام پر لانی ہیں، جب وہ جانے کے لیے روانہ ہوئے تو ہم نے انھیں درگاہ شریف کے دروازے تک رخصت کی۔ یہ ہماری ان سے آخری ملاقات تھی۔ پاکستان سے جانے کے بعد انھوں نے ”ماہنامہ“ ”جام نور“ دہلی میں ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا: ”ہم نے دیکھا پاکستان“ دراصل یہ ان کا سفر نامہ تھا، انھوں نے اس سفر نامہ میں درگاہ شریف آنے کا ذکر کیا اور ہم دونوں بھی یوں کا بھی ذکر کیا، وہ بڑے فعال انسان تھے، خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کا انتظام اور وہاں ہونے والی تقاریب اور اس کے تحت چھنے والے اداروں کی نگرانی بھی کیا کرتے تھے۔ مستقبل میں ان کے بہت سے منصوبے تھے اور بہت ساری علمی کام وہ کرنا چاہتے تھے، لیکن زندگی نے مہلت نہ دی اور وہ ۳۹ سال کی عمر میں ہی دارفانی سے کوچ کر گئے، لیکن اس کم عمری میں بھی وہ بہت بڑے بڑے کام کر گئے۔ جس وقت ان کی اچانک شہادت کی اطلاع ملی تو راقم فیصل آباد میں تھا، خبر یہی بن کر گری، ان کا ہنسا مسکراتا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اپنی شہادت سے صرف چودہ گھنٹے پہلے انھوں نے اپنی تصویر فیس بک پر ڈالی تھی، جس میں وہ اپنے والد اور بھائی کے ہمراہ حضور غوث پاک علیہ الرحمہ کی خانقاہ کے صحن میں کھڑے ہیں۔ حضور سیدنا غوث الاعظم علیہ الرحمہ نے ان کی حاضری کو ایسا قبول فرمایا کہ انھیں اپنے پاس ہی رکھ لیا، ان کا جنازہ حضور غوث پاک علیہ الرحمہ کے قدموں میں رکھ گیا اور حاضرین نے سیدنا غوث پاک کی بارگاہ میں سلام پیش کیا اور پھر اعزاز کی بات یہ تھی کہ نقیب الاشراف جو سجادہ نشین حضرات ہیں ان کے قبرستان میں عاصم میاں کی تدفین ہوئی۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ وہ کل قیامت میں حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ کی اولاد کے ساتھ اٹھیں گے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے مرقہ مبارک پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے او ان کے والد گرامی کو اس عظیم صدمے کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ □□□

☆ سیدہ نعین درگاہ شریف، اشرف آباد، فردوس کوٹلی، کراچی (پاکستان)

ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہماری بہت پرانی شناسائی تھی، نثار احمد اشرفی صاحب کی یہ ڈیٹی لگائی گئی کہ وہ دوسرے روز عاصم میاں کو ساتھ لے کر آئیں، چنانچہ دوسرے روز حسب وعدہ وہ درگاہ شریف تشریف لائے، پہلے راقم کے جد امجد قطب ربانی حضرت ابو محمد شاہ سید محمد طہر اشرف الاشرفی البیلانی اور پھر والد گرامی اشرف المشائخ حضرت ابو محمد شاہ سید احمد اشرفی اشرفی البیلانی نور اللہ مرقہ ہما کے مزارات مقدسہ پر حاضری دی۔ بعد ازاں ہمارے ساتھ دو چہر کا کھانا کھایا اس موقع پر راقم کے برداران صاحبزادہ حکیم سید اشرف جیلانی، صاحبزادہ سید اعراف اشرف جیلانی، صاحبزادہ سید مصطفیٰ اشرف جیلانی اور صاحبزادہ حافظ سید جمال اشرف جیلانی زید محمد ہم بھی موجود تھے۔

عاصم میاں ہم تمام برادران سے مل کر بہت خوش ہوئے، کھانے کے بعد مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ ہندوستان اور پاکستان کے حالات اور یہاں ہونے والے علمی اور روحانی کاموں کے متعلق بھی تبادلہ خیال ہوا۔ راقم نے عاصم میاں کو ماہنامہ ”الاشرف“ نیز والد گرامی اور اپنی کتب کا ایک سیٹ پیش کیا۔ انھوں نے خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں کا تعارف رسالہ ہمیں دیا، ہم نے انھیں اپنی لائبریری بھی دکھائی جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے، انھوں نے ہمیں بدایوں شریف آنے کی بھی دعوت دی، چلتے وقت ہم نے انھیں ایک تحفہ دیا جس کے متعلق انھوں نے فرمایا ”میں صرف اس لیے قبول کر رہا ہوں کہ یہ درگاہ شریف کا تحریک ہے۔“ تین دن کے بعد وہ بدایوں روانہ ہو گئے۔

اس ملاقات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد نثار احمد اشرفی صاحب کا فون آیا اور انھوں نے صاحبزادہ حکیم سید اشرف جیلانی صاحب کو بتایا کہ عاصم میاں بدایوں سے تشریف لائے ہیں اور آپ حضرات سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں لیکن نثار احمد صاحب نے بتایا کہ اس مرتبہ ان کی مصروفیت زیادہ ہیں۔ کئی پروگرام ہیں اور کیوٹی وی پر بھی ریکارڈنگ ہے اس لیے وہ صرف درگاہ شریف پر حاضری اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ جمعرات کا دن منتخب ہوا، ہم نے بتایا کہ دس بجے ذکر حلقہ ہوگا تو وہ ساڑھے دس بجے تشریف آئے آئیں تاکہ ذکر کے بعد ان سے ملاقات ہو جائے، پورے گیارہ بجے وہ نثار صاحب کے ہمراہ تشریف لائے، مزارات

دوسری ملاقات دارالعلوم اصدقیہ بہار شریف (نالندہ، بہار) سے زیر اہتمام ایک سیمینار میں ہوئی جو مختصر رہی۔ تیسری ملاقات ماربرہ تریف (یوپی) کے ٹکرو تدریکہ گرنس (۲۰۱۱ء) میں ہوئی۔ بعد ازاں تفرس ہم (راقم حروف اور ڈاکٹر محبت الحق شعبہ سیاست، علی گڑھ) علی گڑھ کے لیے جلد لوٹنا چاہتے تھے اور جس گاڑی سے ہم لوگ گئے تھے اس کے بیشتر افراد بقیہ اجلاس میں شریک ہو کر تاخیر سے لوٹنا چاہتے تھے، اس لیے جناب ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے ہم دونوں کے لیے ایک اچھی صورت یہ نکالی کہ علامہ اسید الحق و مولانا خوشتر نورانی صاحبان جو اپنی گاڑی سے علی گڑھ ہی آ رہے تھے، ہمیں ان کے ہمراہ کر دیا اور ہم سب علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئے۔ سفر کا آغاز ہوتے ہی گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ شیخ صاحب نے ناچیز کی طرف مضمون ہو کر فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ سے میری پہلی ملاقات کچھ چھ شریف میں ہوئی تھی۔ ناچیز نے عرض کیا: جی ہاں! آپ سے میری ملاقاتیں شریف کمپو پر ہی ہوئی ہیں، پہلی کچھ چھ شریف، دوسری بہر شریف، تیسری برہ شریف۔ اب دیکھیے اگلی ملاقات کس شریف جگہ پر ہوتی ہے۔ پر وہ مسکرائے اور بولے: شریف لوگوں سے شریف جگہوں پر ہی ہوتی ہیں۔ ان شاء اللہ اگلی ملاقات بھی کسی شریف جگہ پر ہوگی۔ اتفاقاً اگلی ملاقات بدایوں شریف میں ہوئی۔ دوران سفر علی گڑھ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس میں سماع کا مسئلہ بھی چھڑ گیا۔ شیخ صاحب سلسلہ قادریہ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سماع کے قائل نہیں تھے، اس لیے انھوں نے سماع کے عدم جواز پر بھرپور دلائل دیے، لیکن ناچیز چون کہ سماع کا قائل ہے اس لیے قائل نہیں ہوا۔ اسی درمیان ہم لوگ علی گڑھ پہنچ گئے۔ شیخ صاحب خوشتر صاحب کے ہمراہ اپنے کسی رشتہ دار کے گھر چلے گئے اور ہم دونوں اپنے اپنے گھر۔

شیخ صاحب سے ناچیز کی چوتھی اور آخری ملاقات بدایوں شریف (۲۰۱۳ء) میں ہوئی جو قابل یادگار رہی۔ دارالعلوم عالیہ قادریہ بدایوں میں طلبہ کے لیے سالانہ تعلیمی و تربیتی پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ اسی پروگرام میں علی گڑھ سے ناچیز اور نوشاد عالم چشتی صاحب بحیثیت ناچ بلائے گئے تھے، نیز مختلف مدارس کے علمائے کرام بھی مدعو تھے۔ جب ناچیز خانقاہ قادریہ پہنچے تو شیخ صاحب اس حسن اخلاق اور تواضع سے

پیش آئے اور اس والہانہ انداز میں میری عزت افزائی فرمائی کہ مجھے یہ حد حیرانی ہوئی۔ حیران ہونے کی دو وجہیں تھیں: ایک تو ناچیز اس کے رائق نہیں تھا، دوسرے عصر حاضر کے اہل خانقاہ (پاسٹنرے) کا ڈکا عام لوگوں سے بنا غرض اس حسن اخلاق و تواضع سے پیش کہاں آتے ہیں۔

بہر حال! پروگرام کی نشستوں میں چلا۔ مسابقے کے کسی مسابقے میں تین طلبہ کے نمبر مساوی آ گئے تو قرعہ اندازی کے ذریعے فیصلہ ہوا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے ناچیز سے کہا گیا کہ ڈاکٹر صاحب! ایک پرچی اس میں سے نکال دیجیے جب کہ حقیقت میں وہاں پر مجھ سے زیادہ مائق اور پرہیزگار عمار اور خود شیخ صاحب موجود تھے۔ میں نے عرض کیا، حضرت! یہ کام تو ہم لوگ آپ رسول اللہ کی موجودگی میں نہیں کرتے، اس لیے آپ ہی انجام دیجیے۔ اس پر شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب! آج آپ مہمان آل رسول ہیں، اس لیے یہ کام آپ ہی کریں گے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے اس میں سے ایک پرچی نکالی تو فیصل نامی بچے کے نام فیصلہ نکل کر آیا۔ رات کو تقسیم انعامات کا پروگرام شروع ہوا جس میں شریک علمائے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔

شیخ صاحب کی تقریباً ۳۹ سالہ زندگی (پیدائش ۶ مئی ۱۹۷۵ء۔ شہادت ۲۴ مارچ ۲۰۱۴ء، در بغداد شریف) کو جب ہم دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ جو پیدائش سے ۲۲ سال تک ہے، وہ ان کے علم و ادب کے سیکھنے و دسترس پانے اور تجربات حاصل کرنے کا ہے۔ بلاشبہ انھوں نے پوری ایمان داری سے اس حصے کا استعمال کیا اور زیادہ سے زیادہ علوم و فنون، حکمت و معرفت اور تجربات کو سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیا۔ دوسرا حصہ ۲۳ سال سے ۳۹ سال تک کا ہے جو سولہ سال پر مشتمل ہے اور یہ ان کی عملی زندگی کا ہے۔ اس زمانے میں وہ اپنی صلاحیتوں اور تجربوں کو بروئے کار لا کر اتنے ڈھیر سارے کام کر گئے کہ ہم میں سے بیشتر تو اتنے کام اپنی بچپن سالہ عملی زندگی میں بھی نہیں کر پاتے ہیں۔ آپ کے شائع شدہ مقالات، کتابیں، دین کی تبلیغ و اشاعت جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ آخر انھیں اتنے سارے کاموں کے لیے وقت کہاں سے مل جاتے تھے کہ وہ ان تمام کاموں کو ساتھ ساتھ کر لیتے تھے، جب کہ ہم

میں سے اکثر وقت کی کمی کا رونا رور و کر اے گزار دیتے ہیں۔

بلاشبہ شیخ صاحب نے اپنی مختصر سی زندگی میں جو علمی، ادبی اور دینی خدمات انجام دیے ہیں وہ قابل رشک اور تقلید ہیں۔ ان کے علمی کاموں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ کاموں کو اس تیزی سے پنتا رہے تھے جیسے کوئی شخص شام کے وقت آفس میں اپنا بچا ہوا کام جلدی جلدی پنتا رہا ہے تاکہ کل کے لیے کچھ باقی نہ رہ جائے اور ہم لوگوں سے بھی کام کا تقاضا کرتے تھے۔ ساتھ دینے کو کہا کرتے تھے مگر ہم لوگ (بالخصوص ناچیز خود) یہ سوچ کر کہ ابھی وقت بہت ہے کچھ ساتھ نہیں دے سکے، جس کا ب احساس ہوتا ہے اور پچھتے و ابھی آتا ہے۔ اے کاش! انھیں دو چار کل اور مل جاتے تو شاید بہت حد تک کام نپٹ جاتے۔ ان کاموں کے تئیں! ان کے دل میں بہت سی آرزوئیں تھیں اور ہم لوگوں کو ان سے بہت سی امیدیں تھیں مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ان کی علمی خدمات، ان کے اخلاق، ان کی باتیں یاد آتی رہیں گی اور ان کی کمی کھلتی رہے گی۔ ان کی علمی خدمات اور نگارشات پر گفتگو کرنا تو اہل علم کا حق ہے، جہاں تک ان کے دیگر اہم کارناموں کی بات ہے تو ان میں سے ایک کارنامہ جو میری نگاہ میں اہم ہے وہ یہ ہے کہ شیخ صاحب نے شمالی ہندوستان میں عموم اسلامیہ کو سائنٹفک انداز میں پیش کرنے، انھیں فروغ دینے اور قدیم صوفیانہ نظام کو بحال کرنے میں پہل کی اور انھیں پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کوشاں رہے۔

شیخ صاحب اپنی نگارشات اور تاج الفحول اکیڈمی سے شائع ہونے والی دوسرے مؤلفین کی کتابیں ناچیز کے مطالعے کے لیے بھیجا کرتے اور جب میں کتاب کے ملنے کی اطلاع اور اس کے لیے شکریہ ادا کرتا تو کہتے، ڈاکٹر صاحب! ضرور پڑھیے گا، کہیں کوئی بات رہ گئی ہو تو اس کی نشان دہی کر دیجیے گا، اگلے ایڈیشن میں اسے درست کر دیا جائے گا۔ ابھی تین مہینے پہلے انھوں نے چند کتابیں بھیجی تھیں، ان میں سے چھوٹی چھوٹی دو کتابیں میں نے پڑھیں اور حسب معمول شکریہ ادا کرنے کے بعد عرض کیا، حضرت! لگتا ہے شائع ہونے سے پہلے فاس فاس کتابوں (نام عہد انہیں کیا گیا) پر آپ کی نگاہ نہیں پڑی ہے۔ ذرا اس پر نگاہ ڈال لیجیے گا۔ میرے خیال سے ان میں برووف ریڈنگ کی کمی کے ساتھ ساتھ بعض جگہوں پر ترجمے میں بھی کمی رہ گئی ہے تو انھوں نے

کہا، ٹھیک ہے ان جگہوں کی نشان دہی کر کے بھیج دیجیے۔ اگلے ایڈیشن میں ان کیوں کو دور کر دیا جائے گا۔ پھر میں نے کہا، حضرت! لیکن یہ اصلاح نامہ میری طرف منسوب نہ ہونے پائے اس لیے کہ ایک تو میں خود ایک طب علم ہوں، دوسرے علمائے ہندوستان کے حالات سے آپ واقف ہیں، یہ لوگ کسی گروپ کا نہیں لگا کر میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اس پر انھوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ڈاکٹر صاحب! آپ ڈرتے کیوں ہیں؟ اور ہر ڈی اگر اس طرح بچ بچا چلنے کی سوچ لے تو پھر کوئی عملی کام نہیں ہو پائے گا۔ کیا ہم ہی حق ہیں کہ سب پر تنقید کرتے رہتے ہیں؟ میں نے کہا، حضرت! اس معات میں بھی آپ کو فضیلت و برتری حاصل ہے۔ آپ اپنی زبان، اپنے ہاتھ اور زبان قلم سے برائی کو روکتے ہیں اور ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ ناچیز دل میں غلط کو غلط کہہ کر ایمان کے اوٹی درجے پر ہے۔ اس پر وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے، پھر سنجیدہ ہو کر بولے۔ ڈاکٹر صاحب! اہل تاریخ کے آخر میں فارسی زبان میں شجرہ طیبہ قادر یہ تحریر ہے، اس کا اردو میں ترجمہ کر کے بھیج دیجیے گا۔ اگلے ایڈیشن میں اس کا ترجمہ بھی سمیع کر دیا جائے گا اور مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں کے کتب خانے میں ایک قدیم فارسی مخطوط (جس کا نام اس وقت وہ نہیں بتا سکے تھے) ہے، اس کو بھی فرصت نکال کر ایڈٹ کر دیجیے گا۔ میں نے ان سے ان دونوں کاموں کے پورا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اول الذکر کام (شجرہ طیبہ قادریہ) کو ان شاء اللہ جلد ہی ترجمہ کر کے تاج الفحول اکیڈمی کو بھیج دوں گا۔

ثانی الذکر کام کے لیے جو لوگ ادارے میں شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں ان سے میری درخواست ہے کہ اگر انھیں اس کے بارے میں علم ہو کہ شیخ صاحب اب اس کام کو کرنا یا کرنا چاہتے تھے تو وہ اس کی کوئی عکس کاپی بھیج دیں، ان شاء اللہ ناچیز حسب وعدہ اس کام کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ کچھ حق دوستی ادا ہو جائے۔ احباب، وابستگان اور متعقین کے لیے انھیں بہترین خراج عقیدت پیش کرنا ہوگا کہ ان کی تحریک کی شمع کو روشن رکھیں، جس سے ان کی روح کو تسکین ملتی رہے۔ □□□

☆ استاذ شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

بے مثال شہرت و مقبولیت کے مالک

مولانا شیخ اسیدالحق قادری کی شہادت علم و فن اور تحقیق و تنقید کا بہت بڑا خسارہ ہے

نوجوان عالم دین مولانا شیخ اسیدالحق عاصم القادری ازہری کی شہادت سے علم و عرفان اور تحقیق و تنقید کی دنیا سونی ہو چکی ہے۔ وہ کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے۔ دہشت گردوں کو کیا معلوم کہ وہ جس شخصیت کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں، اس سے ان کا مقصد تو پورا نہیں ہو سکتا، لیکن دنیا کے کونے کونے میں بسنے والے بے شمار لوگوں کے دل ضرور ٹوٹ جائیں گے اور علم و فن کی بستی اجڑ جائے گی۔ شیخ اسیدالحق شہید ازہری کی مختصر زندگی اور گراں قدر کارناموں کی طویل فہرست پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ:

ایں سعادت بزور بازو نیست

تائید بخشد خداے بخشندہ

۲۰۱۲ء میں عرس قادری کے موقع پر انہوں نے روزنامہ انقلاب کے تمام ایڈیشن میں خصوصی ضمیمہ شائع کروانے کا اہتمام کیا۔ عام طور پر اخبارات میں ضمیمہ شائع کرانے کا مقصد ذاتی مفادات کا حصول ہوتا ہے، لیکن انہوں نے ضمیمہ کے لیے جو مواد فراہم کیا، اس کو دیکھ کر ان کی دوراندیشی اور ملت کے لیے ان کی اعلیٰ سوچ کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ خانقاہ قادریہ بدایوں کے اکابرین کی دینی خدمات، اسلام کی تبلیغ کے لیے جامعہ ازہر مصر جیسے ادارے کے قیام کی اہمیت اور تاج انٹول اکیڈمی کے توسط سے اسلامی لٹریچر کی فراہمی پر خاص طور پر زور دیا گیا تھا۔ مذکورہ ضمیمہ کی رونمائی کے لیے راقم الحروف کو بدایوں آنے کی دعوت دی گئی۔ خانقاہ قادریہ بدایوں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ عرس کے موقع پر بھیج بھاڑ کے باوجود پر تکلف کھانے کا اہتمام اور مہمانوں کی ضیافت کے لیے انتہائی اخلاق مندراساتذہ، مہذب طلبہ اور تربیت یافتہ مریدین و متوسلین کی ایک لمبی قطار دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ مہمانوں کے استقبال، ان کی ضروریات کا خیال رکھنے اور ان کے قیام و طعام میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ نہ جانے، ان تمام نزاکتوں پر پل پل نگاہ رکھنے کے لیے افراد متعین تھے اور وقفے وقفے سے شیخ صاحب کا مہمانوں

سے پاس آ کر خیریت دریافت کرنے کا طریقہ مسکور کن تھا۔ عرس کے دوران عام طور پر انتظامیہ کی طرف سے ایسا انتظام نہیں کیا جاتا کہ نماز کے اوقات میں تمام سرگرمیاں روک کر صرف اور صرف نماز کی ادائیگی کا خیال رکھا جائے، البتہ یہ چیز ہم نے شیخ صاحب کی خانقاہ میں دیکھی۔ اذان ہونے ہی صفیں بچھ گئیں اور زائرین جن کو جہاں جگہ ملی صف بستہ ہو گئے۔ باجماعت نماز ادا کی اور خواہش مند حضرات حلقہ ذکر میں بیٹھ گئے۔ خانقاہ ہوں کا طرہ امتیاز حلقہ ذکر اور تصفیہ قلوب ہی رہا ہے، جو اب ناپید ہوتا جا رہا ہے، البتہ یہاں میں نے اس کا اہتمام دیکھا اور بغداد سے تشریف لائے خانوادہ غوث اعظم کے چشم و چراغ حضرت شیخ محمد توفیق گیلانی مدظلہ العالی کی سرپرستی میں اذکار اور اداسے زائرین فیض یاب ہوئے۔ بعد نماز عشا کا نفرنس کے دوران ادارے کے ایک طالب علم نے انتہائی دلکش انداز میں قراءت سبعہ میں قرآن کریم کی تہودت اور دوسرے نے عربی زبان اور خوبصورت عربی لہجے میں شیخ بغداد کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کر کے ہر ایک کا دل جیت لیا۔ ان تمام سرگرمیوں میں شہید بغداد شیخ اسیدالحق ازہری رحمۃ اللہ علیہ کی جہد مسلسل، اعلیٰ سوچ، تعمیری نظریہ اور ملت کے لیے مرنے کا جذبہ صاف نظر آ رہا تھا۔ بدایوں سے واپسی پر ان اثرات کا اظہار مشفق محترم شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں صاحب کے پاس کیا تو انہوں نے کہا کہ افضل یہ بہت پرانی خانقاہ ہے، یہاں کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع ہے اور یہاں تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ میں نے اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے کہ خانوادہ برکاتیہ کے تمام ارباب حل و عقد شیخ صاحب سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

چچا تو یہ ہے کہ شیخ صاحب نئی نسل کے لیے مشعل راہ تھے۔ تعلیم و تحقیق کی جس راہ کے وہ مسافر تھے، اس پر چلنے والوں کی تعداد بہت کم نظر آتی ہے۔ وہ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے تھے، جن پر بہت کم یا بالکل ہی نہیں لکھا گیا ہو۔ خیر آبادیات کے نام سے انہوں نے کتاب لکھ کر سے ایک فن کی حیثیت عطا کر دی۔ ان کی پچاس سے زائد تصنیفات اہل علم کے لیے بیش قیمت تحفہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو شکل و صورت عطا کی تھی، اس کی طرف ہر ایک کی نظر جاکر نکلتی جاتی تھی۔ وہ اخلاق کے پیکر تھے۔ وہ ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے قول و فعل میں

یکسانیت تھی۔ بڑوں کی عزت، چھوٹوں سے شفقت اور ہم عمروں کے ساتھ باہمی تعاون کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی کم عمری میں اللہ رب العزت نے انہیں جو مقبولیت عطا کی تھی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تمام مکتب فکر کے علما کے درمیان ان کی جو عزت تھی، وہ شاید ہم نوجوان نسل میں سے کسی کو حاصل نہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ دلوں کو فتح کر کے فاتح زمانہ بن چکے تھے تو شاید کسی کو اعتراض نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تمام خوبیوں کے پیچھے ان کے والد محترم حضرت شیخ سالم میاں قادری مدظلہ العالی کی تربیت، ان کی دعائیں اور ملت کے لیے ایک مجاہد تیار کرنے کا جذبہ کارفرما تھا، جس میں انہیں کامیابی ملی۔ میں دعاگوں ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں اس کا اجر عطا فرمائے اور صبر و شکر کی توفیق دے۔ شیخ صاحب شہید میرے ہم عمر تھے، اس لیے ہم بلا جھجک ان سے کسی بھی موضوع پر بحث کر لیتے تھے۔ وہ حق بات بولنے اور لکھنے سے کبھی اعراض نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے شکایتا ناچیز کے بارے میں ان سے کہا کہ افضل صاحب کی بہت بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اخبار کے دفتر میں اپنے ہم مسلک لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس پر جواباً انہوں نے کہا کہ، 'یہ تو ان کی خوبی ہے جناب! وہ اس بات سے بے حد خوش تھے کہ انقلاب چھوڑنے کے بعد ناچیز کی جگہ ان کے خانوادے کے خوش چہیں یا مین انصاری نے سنبھالی۔ یا مین انصاری نوجوان صحافی اور انقلاب دہلی کے ایڈیٹوریل انچارج ہیں۔'

مولانا اسیدالحق ازہری اپنے پیچھے بہت ساری یادگاریں چھوڑ کر گئے ہیں۔ 'جام نور' میں تقریباً ہر ماہ ان کو پڑھنے والوں کو ہمیشہ ان کی یاد ستاتی رہے گی۔ ان کی شہادت علم و حکمت اور تحقیق و تنقید کا بہت بڑا خسارہ ہے۔ جس طرح انہیں بغداد میں شہید کیا گیا، یہ ملت کا بہت بڑا المیہ اور عالم اسلام میں پھیلی انارک کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 'جام نور' کا یہ خصوصی شمارہ شہید بغداد کو صرف خراج عقیدت نہیں ہوگا، بلکہ نئی نسل کو آگے بڑھنے میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔ اس لیے کہ اس کے قارئین میں نوجوان نسل کی بڑی تعداد شامل ہے۔

□□□

پتہ: استاذ شعبہ اردو، ڈاکٹر ہری سنگھ گورنمنٹ یونیورسٹی، ساگر (ایم پی)

email: afzalmisbah@ gmail.com

ایک ممتاز اسلامی اسکالر

مولانا اسید الحق قادری برصغیر پاک و ہند میں علم و ادب کی ایک معتبر شخصیت تھے

محترم السلام علیکم! کیا آپ وہی ترازوی صاحب ہیں جن کی کتاب ”تحریک ختم نبوت سیدنا صدیق اکبر تا علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی ہے؟ یہ کتاب میری نظر سے گزری ہے، خانوادہ علمیہ پر بہت خوب کاوش ہے، میں نے حال ہی میں ایک طویل مضمون رقم بند کیا ہے، آپ کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔

۲۴ اپریل ۲۰۱۲ء کو کوشٹل میڈیا کی مشہور ویب سائٹ فیس بک پر محترم مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری شہید کا ہمارے نام یہ پہلا پیغام تھا جو آگے چل کر مزید رابطے کا سبب بنا۔ حضرت شہید سے دوسرا رابطہ ۲۹ مئی ۲۰۱۲ء کو اُس وقت ہوا جب ہم نے اپنے فیس بک پیج پر علامہ عبدالحامد بدایونی اور مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کے جون ۱۹۵۷ء کے دورہ روس سے متعلق تصاویر شیئر کیں تو علامہ اسید الحق قادری صاحب نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

جناب ترازوی صاحب ”تاثرات روس“ ہمارے کتب خانے میں موجود ہے، لیکن مجھے ایک کتاب کی تلاش ہے، ممکن ہے آپ کے پاس ہو، علامہ بدایونی اور مولانا عبدالحلیم صدیقی کے ۱۹۳۶ء میں حجاز کا سفر نامہ حامد بھائی نے لکھا تھا ”وفد حجاز کی رپورٹ“ کے نام سے یہ کتاب اگر دستیاب ہو جائے تو میں بہت ممنون ہوں گا۔“

اس کے بعد ۲۰ مارچ ۲۰۱۳ء کو حضرت شہید کا برقی پیغام ملا: السلام علیکم! ایک ضرورت کے لیے تکلیف دے رہا ہوں، تاقب بھائی سے بھی کہہ چکا ہوں، مجھے ”جے یو پی“ (جمعیت علمائے پاکستان) کی ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۷ء کے درمیان کی سالانہ رپورٹ درکار ہے، یہ غالباً ایک ساتھ شائع ہوئی ہے، دراصل ان سالوں میں جے یو پی کا ایک وفد حجاز گیا تھا اور اُس نے شاہ سعود سے ملاقات کر کے گنبد خضر اشرف کے تحفہ کا مطالبہ کیا تھا، میں

مولانا عبدالحامد بدایونی کا رسالہ ”الجواب المکثور“ شائع کر رہا ہوں، اُس کے مقدمے کے سلسلے میں مجھے معلومات درکار ہیں، اگر فرصت ہو تو اس جانب توجہ فرمائیں۔“

حسن اتفاق کہ مولانا اسید الحق قادری کی مطلوبہ دستاویزات ۱۹۵۲ء میں جے یو پی کے وفد کی رپورٹ ”تحفظ مسجد نبوی اور آثار مبارکہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہمارے ریکارڈ میں موجود تھی جو ہم نے انہیں ارسال کر دیں، آپ نے بے پناہ اظہار تشکر فرمایا اور دستاویزات کو بطور حوالہ استعمال کرنے کی اجازت طلب کی۔

اکتوبر ۲۰۱۳ء میں ہم نے اپنے فیس بک پیج پر ”فتاویٰ علماء طہور بجواز بناء الانبياء والائمة وزيارتهم عليهم السلام“ اشاعت رجب ۱۳۸۱ھ اور مبلغ اسلام علامہ عبدالحلیم صدیقی کا تقریباً ۷۰ سال قبل ۱۳۶۶ھ میں شائع ہونے والا ایک نادر عربی رسالہ جس پر اخوان المسلمین کے بانی شیخ حسن البنا کی تقریظ موجود ہے ”الفتوى النصوص في بيان الضرائن والمكوس“ کے ناسٹل پیج پر لگا تو حضرت شہید نے ان دونوں اہم رسالوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، ہم نے دونوں رسالے انہیں ارسال فرماتے ہوئے گزارش کی کہ وہ ہمارے لیے ”الفتوى النصوص في بيان الضرائن والمكوس“ کے اردو ترجمہ کا اہتمام فرمادیں، ہم اس ترجمے کو افادہ عام کے لیے پاکستان میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے بہت جلد ترجمہ مکمل کر کے ارسال کرنے کا وعدہ فرمایا، لیکن زندگی نے انہیں وعدہ وفا کرنے کی مہلت نہیں دی۔ ۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو مولانا اسید الحق کی جانب سے ملنے والا پیغام ”ہمارے ایک دوست مبلغ اسلام پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، میں نے آپ کا حوالہ دیا ہے، اگر ممکن ہو تو کچھ تعاون فرمادیں۔“

ہمارے نام حضرت کا آخری برقی مراسلہ ثابت ہوا، اور ملت اسلامیہ کا یہ نابھہ روزگار نوجوان خانوادہ بدایونی کا چشم و چراغ اور عظیم اسلامی

اسکالر ۲۴ مارچ ۲۰۱۳ء کو عراق میں دہشت گردی کا نشانہ بن کر ہمیں حیران و شگین چھوڑ گیا۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

قارئین محترم! اپریل ۲۰۱۳ء سے قبل ہمارا علامہ اسید الحق عاصم قادری سے غائبانہ تعارف تھا، جس کی بنیاد ماہنامہ ”جام نور“ میں شائع ہونے والے آپ کے علمی و تحقیقی مضامین اور مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی پر پاکستان میں شائع ہونے والی کتاب ”خیر آبادیات“ تھی، گو پاک بھارت سرحدی دیوار نے ہمیں کبھی علامہ اسید الحق قادری سے شرف ملاقات کا موقع نہیں دیا، لیکن انٹرنیٹ کی دنیا سرحدی حدود و قیود کی پابندی نہیں، آپ کہیں بھی کسی سے بھی رابطہ قائم کر سکتے ہیں، یوں میٹ کے ذریعے علامہ اسید الحق قادری سے قائم ہونے والا یہ مختصر سا تعلق ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا، ہم نے ہمیشہ اس تعلق کو اپنے لیے باعث فخر و مسرت جانا اور مجلس احباب میں ذکر کرتے ہوئے نازاں و شاداں رہے۔ علامہ اسید الحق قادری خانوادہ قادریہ بدایونی کی علمی، تہذیبی اور روحانی وراثتوں کے امین تھے، آپ حضرت مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی، تاج الحق مولانا عبد القادر بدایونی، مفتی اعظم سلاطین آصفیہ مولانا عبدالقدیر بدایونی اور حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری کے علوم و فضل کے حقیقی وارث تھے۔

صرف دس سال کے مختصر عرصے میں سو سے زائد کتابوں کی تخریج و تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدوین کا حیرت انگیز اور فقید المثال کارنامہ انجام دے ڈالا، یوں صرف ۳۸ سال کی عمر قلیل میں بزرگوں جیسے کام کرنے والے مولانا اسید الحق قادری نوجوان محقق اور اندر نگر رکھنے والے عظیم اسلامی اسکالر کے روپ میں ملت اسلامیہ میں ممتاز مقام حاصل کر چکے تھے، انہوں نے اپنے خانوادے کی علمی و تصنیفی خدمات کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے مزین کیا اور ”تاج الحقول اکیڈمی“ کے ذریعے اپنے بزرگوں کی سو سے زائد تصانیف اپنی تخریج و تفسیر اور تقدیم کے ساتھ شائع کرنے اور بعض کتابوں کو ہندی، گجراتی اور انگریزی زبانوں میں منتقل کرنے کا بھی اہتمام کیا۔ اُن کی تصنیف و تالیف میں قرآن کی سائنسی تفسیر، خامہ تلاشی، خیر آبادیات، عربی محاورات، حدیث

افتراق امت اور حدیث قدسی کو علمی و ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ اپنے خاندان کی تاریخ کی از سر نو اشاعت اور اپنے پیر خانے خانقاہ برکاتیہ مارہرہ کی تاریخ اور اکابر مارہرہ کی حیات و خدمات پر مبنی کتب کی اشاعت جدید ہے، علامہ اسید الحق نے مختلف علوم و فنون پر بھی قلم اٹھایا اور سیکڑوں تحقیقی مضامین سپرد قلم کیے، جو ماہنامہ ”جام نور“ کے صفحات کی زینت بن کر اُس کے علمی معیار میں اضافے کا سبب بنے۔

علامہ اسید الحق قادری کا شمار قرآن و حدیث پر گہری نظر رکھنے والے نوجوان علما میں ہوتا تھا، آپ علوم عقلیہ و نقلیہ پر کامل عبور رکھتے تھے، مولانا اسید الحق قادری برصغیر پاک و ہند میں نوجوان علما کے سرخیل اور نئی نسل میں علم و ادب کی ایک معتبر شخصیت تھے، آپ صحیح معنوں میں عالم دین اور اپنے آباد اجداد کی وراثتوں کے امین اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ حضرت علامہ اسید الحق قادری کی زندگی ”کم وقت میں زیادہ کام“ سے عبارت ہے، یہی وجہ ہے کہ کم عمری میں انہوں نے علمی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، علمی و ادبی حلقوں کو اُن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، زندگی اگر وفا کرتی تو وہ اور بھی محیر العقول اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیتے، مگر کاتب تقدیر کی دی ہوئی مہلت ہی اتنی تھی۔

زندگی میں ایک بار انہوں نے اس تمنا کا اظہار فرمایا تھا کہ ”جینے کے لیے مدینہ اور مرنے کے لیے بغداد پسند کرتا ہوں“، رب کعبہ کی قسم وہ کامیاب ہو گئے، اللہ کریم نے اپنے محبوب بندے کی خواہش کو رتبہ شہادت سے اس طرح بدلا کہ ملت اسلامیہ انہیں ہمیشہ ”شہید بغداد“ کے نام سے یاد رکھے گی، آج دنیائے علم و تحقیق کے اس ابھرتے ہوئے مفکر و مدبر، ممتاز محقق، تبحر عالم دین، محدث و فقیہ، قادر الکلام شاعر اور متحرک و فعال علم دوست شخصیت سے وابستہ چند متذکرہ یادیں ہمارا سرمایہ افتخار ہیں، بلاشبہ شہید علامہ اسید الحق قادری ایک عبقری شخصیت تھے، انہوں نے تلاش و جستجو کو ایک نیا رنگ دیا اور عصری تقاضوں کے مطابق تحقیق و تنقید کے نئے زوایے متعین کر کے میدان علم و ادب پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، اُن کے چلے جانے سے ملت اسلامیہ کا جو عظیم نقصان ہوا، یقیناً اُس کی تلافی کئی دہائیوں تک ممکن نہیں ہے۔ □□□

☆ ماہنامہ افق، کراچی (پاکستان)

مجلس احباب کا میر

مصر میں رضویات پر پہلی تین کتابوں کی اشاعت اسید میاں کے عطا کردہ بطور قرض پانچ سو ڈالر سے ہوئی تھی

خانوادہ عثمانیہ ہدایوں شریف کے بارے میں بچپن سے سنا کرتا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں پہلی بار اجیر شریف کے سفر میں ہدایوں شہر حاضری کا موقع ملا، مگر بڑی سرکار اور چھوٹی سرکار میں حاضری کے علاوہ مجھ جیسا معمول خالص خانقاہ قادریہ میں باریابی سے محروم رہا۔ اس کے بعد ۱۹۹۸ء میں جامعہ ازہر مصر میں تعلیم حاصل کرنے کا شرف ملا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی مئی، جون کا مہینہ تھا، دوپہر کی چٹھلائی دھوپ تھی، کھانے کے بعد تھوڑا آرام کر رہا تھا کہ میرے دوست مولانا گل محمد کشمیری آئے اور بتایا کہ میں ہدایوں خانقاہ کے شیخ کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ ہاشم سے باہر دور محلہ میں مولانا جلال رضا، مولانا آفتاب احمد اور مولانا گل محمد کے ساتھ جب حضرت شیخ سالم القادری مدظلہ العالی سے ملاقات کا شرف ملا تو حضرت نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا ”بھیا کا داخلہ ازہر میں کرانا ہے“ اسید میاں سے پہلی بار ملاقات پردیس میں ہوئی تھی، ہمدردی، اپنائیت اور غمگساری کی چمک جو آنکھوں میں جھلک رہی تھی اسے دیکھ کر وجدان بول اٹھا کہ ایسا دوست پردیس میں اللہ کی نعمت ہے۔ پھر اس کے بعد پانچ سال تک برابر قاہرہ کے قیام کے دوران آپ کے ساتھ تعلق رہا۔ اس درمیان تقریباً ہر سال آپ کے والد ماجد اور آپ کے برادر محترم مولانا عطیف میاں، محترم اکرام بھائی سے ملاقات کا شرف وہیں حاصل ہوتا۔ اسید میاں کے ساتھ تمام درگاہوں کی زیارت میں رفاقت رہی۔ طحطاہ، اسکندریہ، حمیشی، اور دسوق وغیرہ کا سفر رہا۔ ایک مرتبہ ہم پورے قافلے کے ساتھ جس میں مولانا جلال رضا صاحب، مولانا منظر الاسلام، مولانا گل محمد، مولانا آفتاب احمد اور اسید میاں شامل تھے۔ خادم جب بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ سفر میں ہوتا تو ان دوستوں کی نوازش ہوتی کہ مجھے ہی تنظیم کاری کی خدمت کا موقع ملتا۔ ہم طحطاہ کے سفر پر شام میں نکلنے والے تھے، میں نے جیسر کار کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا، میں ابھی ٹکٹ لے کر آیا تھا کہ دوستوں نے سکند

سارے طلبہ تعزیت کے لیے تشریف لائے، اسید میاں بھی تشریف لائے اور تعزیت کے بعد فرمایا کہ اپنے گھر کا فون نمبر دیجیے۔ گھر کا نمبر لے کر میرے بھائیوں سے بھی بات کی اور اس کے بعد لگا تار دو دن تشریف لائے، جب کہ ان کی رہائش گاہ سے میرا ہاشم تقریباً دس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا اور ٹی۔ بیس یا ٹیکسی کے ذریعے ہی آنا جانا تھا۔ مجھے اسید میاں سے زیادہ ملاقات کا موقع دینا شاید فطرت کو منظور تھا، کیوں کہ جس علاقے میں اسید میاں تھے اور جس علاقے میں میں تھا وہاں کوئی براہ راست سٹی بس شروع میں نہیں تھی۔ مگر ایک سال کے اندر ہی ایک نئے نمبر کی سٹی بس شروع ہو گئی، اتفاق سے انہی دنوں حضرت صاحب سجادہ حضور سالم میاں تشریف لائے تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اب تو ایک براہ راست سٹی بس بھی شروع ہو گئی تو مسکرا کر فرمایا کہ ”بھیا سے ملاقاتوں کا اتفاق زیادہ ہوگا۔“ دوستوں کے درمیان کسی ایک دوست کی الگ شناخت اور امتیازی شان ہو، ایسا کم ہوتا ہے۔ مگر اسید میاں کی شخصیت اتنی ممتاز تھی کہ وہ جس مجلس میں ہوتے تو میرے کارواں ہوتے اور جس میں حاضر نہ ہو پاتے تو سب کو آپ کا ہی انتظار ہوتا۔ اسید میاں کی ذات گرامی کتنی علم دوست تھی، اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ مولانا جلال رضا، مولانا منظر الاسلام اور مولانا گل محمد کشمیری نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے تین رسالے جو ردو قادیانیت میں ہیں، عربی ترجمہ کر کے وہاں قاہرہ سے چھپوانے کی کوشش کی، خادم علمی کاموں میں کم تنظیمی کاموں میں پیش پیش رہا، جب یہ رسالے کمپوزنگ، پروف ریڈنگ کے مراحل سے گزر چکے تو میں نے جناب الحاج سعید نوری سے رابطہ کیا۔ کوئی پانچ سو ڈالر کی ضرورت تھی تو سعید نوری صاحب نے اسید میاں کو فون کر کے درخواست کی کہ آپ حضرات وہاں اہل سنت و جماعت کے فروغ کے لیے جو بھی کام ہو سکے کریں، پیسے کی پروا نہ کریں، جلد بھیجا جائے گا۔ اسید میاں نے فوراً ہم لوگوں سے مل کر فرمایا پیسہ آجائے گا، لیکن یہ کام ابھی ہونا چاہیے، لہذا آپ نے اپنی جیب خاص سے پانچ سو ڈالر عنایت کیے اور کتاب چھپ کر منظر عام پر آ گئی۔ ہر دم آپ کسی نئے کام کو شروع کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ آپ کی یہ مختصر مگر پائیدار علمی زندگی اس کی گواہ ہے۔ آپ نے قاہرہ میں

ہم طلبہ کی ایک انجمن ”جمعية الطلبة الباحثين“ کی داغ بیل ڈالی اور الحمد للہ تمام سنی طلبہ اس دور میں ازہر میں پڑھنے والے اس سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ دوسری کتابیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کی ہی ترجمہ کر کے شائع کی گئیں۔ ایک کا نام ہے ”مقامع الحديد على خد المنطق الجديد“ اور دوسری کا نام ہے ”جزی اللہ عدوہ بپاہانہ ختم النبوة۔“ آپ کی شخصیت اتنی متوازن تھی کہ قاہرہ سے واپسی کے تقریباً دس سال ہو رہے، احمد آباد، سورت، دہلی، ممبئی اور ہدایوں کے بہت سارے تبلیغی دوروں میں اسید میاں کا ساتھ رہا مگر میں نے سفر ہوا حضر ہمیشہ آپ کو اپنے معمولات کا پابند پایا۔ اپنی شہادت سے دور و قریب بھی ناچیز کم علم سے رابطہ کیا۔ آج کل میری مصروفیات کا انہیں اتنا لحاظ تھا کہ سلام کے بعد فرماتے ”جناب! ایک منٹ لوں گا آپ کا“ اگر کئی دنوں کے بعد یہ فون ہوتا تو ناچیز عربی میں ایک آدھ منٹ تک صرف خوش آمدید کے مختلف کلمات دہراتا تو اسید میاں کے عربی ذوق کو اتنی تسکین ملتی کہ کھل کر ہنستے۔ شہادت سے صرف دو روز قبل رات کے نو بج رہے تھے اور جماعت عشا میں صرف ایک منٹ باقی تھا کہ ہلچہ نمبروں والا فون لہرایا تو میں نے اٹھایا، فرمایا: ”اسید بول رہا ہوں بغداد سے، بہت جلدی میں ہوں“، میں نے عرض کیا ”حسب معمول“ تو بٹنے اور ایک استفسار کے بعد مع السلامہ ہو گیا۔ کوئی ڈیڑھ دو منٹ کی یہ آخری گفتگو ہی ہماری آخری یادگار رہن کر رہ گئی۔

بڑوں کے لیے فخر عصر اور نسل نو کے لیے خضر عصر

علامہ اسید الحق قادری کی ملی و تحقیقی صلاحیت اور فکری بصیرت نے بڑے بڑوں کو اعتراف پر مجبور کر دیا

یوں تو اس دنیا میں سینکڑوں لوگ روزانہ آتے ہیں اور بہت سے لوگ موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جاتے ہیں، لیکن ایسی شخصیت جن سے اکابر و اصغر سکھوں کو سینکڑوں امیدیں وابستہ ہوں، جن کے علم و تحقیق کا شہرہ عام ہو، قوم و ملت اور فرد و جماعت کی اصلاح و خدمت کی سچی تصویر لگا ہوں کے سامنے ہو، پوری قوم کو جس پر نہ صرف ناز ہو بلکہ وہ بڑوں کے لیے فخر عصر اور نئی نسل کے لیے خضر عصر کی حیثیت رکھتی ہو ان کی موت کی خبر پر انسان کا ذہن شدت غم و اندوہ کے باعث بے یقینی کا شکار ہو جاتا ہے، کیا واقعی ان کا انتقال ہو گیا؟ کیا واقعی علم و عمل کی جامع شخصیت اٹھ گئی؟ کہیں یہ خبر جھوٹی تو نہیں؟ ہر طرف بے یقینی کی انتہائی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، طرح طرح کے سوال اس خبر کے بے یقینی ہونے کا تقاضا کر رہے ہوتے ہیں۔ خبر کی تصدیق پر مومن **إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ** پڑھنے کے بعد نہ صرف اس شخصیت کے ساتھ ارتحال پر یقین کر لیتا ہے بلکہ مرضی مولیٰ پر راضی برضا رہتے ہوئے ان کی مسخرت اور بلندی درجات کے لیے دعا میں مصروف ہو جاتا ہے۔

کچھ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ مورخہ ۱۲ مارچ ۲۰۱۳ء کو اُس وقت جب فاضل جلیل، محقق بے نظیر، آبروئے اہل سنت، چشم و چراغ خانوادہ عثمانیہ، ولی عہد خانقاہ قادریہ بدایوں حضرت مولانا اسید الحق عاصم القادری ازہری علیہ الرحمۃ والرضوان کے ساتھ ارتحال کی خبر ملی، اس تعلق سے راقم الحروف کے پاس سب سے پہلے محبت گرامی مولانا نیاز احمد مصباحی صاحب کافون آیا کہ مولانا اسید الحق صاحب کے تعلق سے اس طرح کی خبریں آرہی ہیں، پھر اس کے بعد تو پے درپے درجوں فون اسی خبر کی تصدیق کے لیے آئے۔ میں اس وقت ماہ نور شہرہ اپریل کے لیے انتخاب مضامین میں مصروف تھا۔ دس منٹ قبل ہی ماہ نور کے مدیر اعزازی ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی سے مضامین کے انتخاب پر گفتگو ہوئی تھی، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور اطلاع دیتے۔ میں ہر ایک کو

کی فائزنگ میں شہید ہو گئے۔ میں نے ان سے بھی یہی کہا: کیا واقعی ایسا ہے؟ انھوں نے فرمایا: ”ہاں! البتہ مجھے بھی اس خبر پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ ارشاد صاحب! جماعت اہل سنت کے لیے یہ حادثہ اس صدی کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔ آپ کو میں بتا نہیں سکتا کہ اس سانحے سے جماعت کا عالمی و ملکی سطح پر کس قدر نقصان ہوا ہے۔ اسید صاحب نئی نسل کے نمائندہ عالم اور ترجمان تھے، ان کے چلے جانے سے جماعت اہل سنت اپنے ایک مخلص اور جامع الصفات شخصیت سے محروم ہو گئی۔“ چشتی صاحب کا لہجہ نہایت غمناک و نلناک تھا اس لیے میرے بھی دل کی دھڑکن تیز ہونی شروع ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ پیروں تلے زمین کھسک گئی ہو۔

بلاشبہ حضرت مولانا اسید الحق قادری کی شخصیت اس دورِ قحط الرجال میں جماعت اہل سنت کے لیے ایک اصول سرمایہ تھی، ان کا علم، فکر، ذہانت، استحضار علمی، تحقیقی صلاحیت، فکری بصیرت، علوم اسلامیہ خصوصاً علم حدیث و تفسیر میں اختصاص و کمال، مختلف زبان و ادب پر مہارت ان کی شخصیت کے ایسے درخشاں پہلو تھے جس کا اعتراف نہایت مختصر عرصے میں بڑے بڑے اصحابِ علم و کمال نے کیا تھا اور آنے والے وقت میں اُن کے کمالِ علم و تحقیق کی بشارت دی تھی۔

آپ سے میری شناسائی جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے زمانہ طالب علمی ہی میں پہلی بار ماہنامہ جام نور کے ذریعے حدیث افتراقی امت: تحقیقی مطالعہ کے ضمن میں ہوئی۔ اس اہم موضوع پر آپ کا یہ تحقیقی مقالہ غالباً تین قسطوں میں شائع ہوا تھا جو بعد میں مستقل کتاب کی شکل میں بھی تاج الحول اکیڈمی بدایوں سے شائع ہوا۔ یہ مضمون آپ کی علمی و تحقیقی شایستگی کا نقشِ اول ثابت ہوا۔ مختلف حلقوں سے اس پر مصنف کو داد و تحیق ملی، کچھ حضرات نے اختلاف رائے بھی کیا۔ ہمارے احباب کے درمیان اس کا بڑا دلچسپ ذکر رہا۔ راقم الحروف نے اسی وقت جام نور کے اظہار خیالات کے کالم میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ساتھ ہی ہم حدیث میں آپ کی تحقیقی کاوشوں پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک معروف حدیث ”مَنْ شَبَّهَ بِلِقْمِ فُہو مِنْہُمْ“ پر ایک تفصیلی و تحقیقی تحریر لکھنے کی فرمائش بھی کی تھی۔ خیر اس کے بعد آپ کی تحریروں کو پڑھنے کا ایسا اشتیاق پیدا ہوا کہ ہر ماہ بطور خاص آپ کی تحریروں پر ہوتا

اور استفادہ کرتا رہا۔
”قرآن کریم کی سائنسی تفسیر“، محافل میلاد میں موضوع روایات: ایک علمی مطالعہ، اسلاف و اکابر کی کتابوں میں تحریف: ایک تحقیقی جائزہ، جیسی تحریریں قارئین کے لیے نہایت دلچسپی کے موضوعات ثابت ہوئے، ہمارے حلقہ احباب میں آپ کی علمی صلاحیت، تحقیقی بصیرت اور فنی لیاقت کا پرزور تذکرہ رہا۔ کبھی لوگ آپ کے انتخاب موضوعات اور چٹختی فکر و قلم پر داد و تحسین دیتے نظر آتے۔

فراغت کے تیسرے سال (مارچ ۲۰۰۷ء) دارالقلم دہلی حاضر ہوا۔ اسی سال دارالقلم ہی میں آپ کی پہلی بار زیارت ہوئی۔ علمی و تحقیقی صلاحیت کا تو پہلے سے معترف تھا، جب آپ کے حسین و جمیل نورانی چہرے کی زیارت ہوئی اور عالمانہ رکھ رکھاؤ کو دیکھا تو ایک خوشگوار مسرت ہوئی کہ انھوں نے اپنے خاندانی ورثے میں علم و فضل کی وراثت کے ساتھ عالمانہ وقار بھی پایا ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں کئی سال بڑے تھے اور میں ان کی علمیت کا دل سے قائل تھا، جیسے ہی میری ان سے ملاقات ہوئی، کسی نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: یہ بھی ڈیٹان صاحب، نیاز مصباحی، ظفر برکاتی وغیرہ کے ہم درس ہیں۔ اسی درمیان میں نے ازراہ عقیدت و احترام ان سے مصافحہ کے ساتھ ان کی دست بوسی کے لیے جھکا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے محبت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا: ارشاد صاحب! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ کام کی جانب توجہ دیں۔ یہ ان کا بڑا کمین تھا وہ نہ میں تو نہ صرف ان کی علمی صلاحیتوں کا قائل تھا بلکہ دل سے ان کی عظمتوں کا معترف بھی۔ اس کے بعد متعدد مرتبہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ جب جب آپ سے ملاقات ہوئی، آپ کی علم و دینی، اصغر نوازی، حسن اخلاق اور جماعت کے تئیں مثبت پیش قدمی کے جذبات سے آپ کے ذہن و فکر کو لبریز پایا۔ علم و فن کے وہ میدان جن کی جانب عام طور سے توجہ نہیں دی جاتی، انھوں نے اپنے لیے ہمیشہ ایسے ہی نئے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب فرمایا اور اپنے احباب کو بھی اسی کی ترغیب دی۔

ایک مجلس میں آپ نے راقم الحروف سے اس کا براہ راست اظہار بھی کیا تھا کہ ارشاد صاحب! بہت سارے موضوعات ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ موضوع کے تعلق سے ہمیشہ یہ پہلو ملحوظ رکھئے

علامہ بدایونی کی علمی سخاوت بے مثال تھی

”پتہ نہیں لوگ ملی خزانے کو اپنی میراث کیوں سمجھتے ہیں، وہ تو اہل علم کا سرمایہ ہے“

اناللہ وانا الیہ راجعون

پھر میں نے ثاقب رضا قادری اور ”فیس بک“ سے جڑے لوگوں تک یہ افسوسناک خبر پہنچانے کی کوشش کی۔ جہاں تک ثاقب بھائی کا ماننا ہے پاکستان میں اکثر لوگوں کو میرے بتانے پر ہی خبر ہوئی اور پھر نفس اسلام، پاکستان اور لاہور، کراچی، ہندوستان کے اکثر مقامات سے خبر کی تصدیق کے لیے احقر کے پاس فون آئے اور وہ دن اسی مصروفیت میں کٹ گیا۔ رات ہوئی تو ذہن میں رہ رہ کے شیخ صاحب کی باتیں گردش کرنے لگیں، وہ مجھ سے کبھی کبھی کافی دیر باتیں کیا کرتے تھے۔ ابھی کی تو بات ہے۔ جب میں نے اپنی کتاب ”فتاویٰ اتر اٹھنڈ“ اور ”رکعات نماز“ طباعت سے پہلے ہی میٹ پرائیڈ کر دی تو ایک دن فون آیا، بہت دیر تک بات ہوتی رہی اور اسی دوران پوچھ لیا کہ کتاب کیوں نہیں چھپوا رہے ہو؟ میں نے کہا: ابھی مکمل رقم کا انتظام نہیں ہوا ہے، فتاویٰ اتر اٹھنڈ کے لیے رقم ہے مگر رکعات والی کتاب کی گنجائش نہیں نکل پارہی ہے، تو فرمایا: ”کتاب چھپواؤ جو خرچ ہوگا میں دوں گا، مگر بس ایک درخواست ہے۔“ میں نے سوچا شاید ناسل پر ناشر کے حوالے سے اپنی اکیڈمی کا نام لکھوانے کو کہیں گے، مگر حیرت ہوئی مجھے یہ سن کر جب انھوں نے کہا: ”میرا نام نہ ٹوک قلم پر آئے اور نہ ٹوک زبان پر“ میں نے سوچا: یا اللہ! ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو دین کا کام خالص دین کے لیے ہی کرتے ہیں؟ یقیناً اس جیلے سے خوشی کی ایک لہر دل میں دوڑ گئی اور اس جیلے سے بزرگوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ خیر خواہ بک ڈپو سے کتاب چھپی اور عرس اعلیٰ حضرت میں اس کا اجرا بھی ہوا۔ میں نے بریلی پہنچ کر اپنی یہ دونوں کتابیں جو مجھے اسی دن بریلی میں ملی تھیں اپنے بہنوئی صاحب کے ہاتھوں شیخ صاحب کو بھیج دیں، میں جلد الرضا میں تھا کہ اچانک فون آیا: کہاں ہیں؟ میں نے کہا ”جلد الرضا“ میں ہوں، کوئی حکم؟ کہا: نہیں بس مبارک باد کے لیے فون کیا تھا۔ مگر افسوس کہ کتاب

بلاشبہ موت سے فرار نہیں الموت قدح کل نفس شاربوہا مگر شہید بارگاہ غوثیت مولانا شیخ اسید الحق قادری بدایونی کی خوش نصیبی ہے کہ موت کا جام شہادت کی شکل میں نوش فرما کر حیات ابدی کے حق دار ہو گئے اور وہ بھی غوث پاک کے قدموں میں جو کہ زندگی اور موت دونوں کی مقبولیت کی ضمانت ہے۔ شہید موصوف کا اچانک اس طرح داغ مفارقت دے جانا یقیناً ملت کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ابھی تو کچھ کر دکھانے کا دور شروع ہوا تھا، مگر قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ کیا کیا سوچ رکھا تھا: یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے، مگر سب کچھ ادھورا چھوڑ چھاڑ کے اچانک ہی رخصت ہو گئے۔

شہید موصوف احقر سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ انہیں اپنے بڑے پان کا خوب احساس تھا، وہ جانتے تھے کہ خوردنوازی عظیم دولت ہوتی ہے۔ ہفتہ عشرے میں بات ہوتی رہتی تھی، کبھی وہ فون کر دیتے، کبھی میں۔ کبھی میں استصواب رائے کے لیے فون کرتا، کبھی وہ اظہار خیالات کے لیے فون کرتے۔ بغداد شریف جانے سے قریب پندرہ روز قبل مجھ سے شیریشا اہل سنت کی کتاب ”دواغ الخیر“ کا مطالبہ کیا، میرے پاس نہ تھی، میں نے میثم عباس قادری (پاکستان) سے کہا، انہوں نے وہ کتاب مجھے اسکین کرا کے میل کی۔ بغداد روانہ ہونے سے دو روز قبل فون پر میں نے موصوف کو بتایا کہ میں نے آپ کو کتاب میل کر دی ہے، دیکھ میں۔ شکر یہ کہ ساتھ فرمایا کہ اب تو بغداد سے آکر دیکھوں گا، میں نے کہا کہ تشریف لے جا رہے ہیں؟ فرمایا پرسوں۔ میں نے کہا کہ اگر وقت مل جائے تو خصوصاً فقیر کے لیے دعا ضرور فرمادیجیے گا، کہا: ضرور ان شاء اللہ۔

اس کے بعد وہ تو نہ آئے، مگر اچانک ایک فون آیا کہ شیخ صاحب کی شہادت ہو گئی۔ بخدا ایسا محسوس ہوا کہ پیروں تلے زمین کھسک گئی ہو، یقین نہ آیا، سوچا افواہ ہوگی، مگر چند منٹوں میں دسیوں فون آگئے کہ اب اس حادثہ جا لاکھ پر یقین کیے بغیر چارہ بھی نہ تھا، برجستہ منہ سے نکلا:

سے نوازا۔ اسی طرح عصر حاضر کے معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی صاحب نے بھی کئی مجلسوں میں براہ راست شیخ صاحب کی عظمت و صلاحیت کا اظہار کیا۔ نئی نسل اور موجودہ اکابر و مشائخ و دانشوران قوم کو ان سے بے پناہ امیدیں وابستہ تھیں۔

جماعتی فلاح و بہبود، امت کی اصلاح و تذکیر اور خانقاہ قادریہ کی علمی وراثت کے منظر عام پر لانے نیز مدرسہ قادریہ کی تعمیر و ترقی کے لیے جو وسیع خاک انھوں نے بنایا تھا، سارے کام درمیان میں ہی چھوڑ کر وہ اپنے پیچھے سمجھوں کو رقم زدہ اور سوگوار کر کے خود بہت جلد آستانہ غوثی اعظم میں آسودہ خاک ہو گئے۔ ان کثیر الجہات منصوبے کی تکمیل اور اس کے لیے شیخ صاحب جیسی موزوں شخصیت کا جب تصور آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، جانا تو ہر ایک کو ہے لیکن وہ اتنی جلدی ہم لوگوں سے رخصت ہو جائیں گے یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ ابھی تو انھیں بہت سارے منصوبے و عزائم کی تکمیل کرنی تھی، لیکن مرضی مولیٰ کے آگے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔ یہ اپنے آپ میں ہم گد گاروں کے لیے تسلی بخش ہے کہ دنیا میں ان سے کسی قدر ہمارا بھی رشتہ محبت و عقیدت استوار تھا۔ شیخ صاحب آپ چلے تو مجھے لیکن آپ ہمیں ہمیشہ یاد آئیں گے۔ آپ کی وہ بات بھی ہم بھی نہیں بھول سکتے کہ ارشاد صاحب! کام کی جانب توجہ دیجیے، دنیا میں وہی لوگ یاد رکھے جاتے ہیں جو اپنے پیچھے پائیدار علمی سرمایہ چھوڑ کر جاتے ہیں۔ ورنہ کتنے انسان ہیں جنہیں زمانے نے یاد رکھا ہے۔ ہمیشہ کام اور صرف کام پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم آپ کی یہ بات بھی کبھی نہیں بھول سکتے کہ کام ہی انسان کو بڑا بناتا ہے، کوئی ماں کے پیٹ سے بڑا بن کر نہیں آتا۔

شیخ صاحب کی شخصیت اس اعتبار سے بھی اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز تھی کہ ان کا اخلاق بہت بلند تھا۔ بڑوں کے سامنے اُن کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت آج کے اس اخلاق سوز ماحول میں اسلاف کی یاد دلاتا تھا۔ کون تھا جو آپ کی شخصیت سے مانوس اور خوش نہیں تھا۔ ہر کسی کے دل میں ان کی علمی عظمت اور بلندی اخلاق کا سکھ بیٹھا ہوا تھا اور ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ ایک عظیم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اپنے آبا و اجداد کے نچے علمی وراثت ہونے کے ساتھ ساتھ عظمت کردار اور بلندی اخلاق کے بھی وارث تھے۔ ————— بقیہ صفحہ 206 پر دیکھیں

کہ وہ ایسا گوشہ ہو جس پر کام کرنے کی ضرورت ہو، ساتھ ہی یہ بھی دیکھیے کہ اس موضوع پر کام کی افادیت کیا ہے۔ ان چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جب آپ کوئی تحریر قلم بند کریں گے تو ضرور اس کی پذیرائی ہوگی۔ میں نے ہمیشہ ان دونوں پہلوؤں کو لازم پکڑ لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت تک قلم نہیں اٹھاتا جب تک موضوع کی جدت اور قوم و ملت کے لیے اس کی افادیت کا مجھے یقین نہیں ہو جاتا۔ ابھی حال ہی کی ایک ملاقات میں مولانا خوشتر نورانی صاحب کے استفسار پر کہ ابھی کون سا کام زیر تکمیل ہے؟ انھوں نے فرمایا تھا کہ ”امثال قرآنی“ پر کام کر رہا ہوں۔ اس موضوع پر کام کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ اس موضوع پر سوائے علامہ ابن تیمیہ کی ایک کتاب جو عربی زبان میں ہے، دوسری کوئی کتاب میری نظر سے اب تک نہیں گزری ہے۔ اس موضوع پر مواد کی دستیابی ہو گئی ہے، ان شاء اللہ جلد ہی اس پر میری کتاب آ رہی ہے۔

دنیا میں بہت سے باصلاحیت اور قابل کار لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی کا نہ تو کوئی ہدف ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی نصب العین۔ وہ زندگی کو یوں ہی بے مقصد گزار دیتے ہیں۔ لیکن شیخ صاحب کی شخصیت ان عظیم شخصیات میں سے تھی جن کی زندگی کا واضح لائحہ عمل تھا۔ انھوں نے زندگی گزارنے کے لیے مضبوط اور شگوش حکمت عملی پر مشتمل اپنا ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا، جس پر وہ مضبوطی کے ساتھ قائم تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو پوری مستعدی کے ساتھ اسی شاہراہ پر لگا رکھا تھا۔

۲۰۰۴ء سے اب تک کے مختصر عرصے میں علمی و تحقیقی، فکری و تنقیدی، دعوتی و تبلیغی اور تحریری و تنظیمی مختلف جہات میں انھوں نے اپنی خدمات و کارنامے کے جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، وہ ان کی اقبال مندی اور جامع کمالات حیثیت کو بتانے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بلاشبہ خاندانہ قادریہ بدایوں کی آٹھ سو سالہ علمی و روحانی تاریخ کے سچے حامل و امین تھے۔ اپنے خاندانہ کی باکمال علمی و روحانی تاریخ کے عہد حاضر میں بھی تصویر تھے، جس کا اعتراف نہ صرف ان کے ہم عصروں نے کیا بلکہ اس عہد کے اکابر و مشائخ نے بھی ان کے اس امتیازی وصف کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور دعاؤں و پزیرائیوں سے سرفراز کیا۔

مولانا یسین اختر مصباحی صاحب نے متعدد مجلسوں میں راقم سے شیخ صاحب کی علمی و تحقیقی اور فکری بصیرت پر بڑے خوشگوار تاثرات

خانوادہ عثمانی کے امتیازات و کمالات کا سچا جائشیں

علامہ بدایونی اپنے خاندانی رواجوں کے امین تھے، تہمتی ہوئی ریت اور ملتی ہوئی زمین بھی ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی

۴ مارچ ۲۰۱۳ء کی شام بعد نماز مغرب موبائل کی گھنٹی بجتی ہے، میں نے موبائل رسپونڈ کیا، مولانا محمد طفیل مصباحی نائب مدیر ”ماہنامہ اشرفیہ“ مبارک پور بول رہے تھے، انہوں نے پوچھا: کیا بدایوں میں سب خیریت ہے؟ میں نے کہا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ پھر انہوں نے کہا: میں نے سنا ہے بغداد شریف میں گولی لگنے کے سبب مولانا اسید الحق شہید ہو گئے؟

میں نے کہا: آپ کو یہ اطلاع کہاں سے ملی؟ مولانا طفیل نے جواب دیا، پچھونڈ شریف سے۔ اتنی بات سنتے ہی میں شش و پنج میں پڑ گیا اور میں نے مولانا سے کہا: میں ابھی معصوم کرتا ہوں۔

میں اپنے گھر سے سیدھا مدرسہ عالیہ قادریہ کے پرنسپل جناب، سر حنیف صاحب کے گھر پہنچا۔ انہیں میں نے روہا نسودیکھا اور چہرے پر طاری مایوسی کے اثرات۔ اس کے فوراً ہی بعد پرنسپل صاحب بھی آستانہ عالیہ قادریہ پہنچ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی پہنچ گیا۔ دیکھا تو سڑک سے آستانے تک گلی بھری ہوئی تھی۔ مدرسہ کا محکمہ، مسجد کا آئین اور آستانہ کچھ کچھ بھرا ہوا تھا، جو سنسنی دہلا آتا، شہر کی تمام دوکانیں بند ہو گئیں، سڑکیں ویران۔ اس طرح پورا بدایوں خاموشی کے آغوش میں گھل گیا۔ ہر ایک کے من میں ایک ہی سوال تھا، ایسا کیسے ہوا؟ وہ تو ایسے نہ تھے؟ انہوں نے روہنا سیکھا ہی نہ تھا، آج تک وہ ہم سے روٹھے نہیں، تو پھر آج کیسے روٹھ گئے؟ یہ وہ باتیں تھیں جنہیں ہر ایک کی خاموشی رہاں بول رہی تھیں۔

ہر ایک کی خاموشی کیوں ناگوار ہو؟ کہ جانے والا کوئی معمولی آدمی نہ تھا، بلکہ وہ ایک اچھا انسان تھا، خوبیوں اور بے پناہ خصوصیات کا حامل تھا، اہل بدایوں کے لیے قابل رشک، اپنے خاندان کے لیے باعث فخر و ناز تھا، وہ بدایوں کے تھے اور بدایوں ان کا تھا، ان کے دل میں بدایوں کے لیے جو احساس تھا، بدایوں والوں کے دلوں میں بھی ٹھیک وہی احساس تھا، ان کے آنے سے بدایوں والے خوش تھے اور بہت خوش تھے، ان کے چہروں سے ایسا محسوس ہوتا جیسے انہیں کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہو اور جب شیخ اسید الحق قادری اہل بدایوں کے درمیاں ہوتے تو ان کے چہرے کی گفتگو ہمیں یہ پیغام دیتی تھی:

میں جن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

مولانا اسید الحق اپنے خاندانی روایتوں کے پاسدار، اپنے بزرگوں کی خصوصیات، کمالات اور امتیازات کے امین تھے۔ ان کی ذات میں جو صلاحیتیں، استعدادیں پائی جاتی تھیں وہ سب انہیں ورثے میں ملی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ خاندان میں جو بچہ آتا ہے وہ اپنے ابا و اجداد کا سر بستہ راز ہوتا ہے، ان کی خوبیوں اور جاہ و جلال کا امین ہوتا ہے، بظاہر بچے کی ذات و فطرت سادہ ہوتی ہے، مگر جو دانشور ہوتا ہے جس کے پاس دیدہ بینا ہوا کرتا ہے وہ اس سادہ سی ذات میں بھی جن کی رعنائیوں اور گلشن کی بہاروں کو دیکھ لیتا ہے۔

جامع از ہر مصر سے آنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو فراموش نہیں کیا، بلکہ انہوں نے اپنے کردار و عمل کو اپنی فکری صلاحیتوں کا آئینہ دار بنا دیا، جہاں تک حوصلے کی بات ہے اس بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے حوصلے بلند تھے، ان کے عزائم میں بڑی پختگی پائی جاتی تھی، کام کتنا ہی مشکل اور کنکھن کیوں نہ ہو، انہوں نے اسے بھی بڑی خوبصورتی اور سلیقہ مندی کے ساتھ انجام دیا، تہمتی ہوئی ریت، جستی ہوئی زمیں اور دھنسا ہوا دلدل ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکا۔ انہوں نے کئی ایک ملاقات میں فرمایا تھا:

مولانا امیر سے سامنے بہت سے کام ہیں اور دشواریاں بھی بہت زیادہ ہیں۔ میں نے عرض کیا: حوصلہ بلند رکھیں، آپ تنہا نہیں ہیں، آپ

ٹھیک ہے۔ پھر ایک بار میں نے فون کیا تو بولے کسی کو بھیج دو، میں نے اپنے ایک عزیز کو بھیج دیا، موصوف نے ”تختہ حنفیہ“ کی ساری فائلیں جس میں اکثر بوسیدہ حالت میں تھیں، مجھے روانہ فرمادیں، میں نے ان فائلوں سے استفادہ کیا، کاپی کیا اور حسب اجازت ڈبل کاپی سے ایک عدد خود کے لیے رکھا اور سب کو مبینہ اور سال کے اعتبار سے ترسیب دیا، جلد سازی کرائی اور پھر واپس بھیج دی۔ بہت خوش ہوئے کہ آپ نے انہیں نئی جان بخشی ہے، میں نے کہا: نہیں، جب میں ان فائلوں سے استفادہ کر رہی رہا تھا تو میرا حق تھا کہ انہیں ترسیب دے کر انہیں محفوظ رکروں۔ خیر اس طرح کی دریافتی شاید کہیں نظر آئے۔

میں نے کبھی پانچ سال پہلے لائبریری میں ایک کتاب ”دافع الفساد عن مراد آباد“ تلاش کی، نہیں ملی۔ میرے ساتھ موصوف نے بھی ڈھونڈی، نہیں ملی۔ میں چلا آیا اور بہت سے لوگوں سے معلوم کی، ڈھونڈنے کی کافی کوشش کی، مگر نہیں ملی، آخر مایوس ہو گیا، اعلیٰ حضرت اور تھانوی کے درمیان جو مناظرہ ۱۹۱۱ء میں طے پایا، اس کی مکمل روداد لکھ رہا تھا، اس لیے وہ رسالہ مجھے درکار تھا۔ خیر نہیں ملا، کام وہیں رک گیا۔ ابھی آٹھ دس ماہ قبل دن میں دس بجے فون آیا، میں اس وقت سوتا ہوں، رات کو جاگنے کے سبب۔ اس لیے آواز پہچان نہ سکا، تعارف کے بعد میں نے معذرت پیش کی کہ نیند میں تھا، پہچان نہ سکا، فرمایا کوئی بات نہیں آپ سو جائیں بعد میں بات کرتا ہوں، میں نے کہا: نہیں، فرمائیں اب جاگ چکا ہوں، فرمایا کہ کبھی آپ نے مجھ سے ”دافع الفساد“ کا ذکر کیا تھا، کہ وہ کتاب مل گئی آپ کو؟ میں نے کہا ابھی تک نہیں۔ فرمایا: مجھے مل گئی ہے اور شام تک اسکیں کرا کے میل کر دوں گا، میں نے شکریہ ادا کیا اور شام کو دیکھا تو وہ رسالہ میرے میل ان ہاؤس میں موجود تھا۔

ایسی بے شمار ان کی سخاوتیں اور کرم فرمائیاں میرے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ کتمان علم کی حرمت سے آگاہ ہونے کے باوجود لوگ کتمان علم سے نہیں چوکتے مگر اللہ درجات بلند فرمائے شیخ موصوف کے کہ کبھی کتمان علم نہیں کیا۔ اگر ہوا تو بھی ”نا“ نہیں کہا۔ کہا کرتے تھے کہ ”چہ نہیں لوگ علمی خزانے کو اپنی میراث کیوں سمجھتے ہیں، وہ تو اہل علم کا سرمایہ ہے، انہیں اس سے استفادے سے روکنا سراسر نا انصافی ہے۔“

بقیہ صفحہ 238 ملاحظہ کریں

شایان شان نہیں چھپی، ہماری کتاب ”اکمل التاریخ“ کا بھی یہی حال ہوا اور آپ کی اس کتاب کا بھی۔ میں نے کہا حضرت کتاب چھپ گئی یہی بہت ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ شایان شان چھپ جائے گی۔ دعا میں یاد رکھیں، آج اس کا اجرا کرانے کا ارادہ ہے، حضور تاج الشریعہ کے اسٹیج پر، فرمایا: بہت بہتر ہوگا اللہ کرم فرمائے۔ اگر نگرالہ آنا ہو تو ضرور تشریف لائیں، فقیر نے ٹھیک ہے کہہ کر اجازت طلب کی اور سلام۔

اور جب عرس اعلیٰ حضرت سے فارغ ہو کر میں نگرالہ پہنچا تو میں نے فون کیا کہ آج آؤں؟ فرمایا آجائے، میں پہنچا، نیچے کمرے میں آپ کے ساتھ پچھونڈ شریف کے ایک بزرگوار تشریف فرما تھے، ظہر سے عصر تک باتیں ہوئیں۔ یہاں ان ہاتوں کا اظہار مناسب نہیں اور پھر اس کے بعد میں گھر آ گیا اور پھر کاشی پور۔ اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی ہاں بات اکثر ہوتی رہی۔ میں نے کبھی کوئی مطالبہ کیا، لفظی میں جواب نہیں پایا۔

میں نے ایک دن فون کیا کہ مجھے ”اہل فقہ“ اخبار درکار ہے، فرمایا: بتائیں میں کیا کروں؟ میں نے کہا میں کسی بندے کو بھیجتا ہوں، کہا بھیج دو، میں نے اپنے ایک عزیز کو بھیجا اور وہاں سے اخبار کی دس سال کی فائلیں کاشی پور منگوا لیں۔ یہ علمی سخاوت کی بہت بڑی مثال ہے، ورنہ میں نے ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو دیکھا، کسی اخبار یا نادر رسالہ کی زیارت بھی نہیں کراتے، دینا تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ علمی سخاوت انہیں اپنے معاصرین پر فوقیت دیتی ہوئی نظر آتی۔ خیر میں نے ان اخبارات سے استفادہ کیا، نئی جلد سازی کرائی اور قریب تین چار ماہ کے بعد بدایوں روانہ کیوں اور حضرت کا شکریہ ادا کیا۔ ہاں ایک بات اور میں نے موصوف کو فون کیا کہ اخبار کے کچھ پرچے تین تین چار عدد ہیں تو جوا ہا فرمایا اگر دو دو بھی ہوں تب بھی آپ کو مکمل اختیار ہے کہ آپ ایک ایک کاپی اپنے لیے ہماری جانب سے رکھ لیں۔ میں نے شکریہ کہا تو بولے اس میں شکریہ کی کیا بات ہے؟ میری کوئی چیز آپ کے کام آجائے اس سے بڑھ کر بھلا کیا خوشی ہوگی؟ جب میں نے اعلیٰ حضرت کے ایک نایاب فتویٰ پر کام کیا، حاشیہ تخریج، تقدیم کے بعد اسے ”انہیائے کرام گناہ سے پاک ہیں“ کے نام سے چھپوایا تو حضرت کو پیش کیا، تو فرمایا کہ ”اعلیٰ حضرت کے بہت سے فتوے تختہ حنفیہ میں ہیں، آپ ان پر بھی کام کرو۔“ میں نے کہا کہ کیسے ملیں گے؟ تو فرمایا: ”ہم دیں گے، تھوڑا وقت دے دو۔“ میں نے کہا:

● عالم ربانی ● 232 ● اپریل ۲۰۱۳ء ●

● عالم ربانی ● 233 ● اپریل ۲۰۱۳ء ●

کے ساتھ آپ کے بزرگوں کی دعائیں ہیں، ان کے فیوض و برکات ہیں، کوئی ان کا کام کرتا نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنا کام کسی سے کروالیا کرتے ہیں اور پھر آپ تو خود ان کے اپنے خون ہیں، تنہائی کا احساس کیوں کرتے ہیں؟ اپنے بزرگوں کے تئیں اسی اذعان و یقین نے ان کے اس شوق اور عزم معصوم کو میسر کیا اور شیخ صاحب آگے بڑھتے گئے اور اس قدر آگے بڑھے کہ کبھی پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ماحول کی تشنگی اور فضا کی دلکشی کو دیکھتے ہوئے میں نے عرض کیا:

شیخ صاحب! مدرسہ شمس العلوم بھی آپ کا اپنا ادارہ ہے، یہ ادارہ بھی آپ کی توجہ کا مستحق ہے، وار الاقامہ نہ ہونے کے سبب طلبہ نہیں آتے ہیں اور اس کا برا اثر تعلیم پر بھی پڑتا ہے۔ اگر یہاں بھی طلبہ کے رہنے اور خورد و نوش کا انتظام ہو جائے تو اچھا ہوگا۔ آپ نے فرمایا، یہ بھی میرے منصوبے کا ایک حصہ ہے، دعا فرمائیں۔

جہاں ایسے حالات ہوں، شیخ صاحب کے جانے کے غم سے کوئی نجات کیسے پاسکتا ہے؟ وہ اپنے پیچھے ایسے آثار و عکوس چھوڑ گئے ہیں کہ ہر پل ان کی یاد آتی رہے گی اور ان کے لبوں کی مسکان برسوں قلب و دماغ میں نور افشانی کرتی رہے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ارباب فکر چیزوں کی خوبصورتی، دلکشی اور ان کی رعنائیوں کو دیکھتے ہیں، ان کے بنانے والے کے جمال و کمال کے گہرے مطالعے میں کھو جایا کرتے ہیں، اس لیے کہ مصنوعات میں کچھ ایسی معنویت، جذب و کشش ہوتی ہے جن سے ذہن کا تپاؤ نہیں سے کہیں تک جا پہنچتا ہے، شیخ صاحب نے کیا نہیں کیا؟ انہوں نے اس قدر کیا کہ شاید ہی کوئی اتنا کر سکتا ہو؟ ان کی کرشماتی صلاحیتوں کی نمود کسی ایک جہت میں نہیں پائی جاتی ہے بلکہ مختلف جہتوں میں پھیلی ہوئی ہے، یہ نمود بھی کوئی سادہ نمود نہیں ہے، غور سے دیکھئے تو اس میں جدت طرازی، نئی آب و تاب اور جدید زمانے کی جھلک بھی پائی جاتی ہے، یہی وہ جھلک ہوتی ہے جس کے سبب شخصیت زندہ رہتی ہے، کارکردگی یادوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جہاں تک زندہ شخصیتوں کے رہنے کی بات ہے؟ تو انہیں تلاش کرنا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، صرف کامل توجہ اور گہری فکر سے کام لینے کی حاجت ہوتی ہے نہ روشنی پردوں میں رہتی ہے اور نہ خوشبوؤں کو پایہ زنجیر کیا جاسکتا ہے۔

مدرسہ عالیہ قادریہ: سب سے اچھا کام وہ ہوتا ہے جو صحرا و دکن میں اجالا پھیلا دیتا ہے اور پیاپلوں میں کیف و سرور کی خوشگوار فضا قائم کر دیتا ہے اور بے زباں پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شیخ صاحب نے کچھ اسی طرح کے کاموں کو انجام دیا ہے، مثلاً:

الف: مدرسہ عالیہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ
ب: نظام تعلیم میں زبردست انقلاب
ج: نصاب تعلیم میں طلبہ کی نفسیات اور سائنسی دور کے تقاضوں میں تال میل۔

د: طلبہ کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے نظام میں انفرادیت
ہ: قابل ترین اساتذہ کا انتخاب

یہی وہ انداز کارکردگی ہوتا ہے جس کے سبب بے زباں لوگوں کو بھی زباں مل جاتی ہے، انہوں نے اپنے حسن انتظام سے اہل علم و فن اور ارباب فکر و دانش کی ایسی ٹیم تیار کر لی جس کے سبب غیروں کے محتاج ہونے سے محفوظ ہو گئے اور اپنے آپ میں خواتمادی پیدا کر لی، ان کی یہی خود اعتمادی رشک خود اعتمادیوں ہے۔

خانقاہ عالیہ قادریہ: ہندوستان میں بہت سی خانقاہیں ہیں، مگر شیخ صاحب نے اپنے والد گرامی کی سرپرستی میں اپنی خانقاہ کو ان سنتوں میں مائل بہ سفر کر دیا جہاں سے انفرادیت کا سراغ ملتا ہے اور بروں کو اچھا بنایا جاتا ہے۔ شیخ صاحب نے پہلے پہل یہ محسوس کیا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ خانقاہوں سے علم اٹھتا جا رہا ہے اور شہزادگان بے علم ہوتے جا رہے ہیں؟ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں کچھ اسی طرح کے اسباب و علل کی تلاش کی تھی۔ یہ مضمون کوئی اور لکھتا تو یہ باعث حیرت نہیں ہوتا، مگر خود ایک مقدس خانقاہ کے شہزادہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے یہ مضمون لکھ کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

عوامی رابطے: کہا جاتا ہے: چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے، یہ ایک محاورہ ہے اور برسوں کا تجربہ یہ ہے لیکن مولانا اسید الحق قادری نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی بنیاد پر یہ کہا جائے۔ اجالوں کا مسافر اپنا پہلا قدم اندھیروں میں رکھتا ہے، انہوں نے اپنے آپ کو خانقاہ اور مدرسے کی چار دیواریوں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ عوام کے رابطے میں بھی آئے اور انہوں نے اہل بدایوں کے لیے بہت کچھ کیا، مثلاً:

● ربيع الاول کے موقع پر جامع مسجد میں سیرت کے موضوع پر پورے ۱۱ دنوں تک پروگرام۔

● قرعہ اندازی کے ذریعے حج بیت اللہ کا پیکیج۔

● ربيع الاول کے موقع پر پورے ۱۲ دنوں تک بدایوں کے مختلف محلوں میں جلسے۔

● دینی و عصری طلبہ کے لیے ہر سال سرکلائز کا انعقاد۔

● ربيع الاول کے دنوں میں بدایوں کے سرکاری اور غیر سرکاری کالجوں میں جانا، کالج میں زیر تعلیم طلبہ سے مخاطب ہونا، ان کے سامنے ہٹی بات رکھنا اور عید ربيع الاول کے تناسب سے تحفے تحائف پیش کرنا۔

● بدایوں کے پڑھ لکھے افراد کے لیے ”مولانا عبدالمجید پبلک لائبریری“ کا قیام۔

● ریسرچ اسکالر کے لیے متون، شروح، اور مواد کی فراہمی کی خاطر اپنے دل کے دروازے کو کھلا رکھنا۔

● تشنگان علوم و فنون کے لیے ان کے مزاج کے مطابق استقبال، ضیافت، اور نیک خواہشات۔

● نکتہ چیں افراد کے لیے بھی پھولوں کا حسین و خوش نما گلہ سترہ۔

● تاج الحول اکیڈمی کی شائع کتابوں کے ارسال کا موثر انتظام یہ تمام چیزیں ”عوامی رابطے“ میں آتی ہیں، جو عوام کے دلوں سے اس قدر قریب ہو گیا کہ بھلائے جاسکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں!

تصنیف و تالیف: تنقید نگاروں نے اپنے جائزے میں کہا ہے: ”سب سے زیادہ آسان تقریر کرنا ہوتا ہے، اس کے بعد درس و تدریس کا معاملہ آتا ہے، جہاں تک تصنیف و تالیف اور تخریج کی بات آتی ہے یہ کام سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔“ مولانا اسید الحق نے اس مشکل کام کو بھی بحسن و خوبی انجام دیا، اپنی بات کو تحریر کی زباں دے دینا تو آسان ہوتا ہے، لیکن دوسروں کی باتوں کو اپنی زباں میں پیش کرنا بہت ہی زیادہ مشکل ہوتا ہے، دشوار اور کشن ہوا کرتا ہے۔ ہر کوئی اس راہ پر نہیں چل پاتا ہے، بہت سے چلنے والے افراد جھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور کتنے ایسے بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں مگر ”اسید الحق“ ایک ایسا فرد عظیم تھا، جو کبھی نہ ٹکان محسوس کرتا تھا اور نہ اپنے پاؤں میں آبلے کے پڑ جانے کی بات کہی ہے، اس کا مطلب یہ

ہوا کہ وہ اس سفر میں بھی کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ یہ کامیابی ان کے اپنے بزرگوں کے فیضان نظر کا پتہ دیتی ہے۔ شیخ اسید الحق نے اس کے تعلق سے جو کاوشیں انجام دی ہیں وہ مختلف جہتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

الف: اپنے بزرگوں کی تصنیفات کی جدید طباعت
ب: تخصیص، توضیح اور تخریج
ج: احوال، سوانح، آثار اور عکوس
د: مقالے، مضامین، تنقیدات

ان کی تصانیف میں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

- سلاست، روانی
- لفظوں کی سبک روی، جملوں کی شگفتگی
- علمی فنی تحقیقات، مواد کی تلاش و تتبع
- متضاد روایتوں میں تطبیق کی کوشش بلیغ
- مضامین میں سائنسی تقاضوں کی آئینہ داری
- تنقیدی شعور کا پائین اور شوخ و شنگ
- معلومات میں وسعت، کشادگی وغیرہ وغیرہ
- تراکیب میں لفظوں کا حسن احتراز
- بولتا ہوا انداز بیان

کتابوں میں جہاں کہیں آپ اس طرح کی خصوصیات پائیں گے وہیں مولانا اسید الحق قادری کی یاد آئے گی، ان کا شگفتہ چہرہ ان کی بکھرتی ہوئی لبوں کی مسکان دکھائی دے گی۔ جانے والا ہم سب بوجھوڑ کر چلا گیا، وہ اکیلا اور تنہا گیا ہے اور اپنی حیات کا بیش بہا سرمایہ اہل سنت و جماعت کے حوالے کر کے گیا ہے اور یہ پیغام دیتا ہوا گیا ہے:

جان کر من جملہ خاصان سے خا: مجھے
مدتوں روپا کریں گے جا: میں نہ شک

جانے والا بڑی شان سے گیا ہے، ان کی موت بڑی کامیاب موت ہے، روپ موت کا ضرور تھا، مگر کام مسیحا کا تھا، اب اسید الحق اسید الحق نہ رہا، ان کی عظمت میں ایک اور اضافہ ہوا اور اب وہ ”شہید بغداد“ بن گیا ہے۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی تربت پاک پر رحمتوں کی برسات کرے۔ آمین۔ □□□

☆ پرنسپل: مدرسہ شمس العلوم، مخدہ گھر، بدایوں (پوٹی)

علامہ اُسید الحق قادری عبقری عصر تھے

امام نووی اور علامہ عبدالحی فرنگی علی نے بھی زندگی کی چالیس بہاریں ہی دیکھی تھیں، علامہ بدایونی نے ان کی یاد تازہ کر دی

جماعت اہل سنت کی عبقری شخصیت علامہ اُسید الحق عاصم القادری بدایونی کی بغداد شریف میں شہادت کی اندوہ ناک خبر نے مجھے بہت دیر تک کرب آثار لحوں کے حصار میں رکھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لیتے تھے اور دل تھا کہ قرار پکڑنے کو تیار نہ تھا کہ ایک عہد ساز سپوت جو پوری جماعت کے لیے سرمایہ صد افتخار تھا، صد انسوس اب وہ ہم میں نہ رہا۔ یہ سچ ہے کہ علامہ جیسی عبقری اثر مان شخصیت کو پانے کے لیے اب صدیاں راہ نکلیں گی اور زمانے چشم براہ رہیں گے؛ کیوں کہ ایسے دیدہ و درو معارف پرور شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے!

ماضی و حال کی جماعتی سرگرمیوں پر تجویزاتی نظر رکھنے والے میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ علامہ نے اپنے علمی کیریئر کا آغاز ایسے وقت میں کیا جب فیض و تحقیق کی جنس گراں مایہ بازارِ علم سے تقریباً اٹھ چکی تھی، فکر و نظر کے زاویے وحدہ حلا سے گئے تھے، تعلیمی و تنظیمی امور بری طرح انحطاط و قفل کا شکار تھے، تحقیقی مزاج مغلوب اور اپنی ذات سے اُپر اٹھ کر دوسروں کے لیے کچھ سوچنے کا شعور قریباً پانچ ہو چکا تھا ایسے خشکیوں دور اور پُر آشوب حالات میں چمن اہل سنت کی حنا بندی اور علم و تحقیق کی گرتی ہوئی قدروں کو سنبھالا دینے کے لیے علامہ میدان میں اترتے ہیں اور قریباً ڈیڑھ دہائیوں کی آنکھ کو ششوں اور اپنے مدبرانہ آئیڈیاز سے وہ انقلاب بہا کرتے ہیں کہ زمانہ عش عش کر اٹھتا ہے۔ ایک طرف تعمیر و مثبت تنقید کا بازار گرم ہوتا ہے تو دوسری طرف روحانیت و خانقاہیت کا نظام بھی تازہ دم ہو جاتا ہے۔ ایک طرف مدارس و جامعات کے ہام و در علم و تحقیق کے سفید مزاج سے جگمگ ہوا اٹھتے ہیں تو دوسری طرف سماجی و معاشرتی سرگرمیوں کی اُٹھان میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے، یعنی ہر سُر و جہانیت کی دھنک اور صراخ انقلاب کی دھمک پھیلی محسوس ہوتی ہے۔

میں بھی یقیناً اپنا احسان مندانہ کر دار ادا کریں گے۔

یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے کہ علامہ کی پوری زندگی کام سے عمارت رہی، اور بے کاری کا ایک لمحہ بھی ان کی زندگی میں ہمیں کھو جے سے نہیں ملتا، اور یہ کوئی قصہ دوشیں نہیں بس کل کی بات ہے۔ ان کی خدمات جلیلہ کا پرچم ابھی ہماری نگاہوں کے سامنے پوری تب و تاب کے ساتھ لہرا رہا ہے، اور ہم میں سے تقریباً ہر کوئی علامہ کے فکر و کا ز سے پورے طور پر واقف و آشنا ہے۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ علامہ کی بارگاہ میں وفادارانہ خراج بھی ہوگا کہ ہم بھی اپنی زندگی کے جس بھی موڑ پر کھڑے ہوں خواہ نو جوان ہوں یا جوان یا اَدھیڑا اپنے کردار و عمل سے جماعت کو ہم جہت قوت و استحکام بخشنے میں اپنا مومنانہ اور داعیانہ کردار ادا کریں۔

اہل سنت کے جیالوں اور نو جوان علما و فضلا کو یہ پیغام دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہو رہی ہے کہ ہم میں بہت سوں کا معاملہ اِلا ماشاء اللہ یہ ہے کہ وہ پوری زندگی خود کو ناقص و کم سوا ذی تصور فرماتے رہتے ہیں اور نتیجے میں کچھ نہ کر کے بالآخر داغ حسرت لیے آخرت سدھار جاتے ہیں؛ حالانکہ اپنی بے پایاں لیاقتوں اور علم و تجربات کے سیل بے کراں سے ایک زمانے کو مستفیض کرنے کی اُن میں صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اس طرح آنے والی نسلوں کو اپنے عظیم سرمایہ فضل و کم سے وہ محروم کر جاتے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ جو مجھے سمجھ آئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ساری زندگی خود کو احساس کمتری کے آہنی حصار سے باہر ہی نہیں نکال پاتے؛ بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ اگر کچھ دوسرے کمزور عزم لوگ اُن کے ہٹھے چڑھ جائیں تو انھیں بھی اپنے حصار کے اندر کھینچنے میں پوری چابک دستی کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔ کاش! انھیں کوئی بتا دیتا کہ کمال تو بس ایک ہی ذات ہوئی ہے اور وہ ہے ذاتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باقی کسی کو درجہ کمال کہاں نصیب! لہذا اعتراف و تقصیر کے ساتھ ہی انسان جتنا کچھ کر سکتا ہے کر لے کہ شاید یہی اُس کے لیے توشہ راہ اور سرمایہ بخشش بن جائے، بقول شاعر۔

لئن لم يعظ العاصمين من هو مذهب

لمن يعظ العاصمين بعد محمد

یعنی اگر ایک خطا کار کو یہ حق نہیں کہ وہ گنہ گار بندوں کو وعظ

وصیحت کرے تو پھر محمد عربی ﷺ کے بعد گنہ گاروں کو نصیحت کرنے کا جواز کسے ہے؟ (کیوں کہ آپ کے علاوہ نقص و خطا سے پاک ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا!)

تاریخ ہمیں ایسی کئی عہد ساز شخصیات کا پتا دیتی ہے جنہوں نے عمر تو بہت کم پائی مگر ان کے تعمیری و تخلیقی کارنامے بڑی بڑی عمر پانے والوں پر بازی مار لے گئے۔ امام محی الدین شرف نووی (م ۶۷۷ھ) کا نام تاریخ اسلام کے صفحات پر درخشاں حروف میں رقم ہے۔ وہ ساتویں صدی کے عظیم الشان محدث ہوئے ہیں اور تاریخ اسلام کی نافعہ روزگار شخصیات کے دھارے میں شامل ہیں۔ سالہا سال شام کے دارالحدیث اشرافیہ میں درس دیا اور جہاں شیخ تقی الدین سبکی اس تمنّا میں جگہ جگہ مجدد ریز ہوتے رہے کہ شاید ان کی پیشانی ایسی جگہ پڑ جائے جہاں امام نووی کے قدم پڑے ہیں (طبقات شافعیہ: ۱۶۷/۵) ذرا اندازہ فرمائیں کہ اپنے پیچھے کوئی پانچ سو کتابوں کا گراں قدر تحفہ چھوڑ جانے والی یہ شخصیت زندگی کی فقط چالیس بہاریں ہی دیکھ سکی تھی کہ اس کا پیمانہ عمر بیز ہو گیا۔ یوں ہی فرنگی علی کے دور آخر کی ناقابل فراموش یادگار بابوا الحسنات مولانا عبدالحی لکھنوی کو دیکھیں، اپنے دور میں بحر العلوم اور جامعیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ آپ کی تصانیف تقریباً تمام علوم و فنون کا احاطہ کرتی ہیں۔ درسیات کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس پر آپ نے حاشیہ، تعلق یا شرح نہ لکھی ہو۔ ایسی جامع کمالات شخصیت جب دنیا سے پردہ کرتی ہے تو اس کی عمر بھی ہی کوئی چالیس سے متجاوز نہ تھی۔

ایسے جہابذ کا روزگار، صنادید و ہر اور عہد ساز شخصیات میں علامہ اُسید الحق بھی بجا طور شمار کیے جانے کے لائق ہیں کہ ۳۹ سال کی عمر میں وہ کچھ کر گئے کہ بڑی بڑی عمر پانے والے جس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ علامہ کا مایہ امتیاز اُن کا مثبت انداز تھا جس نے انھیں دلچسپی اور تن دہی سے دونوں جہان کی سعادتیں بٹورنے والے کاموں میں ہمہ وقت جٹائے رکھا، اور ہر محاذ پر سرخوردہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ہر طبقے میں ترقی مقبولیت عطا کیا۔ لہذا ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ مثبت سوچ اور تعمیری افکار و خیالات ہی انسان کی کامیابی کا زینہ ہوتے ہیں۔ تجربات شاہد ہیں کہ مثبت سوچ نے ناممکن کو ممکن بنادیا ہے۔ دین، دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیاں مثبت سوچ کی مرہونِ منت ہیں اور تمام ناکامیوں کی تہہ

علامہ اُسید الحق قادری کی ذات مجمع البحرین تھی

وہ خود شیخ فروزاں تھے اور دوسروں کو بھی مثل شیخ جلتا ہوا دیکھنے کے خواہاں تھے

کی امیدیں ان سے وابستہ ہوئی تھیں، ہم ایسے المناک خبر کے متحمل کہاں تھے؟ میرے بھائی تھیں ایسی بھی کیا جلدی تھی؟
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے
پھر ان کی ایک ایک باتیں یاد آتی گئیں اور جی بھر کے رلاتی گئیں،
وہ ملاقاتیں، وہ باتیں، وہ ادا و انداز جس کی مثالیں عہد حاضر میں ناپید
ہیں۔ دل پکارتا، آہ اسید واہ اسید! وہ دل کے اس قدر قریب تھے، اس کا
اندازہ مجھے پہلے کبھی نہ ہوسکا، سچ ہے:

وہ اشک بن کر مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

میں ۲۰۰۶ء میں ”حیات اصدق“ کی طباعت کے لیے دہلی گیا
ہوا تھا۔ ایک روز برادر گرامی مولانا خوشتر نورانی کی ملاقات کی غرض سے
مکتبہ جام نور پہنچا تو وہاں کچھ ہی دیر بعد ایک خوش قامت، وجیہ، جامہ
زیب، متمہم چہرہ و بشری کی مالک جواں سال شخصیت رونق افروز ہوئی،
مولانا خوشتر نورانی اور موجود افراد نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا،
تقلید آداب مجلس کا خیال کرتے ہوئے میں بھی کھڑا ہو گیا۔ کیوں کہ
میری اس نواوار شخصیت سے کبھی کی دید و شنید نہ تھی۔ ہمارے ملنے کے
انداز سے خوشتر صاحب نے تاڑ لیا کہ دونوں ایک دوسرے سے ناواقف
ہیں اور تعارف کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ یہ مولانا اسید الحق
محمد عاصم قادری ازہری، ولی عہد خانقاہ قادریہ بدایوں شریف ہیں۔ میں
نے کہا: نام سے واقف ہوں اور تحریریں بھی دیکھی ہیں، لیکن ملاقات کا
شرف اب ملا ہے۔

ہمارے درمیان رکھی گفتگو ہوئی لیکن ”مکتبہ آنست کہ خود ہوید“
کے مصداق اس مختصر ملاقات میں ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص ذی علم بھی
ہے اور باکمال بھی، ذی وجاہت بھی اور اخلاقیات کا اعلیٰ نمونہ بھی۔

۱۴ مارچ ۲۰۱۴ء لمبری محلہ بہار شریف میں ایک میٹنگ سے
فراغت کے بعد احباب کی مجلس میں مشغول تھا، رات کے ۹ بجے تھے۔
اسی اشاعرہ سید جناب حافظ محمد شہباز حسین رضوی علیک کا علی گڑھ
سے فون آیا۔ خیریت کے رنگی جادے کے بعد اس عزیز نے مجھے جھنجھوڑ کر
رکھ دیا کہ علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ
و انا الیہ راجعون۔

میں ایک دم سے چیخ پڑا کیا جکتے ہوئے انہوں نے مضمحل آواز میں
کہا، ہاں حضرت سچ کہتا ہوں۔ پھر بیک زبان لکلا، کہاں؟ کیسے اور
کیوں کر؟ وغیرہ وغیرہ۔ مختصر گفتگو کی اور فون بند کیا۔ احباب سے
اجازت چاہی، سب چونک پڑے۔ کیا ہوا؟ میں ہدقت تمام صرف اتنا
ہی کہہ سکا۔ میرے بہت اچھے دوست حضرت اسید میاں نہیں رہے۔ یہ
کہتے ہوئے کلچر منہ کو آتا تھا۔ سمجھوں نے سوگوارانہ مجھے رخصت کیا۔
گاڑی چلا کر ادارے تک پہنچنے میں ہمارے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے
اور چند منٹ کا یہ سفر بہت طویل ہو گیا تھا۔

جب حواس باختہ ادارہ میں داخل ہوا، اساتذہ، رفقا اور عزیزان
میری حالت کو دیکھ کر مجھے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پہلا فون
تقدیق کے لیے مخلص گرامی مولانا خوشتر نورانی کو لگایا۔ موبائل سوچ
آف آ رہا تھا۔ اس کے بعد برادر مکرم مولانا سید شاہ سیف الدین
اصدق چشتی کو لگایا، انہوں نے میرا فون فوراً ریسیو کیا اور جب میں نے
اضمحلال سے استفسار کیا تو انہوں نے تقدیق کی اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا، ذہن و دماغ پتھر کا ہو کر رہ گیا اور بس
ایک ہی آواز آتی اس کا مد مقابل کوئی نہیں؟ نہ علم و ادب میں، نہ زبان و قلم
میں، نہ اخلاق و عادات میں۔ آہ! وہ کیسا قیمتی سرمایہ تھا ملت کا جماعت کا!
ابھی تو اس کے جوہر نکھر کر سامنے آنا شروع ہوئے تھے۔ ابھی جماعت

بقیہ علامہ بدایونی کی ملی شہادت ہے مثال حقی

مولانا اسید الحق قادری بدایونی کی باتیں آج بھی دل پر نقش ہیں،
اگر لکھنے پہ آؤں تو دفتر درکار ہے۔ خانقاہی اختلافات، اہل سنت کے
مابین ناجائز اقل اکثر ہماری گفتگو کا محور رہی ہوتا تھا۔ کہتے تھے یا اللہ اکبر
وہ دن آئے گا جب اہل سنت کے باہمی اختلافات دور ہوں گے
؟ پھر پلٹ کر کہتے کہ ”اختلافات تو مولانا ہمیشہ سے رہے ہیں اور پھر ہم
کی بہت ساری مثالیں دے ڈالتے۔

کبھی کہا کرتے تھے کہ ”مولانا مخالفت کو دیکھ کر دل کرتا ہے دنیا
چھوڑ دوں۔“ میں ہنستا اور کہتا بس تھک گئے؟ حوصلہ رکھیں حضرت!
تندی با مخالف سے ٹوٹ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے
کہا کرتے تھے:

”میں کسی مخالفت کا جواب دینا نہیں چاہتا، اباجھے سمجھاتے
رہتے ہیں۔“ اس طرح مختلف امور پر عموماً باتیں ہوتیں۔
ایک بار فرمایا کہ ”مولانا گھروالوں کے علاوہ چند لوگ ہیں جن
سے اپنا غم ہلکا کر لیا کرتا ہوں اور وہ میرے راز افشاں نہیں کرتے، ان
میں سے ایک آپ ہو، جن پر میں ہر طرح سے اعتماد کرتا ہوں۔“ کیا کیا
لکھوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟

سیکڑوں باتوں کا وہ رہ کے خیال آتا ہے
کافی طویل تحریر ہو گئی۔ یہ کوئی مضمون نہیں ہے، بس چند یادیں
تھیں جنہیں تحریر یا یاد کر کے دل کے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔
میں آپ کے بلکہ آپ کے گھر کے ہر فرد کے اس غم میں برابر کا
شریک ہوں۔ میں کسی کام کا تو نہیں، پھر بھی اگر کہیں میری ضرورت
ہو تو ضرور یاد فرمائیں۔ آخر میں ہدیہ تعزیت حدیث شریف کے درج
ذیل جملوں کے ساتھ پیش ہے:

”إِنَّ لِلَّهِ مَا أَخَذَ، وَلَهُ مَا أَعْطَى، وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ اللَّهِ
بِأَجَلٍ مُّسَمًّى، فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ“ □□□

(مکتوب بنام: حضرت شیخ عبدالمجید محمد سالم قادری / ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ)
☆ نوری دارالافتاء، مدینہ منورہ، محلہ علی خاں، کاشی پور (اتراکھنڈ)

میں کہیں نہ کہیں منفی سوچ ہی دکھائی دیتی ہے۔ انسان کے جملہ اعمال و
افعال میں سوچ کی حیثیت وہی ہے جو مکان کی تعمیر میں نقشہ کی ہوتی
ہے۔ لہذا جیسا نقشہ، ویسا مکان، جیسی سوچ، ویسا انسان۔

انسان کی عملی زندگی اس کی سوچوں کی ہی آئینہ دار ہوتی ہے۔
سوچ ایک بہت بڑا جھنڈا ہے، اگر اسے مثبت استعمال کر لیا جائے تو ہم
بہت کچھ شکار کر سکتے ہیں اور اگر اسے منفی استعمال کیا جائے تو ہم خود
شکار ہو سکتے ہیں، کاش اہم اپنی سوچوں کا رخ صحیح سمت پر لگا دیتے، اور
اُوروں کے لیے نہ سہی تو کم از کم اپنی ذات کے لیے تو رحمت بن جاتے!
اپنے من میں ڈوب کر پاجاسراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بننا نہ بن اپنا تو بن

مضمون کے اختتام پر اپنے نوجوان دوستوں اور علامہ کے معتقدین
ورفقا کو بجز اس کے اور کیا پیغام دوں کہ اہل سنت و جماعت کے فروغ
و استحکام کے سلسلے میں آپ داسے، درے، قلمے، سختے جو کچھ بھی خدمات
انجام دے سکتے ہیں ضرور دیں، اور جلدی کریں، پروانہ اجل کبھی بھی
آ سکتا ہے۔ اگر آپ جواں سالی میں علامہ کی موت سے بھی کچھ نہ سیکھ
سکے تو خدا معلوم اب کون سا حادثہ جاں کاہ آپ کو خوابیدگی کے حصار
سے باہر لائے گا؟ زندگی کی شام و سحر کو اب سے نظام الاوقات کا پابند
بنالیں اور اپنی لیاقت سے قوم و ملت کی جتنی نفع رسانی اور فیض بخشی
کر سکتے ہیں کر لیں اور یہ بات دلی کی سختی پر نقش کر لیں کہ دنیا میں
مصروف لوگ ہی کچھ کر پاتے ہیں؛ کیونکہ کاموں ہی نے تو انہیں
مصروف کر رکھا ہے اور انہیں سے کام کی توقع بھی رکھی جاسکتی ہے۔ رہی
بات فارغ بیٹھے رہنے والوں کی تو ان کی بے کاری کبھی انہیں فرصت ہی
نہیں دیتی کہ وہ کچھ مثبت کام کر سکیں؛ کیوں کہ وہ اپنی بے کاری و زریاں
کاری ہی کو کار شاہی سمجھے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اُن سے آپ جب بھی کسی
کام کے لیے کہیں، تو وہ اپنی بے جا مصروفیت کا ایسا ڈھنڈورا پیٹیں گے
کہ آپ کو اپنی مصروفیت کا نشہ ہرن ہوتا نظر آنے لگے گا۔ اللہ سبحانہ
و تعالیٰ ایسی بے کاری کا ایک لمحہ بھی کسی مسلمان کی زندگی میں نہ رکھے۔

خداے قدیر و مقتدر جل جلالہ علامہ کو غریق رحمت کرے اور
جماعت میں اُن کے امثال بکثرت پیدا فرمائے۔ آمین □□□

☆ دلاس یونیورسٹی، کپ ٹاؤن، ساؤتھ افریقہ

بہر حال میں ان سے متاثر ہوئے بنانہ رہ سکا۔ میں نے کہا آپ تو بہت خوب لکھتے ہیں۔ ”جام شہود“ بھی آپ کی تحریروں کا منتظر ہے۔

مسکرا کر فرمایا: کہاں حضرت! یہ تو آپ کا حسن ظن ہے اور ”جام نور“ کے لیے خوشتر صاحب کی زبردستی کی وجہ سے کچھ لکھ لیتا ہوں، ورنہ میں اس باب میں بہت سست واقع ہوا ہوں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنے گرد و پیش کے حالات کے تناظر میں ان کی اس خاکساری کو حقیقت پر محمول کر لیا، کیوں کہ میں ان سے کما حقہ واقف نہ تھا۔

جب تو اتر کے ساتھ آپ کی معرکہ آرا تحریروں ماہنامہ ”جام نور“ میں آنے لگیں تو نہ صرف غلط فہمی کا ازالہ ہوا، بلکہ اور بھی بہت کچھ کا اندازہ ہوا۔ پھر تو صرف میں نہیں ایک زمانہ آپ کی قلمی صلاحیت کا معترف ہو گیا۔

آپ کی ”خامہ تلاشی“ اور قلمی نام ”ابوالفیض معینی“ نے جو حوالہ چلایا، وہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ رب قدیر نے آپ کو غزالی و رازی کا علم عطا فرمایا تو دوسری طرف حضرت جنید و شبلی اور سرکارِ محمود جہاں کا بحر و انکسار دیا تھا۔ اللہ رے خاکساری جس کی نظیر عہدِ حاضر میں ڈھونڈنے نہیں ملتی۔ پندارِ علم علامہ اسید کو چھو کر نہیں گذرا۔ ہر خرد و کلاں کی واہ و ابی نے انھیں غیر متوازن نہیں کیا اور کمال تو یہ کہ بدخواہوں کی بدخواہی نے انھیں کبھی بد مزہ نہ ہونے دیا۔

میں نے جام شہود کے ”خواجہ قیام اصدق نمبر“ کی اشاعت کے وقت ان کی خدمت میں مکتوبات اصدق کے دو تین کتب ارسال کیے تھے (مکتوبات اصدق حضرت سیدنا خواجہ شاہ قیام اصدق چشتی رضی اللہ عنہ کے مکتب کا گراں قدر مجموعہ ہے اور ان مکتب کی حیثیت صوفیائے متقدمین کے مکتب کی ہے) اور ان سے درخواست کی کہ آپ ترجمے کے ساتھ ساتھ ایک توضیحی مضمون رقم فرمادیں۔ ادارہ جام شہود آپ کا ممنون کرم ہوگا۔ آپ نے وعدہ فرمایا لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے وفانہ کر سکے، جس کا مجھے بہت ملال ہوا۔ بر بنائے قربت میں نے اپنے ملال کا ان سے اظہار کیا، کوئی اور ہوتا تو شاید نہ کہتا، کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا حضرت میں اسلاف کا خادم ہوں اور خدمت میرا کام ہے، لیکن پہلے میرے اوپر اپنے اسلاف کا حق ہے۔ میں نے سوچا ان کا حق ادا کر لوں، پھر آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ پھر کہنے لگے

”عرس قادری“ میں خانقاہ قادریہ کے بزرگوں کی کتابیں آئی تھیں۔ لہذا ان مکتب کو دیکھنے کے باوجود میں کچھ نہ کر سکا، مجھے خود ملال ہے۔ ان مکتب سے صاحب مکتوب کی جلالت شان کا اندازہ ہوتا ہے۔ لہذا صرف شکایت دور کرنے کی غرض سے لکھنا انصاف کے تقاضے کے خلاف ہے۔ یہ قرض میرے اوپر باقی رہا۔

اس خوبصورتی سے میرے ملال کو رفع کیا کہ میں مطمئن ہی نہیں بلکہ شرمندہ ہو گیا اور دل نے کہا بے شک ہر ایک پر پہلے اس کے آثار اجداد کا حق ہے۔ زمانہ جانتا ہے اسید میاں نے اس حق کو خوب خوب ادا کیا۔ اسی حق شناسی کے نتیجے میں حضرت اسید میاں نے وہ سچ گراں مایہ جو عوام و خواص کی نگاہوں سے اوجھل تھے، نئے زبان و قالب میں ڈھال کر عطا کیے جس کا احاطہ ہمارے اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔

۱-۲ نومبر ۲۰۰۸ء کو ہم نے مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف بہار شریف کے پچیس سالہ جشن کے موقع پر دو روزہ عظیم الشان کل ہند تقابلی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا، جس میں ملک کی پچاس سے زائد قد آور علمی و ادبی شخصیتوں نے اس بے بضاعت کی دعوت پر تشریف آوری کی زحمت گوارا کی۔ شہر کے حالات اس وقت کچھ نا سازگار ہو گئے تھے جس کا اثر کانفرنس کے نظم و نسق پر بھی پڑا جس کا اندازہ ہمیں بخوبی ہے اور ہم بہت اہم مہمانوں کا شایان شان خیر مقدم نہ کر سکے تھے۔ پھر بھی یہ کانفرنس بہار شریف کے لیے تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے ایک مخلص دوست نے کہا بھی تھا، سید صاحب آپ کو اندازہ ہے کہ آپ نے کتنی کیسی شخصیتوں کو اکٹھا کر لیا ہے؟ میں نے حضرت اسید میاں کو اس کانفرنس میں مدعو کیا تھا اور وہ شرفِ ملت حضرت سید محمد اشرف قادری مد فیوضہ (مارہرہ مطہرہ) اور مولانا خوشتر نورانی کے ہمراہ تشریف لائے۔ میں آج بھی خوشتر صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس موقع پر میری بڑی مدد فرمائی تھی۔

سیمینار کی تین نشستوں میں پہلی نشست کا عنوان ”اسلام اور امن عالم“ تھا، اسید میاں صاحب نے اس عنوان کے تحت جب حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے عجب سماں باندھ دیا تھا۔ نادر لکھتے، ثانیاب حوالہ جات، گفتار کی شیرینی، آواز کے مد و زجر نے عوام و خواص سب کو اپنے حصار میں لے لیا تھا اور سب انگشت بندھاں تھے، جوان الطمر

ہونے کے باوجود وسعتِ مطالعہ ایسا کہ جس کی تھاہ نہیں ملتی اور رات کے اجلاس عام میں میرے بے جا اصرار پر بہتوں کو ان کا خطبہ اندر رنگ دے دیکھنے کو ملا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آبشار پھوٹ پڑا ہو۔ بلاشبہ وہ شخص مجمع البحرین تھا، جس کے کمالات کا احاطہ میرے زبان و قلم سے بالاتر ہے۔ ایک وقت وہ محدث بھی تھا، فقیہ بھی تھا، مفسر بھی تھا، ادیب بھی تھا، ناقد بھی تھا، شاعر بھی تھا، مصنف بھی تھا، جتنی بھی تھا، مرتب و مؤلف بھی۔ اسی تعلیمی کا نفرنس کے بطن سے مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف کو ”الاصدق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ“ ملا جس کا افتتاح حضرت شرف ملت سید محمد اشرف مارہروی نے فرمایا اور ”شہودی دارالمطالعہ“ جس کا افتتاح حضرت علامہ اسید الحق بدایونی جیسی علم دوست شخصیت نے فرمایا۔ جہاں ان کے عہدہ دوسرے ڈیڑھ دو برس فوائد و نتائج حاصل ہوئے وہیں جام شہود قسط کا شکار ہوا۔ انجی محترم مولانا سیف الدین اصدق چشتی کے بار بار کہنے پر بھی میں ”جام شہود“ کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ پھر انہوں نے حضرت والد گرامی سے میری شکایت کی اور دوبارہ جام شہود کو منظر عام پر لانے کا مطالبہ کیا۔ بارگاہ عالیہ میں میری جلدی ہوئی اور حضرت والد گرامی نے میرا مشا جانا چاہا۔ میں عرض حال کر کے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر سکوت رہا پھر حضرت نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں حکم صادر فرمایا، جام شہود نکلتا ہے اور میری حیات تک اسے بند کرنے کا خواب اپنے ذہن و دماغ سے نکال دیجیے۔

مرتا کیا نہ کرتا، پھر نئے سرے سے اس کی طرف متوجہ ہوا اور مجلس ادارت کی ایک فہرست ترتیب دی۔ اسے حضرت والد گرامی کی خدمت میں پیش کیا جس کو ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام کے اضافے کے ساتھ جام شہود کی مجلس ادارت کے لیے منظور کر لیا گیا، پھر میں نے سبھوں سے منظوری حاصل کی۔ جب حضرت علامہ اسید الحق سے مجلس ادارت کی ذمہ داری قبول کرنے کی فون پر درخواست کی تو انہوں نے معمولی عذر و معذرت کے بعد قبول فرمایا اور کہنے لگے رسالہ نکلتا کیسے ہے؟ میں دل جلا تھا جواباً عرض کیا تو کل علی اللہ، میرے جواب سے زیادہ میرے لہجے پر کلک لگا کر کہ پڑے۔ اس کے بعد فرمایا پھر تو تم بھی بند ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا والد ماجد کی حیات تک بند ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ پھر

اسید میاں صاحب نے کہا، اس کے بعد آپ بند کر دیں گے؟ میں نے کہا، ایسا تو میں نے نہیں کہا، ہاں! اتنا ضرور ہے حیات پر انحصار ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا، حضرت حالات بنتے نہیں ہیں، بنائے جاتے ہیں، حالات سے ہار نہیں مانی جاتی ہے، حالات کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اسلاف کی کمائی سنبھالی جاتی ہے، لٹائی نہیں جاتی ہے۔ نند یہ خیال بھی نہ لائیے گا۔ میری جانب سے تاج الحول اکیڈمی کے لیے اندرون نائل کو خاص کر دیں اس کا جو بھی تعاون ہو ہمیں بتا دیں میں اکاؤنٹ میں ڈلوادوں گا۔ میں نے کہا مضامین تو ہشتے ہوئے فرمایا وہ بھی گاہے بگاہے حاضر خدمت کروں گا۔ ہر شمارے کے لیے معذرت ہے اور رابطہ منقطع ہوا۔

آہ! آج وہ پیارے بول کانوں میں گونجتے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں کا بھی رہنما تھا، اپنے اسلاف کے ایمانوں کا امین تھا، دوسروں کو بھی وہ امین دیکھنا چاہتا تھا، خود شمع فروزاں تھا، دوسروں کو بھی مثل شمع جتنا دیکھنے کا خواہاں تھا، خود متحرک و فعال تھا دوسروں کو بھی متحرک و فعال رکھنے کا آرزو مند تھا۔

حضرت علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کی شناخت قادری اور قادریت تھی جس کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

غوثِ اعظم کی غلامی عاصم اپنی پہچان ہے کیا ہوتا ہے

بارگاہِ غوثیت مآب میں ان کی مقبولیت اور رشتے کا پتہ کوچہ جاناں میں ان کی شہادت بتا رہی ہے اور قادریت کا انعام آغوشِ غوثیت میں دفن ہو کر پایا۔ اس نصیب پہ کون نہ نازاں ہو! پوری جماعت کو ان کی شہادت نے ایب جگر اڑے کہ ان کی یاد میں ہزار ہا دل تڑپ رہے ہیں، بے شمار آنکھیں اشکبار ہیں۔ آہ! قوم و ملت کا پاسباں جاتا رہا، شریعت و طریقت کا سنگم جاتا رہا، فکر و فن کا نگہباں جاتا رہا۔

ہم سب آپ کی ترقی درجات کے لیے دعا گو ہیں اور شیخِ ملت حضرت سالم میاں قادری مد فیوضہ (سجادہ نشین خانقاہ قادریہ بدایونی شریف) حضرت مولانا عطیہ میاں قادری اور دیگر اہلخانہ خانقاہ بدایونی کو بعد حسرت و افسوس تعزیت پیش کرتے ہیں۔ □□□

ملازمین ماہنامہ ”جام شہود“، مکی تالاب، بہار شریف، ناناندہ (بہار)

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

افسوس صد افسوس کہ ایسا قابل رشک ستارہ اتنی جلدی افق عالم سے روپوش ہو گیا

علامہ شاہ فضل رسول قادری اور تاج الحق علامہ شاہ عبدالقادر بدایونی رحمہم اللہ جیسے آفتاب و ماہتاب رونما ہوئے، اسی گھرانے میں فخر اسلام علامہ اسید الحق عثمانی قادری نے آنکھیں کھولیں، اس خاندان کی خدمت صدیوں پر محیط ہیں، گویا بقول غالب:

سو پشت سے ہے پیشہ آسپہ گری

دین کے یہ سپاہی صدیوں سے دین متین کی خدمت میں مصروف رہے اور بحمدہ تعالیٰ آج بھی سلسلہ جاری و ساری ہے۔

یہ بھی کیا نصیب ہے کہ ولادت حضور سلطان المشائخ محبوب الحق قدس اللہ روحہ کے شہر بدایوں شریف میں اور شہادت غوث اعظم محبوب سبحانی قدس اللہ سرہ کے دیار بغداد شریف میں ہوئی۔ بلاشبہ یہ اللہ رب العزت کا فضل ہے جس میں کسب کا کوئی اختیار نہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

راقم کو جس وقت یہ دل فگار خبر ملی، اس وقت جو صدمہ ہوا اس حال بیان سے باہر ہے۔

ہم آج تک ہیں چوٹ وہ دل پر لیے ہوئے
دل کسی صورت سے ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا اور یہ محسوس ہوا
تھا کہ اب خبر آئے گی کہ آپ سلامت ہیں، لیکن:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

خبر سنتے ہی حضرت پیر و مرشد گرامی عارف باللہ شاہ احسان اللہ محمدی ابو سعید صفوی حفظہ اللہ و رعایہ کی خدمت میں فون کیا اور خبر دی، جن سے علامہ شہید کو قلبی لگاؤ اور نسبت جتنی تھی اور آپ سے حضرت پیر و مرشد کو بے پناہ محبت تھی۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ جب اس نے حضرت پیر و مرشد کے دورہ مصر کی وہ تصویر جس میں سابق مفتی جمہوریہ علامہ مفتی محمد جعفر مدظلہ آپ کی ضیافت فرما رہے تھے، فیس بک پر لگائی تھی تو آپ نے

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی مشہور حدیث پاک ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان اللہ لا ینزع العلم من الناس انتزاعاً ولكن یقبض العلماء فیرفع العلم معهم الحدیث (اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے اچانک نہ اٹھائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ علما کی روح قبض فرمائے گا اور علم کو ان کے رخصت ہونے سے اٹھائے گا)

برادر گرامی علامہ محقق مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری رحمہ اللہ کی شہادت کا ساتھ بھی اس حدیث شریف کی روشنی میں عم کی رخصتی کی طرف اشارہ ہے۔ افسوس صد افسوس کہ ایسا قابل رشک ستارہ اتنی جلدی افق عالم سے روپوش ہو گیا۔ ان کی شہادت کی خبر سنتے ہی دل پر غموں کا کوہ گراں آ پڑا، دل مجھ سا گیا اور حوصلے پست ہوتے ہوئے معلوم ہوئے۔ مجھے رہ رہ کر نابغہ عصر فخر المصنفین علامہ محمد عبدالحی فرنگی محلی رحمہ اللہ کا خیال آتا رہا اور ان سے علامہ شہید رحمہ اللہ میں کئی طرح کی مماثلت معلوم ہوئی۔ علمی میدان میں ژرف نگاہی، وسعت نظری، علوم ہنوں میں پختگی اور پھر قریب قریب ایک ہی عمر میں دونوں کی اس سرائے فانی سے رخصتی۔ حضرت امام نکھنوی بھی تقریباً ۳۹ رسالہ کچھ ماہ کی عمر میں رخصت ہوئے اور فاضل بدایونی بھی اسی کے قریب عمر میں شہید ہوئے، رحمہما اللہ تعالیٰ۔

بدایوں وہ زرخیز خطہ ہے جہاں ایسے ایسے نابغہ روزگار شخصیتوں نے آنکھیں کھولیں ہیں جن پر نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو فخر ہے۔ اسی سرزمین کو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الہی قدس اللہ سرہ کی بھی جائے ولادت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان گنت علما، بے شمار اولیا اور لاتعداد شہداء آج بھی وہاں آرام فرما ہیں۔ اسی زرخیز خطہ کا علم و فضل سے معمور اور حسب و نسب سے مشہور وہ گھرانہ جس میں علامہ شاہ عین الحق عبدالحمید عثمانی قادری، سیف اللہ المسلمول

کھٹ کیا تھا کہ ”ماشاء اللہ اپنے وقت کے دو عظیم عارف باللہ ایک ساتھ“۔ اس ناچیز پر آپ کے الطاف و نوازش کا جو حال رہا، وہ یاد آتا ہے اور دل خون ہوتا ہے۔

بیشیر الصبا پرین فرماست در شکایت گناہ می یتیم
ارشاد در بانی ہے کہ ”صبر کرنے والوں کو بشارت ہو“ اس لیے شکوہ و شکایت میں گناہ سمجھتا ہوں۔ راقم کا جب از ہر شریف آنے کا ارادہ نہیں تھا تو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ آپ از ہر شریف ضرور جائیں اور اگر ارادہ نہیں ہو رہا ہے تو بدایوں شریف آ جائیں اور ہمیں خدمت کا موقع دیں، یہ ازراہ ذرہ نوازی ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خود میرے لیے شرف کا باعث ہوتا۔

دہلی کے دوران قیام پہلی مرتبہ بدایوں شریف کا سفر آپ کے ساتھ کار میں نصیب ہوا۔ وہ سفر بھی کیا یادگار سفر ہے، کافی باتیں ہوئیں، دوران سفر مجھ سے فرمانے لگے کہ مجھے حضرت امیر خسرو کا کلام ”چھاپ تلک سب چھینی رے مو سے نینا ملائے کے“ بہت پسند ہے، اکثر سنتا ہوں۔ اس کے بعد آپ جب خانقاہ عالیہ عارفیہ میں غالباً دوسری مرتبہ عرس اور ”یوم غزالی“ میں شریک ہوئے تو اس غزل کو قل کی محفل میں فرمائش کر کے سنا۔

بڑوں کا حد و رجاء ادب اور چھوٹوں پر بے پناہ شفقت آپ کی ایسی عادت تھی جس نے آپ کو ہر لحیزہ بنا دیا تھا۔ دہلی میں ایک مرتبہ آپ نے راقم سے پوچھا کہ آپ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں؟ راقم نے عرض کیا کہ تصوف تو سراسر ادب ہے، جو جتنا مودب ہوگا اسی قدر صوفی ہوگا، تو

بڑوں کا حد و رجاء ادب اور چھوٹوں پر بے پناہ شفقت آپ کی ایسی عادت تھی جس نے آپ کو ہر لحیزہ بنا دیا تھا۔ دہلی میں ایک مرتبہ آپ نے راقم سے پوچھا کہ آپ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں؟ راقم نے عرض کیا کہ تصوف تو سراسر ادب ہے، جو جتنا مودب ہوگا اسی قدر صوفی ہوگا، تو

□□□

☆ از ہر الشریف، قاہرہ (مصر)

ایک علمی، دینی اور تاریخی بحث پر مشتمل دلچسپ کتاب

سر سید کے مذہبی عقائد و افکار: ایک مکالمہ

ہفت روزہ ”الفتیہ“ امرتسر ۱۹۳۶ء کی فائل سے

صفحات: 104 از: مولانا خوشتر خودانی قیمت: 70

یہ بحث ہفت روزہ ”الفتیہ“ امرتسر ۱۹۳۶ء کے شماروں میں سر سید کے مذہبی عقائد پر ہوئی تھی، جس میں کئی سرکردہ علما مثلاً پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری، پروفیسر مولانا حامد حسن قادری، حضرت علامہ ارشد القادری اور قارئین نے حصہ لیا تھا۔

تقسیم کار: مکتبہ جام نور، 422 میل محل، جامع مسجد، دہلی-۶ ناشر: ادارہ فکر اسلامی، دہلی

نسل نو کے سب سے بڑے محسن

آج جماعت میں جو علمی و تحقیقی شعور پیدا ہوا ہے اس کے بچے مولانا بدایونی کی علمی و فکری تحریک کا بڑا حصہ ہے

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

مولانا اسید الحق قادری اپنی خانقاہی اور مشربی بنیادوں پر روشنی تھے ہی اپنی علمی، فکری، تحقیقی، ادبی، تنقیدی اور نظریاتی بنیادوں پر بھی، شیخ کے مقام پر فائز تھے۔ ان سب کے علاوہ وہ انسان بھی بہت بڑے

تھے۔ ہمارے درمیان ایک سے ایک علما، فقہاء، فضلا اور دانشور موجود ہیں مگر ان میں انسان کم ہی نظر آتے ہیں۔ مولانا قادری ان سب عظمتوں کے ساتھ انسانیت کی بلندی پر بھی براجمان تھے۔ ان سے ملنا، سنا، جانا

اور پڑھنا بڑا دل چسپ اور پراثر تجربہ ہوتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے چھوٹوں سے ملاقات کرتے تو ان کی سوصلہ افزائی کرتے، ان کے کاموں کی تعریف کرتے، مشورے دیتے اور جب بات سے بات نکلتی تو علمی، تحقیقی، فکری اور معاشرتی امور زیر بحث آتے اور پھر ان کی فکری زرخیزی، علمی گہرائی و گیرائی اور ادبی و تنقیدی بصیرت کے جلوے نکھرتے۔ ان کی گفتگو چھوٹوں کے لیے بڑی حوصلہ بخش ثابت ہوتی۔ میں نے ماضی قریب

کے علما و مشائخ میں حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے بارے میں سنا ہے کہ ایک بار کوئی ان سے ملاقات کر لیتا تو پھر ان سے دوبارہ ملنے کا مشتاق رہتا۔ بلا مبالغہ حضرت مولانا قادری کے سلسلے میں میں بالکل یہی کیفیت اپنے اندر پاتا ہوں۔ میری طرح ہر چھوٹا اور جوانیہ گواہی دے گا کہ مولانا کی شخصیت ان کے لیے کس درجہ محرک تھی۔ وہ خود کام کے آدمی تھے اور کام کرنے والوں ہی کو پسند بھی کرتے تھے۔

گزشتہ سال دسمبر کے مہینے میں مولانا اپنی ہمیشہ کے علاج کے سلسلے میں کچھ دنوں کے لیے ممبئی تشریف لائے تھے۔ ایک دن فیس بک پر ان کی تصاویر دیکھیں کہ وہ قلابہ ممبئی کی سینٹرل لائبریری کی مرکزی سیرجیوں اور لائبریری میں کتابوں کے درمیان ہیں، میں نے انہیں نیچ

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

کام کرنے والوں کی اس بھیڑ میں مولانا وہ تنہا شخصیت ہیں جو آج کے فاضل نوجوانوں اور قسری سوچ رکھنے والی نسل کے مقتدی تھے۔ ان کی عمر اور ان کے کام کی طویل ترین فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو واقعی کام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ انہیں شاید معلوم تھا کہ میرا وقت قریب تر ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنے حصے کا کام کر ڈالو۔ ۳۹ سال کی مختصر عمر میں ان کی تصنیفات، تالیفات، تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ

تک پہنچتی ہے اور ان کے علاوہ ایک سو سے زائد علمی و تحقیقی کتابیں ہیں جو انہوں نے اپنی زیر نگرانی لکھوائیں۔ مولانا موصوف سے میری زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں، کل ملا کر تین چار سے زیادہ نہیں لیکن ان مختصر ملاقاتوں نے مولانا کی سحر طراز شخصیت کے جو اثرات مجھ پر قائم کیے وہ شاید یہی کبھی دھند لے ہوں۔

مولانا سے میرا تعارف تو اسی وقت ہو چکا تھا جب وہ ازہر شریف کے دوران طالب علمی جام نور میں اپنی قیمتی اور وسیع تحریروں سے محفوظ کراتے تھے۔ جب وہ مکمل طور پر اپنے وطن بدایوں شریف تشریف لے آئے پھر تو وہ اتنے برقی رفتار ہو گئے گویا قسری، تحقیقی، علمی، تخلیقی اور فکری مہمات ان میں فروکش ہو گئی ہوں۔ ان کے مقالات مسلسل جام نور میں شائع ہوتے رہے اور علمی تحقیقی کتابیں بھی منظر عام پر آتی رہیں اور علمی دنیا کو سیراب کرتی رہیں اور اس وقت تو ان کی عظمت و شہرت کو گویا

پد لگ گئے جب انہوں نے جام نور میں ”خامہ تلاشی“ شروع کی اور برصغیر کی علمی دنیا میں دھوم مچادی۔ جب تک یہ کالم شائع ہوتا رہا، طلبہ کیا، اساتذہ اور محققین بھی اس کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے رہے۔

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

کام کرنے والوں کی اس بھیڑ میں مولانا وہ تنہا شخصیت ہیں جو آج کے فاضل نوجوانوں اور قسری سوچ رکھنے والی نسل کے مقتدی تھے۔ ان کی عمر اور ان کے کام کی طویل ترین فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو واقعی کام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ انہیں شاید معلوم تھا کہ میرا وقت قریب تر ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنے حصے کا کام کر ڈالو۔ ۳۹ سال کی مختصر عمر میں ان کی تصنیفات، تالیفات، تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ

تک پہنچتی ہے اور ان کے علاوہ ایک سو سے زائد علمی و تحقیقی کتابیں ہیں جو انہوں نے اپنی زیر نگرانی لکھوائیں۔ مولانا موصوف سے میری زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں، کل ملا کر تین چار سے زیادہ نہیں لیکن ان مختصر ملاقاتوں نے مولانا کی سحر طراز شخصیت کے جو اثرات مجھ پر قائم کیے وہ شاید یہی کبھی دھند لے ہوں۔

مولانا سے میرا تعارف تو اسی وقت ہو چکا تھا جب وہ ازہر شریف کے دوران طالب علمی جام نور میں اپنی قیمتی اور وسیع تحریروں سے محفوظ کراتے تھے۔ جب وہ مکمل طور پر اپنے وطن بدایوں شریف تشریف لے آئے پھر تو وہ اتنے برقی رفتار ہو گئے گویا قسری، تحقیقی، علمی، تخلیقی اور فکری مہمات ان میں فروکش ہو گئی ہوں۔ ان کے مقالات مسلسل جام نور میں شائع ہوتے رہے اور علمی تحقیقی کتابیں بھی منظر عام پر آتی رہیں اور علمی دنیا کو سیراب کرتی رہیں اور اس وقت تو ان کی عظمت و شہرت کو گویا

پد لگ گئے جب انہوں نے جام نور میں ”خامہ تلاشی“ شروع کی اور برصغیر کی علمی دنیا میں دھوم مچادی۔ جب تک یہ کالم شائع ہوتا رہا، طلبہ کیا، اساتذہ اور محققین بھی اس کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے رہے۔

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

کام کرنے والوں کی اس بھیڑ میں مولانا وہ تنہا شخصیت ہیں جو آج کے فاضل نوجوانوں اور قسری سوچ رکھنے والی نسل کے مقتدی تھے۔ ان کی عمر اور ان کے کام کی طویل ترین فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو واقعی کام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ انہیں شاید معلوم تھا کہ میرا وقت قریب تر ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنے حصے کا کام کر ڈالو۔ ۳۹ سال کی مختصر عمر میں ان کی تصنیفات، تالیفات، تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ

کہا کہ ”حضرت! آپ ممبئی میں ہیں؟“ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو مولانا نے جواب میں لکھا کہ ”اگر آپ وہی ہیں جو ماہ نامہ سنی و جماعت اسلامی ممبئی میں مضامین لکھتے ہیں تو مجھے آپ سے مل کر بہت خوش ہوگی۔“ مولانا کے اس جواب کو پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ وہ پڑھنے لکھنے والوں سے کس قدر محبت فرماتے تھے۔

اسی ملاقات کے سلسلے میں ان سے کئی مرتبہ فون پر بات ہوئی۔ وقت طے ہوا لیکن ان کو عین موقع پر کوئی کام نکل آیا اور وہ پونہ تشریف لے گئے۔ ان کی مصروفیات اتنی تھیں کہ وہ وقت نہیں نکال پارہے تھے۔

ممبئی سے بدایوں کی رخصتی سے ایک دن قبل بات ہوئی تو فرمانے لگے آپ ملاقات ضرور کر لیجیے، ورنہ مجھے بہت افسوس رہے گا، آپ کو مجھے اپنی کچھ تازہ کتابیں بھی دینی ہیں، ”ممبئی سینٹرل اسٹیشن کے سامنے زیر تعمیر ایک ٹاور کے ایک کمرے میں ان سے ملاقات ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی فرمایا: ”آپ تو وہی ہیں جو مقابلہ حدیث میں بدایوں شریف تشریف لائے تھے۔“ میرے ساتھ مولانا مظہر حسین عظیمی مدظلہ

معاون ماہ نامہ سنی و جماعت اسلامی ممبئی بھی تھے۔ بے حد خوش ہوئے۔ گفتگو کے دوران علمی و فکری و جماعتی امور پر پر مغز گفتگو کرتے رہے اور کام کرنے والوں کو سراہتے رہے۔ مولانا مظہر حسین عظیمی نے مولانا اسید الحق صاحب قبلہ کو ”سنی و جماعت اسلامی“ کی چند تازہ مطبوعات پیش کیں۔ کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور سنی و جماعت اسلامی اور امیر

کی و جماعت اسلامی مولانا محمد شاہ علی نوری صاحب قبلہ کو سراہتے رہے۔ سب وعدہ مجھے اپنی کچھ کتابیں تبصرے کے لیے عنایت فرمائیں لیکن ان کتابوں کے تبصرے کا وقت نہیں آیا، مگر اس سے پہلے ہی کہنا کا وقت اجل آ پہنچا۔ دوران گفتگو فرمانے لگے کہ ممبئی کی سینٹرل لائبریری میں انگریزی ناخذ کی بڑی اہم اہم کتابیں ہیں اور یہاں مستشرقین کتابوں کے اصل نسخے بھی موجود ہیں۔ مولانا ان مستشرقین کی بات

رہے تھے جن کے حوالے مثبت یا منفی نقطہ نظر سے سیرت نبوی میں لکھے جاتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے والے نے قلم کاروں پر گفتگو کا رخ ان کو فرمانے لگے کہ مجھے کام کرنے والے نوجوانوں سے بہت محبت ہے۔ جماعت اہل سنت کے موجودہ احوال کا تذکرہ چھڑا تو نہایت افسوس

تھا کہ گویا ہوئے کہ اگر آپ سے ذرا سی چوک ہو جائے اور آپ کی گفتگو کچھ لوگوں کے ذہنی سانچے میں فٹ نہ ہو سکے تو یہ لوگ آپ کی ساری خدمات پر یک لخت پانی پھیر دیتے ہیں۔ اس ملاقات میں مولانا اپنے ساتھ کھانا کھانے کا بھی اصرار کرتے رہے اور اپنے خادم سے کھانا لانے کو بھی کہہ دیا مگر ہم لوگ اس لیے واپس آ گئے کہ دیگر حضرات ملاقات کے لیے آنے والے تھے اور کمرے میں جگہ تنگ تھی۔ ہمیں

کیا معلوم تھا کہ مولانا سے یہ آخری ملاقات ہے۔ آج افسوس ہو رہا ہے کہ اگر ہم مولانا کے ساتھ کھانا کھا لیتے تو کچھ دیر اور ان کی علمی گفتگو سے استفادہ کرتے۔ ہم لوگ جب واپس آنے کے لیے کھڑے ہوئے تو مولانا بھی کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کہ میں اپنے ہر ملاقاتی سے تین چیزوں کی دعا کے لیے ضرور کہتا ہوں۔ آپ سے بھی کہہ رہا ہوں۔ علم نافع، عمل صالح اور خاتمہ بالخیر۔ ان کی گفتگو تکلف سے عاری ہوتی، بالکل حقیقی، جو وہ کہتے خلوص دل سے ہی کہتے تھے۔

۲۰۰۷ء میں میں ”الجمیع الاسلامی“ مبارک پور سے مقابلہ علوم حدیث میں شرکت کے لیے خانقاہ قادریہ بدایوں شریف حاضر ہوا۔ یہ مقابلہ مولانا نے منعقد کیا تھا اور اس میں جامعہ اشرفیہ، دارالعلوم علیہ اور نیز ہندوستان کے دیگر مدارس کے بہت سارے طلبہ شریک تھے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس مقابلے میں شرکت کرنے والا ہر طالب علم مولانا کے اخلاق عالیہ کی گواہی دے گا۔ مولانا ہر ایک سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ خانقاہ میں تو بہت سی ہیں اور وہاں کے شاہزادگان بھی بہت سے

ہیں، مگر ہمارے اس خانقاہی شاہزادے اور عظیم المرتبت شہید راہ بغداد کی مثال دور دور تک نہیں پیش کی جاسکتی۔ اپنے آپا اجداد کے علمی و فکری سرمائے کو عوام و خواص تک پہنچانے کا جوا غار انہوں نے کیا اور جس حسن ترتیب، سلیقے اور تسلسل سے کیا وہ برصغیر کی خانقاہی تاریخ کا ناقابل فراموش عنوان ہے۔ انہوں نے اپنی آبائی خانقاہ، خانقاہ قادریہ کو کبھی اپنے لیے رزق کا ماخذ نہیں بنایا، اس لیے بجا طور پر ہانگ دہل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اپنی خانقاہی عظمتوں پر اپنا سگھاسن بجانے والے دیگر خانقاہی شاہزادوں کے لیے درس عبرت ہیں ہمارے مولانا اسید الحق۔

مولانا کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جو حضرات اور بڑی شخصیات جلدی کسی سے متاثر نہیں ہوتیں وہ بھی ان سے حد درجہ متاثر تھیں۔ ان جیسا نوجوان عالم دین اور مختلف حیثیتوں کا مالک پوری جماعت

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

کام کرنے والوں کی اس بھیڑ میں مولانا وہ تنہا شخصیت ہیں جو آج کے فاضل نوجوانوں اور قسری سوچ رکھنے والی نسل کے مقتدی تھے۔ ان کی عمر اور ان کے کام کی طویل ترین فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو واقعی کام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ انہیں شاید معلوم تھا کہ میرا وقت قریب تر ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنے حصے کا کام کر ڈالو۔ ۳۹ سال کی مختصر عمر میں ان کی تصنیفات، تالیفات، تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ

تک پہنچتی ہے اور ان کے علاوہ ایک سو سے زائد علمی و تحقیقی کتابیں ہیں جو انہوں نے اپنی زیر نگرانی لکھوائیں۔ مولانا موصوف سے میری زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں، کل ملا کر تین چار سے زیادہ نہیں لیکن ان مختصر ملاقاتوں نے مولانا کی سحر طراز شخصیت کے جو اثرات مجھ پر قائم کیے وہ شاید یہی کبھی دھند لے ہوں۔

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

گفتگو کچھ لوگوں کے ذہنی سانچے میں فٹ نہ ہو سکے تو یہ لوگ آپ کی ساری خدمات پر یک لخت پانی پھیر دیتے ہیں۔ اس ملاقات میں مولانا اپنے ساتھ کھانا کھانے کا بھی اصرار کرتے رہے اور اپنے خادم سے کھانا لانے کو بھی کہہ دیا مگر ہم لوگ اس لیے واپس آ گئے کہ دیگر حضرات ملاقات کے لیے آنے والے تھے اور کمرے میں جگہ تنگ تھی۔ ہمیں

کیا معلوم تھا کہ مولانا سے یہ آخری ملاقات ہے۔ آج افسوس ہو رہا ہے کہ اگر ہم مولانا کے ساتھ کھانا کھا لیتے تو کچھ دیر اور ان کی علمی گفتگو سے استفادہ کرتے۔ ہم لوگ جب واپس آنے کے لیے کھڑے ہوئے تو مولانا بھی کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کہ میں اپنے ہر ملاقاتی سے تین چیزوں کی دعا کے لیے ضرور کہتا ہوں۔ آپ سے بھی کہہ رہا ہوں۔ علم نافع، عمل صالح اور خاتمہ بالخیر۔ ان کی گفتگو تکلف سے عاری ہوتی، بالکل حقیقی، جو وہ کہتے خلوص دل سے ہی کہتے تھے۔

۲۰۰۷ء میں میں ”الجمیع الاسلامی“ مبارک پور سے مقابلہ علوم حدیث میں شرکت کے لیے خانقاہ قادریہ بدایوں شریف حاضر ہوا۔ یہ مقابلہ مولانا نے منعقد کیا تھا اور اس میں جامعہ اشرفیہ، دارالعلوم علیہ اور نیز ہندوستان کے دیگر مدارس کے بہت سارے طلبہ شریک تھے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس مقابلے میں شرکت کرنے والا ہر طالب علم مولانا کے اخلاق عالیہ کی گواہی دے گا۔ مولانا ہر ایک سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ خانقاہ میں تو بہت سی ہیں اور وہاں کے شاہزادگان بھی بہت سے

ہیں، مگر ہمارے اس خانقاہی شاہزادے اور عظیم المرتبت شہید راہ بغداد کی مثال دور دور تک نہیں پیش کی جاسکتی۔ اپنے آپا اجداد کے علمی و فکری سرمائے کو عوام و خواص تک پہنچانے کا جوا غار انہوں نے کیا اور جس حسن ترتیب، سلیقے اور تسلسل سے کیا وہ برصغیر کی خانقاہی تاریخ کا ناقابل فراموش عنوان ہے۔ انہوں نے اپنی آبائی خانقاہ، خانقاہ قادریہ کو کبھی اپنے لیے رزق کا ماخذ نہیں بنایا، اس لیے بجا طور پر ہانگ دہل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اپنی خانقاہی عظمتوں پر اپنا سگھاسن بجانے والے دیگر خانقاہی شاہزادوں کے لیے درس عبرت ہیں ہمارے مولانا اسید الحق۔

مولانا کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جو حضرات اور بڑی شخصیات جلدی کسی سے متاثر نہیں ہوتیں وہ بھی ان سے حد درجہ متاثر تھیں۔ ان جیسا نوجوان عالم دین اور مختلف حیثیتوں کا مالک پوری جماعت

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

کام کرنے والوں کی اس بھیڑ میں مولانا وہ تنہا شخصیت ہیں جو آج کے فاضل نوجوانوں اور قسری سوچ رکھنے والی نسل کے مقتدی تھے۔ ان کی عمر اور ان کے کام کی طویل ترین فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو واقعی کام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ انہیں شاید معلوم تھا کہ میرا وقت قریب تر ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنے حصے کا کام کر ڈالو۔ ۳۹ سال کی مختصر عمر میں ان کی تصنیفات، تالیفات، تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ

تک پہنچتی ہے اور ان کے علاوہ ایک سو سے زائد علمی و تحقیقی کتابیں ہیں جو انہوں نے اپنی زیر نگرانی لکھوائیں۔ مولانا موصوف سے میری زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں، کل ملا کر تین چار سے زیادہ نہیں لیکن ان مختصر ملاقاتوں نے مولانا کی سحر طراز شخصیت کے جو اثرات مجھ پر قائم کیے وہ شاید یہی کبھی دھند لے ہوں۔

مولانا سے میرا تعارف تو اسی وقت ہو چکا تھا جب وہ ازہر شریف کے دوران طالب علمی جام نور میں اپنی قیمتی اور وسیع تحریروں سے محفوظ کراتے تھے۔ جب وہ مکمل طور پر اپنے وطن بدایوں شریف تشریف لے آئے پھر تو وہ اتنے برقی رفتار ہو گئے گویا قسری، تحقیقی، علمی، تخلیقی اور فکری مہمات ان میں فروکش ہو گئی ہوں۔ ان کے مقالات مسلسل جام نور میں شائع ہوتے رہے اور علمی تحقیقی کتابیں بھی منظر عام پر آتی رہیں اور علمی دنیا کو سیراب کرتی رہیں اور اس وقت تو ان کی عظمت و شہرت کو گویا

پد لگ گئے جب انہوں نے جام نور میں ”خامہ تلاشی“ شروع کی اور برصغیر کی علمی دنیا میں دھوم مچادی۔ جب تک یہ کالم شائع ہوتا رہا، طلبہ کیا، اساتذہ اور محققین بھی اس کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے رہے۔

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

کام کرنے والوں کی اس بھیڑ میں مولانا وہ تنہا شخصیت ہیں جو آج کے فاضل نوجوانوں اور قسری سوچ رکھنے والی نسل کے مقتدی تھے۔ ان کی عمر اور ان کے کام کی طویل ترین فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو واقعی کام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ انہیں شاید معلوم تھا کہ میرا وقت قریب تر ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنے حصے کا کام کر ڈالو۔ ۳۹ سال کی مختصر عمر میں ان کی تصنیفات، تالیفات، تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ

تک پہنچتی ہے اور ان کے علاوہ ایک سو سے زائد علمی و تحقیقی کتابیں ہیں جو انہوں نے اپنی زیر نگرانی لکھوائیں۔ مولانا موصوف سے میری زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں، کل ملا کر تین چار سے زیادہ نہیں لیکن ان مختصر ملاقاتوں نے مولانا کی سحر طراز شخصیت کے جو اثرات مجھ پر قائم کیے وہ شاید یہی کبھی دھند لے ہوں۔

مولانا اسید الحق قادری برصغیر کے ممتاز عالم دین، عظیم ناقد و محقق اور بے مثال تحریروں کے مالک تھے ہی، عصر حاضر میں جدید قلم کاروں کے سر پرست اور مربی بھی تھے اور ہم سب کے ہیرو اور آئیڈیل بھی۔

کام کرنے والوں کی اس بھیڑ میں مولانا وہ تنہا شخصیت ہیں جو آج کے فاضل نوجوانوں اور قسری سوچ رکھنے والی نسل کے مقتدی تھے۔ ان کی عمر اور ان کے کام کی طویل ترین فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو واقعی کام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ انہیں شاید معلوم تھا کہ میرا وقت قریب تر ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنے حصے کا کام کر ڈالو۔ ۳۹ سال کی مختصر عمر میں ان کی تصنیفات، تالیفات، تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ

میں کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ بات شاید کسی کو مبالغہ محسوس ہو لیکن یہ مبالغہ نہیں حقیقت واقعہ ہے۔ علمی اختلافات اپنی جگہ لیکن ان کی خدمات اور ان خدمات کے اثرات سے انکار ان کے بڑے سے بڑے معاند کو بھی ممکن نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں بڑے اور قائد وہی ہوتے ہیں جن کی شخصیت اور خدمات کے اثرات معاشرے پر قائم ہوں اور یہ اثرات دیر پا اور پائیدار بھی ہوں۔ بڑی شخصیتوں کی عظمت کو ناپنے کا بس ایک یہی پیمانہ ہے، اس سے قطع نظر کہ لوگ وقتی طور پر ان کے بارے میں کیسی رائے رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں مولانا اسید الحق قادری ہمارے معاشرے کی بڑی عظیم شخصیت تھے اور برصغیر میں اہل سنت کے ایک عظیم نوجوان قائد۔ کوئی انہیں پسند کرے یا نہ کرے لیکن اس سے مولانا کی بزرگی اور عظمت پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔

مولانا نے مکمل طور پر ثابت کر دیا کہ ان کی شخصیت اہل سنت کے لیے کس قدر اہمیت کی حامل تھی۔ انہوں نے بتا دیا کہ اپنے فضل و کمال اور اپنے منہ میاں مٹھو ہر کفر نہ لگانے، دعویٰ بلند کرنے اور چیخ و پکار مچانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ جو ہو پہلے اسے ثابت کر دکھاؤ۔ اس کے بعد نیا مانے گی کہ آپ کیا ہو۔ مولانا نے واقعتاً اپنے آپ کو ثابت کر دیا اور یہ ثابت کیا کہ دور جدید میں اتنی کم عمری میں بیک وقت اتنا زبردست محقق، مصنف، تنقید نگار، صاحب الرائے، دانشور، مفکر، مدیر، مرتب، مترجم، خطیب، شاعر، مدرس اور پیر طریقت کسی نے دیکھا نہ سنا۔

مولانا اسید الحق اگر چاہتے تو از ہر سے فراغت کے بعد کوئی بہت بڑا جامعہ قائم کر دیتے، عمارت پر عمارت تعمیر کراتے، ملک و بیرون ملک تقریریں کر کے چندہ کرتے، دست بوی کراتے۔ یہ ان کے لیے کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا کیوں کہ وہ خود ایک بڑی خانقاہ کے شاہ زادے تھے۔ ان کے والد گرامی کے مریدین کا ایک بہت بڑا حلقہ موجود ہے۔ اگر وہ چاہ لیتے تو پوری آن ہان شان کے ساتھ یہ کام کر گزرتے مگر انہوں نے اس کے برخلاف روایت سے الگ ہٹ کر ایسا راستہ منتخب کیا جو واقعہً بہت دشوار گزار ہے۔ انہوں نے مدرسہ قادریہ میں محنتی طلبہ رکھے اور باشعور اساتذہ کا تقرر کیا، انہیں کو سنوارا، نکھارا اور انہیں فکر و تحقیق کے بالمقابل کھڑا کیا۔ اس طرح انہوں نے کام کرنے والے افراد (مختصر ہی سہی) جماعت اہل سنت کے حوالے کیے۔ میرے خیال

میں ان کے دماغ میں یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ مدرسے تو قائم کرنے والے بہت ہیں مگر افراد تیار کرنے والے کم ہی لوگ ہیں۔ ان کا نظر تو وسیع سے زیادہ استحکام پر تھی، اس لیے انہوں نے مدرسے کی توسیع سے زیادہ افراد کی تربیت پر توجہ دی۔ اندازہ فرمائیے کسا گروہ اپنی حق کے ساتھ رخصت ہوتے تو ان کے کام کے اثرات کس قدر ہوتے۔ جی تیوی سے وہ کام کر رہے تھے اس اعتبار سے کیا کوئی ان کے کام کی جامعیت، وسعت اور طوالت کا اندازہ کر سکتا ہے؟

کیا جماعت میں کوئی ہے جو مولانا اسید الحق کی طرح چھوڑ کر بھی ساتھ لے کر چل سکے؟ بڑے تو بہت ہیں، دو چار جیسے حوصلہ افزاں کرنے والے بھی مل جائیں گے لیکن ان میں مولانا اسید الحق کوئی نہیں۔ میں پورے دعویٰ اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نئی نسل کا باشعور جہاد جتنا زیادہ ان کی شخصیت سے متاثر تھا کسی اور سے نہیں۔ ان نوجوانوں پر مولانا کی قلمی و فکری تحریک کے جتنے اثرات ہیں، اتنے کسی اور کے نہیں۔ آج جماعت میں جو شعور پیدا ہوا ہے اس کے پیچھے مولانا کی قلمی و فکری تحریک کا رفرما ہے۔ مولانا موصوف اور ان کے نہایت قریب دوست مولانا خوشتر نورانی جماعت اہل سنت میں قلمی انقلاب، فکری بیداری اور صالح تنقیدی شعور کے بانی اور محرک ہیں۔ ان کی تحریروں نے شعور پیدا کیا اور روایت سے ہٹ کر کام کرنے کا اور سوچنے کا حوصلہ بخشا۔ مولانا دور جدید کے وہ تنہا مجاہد تھے جنہوں نے بے جا روایت پرستی، اندھی عقیدت، خطائے بزرگاں گرفتار خطا است، کے معنوی بت پاش پاش کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی خامہ تلاشی کے ذریعے بے ہی مقالات پر سخت تنقیدیں کر کے، چھوٹے تو کیا بڑے اور سینئر قلم کاروں پر خوب صورت نقد و جرح کے ذریعے نئی نسل کو ایک تعمیراتی اور تخلیقی شعور بخشا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک ان کی تنقیدات و اختلافات مذموم نہیں، محمود ہیں۔ الحمد للہ اب جماعت کا شعور بہت حد تک بیدار چمکا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا اسید الحق قادری دور جدید میں نسل نو کے سب سے بڑے محسن کی حیثیت سے کھڑے نظر آئیں گے۔ انہیں اللہ عز و جل نے غالباً اسی لیے دنیا میں بھیجا تھا کہ یہ ذمہ داری انہوں نے بحسن و خوبی انجام دی اور اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔

بقیہ صفحہ 291 ملاحظہ کریں

(۷)

کمالات و امتیازات

ایک تھا خامہ تلاش

کسے خبر تھی کہ یہ قلب وقت اتنی جلدی اس دنیا سے اٹھ جائے گا اور ایک عالم سوگ میں ڈوبا ہوگا

کیرائی، شائستگی، شگفتگی اور وقار تحریروں میں تھی وہی شخصیت میں بھی تھی۔ روشن چہرہ، بے داغ و کشادہ پیشانی، گلاب کی چھکڑیوں سے نازک اور مسکراتے ہونٹ، وضع قطع، لباس اور رفتار و گفتار میں بے پناہ سلیقہ و شائستگی، مطالعہ بڑا وسیع، جدید و قدیم علوم و فنون پر گہری نظر، ایک سے زائد زبانوں اور ان کے محاوروں پر اہل زبان کی ہی گرفت لیکن چند اہل علم تھا کہ چھوکر نہ گزرا تھا۔ وقار اور عاجزی کا ایسا سنگم کہ دیکھتے تو دیکھتے رہ جاتے۔ اوسط قد کے اس وجیہ نوجوان کی عظمتیں اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ اس بلندی تک دیکھنے میں بھی اچھے اچھوں کی ٹوپیاں گر جائیں۔

ہم ایک دوسرے کے بہت بے تکلف دوست نہ تھے، ہماری عمروں میں بھی تقریباً دس سال کا فرق تھا، پھر بھی وہ اور ان کے بے تکلف دوستوں کی مجلسوں میں شریک رہنے کے مواقع ملتے رہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں اور ان کے دوسرے احباب میں یہ فرق تھا کہ بے تکلف مجلس گفتگو میں بھی کبھی کوئی ہلکی بات ان کی زبان پر نہ آتی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ وقار و شائستگی اوڑھے رہتے بلکہ ان کے طنز کی کاٹ اوروں سے تیز ہوتی، ان کے برجستہ مزاح سے آپ دیر تک محفوظ ہو سکتے تھے۔ خوشتر نورانی، مسیح رحمانی، احمد مجتبیٰ صدیقی، ذیشان مصباحی اور کئی دوسرے احباب بعد میں بھی اس سے لطف اندوز ہوتے، دوستوں کے درمیان نقل کرتے، ان کے کئی معنی خیز فقرے اور برجستہ جملے ضرب المثل کی طرح استعمل کیے جانے لگے تھے۔ بزرگوں میں پروفیسر ظہر رضوی برقی، ڈاکٹر شرر مصباحی، مولانا عبدالحسین نعمانی، پروفیسر فاروقی احمد صدیقی، مولانا سید رکن الدین اصدق، ڈاکٹر سید شمیم گوہر، راجہ رشید محمود اور عزیز زادہ اقبال احمد فاروقی جیسے اصحاب نقد و نظر ان کے طنز کی کاٹ کے قانس تھے یا اس کا سامنا کر چکے تھے، لیکن کیا مجال کہ کبھی وقار و شائستگی پر کوئی آنچ آئی ہو۔ بات کہنے کا سلیقہ کوئی ان سے سیکھتا۔ وہ

یاد نہیں آتا کہ ان سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی، مولانا خوشتر نورانی کے یہاں، مولانا یحییٰ اختر مصباحی کی کسی مجلس میں یا شاید کہیں اور کسی جلسہ یا سیمینار میں۔ امکان غالب یہی ہے کہ دارالقلم میں ہوئی ہوگی یا جام نور کے دفتر میں، جہاں ان کا آنا جانا زیادہ تھا اور وہ دہلی میں دوران سفر چند گھنٹے بھی ٹھہرتے تو ڈاکٹر گمر میں واقع ان ادبی و علمی خانقاہوں کو اپنی آمد کا شرف ضرور بخشتے۔ ہاں! اتنا ضرور یاد ہے کہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ تھے بلکہ اس وقت تک کم از کم میری کیفیت یہ تھی کہ گلشن علم و ادب کے اس مہکتے پھول کو تو ہم نہ جانے کب سے جانتے ہیں۔ ہماری اس گہری شناسائی کا وسیلہ جام نور کے اوراق اور ان کے وہ محققانہ مضامین تھے جن کو پڑھ کر دل ہر بار اس جذبہ سے سرشار ہو جاتا کہ.....

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے کسی کی تحریروں کو پڑھ کر آپ اس کی جو تصویر بناتے ہیں، اکثر ملاقات کے بعد وہ نکھر جاتی ہے۔ میری طرح آپ نے بھی اپنے احباب سے بار بار سنا ہوگا کہ فلان شخص سے مل کر بڑی مایوسی ہوئی۔ ایک شخص بڑی خوبصورت نثر لکھتا ہے، اچھے شعر کہتا ہے، اس کی علمی و ادبی نگارشات فکر انگیز ہوتی ہیں لیکن ملیے تو آپ اس کی شخصیت میں وہی حسن اور وہی دجاہت ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔ فکر انگیز مضامین لکھنے والا قلم کار ایک بے فکر، کھلنڈر اور پھوپھو شخص نکلے گا۔ ایک ادیب و شاعر کے کلام میں آپ بڑا حوصلہ اور جوش عمل پاتے ہیں، لیکن اس کی شخصیت اس کے برعکس بزدلی و بے عملی کا نمونہ ہوتی ہے، کوئی مصنف آپ کو اپنی تحریروں میں بڑا قدر و نظر، تاہوگا لیکن قریب جائیں تو بونا اور ہلاکتیہ نکلے گا لیکن میں جس تصویر کا ذکر کر رہا ہوں وہ حقائق کے ساتھ مزید نکھرتی چلی گئی۔ پہلے سے زیادہ روشن اور گہری ہوتی گئی۔ جو علمی و ادبی گہرائی،

ایک باکمال خطیب بھی تھے لیکن قلم اور زبان دونوں پر ان کی ایسی مضبوط گرفت تھی کہ بزرگوں کی محفل میں ہوں یا دوستوں اور عزیزوں کے درمیان، انگوٹھی میں گھینے کی طرح جڑے ہوئے ہوتے۔ جگہ بلند، جاں پر سوز اور سخن و نواز کی ایک ایسی سن موٹی تصویر جو سارے زمانے کو اپنے ہالے میں سمیٹ لینے کی قوت رکھتی تھی۔

شہید بغدادی علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری ازہری کی یادیں کم از کم میرے لیے مستقبل کے ہندوستان میں ملت مظلوم کے ایک میر کارواں کی مرگ ناگہاں کا ماتم ہے جو اچانک اس قافلے کو چھوڑ کر جو اس کا منتظر تھا، اندھیمی منزلوں کے سفر پر چلا گیا۔ اس نوجوان عالم و محقق، صوفی، شکر اور فقیہ میں مارہرہ والے علامہ شاہ عبدالعزیز عین الحق عثمانی بدایونی کا پرتو دیکھتے تھے، حیدر آباد والوں کو اس میں مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی اور مولانا مفتی شاہ عبدالقادر بدایونی کی جھلک نظر آتی ہوگی، اس کی شخصیت میں آج کے تاج الملک شاہ عبدالقادر بدایونی اور مولانا شاہ فضل رسول بدایونی دیکھنے والوں کی بھی کی نہیں رہی ہوگی لیکن میں اس عالم، محقق اور خطیب میں مولانا عبدالماجد بدایونی دیکھتا تھا۔ بے شک یہ اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی سوچ کا معاملہ ہے اور اسید میاں کی شخصیت کا کمال بھی یہی تھا کہ ہر شخص اپنے ذوق اور اپنی طلب کے مطابق اس کی چشمہ شریں سے حسب توفیق اپنی پیاس بجھا سکتا تھا۔ میری رائے سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ملک میں مسلمانوں کی باثناور و صالح قیادت کے فقدان میں یہ ایک سیاسی و سماجی مصری آزدیے محض ہو لیکن سچ مانے کہ میری آنکھیں اتحاد امت و احیائے ملت کی ایک ہمہ گیر تحریک کی امامت و قیادت کی صلاحیتیں آج کے اس پر آشوب دور میں اگر کسی نوجوان میں دیکھتی تھیں تو وہ اسید الحق قادری بدایونی تھے۔ ان کی شہادت پر میرے تاثرات پڑھ کر جیسے علمائے ہند کے ایک مرکزی رہنما نے اس رد عمل کا اظہار کیا کہ 'جانے والا بڑا ہونہار، بڑے کام کا تھا لیکن مارنے والا کیا اسے مار سکتا ہے، اسے تو زندگی مل گئی، بڑا پیارا انسان تھا وہ؟' تو لگا کہ میرا خیال غلط نہ تھا۔ ملک کی مسلکی صورت حال اور مشربی رقابتوں پر گہری نگاہ رکھنے والے ایک بڑے باخبر عالم نے دہلی میں دوران گفتگو بتایا کہ 'مسلم' کے بعض بڑے مرید آردو قائدین خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں کے اس نوجوان نائب

صاحب سجادہ کی اٹھان سے خائف تھے تو احساس ہوا کہ اپنے ہی نہیں غیر بھی اس میں یہ امکان دیکھتے تھے، ورنہ جاہ پسند علماء و مشائخ میں اس سے خوف کے کیا معنی؟

یہ غالباً ۲۰۰۳ء کا واقعہ ہے جب 'جام نور' میں نواز کے ساتھ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری ازہری کی نگارشات آنے لگیں اور ان کے محققانہ تیور نے قارئین کو چوکایا۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا جن کو اگر اس دینی جریدے میں صرف ایک مضمون پڑھنا ہو تو وہ مضمون مولانا ازہری بدایونی کا ہوتا تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ نام نظر آئے اور آپ سرسری گزر جائیں۔ جام نور کے مستقل قلم کاروں میں اس نام نے اپنی ایک منفرد شناخت بنا لی تھی۔ سلیس و گھنگھن نثر، صاف ستھری با محاورہ زبان، موضوع کے ساتھ مکمل انصاف، قاری کے ذہن میں اٹھنے والے گونا گوں سوالوں کے تشفی بخش جوابات، تحریر برائے تحریر نہیں بلکہ تحریر برائے تحقیق کی عمدہ مثال جس میں ایک معقولی ذہن کا شعور بھی جھلکتا تھا، سائنس اور ریاضی کا علم بھی جھانکتا تھا، زبان و ادب اور تاریخ پر گہری نگاہ بھی متوجہ کرتی تھی اور قرآن و حدیث کا گہرا علم بھی بولتا تھا۔ لیکن ان کی شخصیت کا جو ہر ہم پر سچ معنوں میں اس وقت کھلا جب انہوں نے جام نور کے صفحات پر ابوالفضل معنی کے نام سے خامہ تلاش شروع کی۔ ابتدا میں تو یہ محمد ایک سربستہ راز تھا کہ یہ کس عبقری کے قلم کا جوہر ہے۔ بڑے بڑے علماء و دانشوران حیران تھے کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ اکثر کی رائے تھی کہ یہ کوئی ایک شخص نہیں ہو سکتا جو حدیث اور اصول حدیث پر بھی بات کر رہا ہے، شعر و سخن پر بھی گفتگو کر رہا ہے، ادب، تاریخ اور زبان پر بھی کلام کرتا ہے، تفسیر و علوم قرآن میں بھی اتنا ہی درک رکھتا ہے اور معقولات میں بھی اتھارٹی ہے۔ اس کالم کے لیے ایک پوری ہجائیت تیق ہوگی اور مختلف علوم و فنون کے ماہر الگ الگ افراد کی کئی کئی دنوں کی محنت کے نتیجے میں یہ تین صفحات تیار ہوتے ہوں گے۔ کسی کے گمان میں نہیں تھا کہ یہ ایک پچیس تیس سال کے جوان کی صرف تین چار گھنٹے کی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

"خامہ تلاشی" نے بہت سے نازک آئینوں کو ٹھیس پہنچائی، کئی بحثوں کے دروازے کھولے جن سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا لیکن خود "خامہ تلاش" کی شخصیت بھی "جام نور" کے صفحات پر ایک

عرصے تک موضوع بحث بنی رہی اور یہاں تک کہا گیا کہ اگر یہ ایک ہی شخص ہے تو انسان نہیں ہو سکتا، کوئی جن یا فرشتہ ہوگا۔ خوبی یہ بھی کہ خود اپنے مضامین پر بھی وہ اسی خوبصورتی و غیر جانب داری سے تبصرے کرتے اور اپنی فروگزاشتوں کی بھی اسی سادگی و بے باکی سے نشاندہی کرتے جس بے خوفی اور خود اعتمادی کے ساتھ دوسرے مصنفین کی گرفت کرتے۔ یاد آتا ہے کہ ان ہی دنوں پروفیسر فاروق احمد صدیقی سے میری ملاقات ہوئی، وہ دہلی تشریف لائے ہوئے تھے، جاننا چاہتے تھے کہ ابوالفیض معینی واقعی کوئی حقیقی شخصیت ہے یا یہ کالم کئی افراد کی لکھتے ہیں؟ مجھے احساس ہوا کہ اس کالم کو جام نور کے ہاشور قارئین کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسے کیسی اہمیت و مقبولیت حاصل ہے۔ یہ ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا کہ خامہ تلاشی کا آئیڈیا ”جام نور“ کے ایڈیٹر کو ”نعت رنگ“ (کراچی) کے ہرنے شاعرے میں اس کے گزشتہ شمارے کی مشہور پر مور نا کو کب نورانی کے تفصیلی مکتوب سے آیا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ”نعت رنگ“ کی طرح جام نور کا کوئی ایک موضوع نہ تھا، یہ تو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ بہت غور و فکر کے بعد قرعہ فال علامہ اسیدالحق قادری کے نام لکھا اور انہوں نے بھی اس شرط پر یہ ذمہ داری قبولی کر لی کہ ہر ماہ جام نور کی جملہ مشمولات پر تنقیدی نظر ڈالیں گے اور رسالہ کا ادارہ اور ادارتی نوٹ بھی اس سے منشی نہ ہوگا۔ پھر انہوں نے یہ ذمہ داری جس خوبی سے نبھائی اس پر مرحوم ڈاکٹر پیرزادہ اقبال احمد فاروقی (لاہور) کی گواہی ملاحظہ کریں:

”مجھے ابوالفیض معینی کی ’خامہ تلاشی‘ نے دعوت تحریر دے کر ’خامہ فرسائی‘ پر آمادہ کر دیا۔ میں آپ کے دوسرے قارئین کی طرح ’خامہ تلاشی‘ کے کالم کو دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ معینی صاحب بڑے ہی لطیف انداز میں جام نور کے صفحات کی خامہ تلاشی کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان تحریروں کے دامن کی صفوگری بھی کرتے جاتے ہیں، لغزشوں سے آگاہ کرتے ہیں اور ہمیں احتیاط سے قلم رانی پر آمادہ کرتے ہیں۔ مجھے معینی صاحب کی خامہ تلاشی نے کئی اہل قلم کی یادوں کی خوشبو سے خوش کام کیا ہے۔ کراچی کے مشفق خواجہ ’خامہ بگوش‘ لکھا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں آغا شورش کاشمیری ’چنان‘ کے

’قلم قتلے‘ میں نو سکیل جیل لکھا کرتے تھے۔ مجھے عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کے کالم یاد آتے ہیں تو ’خامہ تلاشی‘ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے ’زمیندار‘ میں لکھے ہوئے ’مطاببات‘ یاد آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام کی غبار خاطر کی رعنائیاں ابھی تک یاد ہیں۔ دربار اکبری کے فیضی کی ’ہانگ قلم دریں شب تار‘ بس چہ معنی خفتہ کرد بیدار‘ یاد آتی ہے تو خامہ تلاشی کی داد دیتا ہوں۔ جو لطافت و نفاست معینی صاحب کی خامہ تلاشی میں ہے اس کا جواب نہیں، بعض دفعہ ان کی تحریروں پر گماں ہوتا ہے کہ وہ بر رخسارہ حور، باروشائی نور، بقلم سرور لکھی جا رہی ہیں۔“ (جام نور، جون ۲۰۰۶ء)

جو تحریروں خامہ تلاشی کے نام سے اپریل ۲۰۰۵ء سے دسمبر ۲۰۰۶ء تک ہر ماہ لکھی گئیں اور پھر قارئین کے مطالبے پر ۲۰۰۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئیں (جس کے ساتھ پردہ اٹھا کہ خامہ تلاشی کوئی اور نہیں علامہ اسیدالحق قادری بدایونی ہی ہیں) وہ محض گل انشتی گفتار نہ تھیں، ان میں علوم و فنون کا گہرا دفور تھا جو ہر کسی کو چوکا تا تھا اور کمال تو یہ ہے کہ یہ سلسلہ پہلی خامہ تلاشی سے ہی شروع ہوا اور آخر تک جاری رہا، ذرا اسلوب تنقید دیکھیں:

”فن شاعری اور حسان الہند پر شرر صاحب نے جو تنقیدی نظر ڈالی ہے، وہ ماہر فن کی حیثیت سے ان ہی کا حصہ ہے اور ان کو زیب بھی دیتی ہے، شرر صاحب کو اس کتاب کے سرورق پر بھی تبصرہ کرنا چاہیے تھا جس میں مولانا ہمدانی صاحب کے میزان عقیدت کے ایک پلہ میں حدائق بخشش ہے تو دوسرے پلہ میں اردو کے تمام نام نہاد صنف اول کے شعرا کے دو اوین۔ کیا یہ سرورق کسی صحت مند فکری رویہ کی عکاسی کرتا ہے؟“ اور یہ کہ:

”حضرت مدنی میاں صاحب کی نعت پاک نے اس مرتبہ منظومات کے کالم کی زینت اور معیار دونوں میں اضافہ کیا ہے..... معنوی اعتبار سے یہ شعر ہمیں بہت پسند آیا:

اللہ اللہ رفعت اشک غم ہجر نبی
جونہی چکا آنکھ سے صبح کا دانہ بنا

ہماری اپنی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے لہذا ہمیں نہیں معلوم کہ توالی اضافت کا کیا قاعدہ ہے؟ اب یہ شرر مصباحی صاحب ہی بتائیں گے کہ ایک مصرعے میں لگا تین سے زیادہ اضافتیں جائز ہیں یا نہیں؟“ (جام نور، مئی ۲۰۰۵ء)

اب ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی کے جوابی مراسلے کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کریں جس سے ’خامہ تلاشی‘ کے اسلوب نگارش کی افادیت و معنویت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے:

”محترم مدنی میاں صاحب کے نعتیہ کلام کی تعریف و توصیف کے بعد توالی اضافت کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے، یہ طرز تحریر ایک پختہ ذہن اور باخ نظر نقاد کا ہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ شعری تعریف کو مقدم اور توالی اضافت کے تعلق سے استفسار کو مؤخر کیا گیا ہے لیکن سخن گسترانہ بات اسی جزء مؤخر میں ہے۔ یہاں شرر مصباحی سے اصلا استفسار مقصود نہیں ہے بلکہ استفسار کے پردے میں ایک شعری عیب کو طشت اڑام کرنا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اساتذہ فن کے یہاں تین سے زائد اضافتیں خلاف فصاحت ہیں، گو غالب بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔“ (جام نور، جون ۲۰۰۵ء)

کسی فقہی سیمینار بورڈ کے ایک سیمینار کی رپورٹ پر ’خامہ تلاشی‘ کے تبصرے کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کریں:

”پہلے ہمارے یہاں مدرسوں کے نام مدرسہ یا دارالعلوم ہوا کرتے تھے۔ کسی نے اپنے مدرسہ کا نام جامعہ رکھ لیا تو آنا فانا ہندوستان کے طول و عرض میں سینکڑوں جامعات اور مجوزہ یونیورسٹیاں معرض وجود میں آ گئیں۔ کہیں سے تربیت افتا کا نعرہ لگایا گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار مدرسوں میں تربیت افتا اور تخصص فی الافتا کے شعبے قائم ہو گئے۔ اب جبکہ فقہی بورڈوں اور شرعی کونسلوں کے قیام کا آغاز ہو ہی گیا ہے تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اب ہر دوسرے تیسرے مدرسہ میں فقہی بورڈ قائم ہوتے دیکھ نہیں لگے گی۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ ان سیمیناروں میں ایسے مسائل پر بحث کی جا رہی ہے جن میں اتنی زیادہ بحث و تحقیق کی سرے سے ضرورت ہی نہیں

ہے۔ مثلاً گل منجن سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ ہم کے ذریعے پھیلیوں کا شکار کرنا کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کے جوابات تو آپ کسی بھی ذمہ دار دارالافتا سے معلوم کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اور اس قسم کے سوالات اتنے پیچیدہ ہیں ہی نہیں کہ ان کے حل کے لیے ایک فقہی بورڈ کی تشکیل کرنا پڑے۔“ (جام نور، اپریل ۲۰۰۵ء)

ایک خامہ تلاشی سے یہ اقتباس:

”ادارہ میں ایک دو جگہ ہمیں زبان و بیان کے رخ سے بھی تامل ہے۔ مثلاً آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں..... ہمارے مذہبی حلقوں میں لفظ کرم کو نوازی استعمال ہوتا ہے۔ ادارہ میں بھی ایک جگہ استعمال کیا گیا ہے، مگر ہماری ناقص رائے میں یہ ترکیب درست نہیں ہے۔“

مولانا اسیدالحق بدایونی کا مضمون ’حدیث افتراق امت تحقیق مطالعہ کی روشنی میں‘ غالباً ایک طویل مضمون ہے جس کی یہ پہلی قسط ہے۔ ایک فاضل از ہر سے جس قسم کے تحقیقی مضامین کی توقع کی جاسکتی ہے، مولانا اس پر ہمیشہ پورے اترتے ہیں۔ حدیث افتراق امت کے آخری جز لکھا فی النار والا واحدہ پر انہوں نے تحقیقی بحث کرتے ہوئے اس کو کثرت طرق کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے ہماری ناقص معلومات کی حد تک یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ مطلقاً ہر ضعیف الاسناد حدیث تعدد طرق کی وجہ سے حسن قرار دے دی جائے۔ (جام نور، جون ۲۰۰۵ء)

اکتوبر ۲۰۰۵ء کی خامہ تلاشی کا یہ ابتداء یہ بھی دیکھیں:

”جوش ملیح آبادی نے اپنی خود نوشت سوانح ’یادوں کی بارات‘ ماہر القادری مدظلہ فاضل کو اس نوٹ کے ساتھ ارسال کی تھی کہ ’جناب ماہر! لیجئے بکرا حاضر ہے، شوق سے ذبح فرمائیے اور پھر ماہر القادری نے بھی اس شان سے بکرا ذبح کیا کہ تقریباً ۶۰ صفحات میں تنقید کا حق ادا کر دیا۔ ہمارے دوست مولانا خوشتر نورانی بھی کچھ اسی قسم کے نوٹ کے ساتھ ہر ماہ جام نور کی ایک کاپی ہمیں ارسال کر دیتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ خود ان کی اپنی تحریروں ہی اب تک قربانی کا بکرا بنتی چلی آرہی ہیں۔“

ڈاکٹر سید شمیم گوہر کی ایک تنقید کے رد عمل میں راجا رشید محمود کے ناشائستہ و غیر مہذب حملے پر 'خامہ تلاش' کے لہجے کی کاٹ ملاحظہ کریں:

"ہمارے پیش نظر اخوت اسلامی کا آفاقی تصور ہے جس کی بنیاد پر ہم سرحدوں اور درزبانوں کے تعصب کو ناپسند کرتے ہیں لہذا ہم جواب آں غزل کے رنگ میں 'مملکت خدام نعت' کے راجا اور نعت کے موضوع پر دنیا میں سب سے زیادہ کام کرنے والے محترم رشید محمود صاحب سے یہ پوچھنے کی جرات نہیں کر سکتے کہ اگر نعت کے ایک مصرعہ میں ایک ہندی لفظ (اپکار) استعمال کرنا صرف اس بنیاد پر گردن زدنی جرم ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے تو کیا پنجابی انڈیا و سرسلین اور اہل جنت کی زبان ہے جس میں راجا صاحب نے تین مجموعہ نعت لکھ کر ثواب دارین حاصل کیا ہے؟ اگر ہندوستان کے غریب مسلمان ہندو معاشرت، ہندو سیاست اور ہندو تعلیم کے زیر اثر دینی شعائر سے مغائرت اور مخالفت کرنے پر مجبور ہیں تو ان کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے مگر مملکت خداداد کے ان 'خالص مسلمانوں' کی کیا مجبوری ہے جو نظام اسلام اور حدود شریعت کے نفاذ کی شب و روز مخالفت کر کے مغربی طرز زندگی، مغربی نظام تعلیم اور مغربی نظام حکومت کے نفاذ کی راہ میں خالص اسلامی جہاد کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں؟

..... راجا صاحب معاف فرمائیں ہم ان سے دست بستہ ان ہی کے الفاظ میں وہی التجا کریں گے جو انہوں نے محترم ڈاکٹر شمیم گوہر سے کی ہے کہ 'ازراہ کرم ششے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر نہ پھینکیں'۔" (جام نور، اگست ۲۰۰۶ء)

ان کے فکری اعتدال کا یہ رنگ بھی دیکھیں۔ تقسیم کے مسئلہ اور سیاست (ہندوپاک) کی الجھی ہوئی تھیوں پر شاید اس سے زیادہ متوازن اور سچی ہوئی ہو سکتی:

"خوشتر صاحب نے (اداریہ میں) تقسیم ہندو 'گندی سیاست' کا نتیجہ اور سیاسی بساط پر چالیں کھینے والوں کی 'بازی گری' قرار دیا ہے۔ اس موضوع پر ہندوپاک میں 'زشتہ نصف صدی' میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ حقیقت کی تلاش مشکل ہو گئی

ہے۔ تقسیم کے عوامل کو کوئی خالص مذہبی قرار دیتا ہے تو کوئی خالص سیاسی، کچھ لوگ اس کو نیم مذہبی نیم سیاسی تحریک بتاتے ہیں۔ تقسیم سے قبل کے حالات کا اگر منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب، سیاست اور مستقبل کا خوف یہ تینوں ایک ناگزیر مثلث کی شکل اختیار کر گئے تھے جس کے تینوں اضلاع باہم کچھ ایسے پیوست تھے کہ ان کو اقلیدس کے خطوط پر بھی الگ کرنا ناممکن تھا۔ آج یہ کہنا آسان ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ہو جاتا اور یہ نہ ہوتا تو ایسا ہوتا مگر جو کچھ ہوا اور اس کے نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس حقیقت سے کوئی آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ خوشتر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہر حال کسی حد تک حقیقت ہے مگر پھر بھی تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ اگر یہاں اجمالاً ہی سبھی تھوڑی سی روشنی ہمارے پاکستانی احباب کے احساسات و جذبات پر بھی ڈال دی گئی ہوتی کہ خود وہ لوگ تقسیم کو کس انداز میں دیکھتے ہیں اور ان کے خیال میں یہ تقسیم ان کے حق میں کتنی مضریا مفید ثابت ہوئی ہے تو کسی کو تحریر میں ایک قطبییت یا عدم توازن کا شکوہ بھی نہ ہوتا اور صحافتی غیر جانبداری کا حق بھی ادا ہو جاتا۔" (جام نور، جون ۲۰۰۵ء)

اعتماد و استحضار علمی کا یہ رنگ بھی دیکھیں:

"معجزہ شق القمر کی احادیث کے بارے میں مولانا منظر (الاسلام ازہری) صاحب فرماتے ہیں 'راقم کی تحقیق کے مطابق اس مضمون کی حدیث چو جلیل القدر صحابہ کرام سے مروی ہے۔' اب ظاہر ہے کہ منظر صاحب جیسے وسیع المطالعہ محقق کی اس 'ازہری تحقیق' کے سامنے خامہ تلاش جیسا محدود المطالعہ لب کشائی کی جرات کیسے کر سکتا ہے؟ ہاں! البتہ اس پر اظہار تعجب کا حق تو ہمیں ہے ہی کہ بالکل وہی تحقیق حافظ ابن کثیر اور امام سیوطی کی بھی ہے۔ ان دونوں حضرات نے بھی اس معجزہ کے سلسلہ میں صرف چھ صحابہ کا ذکر کیا ہے۔ (سیوطی: الدر المنثور ج: ۱، اور ابن کثیر: الہدایہ والنہایہ ج: ۱)۔ منظر صاحب تلاش و تحقیق جاری رکھیں ممکن ہے کہ ان چھ کے علاوہ اور بھی کچھ صحابہ کے اسے گرامی ان کو مل جائیں جن سے باسناد صحیح

اس مضمون کی حدیث مروی ہے۔ اگر تلاش میں کامیابی نہ ہو تو اس کم سواد محدود المطالعہ کو ضرور مطلع کریں، ممکن ہے یہ اپنے ہندوستانی مطالعے کی روشنی میں ان کی کچھ مدد کر سکے اور چھ اسما کی فہرست میں تین ناموں کا اور اضافہ ہو جائے۔" (جام نور، ستمبر ۲۰۰۶ء)

خامہ تلاش کی یادوں کے جزیرے میں اترنے کے لیے 'خامہ تلاشی' کا ایک اور مطالعہ ناگزیر تھا، لیکن کیا بتائیں کہ یہ مطالعہ دل پر کتنی شوق گزرا، اس دوران ہماری آنکھیں کتنی بار پھٹکیں اور آخری 'خامہ تلاشی' کے اس حصے کو پڑھتے ہوئے ہماری کیفیت کیا تھی، بس اتنا سمجھ لیجئے کہ میں اپنی جھگیوں کو روک نہیں سکا:

"ہاں! 'خامہ تلاش' آپ سے اجازت چاہتا ہے۔ اب شاید کبھی اس سے آپ کی ملاقات نہ ہو۔ آپ سمجھ لیں کہ ایک خانہ بدوش تھا جو کسی نامعلوم مقام سے آپ کی بستی میں وارد ہوا، کچھ دن آپ کے ساتھ گزرا اور جب دل بھر گیا تو اپنا سامان اٹھا کر کسی نامعلوم مقام کی طرف کوچ کر گیا۔ خانہ بدوش تو خانہ بدوش ہوتا ہے، اس کی شناخت اور معرفت کا کوئی معتبر حوالہ نہیں ہوتا۔ اب خامہ تلاش جام نور کے صفحات پر تو موجود نہیں ہوگا، مگر قارئین کے دلوں میں، ذہنوں میں، تذکروں میں، تبصروں میں اور ان کے احساسات و خیالات میں ایک طویل عرصے تک اس کی یادیں اس کو زندہ رکھیں گی۔"

اور اس اعلان رخصت پر ایک فاضل مراسلہ نگار کے ان الفاظ پر تو ہماری چیخ نکل گئی:

"جیسے کوئی قطب وقت دنیا سے اٹھ رہا ہے اور سارا عالم اسلام سوگ میں ڈوبا ہوا ہے:

گماں مہر کہ چوں تو بگورنی جہاں بگوشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست"

کے خبر تھی کہ یہ قطب وقت واقعی اتنی جلدی اس دنیا سے اٹھ جائے گا اور ایک عالم سوگ میں ڈوبا ہوگا! □□□

☆ انچارج ایڈیٹر: روزنامہ انقلاب پٹنہ (بہار)

email: ahmadjwd@gmail.co

بقیہ: مولانا اسد الحق قادری اور جام نور

شورش کے قلم قتلے، آزاد کی غبار خاطر اور ظفر علی خاں کے مطاببات سے تشبیہ دی ہو، اس کے بعد مجھ جیسے نوآموز کے اعتراف کی حیثیت "یہ منہ اور مسور کی دال" کی رہ جاتی ہے۔" (خامہ تلاشی، ص: ۶)

اسی میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

"کہتے ہیں کہ ایک شخص میں علم حدیث، تفسیر، منطق و فلسفہ، تاریخ، زبان و ادب، شعر و سخن، خطابت و قلم اور عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں مہارت کی یکجائی عنقا ہے۔ اگر کسی شخص میں ہو تو یہ یکجائی، شخصیت کی جامعیت کی توثیق کرتی ہے۔ ایسی گونا گوں اور جامعیت کی حامل شخصیت کے لیے نعت میں لفظ "عبقری" ملتا ہے، جسے اسید الحق صاحب کی طرف اگر کوئی منسوب کرے تو کم از کم مجھ سے توثیق کی امید نہ رکھے۔ ویسے 'خامہ تلاشی' کو پڑھ کر بڑے بڑے فاضلین علوم اسلامیہ نے یہ ریمارک دیا ہے: "یہ کسی ایک شخص کا کارنامہ نہیں، بلکہ چند ماہرین فنون کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔" اب ہم ٹھہرے موروثی مقلد، بڑوں کی تمام باتوں کو ٹھکرا دینا بھی ہمیں زیب نہیں دیتا۔" (خامہ تلاشی، ص: ۸)

درج بالا پیرا سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خوشتر صاحب کے نزدیک علامہ عاصم قادری علیہ الرحمہ کے اندر ایک علمی شخصیت کے لیے درکار تمام صلاحیتیں موجود تھیں اور وہ "عبقری وقت" بھی تھے، جس کا انہیں اعتراف بھی ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے لیے لب و لہجہ دوستانہ اختیار کیا گیا ہے۔

آخری بات: ہمیں قوی امید ہے کہ ہمارے مدد و شہید بھی بفضلہ تعاقب بعد شہادت ہمارے دلوں کی زمین پر حکومت کرتے رہیں گے، روحانی طور پر اپنی پاکیزہ فکر کی روشنیاں لاتے رہیں گے اور ہمیں اپنے فیوض و برکات سے مالا مال کرتے رہیں گے اور ان کے لیے ہمارا حقیقی خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم ان کے متعین کردہ تعمیری و مثبت خطوط پر چلیں اور ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں □□□

☆ استاذ: جامعہ رفیع، سیدراواں، کوشامی، آلہ آباد (یوپی)

مولانا اسید الحق قادری: ایک عظیم محقق

تحقیق کے کتے ہیں؟

لغت میں تحقیق کہتے ہیں ”حق کو ثابت کرنا اور غلط امور کی نشان دہی کرنا“ اور ادب کی اصطلاح میں ”تحقیق ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے، جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔“ (تحقیق کا فن، ص: ۳۳، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ)

قاضی عبدالودود (ولد قاضی عبدالوحید خلیفہ اعلیٰ حضرت بریلوی) کے بقول ”تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔“ (تحقیق کا فن، ص: ۳)

در اصل تحقیق میں غیر معلوم حقائق کو علم حاصل کیا جاتا ہے اور معلوم حقائق کی تفتیش اور چھان بین کی جاتی ہے۔ یعنی جو حقائق ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں، انھیں کھوجنا اور منظر عام پر لانا۔ اسی طرح جو حقائق سامنے ہیں لیکن دھندلے ہیں۔ ان کے دھندلے پن کو دور کر کے انھیں ایک صاف و شفاف اور غبار آئینہ بنا دیا، یہ کام تحقیق اور محقق کا ہے۔

محقق کے اوصاف:

ایک کامیاب محقق واسکار کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے:

- (۱) حق گوئی (۲) غیر جانب داری (۳) اخلاقی بلندی (۴) محنت و مشقت کا جذبہ (۵) غیر مقلدانہ ذہن و مزاج (۶) مضبوط قوت حافظہ (۷) تاریخی شعور (۸) اردو کے علاوہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے واقفیت (۹) ادبی علوم سے آگاہی (۱۰) ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہونا۔ ان کے علاوہ اور بھی اوصاف ہیں جن سے ایک محقق کو متصف ہونا ضروری ہے لیکن ”تک عشرۃ کاملۃ“ کے مطابق صرف دس اوصاف شمار کرانے پر ہی ہم نے اکتفا کیا ہے۔

اپنے آپ کو محقق کہلانا یا پھر کسی کو محقق جسے ہماری بھر کم خطاب

زندگی سراپا حرکت و عمل کا نام ہے۔ حرکت و عمل اور مثبت سرگرمیوں کی بدولت ہی زندگی ایک کامیاب زندگی کہلاتی ہے۔ ممتاز ناقد و محقق مولانا اسید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ کی زندگی حرکت و عمل سے عمارت تھی۔ وہ جب تک باحیات رہے، عمل پیہم اور جہد مسلسل کی چلتی پھرتی تصویر بنے رہے اور ہمیشہ مثبت اور تعمیری کاموں میں لگے رہے۔ دس پندرہ سالوں میں وہ جس قدر علمی، تحقیقی اور قلمی کارنامے انجام دے گئے، وہ بجائے خود حیرت ناک امر ہے۔

مولانا اسید الحق قادری بہت سارے اوصاف و خصوصیات کے مالک تھے۔ عالم، فاضل، مفتی، محدث ہونے کے ساتھ ایک عظیم تنقید نگار اور باکمال محقق بھی تھے۔ نوجوان علما میں تحقیق و تنقید کے اعتبار سے آپ کی ایک منفرد پہچان تھی۔ آج حال یہ ہے کہ ہر کس و نا کس کو ”محقق عصر“ کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اسید الحق قادری صاحب حقیقت میں محقق عصر تھے اور اہل سنت کے نوجوان محققین کے سالار اور میر کارواں تھے۔ ہمارے دعویٰ کی دلیل مولانا اسید الحق قادری بدایونی کی مندرجہ ذیل کتابیں ہیں: (۱) تحقیق و تفہیم (مضامین کا مجموعہ) (۲) حدیث افتراق امت (۳) عربی محاورات (۴) خامہ تلاشی (۵) مقدمہ قصیدتان رائخان (اردو)۔

مولانا اسید الحق قادری کے اندر تحقیق و تنقید کا فطری ملکہ موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تحریریں زیور تحقیق سے آراستہ ہیں۔ ہماری جماعت میں علماء، فقہاء، قلم کاروں اور فن کاروں کی کمی نہیں ہے، لیکن ارباب تحقیق و تنقید کی قلت ہے۔ مولانا اسید الحق تحقیق و تنقید کے میدان میں جماعت کی طرف سے ایک طرح کا فرض کفایہ ادا کر رہے تھے مگر افسوس! وہ بہت جلد ہم سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے۔

سے یاد کرنا بہت آسان ہے، لیکن حقیقت میں یہ محقق ہونا سینے کے بل پچکنے کے مترادف ہے۔

مندرجہ بالا اصول تحقیق کی روشنی میں جب ہم مولانا اسید الحق قادری بدایونی کی فکر و شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی ذات میں ایک ”عظیم محقق“ کا عکس جمیل صاف دکھائی دیتا ہے۔ تحقیق جو ایک ادبی مشغلہ سے زیادہ ایک مسلک، ایک ذہنی رویہ اور تلاش حق کی ایک منظم تحریک ہے، مولانا اسید الحق فکر و شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اس تحریک کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے تادم حیات منسلک رہے اور اپنے تحقیقی کارناموں سے ثابت کر دیا کہ یہ بدایونی شہزادہ بھی اکیسویں صدی کے اوائل میں جادو تحقیق کا ایک برعزم اور تیز رفتار مسافر ہے۔ وقت نظر، گہری بصیرت اور وسعت مطالعہ تحقیق کے لازمی اجزا ہیں اور یہ چیزیں مولانا کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر ایک جگہ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ”احادیث قدسیہ“ میں لکھتے ہیں: ”میرے مخلص دوست اور کرم فرما مولانا منظر الاسلام ازہری جو وقت نظر اور وسعت مطالعہ میں مجھ سے فائق ہیں۔“

یہ دراصل مولانا موصوف کی عاجزی تھی ورنہ وقت نظر اور وسعت مطالعہ میں اسید الحق صاحب، منظر الاسلام ازہری دام ظلہ سے فائق نہیں تو کم بھی نہیں تھے، تاہم سیاق عبارت سے اتنا تو طے ہے اسید صاحب کے اندر بھی وقت نظر اور مطالعہ کی وسعت پائی جاتی ہے۔ محقق بدایونی کی وقت نظر اور وسعت مطالعہ کا اعتراف ہر ایک نے کیا ہے۔ چند سال پیش جب ماہ نامہ جام نور، دہلی کے صفحات پر ”خامہ تلاشی“ کے کالم میں اسید الحق صاحب اپنے رخِ زیبا پر ”ابوالفیض معینی“ کا نقاب اوڑھے اپنی تحقیق و تنقید کا فیض بانٹ رہے تھے، اسی وقت سے اہل علم کو مولانا کی علمی وجاہت اور ان کی تحقیقی لیاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اکابر علماء و مشائخ تک آپ کے علمی لیاقت اور ادبی و تحقیقی مہارت کے معترف ہیں۔

راقم الحروف نے جب جامعہ اشرفیہ، مبارک پور کے شیخ الحدیث حضرت علامہ عبدالشکور صاحب قبلہ دامت برکاتہم کو اسید الحق صاحب کی شہادت و وفات کی خبر سنائی تو آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے اسی وقت فرمایا ”مولانا اسید بڑے قیمتی آدمی تھے۔“ ایک بزرگ

عالم ربانی کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اسید الحق صاحب واقعی قیمتی تھے۔ ایک قیمتی جوہر جس کی قدر و منزلت کا اندازہ مردم شناس افراد ہی لگا سکتے ہیں۔

مائیہ ناز اور کامیاب محقق کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ اس کے اندر محنت و مشقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ اس جہت سے دیکھا جائے تو مولانا موصوف بڑے محنتی اور جفاکش انسان تھے۔ دورانِ تصنیف و تحقیق متعلقہ مواد کی فراہمی کے لیے اپنے شب و روز ایک کر دیتے تھے۔ کتابوں کی اوراق گردانی اور ہندوستان کی بڑی لائبریریوں کی خاک چھاننے میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بیش قیمت حصہ صرف کیا۔ تب بھی جا کے میدان تحقیق کے شہ سوار بن کر چمکے۔ اس سلسلے میں محبت گرامی جناب احمد جاوید صاحب (ایڈیٹر روزنامہ انقلاب) کا یہ بیانیہ بر حقیقت تاثر ملاحظہ کریں:

”کبھی یہ نوجوان پیرزادہ چھپوئہ کی خانقاہ میں مخطوطات کو کھنگال رہا ہے، کبھی رام پور کی رضا لائبریری میں اوراق پارینہ سے علم کے موتی چن رہا ہے، کبھی بہار شریف، پھلواری شریف اور پٹنہ کی خانقاہوں اور کتب خانوں کا سفر کرتا ہے تو کبھی بمبئی اور حیدرآباد کے علمی مراکز میں سرگرداں ہے۔“

محقق کے اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کا ذہن و فکر مقلدانہ نہیں بلکہ مجتہدانہ ہو۔ کسی دانش ور کا قول ہے کہ ”ایمان بالغیب اور تقلید یہ مذہب میں جائز ہے، لیکن تحقیق میں تقلید ناجائز ہے۔“

مولانا اسید الحق ازہری زندگی بھر اس تحقیقی اصول پر کاربند رہے۔ بہت ساری ضعیف اور موضوع روایات (احادیث) جو برسوں سے عوام و خواص میں مقبول و رائج تھیں۔ آپ نے فی نقطہ نظر سے ان پر کلام کیا اور اکابر پرستی (Hero Worship) کی قدیم روایت سے ہٹ کر اکابر کی کتابوں میں موجود ضعیف و موضوع روایات کو واضح کیا۔ تفسیر روح البیان جس کے مصنف و مفسر حضرت علامہ اسماعیل حق قدس سرہ ہیں، اس کتاب کے بارے میں اسید صاحب نے اپنی ہمت و جرأت اور تحقیقی اصول کو اپناتے ہوئے برکت لکھا کہ ”اس کتاب میں بہت سارے مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں۔“

غرض کہ اسید صاحب ایک مجتہدانہ فکر و ذہن رکھنے والے محقق اور

علامہ اسید الحق بدایونی اور امام احمد رضا بریلوی

احمد رضا کے چھوٹے صاحب زادے حضور مفتی اعظم علامت کی وجہ سے، شہزادے کو دعوت دیئے خود نہ جاسکے تو حضرت عاشق الرسول کو شفا رش کے لیے خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے خلوص و محبت اور دوا دوا کا رنگت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ خط کے الفاظ ہیں:

”حضرت رفیع الدرجت مولانا المکرم ذی الجہد والکریم عاشق الرسول زیدت معالیہ!

بعد سلام، سنت اسلام، عرض مرام! طالب خیر بجزہ تعالیٰ مع اخیر ہے۔ شاہزادہ سرکار غوثیت کا ورد مسعود بدایوں معلوم ہوا۔ آپ کی قسمت قابل ہزار رشک ہے۔ اہمال معذوری سے حاضری نہ ہوئی تو سرکار غوثیت مدار، آقائے نامدار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کرم فرمایا کہ شاہزادہ والا اختیار کو بھیج دیا۔ آپ نے کیسی عظیم دولت گھر بیٹھے پائی۔ آپ کی عنایت مہذول ہوئی اور شاہزادہ سرکار قادری کا کرم ہوا، تو ان شاء المولیٰ، فقیر بے توقیر، ادنیٰ گدا کے لئے حضور نور غوث اعظم رضی اللہ عنہ بھی، اس سرکاری کرم سے محروم نہ رہے گا۔۔۔۔۔ (الغ)

والسلام مع الاکرام
فقیر گدا کے لئے قادری
مصطفیٰ رضا نوری غفرلہ

اور انہوں نے سفارش کر کے یہ دعوت منظور کرائی۔ اس طرح حضور غوث پاک کے وہ شہزادے بریلی بھی تشریف لائے۔

یہ تو تاج الحول اور ان کے صاحبزادگان اور امام احمد رضا اور ان کے صاحبزادگان کے خلوص و محبت اور دوا دوا کا رنگت کی صورت تھی۔ اب خود شہید بغداد، مولانا اسید الحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا امام احمد رضا علیہ الرحمہ سے تعلق خاطر اور محبت کے چند حوالے دیکھیے:

شہید بغداد مولانا اسید الحق قادری کے فرجد حضرت تاج الحول بدایونی اور امام احمد رضا بریلوی علیہم الرحمۃ والرضوان دونوں ہی کا مشترک سرمایہ اور طرۃ امتیاز، اسلام و سنت کی خدمت، بارہرہ مظہرہ کی غلامی اور بد مذہبیت کا رد و ابطال تھا۔ بدایوں اور بریلی میں تقریباً پچاس کیلو میٹر کا زمینی فاصلہ ہونے کے باوجود وہاں کے رہنے والے دونوں بزرگوں کی شخصیتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں تھیں، بلکہ وہ درحقیقت ایک ہی حقیقت کے دو مظہر تھے، جیسا کہ امام احمد رضا نے فرمایا ہے:

نہ تو مجھ سے جدا نہ میں تجھ سے
میں ترا تو مرا محبت رسول
غلطی کی ترا مرا کیسا؟
تو من و من تو یا محبت رسول

حضرت تاج الحول کو ”تاج الحول“ کا خطاب امام احمد رضا نے دیا تھا اور امام احمد رضا کی مجددیت کا اعلان تاج الحول کے بڑے صاحبزادے صاحب الاقدار حضرت مولانا عبدالمقتدر نے فرمایا تھا۔ حضرت تاج الحول کا وصال ہوا اور حضرت صاحب الاقدار مسند آراء سجادہ ہوئے تو ایک فرعی مسئلہ ”محل اذان“ میں، بدایوں کے بعض متسین کا بریلی سے اختلاف ہو گیا اور سوال و جواب ہونے لگے کہ اسی دوران حضرت صاحب الاقدار علیہ الرحمہ نے جام وصال نوش فرمایا۔ ان دنوں امام احمد رضا سخت بیمار تھے، اس لیے خود جنازہ میں شریک نہیں ہو سکے اور اپنے بڑے صاحب زادے حضرت جتہ الاسلام مولانا حامد رضا خاں کو قائم مقام کر کے بھیجا۔

پھر تاج الحول علیہ الرحمہ کے چھوٹے صاحب زادے، عاشق الرسول حضرت مولانا عبدالمقدیر کا دور سجادگی آیا اور بغداد معلیٰ سے حضور غوث پاک کے ایک شہزادے بدایوں تشریف لائے تو بریلی سے امام

کے دور اخیر کی خوب صورت یادگار ہے۔ محقق بدایونی نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں قصیدے کا عروضی اور لسانی جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید عبیدی بغدادی کی شرح و تحقیق کا محققانہ اور ناقدانہ جائزہ لیا ہے، اس سے اسید صاحب کی تحقیق عظمت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب ”قصیدتان راکتان“ تاج الحول اکیدی، بدایوں سے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ ص: ۱۵۰ تا ۱۰۰ یعنی ۸۶ صفحات پر مشتمل مولانا اسید الحق صاحب کا اس کتاب پر مبسوط تحقیقی مقدمہ ہے۔ مقدمہ کی سطر سطر سے مولانا اسید الحق صاحب کی فنی، لسانی اور عروضی مہارت عیاں ہے۔ سبحان اللہ! محقق ہوتا ایسا۔ رع

ایک مرکز پر سمٹ آئے ہیں جو ہر سارے

خلاصہ کلام یہ کہ اسید صاحب عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ایک باکمال محقق اور بے مثال ناقد تھے۔ وہ کام کے انسان تھے اور تاحیات دینی، علمی اور تحقیقی کام انجام دیتے رہے۔ وہ خود بھی کام کرتے تھے اور کام کرنے والوں کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ اشرفیہ مبارک پوری دینی، علمی اور تصنیفی خدمات سے وہ بے حد متاثر تھے۔

استاذ گرامی حضرت مولانا صدر الوردی قادری مصباحی دام ظلہ نے جس وقت ”النبیۃ المسدود“ لکھی تھی تو مولانا اسید الحق نے عربی میں خط لکھ کر انہیں مبارک باد پیش کی تھی۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد ناظم علی مصباحی (استاذ جامعہ اشرفیہ) نے جب ”اخطا ابن تیمیہ“ کا اردو ترجمہ کیا اور راقم الحروف نے اس پر ماہ نامہ اشرفیہ میں تبصرہ لکھا تو مولانا اسید الحق قادری صاحب نے بذریعہ فون اس کام کو سراہا اور راقم الحروف نے کہا کہ ”میری طرف سے مولانا ناظم علی مصباحی“ کو مبارک باد پیش کر دینا۔“

دو سال قبل جب مجھے ”تفسیر عزیزی“ قادری نسخہ کی ضرورت پڑتی تھی تو میں نے مولانا اسید الحق قادری بدایونی صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ بدایوں تشریف لائیں میں مطلوبہ فارسی نسخہ آپ کو مہیا کر دوں گا۔

اللہ رب العزت انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل، آمین۔ □□□

☆ نائب مدیر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

اسلامی اسکا رتھے۔ مقلد ہوتے ہوئے بھی میدان تحقیق و تنقید میں غیر مقلدانہ ذہنیت کے حامل تھے اور یہ چیز ایک کامیاب تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ حق گوئی اور غیر جانب داری بھی تحقیق کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ آپ کی حق گوئی دے باکی نے اچھے اچھوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ قلم کے تقدس اور تحقیق جیسے پاکیزہ شعبہ ادب کی حرمت کا آپ نے بہر گام خیال رکھا اور سامنے والوں کو اچھا لگے یا برا، اس کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ حق بات لکھی اور تحقیق کے اصول کا خیال کیا۔ تعصب اور جانبداری کی بلا سے اللہ بچائے!

اسید الحق قادری صاحب کی تحریر میں راقم الحروف نے ایک خاص وصف یہ پایا کہ ان کی تحریر میں تعصب، جانب داری اور علاقائیت کا متعفن عنصر شامل نہیں ہے اور یہ دراصل تحقیق کے اس اصول کی بجا آوری ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ”محقق کی تحریر تعصب اور جانب داری سے پاک ہو۔“ یعنی ایک دیانت دار محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعصب اور جانب دار ہو۔

جام نور دہلی کے مقبول ترین کالم ”خامہ تلاشی“ میں محقق بدایونی مولانا اسید الحق ازہری (الوفیض معینی) نے تحقیق و تنقید اور تجربہ و تبصرہ کے دوران ہر قسم کے مضامین پر اپنے گراں قدر تاثرات و آرا کا اظہار کیا ہے اور مضمون نگار کہاں کا باشندہ ہے؟

کس مدرسے کا فارغ ہے؟ اور کس خانقاہ سے وابستہ ہے؟ ان باتوں سے قطعی نظر کرتے ہوئے صرف اور صرف مواد و مشمولات کا تحقیق جائزہ لیا ہے اور یہ چیز اسید صاحب کے کمال فن اور تحقیقی اصول و مناج سے ان کی گہری واقفیت کی دلیل ہے اور جہاں تک تحقیقی کارواں کو بحسن و خوبی منزل تک پہنچانے اور منصب تحقیق سے مکاحقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے ”تاریخی شعور“ کی بات ہے تو مولانا اسید الحق محقق بدایوں تاریخی شعور و ادراک میں بھی اپنے اقران و معاصرین میں فائق تھے۔ اس کا نمونہ ہمیں ان کی ان تحریرات میں نظر آتا ہے، جہاں انھوں نے اسمائے رجال پر محدثانہ اور محققانہ گفتگو کی ہے۔

تحقیقی مضامین کا مجموعہ ”تحقیق و تفہیم“ اور ”خیر آبادیات“ آپ کے محققانہ فکر و ذہن کی روشن دلیل ہیں۔ ”قصیدتان راکتان: ایک تحقیقی مطالعہ“ یہ گراں قدر علمی و تحقیقی مبسوط مقالہ مولانا اسید الحق قادری ازہری

استاذ گرامی امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین علیہ الرحمہ مدرسہ قادریہ بدایوں سے دارالعلوم نورالحق، چڑہ محمد پور، ضلع فیض آباد شریف لائے تو مولانا اسیدالحق کو بھی ساتھ لیتے آئے۔ چند دنوں بعد حضرت امام علم وفن نے مجھ فقیر رضوی کو بلا کر تدریس کے لیے مامور فرمایا اور مولانا اسیدالحق کی تعلیم کا خصوصی ذمہ عطا کیا۔

اس لیے مولانا نے مجھ فقیر رضوی سے بھی اصول فقہ اور علم کلام کی بعض کتابیں پڑھیں۔ پھر جب قاعدت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے مجبور کر کے مجھے ادارہ شرعیہ بہار بلالیا اور اس کی خدمت سپرد کی تو مولانا اسیدالحق پورے طور پر حضرت امام علم وفن سے متعلق ہو گئے اور درس نظامی کی تکمیل کے علاوہ مقولات کی مثنوی کتابیں پڑھ کر جامع از ہر مصر گئے۔

اسی دوران ایک بار میں امام علم وفن سے شرف ملاقات کے لیے دارالعلوم نورالحق، چڑہ محمد پور، حاضر ہوا تو بہت سے حضرات کی موجودگی میں مولانا اسیدالحق کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا ایک واقعہ سنایا، جس کی تصدیق مولانا کی مصر سے واپسی کے بعد مجھے خود ان کی زبانی بھی ہو گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ مولانا نے بدایوں میں اپنے احباب کے درمیان برسبیل تذکرہ امام احمد رضا کو بچہ دیا تو خانقاہ قادریہ کے مشائخ میں سے ایک معروف شخص (جن کو مولانا سے حدودِ جبلتِ خاں تھا) نے کہا کہ آپ بھی اپنی زبان سے انہیں مجدد کہیں گے؟ تو مولانا نے برجستہ جواب دیا:

”جناب عالی! میں اپنے جدا مجد کو تو جھوٹا نہیں کہہ سکتا یا درکھے کہ ان کو پہلی بار برسرِ اجلاس، اور اجلاس بھی وہ جس میں ملک بھر کے عہدہ دار و مشائخ بالخصوص جدا مجد کے والد گرامی حضرت تاج اللہ بھی موجود تھے، میرے جدا مجد نے انہیں مجدد کہا ہے۔ اس لیے کان کھول کر سن لیجیے کہ اگر کوئی ان کی مجددیت کا انکار کر رہا ہے تو وہ درحقیقت میرے جدا مجد کو جھٹلا رہا ہے اور میں اسے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میرے جدا مجد کو میرے سامنے جھٹلائے۔ لہذا آئندہ کبھی اس طرح کی بات زبان پر لانے کی کوشش نہ کیجیے گا۔“

مولانا اسیدالحق مصر سے واپس آئے تو پہلے سے زیادہ دور اندیش اور بالغ نظر ہو چکے تھے۔ اہل سنت کی صفوں میں اقتدار اور ان کے بالمقابل غیروں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار دیکھ کر مضطرب و بے قرار ہو گئے۔ اہل سنت میں اتحاد کے لیے سب سے پہلے خانوادہ امام احمد رضا کا انتخاب فرمایا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے نظم ”دوستی کا ہاتھ“ لکھ کر شائع کرائی جو آپ کے سامنے ہے:

مرے عزیز مرے دوست میرے ہم سایہ
ہمارے بیچ جدائی کو اک صدی گزری
نہ تم کو مجھ پہ بھروسہ نہ مجھ کو تم پہ یقین
اسی نفاق و عداوت میں زندگی گزری
وہ جس کا نقش کتب پا ہمارے سینے میں
اسی کی یاد سے آباد تیرا سینہ ہے
وہ جس کے فیض سے ہم نے بلندیاں پائیں
اسی کا نام مبارک ترا وظیفہ ہے
ہماری کشت پہ برسا ہے جو سحاب کرم
اسی کے فیض کی بارش تمہارے آنگن میں
وہ جس کی بو سے معطر مشام جاں ہے مرا
اسی گلاب کی رنگت تمہارے گلشن میں
وہ بادہ خانہ جہاں ہم نے بے گساری کی
شراب تم بھی اسی میکدے کی پیٹتے ہو
ہے جس نگاہ کی مستی ہماری آنکھوں میں
اسی نگاہ سے محو تم بھی رہتے ہو
جو عندلیب مرے باغ میں چہکتا ہے
اسی کی نغمہ سرائی ترے گلستاں میں
وہ شمع جس سے منور ہے طاق دل میری
اسی کی صو سے اجالا ترے شبستاں میں
وہ بجلیاں جو مرے آشیان کو بجکتی ہیں
وہی حریف تمہارے نگار خانے کی
تمہارا گلشن صد رنگ جس کی زد پر ہے

وہی خزاں ہے عدو میرے آشیانے کی
غرض کہ فرق نہیں کوئی ہم میں بنیادی
نہ فکر میں نہ عقیدے نہ دین و مذہب میں
نہ اختلاف خیالات کا نہ مسلک کا
نہ کوئی فرق ہمارے تمہارے مشرب میں
اگر یہ بیچ ہے تو اے محترم حریف مرے
کوئی جواز نہیں ہم میں دشمنی کے لیے
”اگر تمہاری انا ہی کا ہے سوال تو پھر
چلوں میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے“

جب نام نہاد عمل بردہ حدیث کے دعوے داروں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ احادیث کے ہوتے ہوئے بھی مسائل شرعیہ کے استنباط میں محض اپنے قیاس و رائے سے کام لیتے تھے؛ کیوں کہ علم حدیث میں ان کو بہت کم درک تھا تو ماضی بعید میں علامہ ابن ہمام اور علامہ نورالحق دہلوی اور ماضی قریب میں امام احمد رضا کے ”جان پدر، بلکہ از جان بہتر“ ملک العلماء، سید ظفر الدین بہاری علیہ الرحمۃ نے ”صحیح البہاری“ لکھ کر ثابت کیا کہ امام ابوحنیفہ، بخاری و مسلم سمیت تمام محدثین حق کی دوسرے ائمہ مجتہدین سے بھی زیادہ احادیث کے جانکار اور ان پر عمل پیرا تھے۔ مجبوری طور پر تمام محدثین نے جتنی حدیثیں روایت کی ہیں ان سے کہیں زیادہ حدیثیں تھا امام اعظم ابوحنیفہ سے مروی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بخاری شریف میں کمالات کے ساتھ سات ہزار سے کچھ زائد اور کمالات کو حذف کرنے کے بعد کم و بیش ساڑھے چار ہزار حدیثیں ہیں مگر امام اعظم ابوحنیفہ کی مرویات ستر ہزار سے زائد ہیں۔ ملا علی قاری نے امام محمد بن ساعدہ کے حوالے سے لکھا ہے:

ان الامام ذکوفی تصانیفہ بضع و سبعین الف حدیث۔ بے شک امام نے اپنی تصانیف میں ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں بیان کی ہیں۔ حضرت علامہ امیر یمنی کے بیان کے مطابق نفس متین کے اعتبار سے صحیح احادیث جن میں شرعی احکام کے علاوہ قصص و امثال، مستقبل کی پیشین گوئیاں، قرب قیامت کے آثار، قبر کے احوال اور حشر و نشر

کے حالات سب بیان ہوئے ہیں، چار ہزار چار سو ہیں:

ان جملة الاحادیث المسندة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی الصحیحة بالحدیث اربعۃ آلاف ومائة۔
تو بلاشبہ معمول بہ حدیثیں جن کو اصطلاح میں ”سنن“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس سے کم ہوں گی جب کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے مسائل کے تحت جو احادیث بیان فرمائی ہیں وہ نفس متین کے اعتبار سے بھی چار ہزار ہیں جس سے واضح ہے کہ تمام سنن یعنی معمول بہ حدیثیں جن سے احکام مرتب ہوتے ہیں، آپ کے پیش نظر تھیں۔

امام اعظم تو امام اعظم ہی تھے، چودھویں صدی ہجری میں امام اعظم کے سچے جانشین ”امام احمد رضا“ جن کے بارے میں محافل کتب حرم علامہ سید اسماعیل کی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے:

واللہ اقول والحق اقول: لوراھا ابوحنیفۃ النعمان
لاقرت عینہ وجعل مولفہ من جملة الاصحاب۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور صحیح کہتا ہوں کہ امام اعظم ابوحنیفہ آپ کے یہ قنادی دیکھتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور وہ ان کے مؤلف کو اپنے تلامذہ میں شامل کر لیتے۔

ان کے تعلق سے بھی بعض غیر مقلدین اور ان کے ریزہ خواروں نے جب یہ کہا کہ حدیث دانی میں ان کا پایہ کم تھا تو حضرت مولانا محمد حنیف خاں رضوی پرنسپل جامعہ نوریہ، بریلی شریف نے امام احمد رضا کی تقریباً ایک ہزار کتابوں میں سے صرف تین سو کتابوں سے جو ان کے دسترس میں آئیں، دس ہزار احادیث کا مجموعہ تیار کیا اور خرچ کے ساتھ ”جامع الاحادیث“ کے نام سے تقریباً چھ ہزار صفحات پر مشتمل دس جلدوں میں شائع کیا اور اس کی جلد ۲، ص: ۲۵ میں مذکور حدیث:

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فرشتہ جو رجم زن پر موکل ہے جب نطفہ رجم میں قرار پاتا ہے، اسے رحم سے لے کر اپنی جھٹلی پر رکھ کر عرض کرتا ہے: اے رب میرے! اپنے گایا نہیں؟ اگر فرماتا ہے: نہیں! تو اس میں روح نہیں پڑتی اور خون ہو کر رحم سے نکل جاتا ہے اور اگر فرماتا ہے ہاں! تو عرض کرتا ہے: اے میرے رب! اس کا رزق کیا ہے؟ زمین میں کہاں کہاں

چلے گا؟ کیا عمر ہے؟ کیا کام کرے گا؟ ارشاد ہوتا ہے: لوح محفوظ میں دیکھ کہ اس میں نطفہ کا سبب حال پائے گا۔ پھر فرشتہ وہاں کی مٹی لاتا ہے جہاں اس کو دفن ہونا ہے، اسے نطفہ میں ملا کر گوندھتا ہے، یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ زمین ہی سے ہم نے تمہیں بنایا اور اسی میں پھر ہم تمہیں لے جائیں گے۔

کے تخلیق سے اپنے مقدمہ ص: ۱۲۰ میں تحریر فرمایا:

”پوری کتاب میں صرف ایک حدیث ایسی ہے جس کا متن مجھے نہیں مل سکا۔ اس کے لیے بیاض چھوڑ دی گئی ہے کہ اگر کسی صاحب کو وہ متن مل جائے تو اپنے نسخہ میں تحریر کر لیں اور ہمیں مطلع فرمائیں، ہم شکر یہ کے ساتھ آئندہ ایڈیشن میں شائع کر دیں گے۔“

تو اسی شہید بغدادی مولانا اسید الحق مرحوم نے اس کی تخریج کی جو ماہ نامہ جام نور نومبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ موصوف نے تحریر فرمایا: ”الحمد للہ! اس کا متن تلاش کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی، اپنی تلاش و جستجو کا حاصل حاضر خدمت کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اگر درست ہو تو آئندہ ایڈیشن میں شامل کر لیا جائے۔ حکیم ترمذی نے اپنی کتاب ”نوادیر الاصول“ میں اس حدیث پاک کا ذکر فرمایا ہے۔

حدیث کا متن یہ ہے:

ان الملك الموكل بالارحام ياخذ النطفة من الرحم فيضعها على كفه ثم يقول يا رب مخلقة او غير مخلقة فان قال مخلقة قال مال الرزق ما الاثر ما الاجل؟ فيقال انظر في ام الكتاب فينظر في اللوح فيجد فيه رزقه واثره واجله وعمله ثم ياخذ التراب الذي يدفن في بقلته فيعجن به نطفته فذلك قوله الكريم منها خلقناكم وفيها نعيدكم۔

اس حدیث کو حکیم ترمذی ہی کے حوالے سے امام سیوطی نے بھی الدلائلی المصنوعة میں نقل کیا ہے۔ امام قرطبی نے بھی اس حدیث کو اپنی تفسیر میں حافظ ابو نعیم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ حکیم ترمذی اور ابو نعیم دونوں نے اس حدیث کو سیدنا ابن

مسعود سے بطریق مرہ روایت کیا ہے۔ جامع الاحادیث میں نقل کردہ ترجمہ میں یہ جملہ بھی ہے کہ ”اگر فرماتا ہے نہیں تو اس میں روح نہیں پڑتی اور خون ہو کر رحم سے نکل جاتا ہے۔“ ہم نے اوپر جو متن نقل کیا ہے اس میں یہ جملہ نہیں ہے، قرطبی والی روایت میں بھی یہ جملہ نہیں ہے، دراصل یہ جملہ ایک دوسری روایت میں موجود ہے جس کا ابتدائی حصہ تو ہماری نقل کردہ حدیث کے ہم معنی ہے مگر آخری حصہ ذرا مختلف ہے، اس کو امام ابن جریر طبری نے حضرت ابن مسعود سے بطریق علقمہ روایت کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے: النطفة اذا استقرت في الرحم اخذها ملك بكفه فقال يا رب مخلقة او غير مخلقة فان قيل غير مخلقة لم تكن نسمة وقلبتها الارحام دماء وان قيل مخلقة قال اي رب ذكر او انثى شقى او سعيد، الى آخر الحديث حافظ ابن کثیر نے بھی اس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریر کے حوالے سے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا ہے: ”اسنادہ صحیح و هو موقوف لفظاً۔ اس حدیث کو حافظ ابن رجب حنبلی نے بھی نقل کیا ہے۔“

(۳)

امام احمد رضا نے فتاویٰ رضویہ میں عمامہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حدیث: اعتصموا خالفوا علی الامم من قبلکم ذکر کیا ہے اور اس کا ترجمہ فرمایا ہے ”عمامے باندھو، اگلی امتوں یعنی یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرو کہ وہ عمامہ نہیں باندھتے۔“

اس پر ایک صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے اس ترجمہ کو غلط قرار دیا اور کہا کہ اس کا یہ ترجمہ صحیح نہیں کیوں کہ یہ حدیث عمامہ سے متعلق نہیں، بلکہ عشا کی نماز سے متعلق ہے، اس لیے صحیح ترجمہ یہ ہے: ”عشا کی نماز کو پہلی تہائی رات میں ادا کرو۔“ مگر اس کا جواب ہم خواجہ تاجان رضویہ میں ایک سے بڑھ کر ایک محدث اور فاضل موجود رہنے کے باوجود کسی نے نہیں دیا، اس کا جواب اسی شہید بغدادی نے لکھ کر ماہ نامہ ”جام نور“ میں شائع کرایا جس سے معترض کا منہ بند اور قلم خاموش ہوا۔ انہوں نے ”حدیث عمامہ پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ“ کے

زیر عنوان لکھا:

”امام بیہقی نے اپنی کتاب ”شعب الایمان“ میں خالد بن معدان سے ایک مرسل حدیث پاک نقل فرمائی ہے:

اعتصموا خالفوا علی الامم من قبلکم۔

مذکورہ حدیث کو امام سیوطی نے جامع صغیر اور مفتی الہندی نے کنز العمال میں بھی نقل کیا ہے۔ اس حدیث کے پہلے لفظ ”اعتصموا“ میں دو احتمال ہو سکتے ہیں: (۱) یہ ”اعتصام“ (باب الفعل) سے مشتق ہے، اس صورت میں اس کو ”اعتصموا“ پڑھا جائے گا، اور اس کا ترجمہ ہوگا ”عمامہ باندھو“۔ (۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ”اعتصام“ (باب الافعال) سے مشتق ہے اس صورت میں اس کو ”اعتصموا“ پڑھا جائے گا، اور اس کا معنی ہوگا ”عشا کی نماز کو پہلی تہائی رات میں ادا کرو۔“

فتاویٰ رضویہ میں اس حدیث کو فضائل عمامہ کے باب میں ذکر کیا گیا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: ”عمامے باندھو، اگلی امتوں یعنی یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرو کہ وہ عمامہ نہیں باندھتے۔“ حدیث کا یہ ترجمہ بالکل درست اور حدیث کے سیاق و سباق کے عین مطابق ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے، مگر ایک معاصر فاضل و محقق نے اس ترجمہ کو ”حدیث کی غیر معتبر توجیہ“ قرار دیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

”کسی معتبر ذریعہ سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس حدیث کا فضائل عمامہ کے باب سے بھی کچھ تعلق ہے۔ دراصل ”اعتصموا“ کے لفظ سے وہم ہوتا ہے کہ یہ باب ”اعتصام“ سے مشتق ہے، جو عمامہ باندھنے کے معنی میں ہے، حالانکہ وہ باب ”اعتصام“ سے مشتق ہے اور حدیث مذکور میں عشا کی نماز کے متعلق یہ حکم جاری کیا گیا ہے کہ اسے تہائی رات کے پہلے حصے میں ادا کیا جائے۔“

اپنے دعوے کے ثبوت میں فاضل محترم نے علامہ عزیزی کی السراج المنیر شرح الجامع الصغیر اور علامہ عبدالرؤف السناوی کی فیض القدير شرح الجامع الصغیر کا حوالہ بھی دیا ہے۔ علامہ عزیزی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

اعتصموا بفتح الهمزة وسكون العين المهملة وكسر المشددة الفوقانية ای اخبروا صلاة العشاء الى العتمة۔

ترجمہ: اعتصموا میں ہمزہ پر زبر، عین ساکن، تا پر زیر۔ معنی یہ ہے کہ عشا کی نماز کو پہلی تہائی رات تک مؤخر کرو۔“

اس کے بعد فاضل محترم نے فیض القدير سے علامہ مناوی کی ایک طویل عبارت نقل فرمائی ہے، اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ”علامہ مناوی کی اس پوری بحث کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حدیث مذکور کا تعلق عمامہ سے نہیں ہے، بلکہ اس میں نماز عشا کی اہمیت و فضیلت کا بیان ہے۔“

اس کے بعد فاضل محترم نے ابو داؤد و شریف کی ایک حدیث سے اس معنی کی تائید پیش کی ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:

”فاضل بریلوی نے حدیث کا جو ترجمہ پیش کیا ہے وہ غالباً علامہ مناوی کی اس تحریر سے متاثر ہے و قیل هو اعتصموا ای البسوا العمامم ویؤید السبب الآتی علیہ ففیہ ان التعمیم من خصائص هذه الامة مگر یہ ضعیف قول چند وجوہ سے باطل ہے۔“

اس کے بعد فاضل محترم نے اس ”ضعیف قول“ کے باطل ہونے کی پانچ وجوہ ذکر کی ہیں۔ فاضل محترم کی پوری بحث پڑھنے کے بعد ہادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ واقعی یہاں صاحب فتاویٰ رضویہ سے ترجمہ کرنے میں تسامح ہوا ہے، لیکن اس بے بضاعت راقم الحروف نے جب اس حدیث کا تحقیقی مطالعہ کیا تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوئے۔ (۱) اس حدیث پاک کا عشا کے وقت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ عمامہ کی فضیلت ہی میں وارد ہوئی ہے۔ (۲) فتاویٰ رضویہ میں مذکور ترجمہ بالکل درست ہے۔ (۳) جن شارحین نے اس حدیث کو عشا کی فضیلت سے متعلق کیا ہے انہوں نے صرف حدیث کے ایک جز کو پیش نظر رکھا اور حدیث کے سیاق و سباق پر غور نہیں فرمایا۔ اب ہم ان تینوں امور کا دلائل کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔..... ہم نے ابتدا میں ذکر کیا تھا کہ یہ

حدیث شعب الایمان، جامع صغیر اور کنز العمال میں موجود ہے، کافی تلاش کے باوجود فی الحال ان تین کتابوں کے علاوہ اور کہیں اس حدیث کی موجودگی کا علم راقم کو نہیں ہے، جامع صغیر اور کنز العمال دونوں میں اس حدیث کے بعد ”شعب“ کا نشان بنایا گیا ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ مذکورہ دونوں کتابوں میں اگر ”شعب“ کی علامت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے، گویا اس حدیث کا اصل ماخذ ”شعب الایمان“ ہے۔ اب اگر عشا کے وقت سے اس حدیث کا ذرا بھی تعلق ہوتا تو امام بیہقی اس کو ”باب مواقیت الصلاة“ یا ”باب فضائل العشاء“ وغیرہ کے تحت ذکر کرتے لیکن شاید آپ کو حیرت ہوگی کہ امام بیہقی نے اس حدیث کو ”باب فی اللباس“ والاویسی“ (کپڑوں اور برتنوں کا باب) میں درج کیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کو اس باب میں ”فصل فی العمائم“ (فصل عمامہ کے بارے میں) کے تحت رکھا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام بیہقی کے نزدیک بھی یہ حدیث عمامہ سے متعلق ہے۔

اس حدیث کے فضائل عمامہ سے متعلق ہونے کی سب سے بڑی دلیل اس کا سیاق و سباق ہے، اگر سیاق و سباق پر غور کر لیا جائے تو پھر کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جامع صغیر اور کنز العمال میں اس حدیث کا صرف ایک جزدکور ہے (اس کی وجہ آگے آ رہی ہے) مگر اس حدیث کے اصل ماخذ ”شعب الایمان“ میں یہ پوری حدیث نقل کی گئی ہے۔

ملاحظہ کریں تو اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق عمامہ سے ہے۔ حضور ﷺ کا اپنے صحابہ کو کپڑے تقسیم فرماتے ہوئے (جن میں عمامہ کا ہونا عین قرین قیاس ہے)۔ ارشاد فرمانا کہ ”اعتموا“ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ لفظ اعتموا سے عمامہ باندھنے کا حکم فرما رہے ہیں۔ اگر بالفرض یہاں اعتموا سے عشا کی نماز مراد ہو تو پھر راقم الحروف حدیث کے ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان کوئی ربط سمجھنے سے قاصر ہے، کیوں کہ کپڑے تقسیم فرمانے اور عشا کی نماز کے وقت کی فضیلت بیان کرنے میں بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

امام سیوطی نے جامع صغیر میں صرف ”احادیث قولیہ“ ذکر کرنے کا التزام فرمایا ہے، لہذا آپ نے حدیث کا پہلا جز (کپڑے تقسیم فرمانا) جس کا تعلق ”حدیث فعلی“ سے ہے، اس کو چھوڑ کر صرف وہ جز نقل فرمایا جو ”حدیث قولی“ ہے یعنی اعتموا الخ اب چون کہ جامع صغیر کی ترتیب ابواب و فصول پر نہیں ہے بلکہ حدیث قولی کے پہلے حرف کا اعتبار کرتے ہوئے حروف محکم کی ترتیب پر احادیث کو درج کیا گیا ہے لہذا اگر کسی حدیث کے کسی لفظ میں کوئی ایسا ابہام یا احتمال ہے جس کی بنیاد پر اس حدیث کے باب یا موضوع کے تعین میں دشواری ہو تو صرف جامع صغیر دیکھ کر حتمی طور پر یہ طے نہیں کیا جاسکتا کہ اس حدیث کا تعلق کس باب سے ہوگا، جامع صغیر کی اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے امام علی بن حسان الدین چشتی برہان پوری المعروف بابائے الہندی نے کتاب ”کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال“ تالیف فرمائی، جس میں امام سیوطی کی تین کتابوں جامع صغیر، جامع کبیر اور زیادۃ الجامع کی احادیث کو ابواب و فصول پر ترتیب دیا، ابواب و فصول کی یہ ترتیب گویا مذکورہ تین کتابوں میں موجود احادیث کی شرح کی منزل میں ہے۔ مصر کے بلند پایہ محدث اور ازہر شریف میں شعبۂ حدیث کے پروفیسر علامہ عبدالمہدی عبد القادر کنز العمال کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

شریف میں شعبۂ حدیث کے پروفیسر علامہ عبدالمہدی عبد القادر کنز العمال کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جمع احادیث الجامع الصغیر و زوائدہ و بوبہا علی حسب الابواب الفقہیہ، و تلك الابواب والفصول والتراجم بمنزلة الشرح للاحادیث۔ (ترجمہ: جامع صغیر کی احادیث کو جمع کیا اور پھر ابواب فقہیہ کے اعتبار سے ان کی تجویب کی، یہ ابواب، تفصیلیں اور تراجم احادیث کی شرح کی منزل میں ہیں)۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر جامع صغیر کی کسی حدیث کے باب کے تعین میں اختلاف ہو تو اس کے تفسیر کے لیے کنز العمال سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جامع صغیر کی زیر بحث حدیث کو علامہ برہان پوری نے کنز العمال میں کس باب کے تحت درج کیا ہے؟ کنز العمال میں تیسرا باب لباس کے بیان میں ہے (اللباس الثالث فی اللباس) اس باب میں دو تفصیلیں ہیں، پہلی فصل لباس کے آداب کے بیان میں ہے (الفصل الاول فی آدابہ) اس فصل میں چند فروع ہیں، ان میں ایک فرع کا عنوان ہے: ”فرع فی العمائم“ اس فرع میں عمامہ کے متعلق چند احادیث درج کی گئی ہیں، جن میں پانچویں حدیث یہی زیر بحث حدیث ہے [۷] گویا صاحب کنز العمال کے نزدیک بھی عشا کے وقت سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک بھی یہ حدیث عمامہ کے باب سے متعلق ہے۔

فاضل محترم نے جامع صغیر کی دو شروع (السراج المنیر للعزیزی اور لہیض القدر للمناوی) کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مذکورہ دونوں شروع اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں اور یہ درست ہے کہ ان میں اس نکتہ کی تشریح اس کو ”اعتمام“ سے مشتق مان کر کی گئی ہے، لیکن جامع صغیر کے ایک اور جلیل القدر شارح علامہ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن محمد المتبولی نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے اس کو عمامہ کے متعلق ہی تسلیم کیا ہے۔ آپ نے ”الاستدراک المنصور“ کے نام

سے جامع صغیر کی شرح فرمائی ہے، اس کا ایک نایاب مخطوطہ ازہر شریف کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس کے متعلق صفحہ کی فوٹو کاپی ہمارے پیش نظر ہے، اس میں آپ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے: ”قال اعتموا ای تعمموا یعنی البسوا العمامة قال خالفوا علی الامم الخ فیہ الامر بمخالفة من قبلنا حیث لم یرد فی شرعنا وان من قبلنا کانوا لا یعممون وسببہ کما فی الشعب اتی النبی ﷺ بشیاب من الصدقة فقسماہین اصحابہ وقال اعتموا خالفوا لذلک وروی ابن عدی و البیہقی من طریق خالد بن معدان عن عبادۃ مرفوعاً علیکم بالعمائم فانہا سیمما الملائکة و ارجوا لها خلف ظهورکم ولو قبل متن الحدیث جید بلہذا الطرق لم یبعد و فیہ ندب لبس العمائم خصوصاً عند ارادة الصلاة ونحوها۔“

کیا اس واضح عبارت کے بعد بھی اب اس بات میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق عمامہ سے نہیں ہے۔

ان سب حوالوں سے قطع نظر اگر عربی لغت اور زبان کے محاورات کی رو سے اس معاملہ کا جائزہ لیا جائے تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس حدیث میں ”اعتموا“ سے عمامہ باندھنا ہی مراد ہے۔ اس لیے کہ ”اعتم“ کا معنی ”صلی العشاء فی العتمة“ (اس نے رات کی پہلی تہائی میں عشا کی نماز پڑھی)۔ کل نظر ہے، بلکہ ”اعتم“ کا معنی ”دخل فی العتمة“ (دورات کی اول تہائی میں داخل ہوا)۔ ہے، لغت کی معتبر کتاب مختار الصحاح میں ہے ”اعتمنا من العتمة کما صبحنا من الصبح“ خود فاضل محترم نے علامہ مناوی کی جو عبارت نقل فرمائی ہے اس میں بھی یہی ہے۔ ”یقال اعتم الرجل اذا دخل فی العتمة کما یقال اصبح اذا دخل فی الصباح“ لہذا اگر اول تہائی شب میں عشا کی نماز پڑھنے کا مفہوم ادا کرنا ہو تو صرف ”اعتم“ کافی نہیں ہوگا، بلکہ اس کے بعد ”ب“ حرف جر کے صلے کے ساتھ لفظ

اس کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں، مثلاً امام احمد اپنی مسند میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "أَعْتَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْعِشَاءِ" مصنف عبد الرزاق میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے "أَعْتَمَ نَبِيُّ اللَّهِ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ بِالْعِشَاءِ" چونکہ عشا کی نماز کو بھی "العتمة" کہا گیا ہے، لہذا صحیح ابن حبان میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کے الفاظ یہ ہیں: "أَعْتَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْعِشَاءِ" دیکھا آپ نے جہاں بھی "عشا کی نماز اول تہائی شب میں ادا کرنے" کا مفہوم بیان کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہاں صرف "أَعْتَمَ" کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ عشا یا صلاہ وغیرہ بھی لانا ضروری ہوتا ہے، فاضل محترم نے ابو داؤد شریف کی جو حدیث نقل فرمائی ہے اس میں بھی ترکیب کی یہی نوعیت ہے: "أَعْتَمُوا بِهَذِهِ الصَّلَاةِ" اس کے برخلاف جہاں صرف "أَعْتَمَ" ہوتا ہے، اس سے عشا کی نماز نہیں بلکہ رات کے تہائی حصے میں داخل ہونا مراد ہوتا ہے، مثلاً امام احمد اپنی مسند میں اور ابن خزیمہ اپنی صحیح میں سیدہ عائشہ صدیقہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "أَنْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَتَمَّ ذَاتَ لَيْلَةٍ حَتَّى ذَهَبَ عَامَةُ اللَّيْلِ وَحَتَّى نَامَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ فَخَرَجَ فَصَلَّى" اس حدیث پاک میں "أَعْتَمَ" بغیر صلے کے استعمال ہوا ہے لہذا یہاں اس سے عشا کی نماز نہیں بلکہ رات کے پہلے تہائی حصے میں داخل ہونا مراد ہے۔ اس پر قرینہ یہ ہے کہ اگر آپ اس "أَعْتَمَ" سے "صَلَّى الْعِشَاءَ فِي الْعِثْمَةِ" مراد لیں تو حدیث کے آخری الفاظ "فَخَرَجَ فَصَلَّى" بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ ہمیں تلاش بسیار کے باوجود کوئی ایسی روایت نہیں مل سکی جس میں صرف "أَعْتَمَ" ہو اور وہاں عشا کی نماز اول تہائی شب میں پڑھنا مراد ہو۔ اب اس وضاحت کی روشنی میں اگر زیر بحث حدیث پر غور کیا جائے تو اس میں بھی لفظ "أَعْتَمُوا" حرف جار "ب" اور مجرور "عشا" یا "صلاہ" کے بغیر آیا ہے اس لیے

عربی لغت اور محاورے کی رو سے یہاں "أَعْتَمُوا" سے "صَلُّوا الْعِشَاءَ فِي الْعِثْمَةِ" مراد لینا درست معلوم نہیں ہوتا، لہذا یہاں "أَعْتَمُوا" نہیں بلکہ "أَعْتَمُوا" پڑھنا درست ہونا چاہیے، کیونکہ "أَعْتَمُوا" بغیر کسی صلے کے عمامہ باندھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ان تمام دلائل کے بعد بھی ہم یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ "علامہ منووی اور علامہ عزیزی نے اس حدیث کی غیر معتبر توجیہ کی ہے"، کیوں کہ ممکن ہے ان حضرات کے پاس اس توجیہ کی کوئی ایسی وجہ ترجیح ہو جس تک ہماری ناقص نگاہ نہیں پہنچ پارہی ہے۔ ہم نے ابتدا میں ذکر کیا تھا کہ فاضل محترم نے اس حدیث سے عمامہ مراد ہونے کو پانچ وجوہ سے باطل کیا ہے، ان پانچوں وجوہ پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے، مگر ان جلیل القدر ائمہ فہم کی تصریحات اور لغت کی شہادت کے بعد اب ہمارے خیال میں ان وجوہ پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (جام نور دسمبر ۲۰۰۶ء)

(۵)

حدیث میں ہے کہ "عنقریب میری امت بہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ایک فرقہ نجات یافتہ ہوگا باقی تمام فرقے جہنمی ہوں گے۔" "امت" کی دو قسمیں ہیں: (۱) امت دعوت (۲) امت اجابت۔ اسی طرح جہنمی بھی دو طرح کے ہوں گے۔ (۱) جو ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہیں گے۔ (۲) جو جہنم میں اپنے کیے کی سزا پا کر بالآخر اس سے نکل آئیں گے۔ اکثر شارحین حدیث نے اس حدیث کے تحت لفظ "امت" سے مراد "امت اجابت" لے کر "جہنمی" کے تعلق سے بڑی بحثیں کی ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک یہاں جہنمی سے مراد ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں رہنا ہے، ان کے نزدیک جو حضرات دعویٰ ایمان کے ساتھ کفر کے مرتکب ہیں جیسے شیعوں کا وہ طبقہ جو قرآن کو ناقص مانتا ہے، وہابیوں کا وہ طبقہ جو حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کے پیدا ہونے کو شرعاً ممکن بتاتا ہے، وغیرہ وغیرہ، وہ

امت اجابت میں ہونے کے باوجود ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہیں گے۔ اور جن حضرات کے نزدیک یہاں جہنمی سے مراد "جہنم میں اپنے کیے کی سزا پا کر اس سے نکل آئیں گے۔" ہے، ان کے نزدیک دعویٰ ایمان کے ساتھ کفر کا ارتکاب کرنے والے امت اجابت میں داخل ہی نہیں رہتے ہیں، امت اجابت سے نکل کر امت دعوت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ شارحین کے اس اختلاف سے ایک نیا اختلاف رونما ہوتا ہے کہ حدیث پاک میں جن بہتر فرقوں کی پیشین گوئی فرمائی گئی ہے، آیا وہ بہتر فرقے کفار و مرتدین کے ہیں یا صرف اہل بدعت اور گمراہوں کے؟ اول الذکر حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں ہوں گے اور موخر الذکر حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ وہ اپنے کیے کی سزا پا کر جہنم سے نکل آئیں گے۔

بلاشبہ ہر فریق کے پاس اپنے اپنے موقف پر دلائل ہیں، اس لیے کسی بھی موقف کو بالکل غلط و باطل نہیں کہا جاسکتا ہے، البتہ راجح و مرجوح کی بات الگ ہے۔ محقق دوانی، امام ربانی مجدد الف ثانی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا عبدالحمید، مولانا محمد رفیع، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا انوار اللہ فاروقی، اس بات کے قائل ہیں کہ حدیث پاک میں جن بہتر فرقوں کے جہنمی ہونے کی پیشین گوئی فرمائی گئی ہے، وہ بہتر فرقے ہمیشہ ہمیش جہنم میں نہیں رہیں گے، بلکہ اپنے کیے کی سزا پا کر جہنم سے نکل آئیں گے۔ چنانچہ مکتوبات امام ربانی جلد سوم صفحہ ۶۷ مطبع نول کشور لکھنؤ مکتوب نمبر ۶۷ میں ہے:

"باید دانست کہ مراد از قول آن سرور علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ و السلام کہ در حدیث تفریق این امت بہ ہفتاد و دو فرقہ واقع شدہ است کلہم فی النار الا واحدا دخول شان است در نار و مکلف شان است در عذاب آن، نہ خلود در نار و دوام در عذاب آن کہ منافی ایمان است و مخصوص بکفار است۔" جاننا چاہیے کہ سرور عالم ﷺ کہ ارشاد مبارک کلہم فی النار الا واحدا جو حدیث افتراق امت میں آیا ہے اس سے مراد ان کا جہنم میں داخل ہونا اور عذاب میں کچھ وقت گزارنا ہے نہ کہ خلود فی النار اور عذاب میں ہمیشہ ہمیش رہنا، جو ایمان کا منافی اور کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔"

مولانا عبدالحی کے مجموعہ فتاویٰ ۸۹/۱ مطبع برقی ۱۳۱۴ھ میں ہے: "کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ جو حضرت رسول مقبول ﷺ نے فرمایا تھا کہ بعد میرے امت میری کے بہتر فرقے ہو جائیں گے، ایک ناجی اور سب ناری ہوں گے۔ آیا ناری سے مراد کفار ہیں یا مسلمان فاسقان؟ کہ بہ سبب عصیاں کے دوزخی ہو جائیں گے۔ بعضے کہتے ہیں کہ سب اہل ہو کافر ہیں، ایک فرقہ مسلمان ہے جس کو اہل سنت و الجماعت کہتے ہیں۔

الجواب: کتب عقائد اور فقہ میں اس طرح لکھا ہے کہ بہتر فرقے جو اہل ہوا ہیں ایک بھی کافر نہیں۔

اس فتوے کی تصدیق کرتے ہوئے مولانا محمد نعیم فرنگی محلی لکھتے ہیں: فی الواقع حدیث افتراق امت میں ناری سے مراد مسلمین فاسقین ہیں، شامت عصیاں سے دوزخ میں جاویں گے۔" اس موقف پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بہتر فرقے اگر جہنم سے نکل آئیں تو پھر اہل سنت کے وہ افراد جو اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں جائیں گے اور ان جہنمی فرقوں میں فرق کیا ہوگا؟ حضرت محقق دوانی شرح عقائد جلالیہ صفحہ ۱۲ مطبع علویہ لکھنؤ ۱۲۷۰ھ میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کلہا فی النار من حیث الاعتقاد فلا یرد انہ لو ارید الخلود فیہا فهو خلاف الاجماع فان المؤمنین لا یخلدون فی النار و ان ارید بہ مجرد الدخول فهو مشترك بین الفرق اذ ما من فرقة الا و بعضهم عصاة بہتر فرقے عقیدے کے اعتبار سے دوزخی ہوں گے، لہذا یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ مسلمان بالا جماع ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہیں گے۔ اور اگر اس سے مراد جہنم میں جا کر اپنے کیے کی سزا پا کر نکل آنا ہے تو یہ بات تمام فرقوں میں مشترک ہے، کیوں کہ ہر فرقے میں کچھ نہ کچھ گناہ گار ضرور ہیں۔"

حاشیہ میں مولانا عبدالحمید فرنگی محلی فرماتے ہیں "وجه عدم الورد انا نختار الشق الثانی ای مجرد الدخول فی النار و لانسلم انہ مشترك بین الفرق

فان دخول الفرق الهالكة في النار من حيث الاعتقاد، وفراد الفرقه الناجية وان تدخل في النار لكنهم لا يدخلون من حيث الاعتقاد بل ان دخلوا فمن حيث العمل - اعتراض اس لیے نہیں پڑے گا کہ ہم دوسری شق یعنی جہنم میں جا کر اپنے کیے کی سزا پانے کے بعد نکل آنا مراد لیتے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کہ یہ بات تمام فرقوں میں مشترک ہے؛ اس لیے کہ ہلاک ہونے والے فرقوں کا جہنم میں جانا ان کے عقائد کی وجہ سے ہوگا اور فرقہ ناجیہ کے افراد اگر دوزخ میں جائیں گے تو عقائد کی وجہ سے نہیں، عمل کی وجہ سے جائیں گے۔“

شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی شرح سفر السعادة صفحہ ۱۹۷ افضل الراجح مکتبہ ۱۲۵۲ھ میں فرماتے ہیں:

”مراد بدخول نار و نجات ازاں بجهت عقیده است نه عمل، والا دخول فرقہ ناجیہ در نار بجواز عمل نیز جائز است - ایں فرق ہمہ اہل قبلہ اند و تکفیر آنہا مذہب اہل سنت و جماعت نہ، اگرچہ کفر بر آنہا لازم آمد۔“

ان فرقوں کے جہنم میں داخل ہونے اور اس سے نجات پانے سے مراد یہ ہے کہ وہ عقیدے کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے عمل کی وجہ سے نہیں۔ در نہ عمل کی وجہ سے فرقہ ناجیہ کا بھی جہنم میں جانا ممکن ہے۔ یہ تمام فرقے اہل قبلہ ہیں، مذہب اہل سنت کے مطابق ان کی تکفیر نہیں ہوگی، اگرچہ ان پر کفر لازم آتا ہو۔“

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فتاویٰ عزیز یہ صفحہ ۲۶۱/۲۵ مطبع مجبائی دہلی ۱۳۱۱ھ میں فرماتے ہیں:

علیٰ بن شش جواب ازین شبہ نوشتہ اند کہ در شرح عقائد ملا جمل و حواشی آں مذکور و مسطور اند - و منتخب اجوبہ مذکورہ سر جواب است - جواب اول کہ ارجح و اقویٰ ست جواب محقق دوائی است کہ باختیار شق ثانی جواب دادہ اند - حاصلش آں کہ مراد دخول است من حیث الاعتقاد فرقہ ناجیہ را اصلاً از جهت اعتقاد دخول نار نخواہد شد، اگرچہ از جهت تفصیرات عمل در نار داخل شوند۔

علمائے اس شبہ کے پانچ چھ جوابات دیے ہیں، جو شرح عقائد ملا جلال اور اس کے حواشی میں مذکور ہیں۔ ان جوابات میں سے تین جواب منتخب ہیں۔ پہلا جواب جو سب سے زیادہ رائج اور قوی ہے، وہ محقق دوائی کا جواب ہے جو انہوں نے شق ثانی کو اختیار کر کے دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دخول من حیث الاعتقاد مراد ہے اور فرقہ ناجیہ اعتقاد کی وجہ سے جہنم میں نہیں جائے گا، اگرچہ عمل میں کوتاہی کی وجہ سے دوزخ میں جائے۔“

امام احمد رضا نے بھی فتاویٰ رضویہ ج ۶ ص ۲۴۷ تا ۲۴۸ میں مندرج رسالہ سبط السبوح کے تازیانہ ۱۲/۱۳ کے تحت تفسیر جمیل میں شاہ اسماعیل دہلوی کا رد کرتے ہوئے یہی موقف اپنایا ہے، فرماتے ہیں:

اقول: اوجہوئی نظیروں سے بے چارے عوام کو چھٹنے والے! اس تفرقہ کی نئی نظیر دیکھ: مسلمان کو اہل بدعت کے بہتر فرقے پورے گنا کر کہتے: رافضی، وہابی، خارجی، معتزلی، جبری، قدری، ناصبی وغیرہ نہیں تو بے شک اس کی بڑی تعریف ہوئی اور بعد یہی کلمات کسی کافر کے حق میں کہیے تو کچھ تعریف نہیں۔ حالاں کہ یہ سب فقہیہ دونوں جگہ قطعاً صادق - تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمان باوجود قدرت رافضی، وہابی ہونے سے بچا، بلکہ محمود ہوا - اور اس کافر کو رافضی، وہابی ہونے پر قدرت ہی نہ تھی بلکہ اندر نہ ٹھہرا؟ کوئی جاہل سا جاہل یہ فرق نہ سمجھے گا بلکہ تفرقہ وہی ہے کہ جب یہ فرقے اہل قبلہ کے ہیں تو مسلمان کے حق میں ان بہتر کی نفی، سنی ہونے کا اثبات کرے گی، بلکہ اعظم مدائح سے ہوا اور کافر سرے سے مقسم یعنی کلمہ گوہی سے خارج، تو ان کی نفی سے کسی وصف محمود کا اس کے لیے اثبات نہ نکلا، و بلکہ مفید مدح نہ ٹھہرا۔“

مولانا اسید الحق نے بھی اپنی کتاب ”حدیث افتراق امت“ میں اسی موقف کو رائج قرار دیتے ہوئے اختیار کیا ہے، لکھتے ہیں:

”گزشتہ صفحات میں ہم نے زیر بحث حدیث میں ”فی النار“ سے دخول فی النار مراد لینے کے لیے اکابر علمائے اہل سنت

کے حوالے پیش کیے تھے بلکہ اہم بھی..... کے دامن میں پناہ لیتے ہوئے یہاں ”فی النار“ سے ”دخول فی النار“ مراد لینے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔“

(۶)

دوسال پہلے میں نے بنگال کے اپنے ادارہ میں آل بنگال مدارس کے طلبہ کا اردو، عربی، انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں مختلف عناوین پر تقریری مسابقہ کرایا تھا، جس میں جج کی حیثیت سے شہید موصوف جی تھے۔ مسابقہ کے اختتام پر انہوں نے اپنی تقریر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے تعلق سے جو کچھ کہا تھا اس کی یاد آج بھی سامعین کے جہوں میں تازہ ہوگی اور میری معلومات کی حد تک کسی نے بھی اعلیٰ حضرت سے متعلق اس طرح کی بات نہیں کہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

”حضرات! سو سال پہلے میرے جدا محمدی کشنہ کانفرنس میں بڑبان اردو فرمائی ہوئی بات کی صدائے بازگشت آج یہاں کے طلبہ کی اردو کے ساتھ عربی، انگریزی اور بنگلہ کی تحریروں اور تقریروں میں پاکر میں بے حد مسرور ہوا۔..... اعلیٰ حضرت مجدد تھے تو اس کا ادراک سب سے پہلے میرے ہی جدا محمد کو ہوا اور انہوں نے ہی دنیا کو اس سے باخبر کیا۔..... اعلیٰ حضرت اس لیے اعلیٰ حضرت نہیں تھے کہ انہوں نے ڈھیر ساری کتابیں لکھیں، ڈھیر ساری کتابیں تو بہت سے لوگوں نے لکھی ہیں مگر ان کو اعلیٰ حضرت کوئی نہیں کہتا۔ اعلیٰ حضرت کی ڈھیر ساری کتابیں نہیں ہوتیں، صرف الفضل الموصی، اجلی لاعلام ان الفتویٰ مطلقاً علی قول الامام اور آداب التوحید یہ تین کتابیں ہی ہوتیں تو بھی ان کے اعلیٰ حضرت ہونے کے لیے کافی تھیں۔“

(۷)

عراق کے نامور ادیب و شاعر اور محقق و ناقد جناب ڈاکٹر رشید عبد الرحمن عبیدی نے ”قصیدتان والعتان“ مصنفہ امام احمد رضا پر ”شاعر من الہند“ کے عنوان سے تحقیقی کام کیا تو جہاں انہوں نے اہل حق کے محاسن کا کھلے دل سے اعتراف کیا، وہیں اپنی سمجھ کے مطابق کچھ نئی نئی اور عرضی خامیوں کی بھی نشان دہی کی تو ہم خواجہ تاشان

رضویت ہزار دعوائے عقیدت کے باوجود کچھ نہ کر سکے اور اسی شہید بغداد نے بڑھ کر امام احمد رضا کی محبت کا حق ادا کیا اور ”قصیدتان والعتان“ کا اردو ترجمہ اپنے ایک شاگرد سے کرا کر اس پر ایک طویل مقدمہ لکھا، جس میں ان قصائد کی موضوعاتی، فکری، عرضی محاسن کو دکھاتے ہوئے ڈاکٹر رشید عبد الرحمن عبیدی کے اعتراضات کی حقیقت واضح کی ہے اور حوالوں میں علم اللغات، علم العروض اور علم النحو کی معتد و مستند کتابوں کے ساتھ ساتھ عرب کے نامور شعراء امرأ القیس، ابو النعمان اور داعی النعمری وغیرہ کے اشعار پیش کر کے جاہت کر دیا ہے کہ یہ اعتراضات دراصل عراق کے اس نامور ادیب و شاعر اور محقق و ناقد جناب ڈاکٹر رشید عبد الرحمن عبیدی کی امام احمد رضا کے مدارک علمی تک نارسائی کا نتیجہ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ مولانا اسید الحق کی تحریر اور تقریر اور گفتار و کردار سے یہ بات کہیں دور دور تک نظر نہیں آتی کہ انہیں امام احمد رضا قادری بریلوی یا خانوادہ رضویہ سے کسی طرح کا کوئی تعصب ہو۔ وہ مثبت فکر و مزاج کے حامل ایک علمی اور عملی انسان تھے اور علمی اور عملی آدمی کو پسند کرتے تھے، اس لیے ان سے یہ بہت بعید تھا کہ تعصب، عناد، فتنہ پروری اور نفاق جیسے سفلے جذبات ان کو چھو کر بھی گزرتے۔ اس بات سے ان کا قد اور بھی بلند ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی کے بعض نادان دوست ان پر تحریر و تقریریں اور جیسے جیسے بھی کیا کرتے تھے، لیکن مولانا موصوف ایسی مذہبی حرکتوں کے رد عمل میں ہمیشہ خاموش ہی رہے اور کبھی بھی جواب آن غزل کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ وہ ہر صورت میں جماعت میں اتحاد چاہتے تھے اور وہ اس کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

□□□

✽ بانی و مہتمم: جامعہ نور یہ شام پور، رائے، ضلع اتراکھن پور (بنگلہ)
email: mmrziwi@gmail.com

مولانا اسید الحق قادری اور جام نور

جام نور کی نشاۃ ثانیہ

اپنے بڑے بزرگوں سے سنا، پڑھا اور خود کا بھی اعتراف ہے کہ ماضی قریب میں جماعت اہل سنت میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری کی شخصیت رہبر و رہنما کی حیثیت سے تسلیم کی گئی اور آج بھی تسلیم کی جاتی ہے، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عمومی طور پر اعلیٰ حضرت سے جماعت کا لگاؤ جذباتی اور رسمی ہی رہا، حقیقی، واقعی اور معنوی لگاؤ سے جماعت کو سوں دور ہی رہی۔ میرے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ کم از کم اعلیٰ حضرت نے فروغ اہل سنت کے لیے جو دس نکاتی پروگرام مرتب کیا تھا، اس پر ہوشمندوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کو چھوڑ کر عام طور سے جماعت نے عمل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری باتوں میں جماعت نے اعلیٰ حضرت کی علمی، تحقیقی، تدقیقی اور اجتہادی روش کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یا سمجھنے کے باوجود دیدہ و دانستہ اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر اپنی ایک الگ ڈگر بنائی جو عند تحقیق 'روش رضا' سے لگا نہیں کھاتی۔ یہی بات ایک لمبے عرصے سے جماعت کی نوجوان نسلوں کو ستا رہی تھی جس کا شدید احساس خاص طور سے مدیر جام نور محترم مولانا خوشنورانی کو ہوا اور اس خاص احساس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی رگوں میں جماعت کی عبقری شخصیت رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا خون دوڑ رہا ہے اور آپ کی آنکھوں میں جماعت کے لیے علامہ کے دیکھے ہوئے خواب سجے ہوئے ہیں۔ اسی احساس کے پیش نظر مولانا خوشنورانی نے اکتوبر ۲۰۰۲ء میں جام نور کی نشاۃ ثانیہ کی۔

جام نور کے سوس شمارے میں رسالہ ہذا کی نشاۃ ثانیہ کے تعلق سے مدیر محترم نے ادارہ میں "چند سوالات پوری توانائی کے ساتھ اپنے جوابات کے منتظر تھے، وہ یہ ہیں" کے ذیل میں جو باتیں لکھی ہیں، آپ کو ان میں اعلیٰ حضرت کے دس نکاتی پروگرام کی ہی بازگشت سنا کی دے

گی۔ یہ اور بات ہے کہ اسلوب منفرد اور خوشترانہ ہے۔ مزید اطمینان کے لیے محلولہ بالا ادارہ پڑھ سکتے ہیں۔ آغاز نشاۃ ثانیہ اکتوبر ۲۰۰۲ء میں جام نور مسلسل جماعت کے فکری رویوں میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہا ہے، ہر جہت سے جماعت میں فراموش کردہ اسلامی انقلاب لانے کی دعوت دے رہا ہے اور ہر جگہ کہنے سے زیادہ کرنے کا پیغام پہنچا رہا ہے۔ جام نور کا یہ سلسلہ جاری ہے اور دعا ہے کہ یہ صدیوں تک جماعت کے میخانوں میں پلایا جاتا رہے۔

علامہ اسید الحق قادری اور جام نور

روز آغاز سے "بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے چل" ماہ نامہ جام نور کی پالیسی رہی جس سے مدیر جام نور کے دیرینہ رفیق، ممتاز ناقد و محقق، شہید بغداد، عالم ربانی، علامہ اسید الحق عاصم قادری عثمانی بدایونی علیہ الرحمہ بخوبی واقف تھے، بلکہ ایک حد تک اس پالیسی کے وضع میں خود علامہ عاصم قادری بھی شریک تھے، جسے مولانا خوشنورانی صاحب ہر طور پر مانتا سکتے ہیں اور اگر شریک نہیں بھی تھے تو اس پالیسی سے انہیں ہر اتفاق تھا جو شریک ہونے کے برابر ہے۔ اسی پالیسی کے پیش نظر اور خود اپنی عقابانی فکر کے باعث علامہ اسید الحق محمد عاصم قادری شروع ہی سے جام نور کے صفحات پر قارئین کے روبرو بہت کم نالہ درد اکثر دو اسے دل جیسے وہ مقالات/خیالات/تقیدات/مکتوبات/منظومات کے حاضر ہوئے جن سے خصوصاً اہل سنت کے قارئین کی فکر و نظر کوئی حد ملی، نئے گوشے دکھے، نئی سمیٹیں سوچیں اور زبان و ادب کے صحیح معنی معلوم ہوئے۔

علامہ عاصم قادری کی ان تمام کوششوں کے پیچھے جماعت کی عظمت رفتہ کی بحالی کے عوامل ہی کار فرما تھے، نہ کہ وہ ان سے اپنے ہمالیائی معلوماتی ذہن اور اپنی فکری بصیرت کا جماعت سے اعتراف

کروانا چاہتے تھے، بلکہ درحقیقت وہ مخلصانہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر گامزن تھے اور جماعت اہل سنت کے اکابرین کی علمی، فقہی، تحقیقی، تدقیقی، تجدیدی، دعوتی، اصلاحی، عملی اور سماجی طرز کی پیروی کر رہے تھے، جس سے پوری جماعت کو بالعموم اور نئی نسل کو بالخصوص یہ درس دے رہے تھے کہ تقریباً ایک صدی پہلے اگر ہندوستان بھر میں جماعت اہل سنت کے وابستگان کی تعداد ۹۰ یا ۹۵ فی صد تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس دور کے ہر فرد کا بردین و دعوت، علم و عمل، فکر و بصیرت، نقد و ثناء، عقیدہ و کلام، قرآن و علوم قرآن، حدیث و رجال، تصوف و اخلاق، تاریخ دیر، نقد و نظر، شعر و سخن، زبان و ادب کے خود جلوہ ریز و نور ریز پیکر تھے نہ کہ صرف پدم سلطان بوڑے کے نام نہاد علمبردار۔ اس لیے اگر وہی پرانے دن لوٹانے ہیں تو پھر اسی قدیم تعمیری طرز کی باخلاص پیروی کرنی ہوگی، یہ اور بات ہے کہ شراب کہن در جام نو کا اصول اپنانا ہوگا۔ اس فکر کے ساتھ جام نور کا آغاز ہوا اور جلد ہی اس فکر نے جام نور کے پلیٹ فارم سے تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک کے قارئین میں علامہ اسید الحق سرفہرست تھے، انہوں نے اس پلیٹ فارم سے اس فکر کو عام کرنے کے لیے اور امت کی فکری اور علمی تشکیل نو کے لیے مسلسل لکھنا شروع کیا، بلکہ اگر یہ کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ انہوں نے تعلیم سے فراغت کے بعد "جام نور" کے علاوہ کسی دوسرے رسالے کے لیے مستقل، مسلسل اور خصوصی طور پر کچھ نہیں لکھا۔ جام نور میں انہی مضامین اور مقالات کی اشاعت سے ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا۔ خود علامہ عاصم قادری کے بقول جامعہ ازہر، مصر جانے سے پہلے لاہور میں خوب لکھتے تھے جو انہی کی خانقاہ سے جاری ماہ نامہ "منظر حق" میں شائع ہوتے تھے، مصر جانے کے بعد اردو میں لکھنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس پر عربی سوار ہو گئی، البتہ جام نور کے مدیر مولانا خوشنورانی کے کافی اصرار پر انہوں نے اردو میں دوبارہ لکھنا شروع کیا اور پھر پوری علوم سامانی کے ساتھ لکھنے لگے۔

سب سے پہلے جام نور، مئی ۲۰۰۳ء میں ان کی ایک نظم "نالہ درد" کے عنوان سے شائع ہوئی اور آخری تحریر "شرح قصیدتان رائے گشتان: ایک تنقیدی مطالعہ" اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں قسط وار چھپی۔ یہاں علامہ بدایونی کے ان مضامین، مقالات اور نظموں کی

فہرست دی جا رہی ہے جو جام نور میں شائع ہوئے اس فہرست میں ممکن ہے کہ کوئی مقالہ شمار میں آنے سے رہ گیا ہو، جسے میری ناقص تلاش کا نتیجہ سمجھا جائے۔

- ۱- تصویر کا ایک رخ (اپریل، ۲۰۰۴ء) ۲- ابوریحان البیرونی (جون، ۲۰۰۴ء) ۳- دعوت و تبلیغ کے لیے خانقاہی نظام کتنا موثر ہے؟ (جون، ۲۰۰۴ء) ۴- عربی اور اردو محاورات کا تقابلی جائزہ (جولائی، ۲۰۰۴ء) ۵- ہم نامی کا مطالعہ (اگست، ۲۰۰۴ء) ۶- مصنف ابن ابی شیبہ اور فقہ حنفی (ستمبر، ۲۰۰۴ء) ۷- آج اہل خانقاہ کی نئی نسل تعلیم سے دور کیوں ہے؟ (دسمبر، ۲۰۰۴ء) ۸- فضیلۃ الشیخ السید محمد علوی المالکی: ایک تاثر (جنوری، ۲۰۰۵ء) ۹- دوستی کا ہاتھ (نظم) (جنوری، ۲۰۰۵ء) ۱۰- الحاد سے ایمان تک (فروری تا مارچ، ۲۰۰۵ء) ۱۱- حدیث الفراق امت: تحقیقی مطالعے کی روشنی میں (مئی تا اگست، ۲۰۰۵ء) ۱۲- تلاش عظمت رفتہ: خانوادہ عثمانیہ بدایوں کی آٹھ سو سالہ زریں تاریخ کے پس منظر میں (ستمبر، ۲۰۰۵ء) ۱۳- نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت (اکتوبر، ۲۰۰۵ء) ۱۴- متن حدیث کی بازیافت (نومبر، ۲۰۰۵ء) ۱۵- تبرک بالآثار کے خلاف ایک روایت کا علمی جائزہ (دسمبر، ۲۰۰۵ء) ۱۶- نماز میں رفع الیدین کے مسئلہ پر ایک دلچسپ مباحثہ (جنوری، ۲۰۰۶ء) ۱۷- یوسف القرضاوی اور جماعت سلفیہ (فروری، ۲۰۰۶ء) ۱۸- ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام (اپریل، ۲۰۰۶ء) ۱۹- جماعت اہل سنت کا حقیقی تعارف کیا ہے؟ (مئی، ۲۰۰۶ء) ۲۰- جماعت سلفیہ کے لیے دعوت فکر (جون، ۲۰۰۶ء) ۲۱- قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ (اگست تا نومبر، ۲۰۰۶ء) ۲۲- فتاویٰ رضویہ کی عبارت پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ (دسمبر، ۲۰۰۶ء) ۲۳- کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ (جون تا جولائی، ۲۰۰۷ء) ۲۴- مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی (اگست، ۲۰۰۷ء) ۲۵- اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبائے کر (اکتوبر، ۲۰۰۷ء) ۲۶- تحفظ توحید کے نام پر کتب اسلاف میں تحریف (دسمبر، ۲۰۰۷ء) ۲۷- پروفیسر ایوب قادری کی سخن گسری سخن فہمی کے تناظر میں (فروری، ۲۰۰۸ء) ۲۸- کشف الظنون: ایک تحقیقی مطالعہ (جون، ۲۰۰۸ء) ۲۹- احادیث قدسیہ: ایک تحقیقی جائزہ (نومبر، ۲۰۰۸ء) ۳۰- ہم نامی کا مطالعہ (نومبر، ۲۰۰۸ء) ۳۱- سیدنا

شاہ ابوالحسن احمد نوری کی بارگاہ میں حاضری (دسمبر، ۲۰۰۸ء) ۳۲- لیکچر
الہام لیکچر (فروری، ۲۰۰۹ء) ۳۳- تشہد کے سلسلے میں ایک مغالطے کا
تحقیقی جائزہ (مارچ، ۲۰۰۹ء) ۳۴- مطب اہل سنت و جماعت بریلی: تاریخی
پس منظر (مئی، ۲۰۰۹ء) ۳۵- دینی کام کے معنی اور تقاضے کیا ہیں؟
(جولائی، ۲۰۰۹ء) ۳۶- سرور کائنات امت کے احوال سے باخبر ہیں
(اگست، ۲۰۰۹ء) ۳۷- مولانا ابوالکلام آزاد کا تسامع (اکتوبر، ۲۰۰۹ء)
۳۸- دہر میں اسم محمد سے اجالا کروے (اپریل، ۲۰۱۰ء) ۳۹- شمس مارہرہ
اور رسالہ آداب السالکین (جون، ۲۰۱۰ء) ۴۰- شادوم از زندگی خورشید
کارے کردم (ستمبر، ۲۰۱۰ء) ۴۱- تقریروں میں موضوع روایات ایک
لحظہ فکریہ (اکتوبر، نومبر، ۲۰۱۰ء) ۴۲- فضل حق، فضل رسول اور آرزوہ
(دسمبر، ۲۰۱۱ء) ۴۳- خانوادہ خیر آبادی اہل علم خواتین (جولائی، ۲۰۱۱ء)
۴۴- علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں بعض بے بنیاد روایتیں
(اگست، ۲۰۱۱ء) ۴۵- علامہ فضل حق خیر آبادی: ایک تحقیقی جائزہ (ستمبر،
۲۰۱۱ء) ۴۶- علامہ فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسماعیل دہلوی (اکتوبر،
۲۰۱۱ء) ۴۷- عربی محاورات و تعبیرات: ایک جائزہ (نومبر، ۲۰۱۱ء) ۴۸-
سند المستکملین مولانا حیدر علی فیض آبادی (جون، ۲۰۱۲ء) ۴۹- فروز قد
تیمی کا قصیدہ میمیہ: ایک تحقیقی مطالعہ (اگست، ۲۰۱۲ء) ۵۰- خانوادہ
قادریہ بدایوں اور خانوادہ علمیہ: تعلقات و روابط (جنوری، ۲۰۱۳ء)
۵۱- قصیدہ بانٹ سعاد: ایک تحقیقی مطالعہ (فروری و مارچ، ۲۰۱۳ء)
۵۲- مولانا عبدالحمید بدایونی اور تحریک تحفہ نگہ خضریٰ (اپریل، ۲۰۱۳ء)
۵۳- شمس مارہرہ اور سراج الہند: علمی و روحانی روابط (مئی، ۲۰۱۳ء)
۵۴- تو کجا بہر قماش می روی (نومبر، ۲۰۱۳ء) ۵۵- شرح قصیدتان
رائستان: ایک تنقیدی مطالعہ (اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۳ء)۔

یہ وہ پیش رہا فکر انگیز و ملت ساز مقالات و نگارشات و منظومات
ہیں جنہیں ہماری جماعت میں موضوع قلم و سخن بنانا تو دور کی بات سوچا
بھی نہیں جاتا تھا۔ اس سے پہلے تو ہم (پاستھائے بعض) صرف جوت
میلا، فاتحہ، قیام، عرس، نذر و نیاز، چادر وغیرہ پر "خامہ فرسائی" کرتے
تھے جو کہ جماعت کا صرف ایک مباحی و استنباطی گوشہ تھا نہ کہ فرضی و واجبی
ذمہ داری اور اس پر مستزاد یہ کہ ہم اپنی ان مبارک تحریروں کو ہمدوش ثریا
گردانتے تھے۔ خدا مولانا سید الحق قادری کے درجہات ہزاروں ہزار

بلند فرمائے کہ انہوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہمیں لکھنے پڑنے
کا صحیح شعور عطا کر دیا۔ ان کے علاوہ مدیر جام نور مولانا خوشتر نورانی
بہیم اصرار پر علامہ عاصم قادری نے جام نور میں اپریل ۲۰۰۵ء سے دسمبر
۲۰۰۶ء تک "خامہ تلاش" کے عنوان سے جو کالم لکھے اس کی مثال مذہبی
صفت میں عفا ہے۔ خوشتر صاحب کے بقول:

"اس کالم نے خامہ تلاش کی فکر و نظری برنائی، منفرد اسلوب تحریر،
قراغت اور نقد و بحث کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے مذہبی صحافت
کی تاریخ میں مقبولیت اور اثرات کا نیار یکا رکھ قائم کیا۔"

(ماہ نامہ جام نور، سواں شمارہ، ادارہ، مئی، ۸)
"خامہ تلاش" کی بے انتہا مقبولیت کے وجوہات بقول حضرت
سید محمد اشرف قادری مارہروی، یہ تھے:

"(خامہ تلاش کا) گہرا علم، وسیع معلومات، سخن فہمی، عمدہ نثر کا
استعمال، صحت زبان، منطقی طریقہ کار، طنز کا شائستہ انداز،
نظریانہ ذوق، بے باکی (گستاخی نہیں)، احساس توازن،
پاس اعتماد، "خیال خاطر احباب" اور ظرف نگاہ"
(خامہ تلاش، پشت ورق)

ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی کے زاویہ نظر سے خامہ تلاش کی
بڑی خوبی یہ تھی کہ:

"شعر و ادب کے تعلق سے وہ جو بات و ثوق سے کہہ سکتے ہیں
جس کے لیے ان کے پاس ٹھوس دلائل ہیں اکثر اسے بھی وہ
اپنی فہم ناقص کے حوالے کر دیتے ہیں، یوں مخاطب یا مٹھ راہ
کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے، قارئین رسالہ کی معلومات میں
اضافہ بھی ہو جاتا ہے اور بدگمانی بھی راہ نہیں پاتی۔"

(ماہ نامہ جام نور، سواں شمارہ، مئی، ۳۸)
خامہ تلاش کی مذکورہ تمام خوبیوں کے اثرات کو باشعور اہل قلم نے
قبول کیا اور بہت سے اہل قلم ان کے اسلوب نقد کی تقلید کی کوشش کرنے
لگے اور اس طرح علمی دنیا میں ایک صحت مند علمی و فکری انقلاب آیا۔

مولانا خوشتر نورانی جام نور کے اس عہد کو "دور زریں" قرار دیتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کالم کی وجہ سے "اس کے قارئین کی تعداد میں
بے پناہ اضافہ ہوا اور اس کی شہرت ہندو پاک کے وسیع حلقے تک پہنچ

گئی۔" (ماہ نامہ جام نور، سواں شمارہ، ادارہ، مئی، ۸)

علامہ عاصم قادری نے جام نور کے تمام اہم کالمز جیسے ادارہ، پس
منظر و پیش منظر، شخصیات اسلام، تحریری مباحثہ، حالات حاضرہ، تذکار،
رویداد، جہان ادب، اظہار خیالات، حاصل مطالعہ، قلبی واردات، دیوان
ہم، منظومات، آپ نے کہا، گواہی قیمتی تحریروں سے زینت بخشی اور جام
نور کو یہ شرف حاصل رہا کہ علامہ کی تمام تحریروں (دو چار مقالات چھوڑ
کر) اولین طور پر اسی میں شائع ہوئیں۔ اصل میں علامہ عاصم قادری
جام نور کو اپنا رسالہ سمجھتے تھے اور اس سے انہوں جیسی محبت کرتے تھے جو
کہ ان کے تعمیر پسند ذہن کی دلیل تھی، کیونکہ انہیں جام نور سے اس علمی و
فکری انقلاب کی آہٹ محسوس ہو رہی تھی جسے ان کی آنکھیں عملی دنیا میں
بہر جہت انداز میں دیکھنے کی منتظر تھیں اور جس کی طرف وہ انفرادی طور
پر بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے۔

مدیر جام نور سے تعلقات:

یہ بہت ہوتا ہے کہ دو دیرینہ رفیق کچھ دور چل کر رقیب بن جاتے
ہیں اور رقیب بھی ایسے کہ ان کی رقابت کے سامنے عداوت شرمندہ
ہو جائے، لیکن رفاقت میں رقابت کا یہ مرض ان افراد کے مابین حاکم
ہوتا ہے جن کا رشتہ رفاقت خلوص پر مبنی نہ ہو، بلکہ اس کی ترجیحات میں
ذاتی مفادات ہوں۔ ظاہر ہے جو دو متضاد مفادات پر مبنی ہو وہ مفادات
کے غائب ہونے سے خود بھی غائب ہو جائے گی، لیکن اسی دنیا میں ذاتی
مفادات سے پاک خالص و مخلص دوستوں کی ایک ایسی تعداد بھی ہمیشہ
رہی ہے، جن کی دوستی سدا بہار ہوتی ہے، لوگ ان کی دوستی پر رشک
کرتے ہیں اور حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہی دوستیاں کبھی
پرگن بھی دے جاتی ہیں کہ دوستی ہر شے سے بڑھ کر ہے۔ علامہ اسید
الحق قادری سے مدیر جام نور کے تعلقات بھی "خالص و دوستانہ" تھے، اس
دوستانہ تعلق میں درج بالا سے یکسر مختلف ایک خاص قسم کی رقابت بھی
تھی، لیکن یہ رقابت معاصرانہ تھی، رشک کی حد تک تھی، حسد، کینہ اور
نفص جیسی نصیب دشمنان بیاریاں اس میں نہ تھیں۔ یہی وہ رقابت ہے
جو مذموم نہیں، بلکہ محمود کہلاتی ہے اور اسے رقابت نہیں، بلکہ خوشتر
صاحب کے لفظوں میں کمال رفاقت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کی یہ
"خالص دوستی" کیسے اور کب شروع ہوئی اسے مدیر جام نور ہی کے

حسین لب و لہجے میں ملاحظہ کریں:

"۱۹۹۱ء میں میرے دادا محترم (علامہ ارشد نقادری) نے
مجھے اہم علم و فن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین صاحب سے
اکتساب علم کے لیے مدرسہ قادریہ بدایوں بھیجا، اس وقت میری
عمر کوئی پندرہ سولہ برس ہوگی، اس بے ریشی کی عمر میں نہ تو
خانوادہ عثمانی کی علمی جلالت و شوکت کا اندازہ تھا، نہ مدرسہ
قادریہ کی درسگاہی قدامت اور مرکزیت کا علم اور نہ ان دونوں
سے تاریخ کے بے رحمانہ سلوک کا سراغ۔ اس عہد ناواقفیت
میں پہلی بار اس مدرسے ہی میں اپنی ہی عمر کے ایک وجہ اور پر
وقار نوجوان کو دیکھا، دیکھتا رہ گیا۔ چہرے پر بلا کی جاذبیت
نے مجبور کیا کہ اس کا اتنا پتا معلوم کروں، معلوم ہوا کہ یہ حضرت
صاحب سجادہ کے فرزند "اسید الحق" ہیں، جنہیں پیار سے
احباب و اقارب اور مریدین و متوسلین "بھیا" کہتے ہیں.....
ان کی آنکھوں میں تیرتی ذہانت، چہرے پر پُر وقار تکملت اور
پیشانی سے پھوٹی خاندانی مجر و شرافت کی کرن نے دل میں
اسی وقت مجھ سے سرگوشی کی کہ یہ نوجوان آگے چل کر یقیناً
ایک نئی تاریخ رقم کرے گا۔" (خامہ تلاش، مئی، ۸)

خوشتر صاحب کے شخصیت شناس ذہن کا یہ اندازہ سو فی صد درست
ثابت ہوا اور یقیناً ان کے اس بلند نصیب ساتھی نے علمی، فکری، قلمی اور
عملی میدانوں میں ہر جہت سے ایک نئی پیش رفت کی جس کے نتائج
خیز اثرات کسی بھی پیش رفت کے سامنے آتے ہی محسوس کیے گئے اور
اب ایک لمبے عرصے تک جماعت کی زلف پر ہم کو ستوارنے والے تعمیر
پسند افراد کے درمیان محسوس کیے جاتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ اس
بائنصیب نے بارگاہ صدیت سے ایک انوکھی موت حاصل کر کے میدان
اجل میں بھی ایک قابل فخر جہت نصیب کرنے کا شرف حاصل کیا جو یقیناً
لائق صدر رشک ہے۔

مدرسہ قادریہ کے بعد ان دونوں دوستوں کے درمیان تعلیمی
انہماک اور معاصرانہ رقابت میں اول آنے کی کوشش میں ایک وقتی عدم
رہنمائی بھی رہی، لیکن پھر ۲۰۰۳ء میں ماہ نامہ جام نور ہی کے حوالے سے
دونوں دوستوں کے پرانے اور دیرینہ تعلقات استوار ہوئے اور اب

کل وقتی شعری مزاج کا جز وقتی شاعر

مولانا اسید الحق قادری اگر مسلسل شعر کہتے رہتے تو یقیناً اپنے عہد کے بڑے شعرا میں ان کا شمار ہوتا

عربی اور فارسی ادب کا مطالعہ تو کیا ہی تھا لیکن اردو ادب پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ اردو کے کئی کلاسیکی شعرا کا کلام ان کی نوک زبان پر رہتا تھا۔ حالانکہ اسید الحق نئی نسل کے نمائندے تھے لیکن جس علمی اور ادبی سر زمین (ہدایوں) اور خانقاہ (عالیہ قادریہ، ہدایوں) سے ان کا تعلق تھا اس سے بعید از قیاس نہیں کہ انھیں اتنے اشعار کیسے یاد ہو گئے ہوں گے۔ نظامی عروسی سرقندی نے چہار مقالہ میں شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے شاعر ہونے کی جن علامتوں کو گویا ہے اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس وقت تک کسی شخص کو شاعر تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک اس شخص کو ہر موضوع پر پانچ ہزار شعر یاد نہ ہوں آج اس قاعدے کو پوری طرح صحیح اگر اس طرح بھی منطبق کیا جائے کہ ہر شاعر کو کم سے کم پانچ ہزار شعر یاد ہوں تب ہی کسی کو شاعر تسلیم کیا جائے گا تو بہت کم ایسے شعرا ملیں گے جن پر اس اصول کی تطبیق کھری اترے گی، لیکن اسید صاحب کی شخصیت اس عہد میں میرے علم کے مطابق ان دو چار حضرات میں شمار ہوتی ہے جسے پانچ ہزار شعر تو اس کے اریب قریب اشعار تو یاد ہی ہوں گے۔ اس سے ان کی موزوں طبیعت کا علم ہوتا ہے۔ اکثر اوقات وہ شکوہ شکایت بھی شعر یا مصرعوں کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ جس دوران دہلی میں مولانا اسید الحق اور مولانا خوشتر نورانی کی علامہ فضل حق خیر آبادی پر کتابوں کی رسم اجراء میں آئی اس کے بعد ان سے چھ سات مہینے تک میری کوئی گفتگو نہ رہی۔ میں اپنے کاموں میں مصروف تھا وہ اپنے کاموں میں کہ اچانک ایک روز انھوں نے فیس بک پر مجھے متوجہ کیا کہ میں وہی ہوں مومن جتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو میں بہت شرمندہ ہوا اور فوراً ان کا حال احوال طلب کیا۔ اس سے مجھے یاد آتا ہے کہ انھیں موضوع کے مطابق کتنے اشعار یاد تھے۔ بہر کیف! مجھے ان کو شاعر ماننے میں کچھ کلام نہیں لیکن شاعری کوئی تمغہ نہیں ہے جسے عطا کر

مولانا اسید الحق قادری کے متعلق یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انھیں خدا نے شعر کہنے کی صلاحیت بھی عطا کی تھی۔ یہ بات الگ ہے کہ موزوں طبع کے باوجود شعر و شاعری کو انھوں نے کل وقتی مشغلہ نہیں بنایا اور بہت کم شعر کہے، لیکن ان کے جتنے اشعار ہمیں دستیاب ہیں اس سے ان کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اسید الحق صاحب کا جتنا کلام اس وقت میرے سامنے ہے اس میں ایک حمد، چار لغتیں، ایک منقبت اور چھ دیگر نظمیں کا شمار ہوتا ہے۔ شاعری ان کے معمولات زندگی میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اس جالویت کہ باوجود جتنا کلام وہ زینت قمر طاس بنا گئے وہ ایسا انتخاب ہے جو بڑے سے بڑے حمد، نعت اور منقبت نگاروں کے کلیات پر بھاری ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کلام بھی انھوں نے اپنے اس عہد میں کہا تھا جس دوران وہ اکتساب علم کر رہے تھے اور ان کا تعلیمی سفر جاری تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کا سارا دھیان دینی علوم اور اپنے اکابرین کی علمی خدمات کی طرف مبذول ہو گیا۔ پھر اس کام میں ایسے مصروف ہوئے کہ شاعری کی جانب توجہ کرنا ہی چھوڑ دی۔ جن لوگوں نے بھی مولانا اسید الحق قادری سے ملاقات کی ہے وہ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ مولانا اسید الحق مزاجاً ایک قادر الکلام شاعر معلوم ہوتے تھے۔ خود میں نے کئی بار اس بات کا ذکر ان سے کیا تھا کہ آپ کو شعر کہتے رہنا چاہیے کیوں کہ آپ کو اللہ نے شعر کہنے کی جس صلاحیت سے نوازا ہے آپ اس کا حق ادا کر سکیں، اس کے جواب میں وہ اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ کیا فرماتے تھے، اس بات کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں لیکن یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسید الحق قادری ایک ایسی شخصیت کا نام تھا جو کل وقتی شعری مزاج کا جز وقتی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ مولانا اسید الحق کا علمی اور ادبی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے

قابل تقلید موردنی اوصاف یقیناً آج مسند نعینان خانقاہ کے شہزادوں کے لیے عبرت انگیز بھی ہے اور قابل رشک بھی، جس کا ثبوت آپ نے اپنی عالمانہ تحریروں کے ذریعہ جام نور کے صفحات میں فراہم کر دیا ہے۔ اپنے قلم سے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو یہ خراج کی رفاقت و محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقت کا ایک برملا اعتراف ہے۔“

کتاب ”خامہ تلاشی“ کے آغاز میں خوشتر صاحب نے ابتدائی کلمات تحریر کیے ہیں جو ”سرگزشت رقابت“ کے عنوان سے ہیں، جس میں وہ لکھتے ہیں:

”۲۰۰۵ء کے اوائل میں جام نور کے ذریعے نئی نسل کی علمی، فکری اور قلمی رہنمائی کے لیے جب میرے ذہن میں ایک نئے کالم خامہ تلاشی کا پلاٹ تیار ہو رہا تھا تو اس کی انجام دہی کے لیے سب سے مشکل مرحلہ تھا ”شخصیت کا انتخاب“ میں نے سوچا، مذہبی ادب میں نقد و نظر، تلوار کی دھار پر چلنے کا فن ہے، اس کے لیے بصیرت، ظرافت اور گہری نظر کے ساتھ جملہ علوم متداولہ اور زبان و بیان پر درک ہونا چاہیے اور اس دور قحط الرجال میں بظاہر ایسی صفات پر مشتمل شخصیت کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس تعلق سے میں نے بہت غور و فکر کیا، لیکن حیرت ہے کہ جب جب غور کرتا تو گھوم پھر کر ایک ہی شخص ذہن کی اسکرین پر جم جاتا، وہ شخص کوئی اور نہیں اسید الحق تھے۔“

اسی ”سرگزشت رقابت“ میں لکھتے ہیں:

”اب میرے لیے کوئی چارہ نہیں کہ قلم کی امانت اور راست گوئی کا تقاضا ہے کہ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا خاموشی سے اعتراف کر لیا جائے، لیکن ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے لیے علم و فضل کے ساتھ وسیع الخیالی لازمی ہے جو فی الحال مجھ میں مفقود ہے، اس لیے شاید میں ایسا نہ کر سکوں، پھر بھی ان کی محبت مجھ سے یہ کام کروالے تو یہ ان کی کرامت ہوگی۔ ویسے جس کے علم و فن کی دھوم برصغیر ہند و پاک میں مچی ہو اور جس کی خامہ تلاشی کو اہل علم نے فیضی کی بانگ دراء مشفق خوبہ کے خامہ گوش، بقیہ صفحہ 253 پر ملاحظہ کریں

ایسے استوار ہوئے کہ پھر عدم رنگی کو دوبارہ مجال گستاخی نہ ہوئی۔ یہ دیرینہ رفیق جب مصر سے لوٹے تو خوشتر صاحب کی سرتوتوں کی انتہا نہ تھی، جس کا اظہار انہوں نے شمارہ جام نور اکتوبر ۲۰۰۴ء میں کیا۔ تعلقات کے استوار ہوتے ہی دونوں دوستوں نے سیکڑوں جماعتی و ملی اور علمی مسائل میں افکار و خیالات کے تبادلے کیے، ایک دوسرے کی فکری رہنمائی کی، فکری ہم آہنگی تو پہلے ہی سے تھی اور اب دونوں نے اپنی انفرادیت کے ساتھ جماعت کی تعمیر و ترقی اور اس کی عظمت رفتہ کی بحالی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا، جس کے لیے دونوں نے عملی جہتیں متعین کیں اور ہر جگہ دونوں ایک دوسرے کے دست و پاڑو بنے نظر آئے۔ اس ہم خیال و دیگر رفیق کے اچانک چلے جانے سے خوشتر صاحب کو جو تکلیف اور غم لاحق ہوا ہوگا وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، کسی شاعر کے بقول:

جانے کو تو جائے گا جو آیا ہے عدم سے
افسوس تو اس کا ہے وہ پہلے گئے ہم سے

لیکن شاید مولانا اسید الحق اپنی اس ناگہانی شہادت سے خوشتر صاحب کو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دوست میں نے اس پاکیزہ رشتہ رفاقت کو حیات جاوداں بخش دی، جسے اب کسی کی نظر بد نہیں لگ سکتی۔ اب خوشتر صاحب جب تک رہیں گے اس خلد بدامان دوست کی یادوں کی شمع ان کے سینے میں فروزاں رہے گی اور ہزاروں محفلوں خاص طور سے میخانہ جام نور میں گاہے بگاہے چراغاب بھی ہوتے رہیں گے۔

مولانا اسید الحق قادری مدیر جام نور کی نظر میں:

مدیر جام نور مولانا خوشتر نورانی کی نظر میں علامہ اسید الحق عاصم قادری کا کیا مقام و مرتبہ تھا، وہ انہیں صرف اپنا ہم مرتبہ دوست مانتے تھے، باہر جہت سے اپنے سے فزوں تر یا پھر فائق اقران۔ آئیے اس بات کا جائزہ علامہ عاصم قادری کے لیے مولانا خوشتر نورانی کی لکھی تحریروں سے ہی لیتے ہیں۔ جام نور، شمارہ ستمبر ۲۰۰۴ء میں علامہ عاصم قادری سے لیے گئے انٹرویو کے لیے لکھے تعارفی پاکس میں مدیر جام نور نے یوں اعتراف حقیقت کیا ہے:

”ہندو پاک میں خانقاہوں کے علمی و روحانی روایتوں کے دور انحطاط میں موصوف کی بلند پایہ فکر، علمی اٹھان، تحقیقی حراج اور

کے یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں صاحب شاعر ہیں کیوں کہ ان کے پاس شعر کہنے کی سند ہے۔ ہر شاعر اپنے کلام سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس میں شعر کہنے کی کتنی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ وہ کس معیار کے اشعار کہہ سکتا ہے، اس کا کلام اپنے بعد آنے والی نسلوں کو اور خود اس کے معاصرین کو کس حد تک متاثر کرتا ہے۔ اسید الحق قادری کی شاعری پر بھی بہت سے سوال قائم ہوتے ہیں مثلاً وہ شاعر تھے تو کس معیار کے اشعار ان کے وہاں پائے جاتے ہیں؟ ان کے اشعار آفاقی تناظر میں شعر کی تعریف سے کتنے قریب ہیں؟ ان کے کلام میں کس جذبے کی مقدار زیادہ ہے؟ اور کیا انھیں ایسا شاعر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ان کے کلام سے کسی نوع کا ادبی، علمی، فکری، جذباتی اور مشاہداتی استفادہ کیا جاسکے؟ یا انفرادی طور پر ان کے کلام کی اپنی کوئی اہمیت ہے؟ وغیرہ۔

شعر کو کن بنیادوں پر شعر تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ اس پر بہت سے مفکرین اور شعرا نے اپنی آرا درج کی ہیں۔ جن میں اصمعی، ابن رشیق اور ملتن کی آرا میرے نزدیک زیادہ معتبر ہیں۔ اصمعی کہتا ہے:

”شعر وہ ہے جس کی معنی الفاظ سے پہلے ذہن میں آجائیں۔“
ابن رشیق فرماتے ہیں: ”شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں، مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں۔“
اور بقول ملتن:

”شعر وہ ہے، جو سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا اور اصلیت پر مبنی ہو۔ ان تینوں بنیادوں پر کھرا اترنے کے باوجود بھی اگر شعر، شعر نہیں ہے تو اس کے متعلق کسی اور رائے پر غور کیا جائے گا۔ اس بات کی وضاحت یہاں ضروری ہے کہ جن اشعار میں کسی قسم کا عیب یا قسم موجود ہو یہاں ایسے اشعار کی گفتگو نہیں ہو رہی بلکہ جو اشعار اپنی مبادیاتی سطح سے ہر طور کا میاب ہو کر اس صف میں شامل ہو جائیں جس پر علویت کے ساتھ شعر اور غیر شعر ہونے کی بحث ملحوظ ہو۔ یہاں ایسے اشعار کی بات ہو رہی ہے۔ اب اسید صاحب ان شرائط پر کس حد تک کھرے اترتے ہیں اس کا فیصلہ ان کی شاعری کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے۔“
ان کی ایک نظم ”نلہ درؤ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس سے سادہ اسلوب، جوش بیان، اصلیت پسندی، اصمعی کی رائے اور ابن رشیق کے خیال کی

ترجمانی ہوتی ہے۔ اس نظم کا مطلع ہے:

مجھ سے احباب یہ کہتے ہیں قصیدہ لکھو
عید کا دن ہے مسرت کا ترانہ لکھو
اب اشعار ملاحظہ کیجیے:

مگر افسوس میں کس دل سے کروں یار کی بات
کس زباں سے میں کروں زلف طرہ دار کی بات
کس قلم سے لکھوں رعنائی و گلزار کی بات
کیسے لکھوں گل و بلبل لب و رخسار کی بات
مجھ کو آتا ہے فلسطین کے بچوں کا خیال
ان کے سینوں میں اترتے ہوئے نیزوں کا خیال
نوجوان بیٹوں کو روتی ہوئی ماؤں کا خیال
خون سے بھیگی ہوئی ان کی رداؤں کا خیال
غرب اردن کے شہیدوں کا خیال آتا ہے
کبھی غزہ کے یتیموں کا خیال آتا ہے
ان کی مایوس نگاہوں کا خیال آتا ہے
گریہ کرتی ہوئی آنکھوں کا خیال آتا ہے
میرے بغداد پہ چھائے ہیں قضا کے بادل
ظلم کے جور کے وحشت کے جفا کے بادل
فقر و افلاس کے فاقے کے دبا کے بادل
آفت و رنج و مصیبت کے عنا کے بادل
میرے گجرات میں انسانوں کے کتے ہوئے سر
بے کسوں مفلوس مجبوروں کے کتے ہوئے سر
بھوک اور پیاس سے بچوں کے بلکنے کا خیال
خاک اور خون میں لاشوں کے تڑپنے کا خیال
میرے کشمیر سے رونے کی صدا آتی ہے
میرے قندھار سے آواز بکا آتی ہے
میرے کابل میں مکانون سے دھواں اٹھتا ہے
میرے شیشان کی گلیوں میں لبو بہتا ہے
پھر بھی احباب یہ کہتے ہیں قصیدہ لکھوں
عید کا دن ہے کوئی شوخ سا نغمہ لکھوں

ان اشعار کے مطالعے سے خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کس شدید جذبے کو اپنے الفاظ کے ذریعے کامیابی سے بیان کیا ہے۔ ایک عجیب سلسل ہے جو کہیں منقطع نہیں ہوتا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو ان تمام علاقوں میں اور ان تمام بستیوں میں ہونے والے حادثات اپنے گھر میں ہوتے معلوم ہو رہے ہیں۔ ایک گہرا کرب ہے جس میں ڈوب کر وہ ان اشعار تک رسائی حاصل کر رہا ہے۔ اس نظم میں اسید صاحب نے اپنی جودت طبع سے اس بات کا احساس بھی دلایا ہے کہ شاعر کتنا حساس ہوتا ہے۔ نظم کا کردار جو بنیادی طور پر شاعر ہے اس سے اس کے احباب مطالبہ کر رہے ہیں کہ عید کا موقع ہے اسے اس خوشی کے موقع پر کوئی قصیدہ رقم کرنا چاہیے اس میں بھی کئی پہلو پوشیدہ ہیں کہ شاعر یہ پیغام دے رہا ہے کہ قصیدہ جو شاعری کی ایک صنف ہے اس کا کہنا اس دور میں یا اس عہد میں درست نہیں کیوں کہ ہماری قوم پوری دنیا میں جس ظلم و استبداد کا شکار ہو رہی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کچھ عملی کام کریں نہ کہ قصائد اور غزل خوانی میں اپنا وقت ضائع کیا جائے۔
بہر کیف اہم شاعر کے حساس ہونے کی بات کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو احباب شاعر سے قصیدہ رقم کرنے کو کہہ رہے ہیں وہ خود قصیدہ کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے لہذا وہ غیر شاعر ہیں اور شاعر جو اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے وہ شاعر حساس ہے، اسے اپنے لوگوں پر ہونے والے مظالم کا شدت سے احساس ہو رہا ہے اور اپنے دوستوں کو ان کی بے بسی پر شرمندہ کر رہا ہے کہ تم جس دن کو خوشی کا دن سمجھ رہے ہو حقیقتاً وہ غم کا دن ہے کہ ہماری قوم پر ہر طرف سے مصیبت کے بادل چھاتے چلے جا رہے ہیں، جس کا ہم لوگوں کو راتی برابر احساس نہیں۔ یہ وقت اس کا نہیں کہ خوشیاں منائی جائیں یہ تو تدابیر کا وقت ہے، اپنے احتساب کا وقت ہے، جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ آخر ہم اتنے مظالم کا شکار کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے کئی اور پہلو اس نظم میں پوشیدہ ہیں جس کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس ایک نظم پر طویل سے طویل تر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ایک اہم بات اور ہے کہ شاعر کی لفظیات پر غور کیا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اس کو الفاظ کے برتنے کے فن پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ مثلاً زلف طرہ دار، رعنائی، گلزار، گل و بلبل، لب و رخسار، آفت و رنج و مصیبت اور آواز بکا یہ ایسی تراکیب ہیں جو ہماری

کلاسیکی شاعری میں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں اور ہم کئی حوالوں سے ان تراکیب کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ پھر بھی اسید صاحب کے کلام میں یہ مختلف انداز میں نہج توائی بر محل نظر آتی ہیں کہ ایسے الفاظ بھی جن سے نئی شاعری کے خراب ہونے کا خدشہ رہتا ہے اس کے برعکس ان تراکیب کے استعمال سے یہ اشعار بھلے محسوس ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے الفاظ بھی اسے تنوع اور جامعیت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں کہ نظم میں پرنکیشن پیدا ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی شاعر نے احوال شہر کو اسی ترتیب سے باندھا ہے جس ترتیب سے ان شہروں کے غموں کا احساس کسی حساس شخص کو مغموں کر سکتا ہے۔ ہم شعری آہنگ کو نظر میں رکھیں تو شاعر نے جس ترتیب سے شہروں کو بیان کیا ہے اس کی حکمت بھی ہماری سمجھ میں آجائے گی۔ مثلاً فلسطین، اردن، غزہ، بغداد، گجرات، کشمیر، قندھار، کابل اور شیشان یہ ترتیب نظم میں اس طرح استعمال ہوئی ہے کہ شعر کا آہنگ اس سے بتدریج بلند ہوتا جا رہا ہے اور ایسے میں جس قسم کے آہنگ کی ضرورت ہوتی ہے یہ اس آہنگ کو پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ دیگر الفاظ پر نظر کیجئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح شاعر اس اور الفاظ کے اشتراک سے اس نظم میں ایسے کی کیفیت کو بام عروج تک لے جاتا ہے۔ ہر نئے شہر کا نام اس جگہ استعمال میں آیا ہے جس جگہ شاعر کو اس بات کا خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب واقعے کو بدلنے کی ضرورت ہے ورنہ بحث میں تاخیر قائم نہ رہے گی۔ یہ ہی ایک شاعر کی پہچان ہے کہ وہ اپنے کلام کے ذریعے قاری کو باندھنا جانتا ہے۔ اسے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کس حد تک ایک قاری کا ذہن کسی واقعے سے محظوظ و منفعل ہوتا ہے اور کس مقام پہ طبیعت کو تغیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا لیکن وہ مصلحت اتنی تیزی سے عمل میں آتی ہے کہ کسی کو اس کے شعوری ہونے کا احساس ہی نہیں ہو پاتا۔ یہ سب شاعر کی ذہنی کارکردگیوں اور اس کی ذہنی انج کی قوت کا کمال ہے اور اسی سے کسی شاعر کے علمی و ادبی ہونے میں تمیز کیا جاسکتا ہے۔ اسید صاحب کے ذہن پر خیالات کا بہت تیزی سے نزول ہوتا ہے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس آمد کو اسی سلیقے سے ترتیب دینے کے فن سے آشنا ہیں جس تیزی سے وہ خیالات ان پر اترتے ہیں۔

یہ بات صرف ان کی نظموں ہی میں نہیں ہے، بلکہ دیگر اصناف میں بھی وہ اسی قدرت کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ زندگی نے اسید صاحب کا ساتھ بہت جلد چھوڑ دیا ورنہ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز اسید صاحب اس فن کے لیے بھی وقت نکالیں گے اور کئے معوم کئے اشعار وہ روز کہتے ہوں جسے یہاں وہاں لکھ کر چھوڑ گئے ہوں یا صرف ذہن میں ان اشعار کا نقش محفوظ ہو جو صاحب ذہن کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ہم سے دور ہو گیا۔ میں اوپر گنوا چکا ہوں کہ ان کا کتنے کلام مجھ تک پہنچا ہے، لیکن اس قلیل عرصے میں وہ تین اصناف پر طبع آزمائی کر چکے تھے اور ان تینوں اصناف کے ذریعے انھوں نے بامقصد اشعار کا انتخاب ہم تک پہنچایا۔ اسید صاحب کو غزس سے بھی لگاؤ تھا لیکن صرف ایسی غزل جو فی اعتبار سے مکمل ہو۔ انھیں اپنے سے پیشتر شعرا میں احمد فراز کی بعض غزلوں نے متاثر کیا جن میں سے احمد فراز کی ایک مشہور غزل کی ردیف پر انھوں نے چند نعتیہ اشعار کہے اس میں سے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

خرام ناز پہ نبض جہاں ٹھہرتی ہے
فرشتے عرش کے پہلو بدن کے دیکھتے ہیں
وہ بخش دیتے ہیں قدموں پہ گرنے والوں کو
سو ہم بھی قدموں پہ ان کے چل کے دیکھتے ہیں

یہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسید صاحب کو نعت و منقبت سے جو لگاؤ تھا وہ دیگر اصناف سے نہ تھا۔ ایک اور منقبت جو استاد بخضور غوث الثقلین کے عنوان سے انھوں نے کہی، اس میں ایک مقام پر اپنے چار مصرعوں کے ساتھ شاہ حمزہ عینی مارہروی کے مشہور شعر کی جو نظمیں کی وہ اس خیال کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اشعار دیکھئے:

تو بھی گر چاہتا ہے غم کا مداویوں کر
ایک جملے میں علاج غم فردا یوں کر
دل بیمار کو اک آن میں اچھایوں کر
آ در غوث پہ اور عرض تمنا یوں کر
غوث اعظم بمن بے سرو سامان مددے
قبلہ جاں مددے کعبہ ایمان مددے

اسید الحق قادری کا شعری مزاج ان کے آباد اجداد کی شعری سے ملتا جلتا ہے۔ وہ اپنے خاندانی بزرگ شعرا کے شعری اسلوب سے ہم آہنگی

کواپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں جس کا اعتراف انھوں نے اپنی ایک نظم میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں میں کیا ہے۔ یہ بات صرف شعرو شاعری کی حد تک محدود نہیں، بلکہ جملہ اوصاف کو وہ اپنے خاندان سے اخذ کرنا چاہتے ہیں اور عادات و اطوار سے لے کر علوم و فنون تک ہر ایک چیز کے لیے دست بہ دعا ہیں کہ اپنے اکابرین سے کچھ حصہ ان کو بھی نصیب ہو۔ مذکورہ نظم کو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ شاعر کی پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے اس نے شاعر کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ یہاں زندگی کو آراستہ و پیراستہ کرنے کی ہر شے موجود ہے۔ بس ان اوصاف کو اپنے باطن میں روشن کرنے کی ضرورت ہے جس سے ایک با وقار اور پرسکون زندگی حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن یہ ان کی حقیقت پسندی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے اوصاف حمیدہ کو اپنے اندر جتنا بھی پاتے ہیں وہ ناکے برابر ہے۔ انھیں کسی طرح کی خوش فہمی نہیں ہے کہ نسل در نسل وہ اوصاف سب میں منتقل ہوتے چلے گئے ہیں، بلکہ وہ اسے انفرادی ارتقا کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ انھیں اطمینان ہے کہ ان اوصاف سے جس طرح ان کے دیگر اہل خانہ متصف ہیں وہ بھی ایک دن اپنی کوشش سے ان اوصاف کو خود میں روشن کر لیں گے۔ یہ حقیقت پسندی ہی انھیں دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ اس نظم کا پہلا بند دیکھئے جس میں وہ کس امید اور بھروسے کے ساتھ ان چیزوں کو تلاش کر رہے ہیں جو ان کے خون میں شمل ہیں:

میں تیز دھوپ میں سایہ تلاش کرتا ہوں
سیاہ شب میں اجالا تلاش کرتا ہوں
نشن پائے مسیحا تلاش کرتا ہوں
ہلال عید تمنا تلاش کرتا ہوں
میں زندگی کا قرینہ تلاش کرتا ہوں
میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں

دیکھیے کہ شاعر کسی باہری دنیا سے کچھ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کر رہا ہے اور اسے اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ جو عظمت اور جو زندگی کا قرینہ اسے تلاش کرنا ہے وہ اس کا اپنا اثاثہ ہے۔ یہ اظہار ہمیں دھوکے میں ڈال سکتا ہے لیکن یہ کمال شعر ہے کہ ایک ہی مصرع میں شاعر اپنی اس شے کو تلاش کرنے کی اہمیت کر رہا ہے جو خود اس کی اپنی

ہے۔ ظاہر ہے کہ عظمت رفتہ کوئی لکڑی کا کھلونا نہیں ہے نہ ہی کوئی ایسی چیز ہے جسے کوئی چرا سکے۔ وہ تو صرف ایک احساس ہے جو در عمل کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے، جس کا حصول شاعر کو ان اعمال کی طرف ڈھکیں رہا ہے جہاں اسے اپنے مقصد میں کامیابی مل سکتی ہے۔ ایک بات اور غور طلب ہے کہ شاعر کو اس بات کا شکوہ نہیں ہے کہ وہ اپنی بے توجہی کی وجہ سے اس عظمت کو کھو چکا ہے بلکہ اسے یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ یہی وہ عمر ہے جس عمر میں اپنے اجداد کے ورثے کو خود میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس زمانے میں اپنے مشاہدات اور مجاہدات سے اس عظمت کے حصول کی طرف قدم بڑھایا جاسکتا ہے۔ جس میں سخاوت عثمان، حضور غوث اعظم کے فیضان، معین حق کے قلم دان، جناب شیخ کے دامن اور نگاہ مقتدر آقا وغیرہ جیسی بیش قیمتی اشیاء محفوظ ہیں، جو اس بات کی منتظر ہیں کہ ان کا وارث انھیں حاصل کر کے زہن میں اپنی مثال قائم کرے۔ اسید صاحب کی شاعری اتنی جذباتی و معنی خیز ہے کہ اس پر سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اس کم سے کم کلام میں اتنے پہلو پوشیدہ ہیں جو ایک متلاشی کو حیران کر دیں گے۔

اسید صاحب ایسے شاعر نہیں ہیں جن کی شاعری سے صرف محفوظ ہوا جاسکے یا کسی نوع کی ذہنی آسودگی حاصل کی جاسکے بلکہ ان کے اشعار ذہن کو سوتے سے جگاتے ہیں، فکر کی دعوت دیتے ہیں، جھنجھوڑتے ہیں وراپنے مقصد زندگی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ان کے کلام سے ایسے لوگ ہرگز محفوظ نہیں ہو سکتے جو شاعری کو صرف تفریح صبح کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس کے برعکس ان کی شاعری کو ایسے اشخاص اپنی پکوں پر اٹھاتے پھریں گے جو ہر مقصد زندگی گزارنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اشعار کا بغور مطالعہ کیا جائے ان کی زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہوا جائے۔ اس عہد میں انفرادیت کو بہت اہمیت دی جاتی ہے لہذا انفرادی سطح پر اپنے اعمال کا احتساب کرنے والوں اور اجتماعی سطح پر ایک متحرک کی، نند اپنے مزاج کو تشکیل دینے والوں کے نزدیک اس طرح کی شاعری اہم قرار پاتی ہے۔ اپنی ایک چھوٹی سی نظم دوستی کا ہاتھ میں جو پیغام انھوں نے دیا ہے وہ اس بات کا ضامن ہے کہ ایسی شاعری بہت کار آمد ثابت ہو سکتی ہے جو تالیف قلب کا کام انجام دے۔ احمد فراز کے شعر پر ختم ہونے والی اس نظم میں شاعر نے

جس اعلیٰ طرفی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک بڑے ذہن کی علامت ہے۔ یہاں نظم کے اقتباس سے بات سمجھ میں نہیں آئے گی لہذا پوری نظم ملاحظہ فرمائیں:

مرے عزیز مرے دوست میرے ہم سایہ
ہمارے بیچ جدائی کو اک صدی گزری
نہ تم کو مجھ پہ بھروسہ نہ مجھ کو تم پہ یقین
اسی نفق و عداوت میں زندگی گزری
وہ جس کا نقش کتب پا ہمارے سینے میں
اسی کی یاد سے آباد تیرا سینہ ہے
وہ جس کے فیض سے ہم نے بندیں پائیں
اسی کا نام مبارک ترا وظیفہ ہے
ہماری کشت پہ برسا ہے جو صاحب کرم
اسی کے فیض کی بارش تمھارے آنگن میں
وہ جس کی بو سے معطر مشام جاں ہے مرا
اسی گلاب کی رنگت تمھارے گلشن میں
وہ بادہ خانہ جہاں ہم نے مئے گسری کی
شراب تم بھی اسی میکدے کی پیٹتے ہو
اسی نگاہ سے مخمور تم بھی رہتے ہو
جو عندلیب مرے باغ میں چہکتے ہے
اسی کی نغمہ سرائی ترے گلستاں میں
وہ شمع جس سے منور ہے طاق دل میری
اسی کی ضو سے اجالا ترے شبستاں میں
وہ بجلیاں جو مرے آشیاں کو نکلتی ہیں
وہی حریف تمھارے نگار خانے کی
تمھارا گلشن صدر رنگ جس کی زد پر ہے
وہی خزاں ہے عدو میرے آشیانے کی
غرض کہ فرق نہیں کوئی ہم میں بنیادی
نہ فکر میں نہ عقیدے نہ دین و مذہب میں
نہ اختلاف خیالات کا نہ مسلک کا

نہ کوئی فرق ہمارے تمہارے مشرب میں
اگر یہ سچ ہے تو اے محترم حریف مرے
کوئی جواز نہیں ہم میں دشمنی کے لیے
اگر تمہاری انا ہی کا ہے سوال تو پھر
چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لئے

میں اس بات سے آشنا ہوں کہ اسید صاحب نے کس اعلیٰ ظرفی
کا مظاہرہ اس نظم میں کیا ہے لیکن پھر بھی میں اس کے اظہار سے پیغام کو
محدود نہیں کرنا چاہتا۔ یہ نظم ہر اس شخص ہر اس جماعت اور ہر اس ملک
کے لیے سبق آموز ہے جو کسی بھی قسم کی عداوت اور نفاق میں مبتلا رہتا
ہے اور صرف اپنی انا کی بنیاد پر اس لڑائی کو نسل در نسل منتقل کرتا چلا جاتا
ہے۔ یہ آفاقی تناظر اور آسان زبان میں کہی گئی ایک ایسی نظم ہے جس
سے ہر رنگ و نسل کے اذہان مستفید ہو سکتے ہیں۔ ایک بات اور غور
طلب ہے کہ جس شخص کو کسی طرح کا سبق حاصل کرنا ہے یا اپنی زندگی کو
کسی اصول سے مزین کرنا ہے تو اس کے لیے ایک واقعہ ہی کافی ہے اور
جسے کسی طرح کی فصاحت درکار نہیں اس کے لیے چند نصیحت کی تمام کتب
بیکار محض ہیں۔ اسید صاحب کی اس نظم سے جن لوگوں کو سبق حاصل کرنا
ہے وہ کر لیں گے اور جنہیں نہیں کرنا وہ صرف اسے تنقید کا نشانہ بنا کر
آگے بڑھ جائیں گے۔

(۲)

میر نے ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ اس لیے بھی انہیں اردو کا بڑا
شاعر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جن شعرا کے یہاں اس اہتمام کا فقدان ہے۔
ان میں بھی کسی نہ کسی نوع کی عظمت پوشیدہ ہے۔ ایسے شاعر اپنی اسی
صنف کے حوالے سے مشہور ہوئے ہیں جس میں انھوں نے کمال
دکھایا۔ مثلاً انہیں کو دنیا مرچے کے حوالے سے جانتی ہے۔ سودا کو قصائد
کے حوالے سے میر حسن کو مثنوی کے حوالے سے اور امجد حیدر آبادی کو
رباعی کی وجہ سے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان شعرا نے من جملہ نہ سہی دیگر
کچھ اور اصناف میں بھی اشعار کہے ہیں لیکن یہ تمام شعرا کسی ایک صنف
کے حوالے سے زیادہ مقبول ہیں۔ میر نے بھی اپنی غزل کے ذریعے جو
شہرت حاصل کی وہ دوسری اصناف سے انھیں حاصل نہ ہو سکی، لیکن نعت
اور منقبت میں اس قدر کے شعرا بہت کم نظر آتے ہیں۔ نعت کے حوالے

سے اگر حسن کا کوروی کو اردو ادب کی تاریخ سے نکال دیا جائے تو ہمارے
لیے دوسرا نام تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کی کیا وجوہات ہیں اس
سے قطع نظر یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں حسن
کا کوروی کو چھوڑ کر حمد و نعت و منقبت کے حوالے سے بہت شاعری ہوئی
ہے اور بہت اچھی ہوئی ہے، جس کا مطالعہ کرنے کے بعد سمجھ میں آتا
ہے کہ جس طرح عشق کے حقیقی جذبے کی بنا غزل اور قصیدہ نہیں کہا
جاسکتا اسی طرح حمد، نعت اور منقبت بھی نہیں کہی جاسکتی۔ فرق صرف
اتنا ہے کہ ایک طرف عشق مجازی ہے تو دوسری طرف عشق حقیقی۔ جب
ہم غزل میں اس تخصیص کے قائل ہیں کہ مجازی کا اطلاق حقیقی کے معنی پر
بھی کیا جاسکتا ہے تو جو اشعار کہیں اس بوقلمونی سے آراستہ ہیں ان کو اتنی
اہمیت کیوں نہ دی جائے۔ انسان کی ذہنی و دلی وابستگی جس شے سے
ہوتی ہے وہ اسی کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اسید الحق نے جو نعتیہ کلام اپنے
پیچھے چھوڑا ہے وہ کسی طور ایک اچھے غزل گو یا ایک اچھے نظم نگار سے کم
رہتے نہیں۔ یہ ان کے رجحان کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیت کو
ایک مقدس ہستی سے منسلک کیا اور اپنے اشعار میں ان کی مدح سرائی کو
اپنے لیے بہتر جانا۔ صرف اس لیے اگر کسی شاعر کو کھینچا نظر انداز کر دیا
جائے کہ اس نے محدود دائرے میں رہ کر شعر کہے ہیں یا کسی فرد واحد
سے منسلک ہو کر اس فن میں طبع آزمائی کی ہے تو دنیا کی کئی زبانوں میں
ہونے والی شاعری کا ایک بڑا ذخیرہ بے کار ہو جائے گا جو اس انفرادیت
کو ملحوظ رکھ کر کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے۔ ہر محدود نقطہ نظر میں ایک
آفاقیت پوشیدہ ہوتی ہے اور اسید الحق عاصم القادری کی شاعری اسی
آفاقیت کا خزانہ ہے۔ جو ایک محور تک محیط ہے لیکن اس احاطے میں
ایسے مذہبی و ثقافتی اصول پوشیدہ ہیں جو انسانی زندگی میں بہت کارآمد
ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ان اشعار سے
اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسید الحق جیسے اذہان جس سمت اپنی فکر موڑ
دیں وہاں کیا کیا گل کھلا سکتے ہیں:

رسول وہ جو رسولوں کا تاجدار ہوا
وہ جس کا ذکر دوائے دل و فکر ہوا
رسول وہ جسے محبوب کردگار کہیں
رسول وہ جسے قدرت کا شاہکار کہیں

☆☆☆

جب تصور میں بسائیں آنکھیں
ساری دنیا سے اٹھائیں آنکھیں
خاک طیبہ ہے خبر دار قبر
اس کی آنکھوں میں جو ڈالی آنکھیں

☆☆☆

سنا ہے لالہ طیبہ کی تازہ کاری کو
لباس گل سے شکوے نکل کے دیکھتے ہیں
غرام ناز پہ نبض جہاں ٹھہرتی ہے
فرشتے عرش کے پہلو بدل کے دیکھتے ہیں

☆☆☆

تابانی در عدن رخشانی لعل یمن
دندان انور کی ضیاء بھی نہیں وہ بھی نہیں
تاج سرسری کہاں پیشانی زہرہ کہاں
نعلین پاک مصطفیٰ یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

☆☆☆

بصارت کر رہی ہوگی طواف گنبد خضرا
بصیرت کی جبین پر عکس روئے مصطفیٰ ہوگا
بوسری، جامی و قدسی قصائد لکھ رہے ہوں گے
کوئی حسان نعت سرور دیں پڑھ رہا ہوگا

اسید صاحب اس میدان میں جس شاعر سے سب سے زیادہ
متاثر نظر آتے ہیں وہ امام احمد رضا خاں بریلوی کی ذات ہے۔ اس کے
علاوہ ان کی کل شاعری لہجے کے مطابق علامہ اقبال اور جوش سے قریب
نظر آتی ہے۔ اس بات کو میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اسید الحق جس عہد
میں شعر کہ رہے تھے وہ ان کا عہد طالب علمی تھا۔ اس عہد میں زیادہ تر
لوگ انھیں شعرا سے متاثر ہوتے ہیں۔ لہذا اسید صاحب بھی اسی رنگ
میں شعر کہتے نظر آتے ہیں لیکن یہ اشعار تجرباتی نوعیت کے ہیں پھر بھی
ان میں اتنا بلند آہنگ پایا جاتا ہے کہ اگر وہ مسلسل شعر کہتے رہتے تو یقیناً
اپنے عہد کے بڑے شعرا میں ان کا شمار ہوتا۔ اخیر میں اس بات کا اظہار
کرنا بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مولانا اسید الحق جتنے اچھے شاعر تھے

اس سے کہیں زیادہ اچھے انسان تھے۔ اچھا شعر کہنا اتنا مشکل نہیں ہے
جتنا ایک اچھا انسان کہلانا ہے۔ اسید الحق صاحب نے جیسے اشعار کہے
دیے یا اس سے بہتر اشعار کہے جاسکتے ہیں میرا طلسم اس دن ٹوٹے گا
جس دن میں ان سے بہتر انسان دیکھوں گا۔ □□□

☆ فورٹہ فلور، فلیٹ نمبر ۳۶۵، رگبی نمبر ۶، ڈاکٹر، اوکھلا، نئی دہلی

ایک تاثر

(علامہ شیخ اسید الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت پر)

اے شہنشاہ گرامی، مرحبا صد مرحبا
اہل دل، اہل قلم، اہل وفا صد مرحبا
تم غیب وقت تھے، تم قوم کے معمار تھے
تم تھے دریا علم کا، تم صاحب کردار تھے
خود نمائی سے، غرور و تکبر سے دور تھے
خوش روی، سادہ مزاجی کے لیے مشہور تھے
تم نے زندہ کی وطن میں وہ فضا وہ دل کشی
جس نے بخشی قوم کے لرزیدہ ہونٹوں کو ہنسی
زندگی اب کون ڈھونڈھے گا خس و خاشاک میں
کون ڈالے گا تبسم دیدہ غم ناک میں
کوئی شے دین محمد سے سوا پیاری نہ تھی
حق نوا ایسے کہ اپنی جان کی پروا نہ کی
تذکرہ پہنچا تمہارا جب زبان عام تک
حق ہی حق آیا پھر آغاز سے انجام تک
تم وہاں پہنچے جہاں ہیں رحمتیں ہی رحمتیں
ڈھونڈتی پھرتی ہے دنیا جن کے در کی نسبتیں
سبیت کو ناز ہے تم پر تمہارے کام پر
قادریت فخر کرتی ہے تمہارے نام پر

محمد فیروز ظفر بدایونی

فروری ٹولہ، بدایوں (پوٹی)

مولانا اسید الحق قادری کی مکتوب نگاری

تلاشی“ پر آئے تو کیا چھوٹا کیا ہوا، کیا کم عمر کیا، ضعیف العرب پر تنقیدیں کیں اور خصوصیات بھی بیان کیں۔ اب جن لوگوں کو ان کی تنقید ہضم نہیں ہو سکی یا ان کی خوش فہمی کے برخلاف ان پر تنقید کی گئی تو انہوں نے خامہ تلاشی کے ”خ“ کے نقطے کو نیچے کر کے ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کے سینکڑوں تحقیقی مضامین شائع ہوئے، جنہیں عام طور پر پسند کیا گیا اور ”خیر آبادیات“ لکھ کر تو انہوں نے خود کو ذمہ دار اور سنجیدہ محققین کی فہرست میں ڈال دیا۔

تفسیر، حدیث، تحقیق، تنقید کے ساتھ ساتھ انہوں نے خطوط نگاری کے تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے۔ جہاں تکلفات و تصنیفات کا شاہد تک نظر نہیں آتا۔ عام سی تحریر، طنز و مزاح، مجلسی انداز گفتگو، سادہ و پرکار، حسین و رنگین نثر کا نمونہ اور محفلوں کو لالہ زار کر دینے والے خطوط لکھے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرنے والوں کو بعض خطوط پڑھ کر یقین نہیں آئے گا کہ شیخ اتنے خوش طبیعت اور منہاج مریخ فطرت کے مالک تھے۔

ہندوستان کے جس ماحول میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی وہاں آج بھی فتویٰ نویسی کی زبان عام ہے۔ لیکن انہوں نے خود کو رائج عیوب سے محفوظ رکھتے ہوئے معروضی اور سحر انگیز اسلوب کو اختیار کیا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تاثر نہیں ہے کہ انہوں نے خود کو کنوئیں کا مینڈک بھی نہیں بنایا۔ ”خدا مضافاً و دعاً ماکدر“ کے تحت انہوں نے تمام تر مسلکی و فکری اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ادب برائے زندگی، ادب برائے ادب اور اسلامی ادب کے دعویداروں کو بھی خوب پڑھا بلکہ جام پر جام لٹھائے اور دوسروں کے بند اور مقید اذہان کو کشادہ کرنے کی بھی خوش کن کوششیں کیں۔

اب تک ان کے جو خطوط یکجا ہو سکے ہیں ان میں خطوط نویسی کی

ممتاز نفاذ و محقق حضرت مولانا شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری عثمانی (۱۹۷۵ء-۲۰۱۲ء) کا تعارف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ علم و عمل، فہم و شعور، درک و ادراک، طریقہ تزکیہ و تصفیہ، قلوب، بصارت و بصیرت کا خزانہ نسلاناً بعد نسل سبز بہ سبز پہنچ کر ان کے سینے کو گنجینہ علوم و فنون بنادیا تھا اور اس پر مترادان کا اکتساب تھا اور جب دونوں کا ملن ہوا تو ان کا نشہ دوا آتھ ہو گیا۔

تحقیق، تنقید، ادب، حدیث، فقہ، تفسیر ہر ایک فن پر انہوں نے اپنا ہاتھ آزمایا اور ایسا آزمایا کہ زمانے نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشیں جگہ ظاہر ہیں اور عام طور پر ان کی ان اعلیٰ صلاحیتوں سے لوگ واقف ہیں۔ انہوں نے جام نور میں مکمل ایک دہائی تک لکھا اور نہ صرف یہ کہ لکھا بلکہ نئی نسل کو لکھنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ ان کے مضامین، ان کی کتب، ان کی جرح و تعدیل اور تخریج، ان کی تحقیق و تنقید سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ عام طور پر وہ ان تحریروں میں طنز و مزاح کا سہرا نہیں لپٹتے تھے۔ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ لکھتے اور پڑھنے والا ان کے مضامین کو پڑھ کر ان کی تنقیدی و تحقیقی جانفشانیوں پر سردھتا، لیکن اب تک ان کے خطوط پڑھنے خفا میں تھے اور ان خطوط سے وہی لوگ واقف تھے، جن کے نام وہ لکھے گئے تھے۔ شیخ ۱۹۹۹ء میں حصول تعلیم کے لیے مصر گئے، یہ وہی زمانہ تھا جب مکتوب نگاری آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میرے خیال میں ۲۰۰۵ء تک خطوط لکھے گئے اس کے بعد موبائل نے مکتوب نگاری کی ضرورت ختم کر دی۔

شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے، اسے پوری دلچسپی کے ساتھ کرتے بصورت دیگر بہت خوبصورت انداز میں معذرت کر لیتے اور جس فن پر کام کرتے اس کے تقاضوں کو پورا کرتے۔ شاید یہی وجہ رہی کہ ”خامہ

حوالہ قادری:

شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری بہت مشہور علمی و فکری نسا عثمانی اور طریقہ قادری بدایونی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے خاندان میں ہندوستان کے سب سے بڑے اور معروف قادری مرکز خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مظہرہ سے سلسلہ قادریہ پہنچا تھا۔ انہیں اپنے والد ماجد تاجدار اہل سنت، سرپا شفقت و محبت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری مدظلہ العالی سے بیعت و ارادت اور اجازت و خلافت حاصل تھی، گویا وہ پورے کے پورے قادری تھے مگر نام نہاد قادریوں کی طرح ہشتی گستاخ نہیں تھے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں اور اپنے بزرگوں کے دشمنوں کے بھی گستاخ نہیں تھے۔ قادری شرافت و نجابت اور رعب و اب ان کے وجود سے جھلکتی تھی۔ سلسلہ قادریہ کے سرخیل و رہنما اور بانی حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آتے ہی ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا، اس وقت علامہ وقت شیخ اسید الحق کہیں گم ہو جاتا اور باقی جو رہتا وہ صرف اور صرف صوفی اسید الحق ہوتا۔ غنیۃ الطالبین کا سچا پکا عاشق اور طالب علم ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تمام خطوط میں سب سے پہلے بسم اللہ کی جگہ حوالہ قادری لکھتے ہیں۔ القادر اللہ کے صفاتی ناموں میں سے ہے اور اسی القادر کے ساتھ عبد منسلک ہو کر عبدالقادر بنتا ہے، جو شیخ عبدالقادر جیلانی کا نام ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی وہ اپنے خطوط میں رب مقتدر، رب قادر کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ تاج الفحول علامہ شاہ عبدالقادر بدایونی اور علامہ عبدالقادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہما آپ کے خاندانی بزرگ تھے۔ یہ تصوف کا ارفع ترین مقام ہے کہ اپنے شیوخ کے ذریعے اوپر کی جانب سفر کیا جائے۔ شاید کہیں نہ کہیں یہاں بھی نسبت کی تلاش و جستجو میں موجود نظر آتی ہے۔

اسلام و تصوف:

عام طور پر ہر مدرسہ قادریہ بدایونی کے طلبہ خط کے ذریعہ شیخ سے مشورے کیا کرتے تھے، جس کا جواب وہ مصر سے ضرور دیا کرتے تھے۔ لہذا طلبہ کے اکثر خطوط میں اسلام اور تصوف کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ صراط مستقیم پر چلنے اور اسلامی طریقوں کی تعلیم وہ اپنے خطوط کے ذریعے طلبہ کو دیا کرتے تھے۔ چون کہ وہ ہندوستان سے فضیلت کر کے مصر گئے تھے اور وہاں جا کر ان کے مطالعے میں اضافہ اور توازن و اعتدال پیدا

تمام تر ارفع و اعلیٰ قدریں موجود ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، مرزا اسد اللہ خاں غائب، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید حسن خاں اور رشید احمد صدیقی کی ارواح ایک جسم میں حلول کر گئی ہیں اور اس جسم کا ایک جز وہاں تھا جب خط لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو وہ مجموعہ شریعت و طریقت اور ادب و شعر ہو جاتا ہے۔ ان خطوط میں کہیں تفسیر و حدیث اور تصوف کی بحثیں ہیں تو جا بجا بعرمل اشعار بھی بکھرے پڑے ہیں اور کہیں مرزا غالب کا مزاح اور ان کی مجلسی گفتگو نظر آتی ہے تو کہیں آزاد کی طرح عربی و فارسی اشعار اور فارسی تراکیب ذہن و دل کو مسح کر دیتے ہیں۔ ان خطوط میں رشید احمد صدیقی کا سامراجیہ و طنزیہ اسلوب بھی در آیا ہے اور رشید حسن خاں کے محققانہ اسلوب کی جھلک بھی یہاں موجود ہے۔

مذہبی حلقوں میں آج بھی لمبے لمبے القابات کا استعمال عام ہے۔ بڑوں کو جب لکھا جاتا ہے تو آسمان و زمین کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس شیخ اسید الحق قادری اپنے خطوط بہت ہی عام طریقے پر شروع کرتے ہیں۔ بڑوں کو کمری و محترمی اور چھوٹوں کو بھائی تویر، بھائی فلاں جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ البتہ بھائی تویر یا کسی اور بھائی کو یاد کرنے کے بعد وہ بابرک اللہ لکھ و فیکم و فیکم لکھتا ہے اور لکھنا نہیں بھولتے۔ اس کے بعد اسلامی طریقے پر سلام لکھتے ہیں اور سلام کے بعد ایک بہت ہی پر معنی اور خدا کی نعمتوں کا ذکر کرنے والا جملہ رقم کرتے ہیں، جس سے احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والے خدا کی رحمتوں اور نعمتوں کے اظہار میں رطب اللسان ہیں اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ایسا بھی ہے، جسے وہ بیان نہ کر کے خدا پر چھوڑ رہے ہیں وہ جملہ یہ ہے ”ہر حال میں خدا کا شکر ہے“۔

ان کے زیادہ تر خطوط وہ ہیں، جنہیں انہوں نے مصر کے دوران قیام لکھا ہے۔ عام طور پر طالب علم ہاشل میں جب قیام پذیر ہوتے ہیں تو انہیں اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنے محلہ، اپنے شہر کی یادیں بہت متنی ہیں، حالانکہ فراغت کے بعد سالوں سال اپنے شہر کی یاد نہیں آتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ”ہر حال میں خدا کا شکر ہے“ اس جملے میں جبر و فراق کی کسک ہے اور کئی جگہ انہوں نے اپنے خطوط میں اپنوں اور اپنے شہر کی یادوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

ہوا تھا، جس کا اظہار خطوط کی ہر سطر سے ہوتا ہے، یہ بھی ایک بڑی بات تھی کہ مدرسہ قادریہ، بدایوں کے طلبہ مصر میں موجود شیخ سے مشورے کیا کرتے تھے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ اس وقت بھی درجہ عالیہ کے طلبہ کو ان کے علمی و فکری تفوق و برتری اور حسن اخلاق کا بھی احساس تھا۔

مطالعے کی ترغیب:

شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری کے خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں دور طالب علمی سے ہی مطالعے کی سخت ترین عادت تھی، وہ خود بہت زیادہ پڑھتے تھے اور مشاہدین بتاتے ہیں کہ مصر میں ان کی قیام گاہ میں بھی کافی قیمتی کتابیں موجود تھیں، جن سے ان کے احباب بھی استفادہ کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خطوط میں بھی مطالعے پر جابجا زور دیتے ہیں اور ایک ایک موضوع پر کئی کئی کتابوں کا نام درج کرتے ہیں۔ مجھے بھی ان سے اس سلسلے میں کافی استفادہ کا موقع ملا ہے۔ اگر میں کبھی فون کرتا اور کسی موضوع پر کتاب دریافت کرتا تو ایک موضوع پر ایک وقت کئی کتابوں کا نام دیتے اور جب میں کسی کتاب کے بارے میں کہتا کہ یہ کتاب دہلی میں نہیں مل رہی ہے تو وہ کہتے میرے پاس موجود ہے، دیکھتا ہوں آپ تک یہ کتاب کس طرح پہنچ سکتی ہے۔ اگر کسی نادرونیاب کتاب کی اشاعت عالم عرب سے ہوتی اور اس کی سافٹ فائل ان کے پاس موجود ہوتی یا اس کا لنک انہیں معلوم ہوتا تو وہ فوری اس کا حوالہ دیتے اور کئی بار وہ خود لنک یا سافٹ فائل بھیج دیتے۔ کتاب الشفاء کے حوالے سے ان کے خط کا اقتباس دیکھیں:

”یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ تم نے کتاب الشفاء کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف حضرت امام قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ اپنی صدی کے مجدد تھے اور علم و فضل و ورع و تقویٰ کے علاوہ عشق و رسالت مآب کے اعلیٰ مراتب پر فائز تھے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوب کر انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ بعض صاحب دل اور اہل کشف بزرگوں نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مقبول ہے، بلکہ بعض خوش نصیبوں کو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اس کے مطالعے کی ترغیب دی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے اولیا، علما اور عرفا اس کو حرز جاں

بنائے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے علما نے اس کے درس اور اس کی شرح کو اپنی سعادت سمجھا۔ اس کی متعدد شروحات میں علامہ خفاجی کی ”نسیم الریاض“ شرح شفاء قاضی عیاض اور سلطان بن علی قاری کی ”شرح شفاء“ بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ حافظ الحدیث امام جلال الدین سیوطی نے ایک مستقل کتاب لکھ کر کتاب الشفاء کی احادیث کی صحت و خیریت پر محققانہ اور محدثانہ بحث کی ہے۔ شہزادہ غوث اعظم حضرت سید مرعلی شاہ صاحب گولڑی کے حالات میں میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ سفر و حضر میں دو کتابیں ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے ایک تو یہی کتاب الشفاء اور دوسری علامہ شطونی کی بجزہ الاسرار شریف (یہ کتاب سرکار غوث پاک رومیؒ کے فدا کے حالات طیبات میں ہے) ہرے اکابرین کو بھی اس کتاب سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ چنانچہ حضور سیف اللہ المسلمول نے اپنی معرکہ آرا کتاب ”المختصر الممتد“ میں جابجا اس کا حوالہ دیا ہے اور قاضی عیاض کا نام محبت اور احترام سے لکھا ہے۔

کتاب الشفاء کے مطالعے سے سب سے پہلا اثر جو قاری کے دل پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ محبت و تعظیم اور جذبہ ادب و احترام میں بڑھتی آ جاتی ہے۔“

غیر حضانہ مدینہ:

شیخ اسید الحق قادری از ہری وسیع القلب اور وسیع الذہن شخصیت کے مالک تھے۔ دیگر مذاہب و مسلک کی کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے مطالعے کے معاملے میں کبھی بھی مسلک کو درمیان میں آنے نہیں دیا۔ شاید یہی وجہ رہی کہ محققانہ مزاج رکھنے کے باوجود ان کی تحریریں قارئین کو کبھی خشک محسوس نہیں ہوئیں۔ منفرد اسلوب، نہیں جہاں ملا، انہوں نے مطالعہ کیا اور اپنے مسلک کے تحقیقات کے باوجود کتابوں اور اسالیب کو سمجھا اور اپنے متعلقین کو بھی سمجھایا۔

حالاں کہ آج بھی سنی مدارس میں رواج عام ہے کہ وہ دیگر مذاہب و مسلک کے مصنفین کی کتابوں کو شجر منوہ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس انہوں نے خود بھی دوسروں کو پڑھا اور تعلیمی استفادے کے لیے پڑھنے کا مشورہ بھی دیا، شاید اس کے پس پشت جامع ازہر، مصر کا علمی

تحقیقی ماحول رہا ہو، جسے انہوں نے اپنی زندگی کے لیے حرز جاں بنایا تھا۔ انہوں نے اپنے کئی خطوط میں مدرسہ قادریہ، بدایوں کے طلبہ کو بھی اس کی ترغیب دی مگر ایسے لوگوں کی تمام باتوں کو من و عن قبول کرنے سے اجتناب کرنے کی تنبیہ بھی کی۔

دراصل وہ عقائد کے حوالے سے اپنے متعلقین کو اتنا پختہ دیکھتا ہے کہ کسی بھی مصنف کی کتاب کے مطالعے کے باوجود ان کے اپنے نظریات اور مسلکی رجحانات میں تزلزل نہ آنے پائے، جس کی جتنی جاگتی مثال خود ان کی ذات گرامی تھی۔

مالی مہربانے پر نظر:

شیخ اسید الحق قادری کو جتنا پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا اسی قدر بیروسیاحت اور لائبریریوں کا چکر لگانے کا بھی شوق تھا۔ وہ ہندوستان میں ہوں، مصر میں ہوں، پاکستان میں ہوں، یا کہیں اور ہوں یا اپنے آخری سفر بغداد پر ہوں۔ ہر جگہ وہ لائبریریوں کی تلاش کر لیا کرتے تھے اور اپنے زیادہ تر اوقات ر بیریوں میں صرف کرتے تھے۔ ہندوستان کے کئی شہروں کا سفر تو وہ صرف لائبریریوں سے استفادے کے لیے کیا کرتے تھے۔ اس دوران انہیں تلخ تجربات و مشاہدات بھی پیش آتے تھے، جس پر انہوں نے اپنے کئی خطوط میں رد عمل بھی پیش کیا ہے۔ شیخ کا کوئی ایسا خط نہیں ہے جسے انہوں نے کسی کو تصور میں رکھ کر لکھ دیا ہو اور اس کے نام روانہ نہ کیا ہو، اپنے سفر عمان کے سلسلے میں ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے، جس میں مزاح کا پہلو بھی پیدا کر دیا ہے جسے پڑھ کر مالی فکر پر ایک عام انسان کو حیرت بھی ہوتی ہے اور ان کا جملہ فوری سے ہنسنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے:

”قاری کی ایک مشہور مثل ہے کہ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، کچھ یہی حال میرے سفر عمان کا بھی ہوا۔ ایک سال سے اس سفر کے خواب دیکھ رہا تھا، مگر سارے خوابوں پر پانی پھر گیا۔ اللہ کے بندوں نے ویزہ ہی نہیں دیا۔ دراصل فلسطین کے پڑوس میں ہونے کی وجہ سے عمان بھی بہت حساس ہے۔ اس لیے ویزہ وغیرہ میں یہ بہت محتاط ہیں اور پھر اللہ کے کرم سے ہمارے روئے زیا پر ایک عدد ریش مبارک بھی جلوہ گر ہے۔ داڑھی کو طالبان کے ملاؤں نے ایسا بدنام کر دیا ہے کہ لوگ

ہمیں دیکھ کر فوراً یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم بھی طالبانی قسم کے کوئی مجاہد ہیں اور عمان کے راستہ اسرائیل جانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں جا کر آنکھ پھیلانیں۔

ناطقہ سر بگربیاں ہے اسے کیا کہیے“

شعور مقصد کے ادراک پر زور

ہر ہاشعور شخص کو موجودہ دنیا کے مسلمانوں کے ذوال و انحطاط کی داستانوں پر رونا آتا ہے۔ البتہ ان میں کچھ اس احساس کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور کچھ ذوال و انحطاط کے اسباب پر گہرائی کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ غور و فکر کرنے والے بھی بعض دفعہ جذباتی ہو کر کچھ ایسا کرتے ہیں، جو خود ہی مزید ذوال کا سبب بن جاتا ہے اور بعض بڑے عقل اور صبر کے ساتھ ذوال کے اسباب کی تلاش کے بعد اس کے تدارک اور علاج کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ ان میں کم عمری کے باوصف شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری بھی ہیں، جنہوں نے ذوال کے ادراک کے بعد اپنی سطح تک اس کے تدارک و علاج میں لگ گئے اور تاحیات اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اللہ فی اللہ لگے رہے۔ عام طور پر بڑی بڑی اسلامی نام کی تحریکیں حصول مقصد کی راہ پر گامزن ہو کر یہ بھول گئیں کہ حصول مقصد سے پہلے بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے جس کا حصول، حصول مقصد سے پہلے ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے شیخ حصول مقصد سے پہلے شعور مقصد کی بیداری کے لیے تحریک چلانا چاہتے ہیں اور وہ تاکید کرتے ہیں کہ پہلے شعور مقصد کی بیداری کی طرف توجہ مرکوز کی جائے۔ ان بڑی بڑی اور حساس باتوں کو انہوں نے بڑی آسانی کے ساتھ مجلسی انداز گفتگو میں کہی ہیں، جن سے صرف ان کا مخاطب ہی مستفید نہیں ہوگا بلکہ اس زمانے کے تمام مسلمانوں کے لیے وہ باتیں از حد ضروری ہیں۔

”کسی بھی مقصد کے حصول سے پہلے ایک مرحلہ ہوتا ہے جسے ہم شعور مقصد کا مرحلہ کہتے ہیں، مقصد کا حصول بہت حد تک اس کے شعور پر منحصر ہوتا ہے، جسے ہم شعور مقصد کا مرحلہ کہتے ہیں۔ مقصد کا حصول بہت حد تک اس کے شعور پر منحصر ہوتا ہے، اگر مقصد کا صحیح شعور نہ ہو تو حصول مقصد کی سعی اور تنگ و دو کرنا قوت کا ضیاع اور سعی لا حاصل کی صورت میں سامنے

آتا ہے۔“

اس زمانے کی کسی خانقاہ کا شہزادہ اپنے دور طالب علمی میں اگر اس طرح کی فلسفیانہ باتیں کر رہا ہو تو اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی پرواز کیا ہوگی۔

خود پسندی سے اجتناب اور خود شناسی کا احترام:

جس زمانے میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس میں عام طور پر خانقاہیں، سجادہ نشینان اور شہزادگان والا شان توئی لٹی کے باوجود عملی خود پسندی میں گرفتار ہیں، شاید اسی لیے ایک خانقاہ کے تعققات دوسری خانقاہ سے بہتر اور خوش گوار نہیں ہیں۔ حالانکہ صوفیائے متقدمین عام طور پر اس مہلک مرض، یعنی خود پسندی سے دور و نفور رہنے کی ہدایتیں دیتے رہتے ہیں اور خود بھی خود پسندی سے اجتناب کر کے عملی ثبوت پیش کیا ہے جب کہ اس وقت منظر نامہ پوری طرح اس کے برعکس نظر آتا ہے اور جب شیوخ کرام ہی خود پسندی سے محفوظ نہیں ہیں تو شہزادگان اور مریدین سے تو اس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی دیگر گوں صورت حال میں رسم تصوف تو باقی ہے البتہ روح تصوف کو ہم دفن کر چکے ہیں۔ عام طور پر خود پسندی سے دور رہنے کی تلقین کرنا تو دور کی بات ہے۔ بے شمار شیوخ کرام کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خود شناسی نام کی کوئی چیز بھی ہے۔ یہاں ایک اقتباس دیکھیں، جو کتاب التصوف، رسالہ قشیر، عنینہ الطاہرین کی عبارت نہیں، حضرت مولانا اسید الحق قادری کے خط کا ایک اقتباس ہے:

”اگر صوفیائے کرام کی تعلیمات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے سفر کی پہلی منزل نفس کشی ہوتی ہے۔ نفس کشی کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس میں انا کو مارنا، خود پسندی، خود پرستی، خود نمائی کے جن کو دفن کرنا وغیرہ سب شامل ہیں۔ خود پسندی خود فریبی کی طرف لے جاتی ہے اور خود فریبی ہلاکت کی طرف۔“

صوفیہ فرماتے ہیں کہ حصول مقصد کے لیے خود شناسی (جس کو ہم شعور مقصد سے تعبیر کرتے ہیں) جتنی ضروری ہے خود پسندی اتنی ہی مضر، صوفیہ کے نظریہ نفس کشی کی جتنی ضرورت ہمیں آج ہے اتنی شاید ماضی میں بھی نہیں تھی، جب تک انا نہایت

خود غرضی، خود پسندی اور خود نمائی کے جن کو توڑا نہیں جائے گا۔ حصول مقصد کی خواہش ایک مثبت فکر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھے گی۔“

خلوص ولہیت کی دعوت اور مشن کی کامیابی کی فکر:

مولانا شیخ اسید الحق قادری اپنے دیگر معاصرین اور ساتھیوں سے بہت مختلف ممتاز اور منفرد فکر کے مالک تھے۔ ان کا سنہرانا ماضی انہیں مسلسل آواز دے رہا تھا۔ وہ اپنی خانقاہ کے بکھرے ہوئے کاموں اور نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت، گم شدہ کز یوں کے تسلسل اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے کوشاں تھے اور بہت حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب بھی تھے۔ لوگ جس قدر انہیں فارغ اہل سمجھتے تھے، وہ اس سے زیادہ فکر مند رہتے تھے۔ قوم و ملت اور خانقاہوں کے اتحاد کے لیے دین کی دعوت و اشاعت کے لیے، خانقاہوں کے عملی رویوں کی کامیابی کے لیے وہ پورے خلوص اور لہیت کے ساتھ کام کرتے تھے اور اپنے متعلقین کو بھی خلوص ولہیت کی برملا دعوت دیتے تھے، جس کا ذکر کئی خطوط میں بھی ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دور طالب علمی میں اس طرح کی باتیں اور عزائم وہ اپنے بزرگوں اور والد ماجد سے تو نہیں کرتے ہوں گے البتہ دوستوں اور مدد رس قادر یہ کے طلبہ سے ضرور کرتے تھے تاکہ وہ اپنی طرح دیگر قلوب و اذان کو بھی خلوص ولہیت اور نیک نیتی کی ترغیب دے سکیں۔ اس کے ساتھ ان کے دل و دماغ میں مستقبل کے بے شمار اور خوش گوار عزائم اور خطوط بھی تھے، جن پر چل کر یقیناً انہیں کامیابی مل رہی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ہمیں مستقبل میں ان شاء اللہ بہت کچھ کرنا ہے اور موجودہ ڈھرے سے ہٹ کر کرنا ہے اس کے لیے ابھی سے ذہن بنانا ہے اور راہیں ہموار کرنا ہے۔“

اسی طرح وہ خلوص ولہیت سے عاری کسی کام کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ خلوص ولہیت سے عاری کام کو نہ کرنا پسند کرتے تھے:

”اگر ان سارے عملی کاموں اور مطالعے وغیرہ کی غرض دنیاوی شہرت و ناموری ہو اور یہ آرزو ہو کہ لوگ ہمیں بھی محقق وغیرہ سمجھیں تو پھر خدا کے واسطے یہ کاوشیں پہلی فرصت میں ترک کر دو۔ اگر یہ ذہنیت پیدا ہوگئی (یا اگر ہے تو ختم نہ کی گئی) تو یہ

سمجھ لو کہ ہمارا مشن شروع ہونے سے پہلے ہی ناکام ہو گیا۔ اسلام کے ایک سچے خادم کی ذہنیت اور Tendency ہونا چاہیے۔“

شیخ کے خطوط میں جا بجا مستحکم عزائم و ارادے اور مشن کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی جگہ عظمت رفتہ کی بازیافت کی باتیں بھی کی گئی ہیں۔ نثر میں تو اس طرح کے تذکرے ہیں ہی۔ ان کے ایک خط میں انہی کا ایک شعر بھی موجود ہے، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کی تلاش میں کس قدر سرگرداں تھے:

اب ایک پل کی بھی فرصت نہیں ہے عاقبت کو
وہ اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہے

اشعار کا بر محل استعمال:

ان کے ہر خط میں ایک آدھ شعر ضرور درج ہوتا ہے۔ وہ بذات خود بہت اچھے شاعر تھے۔ اس کے علاوہ شاعری کے عظیم سرمایہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی گفتگو میں بھی اشعار کا استعمال کرتے تھے اور خطوط میں بھی۔ کبھی خط کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ وہ خود گفتگو کر رہے ہیں اور یہی وہ نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ ان کے خطوط میں بے شمار ایسے مقامات ہیں، جہاں انہوں نے بر محل اشعار درج کیے ہیں۔ وہ چون کہ عربی داں، فارسی داں اور اردو داں بھی تھے، تینوں زبانوں پر انہیں یکساں انہیں قدرت حاصل تھی۔ اس لیے عربی، فارسی و سب سے زیادہ اردو کے اشعار استعمال ہوئے ہیں۔ اشعار کا ان کے پاس ایسا انتخاب تھا، جسے سن کر کوئی بھی دل خوش گوار مسرتوں سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

اپنی شاعری کا ذکر:

خطوط میں انہوں نے جا بجا اپنی شاعری کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کی دلی ایسی پر کیف نظمیں ہیں، جنہیں پڑھ کر قاری سردھتا ہے لیکن آرزو اپنے خطوط میں اپنے شعر ہونے کی نفی کرتے ہیں اور خود ہی کہیں کہیں اپنے اشعار بھی درج کر دیتے ہیں۔ ان خطوط کے مطابق مقامات کے زمانے میں وہ خوب شاعری کرتے تھے اور کئی خطوط میں ان اشعار بھی رقم ہیں۔ بدایوں کے شعر انہیں منظوم خطوط لکھا کرتے

تھے اور وہ اس کا منظوم جواب بھی مہیا کر دیتے تھے۔ خاص طور پر منظوم خط کا حوالہ بھی بدایوں کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مزاح اپنی شاعری کے تعلق سے کہتے تھے:

”میری شاعری کچھ ”دھوبیانہ“ قسم کی ہے، یعنی جس طرح دھوبی کہنے سے کبھی گدھے پر نہیں بیٹھتا اسی طرح مجھ سے بھی کسی کی فرمائش پر آج تک ایک شعر نہیں ہوا۔ ویسے مجھ سے سہرے کی فرمائش یوں بھی خطرے سے خالی نہیں ہے کہ کہیں ذہنی رو بہک جائے اور میں سہرے میں مرثیہ لکھ ڈالوں۔“

لیکن اس اقتباس کو پڑھ کر یہ فیصلہ قطعی طور پر نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ شاعری پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ عام طور پر کسی کی فرمائش پر کچھ بھی لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ کسی کی فرمائش پر بہت اچھا نہیں لکھا جاسکتا۔ لکھنا وہ چاہیے جس کی طرف اپنی طبیعت مائل ہو۔ انہوں نے کافی اچھی نظمیں لکھی ہیں، تفسیر کی ہے، منظوم خطوط لکھے ہیں۔ ان کی شاعری یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ شاعری پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ بدایوں، بریلی تازے کے خاتمے کی کوشش کے طور پر لکھی گئی ان کی نظم کس جذبہ دروں اور جذبات و احساسات قلبی کے ساتھ لکھی گئی ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جسے اس تنازعے کے بارے میں کچھ معلوم ہو اور اس نے وہ نظم پڑھ رکھی ہو۔

طرح و مزاح:

شیخ کی ذات اہم جہت اور اہم گیر تھی۔ انہوں نے جس طرح تفسیر وحدیث، فقہ و فتاویٰ، تاریخ و تدوین، تحقیق و تنقید کے میدان میں گھوڑے دوڑائے۔ اسی طرح طنز و مزاح میں بھی ان کا جواب نہیں ہے۔ منطق و فلسفہ اور فقہ پڑھ کر انہوں نے خود کو خشک محض نہیں بنایا۔ ادب کا بھی گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور طبیعت میں شوخی و مزاح بھی پایا تھا۔ لیکن وہ ہر چیز کے اصل مقام سے بخوبی واقف تھے۔ طبیعت میں شادابی ہوتی ہے، تو ایک خط میں کئی ایسے مقام آتے ہیں، جہاں نہ چاہتے ہوئے بھی قاری کو ہنسا پڑتا ہے۔ ورنہ تو ہر خط میں چند جملے ایسے ضرور ہوتے ہیں، جنہیں پڑھ کر قاری کے دل کی کلیاں کھل اٹھیں۔ مزاح کے چند جملے دیکھیں۔

مولانا اسید الحق قادری: 'محسن رضویات'

پرائیک ویڈیو خطاب ریکارڈ کروا کر بھی عنایت کیا جو کہ ۲۰ اگست ۲۰۱۱ء کو علامہ کی ویب سائٹ (www.FazleHaq.com) اور فیس بک پیج کے ذریعے نشر کیا گیا۔

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، وہ حافظ بھی تھے قاری بھی تھے، عالم شریعت بھی اور چہرہ طریقت بھی، شیخ الحدیث والفقیر، محدث، محقق، مدقق، مفتی شرع بھی اور مورخ بھی، وہ ادیب بھی تھے اور خطیب بھی، شاعر و ناقد بھی۔ الغرض! وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے اس مصرع کے مصداق تھے:

جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

شیخ صاحب پیکر سوز و گداز، خوش اخلاق، باکردار، منکسر المزاج، منبع صدق و اخلاص، پابند شریعت، عامل طریقت، حامل زہد و تقویٰ، صاحب فہم و بصیرت اور پیرانہ اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کا دل جذبہ خدمت دین سے سرشار تھا، یہی در تھا جو ان کو ہر وقت مسلک حق اہل سنت کی ترویج کے لیے کوشاں رکھتا تھا۔

قبلہ شیخ صاحب کی شہادت سے لے کر تادم تحریر میں اس معاملے میں نہایت متذہب رہا کہ آخر کیا لکھوں؟

اُس ایک شخص میں پنہاں تھی خوبیاں کیا کیا

ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص

چند دن قبل کسی عاقبت نا اندیش نے شیخ صاحب کو فیس بک پر "مخالف اعلیٰ حضرت" لکھا، شیخ صاحب اپنی حیات میں بھی بعض حاسدین جالین کی جانب سے اس پر پیگنڈے کا شکار رہے، ان جالوں کے نزدیک بس اعلیٰ حضرت کا نام چپتے رہنا ہی مسلک کی گنجی خدمت ہے۔ نہ ان کو اعلیٰ حضرت کی تعلیمات سے کوئی واقفیت ہے اور نہ ہی ان کی کتب سے کچھ سروکار۔ بس "مسک اعلیٰ حضرت" کی آڑ میں سنیت

شہید بغداد، عالم ربانی حضرت شیخ اسید الحق قادری کا چہلم قریب ہے، مگر ان کی جدائی کا زخم ہنوز تازہ ہے، سوچ و فکر کی قوت قریباً مصلوب ہے۔ ۱۷ جولائی ۲۰۱۱ء سے ان کی شہادت سے ایک روز قبل تک تقریباً روزانہ ایک بار اور کبھی متعدد مرتبہ بذریعہ فیس بک گفتگو کا سلسلہ رہا، کبھی بکھار فون پر بات ہو جاتی اور کبھی بکھار برقی خطوط کے ذریعے بھی متصل رابطہ رہا۔ فیس بک پر ان کے ساتھ برادرانہ رشتہ قائم ہوا، ان کے لطف و عنایت کی بارش فقیر قادری پر پیہم برستی رہی۔ تحقیقی کام میں جب جب مجھے کوئی اشکال ہوا، حضرت نے بروقت رہنمائی کا فریضہ نبھایا۔ علمی تعاون کرنے میں اس قدر فراخ دل شخصیت میں نے آج تک نہیں دیکھی، اس تین سالہ رفاقت میں مجھے کبھی بیگانگی کا احساس نہیں ہوا، کتب خانہ قادریہ (بدایوں) سے میں یوں ہی مستفید ہوتا رہا جیسے کہ میرا ذاتی کتب خانہ ہو۔ جب کسی کتاب کی ضرورت پڑی، قبلہ شیخ صاحب نے فوراً ارسال کر دی بلکہ بعض اوقات خود ارشاد فرماتے کہ اس موضوع سے متعلق فلاں فلاں کتب آپ کے پاس ہیں؟ اگر نہیں تو میں بھیج دیتا ہوں۔ اللہ اکبر! علم دوستی اور کشتہ قلبی کا یہ انداز بے شک آپ ہی کا خاصہ تھی۔

مجھے یاد ہے جن دنوں ہم عدمہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ پر ایب سائٹ ڈیزائن کر رہے تھے تو ہم نے مواد کی فراہمی کے لیے پاک و ہند کی کئی اہل علم شخصیات سے رابطہ کیا اور تعاون کے خواستگار ہوئے، مگر یہ سب کوششیں تقریباً بے سود رہیں، کسی نے جھاڑا، لٹاڑا تو کسی نے وعدہ فردا پر ٹالا، مگر قربان جانیے شیخ اسید الحق قادری کے جنہوں نے غیر مشروط تعاون کی حامی بھری بلکہ اس کام کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کئی نایاب چیزیں اور قلمی خطوط عینت فرمائے اور ہماری درخواست پر علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ کے علم و فضل

میں موجود ہیں۔ وہ اپنی شان میں استعمال کیے گئے اشعار و جملے اور کتبوں کے انتساب سے روکتے ہیں اور خط لکھنے والے کو بار بار تلقین کرتے ہیں کہ وہ عام ڈاک سے اپنے خطوط روانہ کیا کرے۔

خطوط کا آخری حصہ:

شیخ کے خطوط کے تمام حصے اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر با تفصیل کر جائے۔ میں نے ان کے خطوط کی ابتدائی سطروں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور یہاں آخری حصے کا ذکر کر رہا ہوں۔ شیخ اپنے خطوط کے آخری حصے میں عام طور پر عام رواج کے مطابق اپنے اقربا کو سلام بھیجتے ہیں۔ رب قادری حامی و ناصر یا رب مقتدر حامی و ناصر پر اپنے خطوط ختم کر دیتے ہیں اور آخر میں صرف "اسید الحق" اور اس کے بعد "احقر طلبہ مدرّس قادریہ" رقم کرتے ہیں۔ یہاں بھی عاجزی و انکساری کی انتہا ہے کہ مدرّسہ قادریہ کے مالک ہو کر خود کو "احقر طلبہ" لکھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ کچھ نہ لکھیں پھر بھی کسی کو شکوہ نہیں ہوگا لیکن طلبہ سے ان کا تعلق خاطر اس قدر تھا کہ وہ ہمیشہ خود کو طلبہ کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔

آخری بات:

شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری کے خطوط صرف اردو میں ہی نہیں عربی میں بھی موجود ہیں، اور عربی خطوط کے کچھ نمونے میرے پاس بھی موجود ہیں۔ البتہ ان عربی خطوط میں اپنی خانقاہ، اپنے مدرسہ، اپنے بزرگوں کی خدمات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے یا خط لکھ کر کسی عربی شیخ کو اپنی خانقاہ کے حصے میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اب تک میرے پاس کوئی ایسا عربی خط نہیں پہنچا، جس سے ان کی داخلی کیفیات کا احساس ہو سکے۔ لہذا میں نے اردو خطوط پر بحث کی ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ شیخ کے زیادہ تر خطوط جب لکھا ہو جائیں گے تو یہ خطوط، خطوط نویسی کے آخری دور کے یادگار خطوط ثابت ہوں گے۔ اگر مرزا غالب خطوط نگاری کی ارتقائی تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں تو شیخ اسید الحق قادری خطوط نویسی کے آخری دور کے اہم خطوط نگاروں میں شمار کیے جائیں گے۔



☆ کاپی ایڈیٹر: اردو نیوز جینٹل دور درشن، نئی دہلی
email: alihaqnm@yahoo.com

"آپ اور تسنیم میاں یہ اعتراف کر لیں کہ آپ "دونوں میرے دوسالانہ زرتعداؤں" کی جلیبی، سو سے منگا کر کھا گئے ہیں۔"

"گزشتہ ایک ہفتہ سے کسی فضول اور فالتو قسم کے کام میں وقت ضائع کرنے کو دل چاہ رہا تھا، سوچا آپ کو خط ہی لکھ دوں۔"

اسی طرح وہ جب طنز کرتے ہیں تو ان کے مخاطب کے پاس ہنس کر گزرنے اور محسوس کرنے کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ میں نہیں ہوتا:

"مجھے یقین ہے کہ آپ نے میرے ہر خط کا جواب نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے قلم حق رقم سے رقم فرمایا ہوگا۔ اب یہ میری خوش نصیبی ہے یا آپ کی کہ آپ کے وہ سارے تفصیلی خط ڈاک کی بد نظمی کا شکار ہو کر مجھ تک نہیں پہنچ سکے، جس طرح میرے وہ بے شمار خطوط، جو میں نے لکھے ہی نہیں تھے ڈاک کے حسن انتظام کی وجہ سے آج تک احباب کو نہیں ملے۔"

اس کے علاوہ وہ طنزیہ و مزاحیہ جملے لکھنے کے بعد کہیں کہیں اشعار بھی استعمال کرتے ہیں، جس سے ان جملوں اور شعر و نولوں کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔

سادگی و پرکاری:

شیخ اسید الحق قادری خطوط نویسی میں اخفائے ذات کے قائل نظر نہیں آتے۔ بے تکلفی اور سادگی و پرکاری ان کے خطوط کی بڑی خصوصیت ہے۔ عربی و فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر قدرت و مہارت کے باوجود ان کے خطوط میں بالکل عام فہم اور سامنے کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ الفاظ کی نشست و برخاست ایسی جاذب نظر ہوتی ہے کہ پڑھ کر مزہ بھی آتا ہے اور تقلید کو بھی دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ ان کے خطوط میں بڑی سے بڑی علمی و فکری باتیں بھی موجود ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی۔

وہ نام لکھ لکھ کر اپنے انتہائی قریبی لوگوں تک سلام بھی پہنچاتے ہیں۔ بے جا تکلفات کا ان خطوط پر کوئی سایہ نظر نہیں آتا۔ الفاظ کے انتخاب اور مطالب میں وہ کاوش نہیں کرتے۔ بالکل عام فہم اور بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ البتہ چابجا اردو کے محاورات ضرور استعمال کرتے ہیں، محاوراتی زبان پر انہیں خاصی دسترس حاصل ہے۔ ان کی ذات کے اندر موجود عاجزی و انکساری کی جھلکیاں ان کے خطوط

کے نیچے ادھیڑ نے پر ہی مدار ہے۔

ہمارے ایک مخلص دوست ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی نے اپنی ایک نظم میں قبلہ شیخ صاحب کو ”حسن رضویات“ لکھا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ بجا طور پر اس کے حق دار ہیں، ہماری چند سطور آئندہ سے یہ بات بجا طور پر ثابت ہو جائے گی۔ قبلہ شیخ صاحب کتب اعلیٰ حضرت پر اس قدر گہری نظر رکھتے تھے کہ ایک بار فرمایا کہ میں اعلیٰ حضرت کے معاملے میں ڈی لٹ ہوں۔ (پنی ایچ ڈی سے آگے کی ڈری ہے)

جن دنوں راقم الحروف اور مولانا افرود قادری، استاذ ذہن مولانا حسن رضا حسن کے مجموعہ رسائل کی ترتیب و تدوین میں مصروف عمل تھے، قبلہ شیخ صاحب نے ذاتی دل چسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس قدر دست تعاون و راز کیا کہ مولانا حسن رضا کی بعض ایسی نایاب تصانیف جن کا ہمیں علم بھی نہ تھا، عنایت فرمائیں بلکہ اکثر خود نوں کر کے پوچھتے کہ کیا آپ کو مولانا حسن کی فلاں تصنیف کا علم ہے؟ یا آپ کو دستیاب ہوگی؟ اگر نہیں تو ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے، میں بھیج دیتا ہوں۔ رسائل و کلیات حسن کی تدوین و ترتیب اور رضویات سے متعلق دیگر تحقیقی کام کے لیے قبلہ شیخ صاحب نے جو کتب مہیا فرمائیں ان کے اسادرج ذیل ہیں:

۱- ندوہ کا تجرید و ادوم کا نتیجہ

(بذریعہ برقی مکتوب ۲۳ ستمبر ۲۰۱۱ء)

۲- بے موقع فریاد کے مہذب جواب (دیکھیے حاشیہ: ۱)

۳- ماہ وار رسالہ قہر الدیان علی مرتد بقادیان (اول شمارہ)

(بذریعہ برقی مکتوب، مورخہ ۲۱ ستمبر ۲۰۱۱ء)

۴- مشنوی وسائل بخشش (دیکھیے حاشیہ: ۲)

۵- سوالات و تحقیقات نما برروس ندوۃ العلماء

(ہم راہ برقی مکتوب مورخہ ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۱ء) (دیکھیے حاشیہ: ۴)

۶- مولانا حسن رضا کا ایک تعزیتی مکتوب حضرت مولانا عبدالقیوم قادری بدایونی کی شہادت کے موقع پر

(بذریعہ برقی مکتوب مورخہ ۱۱ مارچ ۲۰۱۲ء)

۷- تحفہ حنفیہ کی فائز سے قطعہ تاریخ وصال مولانا عبدالقیوم قادری بدایونی۔

(ہم راہ برقی مکتوب مورخہ ۱۱ مارچ ۲۰۱۲ء) (دیکھیے حاشیہ: ۳)

۸- قصیدہ در مدح شاہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمۃ (۱ ماہ تابان اوج معرفت، یعنی عرس قادری ۱۳۰۰ھ کی روداد سے)

(برقی مکتوب مورخہ ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۱ء) (دیکھیے حاشیہ: ۴)

۹- تحفہ حنفیہ کی فائز سے ندوہ کے متعلق ایک مضمون ”مدارِ صدر ثانی ندوہ مع پرچہ سوالات“ (دیکھیے حاشیہ: ۵)

۱۰- فتاویٰ القدودہ لکھنؤ دفین اللندوہ

(برقی مکتوب مورخہ ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۱ء)

۱۱- تزک مرتضوی کے ناشر مولانا غلام شہر قادری صاحب کے حالات (ہم راہ برقی مکتوب مورخہ ۱۶ اگست ۲۰۱۲ء) (دیکھیے حاشیہ: ۶)

۱۲- الحصل المصطفیٰ فی عقائد ارباب سید المصطفیٰ (۱۲۹۸ھ) مصنفہ حضرت ابوالحسن نوری علیہ الرحمۃ مطبوعہ جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ میرٹھ سے مولانا حسن رضا کا قطعہ تاریخ طباعت (فارسی)

(ہم راہ برقی مکتوب مورخہ ۱۶ اگست ۲۰۱۲ء)

۱۳- کشکول فقیر قادری

(ہم راہ برقی مکتوب مورخہ ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

(کتاب کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی کہ ایک دوست نے بتایا کہ کشکول فقیر قادری بھی مولانا حسن کی تصنیف ہے، راقم نے فی الفور شیخ صاحب سے رابطہ کیا اور انہوں نے پہلی فرصت میں ہی یہ کتاب مجھے عنایت فرمادی، مفتی عبدالکبیر نعمانی صاحب نے اسے مولانا حسن کی تصنیف لکھا ہے، مگر کتاب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ مولانا حسن کی تصنیف نہیں، بلکہ متفرق شعرا کے کلام کا مجموعہ ہے)

۱۴- قصیدہ معراجیہ پر تفسیر (برقی مکتوب مورخہ ۳ ستمبر ۲۰۱۳ء)

۱۵- دستور العمل مجلس علمائے اہل سنت و مطبع اہل سنت و جماعت واقع شہر بانس بریلی (ہم راہ مکتوب مورخہ ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

۱۶- فتح خمیر (ہم راہ برقی مکتوب مورخہ ۱۸ اگست ۲۰۱۱ء)

۱۷- قصیدتان راکتان کے اصل مخطوط کا عکس

۱۸- لوامع البہا فی المصر الجمعة الاربع عقبہا (اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے اس رسالہ کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ قادریہ بدایونی میں موجود ہے، ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ شیخ

صاحب نے مجھے اس کے دو تین صفحات عنایت فرمائے تھے اور فرمایا تھا کہ میں ان شاء اللہ اس رسالہ کو ترجمہ و تخریج کے ساتھ منظر عام پر لاؤں گا)

اس کے علاوہ بھی کئی ایک نادروالہ جات عنایت فرمائے اور ہمارے کام کو بہت سراہا۔ رسائل کی ترتیب و تدوین کے دوران بعض مقامات پر شکست عبارت اور پیچیدہ ہندی الفاظ کی تصحیح بھی شیخ صاحب نے فرمائی۔

رسائل و کلیات حسن کے آخر میں ہم نے ”جہان حسن“ لانے کا اعلان بھی کیا تھا، جب قبلہ شیخ صاحب کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فقیر کے نام اپنے برقی مکتوب (برقی مکتوب ۴ مارچ ۲۰۱۲ء) میں یہ پیغام ارسال فرمایا: ”امید ہے کہ جہان حسن کا کام چل رہا ہوگا، اس سلسلے میں میرے لائق جو بھی خدمت ہو مطوع فرمائیں۔“

مولانا حسن رضا کے کام کے دوران میں بلا جھجک ان سے مختلف کتب و رسائل کا مطالبہ کرتا رہا، اور ضروری معلومات بھی حاصل کرتا رہا اور شیخ صاحب ہمیشہ فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے میرے سوالات کا جواب دیتے اور کتب و رسائل و دیگر ضروری حوالہ جات فراہم کرتے رہے۔

شیخ صاحب کی علم دوستی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب فقیر قادری نے اخبار ”المنقذ“ کے اشاریے پر کام شروع کیا تو شیخ صاحب نے خود فرمایا کہ اس کی کچھ فائز ہمارے کتب خانہ میں ہیں، میں وہ بھی چیک کروں گا لیکن وہ فائز اخبار اہل فقہ (امرتسر) کی فائز تھیں۔ فقیر قادری کی درخواست پر انہوں نے اخبار اہل فقہ کے سات سال کی فائز اور رسالہ تحفہ حنفیہ کی فائز مجھے عنایت فرمادیں۔

مولانا عبید اللہ کی قادری بدایونی علیہ الرحمہ مصنف ”تنبیہ الغفل من غم غیب الرسول“ (متوفی: ۱۳۱۵ھ) کے وصال پر اعلیٰ حضرت نے لڑی میں دو قطعات تواریخ رقم فرمائے تھے، فصیح و بلیغ عربی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت نے ہر مصرع سے سن وصال کا استخراج فرمایا ہے۔ یہ قطعات مولانا کی کتاب تنبیہ الغفل کے ساتھ ہی شائع ہوئے۔ جب فقیر قادری نے شیخ صاحب کو بتایا کہ ایک صاحب اعلیٰ حضرت کے متفرق قطعات اور تقاریر جمع کر رہے ہیں تو انہوں نے ان قطعات کو لیکن کروا کر بھیجا۔

سید صابر حسین شاہ بخاری نے اپنی کتاب ”تقاریر اعلیٰ حضرت“ میں ان کو شامل کیا یونہی ”فتاویٰ القدودہ“ پر اعلیٰ حضرت کی تقریر بھی شامل

کی۔ میں نے فیس بک پر ”فتاویٰ السنہ لالجام الفقہ“ کا سرورق لگایا اور ساتھ لکھ دیا کہ اس کے کچھ صفحات فقیر کے پاس نہیں، اس پر شیخ صاحب نے منہج کیا کہ آپ کے پاس جو صفحات نہیں وہ مجھ سے حاصل کر لیں۔

راقم کی درخواست پر ڈاکٹر مشاہد رضوی نے اعلیٰ حضرت کے کلام پر لکھی تفسائیں اور طرز رضا کی پیروی (یعنی برزین اعلیٰ حضرت) میں لکھا جانے والے کلام کو جمع کرنا شروع کیا تو شیخ صاحب نے اس کام میں بھی نہایت تعاون فرمایا اور کئی نادروالہ جات تفسائیں و کلام عنایت فرمایا۔

معارف رضا کے شمارہ بابت اپریل ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر مسعود صاحب کے مکتوب ہام محمد صادق قصوری شائع ہوئے، ایک مکتوب میں ڈاکٹر صاحب نے صادق قصوری صاحب سے کہا تھا کہ کتب خانہ قادریہ بدایونی میں ایک قلمی کتاب ”مظہر العلماء فی تراجم العلماء والکملاء“ مؤلفہ محمد حسین، ہے اگر اس کتاب سے امام احمد رضا کے حالات نقل فرما کر بھیج دیں تو ممنون ہوں گا۔“ (صفحہ: ۴۵)

۲۰ مئی ۲۰۱۳ء کو شیخ صاحب سے ہونے والی گفتگو میں راقم نے اس کتاب کا تقاضا کیا، فرمایا: آپ نے اس کا ذکر کہاں پڑھا؟ میں نے عرض کیا: معارف رضا میں۔ فرمایا: غالباً یہ واحد نسخہ ہے، کمپوز ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند کے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب بدایونی میں موجود ہے۔

میں نے عرض کیا: کیا اس میں اعلیٰ حضرت کا ذکر ہے؟ فرمایا: نہ صرف اعلیٰ حضرت بلکہ تھانوی، گنگوہی، نانوتوی اور سرسید سب کا ہی ذکر ہے، چھاپنے کی ہمت ہے؟

میں نے عرض کیا کوئی بات نہیں، یوں تو قرآن کریم میں شیطان کا ذکر بھی ملتا ہے۔

فرمایا: آپ کو ان صحیح فائل بھیج دوں؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں اور پوچھ پوچھ؟

فرمایا: مگر پہلے حلف اٹھائیں کہ کسی دوسرے کو فارورڈ نہیں کریں گے اور نہ ہی پرنٹ نکالیں گے۔ میں نے حامی بھری تو فرمایا: آپ کا دسترخوان بہت وسیع ہے، اس لیے آپ کو کچھ دیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ خیر حضرت نے اس کی فائل بھیج دی تھی۔

شیخ صاحب کو اگر کسی کتاب کی تلاش ہوئی تو فقیر کو حکم فرماتے اور

صاحب نے مجھے اس کے دو تین صفحات عنایت فرمائے تھے اور فرمایا تھا کہ میں ان شاء اللہ اس رسالہ کو ترجمہ و تخریج کے ساتھ منظر عام پر لاؤں گا)

اس کے علاوہ بھی کئی ایک نادروالہ جات عنایت فرمائے اور ہمارے کام کو بہت سراہا۔ رسائل کی ترتیب و تدوین کے دوران بعض مقامات پر شکست عبارت اور پیچیدہ ہندی الفاظ کی تصحیح بھی شیخ صاحب نے فرمائی۔

رسائل و کلیات حسن کے آخر میں ہم نے ”جہان حسن“ لانے کا اعلان بھی کیا تھا، جب قبلہ شیخ صاحب کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فقیر کے نام اپنے برقی مکتوب (برقی مکتوب ۴ مارچ ۲۰۱۲ء) میں یہ پیغام ارسال فرمایا: ”امید ہے کہ جہان حسن کا کام چل رہا ہوگا، اس سلسلے میں میرے لائق جو بھی خدمت ہو مطوع فرمائیں۔“

مولانا حسن رضا کے کام کے دوران میں بلا جھجک ان سے مختلف کتب و رسائل کا مطالبہ کرتا رہا، اور ضروری معلومات بھی حاصل کرتا رہا اور شیخ صاحب ہمیشہ فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے میرے سوالات کا جواب دیتے اور کتب و رسائل و دیگر ضروری حوالہ جات فراہم کرتے رہے۔

شیخ صاحب کی علم دوستی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب فقیر قادری نے اخبار ”المنقذ“ کے اشاریے پر کام شروع کیا تو شیخ صاحب نے خود فرمایا کہ اس کی کچھ فائز ہمارے کتب خانہ میں ہیں، میں وہ بھی چیک کروں گا لیکن وہ فائز اخبار اہل فقہ (امرتسر) کی فائز تھیں۔ فقیر قادری کی درخواست پر انہوں نے اخبار اہل فقہ کے سات سال کی فائز اور رسالہ تحفہ حنفیہ کی فائز مجھے عنایت فرمادیں۔

مولانا عبید اللہ کی قادری بدایونی علیہ الرحمہ مصنف ”تنبیہ الغفل من غم غیب الرسول“ (متوفی: ۱۳۱۵ھ) کے وصال پر اعلیٰ حضرت نے لڑی میں دو قطعات تواریخ رقم فرمائے تھے، فصیح و بلیغ عربی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت نے ہر مصرع سے سن وصال کا استخراج فرمایا ہے۔ یہ قطعات مولانا کی کتاب تنبیہ الغفل کے ساتھ ہی شائع ہوئے۔ جب فقیر قادری نے شیخ صاحب کو بتایا کہ ایک صاحب اعلیٰ حضرت کے متفرق قطعات اور تقاریر جمع کر رہے ہیں تو انہوں نے ان قطعات کو لیکن کروا کر بھیجا۔

سید صابر حسین شاہ بخاری نے اپنی کتاب ”تقاریر اعلیٰ حضرت“ میں ان کو شامل کیا یونہی ”فتاویٰ القدودہ“ پر اعلیٰ حضرت کی تقریر بھی شامل

کی۔ میں نے فیس بک پر ”فتاویٰ السنہ لالجام الفقہ“ کا سرورق لگایا اور ساتھ لکھ دیا کہ اس کے کچھ صفحات فقیر کے پاس نہیں، اس پر شیخ صاحب نے منہج کیا کہ آپ کے پاس جو صفحات نہیں وہ مجھ سے حاصل کر لیں۔

راقم کی درخواست پر ڈاکٹر مشاہد رضوی نے اعلیٰ حضرت کے کلام پر لکھی تفسائیں اور طرز رضا کی پیروی (یعنی برزین اعلیٰ حضرت) میں لکھا جانے والے کلام کو جمع کرنا شروع کیا تو شیخ صاحب نے اس کام میں بھی نہایت تعاون فرمایا اور کئی نادروالہ جات تفسائیں و کلام عنایت فرمایا۔

معارف رضا کے شمارہ بابت اپریل ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر مسعود صاحب کے مکتوب ہام محمد صادق قصوری شائع ہوئے، ایک مکتوب میں ڈاکٹر صاحب نے صادق قصوری صاحب سے کہا تھا کہ کتب خانہ قادریہ بدایونی میں ایک قلمی کتاب ”مظہر العلماء فی تراجم العلماء والکملاء“ مؤلفہ محمد حسین، ہے اگر اس کتاب سے امام احمد رضا کے حالات نقل فرما کر بھیج دیں تو ممنون ہوں گا۔“ (صفحہ: ۴۵)

۲۰ مئی ۲۰۱۳ء کو شیخ صاحب سے ہونے والی گفتگو میں راقم نے اس کتاب کا تقاضا کیا، فرمایا: آپ نے اس کا ذکر کہاں پڑھا؟ میں نے عرض کیا: معارف رضا میں۔ فرمایا: غالباً یہ واحد نسخہ ہے، کمپوز ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند کے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب بدایونی میں موجود ہے۔

میں نے عرض کیا: کیا اس میں اعلیٰ حضرت کا ذکر ہے؟ فرمایا: نہ صرف اعلیٰ حضرت بلکہ تھانوی، گنگوہی، نانوتوی اور سرسید سب کا ہی ذکر ہے، چھاپنے کی ہمت ہے؟

میں نے عرض کیا کوئی بات نہیں، یوں تو قرآن کریم میں شیطان کا ذکر بھی ملتا ہے۔

فرمایا: آپ کو ان صحیح فائل بھیج دوں؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں اور پوچھ پوچھ؟

فرمایا: مگر پہلے حلف اٹھائیں کہ کسی دوسرے کو فارورڈ نہیں کریں گے اور نہ ہی پرنٹ نکالیں گے۔ میں نے حامی بھری تو فرمایا: آپ کا دسترخوان بہت وسیع ہے، اس لیے آپ کو کچھ دیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ خیر حضرت نے اس کی فائل بھیج دی تھی۔

شیخ صاحب کو اگر کسی کتاب کی تلاش ہوئی تو فقیر کو حکم فرماتے اور

میری ہر ممکن کوشش ہوتی کہ جلد از جلد اس کی تعمیل ہو، چنانچہ مولانا عبدالحامد بدایونی کی کتاب ”نظام عمل“ مولانا غلام قادر بھیروی کا ترجمہ ”بوارق محمدیہ“، امثال القرآن اور دیگر کئی کتب شیخ صاحب کو فقیر نے ارسال کیں۔

شہادت سے تقریباً دو تین ماہ قبل سے بعض معاندین حاسدین کی بے جا مخالفت و الزام تراشیوں کے سبب شیخ صاحب نہایت رنجیدہ و مغموم رہا کرتے تھے، اس عرصے میں میرے ساتھ بھی کچھ خاص بات نہ فرماتے، بس سلام و مزاج پرسی کے بعد رخصت ہو جاتے، ۲۴ جنوری ۲۰۱۳ کو حضرت نے نہایت افسردگی میں یہ بیسیج کیا:

”بغداد کو جاتے ہیں کہ وہاں فریاد کا سننے والا ہے۔“
جب اس قدر دکھی دل کے ساتھ انہوں نے بارگاہ غوثیت میں التجا کی ہوگی:

لطف فرما کہ ہے طوفانِ بد میں کشتی
آگئی حوصلہ ذوقِ عمل میں پستی
آج دیران ہے پھر سے مرے دل کی بستی
ما گدا یم تو سلطانِ دو عالم ہستی
از تو دار یم طمع یا شہ جیلاں مدوے
غوثِ اعظم بمن بے سرو ساماں مدوے

(کلام شیخ اسید الحق قادری)
نہ جانے اُن کے قلبِ حزین پر کیا کیا کیفیات گزرتی ہوں گی کہ اُن کی یہ التجابابِ اجابت میں یوں مقبول ہوگی کہ سرکارِ غوثِ اعظم عیہ الرحمہ نے اپنے اس عاشقِ صادق کو ہند کے اس ستم زدہ ماحول میں واپس بھیجنا منظور نہ فرمایا اور اپنے جوار میں آرام کی نیند سنانا منظور کیا۔ کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ شیخ اسید الحق قادری عین عالم شباب میں یوں رخصت ہو جائیں گے۔ شیخ صاحب کی اچانک شہادت نے لاکھوں دلوں کو رنج و غم سے نڈھال کر دیا اور حال یہ ہے کہ آج اتنے دن گزر جانے کے باوجود یقین نہیں آ رہا، یونہی لگتا ہے کہ جیسے یہ سب خواب ہو۔ بہر کیف رضائے موی کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ اللہ کریم اُن کے درجات بلند فرمائے۔ اہل خاندان و دیگر لواحقین، معتقدین، متوسلین اور تمام جماعت کو صبر جمیل عطا فرمائے اور شیخ صاحب

کے مشن کو جاری رکھنے اور پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت و توفیق بر فرمائے۔ بلاشبہ کسی علمی شخصیت کا رخصت ہو جانا ایک عظیم رنج کا سبب ہوتا ہے مگر اس سے بڑھ کر دکھ اس کے مشن کے فوت ہو جانے کا ہے۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ ہمیں شیخ صاحب کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور خانقاہِ قادریہ بدایوں سے جس علمی تحریک کا آغاز شہید شیخ صاحب نے فرمایا تھا اسے تاحق قیامت جاری رکھے۔ آمین

آفریں اُن پر محبت ہی رہا جن کا شعار
نفرتوں کی راہ میں کوہِ گراں ثابت ہوئے
دیکھنے کو اُن کے اُنچا دیکھنا کتنا بڑا
کچھ زمیں کے لوگ تھے جو آسمان ثابت ہوئے

حواشی

قبیلہ شیخ صاحب سے مولانا حسن رضا کے مجموعہ تصانیف کے ضمن میں جو خط و کتابت ہوئی وہ بدیہ قارئین ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد دیگر خطوط بھی پیش کیے جائیں گے۔

(۱) برقی مکتوب مورخہ ۱۲ مارچ ۲۰۱۱ء (اس مکتوب کے ہم راہ مولانا حسن کی کتاب بے موقع فریاد کے مہذب جواب عنایت فرمائی)
سلام مسنون! کتاب بیسیج میں تاخیر ہوئی، اس کے لیے معذرت خواہوں، ذرا مصروف ہو گیا تھا۔

(۲) برقی مکتوب مورخہ ۹ فروری ۲۰۱۱ء (اس برقی مکتوب کے ہم راہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی ”نظم معطر“ جو کہ وسائل بخشش کے ساتھ شائع ہوئی تھی، اس کا عکس عنایت فرمایا اور تحریر کیا)

یہ وسائل بخشش کے آخر میں شائع ہوئی ہے۔ میں صرف اتنا ہی لکھا تھا، اگر اب وہاں (یعنی خانقاہِ صدر یہ چھوڑنا) شیخ صاحب کے نانا کی خانقاہ جانا ہوا تو یہ دیکھوں گا! کچھ دن بعد (۲۴ مارچ ۲۰۱۱ء) شیخ صاحب کو وسائل بخشش کا ایک نسخہ اپنے کتب خانہ سے ہی مل گیا چنانچہ شیخ صاحب نے فقیر قادری کو بذریعہ فون اس کی اطلاع دی اور فرمایا کہ وہ یہ نسخہ انہیں کروا کر ای میل کر رہے ہیں!

(۳) برقی مکتوب مورخہ ۱۱ مارچ ۲۰۱۲ء
مکرمی و محترمی! سلام مسنون! مزاج گرامی؟ ”فد جاز کی رپورٹ“ کا انتظار ہے۔ آپ کے لیے دو تحفے ارسال کر رہا ہوں۔ مولانا حسن رضا صاحب عیہ الرحمہ کا ایک خط اور ایک قطعہ تاریخِ بوسہ ناخیکہ، براہِ اہتمام قادیان

کی وفات کے موقع کے ہیں۔ مولانا عبدالقیوم قادری کی وفات کے موقع پر جتنے تحریری خطوط آئے تھے وہ سب ایک رجسٹر میں نقل کر لیے گئے تھے، یہ رجسٹر کتب خانہ قادریہ بدایوں شریف میں محفوظ ہے، اس کے صفحہ ۱۹ پر مولانا حسن کا یہ خط نقل کیا گیا ہے، خط کی کمزور نگاہ اور عکس دونوں ارسال خدمت ہیں۔ عکس میں جو تحریر ہے وہ مولانا حسن کی نہیں ہے، بلکہ کسی اور کی ہے جس نے یہ تمام خط رجسٹر میں نقل کیے ہوں گے۔ قطعہ تاریخ ماہنامہ تحفہ حنفیہ سے لیا گیا ہے اس کا مکمل حوالہ آخر میں درج ہے۔ والسلام۔ اسید الحق قادری

(۴) برقی مکتوب مورخہ ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۱ء

مکرمی! السلام علیکم... حضرت مولانا حسن رضا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قصیدہ حاضر ہے جو آپ نے سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی قدس سرہ کی مدح میں نظم کیا تھا۔ یہ قصیدہ شاعر نے سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی قدس سرہ کے سالانہ عرس کے موقع پر ۲۲ جمادی الثانی سنہ ۱۴۳۰ھ کو درگاہِ قادریہ بدایوں شریف میں خود پیش کیا تھا، اس سال عرس میں پیش کردہ تمام نعتیہ اور مقبیہ کلام اگلے سال کے عرس ۱۴۳۱ھ میں ”ماہ تابان اوج معرفت“ کے تاریخی نام سے شائع کر دیا گیا تھا۔ یہ صفحات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں، یاد رہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی بھی پابندی سے ہر سال اس عرس میں شرکت فرمایا کرتے تھے، چنانچہ سنہ ۱۴۳۰ھ والے عرس میں بھی آپ شریک تھے اور اس موقع پر آپ نے سیف اللہ المسلول کی مدح میں دو عربی قصیدے نظم فرمائے تھے، یہ دونوں عربی قصیدے خود اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے قلم سے لکھے ہوئے کتب خانہ قادری میں محفوظ ہیں، ان میں سے ایک قصیدہ (والیہ) ”ماہ تابان اوج معرفت“ میں شائع کر دیا گیا تھا۔

بقیہ نسلِ لو کے سب سے بڑے محسن:

قصیدہ والیہ کے آخر میں ایک شعر میں دو تاریخیں برآمد فرمائی ہیں، پہلے مصرع میں صاحبِ عرس حضرت سیف اللہ المسلول کی سنہ وفات ۱۲۸۹ھ برآمد ہوئی ہے جب کہ دوسرے مصرع سے عرس کی تاریخ سنہ ۱۳۰۰ھ نکلتی ہے، شعر درج ذیل ہے:

فضل الرسول مولد یا فضل عرس امجد
باقی کچھ چیزیں اور ارسال خدمت ہیں، سوالات تھاق نق نما کا مقدمہ آپ کے حسبِ خواہش حاضر ہے۔ ندوۃ العلماء والے معاملے میں دو فتوے تھے، ایک فتویٰ جس پر علما حرمین کی تصدیقات تھیں، اس کا نام فساوی الحرمین برجف مدوۃ العین تھا، جب کہ ایک فتویٰ علما ہند کا تھا جس کا نام فساوی القدوۃ لکشف ذفین البدوۃ تھا، ثانی الذکر کے مرتب و مؤلف مولانا حسن رضا قادری صاحب تھے، یہ بھی حاضر خدمت ہے۔

طالب دعا: اسید الحق قادری
(۵) برقی مکتوب مورخہ ۱۵ مارچ ۲۰۱۲ء
السلام علیکم! محسن کا کوروی کے قصیدہ کا مطلوبہ صفحہ حاضر ہے۔ کلیات محسن میں مولانا حسن رضا صاحب کی کتاب کا قطعہ تاریخ بھی مل گیا، وہ بھی حاضر ہے۔ تحفہ حنفیہ پنشن سے مولانا حسن کی ایک تحریر بھی حاضر ہے۔

گر قبول افتد رہے عز و شرف
(۶) برقی مکتوب مورخہ ۱۶ اگست ۲۰۱۲ء
سلام مسنون! مولانا غلام شہر صاحب کے خود نوشت حالات حاضر ہیں۔ ان کی وفات ۱۳۳۶ھ / ۱۹۲۷ء میں ہوئی تھی۔ □□□

☆ ایم اے علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)

ہم ان کی حیات میں اپنے احباب سے جب بھی ان کا تذکرہ کرتے سب کا متفقہ طور پر فیصلہ یہی ہوتا کہ مولانا اگر اسی طرح کام کرتے رہے تو ان کی فتوحات کی فہرست اتنی طویل ہو جائے گی کہ برصغیر کی تاریخ ان پر بجا طور پر فخر کرے گی۔ اہل علم طبقے کے بعض حضرات شاید اعلانیہ طور پر ان کے بارے میں اعترافِ حقیقت کرنے سے پس و پیش کریں لیکن انہیں بھی یہ احساسِ ضرور ہے کہ مولانا عدم و فضل کے روشن ترین چراغ تھے۔ ان کی شہادت سے نہ صرف چراغ گل ہو گیا ہے بلکہ اہل سنت کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ لکھنے پڑھنے والے جدید قلم کاران کے جانے سے خود کو بے آسرا محسوس کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس اکابر تو بہت ہیں لیکن نوجوانوں کو ایک نوجوان ہی اچھے ڈھنگ سے سمجھ سکتا ہے۔ مولانا بڑے ضرور تھے لیکن وہ چھوٹوں سے بالکل بے تکلف تھے۔ وہ چھوٹوں کو ان کے چھوٹے پن کا احساس قطعی نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ ان کا سب سے بڑا کمال تھا اور سب سے عظیم ہونے کا استعارہ۔ دلی مضطرب پوچھ رہا ہے کہ کیا اب کوئی دوسرا اسید الحق ہے؟... کوئی ہے؟... اگر ہو تو برائے کرم مجھے خبر ضرور کیجیے گا۔ □□□

☆ ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی (مہاراشٹر)

ایسا بھی اک شخص تھا جو ملا نہیں اور پچھڑ گیا

مولانا اُسید الحق قادری بدایونی کا پاکستان کے علمی حلقوں میں کتابی تعارف اور راقم سے ان کے مراسم کی کہانی

نومبر ۲۰۱۰ء میں مولانا اُسید الحق قادری اور مولانا خوشتر نورانی جب پاکستان کے دورے پر کراچی وارد ہوئے اُس وقت تک چوں کہ دونوں صاحبان سے میری کوئی ذاتی تعلق داری نہیں تھی صرف نام کی حد تک شناسائی اور کام سے کسی قدر واقفیت تھی، اتفاق سے کسی واسطے سے اُن کی آمد کی بروقت اطلاع بھی نہ ہو سکی، بلکہ یہ خبر مجھے اُس وقت موصول ہوئی جب کہ ان حضرات کی ہندوستان واپسی میں ایک یا دو روز باقی تھے۔ لاہور سے فوراً کراچی جانا میرے جیسے بندے کے لیے تقریباً اتنا ہی مشکل ہے جتنا دہلی جانا۔ لہذا اس منصوبے کو بالائے طاق رکھ کر اپنی سی کوشش کر کے رابطہ نمبر حاصل کیا، تاکہ کم از کم فون پر ہی شرف گفتگو حاصل ہو جائے۔ چنانچہ ایک آدھ دن نمبر حاصل کرنے میں صرف ہو گیا، بقیہ وقت اس سوچ بچار میں بیت گیا کہ کب رابطہ کرنا مناسب ہے؟ اور کیسا انداز گفتگو ان کے شایان شان ہوگا؟ اور کیا بات کرنی موزوں رہے گی؟ اور مقاصد کلام کیا ہیں؟ وغیرہ، ادھر ۹ نومبر کو دو حضرات کا یہ قافلہ وطن واپس ہوا اور ہم ابھی تک فیصلہ ہی نہ کر پائے۔ دراصل وہ دور میرا نوپائی کا تھا، معزز لوگوں کے حضور لب کشائی کے آداب ابھی تک نہیں نے سیکھے نہ تھے، اس لیے یہ جھجک اور پچھچھاہٹ کافی عرصے تک میرے لیے جاب بنی رہی۔ دھیرے دھیرے یہ منزل طے ہوتی گئی اور آج وہ وقت ہے کہ اس رابطے اور سعی پیہم نے پاک و ہند کی نہ ختم ہونے والی زکاتوں اور دوسری دنیا کے طویل ترین فاصلوں کو کالعدم ثابت کر دیا ہے۔

مجھے حضرت مولانا اُسید الحق رحمۃ اللہ علیہ کا علمی و تحقیقی حوالے سے صحیح تعارف سال ۲۰۱۱ء میں ہوا جب اُن کا ترجمہ و ترتیب شدہ ”مجموعہ رسائل فضل رسول“ پاکستان میں مکتبہ برکات المدینہ، کراچی سے نومبر ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا اور سال ۲۰۱۱ء میں لاہور کی مارکیٹوں میں آیا۔ یہ

”مذکرہ فضل رسول“ اور تاج الفحول: حیات و خدمات کی کمپوزنگ ہمارے پاس نہیں ہے، اگر آپ کہیں تو بذریعہ ڈاک کتاب بھجوا دی جائے، قصیدتان را کھتان اور اکمل التاریخ، ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں، ان پر کام چل رہا ہے، ان شاء اللہ رمضان المبارک تک منظر عام پر آجائیں گی، مثنوی غوثیہ کی سافٹ کاپی ارسال کر رہا ہوں، اگر شائع کریں تو اس سے پہلے مجھے مطلع کر دیں۔

رب قدر آپ کی حسنت قبول فرمائے۔

اُسید الحق قادری

اُس وقت جن دو کتابوں کی شدید حاجت تھی ان پر ابھی تک کام مکمل نہیں ہوا تھا، پھر جن کتب کی مزید طلب تھی وہ مطبوعہ تو تھیں لیکن ان کی کمپوزنگ موجود نہیں تھی، اور فوری طور پر انھیں ڈاک سے منگوانا کافی بوجھ لگ رہا تھا، لہذا یہ پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ جب کہ مثنوی کی اشاعت کو کسی مناسب موقع کے لیے روک لیا گیا۔

دوسرا رابطہ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ کے ڈیڑھ صد سالہ منہ شہادت جسے حضرت علامہ ہی سے منسوب کیا گیا، کی تیاریوں کے سلسلے میں ہوا۔ راقم اپنے ادارے سے علامہ خیر آبادی کا رسالہ ”الروض بود“ مع ترجمہ از حکیم سید محمود احمد برکاتی، شائع کر رہا تھا، اس کی ابتدا علمی حالات مصنف شامل کرنے تھے جو میں خود ہی ترتیب دے رہا تھا۔ حضرت خیر آبادی کی تصانیف کے ضمن میں ”انتاع العظیم“ کے بعد ایک نئی بہت مولوی حیدر علی نوکی کے متعلق خبر ہوئی جس کا کسی ذریعے سے سراغ نہ لگ سکا۔ دراصل یہ فتویٰ ”شفاعت مصطفیٰ“ (ترجمہ تحقیق فتویٰ) کے پاکستانی ایڈیشن میں نہیں ہے، جب کہ انڈین اشاعت میں موجود ہے جو میری رسائی سے باہر تھی۔ علاوہ ازیں ”انتاع العظیم“ کے علامہ فضل حق خیر آبادی سے انتساب کے سلسلے میں ایک غلط فہمی پائی تھی جس کا ازالہ کرنا تھا۔ میری نظر میں اس فتوے کے حصول اور تصدیق کے ازالے کے لیے سب سے موزوں حضرت اُسید صاحب کی

مکتبہ گرامی تھی۔ راقم نے آپ سے اس مشکل کا ذکر کیا، حضرت کی ہدایت کو بھلا کیوں کر بھلایا جاسکتا ہے، آں حضور نے اس فتویٰ کے قلمی اثر (جو کتب خانہ قادریہ کی زینت تھا) کی تصاویر بنوا کر مع تفصیلات جو

ان کی زیر تصنیف کتاب ”خیر آبادیات“ میں شامل تھیں، بھیج دیں، ساتھ ہی ”انتاع العظیم“ کے حوالے سے بھی مواد بھیج دیا۔ آپ کا وہ مکتوب گرامی درج ذیل ہے:

”جناب ... السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

فتویٰ حاضر خدمت ہے۔ یہ قلمی نسخہ کتب خانہ قادریہ بدایوں شریف میں محفوظ ہے، فتوے کی بعض تفصیلات جو میں نے اپنی کتاب ”خیر آبادیات“ میں لکھی ہیں، درج ذیل ہیں.....“

اس کے بعد ”خیر آبادیات“ (مسودہ از ص ۱۶۵ تا ص ۱۶۹، مطبوعہ از ص ۱۶۸ تا ۱۷۱) ”فتوے عظیم“ والی بحث اخیر تک درج ہے۔ اور پھر ”علامہ کی کتاب انتاع العظیم کے بارے میں چند گزارشات“ کے عنوان سے ”خیر آبادیات“ (مسودہ از ص ۱۶۱ تا ۱۶۳، مطبوعہ از ص ۱۶۳ تا ۱۶۷) کی ”رسالہ انتاع العظیم“ والی مکمل بحث نقل ہے۔

”خیر آبادیات“ کے مندرجات پر چند اشکالات پیش آئے، جن کا حل راقم نے اس خط کے ذریعے استفسار کیا:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

حضرت! آپ نے اپنی بے پناہ معروضیات کے باوجود جس فراخ دلی سے میری گزارش کو اہمیت دی ہے اور اتنی جلد اسے قیمتی مواد کی فراہمی کو ممکن بنایا ہے۔ میں آپ کی اس بندہ نوازی کو کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ ہر وقت دعا گو ہوں کہ اللہ کریم اپنے نیک بندوں کے طفیل آپ کے اخلاص عظیم کو آپ کے لیے دنیا و آخرت میں کفارہ تقصیرات بنائے۔

حضرت! ایک بات مجھے ٹھنک رہی ہے کہ ”انتاع العظیم“ کے متعلق آپ نے لکھا:

”(خارجی دلیل:) یہ رسالہ علامہ کے شاگرد مولانا ہدایت اللہ رامپوری کے نام سے منظر عام پر آیا تھا۔“

۱۔ کیا انتاع العظیم کی کوئی اشاعت مولانا ہدایت اللہ رامپوری کے نام سے بھی ہو چکی ہے؟

۲۔ سلمہ سیہول صاحبہ نے اپنی کتاب میں انتاع العظیم کو ایک جگہ ”علامہ کے ایک شاگرد (نام نہیں دیا)“ کی تصنیف بتایا ہے اور دوسری جگہ ”غالباً مولانا ہدایت اللہ رامپوری“ لکھا

ہے اور اب اُن کا کہنا یہ ہے کہ یہ مولانا ہدایت اللہ کی بھی تصنیف نہیں ہے، بل کہ کسی اور کی ہے (جن کا نام انھیں اُس وقت متحضر نہیں تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے اپنے کاغذات میں لکھ رکھا ہے، فرصت ملنے پر بتادیں گی)۔

اس مقدمہ کے پیش نظر میری گزارش یہ ہے کہ کیا جیسے اس کتاب پر مولانا ہدایت اللہ صاحب کی تصنیف کا شبہ کیا جا رہا ہے، کیا حضرت علامہ کے کسی اور شاگرد کی طرف بھی اس شک کا رخ ہو سکتا ہے؟

۳۔ ”علامہ کی کتاب اقتناع العظیم کے بارے میں چند گزارشات“ والا مضمون جہاں سے شروع ہو رہا ہے وہاں آپ نے یہ لکھا ہے:

”حیدر علی ٹوکی کے سابق الذکر رسالے کے جواب میں خود علامہ نے قلم اٹھایا، اور رسالہ ”اقتناع العظیم“ تصنیف کیا۔“

کیا یہ رسالہ یا اس کا نام دریافت ہوا ہے؟ باقی، حضرت آپ نے جو علامہ سید محمد سلیمان اشرف صاحب کے حوالے سے اور کتاب کے اسلوبی نقطہ نظر سے جو غوس شواہد اکٹھے کیے ہیں، اُن سے اس کتاب کا علامہ فضل حق خیر آبادی کی تصنیف ہونا سو فی صد ثابت ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمر میں برکتیں عطا فرمائے۔

آپ کی کتاب ”خیر آبادیات“ انڈیا میں چھپ چکی ہے؟ اور پاکستان میں کب اور کہاں سے چھپے گی؟

جواب کا منتظر

محمد رضا الحسن قادری

آپ نے کمال شفقت فرماتے ہوئے اس کا تفصیلی جواب مرحمت فرمایا:

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

راقم کے ناقص خیال میں اقتناع العظیم کی پہلی اشاعت وہی ہے جو مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے کی ہے، اس سے پہلے اس کی اشاعت کا کوئی ثبوت میری نظر سے نہیں گزرا، میں نے جو یہ لکھا ہے کہ ”منظر عام آیا“ اس سے مراد طبعیت

نہیں ہے بلکہ اس زمانے میں کسی کتاب کے منظر عام پر آنے کا مطلب یہی تھا کہ کتاب کے قلمی نسخے منظر عام پر آئے اور اس کی شہرت ہوئی، اقتناع العظیم مولانا ہدایت اللہ رامپوری کے علاوہ کسی اور شاگرد کے نام سے منسوب ہوئی تھی اس کا مجھے علم نہیں، اگر محترمہ سلمہ صاحبہ یہ کہہ رہی ہیں تو ضرور ان کے پاس اس کی کوئی مضبوط بنیاد ضرور ہوگی، مگر علامہ کے ہاتھ کا اصل نسخہ مولانا ہدایت اللہ صاحب کے پاس ہوتا اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ مولانا ہدایت اللہ ہی کے نام سے مشہور ہوئی ہوگی، واللہ اعلم۔

تحقیق الفتویٰ کے جواب میں حیدر علی ٹوکی نے جو رسالہ لکھا تھا وہ آج تک نظر سے نہیں گزرا اور نہ اس کا نام معلوم ہوا، حکیم محمود احمد برکاتی صاحب نے سید حیدر علی ٹوکی کے اس رسالے کا نام ”صيانة الاناس من وسوسة الحساس“ تحریر کیا ہے، ان کے اجراع میں بعد کے بہت سے اہل قلم نے بھی یہی لکھ دیا، مگر یہ درست نہیں ہے، صيانة الاناس علامہ فضل حق کی تحقیق الفتویٰ کے جواب میں نہیں، بلکہ مولانا شاہ فضل رسول بدایونی کی کتاب فصل الخطاب (مقولات عشر) کے جواب میں لکھی گئی تھی، جو فخر المطالع دہلی سے ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوئی۔

مولانا شاہ عبدالصمد سہوانی (وفات: ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید حیدر علی ٹوکی نے تحقیق الفتویٰ کے جواب میں دو رسالے لکھے تھے، ایک مختصر جس کا جواب بدایوں سے دیا گیا اور دوسرا قدرے تفصیلی جس کا جواب مولانا عبدالحق کانپوری نے دیا، لکھتے ہیں:

بعد مدت دراز مولوی حیدر علی نے ایک رسالہ مختصر و مفید بنام نہاد جواب تحقیق الفتویٰ کے لکھا کہ وہ رسالہ بتوسط منشی اظہار حسین صاحب سہوانی کے بدایوں میں پہنچا اور جواب اس کا لکھا گیا کہ بتوسط اہل سہوان مولوی حیدر علی کے پاس پہنچا اور انہوں نے جواب اس کا تو نہ لکھا مگر بعد مدت پھر تحقیق الفتویٰ کا جواب کبیر لکھا اور اس میں اکثر اعتراضات مولوی

فضل حق صاحب سے کلام مولوی اسماعیل پرسکوت کیا چند اعتراضوں کا جواب پریشان دیا، مولوی عبدالحق صاحب بن شاہ عبدالرسول صاحب کانپوری تلمیذ مولوی فضل حق صاحب نے اس کا جواب نہایت سبط کے ساتھ لکھا، اس کا جواب بھی مولوی حیدر علی یا ان کے اتباع سے نہ ہو سکا۔

(افادات ص ۲۰/۱۹ ص ۲۰/۱۹)
سید حیدر علی ٹوکی کے رسالہ صغیرہ کے جواب میں بدایوں سے جو رسالہ لکھا گیا تھا اس کا مخطوطہ کتب خانہ قادریہ میں محفوظ ہے، یہ فارسی میں ۳۱ راویق (۸۱ صفحات) کا رسالہ ہے، اس پر مصنف کا نام درج نہیں ہے، اسلوب تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ مولانا شاہ فضل رسول بدایونی کا ہے، اگرچہ رسم الخط آپ کا نہیں ہے، حمد و صلاۃ کے بعد مصنف رسالہ لکھتے ہیں

ترجمہ: برادر صاحب گرامی مرتبت اعز و ارشد نور العین شیخ اظہار حسین (اسعدہ اللہ فی الدارين)
بعد سلام مسنون، فاضل کامل رأس المدققین سند الحقیقین لوزی اعلیٰ مولوی حیدر علی رامپوری زاد افاداتی کہ وہ تحریر خاکسار کو عنایت کی جو اُس فتوے کے رد میں ہے جو امام زماں فرید دوراں الاستاذ المطلق مولوی فضل حق ازواد برکاتہ کی فکر صامت اور ذہن خائب کا نتیجہ ہے، جو انہوں نے شفاعت کے بیان میں تقویت الایمان کی ایک عبارت کے متعلق دیا تھا، جو کچھ میری شکستہ خیال میں آیا اس کے اظہار کا اصرار کیا گیا، تو حال یہ ہے کہ مولوی فضل حق صاحب علمی کمالات کی جامعیت اور ازاول تا آخر علوم عقلیہ و نقلیہ کے احاطہ میں اس زمانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے الا، شاء اللہ، جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ہے وہ یہی ہے باقی پوشیدہ باتوں کو تو اللہ ہی جانتا ہے، اُس زمانے میں کہ جب انہوں نے یہ فتویٰ لکھا تھا اس فرقے کے ارکان اور اس طائفے کے اعیان جو اس کے شروع کرنے والے اور ہانی مہانی تھے وہ خود موجود تھے، انہوں نے (اس فتوے کی وجہ سے) کیا کیا رنج نہ اٹھائے اور کیا کیا بیچ و تاب نہ

کھایا، اور کتنا جگر خون نہ کیا مگر مقابلے کی تاب نہ لا کر ساکت ہو گئے، الخ۔ (رسالہ تردید حیدر علی ٹوکی قلمی، ص: ۱)
(خیر آبادیات، ص: ۱۶۰/۱۶۱)

”خیر آبادیات“ ابھی شائع نہیں ہوئی ہے، دو تین حضرات سے اس پر تاثرات لکھوا نا ہے، ان کے پاس گئی ہوئی ہے، ان شاء اللہ رمضان کے آخری نصف میں آجائے گی، پاکستان میں بھی اشاعت جلد ہی ہوگی۔

دعا میں یاد رکھیں، میں آپ سے واقف نہیں ہوں، محض اسلام و سمیت کے رشتے کی وجہ سے یہ تعاون کر رہا ہوں، اس کے بدلے دعائے خیر کے علاوہ آپ سے اور کچھ نہیں چاہتا۔

نقد

سید الحق قادری

اس آخری پیرے پر غور فرمائیں! خلوص لوجہ اللہ اور دین کا کتنا اُجلا، اعلیٰ اور پیارا نمونہ ہے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء یوم الجزاء۔

تیسرا رابطہ آپ کی تازہ طبع یافتہ کتاب ”عربی محاورات“ سے ہوا۔ راقم نے حضرت سے اس کتاب کو پاکستان میں اپنی زیر نگرانی چھپوانے کے لیے لکھا اور ساتھ ہی کتاب کی رائٹنگ کے متعلق پوچھا تو آپ نے کتاب کا مختصر تعارف اور اس پر اہل علم کے تاثرات نقل کر کے بھیج دیے۔ اس کے آخر میں یہ نوٹ بھی تھا:

”اگر آپ کتاب شائع کرنا چاہتے ہیں تو میں خوشی سے اس کی اجازت دیتا ہوں، میرے والد محترم فرماتے ہیں کہ بیٹا ہم لوگ علم کے خادم ہیں، کتب فروش نہیں، لہذا کتاب کی اشاعت سے مجھے رائٹنگ وغیرہ کی طلب بھی نہیں ہے، اس کتاب سے اگر طلبہ فائدہ اٹھالیں تو یہی میری کمائی ہے، باقی رہا مالی معاف تو گزارش ہے کہ اس کو آئندہ اور کسی مفید کتاب کی اشاعت میں لگا دیں۔“

کتاب میں کسی قسم کا تہدیل یا آپ کا حق نہیں ہوگا، جس طرح انڈیا میں شائع ہو رہی ہے بالکل ویسا ہی شائع کریں، جام نور کے پاکستانی ایڈیشن میں ہم کتاب کا اشتہار شائع کروادیں

گئے۔ اگر آپ تیار ہوں تو میں کتاب آپ کی خدمت میں ارسال کروں؟

نقطہ

اسید الحق قادری

جواباً اس ناچیز نے یہ حریضہ لکھا:

”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولائی شیخ اسید الحق صاحب تحقیق علمہ!

آپ کا نیاز نامہ پڑھ کر قلبی سکینت حاصل ہوئی۔ آپ مجھ بیچ میرز کے ساتھ جو معاملہ فرماتے ہیں (یقیناً اوروں کے ساتھ بھی آپ کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہوگا)، واقعی اگر اس میں للہیت اور آپ کا بڑا اپن شامل نہ ہو تو شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ میں ہمہ دم اللہ رب العزت سے آپ کے حق میں خیر کا طالب ہوں۔

آپ نے کتاب کا مختصر تعارف اور مثلاً ایک محاورہ بھی منقول کیا، اس سے کتاب کے اسلوب سے واقفیت تو ہوئی، مگر اس کے محققیات سے دل چسپی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ماشاء اللہ آپ جیسے لوگ جس موضوع کو ہاتھ ڈالیں گے، اس سے کما حقہ نباہ کریں گے اور سچی بات یہ ہے کہ نتائج ہماری توقعات سے بہت آگے کے ہوتے ہیں۔

آپ نے میری گزارش کی قدر فرمائی اور اس پر مزید کرم کہ رائلٹی وغیرہ کی قید سے آزاد کر دیا؛ اس فراخ دلی پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ لیکن میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ جب کبھی پاکستان تشریف لائیں گے تو میں آپ کو آپ کے حسب منشا کچھ نہ کچھ عسی مود (جو میری استطاعت میں ہو) فراہم کر دوں جو سب میری بہ خوشی رائلٹی کے علاوہ ہوگا۔

کتاب میں تہذیبی کے حوالے سے آپ کا فرمانا بالکل جائز ہے کہ متن میں آپ کے علاوہ کوئی شخص آپ کی بلا اجازت تغیر نہیں کر سکتا، لیکن حضرت! آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ”جس طرح اٹھایا میں شائع ہو رہی ہے بالکل ویسا ہی شائع کریں“ اس میں میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ میں جو کتابیں اب تک کمپوزنگ میں چھاپ چکا ہوں، ان میں میں نے بیچ سائز، فونٹ سائز، لائن سپیس وغیرہ کی

مقداریں مخصوص کی ہوئی ہیں۔

مثلاً بیچ سائز: 7.25x4.25 فونٹ سائز: 15، لائن سپیس:

21.7 اور انہی کے مطابق سرخیوں کے مختلف سائز مقرر کر رکھے ہیں۔

۲۔ میرے پاس بنوارد کمپوزنگ کا پروگرام ہے اس میں صلی اللہ علیہ وسلم، رحمۃ اللہ علیہ، رضی اللہ عنہ وغیرہ دعائیہ جملے طغروں کی شکل میں ہیں جو جگہ بھی کم گھیرتے ہیں۔

۳۔ مجھے تحریر میں بہ طور خاص املا کی ہارکیوں اور محاسن کو اُجاگر کرنے کا شوق ہے۔ اس میں کئی طرح کی چیزیں ہیں۔ مثلاً: چاہئے کو چاہیے، لئے کو لیے، کئے کو کیے وغیرہ..... الفاظ کو الگ الگ کر کے لکھنا۔ جیسے کیونکہ کو کیوں کہ، بزبان کو بہ زبان، ذیشان کو ذی شان وغیرہ..... کئی عام غلطیاں جو اب غلطیاں کبھی ہی نہیں جاتیں جیسے مع: اس کو عموماً بمع بھی لکھتے ہیں اور خوردنوش: اس کو خوردنوش پڑھتے ہیں۔ اش اش کرتا: اسے عیش عیش کہتے ہیں وغیرہ..... پھر کچھ الفاظ کے املا میں کوتاہی ہوتی ہے جیسے قراءت کو قرأت، مرآت کو مرأت (مرآۃ الگ ہے) اور اسی طرح توجیہ کو توجیہ اور تشبیہ کو تشبیہ وغیرہ۔

یہ ساری باتیں میں نے وضاحتاً اس لیے لکھ دیں کہ آپ مکمل اطمینان رہے اور یقیناً آپ کی دل چسپی بھی بڑھی ہوگی۔ انب کا موم سے لازماً کتاب کے حسن میں اضافہ ہوگا اور یہ سارا کام میں خود کرتا ہوں۔ یہ بھی پریشانی نہیں ہوتی کہ کسی انازی کمپوزنگ کو کام دیا ہے، کہیں وہ خرابی پیدا نہ کرے۔ اُمید ہے کہ آپ میری اس چھوٹی سی گزارش کو بخشن کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ خوشتر نورانی صاحب کی کتاب میں بھی ان تمام امور کا التزام کیا گیا ہے۔

آپ مجھے کتاب بھیج دیں۔ میں تقریباً ایک ڈیڑھ ہفتے میں اپنے جو کام شروع کر رکھے ہیں ان سے فارغ ہو جاؤں گا تو فوراً آپ کی کتاب پر کام شروع کروں گا۔ اللہ خیر فرمائے تو اس ماہ کے آخر میں، نہیں تو اگلے مہینے کی ابتدا میں ہی بفضلہ تعالیٰ کتاب چھپ جائے گی۔ نیاز مند

محمد رضا الحسن قادری

اس کے بعد آپ کا یہ خط ملا:

”محترمی..... السلام علیکم

آپ کا جواب پڑھ لیا، شکریہ، املا کے سلسلے میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں وہ پسند آئیں، ان میں سے اکثر کی پابندی میں خود کرتا ہوں، مثلاً چاہیے، لیے اور کیوں کہ وغیرہ۔ پھر بھی آپ اپنے ذوق کی تسکین کر لیں اور جہاں املا تبدیل کرنا چاہیں کر لیں، مگر عربی عبارات کو دیباہی رہنے دیں۔

کتاب کا مسودہ حاضر خدمت ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ مسودہ آپ کسی کو بیل نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کو کاپی کر کے دیں گے، آپ کو یہ شرط شاید غیر ضروری معلوم ہو مگر مجھے اس سلسلے میں کئی سخت تجربے ہو چکے ہیں اس لیے احتیاط کرتا ہوں، کتاب کی اشاعت سے قبل میں کسی کو بھی کتاب کا مسودہ نہیں دیتا ہوں۔

کتاب کے آخر میں جو تاج الحول اکیڈمی کی مطبوعات کی فہرست ہے اسے نکال دیں، تعارف مصنف اگر باقی رہے تو کوئی حرج نہیں اور اگر چاہیں تو اس کو بھی نکال دیں مجھے اعتراض نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو چند سطروں میں ایک ابتدائی پاکستانی ایڈیشن کے لیے لکھ دوں، جس میں آپ کے لکھے ہوئے کتاب کی اشاعت کی اجازت بھی ہو۔

ڈاکٹر عظیم اشرف جاسی صاحب کی تقریظ میں نے کتاب کے بیک ٹائٹل پر دی ہے، آپ بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں، اور اگر کوئی دشواری ہو تو ڈاکٹر مصطفیٰ شریف صاحب کی تقریظ کے بعد کتاب میں شامل کر لیں، فہرست میں نام ہو گا۔

جام نور کے آئندہ شمارے میں ہندوستانی اور پاکستانی دونوں ایڈیشنز کا اشتہار دے دیا جائے گا۔

کتاب حاضر ہے، مطالعہ کریں اور اپنی رائے سے نوازیں۔

مخلص

اسید الحق قادری

حضرت نے یہ بھی حکم فرمایا تھا کہ کتاب چھپنے کے بعد پاکستان

میں چند حضرات کو کتاب کا ایک ایک نسخہ بھجوا دیا جائے۔

بھگواندے تعالیٰ ”عربی محاورات“ اس ناچیز کی سستی سے پاکستان میں مکتبہ بہار شریعت، لاہور سے رجب ۱۴۳۳ھ / مئی ۲۰۱۲ء میں چھپی۔ لیکن ناشر کو مذکورہ حضرات تک کتاب پہنچانے کی ہمت و توفیق نہیں ہوئی۔ کتاب کی طباعت کے بعد مصنف سے معلوم ہوا کہ مولانا رابع حسنی ندوی (دائر العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)، مولانا سعید اعظمی ندوی (مدیر مجلہ ”الجمیع الاسلامی“) اور مولانا وثیق ندوی (صدر شعبہ عربی) کتاب کے پہلے ایڈیشن پر تاثرات لکھے تھے جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکے۔

دسمبر ۲۰۱۲ء میں ناچیز نے اپنے ادارے سے ”دفاع سیدنا امیر معاویہ“ کے نام سے اکابر علماء اہل سنت کے رسائل کا مجموعہ چھاپنے کا ارادہ کیا، جس میں شیخ محمد حیات سندھی کا ”رسالہ فی فضل معاویہ“، علامہ عبدالعزیز پرہاروی کا ”النابیہ عن طعن امیر المومنین معاویہ“، مولانا عبدالرشید تھنکو کی رحیم اللہ کا ”حضرت سیدنا امیر معاویہ کے بارے کیے گئے چند سوالات کے جوابات“ اور پیر سائیں غلام رسول قاسمی کا ”صافہ لما وقع بین علی و معاویہ“ کے علاوہ تاج الحول حضرت شاہ عبد القادر بدایونی رحمہ اللہ کا مصنفہ رسالہ ”تصحیح العقیدہ فی باب امیر معاویہ“ بھی شامل ہونا تھا، چنانچہ حضرت الشیخ سے گزارش کی گئی کہ تاج الحول اکیڈمی، بدایوں سے اس کی اس رسالے کی جو اشاعت ہوئی ہے اور اس پر آپ نے پیش لفظ لکھا ہے اس کی کمپوزنگ فائل بھیج دی جائے۔ آپ نے اپنی عادت کے مطابق شفقت فرماتے ہوئے وہ فائل بھیج دی جسے مجموعہ رسائل میں شامل کر لیا گیا۔ پانچ رسائل کا یہ مجموعہ راقم کی ترتیب اور کتر العلماء حضرت ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی صاحب کے تحت الاشراف صفر ۱۴۳۳ھ / جنوری ۲۰۱۳ء میں شائع کیا گیا۔ اس سلسلے کی اگلی جلد ان شاء اللہ اسی سال آ رہی ہے جس میں حسب سابق اسلاف علماء کے نایاب رسائل شامل ہوں گے۔

سال ۲۰۱۲ء میں دائر الاسلام نے اعتقادات اسلام کے سلسلے میں عقائد اسلامیہ سنیہ حنفیہ ماتریدیہ کے متون تحقیق و ترجمہ کے ساتھ شائع کرنے کا وسیع و وسیع منصوبہ بنایا۔ اس میں کثیر تعداد میں ائمہ اسلام اہل سنت کے مصنفات متون کو شامل کیا گیا۔ انہی دنوں ”فیس بک“ پر حضرت تاج الحول کے رسالہ ”احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام“

مترجمہ مولانا دشا احمد قادری یہ نام ”اسلام کے بنیادی عقائد“ مطبوعہ تاج الحق لائبریری کی نائٹل نظر پڑا جو حضرت اُسید الحق مرحوم نے اپنے اکاؤنٹ سے شیئر کیا تھا۔ چنانچہ رابطہ قائم کیا گیا اور اعتقادات کے مذکورہ منصوبے کا تعارف کرایا گیا اور رسالہ حاصل کرنے کی عرض کی گئی۔ آں جناب نے کرم فرماتے ہوئے رسالہ کی کمپوزنگ ارسال فرمادی۔ حضرت عزوجل کے لطف و کرم سے یہ رسالہ انوار الاسلام، چشتیان شریف (بہاول نگر) سے ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ / جنوری ۲۰۱۳ء میں قاری محمد عبداللہ حنفی عرفانی نے بہ تعاون قاری محمد ظفر اقبال مظہری نے شائع کیا۔

پاکستان میں کچھ عرصے سے مولود ناموں کے مجموعے چھپ رہے ہیں۔ اس وقت تک مختلف حضرات کے مرتبہ ایک درجن سے زائد مجموعہ ہائے رسائل چھپ چکے ہیں جن میں سوسے بھی زیادہ میلاد نامے (بہ شرط صحت) محفوظ ہو چکے ہیں۔ چند سال قبل حضرت سیف اللہ مسعود شاہ فضل رسول بدایونی رحمہ اللہ کا ”مولود منظوم“ کے قدیم نسخہ کا عکس انکم لائبریری کی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا تھا۔ بعد میں تاج الحق لائبریری کی فہرست کو دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہ مولود نامہ بدایونی سے ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ / دسمبر ۲۰۰۹ء میں چھپ چکا ہے۔ دو سال پہلے محترم صلاح الدین سعیدی صاحب نے راقم سے منگوانے کا کہا تھا، وہ اپنے زیر ترتیب مجموعہ رسائل میں اسے شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن وقت کی کمی کے باعث ناچیز حاصل نہ کر سکا اور ان کا مجموعہ رسائل بھی چھپ گیا۔ پچھلے سال محترمی میثم عباس رضوی صاحب نے بھی نادرد نایاب رسائل میلاد ترتیب دیے لیکن ان رسائل کا خصوصی موضوع منکرین میلاد (دوبابہ) پر رد و قدح بھی ہے، چنانچہ حضرت اُسید صاحب سے درخواست کی گئی کہ مولود نامہ مذکور کی فائل ہمیں ای میل کر دیں۔ آپ نے فائل بھیج دی اور یہ ”میلاد مصطفیٰ قرآن وحدیث کی روشنی میں“ میں شامل ہو کر صفر ۱۴۳۵ھ / دسمبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

اقبال کتب و رسائل کی اشاعت کے بعد تو تاج الحق لائبریری سے جو بھی نئی کتب چھپتی ناچیز بل جھپک فون یا ای میل کے ذریعہ حضرت سے رابطہ کرتا اور مطلوبہ کتاب کی منگوائی کرتا۔ کئی کتب کی مجلس مشاورت میں حضرت الشیخ مولانا اُسید الحق قادری کا نام شامل رہا۔ آپ کے قیمتی آراء سے روشنی حاصل کرتے ہوئے دائرہ الاسلام نے کام یابی اور ترقی کی

کئی منازل طے کی ہیں۔ اعطاه اللہ مقامہ فی اعلیٰ علیین۔
دو برس ایام پاکستان کے کونوں کھدروں میں فرقہ تفضیلیہ کے جراثیم کافی تیزی سے پرورش پا رہے ہیں اور کافی ہاتھ پاؤں بھی رہنے لگے ہیں۔ اپنی شرم ناک سرگرمیوں کے باعث اعتقادی طور پر تو وہ اہل سنت کے لیے نقصان دہ ہیں ہی، مزید یہ کہ وہ اپنے مطلب کے لیے دو نبرہ سنوں (اہل سنت و آل جماعت) کو بھی استعمال کر رہے ہیں۔ پچھلے سال ایک تفضیلی ادارے مکتبہ اہل بیت اطہار، لاہور نے ایک برائے نام سنی سید مہر حسین شاہ بخاری کا رسالہ ”القول المقبول فی مدح اولاد الرسول“ شائع کیا جو عرب کے مشہور شاعر فرزدق کے ایام زین العابدین رحمہ اللہ کی شان میں لکھے ہوئے قصیدہ ترجمہ ہے۔ تفضیلی حضرات کو یہ بہت بڑی فضا دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہل بیت کا اگوتا وارث سمجھتے ہیں، حالاں کہ ان کے پاس صرف یہی ایک موضوع ہے اور انھیں اُس پر بھی کما حقہ کام کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ فرزدق حبشی (متوفی ۱۱۰ھ) کے اسی قصیدہ مصمبہ کی بابت حضرت اُسید الحق رحمہ اللہ کا ایک مضمون ”جام نور“ کے اگست ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ راقم نے اس کے لیے حضرت سے رابطہ کیا تو آپ نے اپنے مضمون ارسال کر دیا۔ جب مضمون میرے پاس پہنچا اور میں نے اُسے پڑھا تو بے حد حیران ہوا کہ اس مختصر سے قصیدے کے بارے میں اتنی کثیر معلومات! سبحان اللہ! ایسا لگا کہ ”القول المقبول“ کی اس مضمون کے سامنے کچھ حیثیت نہیں ہے، اور پھر تفضیلی حضرات کا اس پر اتنا ناخفت عقل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ مضمون بہ جاے خود ایک کتابچہ تھا، خیال ہوا کہ اسے کتابی صورت میں منظر عام پر لانا چاہیے۔ حضرت عالی مرتبت مرحوم سے فرمائش کی گئی، ناچیز کے کہنے پر آپ نے اس میں کچھ اضافات فرمائے اور میرے ہی مشورے پر ڈاکٹر ممتاز احمد سعیدی ازہری صاحب سے تقریظ لکھوائی گئی۔ اس صورت حال کا تذکرہ اور خاک سار کے لیے دواؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار حضرت نے ابتداً یہ میں یوں کیا ہے:

”کچھ ماہ قبل لاہور کے ایک فعال اور بلند حوصلہ نوجوان جناب محمد رضوان الحسن قادری (مالک مکتبہ دار الاسلام، لاہور) نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مذکورہ مضمون کتابچے کی شکل میں اپنے مکتبے سے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے بہ خوش اجازت

کے ساتھ مضمون کی سافٹ کاپی بھی ان کی خدمت میں بھیج دی، انھوں نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اس پر گرامی قدر مولانا ڈاکٹر ممتاز احمد سعیدی ازہری سے تقریظ لکھوائیں، میں نے یہ تجویز بھی بہ خوش منظور کر لی، کیوں کہ عربی شعر و ادب اور اس کی تاریخ کمری ممتاز صاحب کا خاص موضوع ہے، وہ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں اور ازہر شریف کے رشتے سے میرے سہیل اور بڑے بھائی ہیں۔ رضوان الحسن صاحب نے ممتاز صاحب سے تقریظ حاصل کر کے کتاب اشاعت کے لیے تیار کر لی، لیکن کسی وجہ سے اُس وقت اس کی اشاعت عمل میں نہیں آ سکی..... جناب محمد رضوان الحسن صاحب اب دوبارہ مستعد ہو گئے ہیں اور عن قریب یہ کتاب لاہور سے بھی شائع ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔“

الحمد للہ یہ قصیدہ تاج الحق لائبریری بدایوں سے محرم ۱۴۳۵ھ / نومبر ۲۰۱۳ء میں اور دائرہ الاسلام لاہور سے موسوم بہ ”مدح اہل بیت العابدین رحمہم اللہ“ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ / جنوری ۲۰۱۳ء کو چھپ گیا۔ ”تذکرہ لوری“: قاضی غلام شہر قادری بدایونی اور ”قصیدتان راکتان“: اعلیٰ حضرت، امام احمد رضا خان بریلوی بھی جیسے ہی شائع ہوئے اور ان دونوں کے سرورق Facebook پر نمودار ہوئے، حضرت سے رابطہ کر کے ان کی ان بیج فائلز منگوائی گئیں، یکے بعد دیگرے ان کی فائلز موصول ہوئیں۔ ان کے ملتے ہی ٹریننگ پیپر پر نکال کر ناشرین کے سپرد کر دیا گیا۔ ان شاء اللہ الرحمن اقول الذکر کتاب نور یہ رضویہ پبلشنگ کمپنی (دار النور)، لاہور اور آخر الذکر کتب خانہ امام احمد رضا، لاہور سے چھپ کر منظر عام پر آنے والی ہیں۔ خدا کرے ان کے اسباب جلد مہیا ہوں۔

سال گزشتہ میں ”اکمل التاریخ“، مولانا ضیاء القادری بدایونی کی بابوں میں اشاعت کی خبر ملی، ناچیز کے پاس اس کے حصہ اول کا قدیم نسخہ وجود تھا جس میں حضرت شاہ فضل رسول بدایونی رحمہ اللہ کے تذکرہ کے ضمن میں ڈیڑھ صد صلہ و فضلاً کا تذکرہ بھی آ گیا تھا۔ اُس کی اشاعت نو کی خبر سننے ہی منہ میں پانی بھرا آیا۔ فون پر رابطہ کیا اور کتاب کو پاکستان میں اپنے ادارے سے طبع و نشر کرنے کی اجازت چاہی اور فائل بھیجے گا

تقاضا کیا۔ ارشاد فرمایا کہ مطبوعہ ایڈیشن میں کچھ تصحیحات ہونا باقی ہیں، جیسے ہی کام مکمل ہوگا، کتاب بھیج دی جائے گی۔ ساتھ ہی حضرت نے یہ بھی استفسار فرمایا کہ پاکستان میں اس ضخامت کی کتاب چھاپنے پر کتنی لاگت آتی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضور! آپ کی کتاب ”عربی محاورات“ جو کہ اس سے نصف ہے اُس پر قریباً ۸۰ روپے خرچ آیا تھا، ”اکمل التاریخ“ کا آپ دو گنا کر لیجیے۔ معارفم نے یہ بھی عرض کیا کہ قبلہ آپ کی جانب سے ہمیں اتنی قیمتی کتاب تحقیق اور کمپوزنگ اور تصحیح کے ساتھ مل رہی ہے، یہ آپ کا ہمارے ساتھ کیا کم تعاون ہے؟ بہ صورت رقم تعاون کی آپ ہرگز زحمت نہ فرمائیے! اس پر آپ نے جو الفاظ فرمائے وہ میرے لیے سرمایہ دنیا دہی ہیں۔ فرمائے لگے:

”آپ لوگ اتنے کٹھن حالات میں نایاب علمی کتب کی اشاعت کے لیے کوشش کر رہے ہیں، ایسی کوئی بھی کتاب چھاپنا بہت بڑا امتحان ہوتا ہے اور ان کی نکاسی اس سے بھی زیادہ جان جو حکم کا کام ہے، خصوصاً وہ کتاب جو کسی ایک خانوادے کے تذکرے پر مشتمل ہو، اُس کے قارئین کا حلقہ اور زیادہ محدود ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ کتاب ہمارے خاندان کے متعلق لکھی گئی ہے اس لیے اس کی اشاعت میں آپ سے مالی تعاون کرنا ہمارا حق بنتا ہے۔ کراچی میں ہمارے کچھ ارادت مند ارباب ثروت ہیں، اُن سے میں کہوں گا تو وہ آپ سے ربط پیدا کر لیں گے اور آپ اُس ایڈیشن کو چھاپ کر مخصوص تعداد کے وہ نسخے پاکستان کے اہل علم و قلم تک اور لائبریریوں میں نیز محلات میں تبرہ کے لیے بھجوا دیں گے۔ (بہ لفظ آں بہ قدر حفظ)

ناچیز نے اس فرمانی شای پر سر تسلیم خم کر دیا۔ کئی ماہ کام کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ اس عرصہ میں جب بھی فون پر یا ای میل پر رابطہ ہوا، راقم استفسار کرتا رہا۔ ۱۴ فروری کو حضرت کی جو آخری ای میل آئی اُس کے الفاظ یہ تھے:

”اکمل التاریخ میں ابھی کچھ کام ہے، فی الحال اُس (قصیدہ مصمبہ) کو شائع فرمائیں۔“
انہی دنوں بندہ نے ایک صفحہ پر یادداشت کے لیے ”اکمل التاریخ“

کے علاوہ ”حدیث افتراق امت“، ”مولانا فیض احمد بدایونی“ (ڈاکٹر ایوب قادری) پر آپ کا مقدمہ اور تاج الخول اکیڈمی کی ۲۰۱۰ء کی فہرست کتب کے مطابق زیر طبع کتب ”در بار حق و ہدایت“، مرتبہ: قاضی عبد الوحید فردوسی، ”قولہ سدید“ (روحانی معاد و یزید): مولانا ضیا احمد صدیقی بدایونی اور حضرت سیف اللہ المسلمول کی غیر مطلوبہ کتب کے نام لکھے تھے اور ”مولود منظوم“ (مع انتخاب نعت و مناقب): حضرت سیف اللہ المسلمول، ترتیب و تقدیم: مولانا اسید الحق قادری، ”دیوان تاج الخول“ پر فہرست میں ہی نشانات لگائے تھے، ارادہ یہ تھا کہ ان میں سے جو کتب بدایوں میں چھپ چکی ہیں وہ ابھی منگوائی جائیں اور جوں جوں باقی رسائل اور کتابیں چھپتی جائیں تو ان منگوائی جاتی رہیں۔ اوسر ”برکات مارہرہ“: مولوی طفیل احمد صدیقی بدایونی، ”تذکرہ شمس مارہرہ“: مولانا اسید الحق قادری، ”تسمیہ الخلق“ اور ”آداب السالکین“: حضرت شاہ آل احمد اچھے میاں مارہروی، مجھے خانقاہ قادریہ کے ایڈریس سے ای میل میں آئی تھیں اور فیس بک پر بھی ان کے ٹائٹل دیکھے تھے، ان کے نام بھی راقم نے اسی صفحہ پر نوٹ کر لیے۔ یہ صفحہ میرے کمپیوٹر کے پاس رکھا رہتا اور روزانہ کئی بار اس پر نظر ڈھرتی اور ہر روز ان کتابوں کے نام کئی مرتبہ میرے ذہن نشین ہوتے رہتے۔ کئی دن بیت چکے تھے کہ حضرت سے بات نہیں ہوئی تھی، سوچا آج فون کر لوں..... پھر سوچا آج نہیں یار، پھر کسی دن سہی..... دوسرے روز خیال آیا..... آج کرنا چاہیے..... اچھا، آج بھی نہیں..... چلو، کوئی بات نہیں..... دو تین دن بعد دل چاہا کہ آج تو رابطہ کرنا ہے..... اور ضرور کرنا ہے..... ٹھیک ہے..... یہ منگل کا دن ہے، عصر کا وقت ہے اور وہ بھی ختم ہونے کو ہے، پتہ نہیں وہاں کیا نام ہو رہا ہوگا، کہیں نماز کا وقت نہ ہو..... اوہ ہو، بھی اڑائی تو کرو! کوئی حرج نہیں..... نمبر نکالا، ڈائل کیا، ساتھ ہی منقطع کر دیا..... چلو، چھوڑو، ایک گھنٹے بعد رابطہ کر لینا..... مارکیٹ سے گھر کا رخ کیا..... راستے میں اذان مغرب ہوئی..... نماز سے فارغ ہو کر گھر پہنچا..... کھانا کھایا..... اور خیال ہی خیال میں یہ منصوبہ بنا رہا تھا کہ ابھی حضرت کو فون کرنا ہے اور یہ یہ معروضات پیش کرنی ہیں..... ابھی چند لمحے بھی نہ بیتے تھے کہ موبائل پر SMS کی گھنٹی بجی۔ موبائل ہاتھ میں تھا..... میسج کھولا، یہ ہمارے دوست جناب ثقب رضا قادری صاحب کا میسج تھا..... لکھا تھا:

”اہل سنت کا بہت بڑا نقصان۔“

حیرت و استعجاب اور سناٹے کے عالم میں بقیہ میسج پڑھنے کے لیے نیچے کیا تو شیخ اسید الحق ہی کا نام لکھا تھا۔ آپ کا نام پڑھتے ہی ایسے لگا جیسے میری اپنی جان نکلے گی ہو۔ دل سے صدا آنے لگی: کیا ہو گیا؟ خدا خیر کرے! اللہ قدم قدم پر ان کی حفاظت کرے!..... پل بھر میں بہت سے خطرات و حوادث دماغ میں چکرانے لگے..... ہاتھ پھرانے لگے، آنکھیں پھرانے لگیں، دل کا پھٹنے لگا..... اسی کیفیت میں بقیہ میسج پڑھنے کے لیے نیچے کیا تو پتہ چلا کہ قصائے آپ کے لیے شہادت کا فرمان لکھ دیا ہے..... اس الم ناک حادثے کی خبر پڑھ کر کیا بتاؤں کیا حالت رہی..... کئی دن بعد تک یہ معاملہ رہا جیسے حواس ساتھ نہیں دے رہے..... اور آج بھی آپ کی شہادت کا صدمہ ذم تازہ روز کی طرح آپ کی جدائی کا احساس دلاتا رہا ہے..... ہاے پھوٹا نصیب!

میرے گوشہ فکر میں میری جان سے عزیز تر

ایسا بھی اک شخص تھا جو ملا نہیں اور پھڑک گیا

جب سے ”مجموعہ رسائل فضل رسول“ اور ”خیر آبادیات“ شائع ہوئی ہیں، مارکیٹ میں قریباً روزانہ بلا ناٹھ حضرت اسید الحق مرحوم کا تذکرہ ہوتا تھا، جب بھی کچھ لوگ مل بیٹھ کر اپنی پس ماندگیوں اور کوتاہیوں کا تذکرہ کر رہے ہوتے اور کبھی ہمیں موقع ہاتھ آ جاتا تو ہم وہاں اپنے جن محققین، مفکرین اور علما کا ذکر کر کے فخر و مباہات کرتے اور قلوب کو جلا اور دلولوں کو تازگی بخشتے ان میں صف اول کے دانش وروں میں حضرت سیدی علامہ اسید الحق رحمہ اللہ کا ذکر خیر بھی ہوتا اور ہر ایک کے دل سے ان کے لیے برکت و نصرت کی دعائیں نکلتیں اور واقعتاً اتنے مختصر عرصے میں انھوں نے جتنا واقع کام کیا ہے یہ برکت ہی ہے، نصرت الہیہ کے بغیر اتنا کام اتنے عرصے میں ممکن نہیں۔ کبھی کبھی یہ ناچیز اپنے احباب کے سامنے ناز و تفاخر کے ساتھ کہہ دیا کرتا کہ علامہ اسید صاحب جتنا کام کر رہے ہیں امید ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اگلے چند سالوں میں خالوادہ بدایوں کا تمام تر علمی ورثہ زندہ کر ڈالیں گے اور یہ ان کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ مگر رب ذوالجلال کی حکمت کے آگے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔ خداے لم یزل اہل سنت کو مرحوم کا سچا وارث اور جانشین عطا فرمائے۔

مجھے اپنی زندگی میں دو شخصیات کی وفات کا سب سے زیادہ دکھ ہوا: ان میں ایک پاکستان کے علامہ جلیل حکیم الامت، امام اہل سنت فاریح مناظرہ، جنگ اشرف العلماء شیخ الحدیث حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی رحمہ اللہ ہیں جن کا وصال ۱۲ رجب ۱۴۳۳ھ/ ۲۳ مئی ۲۰۱۳ء کو ہوا، ان کی مرقہ منور ڈیرہ اشرف آباد نزد فرود کہ مصافحات سرگودھا میں واقع ہے۔ دوسرے ممتاز ناقد و محقق ہندو بخداد عالم ربانی حضرت علامہ شیخ اسید الحق قادری عثمانی بدایونی رحمہ اللہ ہیں، جن کا مزار پر انوار بخداد معلیٰ میں احاطہ روضہ حضور غوث الاعظم میں ہے۔ ان حضرات سے راقم کی جتنی قربت رہی دین کی حقیقی روح کو سمجھنے کا موقع ملا اور انھی حضرات نے ہی دنیوی اقدار سے صحیح معنوں میں روشناس بھی کرایا۔ رحمن ان سے راضی ہو اور ہمیشہ ان کو اپنی آغوش رحمت میں رکھے۔

حضرت مولانا اسید الحق قادری مرحوم کی شخصیت کی عظمت ایک تو خود ان کی خاندانی شہرت کی وجہ سے تھی، دوسرا علم و ادب اور ادب و تحقیق کی دنیا میں انھوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے کہ بلا شک بدایوں بل کہ ہند کی تاریخ میں انھیں ایک مرجع کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس پر ان کا قلمی سرمایہ شاہد عدل ہے۔ اہل پاکستان پر قرض ہے کہ وہ حضرت شیخ صاحب کی کتب کی اڑاؤں تا آخر اشاعت کریں اور تکرار و تسلسل کے ساتھ کرتے رہیں، تاکہ اہل علم ان کے استفادے سے کسی لمحے بھی محروم نہ رہیں۔ گزشتہ صفحات میں جن کتب کی طباعت کا تذکرہ ہو چکا ان کے علاوہ ”خیر آبادیات“ مکتبہ اعلیٰ حضرت لاہور سے اکتوبر ۲۰۱۱ء میں، ”قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ“ مکتبہ برکات المدینہ کراچی سے شوال ۱۴۳۳ھ/ ستمبر ۲۰۱۲ء میں، تقدیم بر ”شوارق صمدیہ ترجمہ و تفسیر بوارق محمدیہ“ مطبع اہل سنت و جماعت، لاہور سے ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ/ اکتوبر ۲۰۱۲ء میں اور ترجمہ رو روافض ”مجموعہ شیعوں کے عقائد“ میں مکتبہ برکات المدینہ کراچی سے شعبان جولائی ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ ”صحیح البہاری“: مولانا ظفر الدین بہاری کو مولانا محمد حسین عطار نے اپنے ادارہ دائر النعمان، کراچی سے رمضان ۱۴۳۳ھ/ اگست ۲۰۱۱ء میں شائع کیا تو اس کے شروع میں شیخ صاحب کی تقریر بھی شائع کی۔ اس کے علاوہ موصوف ”تحقیق و تنہیم“ اور ”خامہ تلاشی“ کو پاکستان میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، خداوند

قدوس انھیں طباعت کے وسائل جلد مہیا فرمائے۔ ان کے علاوہ جو کتب اس وقت تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں، اللہ عزوجل کی مدد و نصرت سے دائر الاسلام انھیں اسی سال تاج الخول اکیڈمی بدایوں سے منگوا کر پاکستان میں شائع کرے گا۔ و باللہ التوفیق۔

دوست احباب تو علمی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہی ہیں، وہ بھی کبھی کبھی کسی غرض یا مقصد کے تحت، اور بعض اوقات ان کی جانب سے بھی انقباض ہو جاتا ہے، مگر بغیر شائستگی یا تعارف اور تعلق کے مدد کرنا یقیناً حیرت انگیز اور کسی انسان کی حقیقی عظمت اور بڑے پن کی دلیل ہے۔ مولانا اسید الحق قادری رحمہ اللہ حقیقت میں بہت بڑے انسان تھے اور اپنے قد سے کہیں زیادہ اونچے اقدار کے مالک تھے۔ جب آپ ۲۰۱۰ء میں پاکستان کے دورے پر آئے تو ہمارے دوست مولانا محمد فاروق قادری (مجھے پرانی کتابوں کی صحیح معرفت ان سے اور چند دوسرے دوستوں سے حاصل ہوئی ہے) نے آپ سے ملاقات کی، انھیں ریوہایت کے کچھ قدیم ترین نوادر مطلوب تھے۔ حضرت کے دورہ سے واپسی پر جب میری فاروق بھائی سے بات ہوئی تو ان کے تاثرات کے الفاظ یہ تھے: ”رضا بھائی! وہ بہت بڑے دل کے آدمی ہیں۔“ اور واقعی ہم نے انھیں اس سے کہیں بڑے دل والا پایا۔ میں نے اپنی مختصر سی زندگی میں تحقیق اور کتب کے تعلق سے اتنا فراخ دل انسان کبھی نہیں دیکھا اور شاید کبھی دیکھ بھی نہ سکوں۔ بے لوث خدمت علم آپ پر ختم تھی۔ دو واقعات جو میرے سامنے کے ہیں حاضر خدمت کر رہا ہوں:

لاہور سے ایک نوجوان محمد فہد علی رضا (منتظم کتاب محل) نے حضرت سے دورہ پاکستان کے دوران فون پر رابطہ کیا اور حضرت سیف اللہ المسلمول رحمہ اللہ کی کتاب ”البسوارق المحمدیہ لرحمہ الشیاطین النجدیہ“ کے قدیم ایڈیشن کی عکسی طباعت کی خواہش کا اظہار کیا، حضرت نے بغیر کسی جان پہچان کے بدایوں پہنچنے پر قدیم نسخہ بھیجنے کی ہامی بھری۔ یقین فرمائیے کہ سفر سے واپسی کے دو یا تین ہفتے میں ہی کتاب کا اصل نسخہ بذریعہ ڈاک اپنے خراج پر پاکستان بھیج دیا اور نہ کوئی وعدہ لیا، نہ ہی معاہدہ کیا۔ لیکن اس بندہ خدا نے آج لگ بھگ ساڑھے چار سال گزرنے کے بعد بھی اپنا وعدہ نہیں نبھایا اور کتاب کا قیمتی ترین نسخہ یہاں کے ایک عالم مولانا مفتی فضل احمد چشتی صاحب (سندر شریف) کو

مہنگے داموں بیچ دیا۔ راقم نے انھی حضرت کے ایما پر دائر الاسلام سے رجب ۱۴۳۵ھ / مئی ۲۰۱۳ء کو اس تاریخی کتاب کی عکسی اشاعت کردی ہے۔ کتاب کا ایک نسخہ قدیمہ ادارہ کومولانا موصوف کے کتب خانہ سے اور دوسرا نسخہ جامعہ نعیمیہ، گڑھی شاہو، لاہور کی لائبریری سے مولانا وسیم رضا سعیدی کے توسط سے دست یاب ہوا ہے۔ ابتدا میں حضرت اسید الحق قادری مرحوم کا مقدمہ ”بوارق محمدیہ: ایک مطالعہ“ شامل کیا گیا ہے۔

ہمارے ایک کرم فرما حضرت مولانا وارث علی صاحب (مہتمم جامعہ عنایت القرآن والسنة، لاہور) نے پاکستان میں امام عکمت وکلام حضرت علامہ محمد فضل حق چشتی خیر آبادی رحمہ اللہ کی کتاب ”إقتناع الظہیر“ کا ترجمہ، الحمد للہ مکمل فرمایا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت انھیں کتاب کے مطبوعہ نسخے میں کئی مقامات پر تردد ہوا، ”خیر آبادیات“ کے مطالعہ سے اُن پر یہ امر مشکف ہوا کہ کتب خانہ قادریہ بدایوں میں کتاب کا وہ مخطوط موجود ہے جس سے محقق پروفیسر علامہ سید محمد سلیمان اشرف بہاری رحمہ اللہ نے استفادہ کیا تھا، سوچا کہ اُسے دیکھنا چاہیے، شاید یہ پریشانی دور ہو جائے۔ چنانچہ نومبر ۲۰۱۳ء میں حضرت اسید صاحب مرحوم سے فون پر رابطہ کیا اور مخطوط کے عکس کے حصول کی فرمائش کی گئی۔ چند ہی دن میں آپ نے اُس مکمل مخطوطے کی تصاویر بنا کر راقم کے ای میل ایڈریس پر بھیج دیں۔ دائر الاسلام سے ”إقتناع الظہیر“ (فارسی) طباعت کے مراحل طے کر رہی ہے، اس میں مخطوط کے نمونہ صفحات شائع کیے جائیں گے۔

اپنے تو پھر اپنے ہوتے ہیں، اجنبیوں اور بیگانوں سے جس کا یہ حسن سلوک ہوا اُس کے خلوص دل اور صفائے نیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ میرے حسن ظن میں شیخ صاحب اس شعر کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے:

دشمن بھی جو چاہے میری چھاؤں میں بیٹھے
میں اک گھنا پیڑ سر راہ گزر ہوں

آپ اپنی تمام تر مصروفیات علی الخصوص تدریس و تحقیق و خافتاہ کے تھکا دینے والے مشاغل کے باوجود متعلقین و مستفیدین کو وقت دینے میں بخل نہیں کیا کرتے تھے۔ جس وقت کوئی بات پوچھی یا چیز طلب کی اسی دن اس کا جواب آجاتا یا اگر وہ مواد موجود ہوتا تو اگلے دن وہ میل باکس میں پہنچ جاتا کرتا تھا۔ اس فقیر کو اہل علم و فن کی مشغولیت کا

پوری طرح سے ادراک و احساس ہے، اس لیے ضروری کام پڑنے پر ہی رابطہ کرتا ہوں اور وہ بھی اتنے وقت کے لیے جس سے کہ ان کی با مقصد اور مفید سرگرمیوں میں خلل نہ ہو جاؤں۔ حضرت سے بھی کوشش ہوتی کہ ایسا ہی سلسلہ رہے اور الحمد للہ ایسا ہی ہوا، سوائے ایک مرتبہ کے۔ ہوا یوں کہ ”عربی محاورات“ پریس میں جانے کے لیے تیار تھی، مصنف کی طرف سے پیغام موصول ہوا کہ اگر ممکن ہو تو کتاب روک دی جائے، بعض جگہ تصحیح کرنی ہے! ادھر خود آپ سفر پر روانہ ہو گئے، اس وجہ سے چند دن رابطہ منقطع رہا۔ اب مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ سفر میں ہیں، اس لیے میں نے اس تصحیح نامے کے لیے کئی بیج کیے اور جواب کا انتظار کرتا رہا، مگر کوئی جواب نہ آیا، اُن دنوں فون پر رابطہ نہیں تھا اس لیے ای میل کے ذریعہ ہی پیغام رسانی ہوتی رہی۔ ادھر ناشر کو کتاب چھاپنے کی جلدی تھی، چنانچہ راقم نے خود ہی پروف پڑھ کر جہاں لفظی اغلاط نظر آئیں درست کر کے کتاب پریس کے حوالے کردی۔ بعد میں جب آپ سفر سے واپس ہوئے تو آپ نے میری ای میلز کا جواب عطا فرمایا اور میری بے صبری پر ذرا بھی حق کی نہیں فرمائی۔ ادھر اپنا حال سن لیجئے! پچھلے سال عرس قادری پر تاج الخول اکیدی اپنی ۱۰۰ مطبوعات کی فہرست شائع کر رہی تھی، جس کے سرورق پر انڈیا اور خاص طور پر پاکستان سے اکیدی کی طبع ہونے والی کتب کے نامزد دیے جانے تھے۔ چون کہ میری معرفت ابھی تک پاکستان میں صرف ”عربی محاورات“ ہی چھپی تھی لہذا اس کے ناظر کی فائل بھیجے گا مجھے ہی کہا گیا۔ اب معاملہ یہ ہوا کہ ناشر کو کئی بار کہنے کے باوجود اُن سے فائل بھیجنے میں سستی ہو گئی، اس دوران حضرت نے شاید ایک بار پھر یاد دہانی کرائی، لیکن قبیل ارشاد نہیں ہو سکی۔ آخر کار Facebook سے ایک دھندلی سی تصویر لے کر اس کی صفائی کر کے فہرست میں شائع کر دی گئی۔ کام تو چل گیا، لیکن ناشر اور اس کا بل کی غفلت سے آپ کے حکم کی بجا آوری نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد ناچیز نے ایک سے زیادہ مرتبہ معذرت کرنے کی کوشش کی، جسے آپ نے بڑے ہی شفقانہ انداز میں ٹال دیا اور مجھے شرمندگی کا ذرہ بھر احساس نہیں ہونے دیا۔

محترم مولانا خوشتر نورانی صاحب کی کتاب ”علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات“ چھاپتے ہوئے سینک میں کچھ معمولی سی بے

احتیاطیاں ہوئیں، اگر اگلا ایڈیشن (راقم کی کوشش ہے کہ آئندہ ایڈیشن پاکستان کے کسی انٹرنیشنل ادارے سے شائع ہو، الحمد للہ انڈیا میں بھی یہ کتاب حکومت ہند کا ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے چھپ چکی ہے) چھاپنے کا موقع ملا تو ان شاء اللہ ان کی صفائی کی جائے گی، لیکن اس کا شاید انھیں اتنا قلق نہ تھا، جتنا کتاب کی پشت پر آویزاں حضرت غازی ملک ممتاز حسین قادری حفظہ اللہ اور ان سے متعلقہ تصاویر پر رنج ہوا۔ راقم نے معذرت بھی کی اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ آئندہ ایسی جسارت نہیں ہوگی، مگر طبع ناز میں نے گوارا نہیں فرمایا، جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ پاکستان میں نورانی صاحب کی کتابیں چھپنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ مذکورہ کتاب کے علاوہ مصنف کی دوسری کتاب ”دور جدید کے بعض مسلم مسائل: ایک باز دید“ بھی راقم کی تحریک پر ہمارے دوست حسن محمد زاہد قادری نے دلی بھلی کیشنز لاہور سے شائع کی۔ اس سے قبل اور بعد حضرت کی کوئی کتاب پاکستان میں شائع نہیں ہوئی۔ یعنی آج محترم کی کتابوں کی پاکستان میں

اشاعت کا شرف (اب تک) اوّل و آخر راقم کو ہی حاصل ہے۔ والحمد للہ! اخیر، اس ”ساختہ“ کی خبر مولانا اسید الحق رحمہ اللہ تک غالباً مصنف کی طرف سے بھی گئی اور دیگر ذرائع نے بھی انھیں باخبر کر دیا، تو ایک بار فون پر بات چیت کے دوران میں نے اس قضیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کی کہ قبلہ! آپ ہی کوئی راہ نکالے! آپ نے مسکراتے ہوئے کافی بے تکلفی سے فرمایا کہ ”آپ فکر نہیں کریں! خوشتر جذباتی آدمی ہے، میں اسے سمجھا لوں گا۔“ اس کے بعد نہ جانے کوئی بات ہوئی یا نہیں۔ لیکن اگر یہ بات آگے نہ بھی بڑھی ہو تو مضمون کے اس حصے کو پڑھنے کے بعد ہمیں خوشتر نورانی صاحب جیسے عالی فکر، وسیع القلب اور سیر چشم انسان سے یہی توقع ہے کہ وہ اپنے ظرف کے مطابق معاملہ فرمائیں اور اس قسم کی چھوٹی باتوں کو علمی رشتوں کے درمیان حائل نہیں ہونے دیں گے۔ □□□

علامہ: راقم: مجلہ ”حجۃ الاسلام“، مؤسس: دائر الاسلام، لاہور (پاکستان)

darulislam21@yahoo.com

مولانا خوشتر نورانی کی شاہکار علمی و تحقیقی کتاب

علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات

(صفحہ: ۲۳۸ قیمت: ۹۱/-)

کاتیسرا ایڈیشن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی (وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند)

سے اضافے کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔

● علامہ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کے معرکے میں ان کے کردار کے بارے میں آپ نے حرف آخر لکھ دیا ہے۔ (پروفیسر شمس الرحمن فاروقی)

● یہ کتاب اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام تحریروں میں اپنے معیار تحریر و تحقیق کے لحاظ سے فائق ہے۔ (حکیم سید محمود احمد برکاتی)

● یہ کتاب اتنے غیر جذباتی، معروضی اور تحقیقی اوصاف سے متصف ہے کہ یقیناً اس کا شمار اردو کی اعلیٰ تحقیقی کتب میں کیا جاسکتا ہے۔

(پروفیسر سید حسین الحق)

مولانا اسید الحق قادری (در)

کتب اسلاف کی تحقیق و اشاعت: ایک تعارف

(سالِ قیام ۱۴۲۸ھ/۱۸۱۳ء بموقع دستار بندی سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری) کی علمی و تصنیفی خدمات ہر دور میں سواۓ عظیم اہل سنت کے ذخیرہ کتب میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہوتی رہیں، لیکن وہ بیش قیمت تصانیف اپنی پہلی اشاعت کے بعد دوبارہ نہ چھپنے کی وجہ سے عصر حاضر کیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہو چکی تھیں، جن کی دوبارہ اشاعت کا خیال خانوادہ عثمانیہ قادریہ کے متحرک و فعال فاضل، ممتاز ناقد و محقق حضرت مولانا اسید الحق قادری ازہری (ولادت: ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ/۶ مئی ۱۹۷۵ء شہادت: ۲ رجب الاولیٰ ۱۴۳۵ھ/۳ مارچ ۲۰۱۴ء) کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ اگست ۲۰۰۴ء میں وہ جامعہ ازہر قاہرہ مصر سے تفسیر و فقہ میں تخصص کی تعلیم کے بعد ہندوستان واپس آئے اور ۲۰۰۷ء سے باضابطہ اپنے اکابر و اسلاف کے ورثہ علمی کی اشاعت کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔

محرم ۱۴۲۸ھ/جنوری ۲۰۰۷ء سے باضابطہ اس کام کا آغاز سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی کی تصنیف لطیف 'احقاق حق' کی اشاعت سے کیا اور سات سال (جنوری ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۱۴ء) کی نہایت مختصر مدت میں مختلف علوم اسلامی اور فنون ادبیہ میں اپنی درجنوں علمی تصانیف کے علاوہ تاج الفحول اکیڈمی بدایوں (سالِ قیام ۱۹۹۱ء) کے زیر اہتمام اپنے اکابر و اسلاف اور علمائے مدرسہ قادریہ کی مختلف علوم و فنون پر مشتمل کتابوں کی جدید ترتیب، ترجمہ، تسہیل، تحقیق، تحشیہ، تعلیق، تخریج اور تقدیم و تعارف کے ساتھ اشاعت فرمائی، وہ نہایت حیرت انگیز بھی ہے اور قابلِ صداقت بھی۔ اکابر و اسلاف بدایوں کے ورثہ علمی کے تحفظ میں انھوں نے جو قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہمیشہ ان کی علمی و تحریری شخصیت کی یاد دلاتی رہے گی۔

'خانوادہ عثمانیہ قادریہ بدایوں برصغیر ہندوپاک کا ایک ممتاز دینی، علمی اور روحانی خانوادہ ہے، جس کی علمی و روحانی تاریخ کا دائرہ صدیوں پر محیط ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پچھلے دو سو سال کی تاریخ میں اس عظیم خانوادے میں ایسی ایسی باکمال شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جن کی علمی، عملی اور تحریری زندگی آج بھی گم گشتگانِ راہ کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس عظیم خانوادے کے اکابر و اسلاف نے اپنے اپنے عہد میں علم و روحانیت، اصلاح فکر و اعتقاد اور زبان و ادب کی خدمت و آب یاری میں جو عہد ساز خدمات و کارنامے انجام دیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، جن کے بابر احسان سے سواۓ عظیم اہل سنت و جماعت کبھی عہدہ برتا نہیں ہو سکتے۔

عقائد و کلام، تحقیق و اقا، تصوف و سلوک، تاریخ و سیر، تذکرہ و سوانح، تفسیر و حدیث، رد فرق و احزاب، لسانیات، زبان و ادب غرضیکہ علوم و فنون کے ہر میدان میں انھوں نے اپنی عم و دانش کے چشمہ بھاشی سے دنیائے علم و ادب کو خوب خوب سیراب و فیض یاب کیا اور آج بھی اصحاب علم و فضل اپنے ظرف کے مطابق سیراب ہو رہے ہیں۔

شاہ عین الحق عبد المجید قادری (ولادت: ۲۹ رمضان المبارک ۱۱۷۱ھ/۱ اپریل ۱۷۶۳ء - وصال: ۱۷ محرم الحرام ۱۲۶۳ھ) کے ذریعے فیضانِ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مظہرہ کی روشنی سے خانقاہ قادریہ بدایوں کی شکل میں رشد و ہدایت اور روحانیت و طریقت کے جس خانقاہی نظام اور معروف تصنیف 'ہدایت الاسلام' کے ذریعے سلسلہ تحریر و قلم کی جو شاندار روایت قائم ہوئی وہ ہر دور میں جاری رہی۔

اشاعت جدید کے درجہ رواں:

شخصیات خانوادہ قادریہ بدایوں اور علمائے مدرسہ قادریہ بدایوں

(۸)

علمی آثار

اشاعت جدید کے مقاصد:

اسلاف و اکابر کی اشاعت و تصانیف کے پیچھے ان کے کیا مقاصد کار فرما تھے، اس کی تفصیل ذیل میں خود انہیں کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

”عظیم المرتبت اسلاف کے درسا اور اخلاف کی یہ ذمہ داری بھی ہے اور سعادت بھی کہ وہ اپنے اسلاف کی روایات کو برقرار رکھیں، ان کے آثار علمیہ کی حفاظت کریں اور ان کی علمی و فنی خدمات اُچا کر کر کے ان کا فیض اگلی نسلوں تک منتقل کریں۔ ان کتابوں کی جدید اشاعت سعادت مندی کی دلیل اور اسی احساس ذمہ داری کا نتیجہ ہے۔“

ان کتابوں کی جدید اشاعت اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ فرزند ان مدرسہ عالیہ قادریہ اور خاندانِ خانقاہ عالیہ قادریہ آج بھی اپنے اکابر کے مسلک و منہاج پر نہ صرف مضبوطی سے قائم ہیں بلکہ مسلک حق کی اشاعت اور باطل افکار کے رد و ابطال کی ذمہ داری بھی بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

آج کفر و ضلالت اور بدعتیہ گدی و لادینیت نے نئے پیرا ہن بدل کر سامنے آ رہی ہے، حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو رہا ہے، افراط و تفریط کی گرم بازاری ہے، ایسے غیر یقینی حالات میں اپنے اکابر و اسلاف کے فکری اور نظریاتی تسلسل سے مسلک رہنے میں ہی میں سلامتی ہے۔ ان کتابوں کی جدید اشاعت اسی فکری وابستگی اور نظریاتی تسلسل کے استحکام، مضبوطی اور استواری کی جانب ایک ٹھوس اور کامیاب قدم ہے۔“

(بیک نائل کی تحریر سے ایک اقتباس، کیٹلاگ تاج الفول اکیڈمی کی ۱۰۰ مطبوعات)

اشاعت جدید: منزل بہ منزل

اسلاف شناسی، ورثہ اسلاف کی حفاظت اور فکر اسلاف سے غیر معمولی وابستگی، مسلک حق کی اشاعت اور باطل افکار و عقائد کا رد و ابطال یہ وہ اہم مقاصد تھے جن کے پیش نظر انھوں نے تصانیف اسلاف اور ان کی سیرت و سوانح پر مشتمل قدیم و نیا پاب اور جدید کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس اہم منصوبے کو سلسلہ وار مرحلہ اشاعت میں تقسیم کیا۔

(۱) ۱۳۳۰ھ/۲۰۱۰ء میں (موقع پچاس سالہ عہد سجادگی شیخ طریقت

تاج دار اہل سنت حضرت شاہ عبدالحمید سالم القادری دام ظلہ العالی) تاج الفول اکیڈمی کی جانب سے قدیم و جدید پچاس کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا گیا۔ اس پہلے مرحلہ اشاعت میں اسلاف کی درجنوں کتابوں کی اشاعت جدید کی رونمائی ۱۶ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ/۲۴ جنوری ۲۰۱۰ء عرس قادری کے مبارک موقع پر جشنِ رزاس عہد سجادگی کی خوشگوار تقریب ’جشن اشاعت‘ میں کی گئی۔

(۲) پھر دوسرے مرحلہ اشاعت کے طور پر ۱۳۳۳ھ/۲۰۱۳ء میں قدوة الواصلین، زبدۃ العارفین مولانا شاہ مطیع الرسول عبدالمقتدر قادری بدایونی قدس سرہ (وصال: ۱۳۳۳ھ/دسمبر ۱۹۱۵ء) کے صد سالہ عرس کے موقع پر مطبوعات تاج الفول اکیڈمی کا اعلان کیا گیا اور اس مبارک تقریب میں بھی متعدد تصانیف اسلاف کی اشاعت جدید اور رونمائی کی گئی۔ اسی دوسرے مرحلہ اشاعت میں ان کے والد گرامی مولانا شیخ عبدالحمید سالم القادری (زیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایونی) نے انہیں اس امر پر آمادہ کیا کہ:

”جب مدرسہ قادریہ سے اسلاف شناسی کی تحریک کا آغاز کیا گیا ہے تو ہمارے حضرات مشارک مار ہرہ پر بھی کام ہونا چاہیے۔“

(ابتدائیہ، بقلم مولانا اُسید الحق قادری مشمولہ تذکرہ نوری، مصنفہ مولانا غلام شہر قادری بدایونی، رجب ۱۴۳۳ھ/مئی ۲۰۱۳ء، ص ۱۷)

اس لیے انھوں نے اکابر مار ہرہ کی تصنیف کے علاوہ اکابرین مار ہرہ کی سیرت و سوانح پر مشتمل قدیم و نیا پاب کتابوں کی اشاعت کی جانب بھی توجہ دی اور متعدد کتابیں جدید آب و تاب کے ساتھ تاج الفول اکیڈمی سے شائع کیں۔

(۳) تیسرے مرحلہ اشاعت سال ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۴ء کے لیے اخبارات و رسائل میں ایک جامع اشاعتی منصوبے کا اعلان کیا گیا۔ اس رپورٹ کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے جو تصانیف اکابر بدایوں کی اشاعت سے متعلق ہے:

”اکیڈمی نے سال ۲۰۱۳ء کے لیے بھی ایک جامع اشاعتی منصوبہ تیار کیا ہے جس کے تحت نومبر ۲۰۱۴ء میں ہونے والے عرس قادری تک پندرہ کتابیں لانے کا عزم کیا گیا ہے۔ زیر ترتیب و طباعت کتابوں میں حضرت مولانا فضل رسول

بدایونی کی معرکۃ الآرا کتاب ’سیف الجبار‘ کے علاوہ ’مجموعہ رسائل فضل رسول‘، ’مجموعہ رسائل تاج الفول‘، ’نظام عمل‘ مصنفہ مولانا عبدالمجید بدایونی وغیرہ شامل ہیں۔ حافظ عبدالقیوم قادری نے کہا کہ مولانا اُسید الحق قادری ’سیف الجبار‘ پر تحقیق کام کر رہے ہیں۔ ان کی تحقیق و ترتیب اور مبسوط مقدمے کے ساتھ یہ تاریخی اہمیت کی کتاب جلد ہی اکیڈمی شائع کرنے جارہی ہے۔ میننگ کی صدارت تاج الفول اکیڈمی کے صدر الحاج خواجہ احتشام الدین قادری نے کی۔ مولانا اُسید الحق قادری، مولانا عطیہ قادری، مفتی دلشاد احمد قادری اور مولانا عبدالعلیم مجیدی سمیت اکیڈمی کے اہم اراکین نے شرکت کی۔“ (رپورٹ مثبت اور تعمیری کام کرنا وقت کی اہم ضرورت، مطبوعہ متعدد اخبارات و رسائل)

افراد سازی:

تحریک اسلاف شناسی اور ورثہ اسلاف کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط ٹیم کی بھی ضرورت تھی۔ اس تحریک کے روح رواں کو اس امر کا بھی بخوبی ادراک تھا کہ دو سو سال پر محیط اپنے اسلاف کی علمی امانت کو قوم کے سامنے لانے کے لیے انہیں علمی و تحقیقی اور تصنیفی صلاحیتوں سے آراستہ ایک قافلہ جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے انھوں نے علمی و تحقیقی مصروفیات اور تصنیفی و اشاعتی امور پر بھرپور توجہ مرکوز رکھنے کے ساتھ افراد سازی کا بھی خصوصی خیال رکھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے لیے ۲۰۰۵ء سے مدرسہ قادریہ بدایوں میں اپنی درس گاہ علم و فیض بھی آراستہ کی۔ اپنے آبا و اجداد کی علمی یادگار کی عظمت رفتہ کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے انھوں نے اپنی پوری توانائی لگا دی۔ آپ اس ادارہ کے شیخ الحدیث بھی تھے اور صدر المدرسین بھی۔ ادارہ کے معیار تعلیم کو پختہ اور مثالی بنانے کے لیے طلبہ کے داخلہ کے سلسلے میں یہ ضروری دفعہ بھی رکھی کہ درمیان جماعت میں داخلہ نہیں لیا جائے گا۔ اس کا بڑا فائدہ یہ سامنے آیا کہ اگست ۲۰۰۴ء تا مارچ ۲۰۱۴ء کی نہایت مختصر مدت میں کئی ایک باصلاحیت طلبہ آپ کی درس گاہ سے فارغ ہو کر اسی ادارے میں آپ کی زیر نگرانی تدریس و تصنیف کا اہم فریضہ بحسن و خوبی انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مختصر زمانہ

تدریس میں طلبہ مدرسہ قادریہ کی ذہنی و فکری تربیت اور خفیہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے متعدد جہات پر اپنی توجہ مبذول کی۔ ایک جانب ان طلبہ کے اندر تحریک و تبلیغ کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے مختلف مدارس و جامعات کے ارباب علم و دانش سے استفادہ کا موقع فراہم کیا تو دوسری جانب ان کے اندر تحقیقی، تصنیفی اور علمی ذوق کی استواری کے لیے تربیت تصنیف کا بھی مستقل شعبہ تشکیل دے دیا تھا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر سال طلبہ مدرسہ قادریہ کے لیے عرس قادری کے موقع پر سالانہ تحریری و تقریری مسابقے کا اہتمام کرواتے اور اس میں اس میدان کی کسی نہ کسی تجربہ کار شخصیت کو بلا کر ان سے توسیعی خطاب کراتے۔ ایک جگہ اپنے تلامذہ کی تحقیقی صلاحیت کی نشوونما پر اظہار مسرت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”یہ بات میرے لیے شکر اور مسرت کا باعث ہے کہ مدرسہ قادریہ میں اب ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جو نہ صرف یہ کہ علمی اور تحقیقی ذوق رکھتے ہیں بلکہ اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کی حفاظت اور اس کی اشاعت جدید کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔“ (ابتدائیہ، مسئلہ قیام تعظیسی، مطبوعہ تاج الفول اکیڈمی بدایوں، طبع جدید جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ/مارچ ۲۰۱۳ء، ص ۱۲)

یہ اقتباس اس حقیقت کو بتانے کے لیے کافی ہے کہ محقق عصر حضرت مولانا اُسید الحق قادری نے اکابر بدایوں کے ورثہ علمی کے تحفظ و اشاعت کی جو منصوبہ بند اور منظم تحریک اپنے پیچھے چھوڑی ہے، اس کے لیے ایک حد تک افراد بھی تیار کر دیا تھا اس لیے مجھے امید قوی ہے کہ آپ کے شاگردانِ عزیز اس مشن کی لو کو کبھی مدہم نہیں ہونے دیں گے بلکہ اس اہم مشن کی تکمیل کے لیے وہ ہر ممکن حد تک کوشاں رہیں گے۔

إن شاء اللہ العزیز۔

طلبہ مدرسہ قادریہ کے اندر تصنیفی ذوق کی استواری میں مولانا اُسید الحق قادری کے اس وصف خاص کا بھی بے پناہ دخل ہے کہ انھوں نے اپنے عزیز شاگردوں سے تحقیق و ترتیب کتب اسلاف میں اگر تھوڑا بہت بھی علمی کام لیا تو وہ اٹھائے علمی اپنے نام کے بجائے انھیں کے نام سے منظر عام پر لایا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور ان کے اندر زیادہ سے زیادہ علمی کام کرنے کا جذبہ بیکراں پیدا ہو۔ یہ وہ ممتاز اور نادر صفت

ہے جو دیگر حضرات کے لیے بھی عمومی عمل کی حیثیت رکھتا ہے جو ایسے موقع پر اپنی شہرت و نیک نامی کا تو خیال رکھتے ہیں لیکن طلبہ کی عزت افزائی اور حوصلہ بخشی کے پہلو کو پورے طور سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔

اشاعت جدید کی خصوصیات:

مولانا اُسید الحق قادری کی علمی و قلمی قیادت میں اکابر و اسلاف کی تصانیف اور ان کی سیرت و سوانح پر مشتمل قدیم و نایاب کتابوں کی اشاعت جدید کی خصوصیات و امتیازات حسب ذیل ہیں:

● جدید معیار طباعت اور طرزِ املاء و کتابت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

● ہر کتاب میں فہرستِ مشمولات جدید طریقے کے مطابق شروع میں دیا گیا ہے، موضوعاتی فہرست میں فہرستِ مضمون کے سامنے صفحات بھی درج کر دیا گیا ہے، بیشتر کتابوں میں فہرستِ مشمولات مرتب/مترجم کے قلم سے ہے۔

● ہر کتاب پر شروع میں کتاب اور صاحب کتاب کا ایک جامع تعارف شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کے مطالعہ کے مطابق ہر کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے تحریر کردہ ہے۔

● کتاب کے تعارف میں طبع قدیم کی اشاعتی تفصیلات کے ساتھ سبب تالیف اور مشمولات کتاب کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

● مصنف کے تعارف میں سیرت و شخصیت کے ساتھ ان کی دینی و علمی خدمات کا معلوماتی تعارف بھی قلم بند کیا گیا ہے۔ قلمی و تصنیفی خدمات کا تعارف بھی بطور خاص کرایا گیا ہے۔

● حوالہ جات کی ترتیب و ترتیب میں جدید طریقہ تخریج و ترتیب پر بھرپور دھیان دیا گیا ہے۔

● آیاتِ قرآنیہ کی تخریج میں سورت کا نام اور آیت نمبر درج کیا گیا ہے، کیونکہ آیاتِ قرآنیہ کی تخریج میں موجودہ وقت میں یہی رائج ہے۔

● احادیث کی تخریج میں جدید طریقہ تخریج کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کتاب، باب اور حدیث نمبر درج کیا گیا ہے۔

● اصل کتاب میں حوالہ کی عبارتوں کے لیے حاشیہ میں صرف کتاب کا نام اور جلد و صفحہ کی نشاندہی کی گئی ہے، باقی تفصیلات مآخذ

مراجع کے عنوان سے کتاب کے آخر میں درج کی گئی ہیں۔

● مآخذ و مراجع کی ترتیب میں کتابوں کے نام حروفِ تہجی کے اعتبار سے درج کی گئی ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے: پہلے کتاب کا نام، پھر مصنف (مع سن وصال اگر ضرورت ہو تو) پھر مطبع کا نام، مقام طبع پھر سن طبع۔ مآخذ و مراجع کی فہرست میں یہی طریقہ رائج بھی ہے۔

● جدید طریقے کے مطابق کاپی رائٹ کے صفحہ میں پہلے کتاب کا نام، پھر اس کے نیچے مصنف کا نام، اس کے بعد سن طبع اور یا طبع قدیم، پھر سن طبع جدید درج کیا گیا ہے۔

● ہر کتاب یا صاحب کتاب کی مناسبت سے کاپی رائٹ کے صفحہ کے بعد ایک علاحدہ صفحہ کسی نہ کسی اہم شخصیت سے منسوب ہے۔ ہر کتاب پر مولانا اُسید الحق قادری کا نام بطور انتساب کردہ درج ہے۔

● اسلاف کی کتابوں کو قدیم تاریخی نام کے بجائے مختصر اور آسان عربی نام سے شائع کیا گیا ہے، نام کے انتخاب میں ان کے قدیم نام کی روح کا خیال رکھا گیا ہے اور مناسب نام تجویز کیا گیا ہے۔

● ہر کتاب کا ناٹل ویدہ زیب اور طباعت معیاری ہے۔

مطبوعہ تصانیف و رسائل کی فہرست:

اسلاف و اکابر ہدایوں کی قدیم و نایاب کتابوں کی اشاعت کا آغاز یوں تو ۱۹۹۸ء سے ہی حضرت تاج الحق مولانا شاہ عبد القادر ہدایونی کے عرسِ صد سالہ سے ہو چکا تھا، اس وقت کی دو مطبوعات ”تاج الحق: حیات و خدمات“ اور ماہ نامہ مظہر حق کا تاریخی ”تاج الحق نمبر“ اس سیاق میں خاصا اہم ہیں، لیکن وہ حضرت شیخ صاحب کی طالب علمی کا زمانہ تھا، اس اشاعت کا باضابطہ آغاز ازہر شریف سے شیخ صاحب کی واپسی کے بعد محرم ۱۴۲۹ھ/ جنوری ۲۰۰۷ء سے ہوا۔ پہلی کتاب اخلاقِ حق کے نام سے چھپی جو شاہ فضل رسول ہدایونی کی تصنیف ہے۔ رقعہ الثانی ۱۴۳۵ھ/ مارچ ۲۰۱۳ء تک تاج الحق اکیڈمی کے زیرِ اہتمام اسلاف کی پچاس کتابیں طبع ہو چکی ہیں، جب کہ اکیڈمی کی مجموعی مطبوعات سو سے زائد ہیں۔ ہر ایک کتاب کا مختصر تعارف لکھنے سے پہلے مطبوعہ تصنیف و رسائل کی ایک اجمالی فہرست ذیل میں درج کی جا رہی ہے تاکہ شائع شدہ کتابیں ایک نظر میں سامنے آسکیں، فہرست کی ترتیب سنہ اشاعت کے اعتبار سے درج کی گئی ہے تاکہ سال بہ سال اکیڈمی کی

اس تعلق سے پیش قدمی کا ایک واضح نقشہ بھی سامنے آجائے۔

۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء کی مطبوعہ کتابیں:

● احقاقِ حق (مسند توسل و استعانت کی تحقیق)

سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول قادری ہدایونی

● عقیدہ شفاعت کتاب و سنت کی روشنی میں

سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول قادری ہدایونی

● تذکرہ محبوب (تذکرہ مولانا عبد القدیر ہدایونی)

مولانا عبد الرحیم قادری ہدایونی

● جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد: مولانا فیض احمد ہدایونی

پروفیسر محمد ایوب قادری

۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء کی مطبوعہ کتابیں:

● الکلام السدید، تاج الحق مولانا شاہ عبد القادر قادری ہدایونی

● سنت مصافحہ، تاج الحق مولانا شاہ عبد القادر قادری ہدایونی

● خطباتِ صدارت عاشق الرسول مولانا شاہ عبد القدیر ہدایونی

مرتب: مولانا اُسید الحق قادری

● مثنوی غوثیہ، مولانا شاہ عبد القدیر ہدایونی

● فلاج دارین، مولانا عبد الماجد قادری ہدایونی

● عرس کی شرعی حیثیت، مولانا عبد الماجد قادری ہدایونی

● عقائد اہل سنت، مولانا عبد الماجد قادری ہدایونی

● دعوتِ عمل، مولانا عبد الماجد قادری ہدایونی

● مردے سنتے ہیں، مولانا حکیم محمد عبد القیوم شہید قادری ہدایونی

● مضامین شہید، مولانا حکیم محمد عبد القیوم شہید قادری ہدایونی

● ملتِ اسلامیہ کا ماضی، حال، مستقبل

مولانا حکیم محمد عبد القیوم شہید قادری ہدایونی

● احکامِ قبور، مفتی محمد ابراہیم قادری ہدایونی

● ریاض القراءت، مفتی محمد ابراہیم قادری ہدایونی

● تذکرہ فضل رسول، مولانا انوار الحق قادری عثمانی ہدایونی

● تذکرہ ماجد، مولانا اُسید الحق قادری

۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء کی مطبوعہ کتابیں:

● زیارتِ روضہ رسول

سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول ہدایونی

● حربِ معظم، سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول ہدایونی

● فضل الخطاب، سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول ہدایونی

● اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ

سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول ہدایونی

● مولود و منظوم، سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول ہدایونی

● ردِّ روافض، تاج الحق مولانا شاہ عبد القادر ہدایونی

● شرحِ رحۃ الصدور فی احکام القبور

مولانا محمد حبیب الرحمن قادری ہدایونی

● لہذا رُسنی فی الرد علی الوہابیہ، حضرت سید احمد بن زینی دحلان

شافعی کی، ترجمہ: مولانا محمد حبیب الرحمن قادری ہدایونی

● مختصر سیرت خیر البشر، مولانا محمد عبد البہادی ہادی القادری ہدایونی

● باقیاتِ ہادی، مولانا محمد عبد البہادی ہادی القادری ہدایونی

● خمیازہ حیات، مولانا محمد عبد البہادی ہادی القادری ہدایونی

● احوال و مقامات، مولانا محمد عبد البہادی ہادی القادری ہدایونی

۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء کی مطبوعہ کتابیں:

● مجموعہ رسائل فضل رسول، سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل

رسول قادری ہدایونی، ترتیب: مولانا اُسید الحق قادری ہدایونی

● عظمتِ غوثِ اعظم، مولانا محبت احمد قادری ہدایونی

● نگارشاتِ محبت احمد، مولانا محبت احمد قادری ہدایونی

۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء کی مطبوعہ کتابیں:

● خواجہ غلام نظام الدین قادری: حیات و خدمات

ترتیب: محمد تنویر خاں قادری ہدایونی

۱۴۳۳ھ/ ۲۰۱۲ء کی مطبوعہ کتابیں:

● تحقیق التراوح، سید شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی

● وہابی تحریک: تاریخ اور عقائد

مولانا شاہ فضل رسول قادری ہدایونی

● تمکیت النجدی (مسند امتناع نظیر کا تحقیق جائزہ)

● شیخ لادن تیبیہ کے عقائد و افکار

حافظ بخاری مولانا سید عبد الصمد چشتی سہسوانی

- اسلام کے بنیادی عقائد
- تاج اللہ مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
- شمس الایمان (مسئلہ توسل واستعانت کی تحقیق)
- مولانا محمد عیسیٰ الدین عثمانی بدایونی
- فلسفہ عبادت اسلامی، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
- قصیدہ بانٹ سعاد (ترجمہ و تشریح)، مولانا غلام اقبال مجیدی
- اسلام میں محبت الہی کا تصور، شیخ حازم تائف ابو غزالہ (عمان)
- اردو ترجمہ: مولانا دلشاد احمد قادری
- سیف اللہ المسلمول کا علمی مقام، مولانا عبدالعلیم قادری مجیدی
- تذکرہ خانوادہ قادریہ، مولانا عبدالعلیم قادری مجیدی
- ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۳ء کی مطبوعہ کتابیں:
- مسئلہ قیام تعظیمی، مفتی حسین احمد مقتدری بدایونی
- الجواب المشکور، مولانا محمد عبدالماجد قادری بدایونی
- تذکرہ کنویری، مولانا غلام شہر قادری بدایونی
- اکابر بدایوں، مولانا احمد حسین قادری کنویری
- ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۳ء (مجموع جشن دو صد سالہ عرب شمس مارہرہ):
- آداب السالکین، شمس مارہرہ آل احمد اچھے میاں مارہروی
- برکات مارہرہ، طفیل احمد صدیقی بدایونی
- تذکرہ شمس مارہرہ، مولانا اسید الحق قادری بدایونی
- ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۴ء کی مطبوعہ کتابیں:
- اکمل التاریخ (اول، دوم)، مولانا یعقوب ضیاء القادر بدایونی
- قصیدتان راکعتان، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی
- ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۴ء کے ایک جامع اشاعتی منصوبے میں اکابر
- بدایوں کی جن کتابوں کی اشاعت کا اعلان ہو چکا تھا وہ یہ ہیں:
- تلخیص الحق، سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول قادری بدایونی
- سیف الجبار سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول قادری بدایونی
- تلخیص المسائل، سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول قادری بدایونی
- مکاتیب فضل رسول
- سیف اللہ المسلمول شاہ فضل رسول قادری بدایونی
- سیف الاسلام، تاج اللہ مولانا عبدالقادر قادری بدایونی

- تحفہ فیض، تاج اللہ مولانا عبدالقادر قادری بدایونی
- خلاصۃ العقائد، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
- عورت اور قرآن، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
- الہدیۃ القادرۃ والمقامات البغدادیۃ، مولانا فیض احمد بدایونی
- صولت قادریہ، مولانا حکیم سراج الحق عثمانی بدایونی
- تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال، مولانا حافظ بخش قادری
- تنبیہ الغفل عن علم غیب الرسول، مولانا عبید اللہ کنڈی بدایونی
- صون الایمان عن وساوس قرن الشیطان، مولانا محبت احمد قادری
- مظہر العلماء و تراجم الکلام، مولانا سید محمد حسین سید پوری بدایونی
- نظام عمل، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
- (دیکھیے کیٹلاگ "تاج اللہ کنڈی کی ۱۰۰ مطبوعات" ص ۸)
- ۲۰۱۴ء کے جامع اشاعتی منصوبے کے تحت مندرجہ بالا کتابوں
- میں سے کتنی کتابیں اب تک پریس کے حوالے کی جا چکی تھیں، راقم
- الحروف کو اس کا علم نہیں۔
- تعارف تصانیف:
- محقق عصر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری نے اپنے اسلاف کے
- جن کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ متنوع موضوعات پر مشتمل
- ہے۔ ذیل میں سن اشاعت کے لحاظ سے ان کتابوں کا تعارف درج
- کیا جا رہا ہے۔ تعارف تصانیف کے لئے راقم الحروف نے مندرجہ ذیل
- دوسری عنوان کا انتخاب کیا ہے:
- (۱) کتب عقائد و کلام: (۲) اسلاف شناسی۔ تاکہ کتابوں کے
- تعارف میں آسانی بھی ہو اور محقق عصر کی حسن نظر کا واضح نقشہ بھی
- سامنے آجائے۔ ذیل میں پہلے "کتب عقائد و کلام" کا سلسلہ وار تعارف
- کرایا جائے گا پھر اس کے بعد اسلاف شناسی کے تعلق سے مطبوعہ
- تصانیف کا تعارف درج کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ تعارف کتاب کے
- ذیل میں جو اشاعتی تفصیلات اور موضوع کتاب کے تعارف میں مولانا
- اسید الحق قادری کی ان تحریروں سے بطور خاص استفادہ کیا گیا ہے جو ہر
- کتاب کے شروع میں ابتدائیہ کے تحت انہوں نے تحریر فرمایا ہے۔
- کتب عقائد و کلام:
- ذیل میں سن اشاعت کے لحاظ سے سلسلہ داران کتابوں کا

- تعارف کرایا جا رہا ہے جو عقائد و کلام اور اصلاح فکر و اعتقاد کے موضوعات
- پر مشتمل ہیں۔ کچھ متفرق موضوعات پر کتابوں کا تعارف بھی اسی عنوان
- کے ذیل میں شامل کر لیا گیا ہے۔
- احقاق الحق: یہ کتاب سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول
- بدایونی کی تصنیف ہے۔ کتاب کا پورا نام "احقاق الحق و ابطال الباطل"
- ہے۔ اصل رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ مولانا اسید الحق قادری کے
- اندازے کے مطابق یہ کتاب ۱۲۶۵ھ کے آس پاس لکھی گئی۔ اس
- کتاب میں مسئلہ توسل و استعانت پر بے نظیر تحقیقی گفتگو کی گئی ہے اور
- استعانت کے سلسلے میں شاہ اسماعیل دہلوی صاحب کی بعض عبارتوں کا
- تحقیقی و علمی جواب دیا گیا ہے۔ تقریباً ۱۲۶۵ھ میں یہ کتاب فارسی زبان
- میں شائع ہوئی۔
- مولانا اسید الحق قادری نے ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے کے
- بعد اس کی پہلی اشاعت تاج اللہ کنڈی سے محرم ۱۴۳۸ھ/ جنوری
- ۲۰۰۷ء میں کیا، پھر اسی ادارہ سے دوبارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ/
- مئی ۲۰۰۹ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ ابتدائیہ مولانا اسید الحق
- قادری کے قلم سے ہے جس میں کتاب اور مصنف کا مختصر تعارف گرایا
- گیا ہے۔ تعارف مصنف کے لیے مولانا عبدالعلیم شرف قادری کی
- ۲۳ صفحات پر مشتمل ایک قیمتی تحریر بھی شامل اشاعت ہے۔ علامہ شرف
- قادری کی یہ تحریر پہلی بار سیف الجبار (مصنفہ شاہ فضل رسول بدایوں،
- مطبوعہ مکتبہ رضویہ لاہور ۱۹۷۲ء) بطور مقدمہ شائع ہوئی تھی۔ تاج
- اللہ کنڈی کا نسخہ اصل فارسی کے بجائے پوری کتاب کا اردو ترجمہ
- ہے اور حوالہ جات کی تخریج و تحقیق سے مزین ہے۔ ترجمہ و ترتیب جدید،
- تحقیق و تخریج اور حوالہ جات کا اہم کام مولانا اسید الحق قادری نے انجام
- دیا ہے۔ بقول مترجم:
- "یہ لفظی اور حرفی ترجمہ نہیں ہے بلکہ اگر اس کو تخیل و اختصار
- کہا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے اصل کتاب کی
- ہر عبارت اور ہر لفظ کا ترجمہ میں پایا جانا ضروری نہیں ہے۔"
- (ابتدائیہ ص ۶)
- عقیدہ شفاعت کتاب وسنت کی روشنی میں:
- یہ کتاب بھی شاہ فضل رسول بدایونی کی تصنیف ہے جو بقول

- مرتب مولانا اسید الحق قادری مصنف کی جانب سے ۱۲۶۸ھ میں
- تالیف کی گئی۔ شاہ فضل رسول بدایونی نے شاہ اسماعیل دہلوی کی نہایت
- متنازعہ اور گمراہ کن کتاب "تقویۃ الایمان" کے رد میں اور تنقیدی محاسبے
- کا جو سلسلہ شروع کیا تھا یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب
- کا پورا نام "فوز المومنین بشفاعۃ الشافعیین" ہے۔ یہ کتاب پہلی
- مرتبہ ۱۲۶۸ھ میں مطبع مفید الخلق دہلی سے شائع ہوئی۔ ۱۳۱۰ھ/
- ۱۹۹۸ء میں مفتی عبدالعلیم نوری مصباحی کی تسہیل کے ساتھ ماہ نامہ مظہر
- حق بدایوں میں اپریل تا اکتوبر ۱۹۹۸ء قسط وار شائع ہوئی۔
- ۱۴۲۹ھ/ جنوری ۲۰۰۹ء میں یہ کتاب مولانا اسید الحق قادری کی
- ترتیب، تسہیل اور تخریج اور حواشی و تعلیقات کے ساتھ آسان عربی نام
- "عقیدہ شفاعت" کتاب وسنت کی روشنی میں" کے نام سے منظر عام
- پر آئی ہے۔ کتاب کی عام افادی پہلو کے پیش نظر اس کا ہندی ایڈیشن
- بھی تاج اللہ کنڈی سے شائع ہو چکا ہے۔ کل صفحات ۱۴۰ ہے۔
- اخیر میں ایک صفحہ میں طبع اول کے سرورق کا عکس بھی دے دیا گیا جو
- تحقیق و تدوین کا موجودہ رائج طریقہ ہے ساتھ ہی فہرست مشمولات
- بھی کتاب کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے تاکہ مضامین کتاب سے عام
- قاری کے لیے استفادہ آسان ہو جائے۔
- کتاب، ہشمولات کتاب اور اشاعت جدید میں کتاب کی
- ترتیب و تسہیل اور تخریج و تحقیق کے لیے امور طوطی کی تفصیل پر مشتمل ۳
- صفحات میں ایک ابتدائیہ بھی مرتب کے قلم سے شامل ہے۔
- مرتب موصوف نے ہشمولات کتاب کا جامع تعارف ان الفاظ
- میں قلم بند کیا ہے:
- "شاہ اسماعیل دہلوی صاحب نے "تقویۃ الایمان" میں
- دوسرے مسائل کے ساتھ شفاعت کے مسئلہ پر بھی بحث کی
- ہے۔ انہوں نے شفاعت کی تین قسمیں کی ہیں۔ شفاعت
- بالوجاہت، شفاعت بالمحبہ اور شفاعت بالاذن۔ ان میں
- شاہ صاحب نے اول الذکر دو قسموں کا انکار کیا ہے اور صرف
- تیسری قسم کو جائز مانا ہے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے پہلے
- شفاعت کے سلسلے میں اہل سنت کے موقف کو کتاب وسنت
- سے ثابت کیا ہے اور اس کے بعد شفاعت کے متعلق "تقویۃ

الایمان“ کی پوری بحث کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ شاہ صاحب کے بعض حامیوں نے شفاعت کے مسئلہ میں ان کا دفاع کرتے ہوئے ”تنبیہ الغافلین“ کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ ”نور المؤمنین“ کے مصنف نے آخر میں اس رسالہ کا بھی تنقیدی محاسبہ کیا ہے۔ پوری کتاب مصنف کی تحقیقی گہرائی، وسعت مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔“ (ص ۵، ابتدائیہ)

الکلام السدید:

رسالے کا پورا نام ”الکلام السدید فی تحریر الاسانید“ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے اس رسالہ کا سن تالیف ۱۲۹۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ رسالہ تاریخ الخوارج مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے۔ انھوں نے یہ کتاب اپنے شاگرد رشید مولانا محمد حسن اسراغیلی سنبھلی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۰۵ھ) کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ اس میں آپ نے اپنی وہ تمام اسناد اور اجازتیں جمع فرمادی ہیں جو آپ کو محدث مکہ حضرت شیخ جمال بن عمر کی سے حاصل تھیں۔ ۱۳۰۸ھ میں اس کتاب کا ایک عربی نسخہ مطبع چبھائی دہلی سے طبع ہوا۔ ۱۲۹۹ھ رسال بعد اس کا طبع جدید ۱۳۲۹ھ/۲۰۰۸ء میں مطبع تاج الخوارج اکیڈمی سے اشاعت پذیر ہوا۔ اصل رسالہ عربی زبان میں ہے، مولانا اسیدالحق قادری ازہری نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور یہ اردو ترجمہ ہی اکیڈمی سے چھپا ہے۔ تعارف کتاب کے لیے ابتدائیہ اور تعارف مصنف کے لیے ایک مختصر مقدمہ مترجم کے قلم سے ہے، اخیر میں نسخہ مطبوعہ مطبع چبھائی کا عکس بھی دے دیا گیا ہے۔

سنت مصالحو:

یہ کتاب بھی تاج الخوارج مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے۔ کتاب کا اصل نام ”مناصحة فی تحقیق مسائل المصافحه“ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے رسالہ کا سن تصنیف ۱۲۹۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ اصل رسالہ عربی زبان میں ہے۔ مولانا اسیدالحق قادری نے اس کا اردو ترجمہ اور احادیث مبارکہ و اقوال علما کی تخریج بھی فرمائی ہے۔ آغاز کتاب میں ۶ صفحات پر مشتمل ”ابتدائیہ“ قلم بند کیا ہے جس میں انھوں نے صاحب کتاب اور کتاب کا مختصر تعارف کرایا ہے۔

مصنف کتاب مقصد تالیف اور مشمولات کتاب کو بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میں نے ’مناصحة فی تحقیق مسائل المصافحه‘

نامی رسالہ دوستوں اور احباب کی نصیحت اور اسلامی بھائیوں کی اصلاح کے واسطے تحریر کیا ہے، میں بعض لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ مصافحہ کے مسائل میں زبان درازی کرتے ہیں اور لڑائی جھگڑا کر کے شدت اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ انھوں نے مسائل جزئیہ فرعیہ میں تمام اہل اسلام پر کفر و کفران کا حکم لگا دیا ہے اور اپنے وہم و خیال کی پیدا کردہ باطل اور جھوٹی باتوں کو ثابت کرنے میں پوری قوت صرف کر دی۔

میں اللہ رب العزت کی ذات سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے اہل حق و صلاح کے اقوال میں تقیید اور مسائل مصافحہ میں تحقیق کی توفیق عطا فرمائے۔“ (ص ۱۱، احکام مصافحہ، تاج الخوارج اکیڈمی بدایوں، طبع جدید ۱۳۲۹ھ/۲۰۰۸ء)

خطبات صدارت:

یہ کتاب مختلف قومی و ملی اجلاس میں حضرت عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی کے پڑھے گئے خطبات صدارت میں تین خطبہ صدارت کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں جن اجلاسوں اور کانفرنسوں کے خطبات صدارت شامل ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ خطبہ صدارت مؤتمر تحفظ حقوق شرعی، منعقدہ ۲۹ رجب ۱۳۵۳ھ/۱۸ نومبر ۱۹۳۳ء بمقام کانپور

۲۔ خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ: اجلاس جمعیت علما ہند بمقام بدایوں، منعقدہ جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ/۱۹-۲۰-۲۱ اکتوبر ۱۹۵۳ء

۳۔ خطبہ صدارت آل انڈیا نظام کانفرنس، منعقدہ لاہور، ۱۹۲۶ء

ان خطبات صدارت کی ترتیب مولانا اسیدالحق قادری نے انجام دی ہے۔ حضرت مفتی اعظم عدالت عالیہ مملکت آصفیہ حیدرآباد کے پچاسویں یوم وصال (۳ رشتوال ۱۳۲۹ھ/اکتوبر ۲۰۰۸ء) کے مبارک موقع پر تاج الخوارج اکیڈمی بدایوں کے زیر اہتمام کتابی صورت میں اس کی پہلی اشاعت ہوئی ہے۔ شروع میں تین صفحات پر ایک

تعارفی تحریر بھی مرتب نے قلم بند کی ہے، جس میں ان خطبات صدارت کا تعارف ساتھ ہی حضرت عاشق الرسول کی سیاسی بصیرت، ملی قیادت، ملکی اور بین الاقوامی مسائل و تحریکات میں شمولیت اور قائدانہ کردار پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ مرتب موصوف نے خطبات صدارت پر اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

”ان خطبات صدارت سے حضرت عاشق الرسول کی سیاسی بصیرت، دینی حمیت، قوم و ملت کے مسائل و مصائب پر ان کی ترب، ملتی زبوں حالی پر ان کی فکر مندی، مت کے روشن مستقبل کے لیے ان کے عزائم و جذبات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔“ (ص ۶، ابتدائیہ)

ان خطبات صدارت کے علاوہ حضرت عاشق الرسول کی ملی اور سیاسی فکر و شخصیت کے عمدہ جائزہ پر مشتمل پروفیسر محمد مسعود احمد نقشبندی علیہ الرحمہ کا ایک و قیع مضمون ’مولانا عبدالقدیر بدایونی اور سیاست قدیمہ و جدیدہ‘ مطبوعہ قادریہ لاہور، ۱۹۷۸ء بھی شامل اشاعت کیا ہے۔ بطور مقدمہ تین صفحات میں حضرت عاشق الرسول کے احوال، دینی، ملی اور ادبی خدمات پر مشتمل ایک جاندار مضمون بھی مرتب موصوف نے تحریر کیا ہے، جو نہایت معلوماتی اور لائق مطالعہ ہے۔

مثنوی غوثیہ:

یہ کتاب بھی عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی کی تصنیف ہے، جو ۹۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی مخصوص حالات کے زیر اثر بارگاہ غوثیت میں استقامت و استمداد کے طور پر ۱۳۳۹ھ/۱۹۱۹ء میں نظم کی گئی۔ یہ مثنوی پہلی بار ۱۳۳۰ھ میں مطبع حسینی پریس حیدرآباد سے طبع ہوئی۔ مولانا اسیدالحق قادری کی ترتیب کے ساتھ یہ مثنوی ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ/نومبر ۲۰۰۸ء میں ۳۵ صفحات پر مشتمل شائع ہوئی ہے۔ مثنوی کے اشعار کتاب کے ص ۳۱ تا ص ۳۵ پر شامل ہیں۔

عرض مرتب کے تحت مولانا اسیدالحق قادری لکھتے ہیں:

”اس مثنوی میں) مدوح سے والہانہ محبت، جذبہ خود سپردگی، ناز و نیاز عشق اور قلبی واردات کا بے ساختہ اظہار اپنی جگہ لیکن اگر محض زبان و بیان کے رُخ سے مثنوی کا جائزہ لیا جائے تو انکشاف ہوگا کہ اس پہلو سے بھی یہ مثنوی اعلیٰ شعری

کمال کا ایک بے داغ نمونہ ہے۔“ (ص ۶، عرض مرتب)

بقول ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی:

”اس کی زبان و بیان کی حلاوت، عالمانہ بصیرت، الفاظ کی شگفتگی، تراکیب کی برجستگی، صفا شعرا میں بھی آپ کو امامت کا حق دار کرتی ہے۔“ (ص ۹، تقریظ)

آغاز کتاب میں مرتب کتاب مولانا اسیدالحق قادری نے عرض مرتب اور صاحب مثنوی کی حیات و شخصیت پر اپنا تحریر کردہ ایک تفصیلی مضمون کے علاوہ ’مثنوی غوثیہ‘ ایک جائزہ کے تحت انھوں نے مثنوی کا تاریخی پس منظر، مثنوی غوثیہ کی تسبیحات پر اچھی گفتگو کی ہے۔

فلاح دارین:

(۲۵۰ احادیث مبارکہ کا مستند مجموعہ): کتاب کے مؤلف نمبر ۲ تاج الخوارج مولانا عبدالماجد قادری بدایونی ہیں۔ کتاب کا اصل نام ’فلاح دارین باجناغ سید الکونین‘ ہے، جو عقائد، عبادات، اخلاق و آداب، تہذیب نفس، معاملات، معشرت و منذرات سے متعلق منتخب احادیث کا ایک مستند مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۳۳۱ھ/۱۹۲۱ء میں تالیف کی گئی۔ پہلی اشاعت کی تصحیح، کتابت اور نظر ثانی کا کام حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن قادری بدایونی (مدرس مدرسہ قادریہ بدایوں) نے کی۔ زیر نظر اشاعت میں احادیث کی تخریج و تصحیح کا کام نوجوان فاضل مولانا دلشاد احمد قادری نے اپنے استاذ محترم، محقق عصر مولانا اسیدالحق قادری کی زیر نگرانی اور علمی معاونت سے انجام دیا ہے۔ شروع کتاب (ص ۹ تا ۳۷) میں مؤلف کتاب حضرت مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کی شخصیت اور خدمات پر ایک تفصیلی مضمون بقلم مولانا اسیدالحق عاصم قادری تعارف مصنف کے بطور شامل ہے۔

اس و قیع تحریر میں انھوں نے مولانا عبدالماجد قادری کے احوال، مدرسہ شمس العلوم کا احیا اور جدید کاری، قومی و سیاسی خدمات، خلافت کمشنری (۱۹۱۹ء)، جمعیت علما ہند، جمعیت علما کانپور میں بحیثیت صدر، رکن اساسی اور بانیان شرکت و شمولیت سبھی مناظرے، تبلیغی کانفرنس کا انعقاد، جوہر خطبات اور قلمی خدمات کا تفصیلی و تحقیقی ذکر کیا ہے۔

مصنف کتاب کے تعلق سے اپنے تعارفی مضمون میں ایک شبہ کا ازالہ کے عنوان کے تحت مولانا اسیدالحق قادری لکھتے ہیں:

”مولانا عبدالماجد بدایونی کے بارے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ انھوں نے ایک تقریر میں گاندھی جی کو ’مبعوث من اللہ‘ کہا تھا یا یہ کہا تھا کہ اللہ نے انھیں مذکر بنا کر بھیجے ہے۔“ اس زمانے میں اس بات کا کافی چرچہ ہوا اور آج بھی یہ جملہ مولانا بدایونی کی طرف منسوب کر کے وقتاً فوقتاً لکھ دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں جب اس کی شہرت ہوئی تو حلقہ علماء میں ایک بے چینی پھیل گئی۔ بات دارالافتا تک پہنچی اور مولانا عبدالماجد بدایونی کے خلاف فتوے صادر کیے گئے۔ لہذا ضروری ہے کہ یہاں اس سلسلے میں وضاحت کر دی جائے تاکہ مولانا بدایونی کے بارے میں کوئی غلط فہمی راہ نہ پاسکے۔“ (ص ۲۳)

پھر مولانا حبیب الرحمن قادری بدایونی کی کتاب ’البیان‘ میں مولانا بدایونی کے وضاحتی مکتوب کی روشنی میں اس پہلو پر تحقیقی گفتگو قلم بند کرنے کے بعد اخیر میں رقم طراز ہیں:

”مولانا عبدالماجد بدایونی کی صفائی اور برأت کے لیے خود ان کی یہ وضاحتیں بہت کافی ہیں، ان کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔“ (ایضاً، ص ۲۷)

عرس کی شرعی حیثیت:

زیر نظر کتاب ’عرس کی شرعی حیثیت‘ حضرت مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کے دو رسائل کا مجموعہ ہے: (۱) فتویٰ جواز عرس (۲) القول السدید۔ یہ دونوں رسائل بالترتیب ۱۳۲۹ھ اور ۱۳۳۰ھ میں نظمی پریس بدایوں سے شائع ہوئے تھے۔

زیر نظر کتاب میں پہلا رسالہ ص ۳۰ تا ۵۲ جب کہ دوسرا رسالہ ص ۵۳ تا ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں دونوں رسائل کی فہرست مشمولات ۲ صفحات، اس کے بعد حرف آغاز ۳ صفحات جب کہ صاحب کتاب کی شخصیت اور خدمات پر تفصیلی مضمون ۱۰ تا ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں تحریر مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے ہے۔ حرف آغاز میں دونوں کتابوں کا جامع تعارف ہے۔ کتاب کی ترتیب جدید و تخریج مولانا دلشاد احمد قادری نے آپ کی زیر نگرانی انجام دیا ہے۔ تحقیق و تجزیہ مولانا اُسید الحق قادری کے قلم کا مہربان منت ہے۔ جدید ترتیب و تخریج اور تجزیہ و تعلق نے کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت میں اضافہ کے ساتھ

اس سے عام قارئین کے لیے استفادہ کی راہ کو آسان تر کر دیا ہے۔

عقائد اہل سنت:

یہ کتاب نبیرہ فضل رسول مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی (وصال ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء) کی تصنیف ہے۔ ’عقائد اہل سنت‘ کا اصل نام ’تصحیح العقائد‘ ہے۔ یہ کتاب ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں تالیف کی گئی تھی۔ اب تک ہندوپاک کے متعدد اشاعتی ادارے سے اس کی طباعت ہو چکی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں نظمی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۱ء میں شرکت حنفیہ لاہور، ۱۹۹۶ء میں طلبہ جماعت خامسہ جامعہ اشرفیہ مبارکپور، ۲۰۰۰ء میں ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان سے اس کی اشاعت عمل میں آئی اور اب ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ/نومبر ۲۰۰۸ء میں تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے جدید آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔

آغاز کتاب میں ابتدائیہ (۳ صفحات) کے بعد صاحب کتاب مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کی سیرت و خدمات پر مولانا سید محمد فاروق القادری (پاکستان) کا تفصیلی مضمون شامل اشاعت ہے۔ مولانا فاروق قادری کنسلٹنٹ اسلامک اسٹڈیز نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کراچی کا تعارف مصنف پر یہ موقع مضمون کتاب کے ص ۱۱ سے شروع ہو کر ص ۲۸ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا عاشق الرسول مفتی عبدالقدیر بدایونی، مفتی محمد ابراہیم قادری مفتی اعظم ممبئی، مفتی محمد قدیر بخش مفتی ریاست جے پور کی تقریظ ہے جو کتاب کی اہمیت کو بتانے کے لیے کافی ہے۔ تخریج و تحقیق کا کام مولانا دلشاد احمد قادری (استاذ مدرسہ قادریہ بدایوں) نے انجام دیا ہے۔ ان کی تحقیقی صلاحیت پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ابتدائیہ میں مولانا اُسید الحق قادری تحریر فرماتے ہیں:

”کتاب کی تخریج اور نظر ثانی وغیرہ کا مشکل کام عزیز گرامی مولانا دلشاد احمد قادری (استاذ مدرسہ قادریہ بدایوں) نے انجام دیا ہے۔ مولانا گذشتہ دو سال سے راقم الحروف کے زیر نگرانی تخریج و تحقیق کا کام کر رہے ہیں، پڑھنے پڑھانے کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ مزاج تحقیقی ہے، سختی اور جفا کش ہیں۔“ (ص ۹، ابتدائیہ)

دعوت عمل:

یہ کتاب بھی نبیرہ تاج الفحول مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی کی تصنیف ہے، جو نواب سر نظامت جنگ بہادر وزیر سیاسیات مملکت آصفیہ حیدر آباد کی خواہش و فرمائش پر ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں لکھی گئی اور پہلی مرتبہ ۱۳۵۲ھ ہی میں اعظم اسٹیٹ پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔ ۱۴۲۹ھ/نومبر ۲۰۰۹ء میں تاج الفحول اکیڈمی سے اس کی جدید اشاعت عمل میں آئی ہے، جو ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

آغاز کتاب سے پہلے ابتدائیہ کے تحت کتاب اور صاحب کتاب کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے جو مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے ہے، جب کہ تعارف مصنف کے لیے پروفیسر ڈاکٹر جلال الدین احمد نوری (سابق چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، کراچی یونیورسٹی، پاکستان) کا جامع مضمون مطبوعہ ’مجلہ نذرانہ عقیدت‘ بموقع ’مولانا بدایونی کانفرنس ۲۰۰۴ء‘ شامل اشاعت ہے۔

مختلف عنوانات پر مسلمانوں کی اصلاح کے لیے آیات قرآنی کا ایک خوبصورت انتخاب ہے اور بقول مصنف:

”اگر ان آیات کو ہر مسلمان ترجمہ کے ساتھ یاد کر کے اپنی زندگی کے لمحات میں غور و فکر کرتا رہے کہ میں نے اس لمحہ عمل کے خلاف کس طرح قدم اٹھایا اور کتنا موافق عمل کیا اور مجھے اب کیا کرنا چاہیے تو بلاشبہ ہماری اصلاح ہو جائے گی اور مقاصد جلیلہ میں نمایاں کامیابی نظر آنے لگے گی۔“ (ص ۷۰)

مروے سنتے ہیں:

یہ کتاب مولانا حکیم محمد عبدالقیوم شہید قادری کی تصنیف ہے۔ طبع ازل ۱۳۱۸ھ میں مطبع حنفیہ پٹنہ جبکہ طبع جدید ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء میں تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے منظر عام پر آیا ہے۔ کتاب کا اصل نام ’سماح الاموات بالاحادیث والاثار‘ ہے۔ یہ رسالہ سماح اموات اور روحوں سے مدد طلب کرنے پر ہر دم جواز کے فتویٰ مطبوعہ ماہنامہ ’آثار السنن‘ پٹنہ، شمارہ ۳ کے جواب میں قلم بند کیا جو پہلے دو قسطوں میں اہل سنت و جماعت کے معروف رسالہ ’ماہنامہ تحفہ حنفیہ‘ پٹنہ بابت محرم ۱۳۱۸ھ اور بابت صفر ۱۳۱۸ھ میں طبع ہوا۔ پھر اسے قاضی عبدالوحید فردوسی مدیر ماہنامہ ’تحفہ حنفیہ‘ نے اپنے اشاعتی ادارہ مطبع حنفیہ پٹنہ سے علاحدہ کتابی

شکل میں شائع کیا۔ زیر نظر اشاعت تسہیل و ترتیب جدید اور تخریج و ترجمہ عربی و فارسی عبارات کے بعد شائع ہوئی ہے۔

’حرف آغاز‘ کے عنوان سے مولانا اُسید الحق قادری نے رسالہ کا تعارف اور سبب تالیف تحریر کیا ہے جو تین صفحات پر مشتمل ہے۔ ’تعارف مصنف‘ کے نام سے ۱۱ صفحات میں مصنف کتاب کے احوال و خدمات پر مشتمل تحریر بھی شامل اشاعت ہے۔ یہ تحریر بھی مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے ہے۔

جدید ترتیب، تسہیل، تخریج حوالہ جات اور ترجمہ عربی و فارسی عبارات مولانا دلشاد احمد قادری کے قلم سے ہے۔ شروع میں فہرست مشمولات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مضامین حمید:

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مولانا حکیم محمد عبدالقیوم شہید قادری بدایونی کے مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ سبھی تحریریں انھوں نے ۱۳۱۵ھ اور ۱۳۱۸ھ کے درمیانی عرصے میں لکھیں اور ماہ نامہ ’تحفہ حنفیہ‘ میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ شفاعت، علم، حق کی بلندی، شبِ برأت، رمضان المبارک جیسے اہم موضوعات پر مضامین کا یہ گلدستہ عوام و خواص سب کے لیے مفید ہے۔

ان مقالات کی ترتیب و تخریج صاحبزادہ مولانا محمد عطیہ قادری نے انجام دی ہے۔ شروع میں دو صفحات میں ’حرف آغاز‘ کے عنوان سے اس کی تفصیل بھی انھوں نے قلم بند کر دی ہے کہ کتاب میں شامل یہ مضامین کب اور کس پرچے یا مجلہ میں شائع ہوئے۔

صاحب کتاب کے تعارف و شخصیت اور خدمات و کارنامے پر دو اہم تحریریں بھی مرتب موصوف نے شامل اشاعت کی ہیں: (۱) ’تعارف مصنف‘، بقلم مولانا اُسید الحق محمد عاصم قادری، ص ۱ تا ۸ (۲) ’حکیم عبدالقیوم شہید: حیات و شخصیت‘، بقلم مولانا محمد عبدالحی صدیقی قادری۔ مولانا شہید پر یہ مضمون مرتب نے ماہنامہ ’تحفہ حنفیہ‘ پٹنہ (جلد ۴، شمارہ ۹-۱۰، بابت رمضان و شوال ۱۳۱۸ھ) سے لیا ہے۔

طہ اسلام کا ماضی، حال، مستقبل:

یہ کتاب بھی مولانا حکیم محمد عبدالقیوم شہید قادری بدایونی کی ہے۔ یہ کتاب مدرسہ اہل سنت (پٹنہ) کے بانی و مہتمم اور ماہنامہ ’تحفہ حنفیہ‘ پٹنہ

کے مدیر و منتظم حضرت مولانا قاضی عبدالوحید فردوسی کی فرمائش پر آپ نے قلم بند فرمایا۔ یہ مقالہ پہلے ماہنامہ 'تحفہ حنفیہ' میں قسط وار (جلد ۲، شمارہ ۲ تا شمارہ ۶، جمادی الآخر ۱۳۱۶ھ تا شوال المکرم ۱۳۱۶ھ) شائع ہوا۔ پھر مطبع اہل سنت پٹنہ سے کتابی شکل میں قاضی صاحب کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۳۱۶ھ میں شائع ہوا اور پھر اس کے بعد ۱۳۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء میں اس کی جدید اشاعت مولانا اُسید الحق قادری کی ترتیب و تقدیم کے ساتھ تاج الفحول اکیڈمی سے (۶۸ صفحات) عمل میں آئی۔

یہ کتاب بقول مرتب:

”آج سے تیرہ سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس ایک صدی میں کتنے انقلابات آئے، ماہ و سال نے کتنی کروٹیں لیں اور زمانے کے پیوں کے بیچے سے کتنی پانی بہہ گیا، اس کے باوجود اس کتاب کی اہمیت و افادیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی اس کے عہد تالیف میں تھی۔ مصنف نے جن خامیوں کو ہمارے زوال کا سبب قرار دیا تھا وہ آج بھی جیوں کی تیوں ہمارے اندر موجود ہیں اور ترقی و عزت کے لیے جن زینوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ آج بھی کسی آنے والے کی راہ تک رہے ہیں۔“

(ص ۸، حرف آغاز)

احکام قیور:

۲۰ صفحات پر مشتمل اس اہم کتاب کے مصنف مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی ہیں۔ کتاب کا پورا نام 'البناء المتین فی احکام قیور المسلمین' ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے رسالہ کا سن تالیف (۱۳۳۳ھ) برآءد ہوتا ہے۔ اسی سال یہ کتاب پہلی بار بدایوں سے طبع ہوئی۔ ۱۳۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء میں تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے مولانا دلشاد احمد قادری کی تخریج و تحقیق کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ مسلمانوں کی قبر کی حرمت اور تعظیم، ایذائے امواتِ مسلم سے احتراز اور مشائخ و بزرگ اور صالح علما کی قبروں کو پختہ بنانے جانے کے جواز پر یہ ایک جامع رسالہ ہے۔ پوری کتاب مدلل و مستند دلائل و حوالہ جات سے آراستہ ہے۔ زیر نظر اشاعت میں 'ابتداءً' کے عنوان سے صاحب کتاب کا بڑا معلوماتی تذکرہ شامل اشاعت ہے جو مولانا اُسید الحق قادری کے قلم حقیقت رقم سے ہے۔ حوالہ جات کی تخریج و تحقیق کا کام مولانا دلشاد احمد

قادری نے انجام دیا ہے۔ کتاب کے اخیر میں دو صفحات میں مولانا حبیب الرحمن قادری بدایونی اور مفتی محمد عبدالقدیر قادری بدایونی کی تصدیقات بھی ہیں۔

ریاض القراءت:

یہ کتاب بھی مفتی محمد ابراہیم قادری کی تالیف کردہ ہے جو انھوں نے ۱۳۲۸ھ میں تحریر فرمایا تھا اور اسی سال یہ کتاب امیر الاقبال پریس بدایوں سے اشاعت پذیر ہوا۔ قاری محمد شان رضا قادری (استاذ حفظہ و تجوید مدرسہ قادریہ بدایوں) کی ترتیب جدید اور اضافہ مفید کے ساتھ ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ/ نومبر ۲۰۰۸ء میں تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔ یہ رسالہ اپنے اختصار کے باوجود جامع اور علم تجوید و قرأت کے مبتدی طلبہ کے لیے بے حد مفید ہے۔ قاری محمد شان رضا قادری نے مولانا اُسید الحق قادری کی زیر نگرانی بڑی سلیقہ مندی سے رسالہ کے قدیم زبان و اسلوب کی تسہیل، ترتیب جدید اور بعض جگہ مفید چیزوں کا اضافہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب درسی کتب میں شامل کیے جانے کی مستحق ہوگئی ہے۔ پوری کتاب ۱۸۱ اسباق پر مشتمل ہے اور ہر سبق میں فن قرأت کے مبادیات کو بیان کیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب فن تجوید کے طلبہ کے لیے بیش قیمت تحفہ ثابت ہوگی۔ شروع کتاب میں ایک صفحہ میں 'ابتداءً' ہے جو کتاب کے جامع تعارف پر ہے۔ اس کے بعد تعارف مصنف کے عنوان سے صاحب کتاب کے احوال و آثار پر مشتمل ایک و قیع مضمون بھی مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے زینت کتاب ہے۔

زیارت روضہ رسول:

یہ کتاب سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی کی تصنیف ہے۔ کتاب کا اصل نام 'اکمال فی بحث شد الرحال' ہے۔ یہ کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سن تالیف (۱۲۶۶ھ) برآءد ہوتا ہے۔ اصل رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ 'منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال' نامی رسالہ کے مشمولات کے متعلق سات سوالات کا علمی و تحقیقی جواب ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۳۶۶ھ میں مطبع الہی سے شائع ہوا تھا۔ ۱۳۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء میں یہ کتاب اپنی پہلی اشاعت کے تقریباً ۱۶۹ سال بعد مولانا اُسید الحق

قادری کے ترجمہ اور ترتیب جدید سے تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے 'زیارت روضہ رسول' کے عربی نام سے شائع ہوا ہے جو ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ اشاعت فارسی کے بجائے صرف اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اس اشاعت میں 'حرف آغاز' (۷ صفحات) بقلم مترجم اور 'تعارف مصنف' بقلم علامہ عبدالحکیم شرف قادری لاہوری شامل اشاعت ہے۔ کتاب کے سبب تالیف کو بتاتے ہوئے مترجم موصوف 'حرف آغاز' کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

”حضرت مولانا مفتی صدر الدین آزرده (م ۱۲۵۸ھ) صدر الصدور دہلی نے ۱۲۶۴ھ میں روضہ رسول کی زیارت کے مسئلہ پر 'منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال' نامی رسالہ تالیف کیا جو اسی سال شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ رسالہ پر استاذ مطلق علامہ فضل حق خیر آبادی اور مفتی سعد اللہ مراد آبادی نے تقریظات تحریر فرمائیں..... منتہی المقال اپنے موضوع پر ایک تحقیقی اور جامع کتاب ہے۔ اس سے مسئلہ زیارت کی تحقیق و وضاحت کے ساتھ مفتی صدر الدین آزرده صاحب کے وسعت مطالعہ، علمی گہرائی اور تحقیق اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ منتہی المقال کی پہلی اشاعت کے بعد کسی صاحب نے اس کے مباحث کے سلسلے میں سات سوالات لکھ کر سیف اللہ المسلمول کی خدمت میں بھیجے۔ زیر نظر رسالہ دراصل انھیں سات سوالات کے جواب پر مشتمل ہے۔“ (ص ۶، حرف آغاز)

حزب معظم

یہ کتاب بھی سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی کی تصنیف ہے، آثار و تبرکات سے برکت و تعظیم اس کتاب کا موضوع ہے۔ 'حزب معظم' کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف (۱۲۶۵ھ) برآءد ہوتا ہے۔ یہ کتاب آپ نے اردو زبان میں تصنیف فرمائی۔ پھر آپ کے صاحبزادہ گرامی تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی نے حاجی محمد خاں صاحب بہادر کی فرمائش پر اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، جو 'مجموعہ رسائل و فرائد' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں 'حزب معظم' کے علاوہ تین رسائل اور ہیں۔ یہ مجموعہ مطبع کوہ نور لاہور سے

۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا۔ مولانا اُسید الحق قادری نے اسی فارسی والے نسخہ کو اردو ترجمہ و تخریج کے ساتھ رمضان ۱۳۳۰ھ/ ستمبر ۲۰۰۹ء میں تاج الفحول اکیڈمی سے شائع کیا ہے۔ اس ایڈیشن میں پوری کتاب کا سلیس اردو ترجمہ اور حوالہ جات کی تخریج شامل اشاعت ہے۔ 'حرف آغاز' مترجم کے قلم سے ہے۔ 'تعارف مصنف' کے لیے انھوں نے علامہ شرف قادری کی تحریر کو شامل کیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۵۶ ہے۔ 'حرف آغاز' میں پوری کتاب کا ایک جامع تعارف ان الفاظ میں قلم بند کیا گیا ہے:

”رسالہ (کتاب) کو مصنف نے تین فصولوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلی فصل میں تبرکاتِ اصلہ سے خیر و برکت حاصل کرنے کا بیان ہے، جس کے لیے مصنف نے قرآنی آیات، معتبر تفسیر، صحیح احادیث اور علم کے اقوال سے استدلال کیا ہے۔ رسالہ کے زمانہ تالیف میں جو لوگ تبرکات و آثار کی تعظیم و تکریم اور ان سے خیر و برکت حاصل کرنے کے منکر تھے وہ خاندانی طور پر بھی اور علمی طور پر بھی اپنا شجرہ شاہ ولی اللہ اور ان کے مدرسہ سے جوڑتے تھے، اسی لیے مصنف نے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی تفسیر 'فتح العزیز' اور ان کے والد مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ملفوظات و مکتوبات سے خاص طور پر حوالے نقل کیے ہیں۔ اب اگر تبرکات کے سلسلے میں کوئی فنیو شرک و بدعت صادر ہوتا ہے تو اس کی زد میں سب سے پہلے خانوادہ شاہ ولی اللہ دہلی آتا ہے۔

دوسری فصل میں تبرکاتِ مثالیہ غیر منصوصہ کے سلسلے میں بحث کی گئی ہے اور تیسری فصل میں تبرکاتِ مثالیہ مصنوعہ کو معرض بحث میں لایا گیا ہے۔“ (ص ۶، حرف آغاز)

فصل الخطاب:

یہ کتاب بھی مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی کی تصنیف ہے۔ رسالہ کا پورا نام 'فصل الخطاب بین السنی و بین احزاب عدو اللہ' ہے۔ یہ رسالہ کا تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف (۱۲۶۸ھ) برآءد ہوتا ہے۔ یہ رسالہ پہلی بار ۱۲۶۸ھ میں مطبع مفید الخلائق دہلی سے شائع ہوا۔ ۱۶۲ سال بعد مولانا اُسید الحق قادری نے

رمضان ۱۴۳۰ھ / ستمبر ۲۰۰۹ء میں تسبیل، ترتیب اور تخریج کے ساتھ تاج الخول اکیڈمی سے شائع کیا، جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اصل رسالہ کی ترتیب بقول مترجم یہ ہے:

”آپ نے (شاہ فضل رسول بدایونی) شاہ اسماعیل دہلوی صاحب کی کتاب تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم سے دس اقوال کا انتخاب کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ یہ اقوال اہل سنت کے مخالف ہیں اور معتزلہ، خوارج یا شیعہ وغیرہ کے عقائد و نظریات کے موافق ہیں۔ پھر ان عقائد و نظریات کی تردید میں آپ نے علمائے اہل سنت اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتب سے استدلال کیا ہے۔ پھر آپ نے اس پوری بحث کو استغناء کی شکل دے کر علما کی رائے طلب کی، اس وقت کے اٹھارہ جلیل القدر علما (جن میں اکثر خانوادہ ولی اللہی کے فیض یافتہ ہیں) نے متفقہ طور پر اس بات کی تائید و تصدیق کی کہ: قائل کی دسوں باتیں باطل ہیں، حق کے مخالف ہیں، ان اقوال کا قائل اور جو شخص ان اقوال کو حق سمجھے سب اہل سنت سے خارج ہیں۔“ (ص ۶، ابتدائیہ)

اس میں بھی تعارف مصنف کے لیے علامہ شرف قادری کا مضمون شامل اشاعت ہے۔ تسبیل کے وقت یہ کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کا اسلوب اور لب و لہجہ ممکنہ حد تک برقرار رہے۔ اس لیے عموماً الفاظ کی تشدد یا تاخیر کے علاوہ اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے۔ متن میں اردو، عربی، فارسی عبارات کے ترجمے کر دیے گئے ہیں اور حتی الامکان عبارتوں کی تخریج کر دی گئی ہے۔

اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ:

یہ کتاب اہل سنت و جماعت کے معمولات و مراسم پر ہندوستان کے آخری مظل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استغناء کا جواب ہے۔ یہ فتویٰ سب سے پہلے مطبع مفید الخلائق دہلی سے ۱۲۶۸ھ میں شائع ہوا، اس کے بعد دوسری بار اسی مطبوعہ نسخہ سے منقول ہو کر اکل التاریخ مصنفہ مولانا ضیاء القادری میں ۱۳۳۳ھ میں طبع ہوا۔ اصل استغناء فتویٰ فارسی زبان میں ہے۔ سب سے پہلے اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر شیخ عظیم الدین قادری قدیری مرید و خادم خاص مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی نے

۱۹۷۰-۱۹۸۰ء کے درمیانی برسوں میں کیا اور اپنے ادارہ مدینہ اعلم کلکتہ سے شائع کیا۔ بعد میں یہ ترجمہ ماہ نامہ ’مظہر حق‘ بدایوں اور پاکستان سے شائع ہوا۔ ۴۰-۴۵ سال کے بعد مولانا اسید الحق قادری کے ترجمہ و ترتیب جدید کے ساتھ رمضان ۱۴۳۰ھ / ستمبر ۲۰۰۹ء میں جدید آب و تاب کے ساتھ تاج الخول اکیڈمی بدایوں سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس تازہ اشاعت میں تعارف مصنف کے لیے علامہ شرف قادری کا وہی مضمون شامل اشاعت ہے جو دیگر کتب سیف المسلمول پر چھپا ہے۔ ’حرف آغاز‘ مرتب کتاب کے قلم سے ہے جس میں اس کتاب کی تاریخی و علمی اور تحقیقی حیثیت اور اس فتویٰ کے بعض جملے پر مخالفین اہل سنت کے مقابلے اور شبہات کا مسکت جواب بھی دیا گیا ہے۔ کتاب کے نئے ترجمہ کی ضرورت کو بتاتے ہوئے مترجم کتاب تحریر فرماتے ہیں:

”ڈاکٹر (شیخ عظیم الدین قادری قدیری) صاحب کا ترجمہ سلیس اور عمدہ تھا مگر اس کو ۳۰-۴۰ برس گزر گئے، لہذا بعض وجوہات کی بنیاد پر از سر نو ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، راقم الحروف نے اپنی کم علمی کے باوجود فارسی کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ مصنف رسالہ نے جہاں علما کی عربی عبارات لکھنے کے بجائے صرف فارسی ترجمہ لکھنے پر اکتفا کیا تھا، اب اصل کتابوں کی طرف رجوع کر کے ساتھ میں عربی عبارات بھی شامل کر دی گئی ہیں اور حتی الامکان آیات، احادیث اور عبارتوں کی تخریج بھی کر دی گئی ہے۔“ (ص ۸، حرف آغاز)

فتویٰ کی تاریخی و علمی حیثیت کے پیش نظر رضا اکیڈمی ممبئی کے زیر اہتمام تاج الخول اکیڈمی کا یہی ایڈیشن دوبارہ منظر عام پر آ چکا ہے۔

مولود معلوم (مع انتخاب نعت و مناقب):

سیف اللہ المسلمول کے شعری کلام کا مجموعہ ہے، جو میلاد نامہ یا مولود اور نعت و مناقب پر مشتمل ہے۔ میلاد نامہ مع قصائد کے نام سے سیف اللہ المسلمول کا مجموعہ کلام تذکرہ شعرائے بدایوں کے مطابق ۱۲۹۲ھ رفیق یاوردولہ ریاست علی خلف الصدق نواب سرفراز الدولہ کی فرمائش پر مطبع سرکار عالی حیدر آباد دکن میں چھپا، جس کا ایک نسخہ

انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں موجود ہے۔ (جلد ۲، ص ۲۲۹) تاج الخول اکیڈمی بدایوں سے مولانا اسید الحق قادری کی ترتیب سے جو نسخہ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ / دسمبر ۲۰۰۹ء میں سامنے آیا ہے وہ بقول مرتب:

”مولانا عبدالماجد بدایونی کی اجازت و اہتمام اور نواب سید خواجہ غلام محمد عرف حفیظ اللہ خاں بہادر ساکن حیدر آباد کی فرمائش پر مطبع قادری بدایوں سے ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوا، جو ۱۲۴ صفحات پر مشتمل تھا اور اس میں مولود منظوم کے علاوہ اردو نعت و مناقب، ۲۶ فارسی غزلیات اور ۱۰ محسن شامل تھے۔“ (ص ۹، ابتدائیہ)

نسخہ تاج الخول اکیڈمی مرتبہ مولانا اسید الحق قادری ۱۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں بطور تقدیم سات صفحات پر ایک ابتدائیہ ہے جس میں حضرت سیف اللہ المسلمول کی عربی، فارسی اور اردو میں بہاریہ شاعری نیز نعت و مناقب، نظم نگاری پر بڑی اچھی گفتگو کی گئی ہے۔

رد و رافض:

یہ کتاب تاج الخول حضرت مولانا عبدالقادر قادر بدایونی کی شیعہ و روافض کے رد میں چار رسائل کا مجموعہ ہے۔ یہ چاروں رسائل حضرت تاج الخول کے شاگرد رشید اور خانوادہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے جلیل القدر فرزند حضرت مولانا اسید شاہ حیدر حسینی برکاتی مارہروی قدس سرہ کے سوال کے جواب میں تصنیف کیے گئے۔ چاروں رسائل کے نام یہ ہیں: (۱) رد و رافض (۲) حکمہ رد و رافض (۳) انظہار الحق (۴) تصحیح العقیدہ فی باب امیر معاویہ۔ مولانا اسید شاہ حیدر حسینی برکاتی مارہروی نے اسی زمانے میں ان رسائل کو ترتیب دے کر شائع کروایا۔

پہلا رسالہ معاصر علمائے بدایوں، بریلی، رام پور، مراد آباد، فرنگی محل کی تصدیقات کے ساتھ ۱۴۹۱ھ / ۱۸۷۵ء میں مطبع صبح صادق سینا پور سے شائع ہوا۔ دوسرا رسالہ ۱۴۹۲ھ / ۱۸۷۶ء میں اسی ادارے سے منظر عام پر آیا۔ تیسرا رسالہ بھی جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ / جولائی ۱۸۷۶ء میں اسی ادارے سے طبع ہوا اور چوتھا رسالہ پہلی مرتبہ مطبع ہتاب ہند میرٹھ سے مارچ ۱۸۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ بعد میں یہ چوتھا رسالہ مولانا شاہ حسین گردیزی کے اردو ترجمہ کے ساتھ اختلاف

علی و معاویہ کے نام سے محدث سورتی اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا، پھر یہی کتاب ۱۹۹۸ء میں تاج الخول اکیڈمی بدایوں سے طبع ہوا۔ اب یہ چاروں رسائل ایک ساتھ تاج الخول اکیڈمی بدایوں سے ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹ء میں ۱۱۶ صفحات پر مشتمل طبع ہوا ہے۔ بحیثیت مرتب حضرت سید شاہ حسین حیدر حسینی مارہروی کا نام باقی رکھا گیا ہے جو اس کے اصل مرتب تھے۔ البتہ شروع کے تیوں رسائل فارسی زبان میں تھے اس لیے اس کا اردو ترجمہ مولانا اسید الحق قادری نے کر دیا ہے جب کہ آخر الذکر رسالہ کے ساتھ مولانا شاہ حسین گردیزی (پاکستان) کا نام درج ہے جو اس کے اصل مترجم ہیں۔ البتہ مولانا گردیزی نے طوالت کے خوف سے عربی و فارسی عبارتوں کا صرف ترجمہ شامل کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں مولانا اسید الحق قادری نے عربی و فارسی عبارتیں درج کرنے کے ساتھ مولانا گردیزی کے ترجمہ پر نظر ثانی بھی کی ہے اور چاروں رسائل اور اس کے مرتب کے تعارف کے لیے ایک شاندار مقدمہ ابتدائیہ کے نام سے تحریر کیا ہے۔ ان ساری خصوصیات کی وجہ سے عام قاری کے لیے کتاب سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔

شارحہ الصدور:

یہ کتاب مولانا مفتی محمد حبیب الرحمن قادری بدایونی (فاضل مدرسہ قادریہ بدایوں، جمادی الاولیٰ ۱۳۲۶ھ / جولائی ۱۹۰۸ء) کی تصنیف ہے ’شارحہ الصدور فی احکام القبور‘ کتاب کا تاریخی نام ہے، جس سے کتاب کا سن تالیف (۱۳۳۳ھ) برآمد ہوتا ہے۔ ۱۳۳۵ھ میں نجفی پریس مراد آباد سے اس کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کا دوسرا نام ’ارغام النجدیہ‘ ہے جس سے اس کا سن طبع برآمد ہوتا ہے۔ ۸۵ سال بعد تاج الخول اکیڈمی سے اس کی دوبارہ اشاعت ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹ء میں سامنے آئی ہے۔ عصری تقاضے کے پیش نظر اسلوب بیان کی تسبیل اور حوالہ جات کی تخریج مولانا محمد خالد رضا قادری (شاگرد عزیز مولانا اسید الحق قادری) نے اپنے استاذ محترم کی گمرانی میں انجام دیا ہے۔ اس کام کی تحسین کرتے ہوئے مولانا اسید الحق قادری فرماتے ہیں:

”یہ کتاب ان کی پہلی کوشش ہے جس کو انھوں نے کامیابی کے ساتھ مکمل کیا ہے، حتی الامکان کتاب میں موجود آیات و

احادیث اور عربی عبارتوں کی تخریج کردی گئی ہے۔ عربی و فارسی عبارتوں پر نظر ثانی کر کے ان کو آج کے زمانے کے مطابق عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں مصنف نے کسی عبارت کے چند ابتدائی الفاظ لکھ کر الخ آخرہ سے اس کی طرف اشارہ کیا تھا، ایسے مقامات پر اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے پوری عبارت درج کر دی گئی ہے۔“

(ص ۱۵، ابتدائیہ)
اس طبع جدید میں مولانا اُسید الحق قادری نے مصنف کتاب کے تعارف کے لیے دس صفحات میں بطور تقدیم 'ابتدائیہ' قلم بند کیا ہے، جس میں انھوں نے صاحب کتاب کے شخص تعارف کے ساتھ ان کی علمی، دینی، قومی، ملّی اور قلمی خدمات کا ایک بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ صاحب کتاب کا تعارف اور مختلف موضوعات پر ان کی گہرہ کتابوں کا وسیع تعارف پہلی بار اسی مقدمہ کے ذریعے سامنے آیا ہے۔

الدراسیہ فی الرسول الہادیہ

یہ کتاب شیخ الاسلام مولانا سید احمد بن زینی دحلان کی (ولادت ۱۲۳۱ھ مکہ مکرمہ، وصال محرم ۱۴۰۳ھ/۱۸۸۶ء، مدینہ منورہ) کی عربی تصنیف ہے، جس کا اردو ترجمہ مولانا حبیب الرحمن قادری نے شیخ غلام حسین چشتی وزیر آبادی کی فرمائش پر کیا اور انھیں کے صرفہ سے اسلامیہ انسٹیٹیوٹ پریس لاہور سے پہلی بار یہ کتاب چھپی۔ تاج الحول اکیڈمی سے اس کا طبع جدید ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء میں سامنے آیا ہے۔ نظر ثانی کا کام مولانا اُسید الحق قادری نے انجام دیا ہے اور جدید طرزِ کتابت کے ساتھ بعض جگہ ذیلی عناوین کا اضافہ کر کے کتاب کے حسن میں مزید چار چاند لگا دیا ہے۔ پوری کتاب ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے، شروع میں چار صفحات میں 'ابتدائیہ' ہے جس میں صاحب کتاب اور مترجم کتاب کا جامع تعارف تحریر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تحریکِ وہابیت کے اصلی روپ کو جاننے کے لیے ایک عربی مصنف کے قلم سے ہے۔ اس لیے کتاب کی اہمیت سے کسی کا انکار ممکن نہیں۔

مختصر سیرت خیر البشر:

یہ کتاب مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی (ولادت ۱۳۱۳ھ/۱۹۱۳ء، وصال ۱۱ محرم ۱۴۱۵ھ/۲۲ جون ۱۹۹۴ء) کی

تصنیف ہے۔ یہ پہلی بار ڈی الچہ ۱۴۳۰ھ/دسمبر ۲۰۰۹ء میں مولانا سید الحق قادری کی ترتیب کے ساتھ تاج الحول اکیڈمی سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس رسالہ کا نام مولانا اُسید الحق قادری نے خود تجویز فرمایا ہے۔ مرتب موصوف کو رسالہ کا مسودہ بحفظ مصنف ان کی صاحبزادی بیگم سید اکرام احمد رزاقی (اورنگ آباد) کے ذریعہ دستیاب ہوا۔ سیرتِ رسول کے موضوع پر نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ یہ ایک اہم کتاب ہے۔ کتاب کے آغاز میں مصنف کا مختصر تعارف اور رسالہ کے مسودہ کی حصولِ یابی کی تفصیل اور تعارفِ مشمولات پر 'حرفِ آغاز' کے نام سے دو صفحاتی تحریر بقلم مرتب شامل اشاعت ہے۔

باقیاتِ ہادی

یہ کتاب مولانا محمد عبدالہادی کے عربی، فارسی اور اردو مقالات و مضامین اور خطوط و مکاتیب کا مجموعہ ہے، جس کی ترتیب پہلی بار مولانا اُسید الحق قادری نے دی ہے۔ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ/دسمبر ۲۰۰۹ء میں تاج الحول اکیڈمی سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ مشمولات کتاب اس طرح ہیں: (الف) مضامینِ ہادی: اس کے تحت مولانا ہادی کے آٹھ 'رد و مقالات' ہیں۔ (ب) مکاتیبِ ہادی: اس کے تحت مختلف اہل علم و ادب کے نام خطوط و مکاتیب کا انتخاب ہے۔ (ج) لغاتِ ہادی: اس حصہ میں پہلے عربی، فارسی پھر اردو لغت و منقّب، اس کے بعد ردیف و غزلیات کا ایک انتخاب شامل ہے۔ (د) مقالاتِ الاموی: اس حصہ میں مولانا ہادی کے ان عربی مضامین کو شامل اشاعت کیا گیا ہے جو 'الاحد' میگزین نظام کالج حیدرآباد میں ۶۰ مارچ ۷۰ء کی دہائی میں اشاعت پذیر ہوئے۔ یہ مجموعہ مقالات و کلام ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں 'حرفِ آغاز' کے عنوان سے بقسم مرتب ایک مختصر تحریر بھی ہے جس میں مضامین و مشمولات اور صاحب قلم کا تعارف کرایا گیا ہے۔

غیاۃ حیات

مولانا محمد عبدالہادی بدایونی ہادی القادری کا مجموعہ کلام ہے۔ یہ مجموعہ کلام بقول مولانا اُسید الحق قادری خود مصنف کا مرتب کردہ ہے ورنہ فیہ شیم خفی کی تقریظ بھی مصنف کی فرمائش پر قلم بند ہوئی، ساتھ میں ایک تفصیلی مقدمہ بھی 'تا تک جہا تک' کے عنوان سے مصنف نے قلم بند کیا تھا، لیکن کسی نامعلوم وجہ سے یہ مجموعہ کلام ان کی حیات میں شائع

نہیں ہو سکا۔ کتب خانہ قادریہ میں موجود قلمی بیاض کو پہلی بار رمضان ۱۴۳۰ھ/ستمبر ۲۰۰۹ء میں تاج الحول اکیڈمی بدایوں نے شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں 'غیاۃ حیات' پر ایک نظر بقلم ڈاکٹر سید سراج الدین اجلی (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) شامل ہے جب کہ دو صفحات میں 'حرفِ آغاز' کے عنوان سے مجموعہ 'غیاۃ حیات' پر ایک تعارفی تحریر بھی مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے ہے۔

مجموعہ رسائل فضل رسول:

یہ کتاب سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی کے درج ذیل پانچ رسائل کا مجموعہ ہے: (۱) رسالہ فضل الخطاب (۲) اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ (۳) اکمال فی بحث شد الرحال (ذیلِ روضہ رسول) (۴) رسالہ حرزِ معظم (۵) فوز المؤمنین بشفاعۃ الشافعیین (عقیدہ شفاعت)۔ یہ مجموعہ رسائل رضا اکیڈمی ممبئی سے ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ ترتیب و ترجمہ اور تعارفی کتاب و مصنف ہر کتاب کے آغاز میں مولانا اُسید الحق قادری نے تحریر کیا ہے۔ تقریظ شرفِ ملت حضرت سید شاہ اشرف میاں قادری مارہروی نے رقم فرمایا ہے، جب کہ ۶۵ صفحات پر مشتمل تفصیلی مقدمہ مولانا یسین اختر مصباحی دارالقلم دہلی کے قلم گوہر رقم سے ہے۔ شرفِ ملت حضرت سید شاہ اشرف میاں قادری مارہروی نے اپنی تقریظ اور رئیسِ التحریر مولانا یسین اختر مصباحی نے مرتب کتاب کو اس علمی اور تحقیقی کام پر پُر زور الفاظ میں تحسین کی ہے اور ان کی علمی عظمت اور تحقیقی صلاحیت کا خوب خوب اعتراف کیا ہے۔

'مجموعہ رسائل فضل رسول' کا دوسرا ایڈیشن پاکستان سے مکتبہ برکات المدینہ کراچی اور دارالعمان کراچی کے اشتراک و اہتمام سے ۱۴۳۱ھ/نومبر ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

علمتِ نورِ اعظم:

یہ کتاب مولانا محبت احمد قادری بدایونی (ولادت: ۱۲۶۶ھ- وصال ۲۱ رجب الآخر ۱۴۳۱ھ/۱۹۲۲ء) تلمیذ حضرت تاج الحول شاہ عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے۔ رسالے کا اصل نام 'الکلام الحق الجلی فی کون اقدام امام الاقطاب علی عنق کل ولی' ہے جس سے رسالے کا سنہ تالیف ۱۲۹۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ رسالہ پہلی بار

۱۳۰۰ھ میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے اصل نام کے ساتھ شائع ہوا۔ رمضان ۱۴۳۱ھ/ستمبر ۲۰۱۰ء میں یہ کتاب ۱۳۱ ارسال بعد دوبارہ مولانا دلشاد احمد قادری کی ترتیب جدید و تخریج کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب ارشادِ غوثِ اعظم 'قدمی ہدم علی' رقبہ کل ولی اللہ (میر اقدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے) کے تعلق سے ایک اہم استفادہ کا جواب ہے۔ مصنف نے جواب استفتاء کے لیے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب 'زبدۃ الاسرار' سے خصوصی استفادہ کیا ہے۔ فتویٰ کی تقدیق و تائید کرنے والے اکابر علماء و مشائخ میں مطبع الرسول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی، مولانا حکیم عبدالقیوم شہید قادری بدایونی، مولانا فضل مجید قادری فاروقی اور مولانا حافظ بخش آنولوی کا نام درج ہے۔

نگارشاتِ محبت احمد:

یہ کتاب بھی مولانا محبت احمد قادری بدایونی کے مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات و نگارشات کی حصولِ یابی اور ترتیب کا اہم کام مولانا اُسید الحق قادری نے انجام دیا ہے۔ رمضان ۱۴۳۱ھ/اگست ۲۰۱۰ء میں اس کی پہلی اشاعت تاج الحول اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ہوئی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ مقالات ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ بشمول فہرستِ مشمولات کے ایک ابتدائیہ ۲ صفحات اور تعارفِ مصنف پر ایک وسیع مضمون بعنوان 'علامہ محبت احمد بدایونی: حیات و خدمات' ۹ صفحات میں ہے، جو مرتبہ کتاب مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے ہے۔ تعارفِ مصنف کے تحت مضمون میں انھوں نے صاحب نگارشات کی سیرت و سوانح کے ساتھ ان کی ۱۰ مستقل تصانیف کا نہایت جامع تعارف قلم بند کیا ہے۔ ص ۱۷ تا ص ۱۳ مختلف موضوعات پر صاحب نگارشات کے مقالات کا ایک انتخاب ہے۔ اخیر میں 'مرتب ایک نظر میں' کے زیرِ عنوان مرتب کے مختصر حالات اور قلمی خدمات کی تفصیل ہے۔

مقالات کا تعارف کراتے ہوئے مرتب کتاب لکھتے ہیں: "زیرِ نظر مضامین (دو کے استثناء کے ساتھ) قاضی عبدالوحید فردوسی، مہتمم 'تحفہ حنفیہ' پٹنہ (جو مولانا محبت احمد کے مخلص دوست تھے) کی فرمائش پر آج سے ایک صدی قبل قلم بند کیے گئے تھے، ان مضامین میں زیادہ تر وہ ہیں جو ماہ نامہ 'تحفہ

حنفیہ کی وقتی ضرورتوں کے پیش نظر لکھے گئے ہیں۔ مثلاً مہینوں کے فضائل، دعا اور آداب دعا اور سنت تراویح وغیرہ۔ ندائے یار رسول اللہ اور علم غیب سے متعلق مضمون ماہنامہ شمس العلوم ہدایوں کے لیے لکھے گئے اور اسی میں شائع بھی ہوئے۔ ان میں کچھ مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں، جو صرف علما کو مخاطب بنا کر لکھے گئے ہیں اور بعض عوام کے لیے لکھے گئے تھے جن میں خطیبانہ اسلوب غالب ہے۔“ (ص ۶، ابتدائیہ)

تحقیق التراویح:

یہ کتاب نور العارفین سید شاہ ابوالحسن احمد نوری قادری مارہروی کی تصنیف ہے۔ ”تحقیق التراویح“ یہ کتاب کا تاریخی نام ہے، جس سے سن تالیف ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۵ء) برآمد ہوتا ہے۔ پوری کتاب عربی زبان میں تھی جو پہلی بار ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ/ فروری ۱۸۷۵ء میں مطبع غالب الاخبار پشاور سے شائع ہوئی اور اب دوسری بار ۱۳۳۳ھ/ ۲۰۱۲ء میں اس کا اردو ترجمہ بقلم مولانا دلشاد احمد قادری (استاذ مدرسہ قادریہ ہدایوں) تاج اللہ اکیڈمی ہدایوں سے منظر عام پر آیا۔ اس اشاعت میں عربی کے بجائے صرف اردو ترجمہ کی اشاعت ہوئی ہے۔

تعارف مصنف کے بطور ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی (جوائنٹ سکریٹری جلد۱ البرکات علی گڑھ) کا ایک قیمتی مضمون بعنوان ”نور العارفین سید شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی قدس سرہ شائع اشاعت ہے۔ ص ۱۱ پر اہمیت پر و فی سید شاہ محمد امین میاں قادری مارہروی سجادہ نشین خانقاہ قادریہ مارہرہ مطہرہ کا ایک پیغام بھی شامل کتاب ہے، جس میں آپ نے تاج اللہ اکیڈمی ہدایوں کے زیر اہتمام تحقیق التراویح کے اردو ترجمہ کی اشاعت پر اظہار مسرت فرمایا ہے اور مولانا اسید الحق قادری کے علمی و تحقیقی کاموں کو عمدہ و بڑا ہیہ بیان میں سراہا ہے۔

دہائی تحریک: تاریخ اور مقام:

یہ کتاب مولانا شاہ فضل رسول قادری کی تصنیف ”بوارقی محمدیہ“ (سال تصنیف ۱۲۶۵ھ، سال اشاعت ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء) کے ابتدائی حصے کا ترجمہ ہے جو شوارق صدیہ ترجمہ بوارقی محمدیہ کے نام سے ۳۲ صفحات پر مشتمل ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں مطبع گلزار محمدی لاہور سے طبع ہوا۔ کتاب کے مترجم قطب لاہور مولانا غلام قادر بھیردی، بھیرہ

پاکستان (ولادت ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء- وصال ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ/ ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء) ہیں۔ تاج اللہ اکیڈمی ہدایوں سے جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ/ مئی ۲۰۱۲ء میں ۷۶ صفحات پر مشتمل منظر عام آیا ہے۔ اس کی ترتیب جدید اور صحیح کا اہم کام مولانا خالد قادری جمیدی (شاگرد رشید مولانا اسید الحق قادری) نے انجام دیا ہے۔

اس ایڈیشن میں فہرست مشمولات کا اضافہ کیا گیا ہے، ساتھ ہی کتاب کے تعارف پر بوارقی محمدیہ: ایک تعارف کے عنوان سے ۲۶ صفحات کی ایک علمی و تحقیقی تحریر بھی کتاب کے آغاز میں ہے جو مولانا اسید الحق قادری کے گورنمنٹ قلم سے ہے۔ دو صفحات میں ”ابتدائیہ“ بھی انھوں نے ہی قلم بند کیا ہے جس میں اس ایڈیشن کی خصوصیات کو تحریر کیا گیا ہے۔ ”بوارقی محمدیہ“ کی کچھ اہم خصوصیات کی وجہ سے مولانا اسید الحق قادری اس پر تفصیلی کام کا ارادہ بھی رکھتے تھے، جس کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ”ابتدائیہ“ میں کیا ہے۔

حکمت العجی (مسئلہ امتناع نظیر کا تحقیقی جائزہ):

یہ کتاب سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول ہدایوں کی تصنیف ہے۔ فارسی زبان میں یہ رسالہ ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے جو مولانا سید حیدر علی ٹوگی کے ایک رسالے (کلام الفضل الکبیر) کی تردید اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے دفاع میں ۱۲۷۸ھ میں لکھا گیا۔ یہ رسالہ اس لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے، تصنیف کے بعد پہلی بار جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ/ مئی ۲۰۱۲ء میں تاج اللہ اکیڈمی سے اصل قلمی خطوط کے عکس شائع کیا گیا ہے۔ ۲۰۱۱ء تک یہ کتاب مرتب کے دست رس معلومات سے باہر تھی۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں کتب خانہ قادریہ کے شعبہ مخطوطات میں ایک مجموعہ رسائل (جس میں سات قلمی رسائل ہیں) میں یہ کتاب انھیں ملی۔ رسالے کی بازیافت کے بعد انھوں نے چاباکہ تحشیہ اور تخریج کے بعد اسے منظر عام پر لایا جائے مگر بقول ان کے:

”اس رسالے کی بازیافت کا تذکرہ میں نے حضرت مولانا لیس اختر مصباحی مدظلہ سے کیا اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں مشورہ طلب کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اس کی جدید کمپوزنگ اور ترجمہ و تحشیہ کا کام بعد میں ہوتا رہے گا۔ اگر یہ مخطوط خوش خط ہے تو سر دست آپ اسی کا عکس شائع کر دیجیے تاکہ یہ محفوظ

ہو جائے۔ میں نے اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے اس کی عکسی اشاعت کا فیصلہ کیا۔“ (ص ۱۳، تقدیم)

شیخ ابن تیمیہ کے مسائل کا ایک تحفہ جاری:

یہ کتاب حافظ بخاری مولانا سید شاہ عبدالصمد چشتی سہوانی (ولادت: ۱۲۶۹ھ/ مئی ۱۸۵۳ء، وصال: ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کی تصنیف ہے۔ کتاب کا اصل نام تبصیر الشیاطین بامداد جنود الحق المبین ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں لکھی گئی اور اسی سال اس کی پہلی اشاعت انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کے زیر اہتمام متوسط تقطیع کے ۶۲ صفحات میں عمل میں آئی۔ دوسری اشاعت بموقع عربیہ صد سالہ حافظ بخاری (۲۰۰۳ء) ’ابن تیمیہ اور علمائے حق‘ کے نام سے ’انجمن حافظ بخاری‘ پھپھوند شریف کے زیر اہتمام ہوئی اور اب تیسری اشاعت مولانا دلشاد احمد قادری (استاذ مدرسہ قادریہ ہدایوں) کی ترتیب جدید، تخریج اور ترجمے کے ساتھ تاج اللہ اکیڈمی ہدایوں سے شوال ۱۴۳۲ھ/ ستمبر ۲۰۱۲ء میں ’شیخ ابن تیمیہ کے عقائد و افکار: ایک تنقیدی جائزہ‘ کے نام سے عمل میں آئی ہے۔ تعارف مصنف کے لیے مولانا مجاہد رضا قادری (استاذ مدرسہ قادریہ ہدایوں) کا مضمون ’حافظ بخاری: حیات و خدمات‘ (مطبوعہ ماہ نامہ ’جام نور‘ شمارہ جولائی ۲۰۱۱ء) شامل کتاب ہے۔ مولانا اسید الحق قادری نے بطور تقدیم ۱۱ صفحات پر مشتمل ایک شاندار ’ابتدائیہ‘ بھی لکھا ہے، جس میں انھوں نے کتاب اور مصنف کتاب کا دلچسپ اور معلوماتی تعارف کرایا ہے۔ کتاب کا انتساب مصنف کتاب کے علمی اور روحانی وارث و جانشین، افتخار الملت، فرد الوقت حضرت سید شاہ محمد اکبر چشتی مودودی قدس اللہ سرہ و رحمۃ اللہ علیہ کے نام کیا گیا ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد:

یہ کتاب تاج اللہ مولانا شاہ عبدالقادر قادری ہدایوں کی تصنیف ہے۔ اصل کتاب عربی زبان میں ہے۔ اصل نام ’احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام‘ ہے۔ یہ رسالہ ۱۲۹۷ھ

۸۰-۱۸۷۹ء میں مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے نصاب علم عقائد و کلام کے پیش نظر تصنیف کی گئی۔ اس وقت یہ بعض مدارس کے نصاب میں بھی شامل کی گئی تھی۔

۱۳۰۰ھ میں اس کا اردو ترجمہ تاج اللہ کے ایک شاگرد عزیز مولانا غلام سادات صدیقی ہدایوں نے کیا جو مطبع شکوفہ فیض سے شائع ہوا۔ ۱۳۳۳ھ سال بعد مولانا دلشاد احمد قادری (استاذ مدرسہ قادریہ ہدایوں) نے مولانا اسید الحق قادری کی تحریک و گہرائی میں از سر نو اس کا ترجمہ کیا ہے، جو رمضان ۱۳۳۳ھ/ اگست ۲۰۱۲ء میں تاج اللہ اکیڈمی سے شائع ہوا ہے۔

مولانا اسید الحق قادری کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب مدرسہ اہل سنت پٹنہ (قیام ۱۳۱۸ھ) اور مدرسہ شمس العلوم ہدایوں کے نصاب میں درج شامل رہی۔

مولانا حکیم عبدالماجد قادری ہدایوں نے اردو زبان میں ’خلاصہ العقائد‘ کے نام سے اس کی شرح لکھی، مولانا عبدالماجد کی یہ شرح بھی ایک زمانے تک مدرسہ شمس العلوم میں پڑھائی جاتی رہی۔ (ص ۷، ابتدائیہ)

خوشی کی بات ہے کہ ایک صدی بعد پھر سے اس کتاب کو مدرسہ قادریہ ہدایوں کے نصاب تعلیم میں مولانا اسید الحق قادری نے شامل فرمادیا ہے، یہ رسالہ جماعت ثانیہ میں پڑھایا جاتا ہے اور زبانی یاد بھی کرایا جاتا ہے۔ مولانا اسید الحق قادری صاحب اس رسالے کی ایک جامع شرح لکھنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے جو مدرسہ قادریہ کے طلبہ جماعت رابعہ یا خامسہ کے نصاب میں شامل ہوتی۔ اب تک وہ کام کس مرحلے میں تھا اس کا راقم الجروف کو صحیح علم نہیں ہے۔

شمس الایمان:

یہ کتاب مولانا محمد محی الدین عثمانی قادری (ولادت: ۱۷۷۷ء/ ۱۲۳۰ھ/ ستمبر ۱۸۲۷ء- وصال ۶ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء) ہمرہ ۲۷ سال) خلف اکبر مولانا شاہ فضل رسول ہدایوں کی تصنیف ہے۔ یہ رسالہ سراج الایمان مصنفہ مولانا سید سراج احمد سہوانی (ولادت: ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۶ء- وفات: ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) کے جواب میں ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء میں لکھا گیا جو پہلی بار ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ/ اکتوبر ۱۸۵۰ء میں مطبع دہلی اردو اخبار دہلی سے شائع ہوا۔ ۱۶ سال بعد حافظ عبدالعلیم قادری جمیدی

(شاگرد رشید مولانا اُسید الحق قادری) کی ترتیب جدید تصحیح کے ساتھ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ/ مئی ۲۰۱۲ء میں تاج الفحول اکیڈمی سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں بطور تقدیم پانچ صفحات میں مولانا اُسید الحق قادری کے قلم سے 'ابتدائیہ' ہے، جس میں کتاب اور صاحب کتاب کا پہلی بار اتنا بھرپور تعارف کرایا گیا ہے۔ پوری کتاب ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مسئلہ توسل و استعانت پر علمی و تحقیقی بحث کی گئی ہے۔

فائدہ ہانت اسلامی:

یہ کتاب مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کی تصنیف ہے جو ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں مصنف نے اسلامی عبادات کی حکمتوں اور ان میں پوشیدہ سماجی، معاشرتی اور عمرانی اسرار و مصالح کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء میں پہلی بار مدینہ پبلشنگ ہاؤس کراچی سے طبع ہوئی۔ پھر ریح الاول ۱۴۳۱ھ/ فروری ۲۰۱۰ء میں اشاعتِ اول کا عکس جناب ظہور الدین امرتسری نے ادارہ پاکستان شناسی، لاہور پاکستان سے شائع کیا اور اب جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ/ مئی ۲۰۱۲ء میں تاج الفحول اکیڈمی بدایوں نے اشاعتِ ثانی کا عکسی ایڈیشن شائع کیا ہے، البتہ حالاتِ مصنف کے تعلق سے دوسری اشاعت میں شامل جناب سید ظہور الدین امرتسری کا مضمون اس اشاعت میں کسی وجہ سے شامل اشاعت نہیں ہے۔ ہاں! ڈاکٹر سید محمد قمر علی (پروفیسر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی) کا مضمون 'مولانا عبدالماجد بدایونی: ایک بالغ نظر مصنف' حسب سابق اس اشاعت میں بھی باقی رکھا گیا ہے، جو مصنف کتاب کی اصلاحی اور دعوتی خدمات پر ایک قیمتی تحریر ہے۔ کتاب کا انتساب ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

قصیدہ ہانت سعادت:

شاعر دربار رسالت، صحابی جلیل حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا 'قصیدہ ہانت سعادت' ہمیشہ سے اہل علم و ادب کے درمیان توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس قصیدہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ اسے حضرت کعب بن زہیر نے اپنے گناہوں سے معافی کی طلب کے طور پر بارگاہِ رسول میں پیش کیا گیا، جو شرفِ قبولیت کی دولت سے سرفراز ہوا۔ قبولیتِ عامہ اور فنی وادبی خصوصیات کی وجہ سے ہر دور میں اہل علم نے اس کی شرح و

تعلیق کا فریضہ انجام دیا۔

یہ قصیدہ عربی زبان میں ہے۔ مدرسہ قادریہ بدایوں کے ایک نوجوان فاضل مولانا عاصم اقبال مجیدی (تلمیذ رشید مولانا اُسید الحق قادری) نے اپنے عہد طالب علمی میں اپنے استاذ گرامی کی زیر نگرانی اس کے ترجمہ و تشریح کا علمی کام انجام دیا اور یہ قصیدہ ان کے مشفق استاذ کی نظیر ثانی اور ایک قیمتی مقدمے کے ساتھ تاج الفحول اکیڈمی سے ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ/ نومبر ۲۰۱۲ء میں ۸۴ صفحات پر مشتمل منظرِ عام پر آیا۔ مولانا اُسید الحق قادری کا علمی و تحقیقی مقدمہ 'قصیدہ ہانت سعادت: ایک تعارف' ۴۰ صفحات پر محیط ہے، اس میں انھوں نے قصیدہ نگار کا تعارف، قصیدہ کا تاریخی پس منظر، قصیدے کا موضوعاتی جائزہ، قصیدہ کی اہمیت و خصوصیت، قصیدہ کے تعلق سے اہل علم و تاریخ کے بیان کردہ واقعات کا تحقیقی و علمی جائزہ، قصیدہ کی مقبولیت اور اس قصیدے کے تعلق سے عرب و دنیا اور ہندوستانی اہل علم کی شروحات کا تعارفی جائزہ جس شرح و بسط اور تحقیق و تجزیہ کے ساتھ پیش کیا ہے یہ ان ہی کے قلمِ اعجازِ رقم کا حصہ ہے۔ پہلی بار اردو زبان میں راقم الحروف کی نگاہ سے اس قصیدے کا اتنا جامع علمی و تحقیقی جائزہ گزرا ہے۔ موصوف کا یہ مقدمہ اصل کتاب کے ص ۳۸ تک ہے، ص ۵۰ سے مولانا عاصم اقبال مجیدی کے قلم سے اس قصیدے کے ترجمہ و تشریح کا آغاز ہوتا ہے جو آخر کتاب ص ۸۲ پر ختم ہوتا ہے۔

اسلام میں محبت الہی کا تصور:

یہ کتاب شیخ حازم نانف ابو غزالہ (عمان، اردن) کی شاہ کار عربی تصنیف 'المحبة الالهية في الاسلام' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا اُسید الحق قادری کی خواہش و تحریک پر مولانا دلشاد احمد قادری (استاذ مدرسہ قادریہ بدایوں) نے بڑی محنت، مہارت اور خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ عربی کتاب کی دوسری اشاعت دارالامام النووی عمان سے ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء میں ہوئی۔ اسی نسخہ کو سامنے رکھ کر مولانا نے ترجمہ کا کام کیا ہے۔ یہ اردو ترجمہ ۱۴۳۳ھ/ ۲۰۱۲ء میں طبع اول کی شکل میں تاج الفحول اکیڈمی بدایوں کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوا ہے۔ تین صفحات میں مشمولاتِ کتاب کی فہرست ہے، پھر تین صفحات میں مولانا اُسید الحق قادری کا 'ابتدائیہ' ہے، جس میں انھوں نے کتاب اور صاحب

کتاب کا جامع اور بصیرت افروز تعارف تحریر کیا ہے۔ ص ۱۱ سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے جس کا اختتام ص ۱۰۴ پر ہوا ہے۔ اس طرح پوری کتاب ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا اُسید الحق قادری نے 'ابتدائیہ' کے اخیر پر اگر ارف میں کتاب سے اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ یہ کتاب عوام و خواص دونوں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ اس کے ذریعے سے دلوں میں محبتِ حقیقی کے چراغ روشن ہوں گے۔ اگر سننے میں ایک مرتبہ عشق کی چنگاری بھڑک اٹھے تو اس کو شعلہ جوالہ بننے دیر نہیں لگتی۔ (ص ۱۰)

مسئلہ قیامِ تعظیمی:

یہ کتاب مولانا مفتی حسین احمد مقتدری بدایونی کی تصنیف ہے۔ کتاب کا پورا نام 'تحقیق العلماء الکرام فی مسئلة استصحاب القیام' ہے۔ محفل میلاد کے بعد کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے کے جواز اور اس تعلق سے مخالفین کے شکوک و شبہات اور الزامات کے ازالہ پر یہ ایک علمی و تحقیقی کتاب ہے۔ ۱۳۳۶ھ/ ۱۸-۱۹۱۷ء میں یہ کتاب پہلی بار مطبع قادری بدایوں سے ۹۶ صفحات میں چھپی۔ ۹۸ رسال کے بعد 'مسئلہ قیامِ تعظیمی' کے نام سے مولانا خالد قادری مجیدی (استاذ مدرسہ قادریہ بدایوں) کے ترجمہ عربی و فارسی عبارات اور حوالہ جات کی تخریج و تحقیق کے ساتھ تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ/ مارچ ۲۰۱۳ء میں دوبارہ شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا یہ ایڈیشن ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب اور صاحب کتاب کا جامع تعارف 'ابتدائیہ' کے عنوان سے مولانا اُسید الحق قادری کا تحریر کردہ ہے جو سات صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں فہرست مشمولات اور اخیر میں مآخذ و مراجع کی ایک جامع فہرست دی گئی ہے۔ مصنف کے معاصر علماء و مشائخ کی تقریحات و تصدیقات سے یہ کتاب مزین ہے۔

الجواب المفکور:

یہ کتاب مولانا محمد عبدالماجد قادری بدایونی کی دو اہم تحریروں کا مجموعہ ہے: (۱) الجواب المشکور علی مسئلة القبور (۲) جامع فتویٰ مع تصدیقات علمائے ہندوستان و پاکستان۔ پہلی کتاب عربی زبان میں جب کہ دوسری کتاب اردو زبان میں ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء میں لکھی گئی اور اسی سال مرکزی انجمن تبلیغ اسلام کراچی سے مولانا محمد حسن فقیہ شافعی (ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے اسلام) کے زیر اہتمام علاحدہ

علاحدہ طبع ہوئی۔ 'الجواب المفکور' میں عربی زبان میں شاہ سعود کے نام مولانا عبدالماجد قادری کا ایک تفصیلی تا صحت و مصلحانہ خط اور شیخ محمود حسین ریح (اساذ جامعہ ازہر مصر) کا عربی زبان میں شاندار مقدمہ شامل اشاعت تھا۔ ۵۳ رسال بعد یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ 'الجواب المفکور' کے نام سے تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے مولانا دلشاد احمد قادری کے ترجمہ و ترتیب جدید اور مولانا اُسید الحق قادری کے شاندار معلوماتی و تاریخی مقدمہ کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں سعودی حکومت کی جانب سے دیگر مقاماتِ مقدمہ کے ساتھ گنبد خضریٰ کو منہدم کرنے کے قلعہ اور ناپاک عزائم کے خلاف تاریخی فتویٰ کی شکل میں لکھی گئی۔ ترتیب جدید میں فتویٰ کے متن کے لیے 'جامع فتویٰ' کے اصلی متن کو باقی رکھا گیا ہے، ساتھ ہی تصدیقات علماء و مشائخ کے لیے 'جامع فتویٰ' کے متن کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مشمولات 'الجواب المفکور' کا اردو ترجمہ شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ شروع میں فہرست مشمولات اور اخیر میں تحفظ گنبد خضریٰ (۱۹۵۲ء) کے پس منظر میں مولانا بدایونی کی جانب سے مرکزی انجمن تبلیغ اسلام و جمعیۃ علمائے پاکستان کے زیر اہتمام مطبوعہ حسب ذیل چار رسائل کے ٹائٹل پیج کا عکس شامل اشاعت ہے۔ (۱) الجواب المشکور عن مسئلة القبور صاحب الفضیلہ مولانا الشیخ محمد عبدالماجد قادری بدایونی (۲) مما لکب عربیہ اور ایران کا سفر نامہ۔ مرتبہ مولانا شاہ عبدالماجد قادری بدایونی (۳) مسجد نبوی اور آثار مبارکہ کے تحفظ کا مطالبہ۔ مرتبہ مولانا محمد حسن فقیہ شافعی (۴) جامع فتویٰ۔ مجاہد ملت مولانا شاہ محمد عبدالماجد قادری بدایونی۔

مولانا اُسید الحق قادری کا مقدمہ 'مولانا عبدالماجد بدایونی اور تحریک تحفظ گنبد خضریٰ' جہاں موصوف کی تاریخی معلومات کا شاہکار ہے وہیں مولانا بدایونی کی اس تحریک کے تعلق سے عالمگیر خدمات کا حسین مرقع بھی ہے۔

آداب السالکین:

یہ کتاب شمس مارہرہ حضرت سید شاہ آل احمد اچھے میاں قادری مارہروی (ولادت: ۲۸ رمضان المبارک ۱۲۶۰ھ، وصال: ۱۷ رجب الاول ۱۳۳۵ھ) کی تصنیف ہے۔ آداب سلوک و ذکر و اشغال پر یہ

ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ اصل کتاب فارسی زبان میں ہے جس کا اردو ترجمہ پہلی بار تاج العلماء، مؤرخ خانوادہ برکاتیہ مولانا سید شاہ اولاد رسول محمد میاں قادری مارہروی صاحب 'صح التواریخ' نے کیا۔ اس ترجمہ کی پہلی اشاعت ۱۹۱۵ء میں مطبع ادبی لکھنؤ سے ہوئی، جس میں اردو ترجمہ کے ساتھ اصل فارسی متن کو بھی شامل اشاعت کیا گیا۔ دوسری بار بزم قاسمی برکاتی کا پورے کے زیر اہتمام صرف اردو ترجمہ کی اشاعت عمل میں آئی۔

امین ملت حضرت سید شاہ محمد امین میاں قادری (سجادہ نشین خانقاہ قادریہ مارہرہ مطہرہ) نے ۱۹۸۷ء میں اس کا از سر نو ترجمہ کیا اور اس پر ایک شاندار مقدمہ بھی تحریر کیا، جس کی اشاعت ۱۹۸۷ء میں برکاتی پبلشرز کراچی سے ہوئی۔ محرم ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۳ء میں بموقع جشن دوسو سالہ حضور شمس مارہرہ تاج اللہ اکیڈمی بدایوں سے ڈاکٹر احمد عتیقی صدیقی کی ترتیب جدید تصحیح کے ساتھ اس کا طبع جدید منظر عام پر آیا ہے۔

اسلاف شناسی (حصہ اول) اکابرین مارہرہ:

ذیل میں پہلے ان ساری کتابوں کا سن وارتعارف کرایا جا رہا ہے، جو خانقاہ قادریہ عثمانیہ بدایوں کے حیر خانہ مارہرہ شریف کے اکابر و مشائخ اور بزرگان و اسلاف کی حیات و خدمات پر بسلسلہ اسلاف شناسی تاج اللہ اکیڈمی کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اس سلسلے میں اسلاف کی نایاب کتابوں کے ساتھ مولانا اسید الحق قادری کی ایک مستقل تصنیف کا بھی تعارفی جائزہ سپرد قلم کیا گیا ہے جو کہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، لیکن ایسا صرف اس مقصد کے تحت کیا گیا ہے تاکہ بسلسلہ اسلاف شناسی جو کتابیں طبع ہوئیں ان سب کا ایک ساتھ ذکر ہو جائے۔

تذکرہ نوری:

یہ قاضی غلام شہر قادری بدایونی (وصال: ۱۳۱۶ھ/۱۹۲۷ء) کی تصنیف ہے، جو نور العارفین حضرت سید شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی کے مرید و خلیفہ تھے۔ کتاب کا اصل نام 'مدارج حضور نور' ہے۔ یہ کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف ۱۳۳۳ھ برآء ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نام 'تنویر العین من کنز مدارج السید ابی الحسن' ہے، جس کے اعداد ۱۳۳۳ھ ہوتے ہیں۔ مولانا اسید الحق قادری کی تحقیق کے مطابق ۱۳۳۳ھ آغاز

تالیف اور ۱۳۳۲ھ تکمیل و طہارت کا سن ہے۔ (ص ۱۹، ابتدائیہ) یہ کتاب خانوادہ قادریہ کے گل سرسبد، نور العارفین حضرت سید شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی کے حالات طہیات کا مفصل تذکرہ ہے جس کی ترتیب اس طرح ہے کہ کتاب کے آغاز میں مؤلف کے قلم سے ایک طویل مقدمہ ہے، جس ۳۴ سے ۱۲۱ صفحات پر محیط ہے۔ اس کے بعد گیارہ ابواب اور ایک خاتمہ ہے، جس میں حضرت نوری میاں کی ولادت سے وقت رحلت تک کے سارے احوال و آثار کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اخیر میں 'حالات مؤلف' کے عنوان سے مؤلف نے اپنے احوال بھی قلم بند کیے ہیں جو کتاب کے ص ۲۸۴ سے ۲۹۹ پر مشتمل ہے۔

کتاب کی پہلی اشاعت امیرالاقبال پریس بدایوں سے دو حصے میں ہوئی۔ دوسرا حصہ پروفیسر ایوب قادری کی ترتیب و تقدیم اور حضرت عبدالغفور اقبال میاں قادری (برادر اکبر شیخ عبدالحمید سالم القادری زبیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں) کے پیش لفظ کے ساتھ دارالاشاعت رضویہ لائل پور (پاکستان) سے ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔

کتاب کا عربی نام 'تذکرہ نوری بقول مولانا اسید الحق قادری: پروفیسر ایوب قادری کا تجویز کردہ ہے۔ اسی عربی نام کے ساتھ یہ کتاب رجب ۱۴۳۳ھ/ مئی ۲۰۱۳ء میں مولانا اسید الحق قادری کی ترتیب و تقدیم اور شرف ملت حضرت سید محمد اشرف قادری مارہروی کی تقریظ کے ساتھ تاج اللہ اکیڈمی بدایوں سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

حضرت سید اشرف میاں قادری کتاب کی استنادی حیثیت کو بتاتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"مارہرہ مطہرہ اور بدایوں شریف کے بزرگوں کے حوالے سے جو مخصوص روایات اس کتاب میں ملتی ہیں ان کو مرشد گرامی تاج العلماء حضرت سید اولاد رسول محمد میاں نے بھی اپنی تاریخی کتاب 'تاریخ خاندان برکات' (مطبوعہ ۱۹۲۷ء) میں مختصراً لکھا ہے اور میں نے اپنے بزرگوں کی زبانی بھی سنا ہے۔ جب یہ بات تصور میں رکھ کر تذکرہ نوری پڑھتا ہوں تو 'تذکرہ نوری' کے استناد کا وزن بڑھ جاتا ہے۔" (ص ۱۵، تقریظ)

اپنی اسی تقریظ میں انھوں نے مولانا اسید الحق قادری کے علمی انداز تحقیق، متوازن فکر، مومنانہ فراست اور علمی تبحر کی تحسین کی ہے۔

تفصیل کے لیے ص ۱۶۵ کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

برکات مارہرہ:

یہ مولوی طفیل احمد متوفی صدیقی بدایونی (وصال: ۱۹۴۴ء) کی تالیف ہے۔ یہ اکابر و مشائخ خانوادہ برکاتیہ کی حیات و خدمات کا ایک اجمالی تذکرہ ہے، جس میں صاحب البرکات حضرت سیدنا شاہ برکت اللہ مارہروی سے حضرت شیخ سیدنا شاہ غلام محی الدین امیر عالم تک گیارہ مشائخ کرام کا مستند تذکرہ ہے۔ شروع میں خانوادہ برکاتیہ کے اجمالی تعارف و تاریخ پر مؤلف کے قلم سے ایک قیمتی مقدمہ اور اخیر میں تبرکات مارہرہ کے عنوان سے خانقاہ برکاتیہ میں موجود آثار و تبرکات کے تعارف اور اعراس کی کیفیت و احوال پر تفصیل سے قیمتی معلومات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۳۱ھ/۱۳۳۲ء میں تالیف کی گئی اور اسی سال ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اپنی پہلی اور آخری اشاعت کے ساتھ ہی یہ کتاب عرصہ دراز سے نایاب بھی جو مکمل ایک صدی بعد ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۳ء میں مولانا عبدالعلیم قادری مجیدی (شاگرد سید مولانا اسید الحق قادری) کی ترتیب جدید اور تصحیح کے ساتھ دوبارہ چھپی ہے۔ کل صفحات ۱۷۲ ہیں۔ ص ۱۶ پر کتاب کے طبع اول کا سرورق بھی شامل اشاعت ہے۔ طبع جدید کا 'ابتدائیہ' مولانا اسید الحق قادری نے تحریر کیا ہے جس میں کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔

تذکرہ شمس مارہرہ:

یہ کتاب شمس مارہرہ حضرت سید شاہ آل احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی (ولادت ۱۱۶۰ھ۔ وصال ۱۲۳۵ء) کی سیرت و سوانح اور روحانی و علمی خدمات پر مشتمل ہے کتاب کے مصنف مولانا اسید الحق قادری ہیں۔ یہ کتاب ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے، جو انہوں نے جشن صد سالہ حضرت شمس مارہرہ ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۳ء کے موقع سے ترتیب دیا اور تاج اللہ اکیڈمی کے سلسلہ مطبوعات ۱۰۶ کے تحت محرم ۱۴۳۵ھ/ ۱۵ نومبر ۲۰۱۳ء میں اس کی پہلی اشاعت ہوئی ہے۔ شمس مارہروی کی سوانح و خدمات پر یہ پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔ تجدید نعت کے طور پر کتاب کے "ابتدائیہ" میں اس کا اظہار کرتے ہوئے مؤلف کتاب لکھتے ہیں:

"یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خانوادہ برکاتیہ کے دیگر اکابر

اولیا کے مقابلے میں حضرت شمس مارہرہ پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ آپ کی حیات میں آپ کے مریدین و خلفائے اور بعد وصال دیگر اہل ارادت نے آپ کے حالات و سوانح پر متعدد کتابیں ترتیب دیں، جن میں آثار احمدی، ہدایۃ الخلق فارسی (مصنفہ مولانا شاہ محمد افضل صدیقی بدایونی متوفی ۱۸۴۶ء مرید و خلیفہ حضرت شمس مارہرہ) گلشن ابرار اور تنبیہ الخلق (ترجمہ اردو و ہدایت الخلق مولوی مجاہد الدین ذاکر دایونی متوفی ۱۳۳۴ھ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب زیر طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی اور بعض کے بارے میں علم نہیں کہ محفوظ بھی ہیں یا دست برد زمانہ کا شکار ہو کر مفقود ہو گئیں۔ مطبوعہ خاندانی تذکروں میں یادگیر اکابر مارہرہ کی سوانح (مثلاً تاریخ خاندان برکات، مدارج حضور نور اور برکات مارہرہ وغیرہ) میں حضرت شمس مارہرہ کا تذکرہ ضرور آیا لیکن میری معلومات کی حد تک حضرت شمس مارہرہ کی کوئی علاحدہ مستقل سوانح شائع نہیں ہوئی۔ اسی کے پیش نظر حضور شمس مارہرہ قدس سرہ کی ایک مفصل سوانح کی تالیف و ترتیب میری برسوں پرانی خواہش تھی مصر کے دوران قیام زمانہ طالب علمی میں میں نے تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اپنے فرائض، حقوق اور قرضوں کی ایک فہرست بنائی تھی جس میں فرض یا قرض کے طور پر "سوانح آل احمد" نامی کتاب کا خاکہ بھی بنایا تھا۔

مجھے اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہ مختصر تعارف کتاب نہ حضور شمس مارہرہ کی عظیم شخصیت کے شایان شان تعارف کا حق ادا کرتی ہے اور نہ میری دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے۔ ہاں! البتہ اس مختصر اور حقیر سی کاوش کو یہ فخر ضرور حاصل ہے کہ گزشتہ دو سو سال میں یہ شمس مارہروی کی پہلی مطبوعہ سوانح ہے۔

یہ مؤلف کا اکسار و تواضع دار بزرگان مارہرہ سے قلبی دروہانی تعلق کا ایک اظہار ہے ورنہ راقم الحروف کی نگاہ میں موصوف کی یہ تصنیف حضرت شمس مارہرہ کی شخصیت پر نہایت علمی و معلوماتی کتاب ہے۔ خانوادہ عثمانیہ بدایوں و خانوادہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے درمیان

حضرت شمس مارہری روحانی و تذکیری شخصیت پہلی کڑی ہے جن سے خانوادہ عثمانیہ میں سلسلہ قادریہ کا اجرا ہوا۔ اپنے خانوادہ کے اسی روحانی وابستگی کی وجہ سے مصنف کتاب دیگر مشائخ مارہرہ خاص طور سے حضرت شمس مارہرہ سے جوان کی روحانی موروثی وابستگی ہے، اس کے پیش نظر انہوں نے اپنے مذکورہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ابتداً یہی کہ اخیر میں انہوں نے اس عزم کا بھی اظہار کیا ہے کہ: ”تاہم آل مجیدی و آل احمدی ہونے کی حیثیت سے ایک مبسوط ”سوانح آل احمد کی تالیف و ترتیب کو میں اب بھی اپنا فرض اور اپنے قلم پر قرض سمجھتا ہوں۔“ (ص ۱۱۰ ایضاً)

میں سمجھتا ہوں کہ مصنف کے شاگردان عزیز میں سے کوئی آپ کے اس عزم کی تکمیل ضرور کریں گے۔

اسلاف شناسی (حصہ) اکابرین بدایوں:

ذیل میں اکابرین بدایوں کی حیات اور خدمات و کارنامے پر مشتمل قدیم و نایاب کتابوں کی اشاعت جدید کے تعارف کے ساتھ فرزندانِ مدرسہ قادریہ کی جدید تصانیف و تالیفات کا تعارف بھی شامل ہے اور اس میں بھی وہی مقصد پیش نظر ہے کہ ”سلسلہ اسلاف شناسی“ مولانا اسید الحق قادری کی خدمات کا ایک واضح نقشہ سامنے آجائے۔ اس تعلق سے مطبوعات تاج الحق لائبریری (سال قیام ۱۹۹۱ء) و ادارہ مظہر حق بدایوں (سال قیام ۱۹۸۵ء) کی صرف اسلاف و اکابر کے تذکرہ پر مشتمل مطبوعات کا بھی ایک مختصر جائزہ لے لیا گیا ہے۔

تذکرہ محبوب:

یہ کتاب مولانا عبد الرحیم قادری کی تالیف ہے۔ کتاب میں سابق مفتی اعظم ریاست حیدرآباد و کن حضرت عاشق الرسول مولانا عبد القدیر قادری بدایونی (ولادت: ۱۱ ریشوال ۱۳۱۱ھ / اپریل ۱۸۹۳ء - وصال: ۷ ارجادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ / اپریل ۱۹۱۳ء) کے مختصر مگر جامع احوال کا تذکرہ ہے، جوان کے وصال پر ادب و علم و دانش کے تعزیتی مکاتیب و تاثرات اور اخبارات و رسائل میں ان کے ساتھ ارتحال پر مجالس تعزیت و ایصالِ ثواب کی رپورٹ اور بابِ ادب کی جانب سے ان کی شان میں کہے گئے مناقب، قطعات، تاریخ وصال کا ایک حسین مرقع ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۷۹ھ میں فاطمی پریس بدایوں سے طبع ہوا اور

اب ۳۹ سال بعد ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء میں اس کا طبع جدید تاج الحق لائبریری سے سامنے آیا ہے۔

مرتب کتاب کو دربارِ غوثیہ کے صاحبِ سجادہ و نقیب الاشراف حضرت مولانا اسید پیر ابراہیم سیف الدین گیلانی کے بڑے پڑپوتے سیدنا عبدالقادر گیلانی نے ”طاؤس الملائکہ“ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ اس کتاب پر مولانا اسید الحق قادری نے دو صفحات میں معلوماتی ابتداً یہ قلم بند کیا ہے جس میں انہوں نے حضرت عاشق الرسول کے ساتھ مؤلف کتاب کا ایسا جامع تذکرہ تحریر فرمایا ہے جس سے صاحبِ تذکرہ کے ساتھ مؤلف کتاب کی شخصیت اور خدمات کا بھی ایک واضح نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد: مولانا فیض احمد بدایونی:

یہ کتاب مجاہد انقلاب ۱۸۵۷ء حضرت مولانا فیض احمد بدایونی کی سوانح حیات اور خدمات کا تذکرہ ہے۔ کتاب کے مصنف معروف محقق و ادیب پروفیسر محمد ایوب قادری (ولادت: ۱۹۲۶ء - وصال: ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء) ہیں۔ مصنف کتاب نے نہایت جستجو اور محنت سے مولانا فیض احمد بدایونی کے تعلق سے تاریخی معلومات کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۵۷ء میں پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی پاکستان سے طبع ہوئی۔ زیرِ نظر اشاعت مولانا اسید الحق قادری کی ترتیب جدید کے ساتھ (موقع ڈیڑھ سو سالہ جشن جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء میں تاج الحق لائبریری بدایوں سے سامنے آئی ہے۔ ترتیب جدید کے ساتھ اس پر ممتاز ناقد و محقق مولانا اسید الحق قادری نے ۲۱ صفحات پر مشتمل ایک شاندار تحقیقی و علمی مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ اس مقدمے کے مطالعے سے موصوف کی تاریخی معلومات اور تاریخی حقائق سے آگاہی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر ایوب قادری علمی و تاریخی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ ان کی رائے سے اختلاف وہی شخص کر سکتا ہے جو تاریخی معلومات و حقائق پر گہری نظر رکھتا ہو۔ علمی و تحقیقی میدان میں اختلاف رائے کا حق ہے لیکن اس کے لیے خالص علمی و ادبی اور تحقیقی اسلوب بھی ہونا چاہیے۔ اگر اس کے برعکس مناظرانہ اور مجاہدانہ اسلوب کو اختیار کیا جائے تو وہ علمی دنیا میں لائق التفات نہ ہوگا۔

مرتب موصوف نے پروفیسر ایوب قادری کی کئی فروگزاشتوں پر تنقیدیں بھی کی ہیں لیکن کہیں بھی انہوں نے اپنے اسلوب کو جذبات آمیز نہیں ہونے دیا ہے بلکہ علمی اسلوب میں انہوں نے پروفیسر صاحب کی فروگزاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور اس کے تعلق سے تاریخی حوالوں سے اپنی گفتگو کو پیش کیا ہے۔

اس مبسوط مقدمے میں انہوں نے مجاہد آزادی کے تعلق سے ایوب قادری کے دو معروضے اور سخن گسٹری پر علمی پیرایہ بیان اور لطیف تنقیدی اسلوب میں جو فاضلانہ و محققانہ اور معروضی گفتگو کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایوب قادری کے دو معروضے یہ ہیں:

- (۱) مولانا فیض احمد بدایونی کے خاندان والوں نے ان کے مجاہدانہ کردار پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور جہاد آزادی میں ان کی شرکت کا یا تو تذکرہ ہی نہیں کیا یا اگر کیا تو بڑے مبہم انداز میں۔
- (۲) مولانا فیض احمد بدایونی کے سال وفات کا تعین نہیں کیا جاسکتا، لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے ۱۲۷۳ھ کو ان کا سال وفات تحریر کیا ہے جب کہ ہادی النظر میں سال وفات ۱۲۷۳ھ کا تعین ہوتا ہے حالانکہ ۱۲۷۵ھ تک مولانا کا باحیات ہونا یقینی ہے۔

ان دونوں معروضات کا تحقیقی و تنقیدی جواب مقدمے کے ص ۹: تا ص ۲۵ پر تحریر کرنے کے بعد مقدمہ نگار لکھتے ہیں:

”ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہماری ان معروضات کو دیکھنے اور اپنی سخن گسٹری کا دفاع کرنے کے لیے آج ایوب قادری صاحب مرحوم اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، تاہم ہمارا ضمیر اس پر مطمئن ہے کہ ہم نے یہ گزارشات نیک نیتی کے ساتھ دلائل کی روشنی میں کی ہیں۔ خدا خواستہ ڈاکٹر قادری مرحوم کی ذات پر حملہ یا ان کے متعلقین کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ اگر کسی وفات یافتہ شخص کی رائے سے اختلاف یا اس تحقیق پر تنقید کوئی جرم ہوتا تو قادری مرحوم مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا انوار الحق بدایونی، قاضی عین الدین کیفی اور مولوی رحمن علی کی عبارتوں پر تنقید کر کے اس جرم کے ہرگز مرتکب نہ ہوتے (کہ) جس وقت ڈاکٹر صاحب زیرِ نظر رسالہ میں ان حضرات کی عبارتوں پر سخن گسٹرا نہ فرما رہے تھے۔ اس

وقت یہ چاروں حضرات پردہ فرما چکے تھے۔“ (ص ۲۵، مقدمہ)

اخیر میں ایوب قادری صاحب کی مولانا فیض احمد عثمانی کے احوال و آثار پر مشتمل اس رسالہ کی تصنیف پر ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے استدراک کے عنوان سے بعض تاریخی تسامحات کی اصلاح بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر ایوب قادری کی طرح ان کے رسالہ کا پایہ بھی مسلم ہے تاہم رسالہ میں بعض جگہ کچھ تاریخی تسامحات راہ پا گئے ہیں لیکن ایسے معمولی تسامحات سے محقق کی دیگر تحقیقات کے استناد و اعتبار پر حرف نہیں آتا۔ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم نے رسالہ میں لکھا ہے کہ: مولانا فیض احمد بدایونی کو ان کے ماموں مولانا فضل رسول کی صاحبزادی منسوب تھیں، جن سے صرف ایک صاحبزادے مولانا حکیم سراج الحق تھے۔“

یہ بات درست نہیں ہے، مولانا فیض احمد بدایونی کی شادی مولانا فضل رسول بدایونی کے چچا مولانا محمد شفیع عثمانی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ البتہ مولانا فیض احمد کے صاحبزادے حکیم سراج الحق کو مولانا فضل رسول کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ (ایضاً ص ۲۶)

تذکرہ فضل رسول:

کتاب کا اصل نام ”طوالع الانوار فی محامد اکمل الکاملین الابرار“ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے کتاب کا سن تالیف (۱۲۹۶ھ) برآمد ہوتا ہے۔ یہ کتاب مولانا انوار الحق قادری عثمانی بدایونی کی تالیف ہے جو پہلی بار صفر ۱۲۹۷ھ / جنوری ۱۹۸۰ء میں مطبع صبح صادق سیتاپور سے طبع ہوئی۔ سیف اللہ المسلمول حضرت مولانا شاہ فضل رسول بدایونی کی سیرت و سوانح کے سلسلے میں یہ کتاب بنیادی اور اولین اخذ کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ یہ کتاب صاحبِ سوانح کی وفات (۱۲۹۸ھ) کے صرف سات سال بعد ۱۲۹۶ھ میں تالیف کی گئی۔ مؤلف کتاب صاحبِ تذکرہ کے مرید بھی تھے اور بھانجے بھی اس لیے انہوں نے چشمِ خود یعنی حالات و واقعات کا تذکرہ کیا ہے یا ان واقعات کو ہی کتاب میں جگہ دی ہے جو حالات کے معنی شاہدین کی زبانی سنے۔ کتاب میں آٹھ ایسے مکاتیب بھی شامل اشاعت ہیں جو پہلی بار

اسی کتاب کی زینت ہیں۔

کتاب عرصہ دراز سے کیا ہی نہیں بلکہ نایاب ہو چکی تھی، تقریباً ۱۳۰ سال بعد مولانا اُسید الحق قادری کی ترتیب جدید و تسہیل سے محرم ۱۴۲۹ھ / جنوری ۲۰۰۸ء میں تاج الحق اکیڈمی بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔

تذکرہ ماجد:

یہ کتاب نبیرہ فضل رسول، مجاہد آزادی حضرت مولانا حکیم عبدالمجید قادری، عثمانی کی حیات و خدمات پر ارباب علم و دانش کے چند اہم اور وسیع مضامین کا مجموعہ ہے، جن کی ترتیب و تقدیم مولانا اُسید الحق قادری نے انجام دی ہے۔ یہ کتاب ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور تاج الحق اکیڈمی بدایوں سے رجب ۱۴۲۹ھ / جولائی ۲۰۰۸ء میں اس کی پہلی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ مشمولات کتاب کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا عبدالمجید بدایونی شخصیت اور خدمات بقلم مولانا اُسید الحق قادری۔

(۲) مولانا عبدالمجید بدایونی کا خاندان۔ یہ تحریر اکمل التواریخ مصنفہ مولانا ضیاء القادری بدایونی اور ”نسب نامہ خاندان عثمانی“ مرتبہ محمد فرید اقبال قادری کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

(۳) تذکرہ طیبہ: یہ تحریر مولانا ضیاء القادری بدایونی کی ہے جو مستقل کتاب کی صورت میں نظمی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔

(۴) مدرسہ شمس العلوم بدایوں۔ یہ تحریر پروفیسر ایوب قادری کی ہے جسے مرتب نے انسائیکلو پیڈیا آف بدایوں جلد چہارم سے لیا ہے۔

(۵) خطیب الامہ مولانا عبدالمجید بدایونی۔ یہ تحریر مولانا اُسید سلیمان ندوی مشمولہ ”تواریخ وصل و انتقال“ ادبی پریس لکھنؤ ۱۹۳۱ء

(۶) حضرت مولانا عبدالمجید مرحوم کی خطابت۔ تحریر سید حسن ریاض مشمولہ ”تواریخ وصل و انتقال“

(۷) مثنوی مشق تقریر۔ از مولانا ضیاء القادری

(۸) پارہ ہائے جگر (مرثیہ) از مولوی تولا حسین تولا بدایونی

(۹) کلام منظور۔ از مولانا عبدالمجید قادری بدایونی

یہ کتاب مجاہد آزادی مولانا عبدالمجید بدایونی کی شخصیت و خدمات کے تعلق سے تاج الحق اکیڈمی کی ایک اہم پیش کش ہے جو

مولانا عبدالمجید بدایونی کے ۱۲۵ ویں یوم ولادت (شعبان ۱۴۲۹ھ) کے موقع پر منعقدہ تاریخی ”جشن ماجد“ میں پیش کیا گیا۔ اسی موقع سے مولانا عبدالمجید پبلک لائبریری کا جشن افتتاح بھی ہوا اور اسی موقع پر نہایت قلیل مدت میں یہ کتاب ترتیب دی گئی۔ کتاب اپنے موضوع پر مختصر ضرور ہے لیکن ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اعتراف حقیقت کے طور پر مرتب کتاب لکھتے ہیں:

”یہ کتاب کسی مستقل تحقیق اور سوانحی کام کے ذمے میں نہیں آتی محض وقتی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر ترتیب دی گئی ہے۔ یہاں: البتہ مولانا بدایونی پر آئندہ محققین اور تفصیلی کام کرنے والوں کے لیے نشان منزل نہ کسی سراغ راہ ضرور فراہم کرتی ہے۔“ (ص: ۸۸ حرف آغاز)

احوال و مقامات:

خانوادہ قادریہ بدایوں کی دو عظیم شخصیت مولانا شاہ عبدالمقتدر قادری بدایونی اور عاشق الرسول مولانا عبدالمقتدر قادری بدایونی کی سوانح حیات اور خدمات و کارنامے کا تذکرہ ہے، جو مولانا عبدالبہادی قادری کے قلم سے ہے، جسے ۱۹۹۱ء میں قلم بند کیا گیا اور اسی سال بدایوں سے طبع ہوا۔ تاج الحق اکیڈمی بدایوں سے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل اس کا طبع جدید ڈالوج ۱۴۳۰ھ / دسمبر ۲۰۰۹ء میں مولانا اُسید الحق قادری کی ترتیب جدید و تلخیص کے ساتھ سامنے آیا ہے۔

خواجہ غلام نظام الدین: حیات و خدمات:

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نواسہ تاج الحق، مجاہد سید خواجہ غلام نظام الدین قادری بدایونی (ولادت ۱۳۱۶ھ / ۹۹-۱۸۹۸ء وصال ۱۹ مئی ۱۴۰۵ھ / ۵ دسمبر ۱۹۸۵ء) کے احوال و آثار اور دینی و ملی خدمات کی سرگذشت ہے۔ اس کتاب کی ترتیب جناب محمد تومر خاں قادری بدایونی (استاذ مدرسہ قادریہ بدایوں) نے مولانا اُسید الحق قادری کی زیر نگرانی کی ہے۔ محرم ۱۴۳۳ھ / دسمبر ۲۰۱۱ء میں تاج الحق اکیڈمی سے اس کی پہلی طباعت ہوئی۔ کتاب کا انتساب صاحب تذکرہ کے صاحبزادے شیخ طریقت حضرت الحاج خواجہ احتشام الدین قادری بدایونی موجودہ امام عید گاہ بدایوں کے نام کیا گیا ہے۔

سیف اللہ المسلمول کا علمی مقام:

یہ کتاب مولانا عبدالحکیم قادری جمیدی (فاضل مدرسہ قادریہ

بدایوں) کی تالیف ہے، جو ایک طویل مقالہ کی شکل میں پہلی بار طلبہ مدرسہ قادریہ بدایوں کے درمیان سالانہ علمی مذاکرے میں ۳۴ رجواہی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ / ۲۶ اپریل ۲۰۱۲ء کو بعنوان ”سیف اللہ المسلمول ارباب علم و دانش کی نظر میں“ پیش کیا گیا۔ بعد میں یہی مقالہ کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ / نومبر ۲۰۱۲ء میں ”سیف اللہ المسلمول کا علمی مقام: اولیاء، علماء، مؤرخین اور معاصرین کی نظر میں“ کے نام سے کتابی شکل میں تاج الحق اکیڈمی بدایوں کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوا۔

کتاب حسب ذیل مرکزی عنوانات پر مشتمل ہے:

(۱) سیف اللہ المسلمول: ایک تعارف (۲) سیف اللہ المسلمول بارگاہ رسالت میں (۳) سیف اللہ المسلمول اور علمائے حرمین شریفین (۴) سیف اللہ المسلمول بغداد شریف میں (۵) سیف اللہ المسلمول اور فیضانِ چشت (۶) سیف اللہ المسلمول اکابر مارہرہ مطہرہ کی نظر میں (۷) سیف اللہ المسلمول کا مقام ہم عصروں کی نظر میں (۸) سیف اللہ المسلمول اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر (۹) سیف اللہ المسلمول متاخر علماء و مشائخ کی نظر میں (۱۰) سیف اللہ المسلمول مؤرخین کی نظر میں (۱۱) سیف اللہ المسلمول عصر حاضر کے ارباب علم و تحقیق کی نظر میں۔

اس طرح مؤلف کتاب نے سینکڑوں ماخذ و مصادر سے تحقیق و تتبع اور تلاش و جستجو کے بعد ان مرکزی موضوعات کے تحت منتخب اور مستند مواد کو جمع کیا ہے۔ اس راہ میں انھیں کیا کچھ محنت و وقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس سے وہی لوگ صحیح طور سے واقف ہو سکتے ہیں جنھوں نے اس دشت کی سیاحت کی ہے۔

تذکرہ خانوادہ قادریہ:

یہ کتاب ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، خانوادہ عثمانیہ قادریہ بدایوں کی شخصیات پر مشتمل متداول و مستند تذکروں میں شامل مواد و مشمولات کا ایک خوبصورت انتخاب ہے۔

یہ کام مولانا اُسید الحق قادری کے ایک چہیتے اور محبوب نظر شاگرد مولانا عبدالحکیم قادری جمیدی نے آپ کی نگرانی و تحریک پر انجام دیا ہے۔ اس کتاب کی افادیت کو بتاتے ہوئے مولانا اُسید الحق قادری ابتدائیہ کے تحت لکھتے ہیں:

”علامہ فضل حق خیر آبادی کے سلسلے میں ڈاکٹر معین الدین

عقیل کا ایک مقالہ نظر سے گذرنا تھا جس میں انہوں نے اُن تمام اہم ماخذ و مراجع کی نشان دہی کر دی تھی جن میں علامہ کا تذکرہ موجود تھا۔ اس کے زیر سرچ اسکا لرز اور اہل قلم کو سہولت ہو گئی کہ وہ علامہ کے سلسلے میں مواد کی تلاش کے لیے سرگرداں نہیں رہیں گے بلکہ سارا مواد ایک نظر میں ان کے پیش نظر ہوگا۔ اس مقالے کو دیکھ کر خیال آیا کہ اکابر خانوادہ قادریہ کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی ایک کتاب مرتب کرادی جائے تاکہ ان حضرات کے متعلق اہل تذکرہ و سیر نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ایک جگہ جمع ہو جائے اور یہ کتاب آگے آنے والوں کے لیے حوالے کا کام کرے۔ اسی خیال کی عمل شکل اس کتاب کی صورت میں آپ کے پیش نظر ہے۔ (۹ راہبتدائیہ)

مزید لکھتے ہیں:

”ذریعہ نظر کتاب میں خانوادہ قادریہ کے تمام اہل علم و فضل کے تذکرے کو جمع نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف تیرہویں صدی اور چودہویں صدی کے بعض اکابر کے تذکرے پر اکتفا کیا گیا ہے جن شخصیات کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اپنی علمی، دینی اور روحانی خدمات کے سلسلے میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

ابتدائیہ کے اخیر میں طلبہ مدرسہ قادریہ کی علمی و تحقیقی اور اپنے اسلاف سے وابستگی پر انہوں نے اپنے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ یہاں کے طلبہ کی روشن مستقبل کا غماز ہے۔ ان دعاۓ کلمات کو آپ بھی پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

”یہ بات میرے لیے انتہائی مسرت اور اطمینان کا باعث ہے کہ مدرسہ قادریہ کے طلبہ کی موجودہ نسل میں بعض طلبہ خصوصیت کے ساتھ علمی و تحقیقی مزاج، تحریر و تصنیف کا ذوق اور خلصانہ دینی خدمات کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس پر اپنے اکابر و اسلاف سے گہرا رشتہ عقیدت و محبت مستزاد مرتب کتاب عزیز عبدالحکیم قادری جمیدی کا شمار بھی موصوف کے روشن اور تاب ناک مستقبل کا مثنوی بھی ہوں اور اس کے لیے دعا گو بھی۔ رب قدیر و مقتدر و دارین کی برکات عطا فرمائے۔ آمین

(ص ۱۲ راہبتدائیہ)

اکابر ہدایوں:

یہ کتاب مولانا احمد حسین قادری گنوری کی ہے جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل پانچ اکابر خانوادہ عثمانیہ قادریہ کے احوال و خدمات کو قلم بند کیا ہے:

(۱) شاہ عین الحق عبدالمجید قادری ہدایونی (۲) سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری ہدایونی (۳) تاج الحق، مظہر حق منورنا شاہ عبدالقادر قادری ہدایونی (۴) سرکار صاحب الاقدار مولانا شہ مطیع الرسول عبدالمقتدر قادری ہدایونی (۵) شیخ المشائخ، عاشق الرسول مولانا شاہ عبدالقدیر قادری ہدایونی۔

یہ کتاب مولف نے بعض مخلص وابستگان خانقاہ کی فرمائش پر ۱۹۸۵ء میں قلم بند کیا تھا جو اسی وقت اکتوبر ۱۹۸۵ء میں "ادارہ مظہر حق ہدایوں" کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوا۔ مولانا اسید الحق قادری لکھتے ہیں:

"زیر نظر کتاب مولانا (احمد حسین قادری گنوری) نے خانقاہ قادریہ سے وابستہ مریدین و معتقدین کی فرمائش پر ترتیب دی تھی۔ لہذا اس طبقے کو سامنے رکھ کر مواد اور اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ کتاب کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے ساتھ ہی ہر برگ کے تذکرہ میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔"

(ص ۵ راہنما)

جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ بموافق ۲۰۱۳ء میں کتاب کا طبع جدید مولانا عاصم اقبال جمیدی (تلمیذ عزیز مولانا اسید الحق قادری) کی ترتیب جدید کے ساتھ ۶۰ صفحات پر مشتمل منظر عام پر آئی ہے۔

اکمل التاریخ:

اکابر خانوادہ عثمانیہ قادریہ ہدایوں بالخصوص سیف اللہ المسلمول شہ فضل رسول ہدایونی کی سب سے مفصل اور جامع سوانح حیات اور خدمات کا تذکرہ ہے۔ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں مولف کتاب مولانا محمد یعقوب حسن ضیاء القادر ہدایونی نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ و خانوادہ عثمانیہ کے مورث اعلیٰ قاضی دانیال قطری (قاضی القضاۃ علاقہ ہدایوں بعد سلطان شمس الدین التمش سے لے کر صاحب تذکرہ کے والد ماجد شاہ عین الحق عبدالمجید قادری قدس سرہ تک کے

اکابر خانوادہ عثمانیہ کا جامع تذکرہ تحریر کیا ہے، جب کہ دوسرا حصہ حضرت سیف اللہ المسلمول اور آپ کے سلسلہ اجداد و اخلاف، اساتذہ و علمائے خلفا و مریدین تصانیف و مکاتیب، کرامات و معالجات و امثالہ و معمولات کبھی چیزوں کا احاطہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اور دونوں حصوں میں جاہ جاہی کے تحت ہدایوں کے دیگر نامور و فضلا خصوصاً سلسلہ قادریہ سے وابستہ علماء و مشائخ کا مختصراً ذکر بھی کیا ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے یہ کتاب خانوادہ عثمانیہ کے علماء و مشائخ خصوصاً سیف اللہ المسلمول کی سیرت و خدمات کے تعلق سے اہل علم و ادب کی تحقیق کے دیمان یہ کتاب ہمیشہ سے ایک مستند ناخذ اور حوالے کی کتاب کے طور پر مقبول رہی۔

یہ کتاب پہلی بار جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ بموافق ۱۹۱۶ء میں مطبع قادری مولوی محلہ ہدایوں سے مولوی عبدالصمد صاحب سرور مقتدری کے زیر اہتمام باجائز محکم تصنیف مولانا عبدالمجید قادری ہدایونی شائع ہوئی۔ طبع اول الگ الگ دو حصوں میں اشاعت پذیر ہوا تھا، اب یہ دونوں حصے ایک ساتھ رمضان ۱۴۳۲ھ جولائی ۲۰۱۳ء میں تاج الحق اکیڈمی ہدایوں کے زیر اہتمام تقریباً ایک صدی بعد ممتاز محقق و ناقد حضرت مولانا اسید الحق قادری کی ترتیب جدید مختصر ضروری حواشی اور توضیح ضمیمہ کے ساتھ منظر عام پر آئی ہیں۔

کتاب کا پہلا حصہ ص ۲۸ سے ۱۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ ص ۱۸۳ سے ۳۷۵ صفحات تک ہے۔ پھر ص ۳۷۵ سے "ضمیمہ اکمل التاریخ" مرتبہ اسید الحق قادری کا آغاز ہوتا ہے جو کتاب کے ص ۳۵۸ تک ہے۔ آخر میں "مرتب ایک نظر میں" کے زیر عنوان ۲۰ صفحات میں مرتب کی سوانح اور قلمی خدمات کی فہرست ہے۔ اس کے علاوہ شروع میں ۱۳ صفحات میں فہرست مشمولات ہے اور ۷ صفحات میں مرتب کے قلم سے ایک ابتدائی بھی ہے جس میں اکمل التاریخ کا تعارف اور ترتیب جدید میں مرتب کی جانب سے انجام دیے گئے تحقیقی و تدوینی امور کی تفصیلات اور کتاب کی استنادی و تاریخی حیثیت پر مورخین و محققین کی آرا کا ذکر ہے۔

ضمیمہ اکمل التاریخ میں مرتب نے (ص ۳۷۵ تا ۳۹۱) توفیق تصانیف سیف اللہ المسلمول، کے تحت سیف اللہ المسلمول کی ۱۱ کتابوں

کا تحقیقی، علمی اور تاریخی تعارف قلم بند کیا ہے۔ پھر (ص ۳۹۲ تا ۴۰۹) حضرت مولانا عبدالمجید قادری ہدایونی سے لے کر خانوادہ عثمانیہ قادریہ کے موجودہ صاحب سجادہ اپنے والد ماجد حضرت شیخ عبدالمجید سالم القادری تک متعدد علماء و مشائخ خانوادہ عثمانیہ قادریہ کا تذکرہ قلم بند کیا ہے۔ ص ۴۱۰ پر شاہ عبدالمقتدر ہدایونی کی جانب سے شاہ عبدالقدیر ہدایونی کو ملی اجازت و خلافت کی ایک نقل شامل ہے۔ پھر ۴۱۱ تا ۴۲۰ مصنف اکمل التاریخ مولانا یعقوب حسین ضیاء القادری ہدایونی کی سوانح حیات اور قلمی خدمات پر تفصیلی تحریر ہے۔ راقم الحروف کے خیال سے ہندوستان میں پہلی بار کسی نے خانوادہ قادریہ کے اس اہم مورخ پر اپنی معلوماتی اور تفصیلی تحریر لکھی ہے۔ اس کے بعد "اکمل التاریخ" پر نقد و نظر: ایک جائزہ کے عنوان سے اکمل التاریخ کے بعض مندرجات کے تعلق سے عہد مصنف ہی میں بعض افراد کی جانب سے لکھے گئے کتب و رسائل کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ تحریر (۴۲۱ تا ۴۳۳) ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے، جو مرتب کی تحقیقی و تنقیدی اور تاریخی بصیرت و معلومات کا شاہکار ہے۔

اس کے بعد اکابر و مشائخ خانوادہ عثمانیہ کے اسناد حدیث، شجرہ طریقت، سلسلہ تلمذ کا بیان ہے جو ص ۴۳۵ تا ۴۴۳ پر مشتمل ہے۔ پھر فرید اقبال قادری ابن حضرت عبدالمجید اقبال قادری کی علم الانساب پر ایک اہم تحریر "نسب نامہ خاندان عثمانی ہدایوں" شامل اشاعت ہے جو ص ۴۴۵ سے شروع ہو کر ۴۵۷ پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں "حادثہ جانکاہ کے عنوان سے مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری کی ایک تعزیتی تحریر جو شاہ عبدالقدیر ہدایونی کے وصال پر ملال پر تحریر کی گئی تھی، شامل اشاعت ہے۔

قصیدتان رائگان (اردو ترجمہ و تشریح):

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی (۱۲۷۲ھ/۱۳۳۰ھ) کے دو عربی قصائد (۱) قصیدہ "نویہ" مدائح فضل الرسول، (۲) قصیدہ "والیہ" "حمائد فضل الرسول" کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۳۰۰ھ میں ۳۱۳ اشعار پر مشتمل عربی زبان میں نظم کیا۔ یہ دونوں عربی قصائد آپ نے سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول قادری ہدایونی اور تاج الحق مولانا شاہ عبدالقادر قادری ہدایونی کی مدح و منقبت میں آج سے ۱۳۵ سال پہلے کہے۔ دونوں قصائد کا عربی متن پہلی بار ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء میں

المجمع الاسلامی مبارک پور سے بخط مصنف عکسی طبعیت کی صورت میں سامنے آیا اور پھر اس کے بعد متعدد ادارے کی جانب سے یہ اشاعت پذیر ہوا۔ کئی مدارس کے عربی زبان و ادب کی تعلیم کے بطور شامل نصاب بھی ہوا، لیکن اب تک اس کا اردو ترجمہ و تشریح اہل علم پر قرض تھا، جس کی شاندار ادائیگی کا کام خانقاہ قادریہ عثمانیہ کے نامور فرزند حضرت مولانا اسید الحق قادری کی زیر نگرانی عمل میں آیا۔ قصیدے کا اردو ترجمہ و تشریح اور قصیدے پر نہایت علمی و تحقیقی فی و تاریخی مبسوط تقدیم "قصیدتان رائگان" ایک تحقیقی مقالہ کے ساتھ پہلی بار تاج الحق اکیڈمی ہدایوں کے زیر اہتمام ابھی حال ہی میں ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ/ اکتوبر ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا ہے۔

اس کتاب پر شروع میں امین ملت حضرت سید شاہ محمد امین میاں قادری (زیب سجادہ خانقاہ عالیہ برکاتیہ مارہرہ شریف) کی تقریظ مبارک ۴ صفحات پر مشتمل ہے، جو بقول مقدمہ نگار:

"اس قصیدے پر تقریظ لکھنے کے لیے سب سے موزوں ترین شخصیت ہیں کہ ان قصائد کے مدوح اور شاعر و ناظم دونوں حضرات کی بیعت و ولادت اور عقیدت و محبت کا سلسلہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ سے ملتا ہے۔"

راقم بھی موصوف کے اس اظہار "منبت شناسی" پر صاؤ کرتا ہے۔ اس کے بعد مولانا اسید الحق قادری کا ابتدائی ہے جس میں انہوں نے اس قصیدے کے ترجمہ و تشریح کے داعیے اور ترجمہ و تشریح کی خصوصیات پر ۴ صفحات میں اچھی روشنی ڈالی ہے۔

پھر اس کے بعد ص ۱۵ تا ۱۰۰ اکل ۸۵ صفحات میں ان کا طویل تحقیقی مقدمہ ہے۔ اس مقدمے میں انہوں نے تمہید و تعارف، قصیدے کی تالیف و سبب تالیف، قصیدے کا تاریخی نام، اشعار کی تعداد، قصیدے کے مخطوطات و خطی نسخے کا تعارف، مختلف اشاعتیں اور تحقیقی کام، دونوں قصائد کا موضوعاتی جائزہ، قصیدے کی مقبولیت، قصیدے کے اہم پہلو، قصیدے کا عروضی و لسانی جائزہ جیسے اہم مرکزی موضوعات اور اس کے تحت متعدد ذیلی عناوین پر معلومات افزا، بصیرت افروز تحقیقی گفتگو سپرد قلم کی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبیدی عراقی (ولادت ۱۹۳۰ء وصال ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء) کی عربی زبان میں شرح و تحقیق مطبوعہ

المجمع الرضوی العلیی بغداد ۲۰۰۲ء کا تنقیدی جائزہ قلم بند کیا ہے۔ یہ علمی و تنقیدی جائزہ ص ۵۲ تا ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمے کے سارے مباحث اور گوشے نہایت علمی و تحقیقی اور معلوماتی ہونے کے باوجود مقدمے کا یہ حصہ بطور خاص مطالعہ کیے جانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس گوشے میں مقدمہ نگار نے جس علمی آگاہی اور بصیرت کے ساتھ قصائد امام احمد رضا پر ڈاکٹر عبیدی عراقی صاحب کی تنقید کا علمی تجزیہ و محاسبہ دیا کہ کیا ہے، وہ انہیں کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

ص ۱۰۱ سے قصیدے کا ترجمہ و تشریح شروع ہوتا ہے۔ ترجمہ و تشریح کا یہ کام مولانا اسید الحق قادری کے ایک عزیز شاگرد مولانا حاتم اقبال قادری مجیدی (استاذ مدرسہ قادریہ بدایوں) نے اپنے استاذ گرامی کے حکم و خواہش پر انجام دیا ہے۔

پہلے قصیدہ نو بیہدایات فضل الرسول کا ترجمہ و تشریح ہے جو ص ۱۰۳ تا ۲۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے میں اشعار کی تعداد ۲۴۳ ہے۔ اس کے بعد قصیدہ دالیہ حماید فضل الرسول کا ترجمہ و تشریح ص ۲۳۰ تا ۲۵۲ صفحات پر ہے۔ اس قصیدے کے تحت ۷۰ اشعار ہیں۔ اس طرح دونوں قصائد کے کل اشعار کی تعداد ۳۱۲ ہے۔ پھر ۲۵۲ پر کتب خانہ قادریہ بدایوں میں محفوظ واحد مخطوطہ بخیر مصنف کے پہلے اور آخری صفحے کا عکس دیا گیا ہے۔

آخر میں راقم الحروف امین ملت حضرت سید شاہ امین میاں قادری برکاتی برکاتی مدظلہ العالی کی تقریظ سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہے جو درحقیقت جماعت اہل سنت کی شیرازہ بندی کے لیے ان کے مخلصانہ جذبات کی ترجمانی کے ساتھ سبھی غلامان مارہرہ کے لیے ایک اہم پیغام کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت امین ملت فرماتے ہیں:

”۳۱۳ اشعار پر مشتمل ان قصیدوں میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریوی قدس سرہ نے جامع معقول و منقول سیف اللہ السلول حضرت مولانا شاہ فضل رسول قادری برکاتی بدایونی قدس سرہ کی بارگاہ میں جس عقیدت اور محبت کا اظہار فرمایا ہے، اس کا انداز تو قارئین ان قصیدوں کو پڑھ کر ہی لگا سکتے ہیں، میں تو صرف یہ کہوں گا کہ جیسی محبت، عقیدت اور ربط ہمارے ان اکابر کے مابین ہوا کرتا تھا اگر

اس کا عشر عشر بھی ہمیں حاصل ہو جائے تو آج ہر ری جماعت کا عالم ہی نہ آلا ہو۔“ (ص ۷ تقریظ)

تاج الحول: حیات و خدمات:

یہ کتاب تاج الحول، محبت رسول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی کی سوانح حیات اور خدمات پر مشتمل ہے جو آپ کے صد سالہ عرس کے موقع پر ادارہ مظہر حق بدایوں کے زیر اہتمام اکتوبر ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آئی۔ کتاب کے مولف مفتی عبدالکیم نوری (سابق مدیر ماہ نامہ مظہر حق بدایوں) ہیں۔ پوری کتاب ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مشمولات کتاب کو مولف نے ۱۶ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب۔ تاج الحول، مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی کے خاندانی پس منظر اور ان کے سلسلہ اجداد کے ذکر پر مشتمل ہے۔

دوسرا باب۔ تاج الحول کی حیات کے تحت ولادت، تعلیم و تربیت، اجازت حدیث، بیعت و خلافت، حج و زیارت، سفر آخرت، کرامت، اولاد و اخلاف اور اساتذہ معقولات و مقولات کا خوب صورت ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں خدمات کے تحت مولف نے حضرت تاج الحول کی تدریسی خدمات، فتویٰ نویسی، دعوت و تبلیغ، سلسلہ بیعت و ارشاد اور مختلف تحریکات میں آپ کے قائدانہ کردار اور آخر میں تصانیف کا تعارف اور آپ کی تصنیفی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

باب چہارم شاعری کے تحت۔ حضرت تاج الحول کی شاعرانہ عظمت اور مجموعہ شاعری ”در شہوار عقیدت“ (۱۲۹۹ھ) کا تجزیاتی و تاریخی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب معاصرین و اکابرین کے تحت مولف کتاب نے حضرت تاج الحول کی علمی عظمت اور قائدانہ حیثیت کے اعتراف پر مشتمل اکابر و معاصرین کے اقوال و ارشادات کو پیش کیا ہے۔ اس باب کے تحت انھوں نے سیف اللہ السلول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی، مولانا عبدالسیح بیدل رام پوری، قاضی عبد الوحید فردوسی، علامہ فضل حق خیر آبادی، علامہ عبدالحق خیر آبادی، سید شاہ آل رسول احمدی مارہروی، سید شاہ ابوالحسن نوری مارہروی، علامہ خیر الدین دہلوی، مولانا حسن رضا بیلوی کی جانب سے حضرت تاج الحول کی علمی و روحانی شخصیت پر مشتمل اقوال و اعترافات کو معاصر شواہد کی

روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

باب ششم کے تحت مصنف کتاب نے تاج الحول اور امام احمد رضا بدایونی کے درمیان عقیدت مند انداز و وابہاندہ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

مولف موصوف نے یہ کتاب بھی شیخ اسید الحق قادری بدایونی کے خواہش و حکم پر مرتب کی۔ یہ کتاب تاج الحول کی حیات و خدمات پر ایک اولین تحقیقی کاوش ہے جس پر مصنف کو راقم الحروف مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تذکرہ و سیرت نگاری کے اصول کو نظر رکھتے ہوئے پوری گفتگو صاحب تذکرہ کے تعلق سے اولیں ناخذ و موصوں کے آئینے میں کی ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب تاج الحول کی نیت و خدمات پر ایک مستند ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

تاج الحول نمبر:

ماہ نامہ مظہر حق بدایوں کا یہ تاریخی و دستاویزی نمبر ہے جو میگزین نمبر ۶۷۲ کے صفحات پر مشتمل ہے۔ تاج الحول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ کے جشن صد سالہ ۱۹۹۸ء کے موقع پر خانقاہ قادریہ بدایوں کے زیر اہتمام شعبان تا ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ نومبر تا مارچ ۱۹۹۸ء، ۱۹۹۹ء جلد شمارہ ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ کے بطور منظر عام پر آیا۔

تاریخی نمبر حضرت تاج الحول کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں پر برصغیر ہندو پاک کے سینکڑوں مشاہیر اباب قلم و اہل دانش کے مقالات، مضامین، تاثرات، منظومات کا مجموعہ ہے، جس کی ترتیب ادارت مفتی عبدالکیم نوری و صاحبزادہ گرامی مولانا اسید الحق قادری نے انجام دی ہے۔ معاون مرتبین کی حیثیت سے مولانا محمد حنیف قادری لٹوی اور ڈاکٹر شاداب ذکی بدایونی کا نام شامل ہے۔ شروع میں جشن صد سالہ تاج الحول ۱۹۹۸ء کی تفصیلی رپورٹ بھی شامل ہے۔

اختتام مولانا شیخ اسید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ کی عسی اور نائق خدمات کا تعارف میں اس امید کے مکمل کر رہا ہوں کہ شیخ صاحب نے جس مشن کو شروع کیا تھا، حضرت قبلہ شیخ عبدالحمید سالم القادری دام اللہ کے زیر سایہ، ان کے برادران، احباب اور تلامذہ کا کاروان شوق سے منزل مقصود تک ضرور پہنچائے گا۔

□□□

مکتبہ ریسرچ اسلام آباد، جامعہ اہل سنت، تعلق آباد، نئی دہلی

عصری معیار کے مطابق اسلامی ادب کا اشاعتی مرکز

ادارہ فکر اسلامی، دہلی

کی اہم مطبوعات

دور جدید کے بعض مسلم مسائل

ایک باز دید

(از: مولانا خوشتر نورانی، صفحات: 156)

علامہ ارشد القادری کے بے لاگ اداروں کا مجموعہ

فغان درویش

(از: مولانا خوشتر نورانی، صفحات: 136)

Islam, Jihad and Terrorism

By: Khushtar Noorani

Pages: 395,

جہاد اور دہشت گردی، اجتہاد و تقلید اور انقلاب ۱۸۵۷ء پر

تین علمی و فکری انٹرویوز

(از: مولانا خوشتر نورانی، صفحات: 88)

ماہنامہ جام نور کا ایک یادگار تنقیدی، علمی و ادبی کالم

خامہ تلاشی

(از: ابو فیض معینی، صفحات: 200)

تحقیق و تفہیم

(از: مولانا اسید الحق قادری، صفحات: 276)

تقسیم کار: مکتبہ جام نور، دہلی

Phone: 011-23281418, 09313783691

مولانا سید الحق قادری کی تصانیف: ایک تعارف

مولانا بدایونی کے آہوئے قلم سے جو نفاذ مشک لکل کر آیا ہے اس کی خوشبو سے اہل علم کے مشام جاں معطر ہو گئے

دنیا میں لاکھوں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کی موت کا کسی کو افسوس نہیں ہوتا، لیکن اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اس دنیا سے رخصتی پر ایک عالم میں کھرام بپا ہو جاتا ہے اور وہ غم اس وقت اور بھی جاں کاہ ہوتا ہے جب کہ وفات پانے والے کی شخصیت ایسی ہو کہ اس سے ایک عالم کو ضیاء ملتی ہو، ایک نسل کی عیسیٰ و دینی تربیت ہوتی ہو، اس کی ضیا پاشیوں کو ابھی بام عروج تک پہنچنا باقی ہو اور ملت اسلامیہ کی بڑی امیدیں اور تمناؤں اس سے وابستہ ہوں۔ ان عظیم شخصیات میں ایک شخصیت حضرت علامہ سید الحق قادری صاحب کی ہے۔ عین عہد شباب میں ان کی ناگہانی شہادت سے پوری جماعت اہل سنت بلکہ انھی اور پوری دنیائے اہل سنت سوگوار ہو گئی۔ یہ تو ایک پہلو رہا لیکن جب ان کے کارناموں پر نظر پڑتی اور ان کی مصنفات و مؤلفات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مختصر مدت میں وہ کام کر ڈالا جو دوسرے لوگ طویل عمر پانے کے بعد بھی نہیں کر پاتے، بلکہ اس مختصر مدت میں ان کے ذریعے انجام پانے والے کام بھی ان کو اکابر کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے کام کی جہتیں متنوع اور متعدد ہیں۔ میں ذیل میں صرف ان کی تصانیف کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ علامہ موصوف نے اپنی زندگی کو کس قدر بہتر طریقے سے استعمال کیا اور آئندہ نسلوں کے لیے دینی و علمی خدمات کے باب میں کیسی قابل تقلید مثال قائم کی۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک اندازے کے مطابق کم و بیش ایک درجن ہے۔ ان کی یہ خدمت سب سے زائد خاندانی افاضل کی کتابوں کی تحقیق، تخریج اور مقدمہ نگاری کے علاوہ ہے جسے انھوں نے دس سال کے عرصے میں انجام دیا۔

علامہ سید الحق قادری روز اول سے ہی اپنے تحقیقی مزاج، مثبت انداز فکر، معروضی پیش کش اور نگہ سے ہوئے اسلوب تحریر کے لیے معروف رہے۔ چنانچہ ان کے آہوئے قلم سے جو نفاذ مشک لکل کر آیا ہے اس کی خوشبو سے اہل علم کے مشام جاں معطر ہو گئے۔

ان کی تالیفات کی مختلف نوعیتیں ہیں، بعض تو ان تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہیں جو جام نور کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے اور پھر بعد میں کچھ حذف و اضافے کے بعد اسے کتابی شکل دے دی گئی۔ بعض وہ تنقیدی تحریریں ہیں جو جام نور دہلی کے مشہور زمانہ کالم ”خامہ تلاشی“ میں شائع ہوئیں جن کی بنا پر جام نور کی مقبولیت کا گراف آسمان چھونے لگا اور بعد میں اس کی علمی، تنقیدی و تربیتی افادیت کی خاطر اسے ”خامہ تلاشی“ کے نام سے ہی کتابی فارم میں طبع کروایا گیا۔ بعض وہ کتابچے ہیں جو کسی ایک خاص عنوان پر لکھے گئے ہیں اور جو پہلے جام نور یا ان کے علاوہ دوسرے جرائد و مجلات میں تحقیقی اور مفصل مضمون کے طور پر شائع ہوئے اور بعد میں مضامین کی طوالت کے مد نظر حذف و اضافے کے ساتھ مستقل کتابچے کی صورت میں زیر طبع سے آراستہ کیا گیا اور بعض کتابیں وہ ہیں جو درحقیقت تصنیف کا درجہ رکھتی ہیں اور کسی ایک خاص تحقیقی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی جن تصانیف و تالیفات کے نام مجھے معلوم ہو سکے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) خامہ تلاشی (۲) تحقیق و تنہیم (۳) حدیث افتراق امت: تحقیقی مطالعے کی روشنی میں (۴) فرزدق تیبی کا قصیدہ مہمہ: ایک تحقیقی مطالعہ (۵) قرآن کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ (۶) عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات (۷) خبر آبادیات (۸) احادیث قدسیہ (۹) تذکرہ ماجد (۱۰) مفتی لطف بدایونی: شخصیت اور شاعری (۱۱) تذکرہ شمس مارہرہ (۱۲) اسلام ایک تعارف۔

ذیل میں مذکورہ بالا کتابوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) خامہ تلاشی:

یہ کتاب علامہ سید الحق قادری کے ان تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو جام نور کے سب سے مقبول کالم ”خامہ تلاشی“ میں اپریل ۲۰۰۵ء سے لے کر دسمبر ۲۰۰۶ء تک تقریباً پونے دو سال کے عرصے میں شائع ہوئے۔ خامہ تلاشی کا کالم کس قدر اہل علم کے درمیان مقبول ہوا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کالم کو فیضی کی ہانگ دراء، مشفق خواجہ کے خامہ بگوش آزاد کی غبار خاطر اور ظفر علی خان کے مطالبات سے تشبیہ دی گئی۔

یوں تو پہلے سے علامہ سید الحق کی علمیت کا لوہا مانا جاتا تھا لیکن جب اس کالم کے تحت ابوالفیض معینی کے نام سے ان کی تنقیدی تحریریں آئیں جن میں انھوں نے علوم قرآن، علوم حدیث، ادب، بلاغت، عروض اور دوسرے تمام علوم پر ناقہ اند و محققانہ انداز میں اظہار خیال کیا تو اکثریت نے یہ گمان کیا کہ یہ ایک شخص کا کام نہیں ہے بلکہ اس کالم کو لکھنے میں ایک پوری اکیڈمک ٹیم رول ادا کرتی ہے لیکن جب کالم بند ہوا اور یہ سر نہاں فاش ہوا کہ یہ کالم کوئی اور نہیں بلکہ فاضل نوجوان، مجتہدی زماں حضرت علامہ سید الحق لکھ رہے ہیں تو لوگ انگشت بدندان رہ گئے اور لوگ اس شہسوار علوم و معارف کے آگے سجدہ تحیت بجالائے۔

”خامہ تلاشی“ کے بند ہو جانے کے بعد نقاب کے نام سے ایک دوسرا کالم شروع ہوا جو جنوری، فروری صرف دو مہینے تک لکھا گیا اور بعد میں چند وجوہ کی بنا پر اس کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

”خامہ تلاشی“ کا کالم چوں کہ ایک قلمی نام سے شائع ہو رہا تھا، اس لیے لوگوں کو اسی بات کا بڑا اشتیاق اور تجسس تھا کہ اس کے کالم نگار کون ہیں، چنانچہ جب یہ کالم بند ہوا تو ان سے ایک مفصل انٹرویو کے ذریعے کالم نگار کی رونمائی ہوئی۔

بعد میں ”خامہ تلاشی“ کے تمام مضامین (اپریل ۲۰۰۵ء، دسمبر ۲۰۰۶ء) اور ”نقاب“ کے دو مضمون کو جمع کر کے مدیر ماہ نامہ جام نور کے مقدمے اور کالم نگار کے بارے میں اہل علم کے گراں قدر تاثرات کے ساتھ ادارہ فکر اسلامی دہلی سے شائع کیا گیا۔ کہنے کے لیے یہ صرف مضامین کا مجموعہ ہے لیکن درحقیقت طالبان علوم اور تحقیق و تنقید سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ دائرہ معارف کی حیثیت رکھنے والا سرمایہ ہے۔

(۲) تحقیق و تنہیم:

یہ کتاب بھی علامہ سید الحق کے ان علمی و تحقیقی شہ پاروں کا مجموعہ ہے جو ۲۰۰۳ء سے لے کر دسمبر ۲۰۰۹ء تک جام نور کے صفحات پر شائع ہوئے۔ ان سے صرف چار مضامین ایسے ہیں جو جام نور میں شائع نہیں ہوئے۔ ان مضامین کو موضوع کے لحاظ سے مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ جن مضامین کا تعلق تحقیقات سے تھا، ان کو تحقیقات کے عنوان سے جن کا تنہیم حدیث سے تھا ان کو تنہیم حدیث کے سرنامے کے ساتھ، جو اجتہاد و تقلید سے تعلق رکھنے والے تھے ان کو اجتہاد و تقلید کے نام سے، جو تصوف و سلوک کے مباحث پر مشتمل تھے ان کو تصوف و سلوک کے نام سے اور جن کا تعلق مباحث سے تھا ان کو مباحث کی شہ سرفی کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کے چند اہم موضوعات کچھ اس طرح ہیں: نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت، مطہ اہل سنت و جماعت: تاریخی پس منظر اور اشاعتی خدمات، تحریک بالآثار کے خلاف ایک روایت کا علمی جائزہ، متن حدیث کی بازیافت، مصنف ابن ابی شیبہ اور فقہ حنفی، شیخ بہاء الدین شطاری اور سلسلہ شطاریہ، دعوت و تبلیغ کے لیے خانقاہی نظام کتنا موثر ہے؟ جماعت اہل سنت کا تحقیقی تعارف کیا ہے؟ مؤلف کی دوسری تحریروں کی طرح مؤلف کی دوسری تمام تحریریں علمی و تحقیقی آہنگ اور سادہ و نگین اسلوب لیے ہوئے ہیں۔ کتاب ۲۷۲ صفحات مشتمل ہے اور طباعت کی خدمت ادارہ فکر اسلامی دہلی نے انجام دی ہے۔

(۳) حدیث افتراق امت: تحقیقی مطالعے کی روشنی میں:

علامہ سید الحق کے قلم سے نکلا ہوا یہ وہ تحقیقی شاہ کار ہے جس کا محرک خود مؤلف کے بقول: فیکلنی آف اصول الدین جامعہ ازہر کے شعبہ عقیدہ کے استاذ ڈاکٹر محمد احمد المسیر کا ایک رسالہ قضیۃ التکفیر فی الفکر الاسلامی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک مبسوط مقالہ ہے جو جام نور کے صفحات پر چار سطحوں (مئی تا اگست ۲۰۰۵ء) میں شائع ہوا تھا اور پھر بعد میں بعض جزوی ترمیم کے ساتھ اسے تاج التحول اکیڈمی بدایوں نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ کتاب کا موضوع جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے وہ حدیث رسول ﷺ ہے جس میں ۳ فرقوں میں امت محمدیہ کے بننے کی بات کہی گئی ہے۔ مؤلف نے اس کتاب میں حدیث

افتراق کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے، اس کے تمام طرق کا جائزہ لیا ہے، ان کی اسنادی حیثیت کو واضح کیا ہے اور پھر اس سے جو مفہوم نکل کر آتا ہے، اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

امت سے کیا مراد ہے، امت اجابت یا دعوت؟ اور پھر کھلا فی النار سے کیا مراد ہے، خلود فی النار یا دخول فی النار؟ ان تمام موضوعات پر مکمل کر بحث کی ہے۔ جدید و قدیم ائمہ اعلام کے اقوال نقل کیے ہیں اور پھر علی منہج کے مطابق خلاصہ بحث لکھا ہے اور دس نتائج بیان کیے ہیں۔ اسی میں پہلا نتیجہ یہ ہے کہ حدیث افتراق امت ۱۸ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم اجماع سے مروی ہے اور آخری تین نتائج یہ بیان کیے ہیں کہ حدیث میں کھلا فی النار سے خلود فی النار نہیں بلکہ دخول فی النار مراد ہے۔ اہل قبلہ کی تکفیر کا مسئلہ بہت نازک ہے، لہذا تاویل کر کے تکفیر سے رکنے اور احتیاط کی ضرورت ہے اور فرقہ تاجیہ کے علاوہ باقی فرقے گمراہ اور گمراہ گر ہیں اور ان کا رد و ابطال ضروری ہے۔

اس مقالے کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی تیاری میں ۵۴۲ مصادر و مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد کوئی بھی قاری ان کی تحقیقی شخصیت کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۴) قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تحفیدی مطالعہ:

علامہ اسید الحق کے شذرات الذہب میں ایک شذرہ قرآن کریم کی سائنسی تفسیر بھی ہے۔ یہ کتاب بھی دراصل ان کے تحقیقی مضامین میں سے ایک ہے جو جام نور میں چار قسطوں میں شائع ہوئے اور بعد میں اس مقالے کی اہمیت اور غنیمت کی وجہ سے ماہنامہ سوئے حجاز لاہور نے بھی اسے ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں شامل کیا اور یہی مقالہ بعد میں تاج الحول اکیڈمی بادیوں کی طرف سے کتابی شکل میں بغیر حذف و اضافے کے شائع ہوا۔ مؤلف اس میں حذف و اضافہ کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی گونا گوں مصروفیات ان کی خواہش راہ میں مانع ہوئی اور مقالے کو اپنی سابقہ حالت میں ہی شائع کرنا پڑا۔

اس کتاب میں انھوں نے سائنسی تفسیر کے رجحانات کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ سائنسی تفسیر کے مفہوم کو واضح کیا ہے اور سائنسی تفسیر

کے جواز کے حوالے سے علما کی آرا کو نقل کیا ہے، جو علمائے سائنسی تفسیر کے مخالف تھے ان کی آرا کو بھی ان کے دلائل سے نقل کیا ہے۔ پھر فریقین کے دلائل کا ناقدانہ اور بصیرت مندانہ تجزیہ کیا ہے، قرآن اور سائنس میں تعارض کی حقیقت پر بحث کی ہے، سائنسی تفسیر کے سلسلے میں ہونے والی بعض بے اعتدالیوں کو واضح کیا ہے، سائنسی تفسیر کے رواج کے اسباب مختصر ذکر کیا ہے، سائنسی تفسیر کے جواز کے شرائط کو بیان کیا ہے اور پھر اخیر میں غیر مقبول سائنسی تفاسیر کے کچھ نمونے ذکر کیے ہیں، لیکن مقبول سائنسی تفاسیر کے نمونے ذکر نہیں کیے ہیں۔ اس کی کمی انھوں نے خود اپنے پیش لفظ میں بھی صراحت کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر مقبول سائنسی تفاسیر کے نمونے شامل ہو جائے تو موضوع کے ساتھ پورا انصاف ہو جاتا۔ خود مؤلف نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے، اس کی کمی سے قطع نظر کتاب علمی تحقیق اور بحث و تجزیہ کا اعلیٰ نمونہ اور اہل علم و تحقیق کے ذوق کی تسکین کا عمدہ دسترخوان ہے۔ ۵۷ صفحات کی اس کتاب کی تیاری میں ۲۷ مصادر و مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے جو اس کتاب کے علمی و تحقیقی ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(۴) فردوزق خمی کا قصیدہ ہمسیمہ: ایک تحقیقی مطالعہ:

اسید الحق قادری صرف علوم اسلامیہ میں ہی دستگاہ رکھنے والے نہیں تھے بلکہ ادبی ذوق بھی بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ ان کو عربی ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ انھوں نے علوم عربیہ و اسلامیہ کے گہوارے جامعہ ازہر مصر کے چشمہ علمی سے استباب فیض کیا تھا۔ چنانچہ عربی ادب میں ان کی مہارت کی نمائندہ کتابوں میں ایک کتاب ”فردوزق خمی کا قصیدہ ہمسیمہ: ایک تحقیقی مطالعہ“ ہے۔ یہ کتاب بھی دراصل جام نور میں شائع شدہ (اگست ۲۰۱۲ء) ان کے ایک علمی و تحقیقی مضمون کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے سب سے پہلے قصیدہ ہمسیمہ کے حوالے سے تمہیدی و تعارفی تحریر لکھی ہے، پھر امام زین العابدین کا ایک خوب صورت تعارف تاریخی شواہد کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کی عظمت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے بعد قصیدہ کہنے والے فردوزق کی زندگی کے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور خصوصاً قصیدہ ہمسیمہ کہنے کی پاداش میں اس کو جو قید و بند کی سزا جھیلی پڑی، اس کا ذکر کیا

ہے اور پھر امام زین العابدین کی شان میں کہے گئے اس قصیدے کی برکت سے فردوزق کی نجات کے حوالے سے علمائے امت نے جو باتیں کہی ہیں، ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فردوزق نے جس اموی بادشاہ کے سامنے یہ قصیدہ کہا تھا اس کے متعلق بھی کچھ سوانحی باتیں لکھی گئی ہیں اور اس کے بعد قصیدہ ہمسیمہ کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جس کے ذیل میں یہ بحث بھی آئی ہے کہ یہ قصیدہ درحقیقت فردوزق ہی کا ہے یا کسی اور کا؟ اور یہ کہ یہ قصیدہ امام زین العابدین کی شان میں ہی کہا گیا یا کسی اور کی شان میں؟ ان دونوں پہلوؤں پر تاریخی شواہد کی روشنی میں معروضی گفتگو کی گئی ہے، پھر امت میں اس قصیدے کی مقبولیت کے ضمن اس کے فارسی ترجمے، اس کی تحمیس اور شروع کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے اور جن علمائے اس قصیدے کے حوالے سے کوئی کام کیا تھا ان کا اور ان کے کام کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے اور اخیر میں مختلف کتابوں سے جمع کر کے قصیدہ ہمسیمہ کا متن سلیس اور با محاورہ ترجمے کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

میرے علم کی حد تک فردوزق کے قصیدہ ہمسیمہ کے حوالے سے ایسا کوئی علمی کام اس سے پہلے سامنے نہیں آیا۔ یہ کتاب عربی شعر و ادب سے ذوق رکھنے والوں کے علاوہ اہل بیت سے محبت رکھنے والوں کی بھی روح کی تسکین کا سامان ہے۔

(۵) احادیث قدسیہ:

احادیث قدسیہ، احادیث کے ذخیرے میں ایک الگ شان رکھتی ہیں۔ اسی امتیازی شان کی بنا پر محدثین اور صوفیہ نے احادیث قدسیہ کے مستقل مجموعے ترتیب دیے۔ اردو زبان میں اس حوالے سے تا کے برابر کام ہوا ہے۔ علامہ اسید الحق قادری چوں کہ جامعہ ازہر مصر جس کی حدیث اور علوم حدیث میں پیش بہا خدمات ہیں، وہاں کے ممتاز ہندوستانی فاضل ہیں، اس لیے ان کا یہ حق بھی تھا کہ وہ اس طرح کے موضوعات پر کام کریں اور احادیث کی خدمت انجام دیں۔ چنانچہ انھوں نے احادیث قدسیہ کے نام سے اردو زبان میں ایک مجموعہ ترتیب دیا، اس کی ترتیب میں منہج اور طریقہ کیا رہا، اس کی انھوں نے عرض مرتب کے نام سے لکھی گئی تحریر میں وضاحت کر دی ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ اس مجموعے کی زیادہ تر احادیث صحت کے اعلیٰ درجے پر ہیں، عموماً مشفق علیہ ہیں یا پھر صحیحین میں سے کسی ایک کی

ہیں، اگر ان کے علاوہ کسی اور کتاب کی ہیں تو پھر صحت کی پوری تحقیق کے بعد ہی اس کو درج کیا گیا ہے۔ ۱۰۰ سے کم احادیث ایسی ہیں جن کو محدثین نے حسن کہا ہے، البتہ تین حدیثیں ایسی بھی ہیں جن کو بعض متشددین نے ضعیف کہا ہے مگر وہ بھی متابعات و شواہد کی وجہ سے قوی ہیں۔ ۱۳ مختلف عنوانات کے تحت احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔ وہ عنوانات یہ ہیں:

عقیدہ ایمان، عظمت پروردگار، رحمت و مغفرت، جنت و دوزخ، عظمت مصطفیٰ، انبیاء و مرسلین، شفاعت، امت محمدیہ کی فضیلت، اولیاء و صالحین کا مرتبہ، شہداء کا مرتبہ اور جہاد کی فضیلت، اعمال صالحہ کی فضیلت، گناہوں کا انجام۔

اس مجموعے میں احادیث کی کل تعداد کتنی ہے، اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے، میرے شمار کے مطابق کل ۱۰۲ احادیث ہیں، اگر آئندہ ایڈیشن میں احادیث کی نمبرنگ کر دی جائے تو بہتر ہوگا۔

اصل کتاب کے علاوہ مرتب کی طرف سے عرض مرتب کے علاوہ احادیث قدسیہ کے حوالے سے ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں حدیث کے معنی و مفہوم، قرآن کریم اور احادیث قدسیہ میں فرق، حدیث قدسی کے اقسام، ان کی تعداد، ان کے موضوعات، موضوع احادیث قدسیہ اور موضوع کی بعض اہم کتابوں کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ مؤلف کے دوست اور فاضل ازہر مولانا منظر الاسلام ازہری نے احادیث قدسیہ اور صفات باری کے عنوان سے ایک مبسوط علمی مقدمہ لکھا ہے۔ چوں کہ احادیث قدسیہ میں صفات باری کا ذکر بکثرت آیا ہے اور ان صفات کا ذکر کثرت سے آیا ہے، جو تشبیہ کا وہم پیدا کرنے والی ہیں، اس لیے اس مقدمے کا ہونا ضروری تھا۔ انھوں نے پوری علمی تحقیق کے ساتھ صفات باری کے حوالے اہل سنت کے موقف کو واضح کیا ہے اور اہل بدعت کے نظریات کی کمزوریوں کو اجاگر کیا ہے۔ خود مؤلف کے مقدمے اور پھر مولانا منظر الاسلام کے مقدمے کے ساتھ یہ مجموعہ بہت ہی وقیع ہو گیا ہے اور کم از کم ہندوستانی سطح پر احادیث کے ذخیرے میں یقیناً یہ قیمتی اضافہ ہے۔ احادیث کا کوئی بھی طالب علم اس کتاب کے علمی مباحث اور صحیح احادیث قدسیہ کے انتخاب کو دیکھنے کے بعد اس کتاب کی ضرورت و اہمیت کا قائل ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ اس بیش قیمت کتاب کو جو ۸۷۸ صفحات پر مشتمل ہے، تاج الحول اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

علامہ اسید الحق قادری نے یوں تو جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا، تحقیق کا حق ادا کر دیا، لیکن ان کی تحقیقی کاوشوں میں ان کی یہ کوشش ان کے اعلیٰ تاریخی شعور کی غماز ہے۔ خیر آبادی سلسلہ علم و فضل کے احوال و آثار پر یہ ایک انوکھی کاوش ہے، جس وقت یہ کتاب اہل علم کے درمیان پہنچی، ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور اس کتاب کی انفرادیت پر گفتگو شروع ہو گئی اور بڑے بڑے اہل علم و فضل کتاب کی خصوصیتوں کی بنا پر اپنی گرامی قدر آرا سے نوازا۔ کتاب کا انتساب سلسلہ خیر آباد کے عناصر راجعہ علامہ عبدالحق خیر آبادی، مولانا عبدالقادر بدایونی، استاذ الاساتذہ، مولانا ہدایت اللہ رام پوری اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی طرف کیا گیا ہے۔ مصنف کے ”اظہار یہ“ ”دعائیہ کلمات“، ”خیر آبادیات میری نظر میں“ اور اس طرح کے دوسرے متعلقات کتاب کے علاوہ کتاب میں خیر البلاد خیر آباد، خانوادہ خیر آباد، خانوادہ خیر آباد کی اہل علم خواتین، مدرسہ خیر آباد، خیر آبادی طریقہ درس اور اس کی خصوصیات، خیر آبادی اساتذہ کی شفقت، خیر آبادی تلامذہ کی عقیدت، استاد بھائی کا رشتہ، بدایوں میں سلسلہ خیر آباد، کتب خانہ قادریہ میں خیر آبادی نواور، فضل حق، فضل رسول اور آرزو، علامہ فضل حق خیر آبادی اور حافظ محمد علی خیر آبادی، علامہ فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسماعیل دہلوی، علامہ فضل حق کے بارے میں بعض بے بنیاد روایتیں، علامہ فضل حق خیر آبادی اور سید حیدر علی ٹوکی، علامہ فضل حق خیر آبادی اور مفتی سعد اللہ مراد آبادی، علامہ فضل حق خیر آبادی کے علمی معرکے، مولانا عبدالحق خیر آبادی اور ان کے تلامذہ کے علمی معرکے، لطائف خیر آباد، اطہر مان کا ایک سفر، خیر آبادیات پر تحقیقی، تصنیفی اور اشاعتی کام جیسے عنوانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور پورے تاریخی تسلسل کے واقعات کو تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کے اخیر میں دو ضمیمے بھی شامل اشاعت ہیں، ایک ضمیمہ مولانا فضل رسول بدایونی اور سید حیدر علی کی مناقشات سے متعلق ہے جب کہ دوسرے ضمیمے میں روداد مناظرہ دہلی ہے۔

اظہار یہ میں مولف نے کتاب کی تالیف کے پس منظر اور پھر علمی منہج کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور کتاب کی مختلف خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں کچھ معلومات وہ ہیں جو شاید پہلی بار

منظر پر آئے۔ مثلاً مفتی سعد اللہ مراد آبادی کے ساتھ علامہ فضل حق خیر آبادی کی معرکہ آرائی، علامہ فضل رسول بدایونی اور مفتی صدر الدین آرزو کے باہمی علمی مناقشات کی تفصیلات وغیرہ جو مباحث پرانے ہیں، ان میں بھی اضافے یا پھر نئے انداز ان کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی بنا پر ان قدیم مباحث پر بھی نیا غول چڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پامال شدہ واقعات کے اعادے سے کتاب کو بالکل پاک رکھا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ریسرچ اور تحقیق کے اصول پر یہ کتاب پوری طرح منطبق ہے۔ ریسرچ کا مقصد ہوتا ہے نئے عنوان پر کام کرنا یا پھر پرانے عنوان نئے مباحث کا اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب ریسرچ کے دونوں مقاصد کو پوری کرنے والی ہے۔

عربی محاورات:

علامہ اسید الحق قادری کو علوم عربیہ سے گہرا شغف تھا اور ان کے اس ذوق پر شہادت کے لیے فرزدق حبیبی کا قصیدہ مسیہ نامی کتاب ہی کافی ہے۔ ان کے اسی ذوق کی نمائندہ ایک دوسری کتاب بھی ہے جس کا نام ہے عربی محاورات۔

اصل کتاب سے پہلے اظہار یہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کی تالیف کا پس منظر بیان کیا ہے اور پھر منہج ترتیب و تالیف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم صدر شعبہ اردو جامعہ ازہر مصر کی تقریظ ہے جس میں انھوں نے کتاب کی اہمیت و افادیت اور اس کی خصوصیات پر گفتگو کی ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عصام ابو غریبہ پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی، قاہرہ مصر کی بھی تقریظ ہے جس میں انھوں نے مولف سے اپنے تعلقات کی شکل کا ذکر کیا ہے اور پھر مؤلف کی طالب علم کی حیثیت سے اعلیٰ خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے اور دعاؤں سے نوازا ہے۔ ان دونوں عالم عرب کے اساتذہ کے علاوہ ڈاکٹر مصطفی شریف صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کی تقریظ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد عربی اور اردو محاورات، تحقیق و تجزیہ کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ ہے جو علمی اور تحقیقی لحاظ سے کتاب کی جان ہے۔ اس مقدمے کو پڑھنے کے بعد عربی اور اردو زبان و ادب کی بلاغتوں اور اس کی نزاکتوں سے ان کی گہری آشنائی کا اندازہ ہوتا ہے اور مقارناتی

ادب پر ان کی دسترس کا ثبوت ملتا ہے۔ ادب مقارن کے دل دادگان لیے یہ مقدمہ لازمی مطالعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی مقدمے کے بعد انھوں نے پوری دیانت داری کے ساتھ اس کی ترتیب میں جن کتابوں سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، ان کا ذکر کیا اور منہج پر بھی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب یعنی عربی محاورات کو ذکر کر کے اردو میں اس کا متبادل ذکر کیا ہے اور اس کا ترجمہ کیا ہے۔

یہ محاورات دو ابواب پر منقسم ہیں؛ پہلے باب میں ان محاورات کو ذکر کیا گیا ہے جن کی ابتدا فضل سے ہوتی ہے جب کہ دوسرے باب میں ان محاورات کو ذکر کیا گیا ہے جو جملہ اسیم ہیں یا پھر مرکب ناقص۔

ان محاورات کے مطالعے سے خود میری معلومات میں وسعت پیدا ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ عربی زبان و ادب کے اسکالرز و طلبہ اگر اس کتاب کا مطالعہ کر لیں تو ضرور ان کی ادبی و لسانی قوت میں اضافہ ہوگا۔ خود مترجمین کے اندر ترجمہ کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوگا۔ انشا کی غلطیوں سے بچیں گے اور ترجمہ کی راہ کی تاریکیوں میں یہ کتاب منارہ نور ثابت ہوگی۔

تذکرہ ماجد:

یہ کتاب علامہ اسید الحق قادری کی مولانا عبد الماجد بدایونی پر ایک تحقیقی مقالہ اور دیگر چند اہل علم و تاریخ کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ مولانا قادری کا جو مقالہ اس کتاب میں شامل ہے، یہ مقالہ جام نور میں چھپ چکا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اہل علم کے مضامین، ملک کے دیگر معروف جرائد و رسائل اور کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے مولانا عبد الماجد بدایونی کی شخصیت، سیرت اور خدمات علمی و ملی کی واضح تصویر قارئین کے سامنے آتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار تاج اللؤلؤ اکیڈمی سے ۲۰۰۹ء میں چھپی ہے۔ ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

مفتی لطف بدایونی: شخصیت اور شاعری:

مفتی اکرام احمد لطف قادری بدایونی کی شخصیت اور شاعری علامہ اسید کی ایک اہم تالیف ہے، جس میں شخصیت اور شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا ایک انتخاب بھی شامل اشاعت کر لیا گیا ہے۔ شخصیت و شاعری کے تعلق سے آل احمد سرور، مولانا عبد الہادی قادری، اور ابراہیم علی صدیقی کے تین اہم مضامین بھی شامل کتاب ہیں، جن سے

مفتی لطف بدایونی کی شخصیت اور کمالات شاعری کے اہم پہلو کا انکشاف ہوتا ہے۔ پوری کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جس کی پہلی اشاعت ۲۰۱۰ء میں تاج اللؤلؤ اکیڈمی بدایوں سے شائع ہوئی۔

تذکرہ شمس مارہرہ:

شمس مارہرہ حضرت اچھے میاں مارہروی قدس سرہ کی حیات زندگی، افکار اور تعلیمات پر یہ ایک اہم تالیف ہے۔ یہ کتاب علامہ اسید الحق کے دو مقالات کا مجموعہ ہے جو دو الگ الگ رسائل میں شائع ہوئے، لیکن بعد میں یہ دونوں مقالے کتابی صورت میں اہم اضافے کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ کتاب شمس مارہرہ کی روحانی و عملی زندگی کو جاننے کے لیے ایک اہم تصنیف کی اہمیت رکھتی ہے۔ ضخامت مختصر ہے، لیکن جامعیت اور معلومات کا شاہکار ہے۔

اسلام: ایک تعارف:

یہ کتاب علامہ اسید الحق قادری بدایونی نے برادران وطن کی تفہیم اور ذہنی سطح کا خیال کر کے تصنیف کیا۔ اس لیے نہایت سادہ اور آسان زبان میں اسلام اور پیغام اسلام کو پیش کیا گیا ہے۔ ۳۲ صفحات پر مشتمل مختصر ضخامت کی یہ کتاب مبلغین اور داعیان اسلام کے لیے ایک اہم تحفہ ہے جس کے ذریعے وہ اسلام کی اشاعت اور تعارف ہر جگہ اچھے انداز میں انجام دے سکتے ہیں۔ اسی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہندی، انگلش، مراٹھی، گجراتی اور قسمل زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے۔

علامہ اسید الحق قادری کی یہ چند اہم علمی و ادبی تحقیقی و تنقیدی کتابیں تھیں جن کا ایک سرسری تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ ان کی کتابوں کا حقیقی تجزیہ نہیں ہے بلکہ یہ صرف چند نقوش ہیں جن کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی تمام کتابوں کے مطالعے سے بغض نفیس میں نے خود بہت کچھ سیکھا ہے، استفادہ کیا ہے اور ان کی تصنیفات آئندہ علم و تحقیق سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں گی۔ ان سے خود میرے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ ہمارے تمام احباب کے کرم فرماتے تھے۔ خود صالح تھے اور ہمیشہ صلاح پر ابھارتے تھے۔ خود مثبت اور تعمیری سوچ کے حامل تھے اور ہم لوگوں کو بھی اس کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔ □□□

☆ استاذ: جامعہ عارفیہ سیدراواں، کوشامی، آلہ آباد (یوپی)

عالم ربانی کے مقالات و مضامین: ایک تعارف

اس دنیا میں لوگ آتے رہتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ سیدنا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے جاری ہے اور قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ اب تک لاتعداد انسان دنیا میں آئے اور اپنی حیات مستعار کا محدود وقت گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔ مگر تاریخ اسلام کا نادر نمونہ بننے کی سعادت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ خوش بختی اور سعادت جن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے حساس اور دردمندوں ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی انہیں یاد رکھتے ہیں اور ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔ برصغیر کی تاریخ اسلام کے ایسے ہی نمائندہ اور عبقری شخصیات میں ایک اہم نام شہید راہ بغداد، مظہر علوم سیف اللہ المسول، نبیرہ تاج الخول، عالم ربانی حضرت علامہ شیخ اسحاق قادری ازہری محدث بدایونی بھی ہیں۔

چند سال کے مختصر عرصے میں وہ کر دکھایا جو دوسرے لوگ اپنی تمام عمر میں بھی نہیں کر پاتے ہیں۔ شیخ صاحب کی زندگی ہمہ جہت تھی۔ شیخ صاحب کی زندگی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، آپ وسیع المطالعہ عالم دین، ماہر مدرس، عربی و فارسی اور اردو کے صاحب طرز ادیب، قادر الکلام شاعر، تصوف و سلوک اور روحانیت و معرفت سے سرشار، بیدار مغز، باشعور صوفی غرض یہ کہ ہر حیثیت سے آپ جامع کمالات اور عبقری شخصیت تھے۔ خداوند قدوس نے شیخ صاحب کو تصنیف و تالیف، تحقیق و تخریج، تسہیل و تذہیب، تجلیہ و تزیین جدید کا زبردست شعور بخشا تھا۔ آپ نے اپنے پیچھے قلمی خدمات کا ایک ذخیرہ چھوڑا ہے۔ آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف ایک درجن سے زائد ہیں اور مدرسہ قادریہ کے اکابر علماء کی سو سے زائد کتب جدید تقاضوں کے مطابق آپ منظر عام پر لائے۔ سر دست ہمارا موضوع آپ کی قلمی خدمات کا وہ حصہ ہے جو مقالات کی شکل میں ہے۔

شیخ صاحب کے قلمی سفر کے دو دور ہیں۔ دور اول از ابتدا اور مصر جانے سے پہلے ستمبر ۱۹۹۹ء تک ہے۔ دور دوم مصر جانے کے بعد دسمبر ۲۰۱۳ء تک ہے۔ جنوری و فروری ۲۰۱۴ء میں حدیث افتراق امت پر ایک ہم عصر فاضل سے علمی گفتگو کرنے کے لیے ایک خط لکھا تھا باقی وقت کیرالہ، کرناٹک اور ممبئی، پمپھونڈ شریف کے علمی سیمینار اور گھریلو پروگرام وغیرہ میں گزارا۔ اس کے علاوہ شب و روز کتب اسلاف کی تحقیق و تخریج وغیرہ محبوب مشغلہ تھا اس میں لگے رہے۔ سیف الجبار پر کام مکمل ہو چکا تھا۔ سفر بغداد سے واپسی پر سیف الجبار پر تاریخ و ہابیت سے متعلق تین موصفات پر مشتمل مقدمہ لکھنا تھا۔ اس کے علاوہ راقم سطور کی مرتب کردہ کتاب ”تذکرہ مشائخ قادریہ مجددیہ شریفیہ“ پر بھی تصوف کے حوالے سے طویل مقدمہ لکھنے کا ارادہ تھا۔ دور اول کے مقالات سے صرف نظر کرتے ہوئے فی الحال دور ثانی کے مقالات کا تعارف ہدیہ قارئین ہے۔ شیخ صاحب نے زیادہ تر مقالات اپنے دوست مولانا خوشتر نورانی چیف ایڈیٹر ماہ نامہ جام نور دہلی کی فرمائش پر جام نور کے لیے لکھے۔ چند مقالے ایسے ہیں جو کسی دوسرے رسالے کے لیے لکھے۔ چھپیں مقالات کا مجموعہ بنام تحقیق و تفہیم کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ باقی مقالات کی تعداد تیس ہے۔ کل مقالات ہمارے دسترس اور تحقیق کے مطابق ۵۶ ہیں جن کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ کیا عالم عرب کے دینی جامعات میں صرف عربی زبان پر ہی زور دیا جاتا ہے؟ ۲۹۔ ابوریحان البیرونی ۳۔ علامہ سید محمد علوی مکی مالکی: حیات و خدمات ۴۔ الحاد سے ایمان تک ۵۔ مجاہد آزادی مولانا عبد الماجد بدایونی: حیات و خدمات ۶۔ احادیث قدسیہ: ایک تحقیقی جائزہ ۷۔ نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی آخری آیت ۸۔ خدا کی طرف واپسی ۹۔ عصر حاضر میں مطالعہ سیرت کی معنویت، اہمیت اور جہت

۱۰۔ تحفظ توحید کے نام پر کتب اسلاف میں تحریف ۱۱۔ مطبع اہل سنت و جماعت بریلی تاریخی پس منظر اور اشاعتی خدمات ۱۲۔ کشف الظنون عن اسامی الکتاب و الفنون ۱۳۔ عربی محاورات کا تقابلی جائزہ ۱۴۔ ہم نامی کا مطالعہ ۱۵۔ تشہد کے سلسلے میں ایک مقالے کا تحقیقی جائزہ ۱۶۔ کیا رسول ﷺ امت کے احوال سے باخبر ہیں ۱۷۔ ہجرک بالآثار کے خلاف ایک روایت کا علمی جائزہ ۱۸۔ متن حدیث کی بازیافت ۱۹۔ حدیث عمادہ پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۲۰۔ فقہ حنفی اور عمل بالحدیث ۲۱۔ ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام ۲۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ اور فقہ حنفی ۲۳۔ علامہ یوسف القرضاوی اور جماعت سلفیہ ۲۴۔ رفیع یدین کے مسئلہ پر ایک دلچسپ مباحثہ ۲۵۔ کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ ۲۶۔ شیخ بہاء الدین عطار اور رسالہ شطاریہ ۲۷۔ خانوادہ برکاتیہ اور فیضانِ چشت ۲۸۔ دعوت و تبلیغ کے لئے خانقاہی نظام کتنا موثر ہے؟ ۲۹۔ آج اہل خانقاہ کی نئی نسل تعلیم سے دور کیوں ہے؟ ۳۰۔ جماعت اہل سنت کا حقیقی تعارف کیا ہے؟ ۳۱۔ دینی کام کا معنی اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ ۳۲۔ لبیک اللہم لبیک ۳۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا تسامح ۳۴۔ دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے ۳۵۔ کچھ لمحے امیر دعوت اسلامی کے ساتھ ۳۶۔ شمس مارہرہ اور رسالہ آداب السالکین ۳۷۔ تقریروں میں موضوع روایات: ایک لمحہ فکریہ ۳۸۔ فضل حق، فضل رسول اور آزرہ ۳۹۔ ہم نے دیکھا پاکستان ۴۰۔ مولانا عبدالحق خیر آبادی اور ان کے تلامذہ کے علمی معرکے ۴۱۔ خانوادہ خیر آبادی کی اہل علم خواتین ۴۲۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں بعض بے بنیاد روایتیں ۴۳۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں بعض روایات کا تحقیقی جائزہ ۴۴۔ علامہ فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسماعیل دہلوی ۴۵۔ عربی محاورات و تعبیرات ایک جائزہ ۴۶۔ سند اکملین مولانا حیدر علی فیض آبادی ۴۷۔ فرزدق حبیبی کا قصیدہ سمیہ ایک تحقیقی مطالعہ ۴۸۔ خانوادہ قادریہ ہدایوں اور خانوادہ علمیہ: تعلقات و روابط ۴۹۔ قصیدہ بانٹ سعاد: ایک مطالعہ ۵۰۔ مولانا عبدالحامد بدایونی اور تحریک تحفظ گنبد خضرا ۵۱۔ شمس مارہرہ اور سراج الہند ۵۲۔ شرح قصیدتان رائے گان: ایک تنقیدی مطالعہ ۵۳۔ ٹوکجا بہر قمار شہی روی ۵۴۔ شب جائے کہ من بودم ۵۵۔ حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں ۵۶۔ قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک

تنقیدی مطالعہ۔

حضرت علامہ ارشد القادری متوفی ۲۰۰۲ء کے وصال کے بعد ان کے علمی و فکری جانشین مولانا خوشتر نورانی نے جام نور کا احیا کیا اور تقریباً تین موصفات پر مشتمل رییس انکم نمبر شائع کیا۔ اس کے بعد ستمبر ۲۰۰۲ء سے ماہ نامہ جام نور تو اتر کے ساتھ مذہبی صحافت کی خدمت کر رہا ہے۔

(۱) کیا عالم عرب کے دینی جامعات میں صرف عربی زبان پر ہی زور دیا جاتا ہے؟

میری تحقیق کے مطابق ممتاز محقق و ناقد، عالم ربانی حضرت علامہ شیخ اسحاق قادری نے پہلی بار بزم جام نور میں باضابطہ ستمبر ۲۰۰۳ء میں شرکت کی۔ اس سے قبل منظومات کے کالم میں حاضری درج کر رہے تھے۔ اس مقالے کا خلاصہ یہ ہے کہ جامعہ ازہر شریف مصر کے نصاب تعلیم اور نظام درس و تدریس اور ہندوستانی نظام و نصاب تعلیم میں کیا بنیادی فرق ہے۔ جامعہ ازہر کے کلیہ اصول الدین کا تعارف مع شعبہ جات پیش کیا ہے اور چند مثالیں بھی دی ہیں۔ اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو محدود ذہن و فکر کا حامل نہ ہو۔ ہندوستانی اور مصری تعلیم کا خلاصہ حفظ و تکرار یہ ہے کہ ہندوستانی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ لکیر کے فقیر بن جاتے ہیں۔ برخلاف ازہر شریف کے وہاں کی تعلیم سے جدید تحقیق کا مزاج پیدا ہوتا ہے اور نئے جہان آشکار ہوتے ہیں۔

(۲) ابوریحان البیرونی:

یہ مضمون شخصیات اسلام کے کالم میں جون ۲۰۰۴ء میں جام نور میں شائع ہوا جس میں البیرونی کے حالات زندگی، علوم و فنون اور رسالت تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ اس مقالے کی تیاری میں دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مقدمہ تحقیق مالہند اور الوانی بالوفیات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ تاریخی اور تحقیقی مزاج رکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے البیرونی کے تفصیلی حالات جاننے کے لیے دس کتابوں کے نام بھی دیے ہیں۔

(۳) حضرت علامہ سید محمد علوی مکی مالکی: حیات و خدمات

یہ مضمون جام نور جنوری ۲۰۰۵ء میں شخصیات اسلام کے کالم میں شائع ہوا۔ عالمی شہرت یافتہ عالم دین، ممتاز صوفی، درجنوں کتابوں کے مصنف حضرت علوی صاحب کی حیات و خدمات اور ہمہ جہت شخصیت

پر خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ مضمون درحقیقت جدہ سعودی عرب کے ایک اخبار کے مضمون کا اردو ترجمہ ہے۔

(۴) الحاد سے ایمان تک:

یہ مضمون دو سطحوں میں فروری، مارچ ۲۰۰۵ء میں جام نور میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک امریکی نو مسلم ڈاکٹر جفرے لینگ کا الحاد سے ایمان یعنی عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کی داستان ہے۔ یہ عربی سے اردو ترجمہ ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات سے ظاہر ہے کہ اس کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے مفید ہے۔ مثلاً زمانہ الحاد میں ذہنی اور قلبی کیفیت، بخدا و مومن کی کیفیات میں فرق وغیرہ۔

(۵) مجاہد آزادی مولانا محمد امجد عثمانی بدایونی: حیات و خدمات:

جام نور اکتوبر ۲۰۰۸ء میں شخصیات اسلام کے کالم میں شیخ صاحب نے اپنے عثمانی خاندان کے ایک فرزند کی مجاہدانہ کارناموں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس موضوع پر شیخ صاحب کی مرتب کردہ کتاب ”تذکرہ ماجد“ بھی ہے۔ تفصیلی حالات کے لیے اس کا مطالعہ کریں، جو تاج الفحول اکیڈمی بدایوں کے زیر اہتمام ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔

(۶) احادیث قدسیہ: ایک مختصر جائزہ:

یہ تحقیقی مقالہ نومبر ۲۰۰۸ء میں پس منظر کے کالم میں بارہ صفحات پر مشتمل شائع ہوا جس میں حدیث قدسی کا معنی اور تعریف قرآن کریم اور احادیث قدسیہ میں فرق، حدیث قدسی کے اقسام، احادیث قدسیہ کی تعداد، حدیث قدسیہ کے موضوعات، عظمت و تقدیس الہی، اعمال کا ثواب، نیکیوں کی جزا اور احادیث قدسیہ پر بعض اہم کتابیں۔ ان تمام موضوعات پر تفصیلی اور تحقیقی گفتگو کی ہے۔

اس موضوع پر آپ کی ایک مستقل کتاب احادیث قدسیہ بھی موجود ہے۔ یہ چھ مضامین وہ ہیں جو تحقیق و تفہیم میں شامل نہیں ہیں۔ شیخ صاحب کے چھبیس مقالات کا مجموعہ تحقیق و تفہیم ہے۔

(۷) نزول کے احبار سے قرآن کریم کی آخری آیت:

شیخ صاحب نے اس میں علوم القرآن والمحدث کی چھبیس کتابوں کے حوالے سے نہایت تحقیقی اور علمی گفتگو کی ہے۔ اس بحث سے کیا فائدہ ہے اس کے ثبوت میں عبدالعظیم زرقانی کی کتب مناب العرفان کے حوالے سے تین فوائد نقل کیے ہیں۔ محدثین و مفسرین کے آٹھ اقوال

ہیں کہ کون سی سورت یا آیت آخری ہے۔ ساری روایتیں اور سب کے دلائل نقل کیے ہیں۔ پھر اس میں متضاد روایتوں میں تطبیق پیدا کی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں ”اس سلسلے میں گہرے مطالعے کے بعد ہم بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۸۱ و اتقوا ابو مائتہ جمعوں فیہ الی اللہ مطلقہ قرآن کی آخری آیت ہے اس آیت کو باعتبار نزول آخری آیت ماننے پر تین اسباب ترجیح بھی ذکر کئے ہیں جو مقالہ نگار کی وسعت علمی پر دال ہے۔“

(۸) خدا کی طرف داعی:

یہ مقالہ شیخ صاحب نے ”نیواج ویزن“ کے لیے لکھا ہے۔ اس میں شیخ صاحب نے انسانیت کی فلاح و بہبود اور ابدی کامیابی کی طرف توجہ دلائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ آج کا ترقی یافتہ انسان اسی وقت عزت و اقتدار حاصل کر سکتا ہے جب اس کا رشتہ اس کے معبود سے مضبوط تر ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ لکھتے ہیں:

”عصر حاضر میں انسان کی سب سے بڑی پرابلم اس کی اپنی فطرت سے جنگ ہے۔ یہ اسی جنگ کا نتیجہ ہے کہ مادی طور پر تاریخ انسانی کا سب سے ترقی یافتہ اور طاقتور انسان بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہے۔“

پھر انسان کو چین و سکون کیسے حاصل ہوگا آپ رقم طراز ہیں:

”مادیت پر مبنی الحادی نظریات کی شکست ہو چکی ہے اور آج کا انسان ایک بار پھر اپنے انہیں فطری تقاضوں کا سرا تلاش کر رہا ہے اور ریتیزی کے ساتھ واپس خالق حقیقی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اگر دنیا کا کوئی انسان اسلام قبول کر رہا ہے تو یہ دخول نہیں ہے بلکہ رجوع ہے۔ یہ ہے خدا کی طرف واپسی۔“

(۹) عصر حاضر میں مطالعہ سیرت کی ضرورت، اہمیت اور محبت:

تحقیق و تفہیم میں اس امر کی صراحت نہیں ہے کہ یہ مضمون جام نور یا کسی اور رسالے میں کب شائع ہوا۔ اس مضمون میں اس امر کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ سیرت رسول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام کی حیات کو تاریخی تسلسل اور جغرافیائی پس منظر میں سمجھ لیا جائے۔ آپ کی ولادت کب ہوئی، کس طرح پرورش ہوئی، پہلی وحی کب نازل ہوئی، ہجرت کا واقعہ کیا ہے، غزوات کو بحیثیت واقعات پڑھ لیا جائے اور

چند معجزات رٹ لیے جائیں۔ شیخ صاحب رقم طراز ہیں:

”بلکہ سیرت کے معنی و مفہوم کی حدیں اس سے بہت آگے ہیں۔ سیرت قرآنی تعلیمات کی عملی تصویر کا نام ہے۔ اسلامی عقائد، اسلامی اعمال، اسلامی اخلاق، فرد کا نظام حیات، معاشرہ کے مسائل، بین الاقوامی تعلقات و روابط، امن کے تقاضے، جنگی قانون اور اس کے علاوہ انسانیت کی ضروریات کے تمام مسائل اور ان کا حل سیرت رسول ﷺ میں موجود ہے۔ سیرت طیبہ کو اسی وسیع مفہوم میں اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔“

سیرت رسول ﷺ کے مثبت پہلو پر عصر حاضر کے مطابق تفصیلی گفتگو کی ہے۔ قوم مسلم کو ان بعض حرکات کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے جو سیرت رسول ﷺ کے متعلق نہیں ہے اور لوگ اس فعل کو سیرت کا جز سمجھتے ہیں۔ اس مضمون کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ سیرت رسول ﷺ کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے اور ان آشنا قلوب و اذہان کو سیرت کی نئی دنیا کی سیر کرائی جائے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسانیت ہر طرح کی کامیابی اور رہنمائی کا قیام سیرت رسول ﷺ میں مضمر ہے۔

(۱۰) تحفظ توحید کے نام پر کتب اسلاف میں تحریف:

یہ مضمون جام نور دسمبر ۲۰۰۷ء اور جنوری ۲۰۰۸ء میں دو سطحوں میں شائع ہوا۔ شیخ صاحب نے مقالے کے شروع میں لکھا ہے کہ لیبیا کے ایک جلیل القدر عالم اور عظیم شیخ طریقت حضرت سید یوسف عبداللہ البجور الحسینی نے از ہر شریف کے طلبہ کو دوران درس اس طرف توجہ دلائی اس تفصیلی گفتگو کے بعد شیخ صاحب نے کتب اسلاف میں تحریف، تلفیق اور تلخیص کے پانچ مقاصد ذکر کیے ہیں۔ کتب اسلاف میں تحریف کرنا یہ دہائیہ غیر مقلدین کا محبوب مشغلہ ہے جو وہ عبادت سمجھ کر کر رہے ہیں۔ اس

مقالے میں صرف سات کتابوں کی مثالوں پر اکتفا کیا ہے۔ اور ان میں جو تحریفات کی گئی ہیں ان کو مع حوالہ دلیل مفصل بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”امام الہند، حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے عظیم الشان خالوادے کے علما کی تصنیفات میں جو تحریف، الحاق اور حذف و اضافات کیے گئے ہیں وہ ایسا وسیع موضوع ہے جو مستقل ایک مقالے کا متقاضی ہے۔“

شاہ صاحب کی کتاب تمہیدات میں جو تحریف کی گئی ہے تقریباً

نصف درجن سے زائد مثالیں تحریف کی پیش کی ہیں۔ اس مقالے کی تیاری میں اکیس مراجع و مصادر کا انتخاب کیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شیخ صاحب کا تحقیقی اور علمی معیار کتابت بلند ہے۔ اس مقالے کا اختتام اس پیرا گراف پر ہے:

”یہ صرف چند سرسری اشارے ہیں ورنہ کتب اسلاف میں لفظی اور معنوی تحریف کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں یہ کم مایہ راقم سطور (اسید الحق) کا اس موضوع پر اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ایک مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔ کافی مواد جمع ہو چکا ہے اور ہنوز تلاش و تحقیق جاری ہے۔“

وائے حسرت! شیخ محترم کا یہ ارادہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا اور بغداد معلیٰ میں علم و فضل کا آفتاب غروب ہو گیا۔

(۱۱) مطبوعہ متعدد معاصرت بریلی: تاریخ میں حضرت امجد عثمانی خدمات:

شیخ صاحب کی وسعت فکر اور وسیع القلمی اور تحقیقی مطالعے پر بار بار داد دینے کو دل کرتا ہے۔ مقالہ نگار حضرات عام طور پر ایسے موضوع پر مضمون نہیں لکھتے ہیں شیخ صاحب نے ایک سنی پریس کی تاریخ اور اشاعتی خدمات پر جو تحقیقی مقالہ لکھا ہے وہ نہایت قابل غور ہے اور اس سے جماعت اہل سنت کے لئے بے شمار فوائد اور ہدایات منظر عام پر آرہی ہیں۔ اس مقالے کی ذیلی سرخیوں میں یہ ہیں مطبوعہ کے قیام کا تاریخی پس منظر، مجلس علمائے اہل سنت کا قیام، ارکان مجلس علمائے اہل سنت، مطبوعہ اہل سنت کا قیام، مطبوعہ اہل سنت کا دستور العمل، مطبوعہ اہل سنت کی خدمات کے چاروں، خلاصہ بحث، آخری بات۔

یہ مقالہ سولہ صفحات پر مشتمل ہے جو جام نور مئی ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ اس مقالے سے بڑی بڑی جو چند مفید باتیں سامنے آئیں وہ یہ ہیں کہ علمائے اہل سنت نے کتنا پس لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی اشاعت پر بھرپور توجہ دی۔ پچیس علمائے اہل سنت نے مل جل کر یہ مطبوعہ قائم کیا اور رقم پوری نہ ہو سکی تو مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی نے خطیر رقم چندے میں دی۔ اس کے علاوہ سالانہ چندہ متعین کیا اور اپنے وابستگان سے بھی تعاون کرایا، جس سے یہ مطبوعہ وجود میں آیا۔ اتنا بڑا کام ۱۳۱۳ھ میں علمائے بدایوں اور بریلی دونوں کے باہمی تعاون سے وجود میں آیا۔ اس زمانے میں بھی بریلی میں اذان ثانی باہر ہوتی تھی اور بدایوں میں اندر

ہوتی تھی۔ آخری بات کے عنوان سے مزید تحقیقی کام کرنے والوں کو ابھارنے کے لیے شیخ صاحب لکھتے ہیں:

”مطبع اہل سنت و جماعت کی ذریں خدمات کا سرسری جائزہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اس مطبع کی خدمات اس قابل ہیں کہ اس پر باقاعدہ تحقیق کا کام ہو اور اس کی ایک مفصل تاریخ مرتب ہو کر منظر عام پر آئے۔ سچے سچے مردانِ غیب بروں آید و کارے بکند یہ مقالہ ۱۲ کتابوں کے مطالعے کے بعد معرض وجود میں آیا ہے۔

(۱۲) کشف الظنون من اسامی الکتاب والفنون ایک تحقیقی مطالعہ:

یہ علامہ مصطفیٰ بن عبد اللہ المعروف حاجی خلیفہ یا کاتب جلی کی کتاب ہے۔ حاجی خلیفہ کی یہ کتاب علمی حلقوں میں اجنبی یا محتاج تعارف نہیں ہے۔ یہ کتاب مختلف علوم و فنون کی تعریف اور ان پر لکھی جانے والی مختلف کتابوں کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے تعارف میں شیخ صاحب نے لکھا ہے:

”یہ کتاب گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں تالیف کی گئی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی تالیف کے فوراً بعد سے ہی اس پر تحقیقی کام کا آغاز ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں عالمی زبانوں میں اس کے ترجمے، ذیول، شروحات اور مختصرات منظر عام پر آئے۔ کشف الظنون طبع چہارم کے ناشرین کے اعداد و شمار پر اعتماد کیا جائے تو یہ کتاب تین سو علموں کی تعریف، پندرہ ہزار کتب کے تعارف اور نو ہزار پانچ سو مصنفین کے تذکرے پر مشتمل ہے۔“

زیر نظر مقالے میں شیخ صاحب نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات، اس کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں، اس کے ترجمے اور مختصرات سمیت مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد ان تمام امور پر مقالے میں سیر حاصل بحث کی ہے جس سے کشف الظنون کی فنی، علمی اور تحقیقی حیثیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس مقالے میں حاجی خلیفہ کی سوانح حیات، تعلیم، درس و تدریس، مطالعہ اور تصنیف و تالیف پر تحقیقی گفتگو کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے نہایت دقیق فکر و نظر سے اس کتاب کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا۔ یہ مقالہ سترہ حوالوں سے مزین ہے جو جام نور جون ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔

(۱۳) عربی اور اردو محاورات کا قلمی جائزہ:

یہ مضمون جام نور جولائی ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون در حقیقت شیخ صاحب کی ایک مستقل کتاب عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات کا ایک حصہ ہے۔ یہ ایک نہایت علمی اور فنی موضوع ہے جو مقالہ نگار کے لئے یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ عربی زبان و ادب، صرف و نحو اور عربی و اردو محاورات پر اچھی دسترس رکھتا ہے۔ اس کا تفصیلی تعارف شیخ صاحب کی تصنیفات کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۴) ہم نامی کا مطالعہ:

یہ مضمون جام نور اگست ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اس امر پر شاہد عدل ہے کہ حضرت شیخ علوم الحدیث کی ایک شاخ فنِ اسماء الرجال سے خاصہ شغف رکھتے ہیں اور انہیں اس پر اچھی مہارت حاصل ہے۔ ہمہ دشوائیے وادی پر خاریں قدم نہیں رکھتے۔ اس مقالے میں دس مثالوں سے بیس علماء کے نام پیش کیے ہیں کہ یہ ہم نام ہیں۔ ان میں کس طرح فرق کیا جائے گا، اس کا کیا قاعدہ اور اصول ہے، ضمنی طور پر اور چند مثالوں پر گفتگو کی ہے۔

(۱۵) تشہد کے سلسلے میں ایک مطالعہ کا تحقیقی جائزہ:

یہ مضمون جام نور مارچ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ کتب احادیث میں محدثین نے تین طرح تشہد کی تخریج کی ہے۔ تشہد ابن مسعود پر مذہب احناف اور مذہب حنبلی میں عمل ہے۔ تشہد ابن عباس کو اکثر شوافع اور امام لیث بن سعد نے اختیار کیا ہے۔ امام مالک کے مذہب میں تشہد ابن عمر پر عمل ہے۔ تینوں تشہد کا مفہوم اور ترتیب ایک ہی ہے۔ تمام روایتوں میں نبی کریم ﷺ کو سلام کے لئے دعا اور خطاب کا صیغہ السلام علیک یا ایہا النبی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بعض حضرات کی تشویش کا باعث ہے۔

وہابیہ غیر مقلدین اس سلسلے میں دو طرح کے مطالعے دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ عہد رسالت میں بصیغہ خطاب نبی پر سلام اس لیے کہتے تھے کہ حضور ﷺ سامنے ہوتے تھے۔ دوسرا مطالعہ یہ دیتے ہیں کہ اس سے سلام علی النبی مقصود نہیں ہے بلکہ واقعہ معراج میں اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے درمیان ہونے والی گفتگو کی حکایت مراد ہے۔ کتب حدیث اور شروحات حدیث کی انیس کتابوں سے دونوں مطالعوں کا جواب دیا

ہے کہ دونوں مطالعے مثل تاریکوت ہوا ہیں اور احادیث کی روشنی میں بالکل غلط ہیں۔ انداز جواب نہایت سلیس، شگفتہ اور سنجیدہ ہے۔ علم حدیث اور مختلف روایتوں میں تطبیق کا اندازہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کی نظر علوم الحدیث میں بہت گہری ہے۔

(۱۶) ”کیا رسول اللہ ﷺ امت کے اعمال سے باخبر ہیں؟“

یہ مضمون جام نور اگست ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون حضرت علامہ ڈاکٹر سید محمود السید صبیح مصر کے بلند پایہ عالم اور وسیع النظر محدث کی کتاب اخطاء ابن تیمیہ فی حق رسول اللہ و اہل بیتہ کی ایک فصل کا ترجمہ ہے۔ دور حاضر کی ایک نئی پیداوار کہ حضور ﷺ کو قبر انور میں امت کے اعمال و احوال کی خبر نہیں ہے کا علمی ردِ مبلغ ہے۔ مخالفت نے ایک حدیث مشکل کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ یہ روایت ایسی دلیلوں اور احادیث کے معارض ہے کہ جو اس روایت سے زیادہ قوی بھی ہیں اور کثیر بھی ہیں، جن میں سے چھ روایات مع سند، جرح و تعدیل اور تخریج کے ساتھ نقل کی ہیں۔ ڈاکٹر محمود صبیح لکھتے ہیں:

”آخر میں ہم عرض کریں گے کہ مبتدعین کا یہ گروہ جان بوجھ کر بالاشعوری طور پر ایسی چیزوں اور دلیلوں کی تلاش میں رہتا ہے جس سے نبی مکرم کے مقام و مرتبہ میں کمی ثابت کی جاسکے اور آپ کو ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش کیا جاسکے جو وفات کے بعد اپنے لیے دوسروں کی وحائے مغفرت کا محتاج ہو اور جو اس کی زیارت کرے تو اس کی زیارت سے زائر کو فائدہ نہ ہو بلکہ زائر کی دعا سے صاحب قبر کو فائدہ ہو۔ معاذ اللہ!“

شیخ صاحب نے اتنی خوش اسلوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ اگر وہ شروع میں اس کی وضاحت نہ کرتے تو ترجمہ ہونے کا گمان ہی نہیں ہوتا بلکہ مستقل اردو زبان کا مضمون معلوم ہوتا۔ ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے دونوں زبان کے اسرار و رموز سے واقف ہونا چاہیے اور ترجمہ ایسا ہو کہ اس کے تمام شرائط مکمل ہوں۔ یہ تمام خوبیاں اس ترجمے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

(۱۷) حرمک بالآثار کے خلاف ایک روایت کا قلمی جائزہ:

یہ مضمون جام نور دسمبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا اس کا عنوان انبیاء و صالحین کے آثار و تبرکات سے برکت حاصل کرنے کے سلسلے میں

ہے۔ مقام حدیبیہ پر سرور کائنات محمد ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایک درخت کے نیچے بیعت لی تھی۔ اس لیے اس درخت کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ قرآن کریم میں اس درخت کا تذکرہ کر کے اس کے ذکر کو زندہ جاوید کر دیا۔ اس درخت کے سلسلے میں ایک روایت یہ مشہور ہے کہ بعض لوگ اس سے برکت حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس نماز پڑھنے لگے تو امیر المومنین حضرت عمرؓ نے لوگوں کو سرزنش کی اور اس درخت کو کٹوا دیا۔ ایک مخصوص طبقہ انبیاء و صالحین کے تبرکات و آثار سے برکت نہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اس روایت کو نہایت شد و بد کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ کام سب سے پہلے حافظ ابن تیمیہ نے کیا۔ شیخ صاحب نے اس کے جواب میں لکھا ہے ابن تیمیہ کی دلیل والی حدیث صحاح ستہ سمیت حدیث کی اکثر مشہور و معتبر کتب میں اس روایت کا کہیں نام و نشان نہیں ہے، بلکہ یہ روایت صحیحین کی روایت کے معارض بھی ہے۔ یہ روایت صرف طبقات ابن سعد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے جو سند کے اعتبار سے حدیث منقطع ہے۔ اس کے برخلاف شیخین نے متعدد طرق سے جو روایت حدیث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس سال اس درخت کے نیچے بیعت لی گئی اس کے اگلے سال صحابہ کرام نے اس کو تلاش کیا مگر نہ پایا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ درخت اللہ کی طرف سے رحمت تھا جو نظروں سے اوجھل کر دیا گیا۔ شیخ صاحب آخر میں لکھتے ہیں:

”ان نکات سے یقینی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب ایک سال بعد ہی اس درخت کا کل وقوع اختلاف رائے کا شکار ہو گیا اور مصلحت خداوندی کے مطابق نظروں سے اوجھل ہو گیا تو خلافت فاروقی میں اس کو کٹوانے والی بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔“

اس مقالے میں مراجع اور مصادر کی فہرست بارہ ہے۔

(۱۸) متن حدیث کی بازیافت:

امام احمد رضا اکیڈمی بریلی شریف کے بانی و صدر مولانا محمد حنیف خاں رضوی بریلوی نے اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں قادری فاضل بریلوی کی تصنیفات سے چار ہزار پانچ سو احادیث و آثار، چھ سو مباحث تفسیر یہ اور گیارہ سو افادات رضویہ کی ترتیب، تخریج، ترجمہ اور

فہرست سازی کر کے دس جلدوں میں جامع الاحادیث علمائے ہند کی خدمت حدیث میں پیش کیا۔ جامع الاحادیث میں صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں مولانا محمد حنیف خاں کو اردو حدیث کا عربی متن دستیاب نہ ہو سکا۔ انہوں نے علمی امانت و دیانت کے پیش نظر اس امر کی صراحت بھی کر دی۔ حضرت مولانا شیخ اسد الحق از ہری علیہ الرحمہ کی نظر سے جب یہ عبارت گزری تو تھوڑی سی محنت کے بعد اس حدیث کا متن مل گیا اور جام نور ۲۰۰۵ء میں ”متن حدیث کی بازیافت“ کے نام سے شائع کیا۔ شیخ صاحب کی یہ تحریر مطالعہ کرنے کے بعد مولانا محمد حنیف خاں رضوی نے اپنی وسیع القسی کا ثبوت دیتے ہوئے اچھے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے۔ اسے جام نور دسمبر ۲۰۰۵ء صفحہ ۶۲-۶۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں پر اس تاثرات کا صرف ایک حیرانگراں ہدیہ قارئین ہے:

”متن حدیث کی بازیافت میں حوالوں کے لیے متعدد کتب احادیث کی نشان دہی بلاشبہ فاضل گرامی شیخ اسد الحق قادری کی تتبع و تلاش اور وسیع مطالعہ کی غماز ہے اور یہ سب کچھ ان کے دوسرے مضامین حدیث افتراق امت اور نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت وغیرہ سے بھی ظاہر ہے۔“

(۱۹) حدیث عمامہ پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

یہ مضمون جام نور دسمبر ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں ایک حدیث مرسل نقل کی ہے: ”اعتموا خالفوا علی الامم من قبلکم“ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ عمامے باندھو اور اچھی امتوں یعنی یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرو، وہ عمامہ نہیں باندھتے۔ فیاض بریلوی نے اس حدیث کو فضائل عمامہ کے باب میں ذکر کیا ہے۔ ایک معاصر فاضل و محقق نے اس ترجمہ کو ”حدیث کی غیر معتبر توجیہ“ قرار دیا ہے۔ غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ معترض کا علم صرف کمزور ہے اور وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اعتموا کا مصدر اور باب کیا ہے اعتمام ہے یا اعتمام؟ فاضل محترم اعتموا سمجھ بیٹھے اور ترجمہ یہ کر دیا کہ ”عشا کی نماز کو پہلی تہائی رات میں ادا کرو“، شیخ صاحب نے تخریج، علم، علم صرف، علم لغت اور شروحات حدیث کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ اعتموا، اعتمام سے مشتق ہے نہ کہ اعتمام سے۔ دلائل کی روشنی میں تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں: ”فتاویٰ رضویہ میں مذکور ترجمہ بالکل درست

ہے۔“ پندرہ مراجع و مصادر اس مقالے کی زینت ہیں۔

(۲۰) فضیلت اور عمل بالحدیث:

یہ مضمون جام نور اپریل ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ اس مقالے کا تعارف یہ ہے کہ جہاں امت مسلمہ کی اکثریت نے امام اعظم کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اور ان کے ذریعے تدوین کی گئی فقہ کو حرز جان بنا دیا وہیں بعض حضرات ان کے مخالف بھی ہو گئے۔ مقالہ نگار شیخ صاحب نے امام اعظم کے خالفین کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے بعد امام اعظم ابو حنیفہ پر ہمیشہ تعصب و عناد نے نکتے رہنے والے چار الزامات نقل کیے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ امام اعظم حدیث پر اپنے قیاس کو ترجیح دیتے تھے۔ علم حدیث سے نابلد تھے وغیرہ۔ اس کے جواب میں شیخ صاحب نے تین بنیادی مقدمے نقل کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کے رد و قبول، تصحیح و تضعیف وغیرہ کے اصول قواعد امام اعظم کے سو سال بعد ایجاد ہوئے۔ تانیب الخطیب کے حوالے سے آٹھ قواعد نقل کیے ہیں جن کی بنیاد پر امام اعظم ابو حنیفہ نے بہت سی اخبار آحاد پر عمل نہیں کیا۔ اسی طرح تہذیب و اتمام الزامات کا تحقیقی جواب دیا ہے۔ چودھویں صدی کے علوم الحدیث سے ناہم و غیر سنجیدہ اور قصد انکار کرنے والے علما نے یہ محض پردہ پیگنڈہ کر رکھا ہے کہ امام اعظم کا عمل حدیث پر نہیں ہے بلکہ اپنی ذاتی رائے پر ہے۔ بارہ کتابیں مراجع و مصادر کی حیثیت سے زینت مقدمہ ہیں۔

(۲۱) ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام:

یہ مضمون جام نور اپریل ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ عصر حاضر میں ایک مخصوص طبقہ جو عمل بالحدیث کا دعوے دار ہے باقی تمام مسلمانوں کو بالخصوص ائمہ مجتہدین کو ترک حدیث قرار دیتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کے ایک رسالہ ”رفع الملام عن الانمة الاعلام“ کے حوالے سے ان دس اسباب کو ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے ائمہ مجتہدین حدیث کو چھوڑتے ہیں۔ ترک حدیث کے یہ دس اسباب بیان کرنے کے بعد حافظ ابن تیمیہ نے حقیقت پسندانہ اور بصیرت افروز چند سطور لکھی ہیں جو ان لوگوں کو بغور پڑھنا چاہیے جو اٹھتے بیٹھتے اپنی نادانی، کم علمی اور تعصب و عناد کی بنیاد پر ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث اور مخالفت سنت کا الزام لگاتے ہیں۔ شیخ ابن تیمیہ کی وہ سطور یہ ہیں:

”دس اسباب تو بالکل ظاہر ہیں اور ممکن ہے کہ بہت سی احادیث کو ترک کرنے میں مجتہد کے پاس کوئی ایسی دلیل اور حجت ہو جس پر ہم مطلع نہ ہو سکے ہیں۔ اس لیے کہ علم کے مدارج بہت وسیع ہیں اور عوام کے باطن میں جو کچھ ہے ہم اس سب پر مطلع نہیں ہیں۔“

شیخ صاحب نے اس مقالے میں بھی حسب عادت وہی سنجیدہ اسلوب اختیار کیا ہے جو ان کے دیگر مقالات میں نظر آتا ہے۔ ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کے الزام کے جوابات حافظ ابن تیمیہ کے رسالے سے اس لیے دیے کہ الزام لگانے والے وہابیہ غیر مقلدین دم نہ مار سکیں۔ یہ مقالہ پندرہ حوالوں سے مزین ہے۔

(۲۲) مصنف ابن ابی شیبہ اور فقہ حنفی:

یہ مقالہ جام نور ستمبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس کا تعارف یہ ہے کہ مشہور محدث ابن تیمیہ نے امام ابن ابی شیبہ نے احادیث مبارکہ کا ایک عظیم مجموعہ مرتب کیا جو علمی حلقوں میں مصنف ابن ابی شیبہ کے نام سے مشہور ہے۔ علم حدیث کی اصطلاح میں مصنف ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث احکام جمع کیے جائیں۔ اس کتاب میں ۱۳۷۹۴۳ احادیث ہیں۔ یہ سات جلدوں میں ہے۔ ساتویں جلد میں اثنا لیس صفحات پر مشتمل ایک مستقل باب امام اعظم ابو حنیفہ کے رد میں مخصوص کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ امام اعظم نے ایک سو پچیس مسائل فقہیہ میں حدیث کی مخالفت کی ہے۔ امام ابن ابی شیبہ کا یہ انصاف نہیں بلکہ ظلم ہے۔ شیخ صاحب کا اشہب قلم الدر المنیفة فی الرد علی ابن ابی شیبہ عن ابنی حنیفہ، عقود الجمان فی مناقب ابنی حنیفہ العمان اور امام کوثری کی النکت الطریفہ کے حوالے سے امام اعظم کے دفاع میں خوب چلا ہے۔ امام ابن ابی شیبہ کا جواب دس وجوہات سے دیا ہے اور پھر ان الفاظ میں اپنا عندیہ رقم کیا ہے:

”ایک سو پچیس مسائل میں امام اعظم سے سب نہیں ہوا ہے نہ انہوں نے حدیث کو ترک کیا ہے بلکہ امام ابن ابی شیبہ امام اعظم کی دلیل اور جہاد تک نہ پہنچ سکے اور امام اعظم پر ترک حدیث اور مخالفت سنت کا الزام لگایا۔“

آخر میں شیخ صاحب نے لکھا ہے:

”اس سے پہلے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کے اس باب کا کوئی

متعصب اردو میں ترجمہ کرے اس سے پہلے احناف کو چاہیے کہ امام زاہد الکوثری کی کتاب النکت الطریفہ کا اردو میں ترجمہ ہو جانا چاہیے۔“

(۲۳) علامہ یوسف القرضاوی اور جماعت سلفیہ:

اس مضمون کے تعارف میں شیخ صاحب نے پیش گفتار میں لکھا ہے: علامہ یوسف القرضاوی اور جماعت سلفیہ ”مطبوعہ جام نور فروری ۲۰۰۶ء اور ”جماعت سلفیہ کے لیے لکھ کر یہ“ ”مطبوعہ جون ۲۰۰۶ء یہ دو الگ الگ مضمون تھے۔ تحقیق و تنقیح میں دونوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قرضاوی مصری ثم نظری کا نام عالم اسلام میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ پچاس سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے معتقدین و محبین عرب، افریقہ، امریکہ، انڈونیشیا، ملیشیا غرض یہ کہ پوری دنیا میں انہیں مجدد، مجتہد، مفکر، شیخ الاسلام اور امام جیسے بھاری بھر کم القابات و خطابات سے یاد کرتے ہیں۔ مسلسل اعتبار سے ٹھیک اسی فکر و عقیدہ کے حامل ہیں جس کو برصغیر میں وہابیت اور غیر مقلدیت کہتے ہیں۔ شیخ صاحب نے قرضاوی صاحب کی سات کتابوں سے موجودہ سلفیوں اور وہابیوں کے بارے میں آرا کا ذکر کیا ہے جو احناف اور غیر مقلدین دونوں کو غیر جانب داری سے مطاع کرنا چاہیے اور سلفیوں کو اپنا عقیدہ و ایمان ٹھیک کرنا چاہیے۔ وہ تمام محبوب و نفاس اور خرابیاں جو برصغیر کے سلفی حنفیوں کے متعلق ذکر کرتے ہیں وہ سب قرضاوی صاحب نے لکھ کر دہائیوں کو دعوت انصاف دی ہے کہ خود تمہارا دامن اسی طرح کی خرابیوں سے داغدار ہے۔“

(۲۴) رفع یدین کے مسئلے پر ایک دلچسپ مباحثہ:

جام نور جنوری ۲۰۰۶ء میں یہ دلچسپ مقالہ اشاعت پذیر ہوا۔ موضوع مقالہ یہ ہے کہ نماز میں کتنی بار رفع یدین ہے۔ متعدد روایات کو یکجا کرنے کے بعد کل سات صورتیں بنتی ہیں۔ امام اعظم اور امام مالک کے مذہب میں صرف یکم تحریر کے وقت رفع یدین ہے۔ شافعی اور حنبلی مذہب میں تین مرتبہ رفع یدین ہے۔ ان ائمہ میں سے کسی پر ترک حدیث اور مخالفت سنت کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ مضمون اسی موضوع پر امام زاہد الکوثری اور ایک شدت پسند سلفی عالم سے دلچسپ مباحثے کا خلاصہ ہے جس میں امام کوثری نے اس کو خاموش کر دیا اور ثابت کر دیا

کہ صحیح معنی میں ہم مقلدین عامل بالحدیث ہیں اور سلفی مخالف حدیث ہیں۔ اس عربی کے دلچسپ مباحثہ کو شیخ صاحب نے تمام نزاکتوں اور خوبیوں کے ساتھ اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

(۲۵) کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے:

ذیلی سرخی یہ ہے "صاحب نظر کی تحقیق پر صاحب دل کی تنقید" مقالے کے شروع میں شیخ صاحب نے تصوف پر بطور تمہید خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ حضرت شیخ صاحب کا کوئی ذاتی مضمون نہیں ہے بلکہ دبستان بدایوں کے ایک علمی فرزند پروفیسر ضیاء احمد صدیقی بدایونی نے لگ بھگ ۶۵ سال قبل تصوف کے موضوع پر ۲۲ صفحات پر مشتمل ایک علمی تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس میں کچھ مسائل تصوف محل نظر اور قابل توجہ تھے۔ شیخ صاحب کے دادا مفتی عبدالقدیر بدایونی نے تصوف و صوفیہ کا دفاع کرتے ہوئے ایک علمی اور سنجیدہ تحریر سیر قلم کی تھی جو کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ حضرت شیخ صاحب نے مشکل مقامات کے ساتھ مفتی عبدالقدیر بدایونی کی تحریر کو لائحہ عمل کے مضمون کی شکل دے کر پانچ نومبر ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگنا کوئی دشوار نہیں کہ شیخ صاحب ایک عظیم محدث اور بلند پایہ مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے جد امجد کی طرح صاحب دل، صوفی عالم دین بھی تھے۔

(۲۶) شیخ بہاء الدین شطاری اور رسالہ شطاریہ:

شیخ صاحب نے یہ مضمون جام نور دہلی کے لیے نہیں بلکہ ماہ نامہ تصوف ملی کلکتہ نومبر ۲۰۰۵ء کے لئے لکھا ہے۔ شیخ صاحب کا یہ مقالہ آپ کے صوفی ہونے کا ثبوت ہے۔ اس مقالے کی تمہید میں شیخ شطاری کا تعارف لکھا ہے اور آپ کی ایک تصنیف رسالہ شطاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج تک اس رسالہ کی زیارت نہ ہو سکی اور نہ کہیں موجود ہونے کا علم ہوا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں رسالہ شطاریہ کے چند مفید اقتباسات لکھے ہیں۔ انہی کی تلخیص اور ترجمہ حضرت شیخ صاحب نے سپرد قلم کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تک رسائی کے تین طریقے ہیں طریقہ شطاریہ کے دس اصول ہیں۔ اسے ذکر کی تین قسمیں ہیں سلسلہ شطاریہ میں کشف ارواح کے دو طریقے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی تصوف و سلوک کے دیگر اصول و قواعد

پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کا آخری حصہ یہ ہے:

"بعض لوگوں نے کہا ہے کہ فکر ذکر سے افضل ہے اس لیے کہ فکر شغل باطن ہے، ذکر شغل ظاہری ہے، فکر پر خدا کے علاوہ غیر مطلع بھی نہیں ہوتا، ذکر میں ریا کاری ہو سکتی ہے، فکر میں نہیں ہو سکتی۔"

(۲۷) خانوادہ برکاتیہ اور فیضانِ چشت:

حسب سابق یہ مقالہ بھی جام نور دہلی کے لیے نہیں بلکہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ کے سالانہ مجلہ اہل سنت کی آواز ۲۰۰۸ء کے لیے لکھا ہے۔ اس میں بلگرام اور مارہرہ کا صوفیانہ تعارف قلم بند کیا ہے۔ مقالے کا لب لباب یہ ہے کہ بظاہر یہ مشہور مارہرہ کا سلسلہ طریقت قادری ہے مگر ہمیشہ سے خانوادہ برکاتیہ میں فیضانِ چشت بھی جاری و ساری ہے۔ خانوادہ برکات کے سلسلہ چشتیہ قدیم اور جدیدہ دونوں کا تعارف کرایا ہے۔ آخر میں شیخ صاحب لکھتے ہیں:

"خانوادہ برکاتیہ کے صوفیہ مشائخ ہمیشہ اپنی اس قدیم نسبت چشتیت پر فخر کرتے رہے ہیں اور خانوادہ سے جاری کرنے والی اجازتوں اور خلافتوں کے ذریعہ فیضانِ چشت کو عام کرتے رہے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ خیر و برکت جاری ہے۔"

(۲۸) دعوت و تبلیغ کے لئے خانقاہی نظام کتنا موثر ہے؟

یہ مقالہ تحقیق و تفہیم کی قسم سوم مباحثہ سے ہے۔ جام نور دہلی کے مستقل کالم تحریری مباحثہ میں مدیر اعلیٰ جام نور دہلی کے سوالات کے اس مضمون میں جوابات ہیں۔ ماضی میں خانقاہوں کے قیام کا مقصد، ماضی میں تبلیغ اسلام اور اصلاح معاشرہ میں خانقاہوں کا کردار، موجودہ دور میں دعوت و تبلیغ کے پس منظر میں خانقاہوں کی افادیت اور موجودہ خانقاہی رسوم و روایات کا تصوف سے تعلق پر نہایت دیانتداری سے گفتگو کی ہے۔ یہاں پر قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ خانقاہی نظام پر شیخ صاحب نے خامہ فرسائی کی ہے جو بذات خود ایک پیر زادہ اور خانقاہی شہزادے ہیں۔ یقیناً یہ دل گردے کا کام ہے جو حضرت شیخ نے اپنے اہلب قلم سے انجام دیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی خانقاہوں اور مصری خانقاہوں کا تقابل پیش کیا ہے۔ دونوں جگہ کی خانقاہوں میں وہی فرق ہے جو ایک چلتے پھرتے انسان اور ایک بے جان مردہ جسم میں ہوتا

ہے اور آٹھ نمونے بطور مثال پیش کیے ہیں۔ جام نور کا یہ مباحثہ مشکل مضمون بار بار شائع ہونا چاہیے۔

(۲۹) آج اہل خانقاہ کی نئی نسل تعلیم سے دور کیوں ہے؟

یہ مضمون جام نور دسمبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ برصغیر میں خانقاہی شہزادوں کی صورت حال اظہر من الشمس ہے جن وجوہات کی بنیاد پر، لا پرواہی کی بنا پر اور خانقاہی بے اعتدالیوں کی وجہ سے خانقاہی شہزادے تعلیم سے دور رہتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اس طرح کے تمام امور کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔

مثلاً مکتب کی کرامت سے زیادہ فیضانِ نظر پر تکیہ کرنا، والدین کی لوح دل بالکل صاف و شفاف ہونا، اساتذہ کا پیر زادہ کے والد سے بیعت ہونا، جاہل اور غالی مریدین کا شہزادوں کی جی حضوری کرنا، صاحب دولت و ثروت مریدین کا شہزادوں کے اشارہ ابرو پر گھومنا اور ان کی جیبیں گرم رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ خانقاہی شہزادوں کا مزاج کیا ہوتا ہے؟ وہ تعلیم و تربیت کے لیے کیا نظام چاہتے ہیں؟ اس کو شیخ صاحب بخوبی سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا دل کتنا حساس اور دردمند تھا مندرجہ ذیل تحریر سے اندازہ لگائیے، لکھتے ہیں:

"دیے میرا ارادہ ہے کہ مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف میں خانقاہی شہزادوں کے لیے ان کے مزاج کے مطابق ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے جس میں نہ صرف ان پر خصوصی توجہ کی جائے بلکہ ان کو خانقاہی اخلاق و آداب سے مزین کرنے کے لیے سنجیدہ اور مخلصانہ کوششیں کی جائیں۔"

(۳۰) جماعت اہل سنت کا حقیقی تعارف کیا ہے؟

یہ ایک تحریری مباحثہ ہے جس میں چھ بنیادی نکات پر گفتگو کی گئی ہے۔ برصغیر میں جماعت اہل سنت کے تعارف سلسلے میں جو بے احتیاطی اور بے اعتدالیاں بڑھتی جاتی ہیں ان کا بھی مفصل ذکر کیا ہے۔ تعارف کے سلسلے میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں جب جب کسی جماعت نے سوادِ اعظم کے جن عقائد سے اختلاف کیا وہی عقائد اس دور میں جماعت اہل سنت کا امتیاز اور اہل سنت کی علامت قرار پائے۔ شیخ صاحب نے اس سلسلے میں مختلف ادوار کی علامتی فہرست نقل کی ہے۔ یہ ایک نہایت محتاط، سنجیدہ اور چشم کشا تحریر ہے جو عوام و خواص دونوں کے

لیے لائق مطالعہ ہے۔ یہ جام نور میں ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔

(۳۱) دینی کام کا معنی اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟

یہ جام نور میں تحریری مباحثہ کے کالم میں شائع شدہ مضمون ہے اور تحقیق و تفہیم کا آخری مضمون ہے جو جولائی ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ شیخ صاحب کی نظر میں دینی کام کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ کام جس سے دین کی تبلیغ و اشاعت مقصود ہو۔ جماعت صحابہ کے احوال و آثار کا جائزہ لینے کے بعد حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس جماعت کے ہر فرد نے اپنے ذوق اور رجحان کے پیش نظر دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے الگ الگ قسم کے میدان کا انتخاب کیا۔ شیخ صاحب کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی تبلیغ کے لیے جس شعبہ میں کام کریں وہ دینی کام ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسروں کے ہر نیک کام کا انکار کر دیا جائے کہ یہ دین کا کام نہیں ہے۔ اس مضمون میں اس طرح کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔

(۳۲) ایک الہم ایک:

یہ مضمون فروری ۲۰۰۹ء میں جام نور میں مہمان ادارہ کی حیثیت سے شائع ہوا۔ عالم ربانی حضرت مولانا شیخ اسید الحق قادری ۲۰۰۸ء میں حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے جو تجربات، مشاہدات سامنے آئے اور سفر حج کی آسانی اور وسائل کی فراوانی اور جدید سہولیات کے نام پر حج کی جو برکتیں کم ہو رہی ہیں ان حالات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اب حج و عمرہ رفتہ رفتہ عبادت سے زیادہ ایک فیشن، تفریح اور سیر و سیاحت بننا جا رہا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کے حاجی اور آج سے پچاس سال پہلے کے حاجی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(۳۳) مولانا ابوالکلام آزاد کا تسامع:

یہ مضمون اکتوبر ۲۰۰۹ء میں جام نور میں شائع ہوا۔ شیخ صاحب کے دادا کے دادا مولانا شاہ فضل رسول عثمانی بدایونی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ باطل افکار و نظریات اور بد عقیدگی کے مقابلے میں آپ کا جہاد باقلم اسلامیانِ ہند پر ایک عظیم احسان ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی تصنیفات، اولیٰ ماخذ اور درجہ استناد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ نے ردِ وہابیہ میں ایک کتاب البوارق المحمدیہ لوجہ الشیاطین النجدیہ ۱۴۶۵ھ میں تصنیف کی۔ اس کتاب کا دوسرا نام سوط

الرحمن علیٰ قرن الشیطان ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ”تذکرہ“ میں سوط الرحمن کی بعض عبارتوں پر تنقید بلکہ تضحیک کی ہے۔ اس کتاب میں علامہ فضل رسول بدایونی نے باطل افکار و نظریات کے ترجمان ابن تیمیہ، ابن حزم اور ابن قیم کا رد و تبلیغ کیا ہے جو مولانا آزاد کی طبع نازک پر گراں گزرا اور سوط الرحمن میں کتابت کی ایک غلطی جس سے عبارت میں تقدیم و تاخیر کے باعث مفہوم برعکس ہو رہا تھا۔ اس عبارت کو تختہ مشق بنا کر تضحیک کر ڈالی جو مولانا آزاد جیسے وسیع المطالعہ اور آزاد خیال مفکر کے شایان شان نہیں تھا۔ شیخ صاحب نے نہایت علمی تاریخی اور محققانہ انداز میں مولانا آزاد کی تنقید اور تضحیک کی خبر لی ہے اور ثابت کیا ہے کہ مولانا آزاد کی تمام بوالعجبوں اور موشگافیوں کی عمارت صرف تساح یا غلط فہمی پر ہے۔

(۳۳) دہر میں ام محمد سے اجالا کر دے:

یہ مضمون جام نور اپریل ۲۰۱۰ء میں بحیثیت مہمان ادارہ کے شائع ہوا۔ اس میں خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے زیر اہتمام ہونے والے مختلف پروگرام مثلاً کیم رتج الاول سے بارہ رتج الاول تک شہر کے بارہ پروگرام غیر مسلموں میں دعوت اسلام، کالج اور اسکولوں میں تبلیغ وغیرہ جموں کا تذکرہ ہے۔ اس موقع پر شیخ صاحب کے مرتب کردہ مختلف کتابچے، پمفلٹ اور فولڈر بدایوں میں تقسیم ہوئے اس کے بعد سے آج تک ان کی تعلیم پورے ملک میں جاری ہے۔ اس میں ایک پمفلٹ ”عید میلہ النبی اس طرح منائیں“ بھی ہے۔ اس میں دس اصول ایسے ہیں جو اس موقع پر افراط و تفریط سے بچنے کے لیے ایک پیشل پیڈیل ہے۔

(۳۵) کچھ لمے امیر دعوت اسلامی کے ساتھ:

اگست ۲۰۰۹ء میں شیخ صاحب پندرہ روزہ پاکستان کے دورے پر گئے۔ کراچی میں مولانا الیاس قادری بانی دعوت اسلامی سے بھی ملاقات ہوئی جس میں امیر دعوت اسلامی نے شیخ صاحب کا بہت ادب و احترام کیا۔ پورے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر دعوت اسلامی اخلاق و کردار کے پیکر ہیں۔ جم نور مئی ۲۰۱۰ء میں یہ مضمون شائع ہوا۔

(۳۶) شمس مارہرہ اور رسالہ آداب السالکین:

یہ مضمون جام نور ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ شمس مارہرہ کی ایک

مستقل سوانح حیات شیخ صاحب نے ”تذکرہ شمس مارہرہ“ کے نام سے مرتب کی ہے اور الگ سے اس میں شمس مارہرہ کی سوانح حیات پر جامع اور مختصر گفتگو کی ہے اور اس کے بعد رسالہ آداب السالکین کا تعارف ہے۔ یہ رسالہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب آداب کے بیان میں، اس میں ۱۲ آداب ہیں۔ دوسرا باب ذکر کی ترتیب اور تیسرا باب دفع خطرات کے بیان میں ہے۔ مستقل رسالہ آداب السالکین بھی شائع ہوا۔ شیخ صاحب کی تصنیفات اور تاج المول اکبڑی کی مطبوعات کے ضمن میں اس پر تفصیلی تعارف ملاحظہ فرمائیں۔

(۳۷) تقریروں میں موضوع روایات ایک لمہ نگری:

شیخ صاحب کا یہ مضمون جام نور اکتوبر، نومبر ۲۰۱۰ء دو قسطوں میں شائع ہوا۔ ہندوستان کے اکثر مدارس میں علوم حدیث کے نام پر صرف ایک کتاب شرح تفسیر الفکر داخل درس ہے۔ اس لیے عام طور پر عام احادیث کی تصحیح و تفسیف، تردید و قبول اور موضوع وغیرہ کو نہیں سمجھ پاتے۔ اسی وجہ سے بے شمار میڈان انڈیا حدیثوں کی بھر مار شیخ پر شعلہ بیانی کے ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ جب دو چار اسٹیجوں پر شیخ صاحب اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہوئے تو یہ مضمون سپرد قلم طاس کیا۔ جیسے ہی مقررین کی عدالت میں پہنچا تو بیشتر، پیشہ ور خطبا کو بے روزگار ہونے کا ڈر ستانے لگا۔ نذرانہ وصولی کی خاطر من گھڑت احادیث کا سہارا لیتے ہیں۔ پہلی قسط کی اشاعت کے بعد لوگوں نے اپنی بے چینی کا اظہار شروع کر دیا۔ دوسری اور آخری قسط کے بعد دسمبر ۲۰۱۰ء اور جنوری ۲۰۱۱ء میں اظہار خیالات کا کالم اسی کی نظر ہو گیا۔ اس مضمون کی اشاعت سے وہ لوگ زیادہ چراغ پا ہوئے جن کے علم حدیث کا مبلغ صرف تقریر اور خطبات کی کتابوں تک محدود ہے مگر کسی نے بھی علوم الحدیث کی روشنی میں واضح، مدلل اور سنجیدہ مضمون نہیں لکھا۔ شیخ صاحب نے بار بار کہا کہ میرے اس مضمون یا کسی اور مضمون پر کسی صاحب علم کو اعتراض ہو تو اصول و قواعد کی روشنی میں ثابت کریں قبول حق میں مجھے کوئی پس و پیش نہیں ہے۔ رجوع کرنا میرے لیے باعث فخر ہے مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔

(۳۸) فضل حق فضل رسول اور آزردہ:

یہ مضمون جام نور ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں تیرہویں صدی ہجری کی تین عبقری شخصیات استاذ مطلق علامہ فضل حق خیر آبادی

(ولادت ۱۲۱۲ھ، وفات ۱۲۷۸ھ) سیف اللہ المسلمول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی (ولادت ۱۲۱۳ھ، وفات ۱۲۸۹ھ) صدر الصدور مفتی صدر الدین آزرہ دہلوی (ولادت ۱۲۰۴ھ، وفات ۱۲۸۵ھ) کے آپس میں روابط، محبت و الفت کا تذکرہ ہے۔ کئی امور ایسے قدر مشترک تھے جو باہم یگانگت اور رشتہ خصوص و محبت کی بنیاد بنے۔ شیخ صاحب نے اس طریقے کے پانچ امور کا ذکر کیا ہے جو ان تینوں کو مزاج و مذاق مسلکی میلان، ابدی رجحان، سیاسی خیالات اور اتحاد دو یگانگت کے ایک مرکزی نقطہ پر جمع کر دیتے ہیں۔ یہی نقطہ اتحاد ان تینوں حضرات میں محبت، خلوص، بے تکلف دوستانہ مراسم، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، قدر و منزلت، قدر شناسی اور قدردانی کی بنیاد ہے۔ فضل مقالہ نگار نے چھیس مراجع و مصادر کے حوالے سے نہایت تحقیقی، تاریخی اور مسلکی گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون شیخ صاحب کی ایک تاریخی تحقیقی کتاب ”خیر آبادیات“ کا ایک باب ہے۔

(۳۹) ہم نے دیکھا پاکستان:

مدیر اعلیٰ ماہ نامہ جام نور مولانا خوشتر نورانی اور شیخ صاحب ۲۲ نومبر ۲۰۱۰ء کو پاکستان کے تیس روزہ دورے پر گئے، جو بہت معلوماتی اور قیمتی سفر ہے جس میں پاکستان کے مدارس، خانقاہیں، لائبریریاں اور عوام و مشائخ کا جامع تعارف بھی ہے اور علمی گفتگو کی تفصیل بھی ہے، جو فقط ایک سفر نامہ ہی نہیں بلکہ معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ سفر نامہ مئی ۲۰۱۰ء میں بحیثیت مہمان ادارہ شائع ہوا۔ اسی شمارے میں خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے زیر اہتمام شیخ اسید الحق قادری کے زیر قیادت بدایوں شریف میں ہونے والے شانتی سمیلن کی رپورٹ بھی شائع ہوئی۔ ”شانتی سمیلن“ کے ذریعے برادران وطن کے درمیان بھائی چارے کو عام کرنے کی جو پہل کی گئی ہے یہ موجودہ دور میں اسلام کی بہترین خدمت ہے۔

(۴۰) مولانا عبدالحق خیر آبادی اور ان کے تلامذہ کے علمی محرکے:

یہ مضمون جام نور جون ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ مولانا عبدالحق خیر آبادی کی علمی تحقیق پر بعض معاصرین نے اپنی تحقیق پیش کی تو مولانا عبدالحق خیر آبادی کے تلامذہ میدان تحقیق و مناظرہ اور مباحثہ میں کود پڑے اور اپنے استدعا کو خوب دفاع کیا۔

(۴۱) خانوادہ خیر آبادی کی اہل علم خاتون:

یہ مضمون جام نور جولائی ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے خانوادے کی تین صاحبہم و فضل خواتین کا تذکرہ ہے۔ ۱۔ بی بی سعیدہ النسا حراماں خیر آبادی ۲۔ بی بی ہاجرہ خاتون خیر آبادی ۳۔ بی بی رقیہ بنت عبدالحق خیر آبادی۔

(۴۲) علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں بعض بے بنیاد باتیں:

جس طرح متعصبین و مخالفین اور حاسدین دیگر علما کے اہل سنت کو بدنام کرنے کے لیے ہمیشہ بے بنیاد الزامات لگاتے رہتے ہیں، اسی طرح علامہ فضل حق خیر آبادی کے ساتھ ہوا۔ ان بے بنیاد روایتوں میں ۱۔ مولوی عبد اللہ خاں کاندھوی سے منظرہ ۲۔ شاہ اسماعیل دہلوی اور علامہ کا تحریری مناظرہ ۳۔ علامہ فضل حق کی رد و ہابیہ سے توبہ وغیرہ ہیں۔ یہ مضمون اگست ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔

(۴۳) علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں بعض روایات کا تحقیقی جائزہ:

یہ مضمون جام نور ستمبر ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا اس میں بھی چند بے بنیاد الزامات اور روایات کا علمی اور تحقیقی جائزہ پیش کر کے ان بے بنیاد الزامات کا بطلان ثابت کیا گیا ہے۔ مثلاً مولوی امیر احمد سہوانی اور مسئلہ امکان نظیر، مولوی سید سراج احمد سہوانی سے مباحثہ وغیرہ۔

(۴۴) علامہ فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسماعیل دہلوی:

اس مضمون میں ان تمام احوال و کوائف کا ذکر ہے جو علامہ خیر آبادی نے شاہ اسماعیل دہلوی کے باطل افکار و نظریات کے رد و تبلیغ میں کیا ہے۔ یہ مضمون اگست ۲۰۱۱ء جام نور میں شائع ہوا۔ مقالہ نمبر ۳۸ اور ۴۰ سے ۴۳ تک۔ چھ مقالات کا علمی تعارف اور ان پر تفصیلی گفتگو شیخ صاحب کی تحقیقی اور تاریخی کتاب ”خیر آبادیات“ کے تعارف میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۴۵) عربی محاورات و تعبیرات ایک جائزہ:

عالم ربانی حضرت شیخ صاحب علیہ الرحمہ نے عربی اور اردو محاورات کے موضوع پر ایک تحقیقی مفید اور معلومات افزا کتاب ”عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات“ کے عنوان سے ترتیب دی ہے۔ یہ مضمون درحقیقت اسی کتاب کے مقدمے کی ایک فصل ہے، جس میں محاورے کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اخذ، محل استعمال اور حدود پر نہایت علمی گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون جام نور میں نومبر ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا جو صرف

شیخ صاحب کا ہی حصہ ہے۔ اس کتاب پر مزید تعارف شیخ صاحب کی تصنیفات کے تعارف میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳۶) سند متکلمین مولانا حیدر علی فیض آبادی: حیات و خدمات:

یہ مضمون جام نور جون ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ جماعت اہل سنت کے بے دار مغز اور حساس علمائے چند سال پیشتر تحریک اسلاف شناسی شروع کی تھی جس کے پلیٹ فارم سے بے شمار اسلاف و اکابر کی حیات و خدمات، کارنامے، علمی تحقیقی کام منظر عام پر آئے اور عظیم الشان اساطین امت سے اس صدی کے عوام و خواص بالخصوص علمائے اہل سنت روشناس ہوئے۔ اس سلسلے میں ملت کا ترجمان ماہ نامہ ”جام نور“ کی خدمات قابل قدر اور تاریخی ہیں۔ اس مضمون میں شیخ صاحب نے تیرہویں صدی ہجری کی عبقری شخصیت رئیس المناظرین، سند متکلمین، صاحب تصانیف کثیرہ مولانا حیدر علی فیض آبادی (وفات ۱۸۸۱ء) کا سوانحی خاکہ، معاصرین کی آراء، علامہ فضل حق خیر آبادی سے روابط، مسئلہ اثناعشریہ اور امکان کذب، مولانا شاہ فضل رسول ہدایونی سے روابط اور ان کی کتاب فصل الخطاب پر تصدیق وغیرہ عنوانات پر شیخ صاحب نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد مولانا فیض آبادی کی تصانیف کا تعارف کرایا ہے۔ مولانا فیض آبادی نے تصانیف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا جو ۱۸۵ء کے ہنگامہ غدر میں تلف ہو گیا۔ شیخ صاحب کی دسترس میں آپ کی چودہ کتابیں آئیں جن کا تعارف زینت مقالہ ہے۔ آخر میں شاہ اسماعیل دہلوی کی تحریک اور اس پر مولانا فیض آبادی کی تردید پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ چوبیس کتب کی مراجعت اور مطالعہ سے یہ تحقیقی مقالہ منظر عام پر آیا۔

(۳۷) فردوق حسی کا قصیدہ مہمیر: ایک تحقیقی مطالعہ:

یہ مضمون جام نور اگست ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کا بیٹا اور ولی عہد سلطنت ہشام بن عبد الملک ملک شام سے سرج پڑ آیا۔ اس کو کسی نے اہمیت نہیں دی اور حرم شریف میں جب اس کی موجودگی میں امام زین العابدین آئے تو لوگوں نے انہیں اہمیت دی اور ادب و احترام سے پیش آئے یہ دیکھ کر ہشام کو شرمندگی ہوئی دوستوں کے دریافت کرنے پر تباہل عارفانہ سے بولا میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔ اس سفر حج میں عہد اموی کا مشہور شاعر ابو فراس ہمام بن

غالب فردوق حسی بھی تھا۔ ہشام کا یہ جواب سن کر اس کی رگ حسیٹ بھڑک اٹھی اور اس نے امام زین العابدین کی شان میں فی البدیہہ ایک فصیح و بلیغ قصیدہ نظم کر کے برجستہ سنا دیا۔ اس قصیدہ کی تحقیق میں اختلاف ہے کہ اس میں کتنے اشعار ہیں۔ ایک تاریخی اختلاف یہ بھی ہے کہ فردوق نے یہ قصیدہ امام زین العابدین کی شان میں کہا ہے یا امام حسین کی شان میں۔ شیخ صاحب نے تاریخی، تحقیقی اور علمی جہت سے اشعار کے تعداد کی تحقیق ۳۰ کی ہے۔ شاعر فردوق اور مدح امام زین العابدین کو ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام زین العابدین، شاعر فردوق، ہشام کا تعارف، قصیدہ کے انتساب کا قضیہ، قصیدہ کا مضمون، فارسی ترجمہ، قصیدہ مہمیر کی شروحات، ہمیس اور بعض دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ قصیدہ مہمیر کا متن مع ترجمہ پر خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ اس قصیدہ پر علمی تحقیق کام دیکھ کر شیخ صاحب کی وسعت مطالعہ اور علم ادب سے گہری دلچسپی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مارہرہ سے نکلنے والے سالانہ مجلہ اہل سنت کی آواز میں بھی ۲۰۱۲ء میں یہ مضمون مزید اضافے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

عرس قادری ۱۴۳۵ھ میں ۲۸ صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کا مطالعہ عربی زبان و ادب کے شائقین کے علم میں اضافے کا سبب ہوگا۔

(۳۸) خانوادہ قادریہ ہدایوں اور خانوادہ عظیمیہ: تعلقات و روابط:

شیخ صاحب کا یہ مضمون جام نور اکتوبر ۲۰۱۲ء اور جنوری ۲۰۱۳ء دو قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ بالکل نیا موضوع ہے اور بہت اہم ہے۔ موجودہ نسل کے لیے بیسویں صدی کے نصف اول کی قومی و ملی سیاست اور آزادی کے بعد عالمی منظر نامے پر علمائے اہل سنت کے قائدانہ کردار کے چند اہم گوشے سامنے آ رہے ہیں۔ خانوادہ عظیمیہ سے مبلغ اسلام مولانا شاہ عبد العظیم صدیقی میرٹھی، مولانا مختار احمد میرٹھی، مولانا نذیر احمد بخندی، قائد اہل سنت مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا محمد جیلانی صدیقی مراد ہیں۔ خانوادہ قادریہ سے مولانا عبد الماجد ہدایونی، مولانا عبد القدیر ہدایونی اور مولانا عبد الحامد ہدایونی مراد ہیں۔ ان دونوں خانوادوں نے ملکی، ملی، مذہبی، دینی اور مسلکی محاذوں پر شانہ بشانہ کام کیا۔

تحریک خلافت کی متحدہ جدوجہد، اجلاس مؤتمر اسلامی کانپور،

آل انڈیا سنی کانفرنس، دارالمسلمین ہدایوں شریف کا قیام، سنی کانفرنس اجیر شریف وکراچی، وفد حجاز ۱۹۳۶ء، قیام پاکستان اور ہجرت، پاکستان کا اسلامی دستور، جمعیتہ علمائے پاکستان، ۱۹۵۷ء کا دورہ روس، جنت المعلیٰ اور جنت البقیع کی حفاظت و صیانت کی تحریک وغیرہ پر حضرت شیخ صاحب نے نہایت تاریخی اور تحقیقی گفتگو کر کے تحریک اسلاف شناسی کا حق ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

(۳۹) قصیدہ بانہ سجاد: ایک مطالعہ:

یہ مضمون فردری، مارچ ۲۰۱۳ء دو قسطوں میں بیس صفحات پر شائع ہوا۔ صحابی رسول حضرت کعب بن زہیر جو شعراے خضر سے ہیں، کا نظم کردہ اور حضور ﷺ کا پسند فرمودہ ہے۔ مولانا عاصم اقبال مجیدی ہدایونی نے اس قصیدہ کا اردو ترجمہ و تشریح کیا ہے۔ زیر نظر مضمون شیخ صاحب نے بطور مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔ مضمون نہایت علمی اور تحقیقی ہے، جو موضوع کے تمام ضروری گوشوں مثلاً عربی، ادبی، لسانی، بلاغی، نحو و صرف کے متعلق تمام بحث کا احاطہ کر رہا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر شیخ صاحب نے اس مقالے کو جام نور کے صفحات کی زینت بنایا۔ تفصیل کے لیے تاج الفحول اکیڈمی کی مطبوعات کے تعارف میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۰) مولانا عبد الماجد ہدایونی اور تحریک تحفظ گنبد عمری:

یہ مضمون جام نور اپریل ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ خانوادہ قادریہ عثمانیہ ہدایوں شریف نے ہر دور میں اچھے افراد قوم و ملت کو دیے ہیں مگر گذشتہ دو صدیوں میں اس خانوادے کی جن عظیم شخصیات نے علمی، عملی، تحریری، تقریری، قومی، ملی ہر محاذ پر خدمات انجام دی ہیں، ان میں ایک بڑا نام مجاہد آزادی مولانا عبد الحامد ہدایونی کا بھی ہے۔ زیر نظر مضمون میں ان کی ایک تحریک تحفظ گنبد خضرا بھی ہے۔ مقالے کی ابتدا میں سوانحی خاکہ اس کے بعد سترہ تصنیفات کی فہرست پھر تحریک تحفظ گنبد خضرا کا تعارف ہے۔ اس مقالے کے عناصر یہ ہیں وفد حجاز ۱۹۵۲ء، شیخ محمد سرور الصبان نائب وزیر مالیات سعودیہ، مفتی اعظم مصر شیخ حسین مخلوف، مفتی اعظم شام شیخ سعید رمضان بوٹی سے ملاقات، شیخ صالح قزاز انچارج محکمہ تعمیرات سے میٹنگ، ترکی کے وفد سے ملاقات، شیخ صالح سے مفتی اعظم مصر کا مذاکرہ، اراکین وفد کی وزیر مالیات سے

ملاقات، ولی عہد مملکت شہزادہ سعود بن عبد العزیز سے ملاقات، نجدی امیر کے دربار میں ہدایونی فقیر کا اعلان حق، امیر سعود بن عبد العزیز کے نام مولانا ہدایونی کا تار وغیرہ۔ اس طریقے کے اور دیگر عنوانات پر شیخ صاحب نے تاریخی اعتبار سے نہایت علمی اور سنجیدہ گفتگو کی ہے۔ حاصل کلام حضرت مولانا ضیاء الدین قادری مہاجر مدنی نے فرمایا ”امت مسلمہ پر یہ مولانا عبد الحامد ہدایونی کا یہ احسان ہے کہ ان کی بروقت مداخلت اور پر زور تحریک کے نتیجے میں سعودی حکومت گنبد خضرا کے انہدام سے باز رہی۔ اگر مولانا ہدایونی کی تحریک تحفظ گنبد خضرا نہ چلاتے تو خدا جانے کیا صورت حال ہوتی۔“

(۵۱) شمس مارہرہ اور سراج الہند:

یہ مضمون جام نور مئی ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ خانوادہ ولی اللہی میں شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے صاحبزادے سراج الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی شخصیت مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح خانوادہ برکات میں شمس مارہرہ حضور اچھے میاں کی ذات گرامی کو ارباب نظر اور اصحاب دل نے فخر خاندان برکات تسلیم کیا ہے۔ یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہے کہ یہ دونوں فخر خاندان کے چشم و چراغ ایک ہی زمانے کے ہیں۔ شیخ صاحب نے دونوں بزرگوں کے تعلق سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ علمی تاریخی اور محبت والی گفتگو کی ہے جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ولی راوی می شناسد۔ اس مقالے کے عناصر یہ ہیں: مجلس عزیزی میں تذکرہ شمس مارہرہ، مجلس شمس مارہرہ میں تذکرہ عزیزی، مریدین شمس مارہرہ درس گاہ عزیزی میں اور اس کے علاوہ تمام حالات و واقعات جن سے دو خانوادوں کے درمیان محبت اور تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔ خانقاہ عالیہ قادریہ ہدایوں شریف کے زیر اہتمام عرس قادری ۲۰۱۳ء میں جشن دو سالہ شمس مارہرہ کے موقع پر شیخ صاحب کی ۸۸ صفحات کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسی کی ایک فصل ہے جس میں خانقاہ برکاتیہ مارہرہ اور خانقاہ قادریہ ہدایوں کے مابین محبت و عقیدت اور ادب و احترام کے جلوے نظر آتے ہیں۔ شائقین تصوف اس کا مطالعہ کریں۔

(۵۲) شرح قصیدتان رائدان ایک تنقیدی مطالعہ:

یہ تحقیقی، تنقیدی اور علمی مقالہ جام نور اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۳ء میں تین قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ شیخ صاحب کے جدا جدا مولانا شاہ

فضل رسول قادری عثمانی بدایونی کی مدح و منقبت میں اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے تین سو تیرہ اشعار پر مشتمل عربی زبان میں دو صبح و بلیغ قصیدے نظم کیے تھے جو عقیدت و محبت اور زبان و بیان دونوں جہتوں سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلے قصیدے میں دو سو تینتالیس اشعار ہیں۔ اس کا تاریخی نام مدائح فضل الرسول ہے۔ دوسرے قصیدے میں ستر اشعار ہیں۔ اس کا تاریخی نام حمایہ فضل الرسول ہے۔ یہ قصائد علمی حلقوں میں قصیدتان راجستان کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت شیخ صاحب کے تلمیذ رشید مولانا عاصم اقبال مجیدی بدایونی نے ان اہم تاریخی قصائد کا ترجمہ و تفسیر کی ہے۔ شیخ صاحب نے پچاس صفحات پر مشتمل تفصیلی مقدمہ لکھا ہے جس میں عربی زبان و ادب اور نظم عربی کے تمام پہلوؤں کا علمی، تحقیقی، فنی، لسانی، عروضی اور بلاغی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقدمے میں فاضل بغدادی ڈاکٹر رشید عبیدی کی شرح و تحقیق میں تسامحات کی بھی سنجیدگی سے خبر لی گئی ہے۔ مقدمے کا یہ حصہ مقدمے کی جان ہے جس کو افادہ عام کے لیے جام نور کے صفحات کی زینت بنایا گیا ہے۔ عربی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے شائقین علم، طلبہ اور عربی ادب کو دعوت عام ہے کہ ہر جہت سے اس کا مطالعہ کریں اور شیخ صاحب کی علمی وسعت کا اندازہ لگائیں۔

(۵۳) تو کجا بہر قشاشی روی:

یہ مضمون نومبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ امام علم و فن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی علیہ الرحمہ کی وفات پر ایک سو گوار تحریر ہے جو انہوں نے خواجہ صاحب کی تدفین میں شرکت سے واپسی پر لکھی۔ اس میں خواجہ صاحب کی حیات کے تعلق سے کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہے بلکہ غم و اندوہ کے الم میں خالص ایک تعزیتی تحریر ہے۔ شیخ صاحب اپنے استاذ و محترم خواجہ صاحب کی ایک سوانح حیات مرتب کر رہے تھے جو غالباً پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ مردے از غیب بروں آید و کار سے بکند

(۵۴) شب جائے کہ من بودم:

جام نور جنوری ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۷ء عرس قاسمی مارہرہ میں شیخ صاحب کی دوسری حاضری کے موقع پر خصوصی تحریر ہے جس کو مدیر اعلیٰ جام نور نے مہمان ادارہ کے بطور شائع کیا ہے۔ اردو زبان و

ادب کے تعلق سے یہ ایک عظیم شاہ کار ہے جس سے متعدد پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً بدایوں مارہرہ کے صدیوں پرانے رشتوں کی منظر نگاری، ارباب خانقاہ قادریہ بدایوں کس حیثیت سے خانقاہ برکاتیہ مارہرہ حاضر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار خصوصیات ہیں جو اس مقالے سے اظہر من الشمس ہیں۔ اہل بدایوں اپنی عزت و عظمت، شہرت و رفعت، معرفت و ولایت وغیرہ سب کچھ مارہرہ کا رہن منت تصور فرماتے ہیں۔

(۵۵) حدیث انزاق امت: تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں:

مئی تا اگست ۲۰۰۵ء جام نور میں چار قسطوں میں اس مقالے کو شائع کیا۔ اس کی اشاعت پر کرم فرماؤں نے نہایت تشویش کا اظہار کیا۔ علم و فضل، تحقیق و تدقیق اور علوم الحدیث سے نااہل حضرات، بخاری اور مسلم کا لفظی ترجمہ کرنے والے شیخ الحدیث، اندھی تقلید میں گرفتار بے حس مولوی حضرات کی پوری برادری بے چینی ہو گئی۔ بزم خویش تحقیق و تدقیق اور علم و ادب کی نئی راہوں کا دروازہ بند کرنے والے بلبل اٹھے۔ علوم القرآن اور علوم الحدیث کی روشنی میں کوئی مدلل و مفصل اور واضح اور اطمینان بخش تحریر نہ لکھ سکے۔ بہت سے لوگوں نے اس میدان میں پنجہ آزمائی کی اور اپنی موروثی روش کے مطابق نہایت غیر سنجیدہ اور انسانیت سے گری ہوئی باتیں کہیں اور لکھیں، جس کو مہذب، دانشور اور اہل علم و ادب کا طبقہ یا ایک انصاف پسند انسان پسند نہیں کرتا۔ بہر حال بہت لے دے گئی اب بھی کچھ یاران طریقت سنی نامحمدیوں جھلا ہیں۔ شیخ صاحب نے حرف آغاز میں لکھا ہے:

”اگر کوئی سنجیدہ اور علمی تنقید سامنے آتی ہے تو مجھے مقالے پر نظر ثانی کرنے اور فطرتی واضح ہونے کی صورت میں اپنی خطا کے اعتراف اور قبول حق میں کوئی تاثر نہیں ہوگا۔“

شیخ صاحب کے مقالات میں سب سے زیادہ بے چینی اسی مقالے پر ہوئی۔ یہ مقالہ نومبر ۲۰۰۸ء میں چوراسی صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ اس موضوع پر مزید تعارف شیخ صاحب کی تصنیفات کے تعارف میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۶) قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ:

خالص علمی، تحقیقی مقالہ اگست تا نومبر ۲۰۰۶ء ماہ نامہ جام نور میں

شائع ہوا۔ یہ مضمون از ہر شریف معر میں کلیہ اصول الدین شعبہ تفسیر کے سال سوم میں لکھا گیا مقالہ ہے جو دراصل عربی میں لکھا تھا۔ شیخ صاحب نے بقلم خود اردو کا جامہ پہنایا اور اردو رسائل و جرائد میں شائع کیا جو ۲۰۰۸ء میں ۶۴ صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں شائع ہوا۔ برصغیر کے مدارس میں اصول تفسیر کی کتابیں داخل نصاب نہیں ہیں (اب چند سالوں سے) اس لیے علم، طلبہ کے لیے یہ موضوع جدید تھا۔ شائقین کے لیے تعجب اور دلچسپی کا باعث تھا۔ علم و ادب اور تحقیق و مطالعہ کے شائقین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حسب سابق از ہری بدایونی تحقیق ہونے کے ناطے ایک مخصوص طبقے نے اظہار تشویش کیا۔ کرنا بھی چاہیے، اس لیے کہ یہ ان کا موروثی حق ہے۔ ان کے نزدیک جدید تحقیق کے نام پر ہر حرف غلط ہے۔ مگر ان کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہ کی اور نہ کسی نے ان کی سنی۔ اس لیے کف دست مل کر کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنی اپنی خواب گاہوں میں واپس ہو گئے۔

اس موضوع کے ساتھ شیخ صاحب نے تحقیقی اعتبار سے کتنا انصاف کیا ہے اور کیا نیا پیش کیا ہے، اس کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں جو تاج اللؤلؤ اکیڈمی بدایوں کے زیر اہتمام ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ تاج اللؤلؤ اکیڈمی بدایوں شریف کی جملہ مطبوعات مکتبہ جام نور دہلی اور خواجہ بک پوڈ دہلی سے طلب کریں۔

حضرت شیخ اسید الحق قادری کے ۵۶ مقالات کا تعارف حاضر خدمت ہے جو بے شمار مصروفیات اور ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ نہایت کم وقت میں لکھا گیا ہے۔ اگر قارئین کو پسند آئے تو اللہ و رسول کا فضل و احسان اور حضور غوث اعظم کا فیضان ہے۔ اگر پسند نہ آئے تو یہ میری علمی بے مائیگی ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم ربانی اور شہید راہ بغداد کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے چھوڑے ہوئے مشن کی تکمیل کے لیے غیب سے اسباب مہیا فرمائے۔ مولانا محمد عطیف میاں قادری اور محمد عزام میاں قادری کو شیخ صاحب کا سچا علمی جانشین بنائے۔ آمین

□□□

☆ پرنسپل دارالعلوم فیضان شاہ فکین، قصبہ نگرالہ ضلع بدایوں (ہوئی)

ماہنامہ جام نور کے تاریخی انٹرویوز کا مجموعہ

روبو

(۳ جلدیں)

شائع ہو چکا ہے

ترتیب: خوشتر فورانی

ناشر: ادارہ فکر اسلامی، دہلی

معاصر مذہبی، مسلکی، ملی، علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی، سماجی اور صوفی مسائل پر مشاہیر وقت کے افکار و خیالات کے اس دستاویز کو درج ذیل تین جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلی جلد: علما و مشائخ پر مشتمل ہے

صفحات: 364، قیمت: 160/-

دوسری جلد: ادبا، شعرا اور ناقدین ادب پر مشتمل ہے

صفحات: 306، قیمت: 140/-

تیسری جلد: ملی، سیاسی، تعلیمی، تحریری اور صحافتی شخصیات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 306، قیمت: 140/-

ادارہ فکر اسلامی دہلی کی طرف سے شائع شدہ تقریباً ہزار صفحات پر پھیلے اس علمی، فکری اور تاریخی دستاویز کے لیے مکتبہ جام نور دہلی سے رابطہ کریں۔

Phone: 011-23281418, 09313783691

عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات: ایک مطالعہ

مدارس اور جامعات کے عربی شعبہ جات میں اس کتاب کو شامل نصاب کیا جانا چاہیے

ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے کہ محبت مکرم مولانا اسید الحق قادری بدایونی سے رشتہ مودت کی بنیاد کیسے اور کب پڑی۔ غالباً مرحوم نے اپنی گرامر قدر تصنیف ”عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات“ سے نوازا تھا جس میں دیگر مآخذ کے ساتھ میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے ”اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو“ کے حوالے سے محاورے کی تحریف متعین کی گئی تھی اور اس کے خصائص کو اجاگر کیا تھا۔ کہاوتوں اور محاوروں پر مہسوط و منضبط کام نسبتاً کم ہوا ہے، اس لیے مجھے ان کی یہ علمی کاوش مفید و ممتاز لگی اور میں نے کتاب میں درج ہیل فون نمبر پر ان سے رابطہ کر کے ان کے کام کو سراہا۔ اس وقت مرحوم نے خود میرے کام کی اس منسکرانہ انداز سے تحسین کی کہ مجھے جواب آنے لگا۔ گفتگو اگرچہ فون پر ہو رہی تھی مگر ان کے لہجے اور لفظوں کے انتخاب سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس میں اردو والوں کا نام نہاد انکسار نہیں فائل کا اخلاص شامل ہے۔

مرحوم کی ایک اور کتاب ”خامہ غلاشی“ بھی موصول ہوئی تھی جس پر بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ایم فل کر رہے ایک قدرے سمجھدار طالب علم سید عبداللہ علوی سے میں نے تبصرہ کروا کے ”سہ ماہی ترسیل“ میں اسے شائع کیا۔

اور ”ترسیل“ ان کے نام جاری بھی کرایا تھا کہ اس تبصرے کے علاوہ ترسیل کے دیگر مشمولات ان کی نظر سے گزرتے رہیں۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ اعزازی طور پر مرسلہ شماروں سے متعلق چٹوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ملا تو میں نے پرچہ طے کی تصدیق کرانے کے لیے انہیں SMS کیا اور پتے میں کوئی غلطی بھی ہو تو اس کی اصلاح کی درخواست کی۔ جواب میں پرچہ طے کی رسید آئی۔ کوئی ایک ماہ بعد ان کا ایک اور ایس ایم آیا جو غالباً اگلا پرچہ نہ طے کی شکایت کا پر لطف اظہار تھا:

کس قدر ظلم ڈھایا کرتے ہو
یہ جو تم بھول جایا کرتے ہو

(۳۱ جولائی ۲۰۱۳ء شام ۶ بج کر ۳۶ منٹ)

مرحوم ہیل فون پر فیکسٹ کی صورت میں اپنی محبت آمیز سخن فہمی سے میرے ذہن کی ہولناک تاریکی میں چراغ ساروشن کر دیتے تھے۔ ۱۹ مئی ۲۰۱۳ء کی رات کے سات بج کر باون منٹ پر انہوں نے یہ شعر فیکسٹ کیا تھا جسے جواباً انھیں کوواپس روانہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کاش یہ ممکن ہوتا۔

کبھی کبھی سفر زندگی سے تھک کر ہم
ترے خیال کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں

اور یہ شعر تو اب ایسا لگتا ہے انہی کے لیے کہا گیا تھا جو ان کے ہم سے اچانک ہجرت جانے کے بعد اپنی معنویت کو پوری طرح اجاگر کر رہا ہے۔ یہ اپنے چاہنے والوں کا حال کرتے ہو کمال کرتے ہو صاحب کمال کرتے ہو (یکم دسمبر ۲۰۱۳ء)

مولانا اسید الحق قادری سے پہلی اور آخری مرتبہ بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے منعقدہ سیمینار بہ عنوان ”عربی اور اردو کے لسانی و ادبی روابط“ میں شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ یہ دور روزہ سیمینار ۲۷/۲۸ فروری ۲۰۱۳ء کو منعقد ہوا تھا۔ میں ان کی عیشت کا تو قائل تھا ہی ملاقات کے بعد ان کی طبعی شائستگی اور حسن اخلاق کا بھی معترف ہو گیا۔ ان کے طرز عمل اور انداز گفتگو سے متانت اور وضع قطع سے رٹھ رکھاؤ اور سلیقہ مندی چلتی تھی۔ وہ مولویانہ کھرے پن سے ہماری ایک شکستہ مزاج عالم نظر آئے۔ راقم الحروف نے سیمینار کے کلیدی خطبے میں اپنی بساط بھر موضوع سے انصاف کرنے کی سعی ناتمام کے ساتھ شرکائے مذاکرہ سے

یہ توقع بھی وابستہ کی کہ وہ اردو کے تعلق سے مریدانہ رویہ اختیار کرنے کے بہ جائے اسے ایک خود مکتبی زبان کی حیثیت سے دیکھیں اور عربی عناصر و الفاظ کے تلفظ، املا، معنی اور محل استعمال کے اعتبار سے اسے عربی کی دست نگر نہ سمجھیں۔ بعض مقالات کی پیش کش کے دوران اردو کے ایک مستقل زبان ہونے کے ناطے اسے اپنی لسانی ترجیحات و امتیازات کو اختیار کرنے اور ان پر عمل کرنے کی آزادی پر گرم بحث بھی ہوئی۔ پہلے دن کے اجلاسوں کے اختتام پر لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے اور کچھ شعبہ اردو یا اپنی اپنی قیام گاہ کو روانہ ہو گئے۔ میں بھی شعبہ اردو کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اسید الحق صاحب چند شرکا کے ساتھ جاتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے رک کر سب کو سیمینار کی کامیابی کے لیے مبارک باد دیتے ہوئے ازراہ تفنن کہا ”ایک دل چسپ بات یہ ہوئی کہ اردو اور عربی والوں میں علمی چچا بھی ہو گیا۔“ اس پر مرحوم نے جو تبصرہ لگایا، وہ ان کی خوش دلی و خوش مذاقی پر دلالت کرتا تھا اور اب تک کانوں میں گونجتا محسوس ہوتا ہے۔

مرگ ناگہانی نے مولانا کی راہ کھوئی نہ کی ہوتی تو ان کی ذات سے علم و ادب اور مذہب و ملت کی گراں مایہ خدمات کا ظہور ہوتا۔ اگرچہ ان کا چھوڑا ہوا علمی سرمایہ بھی ان کے نام اور ان کی یاد سے ہمارے سینوں کو پُر نور رکھے گا مگر ان کا فعل مستعمل ہونا بھی ہمارے دلوں کو ان کی آخری دھڑکنوں تک موسساتر ہے گا۔

ہاں اے فلک پیر، جواں تھا ابھی عارف

کیا تیرا مجزنا جو نہ مرتا کوئی دن اور

برقی پیغامات کا ذکر آگیا ہے تو ایک آخری پیغام کی بابت بھی دو باتیں کر لوں جو مرحوم کی سناوٹی کے طور پر عزیز یی تالیف حیدر نے ارسال کیا تھا۔ پڑھتے ہی دل پر ایسی چوٹ لگی جیسے کسی قریبی عزیز کے اٹھ جانے کا صدمہ پہنچا ہو۔ اپنے جوان بھائی کے خالی گھر کی تنہائی میں ہارٹ اٹک کے بعد اپنوں سے دور ہونے والی ناگہانی موت کے صدمے سے اب تک باہر نہیں آسکا ہوں۔ اسید الحق مرحوم کے انتقال کی خبر نے اس غم کو تازہ کر دیا اور میں نے جواباً یہ پیغام ٹائپ کیا جو قلب مضطرب کا ترجمان تھا:

”یہ سال کی پہلی سب سے اندوہ ناک خبر ہے۔ ایک حلیم الطبع

عالم کی رحلت علم و اخلاق دونوں کا نقصان ہے۔ اللہ ان کے درجات عالی کرے۔“ (۳ مارچ ۲۰۱۳ء)

میری ناخوار طبیعت کا احوال یہ ہے کہ گھنٹوں کا کام دنوں میں، دنوں کا ہفتوں میں اور ہفتوں کا مہینوں میں انجام پاتا ہے اور جو کام موقوف ہو جاتے ہیں وہ ایک ایسا گلدستہ طاق لسیاں ہو کر رہ جاتے ہیں جس کے مرجھائے ہوئے پھول کتابوں تو کچا صندوقچوں میں بھی جک نہیں پاتے۔ مگر عزیز یی تالیف حیدر کے محبت آمیز اصرار اور مرحوم کی موتی یادوں کے سحر نے ایسا باندھ لیا کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس تحریر کی تکمیل میں لگ گیا ہوں۔

وقت کی کمی اور قلم کی کوتاہی (آج مارچ کی ستائیسویں ہے اور مجھے کل تک اپنی یہ تحریر اسکین کرانے کی سیل کرانی ہے۔ نظر ثانی اور ترمیم کا بھی وقت نہیں ہے، اس لیے ہاتھ اور قلم سنبھال کے لکھنے کی کشاکش میں مبتلا ہوں) کے پیش نظر مرحوم کی وقیع تصنیف ”عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات“ کا مہسوط جائزہ لینے سے قاصر ہوں لیکن وعدے کی پابندی اور مرحوم کے دام محبت کی گرفتاری کا تقاضا ہے کہ اپنے تاثرات قلم بند کرنے کی سعادت سے محروم نہ رہوں۔ لیکن اپنے ناقص معروضات پیش کرنے سے قبل اس کتاب کے تقریظ نگار صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی ڈاکٹر محمد مصطفیٰ شریف کی عالمانہ تحریر کے دو مختصر اقتباسات نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان سے کتاب اور صاحب کتاب کا جامع تعارف سامنے آتا ہے اور راقم الحروف کے جذبات و احساسات کی بھی عکاسی ہوتی ہے:

”زیر نظر کتاب ایک ایسے ہی عالم کے لوگ قلم سے معرض وجود میں آئی ہے جو اللہ اللہ! بے پیک وقت دونوں زبانوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ صوفی بھی ہیں عالم بھی، ادیب بھی ہیں ناقد بھی، مترجم بھی ہیں مؤلف بھی اور ماہر لسانیات بھی۔ اردو نے تو انہی کے خانوادوں میں انگریزیاں لی ہیں، عربی ادب کی آخری پناہ گاہ (جامع ازہر) میں ان کا قیام اور وہاں کے عمق قری اساتذہ سے ان کا استفادہ اس پر مستزاد۔“

”مولانا موصوف سے میری پہلی ملاقات شعبہ عربی، جامعہ عثمانیہ میں ہوئی۔ نورانی متمسم چہرہ اور اندازِ تکلم ان کی خاندانی

مقدمہ قصیدتان رائعتان پر ایک نظر

اور غم کا اظہار کیا جائے کم ہے لیکن قدرت نے اس زخم کے لیے ایک ایسا مرہم شفا بھی عطا کر دیا ہے جو ہر زہر غم کا تریاق ہے۔ جہاں رحلت، وفات اور انتقال کے تصور نے ہمیں غم حال کر دیا ہے، وہیں شہادت کے لیے وعدہ الہیہ کا خوشگوار تصور تسکین قلب کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ شہادت ایک ایسا راستہ ہے جو کہیں سے کج گنج نہیں ہے، سیدھا جنت الفردوس کو جاتا ہے، پھر سرکارِ غوثیت کے احاطے میں موفون ہونے کا شرف نور علی نور:

ایں دولت سرمد ہند کس رائد ہند

فاضل بدایونی نے چند ماہ پیشتر مجھ سے فون پر کہا تھا کہ انھوں نے سیدنا اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دو قصیدے مدائح فضل الرسول اور حمائد فضل الرسول کا تحقیقی جائزہ لیا ہے، اسے ایک نظر دیکھ لیجئے تاکہ طباعت کا مکمل شروع کیا جائے، چند روز کے بعد خواجہ بکڑ پو سے مسودہ کا پرنٹ آؤٹ مجھے ملا اور یہ پیغام بھی کہ اس کی طباعت آپ کے دیکھ لینے کے بعد ہی ہوگی، میں اپنے سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات کی وجہ سے مواد کا مطالعہ نہ کر سکا، تاہم فون کے ذریعے خیالات کا تبادلہ ہوتا رہا، میری تاثراتی تحریر بروقت نہ پہنچ سکی، وقتاً فوقتاً ٹیلی فونی رابطہ کو غنیمت سمجھ لیا گیا اور تحقیقی جائزہ مترجم قصائد کے ساتھ شائع ہو گیا۔

امام احمد رضا کے دونوں قصائد جو حضرت سیف اللہ المسلمول مولانا شیخ فضل رسول رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مدح میں کہے گئے ہیں، قصائد کے نام ”مدائح فضل الرسول“ اور ”حمائد فضل الرسول“ حضرت امام کے رکھے ہوئے ہیں، جن سے ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتا ہے لیکن دونوں قصائد کے مجموعے کا نام ”قصیدتان رائعتان“ حضرت امام کا رکھا ہوا نہیں ہے، قیاس کہتا ہے کہ اگر وہ اس مجموعے کا نام رکھتے تو اس سے بھی

یہ مختصر تحریر گرامی منزلت، شیخ علام مولانا سید الحق قادری کی خواہش کی تکمیل کی کوشش ہے، جس کا اظہار موصوف نے بغداد مصلیٰ کی حاضری سے پہلے فون پر ایس ایم ایس کے ذریعے اور خواجہ بکڑ پو، دہلی کے مولانا غلام حسن کے توسط سے کیا تھا۔

فضیلۃ الشیخ علامہ سید بدایونی علیہ الرحمہ ہمارے درمیان نہ رہے، مذہبی، علمی اور شعری وقتی دنیا ایک عظیم سپوت سے محروم ہو گئی، مرحوم نے چالیس برس سے کم عمر میں قوم و ملت کے لیے جو جاہر پارے چھوڑے ہیں اس سے یہ اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں کہ اس بطل جلیل کی طبع رواں چالیس کی عمر پار کر کے معورہ علم و فن کو کیسے کیسے گہائے رنگ رنگ سے آباد کرتی۔

حیف!

خوش درخشد و لے دولت مستعجل بود

میں حیران ہوں، بغداد مصلیٰ کی حاضری میں یہ حادثہ پیش آیا، وہی سرکارِ غوثیت جس کے بارے میں سیدی امام احمد رضا فرماتے ہیں:

عطفًا عطفًا عطفوں عبدالقادر

راقا راقا راقا رؤف عبدالقادر

اے آنکہ بدست تست تعریف امور

اصرف عنا الصروف عبدالقادر

یہ سب کچھ محو اثبات پر تصرف کرنے والے آقا کے نورِ نظر کے سامنے ہوا، وہشت گرد اپنے منصوبے میں کامیاب رہے، یہ خدائی بعید ہے، ہماری فہم سے ماوراء ہے، بہت تھا کاٹنے سے دماغ پھٹ جائے گا، کیا معلوم شیخ بدایونی نے بارگاہِ غوثیت میں کیا استغاثہ کیا تھا۔

شیخ بدایونی کی رحلت نہ صرف خانوادہ عثمانی بدایونی کے لیے بلکہ پوری دنیا کے علم و حکمت کے لیے ایک عظیم المیہ ہے اور اس پر جتنا رنج

انھوں نے کوئی واقعہ سنایا جس میں کسی شخص پر بہت مظالم کیے گئے تھے۔ اس کی تعبیر کے لیے انھوں نے کہا کائنات حسبہ فی سجن ابو غریب یعنی گویا کراسے ابو غریب جیل میں قید کر دیا گیا ہو۔ اس وقت تو بات ہنسی میں آئی گئی ہوئی مگر چند ماہ بعد میں نے یہی محاورہ اسی معنی میں مصر کے موثر روزنامہ ”الابرار“ میں پڑھا۔

اپنے موضوع سے اس قدر جذباتی لگاؤ اور وقتی وابستگی کی مثال آج ہمارے طلبہ تو کچھ اساتذہ میں بھی خال خال ہی ملے گی۔ اس خوبی کے علاوہ مصنف کے علمی انکسار اور تحقیق دیانت داری کا ذکر بھی ضروری ہے جس کا اظہار ”کچھ کتاب کی ترتیب کے بارے میں“ کے زیر عنوان شامل کی گئی تحریر سے ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے محاورات کے مأخذ و درج کیے ہیں، ان سے متعلق مثالوں کے تعلق سے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ بعض مثالیں شعبہ اردو، جامعہ ازہر کے استاد ڈاکٹر ابراہیم نے نظر ثانی کے دوران لکھ دی تھیں لیکن ”توسید و تمییز کے مراحل کے دوران سب مثالیں آپس میں گنڈم ہو گئیں، اب یہ نشان دہی مشکل ہے کہ ڈاکٹر ابراہیم صاحب کی لکھی ہوئی مثالیں کون کون سی ہیں ورنہ میں اس کا حوالہ ضرور دے دیتا۔“

آگے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ بیس بچیس مقامات پر مختلف ادبا کی کتابوں سے محاورات پر مشتمل عبارتیں نوٹ کر کے شامل کی گئی ہیں لیکن حوالہ اس لیے نہیں دیا جاسکا کہ نوٹ کرتے وقت کتاب ترتیب دینے کا خیال ذہن میں نہیں تھا لہذا مصنف اور کتاب کا نام نوٹ نہیں کیا جاسکا۔ چنانچہ اگر کسی کو میری درج کردہ مثال کسی ادیب کی کتاب میں مل جائے تو اس کو سرفہ نہ سمجھا جائے۔

زیر نظر کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ (۱) مقدمہ اور (۲) فرہنگ امثال۔ دونوں حصوں میں مصنف کی علمی جستجو، تحقیقی نظر اور باریک بین نگاہ کا سحر قاری کو ہر وقت باندھے رکھتا ہے۔ محاورات کی تاریخی و سماجی پس منظر اور ان پر تہذیب و تمدن کے اثر سے متعلق مدلل گفتگو کے علاوہ عربی اردو محاورات کا تقابلی جائزہ اور با محاورہ ترجمے میں احتیاط کے ذیلی عنوانات کے تحت کی گئی بحث اور اس میں پیش کردہ مثالوں سے عربی وارد کے طلبہ..... بقیہ صفحہ 131 پر ملاحظہ کریں

اور ذاتی علمی وجاہت کی گواہی دے رہا تھا۔ عربی زبان اور بالخصوص محاورات کے سلسلے میں ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف اسید الحق ہی نہیں بلکہ اسدِ الادب بھی ہیں۔“

زیر نظر کتاب کے مقدمے میں مصنف نے محاورہ کیا ہے اور اس کی درست و جامع تعریف کیا ہو سکتی ہے، اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور متعدد مصادر سے استفادہ کرتے ہوئے فرہنگ آصفیہ اور فیروز اللغات میں درج تعریفوں سے اختلاف بھی کیا ہے اور محاورہ، ضرب المثل میں ہونے والے خلط بحث پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے موضوع سے انصاف کرنے کی خاطر انھوں نے عربی مصادر کے حوالے بھی درج کیے ہیں اور قاری کی سہولت کی خاطر عربی اقتباسات کا سلیس اردو ترجمہ بھی درج کیا ہے۔

عربی محاوروں کے تعلق سے ان کی یہ تحقیق ہمارے علم میں اضافے کا باعث ہے کہ محققوں نے انھیں چار زمروں میں تقسیم کیا ہے: (۱) قرآنی محاورے (۲) قدیم محاورے (۳) جدید محاورے (۴) معرب محاورے۔ ان چاروں اقسام پر مولانا سید الحق نے سیر حاصل روشنی ڈالتے ہوئے جو مثالیں درج کی ہیں وہ ان کی عربی دانی، قرآن فہمی، وسعت علمی اور اپنے موضوع پر مکمل گرفت کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا سید الحق مصر میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے اس موضوع کے سحر میں اس قدر گرفتار ہو گئے تھے کہ درسی وغیر درسی کتب، اخبارات و رسائل یہاں تک کہ اساتذہ و طلبہ کی گفتگو میں بھی عربی محاوروں کی جستجو کرنے اور انھیں حافظے یا نوٹ بک میں محفوظ کرنے کے عمل میں سرگرم رہا کرتے تھے۔ اپنے اس تاثر کی تائید میں انھیں کے ایک مشاہدے سے آپ کو رو برکراؤں تو بہتر ہوگا۔ فرماتے ہیں:

”۲۰۰۳ء میں عراق پر قبضے کے بعد امریکی فوجیوں نے ابو غریب نامی جیل میں عراقی فوجیوں کو قید کر دیا۔ اسی درمیان ابو غریب جیل سے ایسی ویڈیو سامنے آئیں جن میں امریکی فوجیوں کو عراقیوں پر انسانیت سوز مظالم کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ بین الاقوامی میڈیا میں اس کا بہت چرچا رہا۔ اس زمانے میں مصری دارالافتاء میں تربیت افتا کا کورس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر احمد کمال اصول فقہ کا درس دیتے تھے۔ دوران درس

تاریخ نظم برآمد ہوتی، تاہم یہ نام بہت اچھا تجویز ہوا ہے۔ تجویز کنندہ کے باشد، سب سے پہلے میں حضرت امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کی بارگاہ میں نذرانہ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ آپ نے دونوں قصائد کے لیے جس بحر کا انتخاب کیا ہے یہ خالص تازی الاصل ہے، اہل فارس اور اہل ہند کے طابع سے اس کے زحافی اوزان کی موزونیت میل نہیں کھاتی، مگر عرب شعرا کا کلام اس بحر کے اسی زحافی وزن میں سب سے زیادہ دیکھا گیا ہے۔

پہلا قصیدہ جو بحر کامل میں ہے اس کے تعلق سے فاضل بدایونی رقم طراز ہیں:

”بحر کامل میں چھ تعلیمات ہوتے ہیں۔ تین پہلے شعر میں اور تین دوسرے شعر میں اس کا پورا وزن یوں ہے:

مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ
مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ

پہلے شعر کا آخری تفعیلہ عروض کہلاتا ہے اور دوسرے شعر کا آخری تفعیلہ ضرب کہلاتا ہے۔“

اسی کے ساتھ فاضل راقم نے ایک نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ:

”بحر جز اور بحر کامل میں نہایت باریک فرق ہے کیونکہ بحر جز

میں مندرجہ ذیل چھ تعلیمات ہوتے ہیں:

مُسْتَعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ
مُسْتَعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ

اس باریک فرق کی وضاحت یہ ہے کہ بحر کامل کے رکن متفاعِلُنْ کا حرف ثانی ساکن ہو جانے کی صورت میں مُتَفَاعِلُنْ، مُتَفَاعِلُنْ ہو جاتا ہے، جسے اہل عروض معروف عروضی وزن مُسْتَعِلُنْ سے بدل دیتے ہیں۔ یہ زحافی صورت جس کا اصطلاحی نام ”زحاف اضماع“ ہے، بحر کامل میں عام ہے، اس بحر میں اگر کوئی تفعیلہ مُسْتَعِلُنْ پر تقطیع ہو تو نہ صرف جائز ہے بلکہ دیگر زحافات کے بالمقابل مستحسن ہے، لیکن بحر جز کے جو تعلیمات ہیں ان میں سے کوئی تفعیلہ متفاعِلُنْ پر تقطیع نہیں ہوگا۔ فاضل بریلوی کا قصیدہ نوہ بحر کامل میں ہے، اس کی ضرب میں ایک اور زحاف کو راہ لی ہے جو اہل عرب میں نہایت مطبوع ہے لیکن فارسی اور اردو میں یہ زحافی شکل غیر مطبوع ہے عروض کی کتابوں میں

جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ محض تفہیم کے لیے ہیں، کوئی باضابطہ قصیدہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔ فاضل بدایونی نے اس قصیدہ کا اصل وزن واضح کرتے ہوئے بطور مثال ایک شعر کی تقطیع کی ہے، کیونکہ پورا قصیدہ (باستثنائے چند دیگر زحافات) اسی وزن پر تقطیع ہوتا ہے۔

تَبْکِی دَمْنِ / اَوْ تَقُولُ فِی / اَسْجَاعِہَا
مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ
اللّٰہُ بَضْ / حَلْکَ مَن مِّنْ / اَبْکَانِی
مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ

جائزہ نگار نے واضح کر دیا ہے کہ پہلے شعر کی ضرب میں (یعنی ”ذَنّ الحِمَامِ اَرَحْ“ میں) زحاف اضماع قطع واقع ہے، یہ تمہیما ہے لیکن اگر عروضیوں کے تعامل کے پیش نظر اضماع کی صورت میں مُتَفَاعِلُنْ کو مُسْتَعِلُنْ اور مُتَفَاعِلُنْ کو مُسْتَعِلُنْ لکھا جاتا تو درست ہوتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا بحر کامل سالم میں زحاف اضماع عرب شعرا میں عام ہے اور ان کے طابع کہیں سے بھی اس کی موزونیت میں کھٹک محسوس نہیں کرتے لیکن فارسی اور اردو شعرا کے طابع میں اس کی موزونیت غنائیت کو کسی حد تک متاثر ضرور کرتی ہے، مثلاً یہ شعر:

نہ ہوئی کبھی مجھ سے خطا نہ ہوا کرو مجھ پر خفا
نہ دیا کرو تم گالیاں نہ کیا کرو مجھ پر جفا

پہلا مصرعہ متفاعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ پر اور دوسرا مصرعہ بھی متفاعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ / مُتَفَاعِلُنْ / مُسْتَعِلُنْ پر تقطیع ہوتا ہے جو کسی طرح بھی غلط نہیں ہے، لیکن غور کیجیے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک نبض تواتر کے ساتھ چلتے چلتے دو مقامات پر سکون کا وقفہ قدرے بڑھا کر آگے بڑھ رہی ہے، طابع اور مزاج کے اسی اختلاف کی وجہ سے عربی بحر کے بہت سے مزاحف اوزان، فارسی اور اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ بحر کامل کا یہ قصیدہ نوہ اپنے زحاف اضماع قطع کی وجہ سے فارسی اور اردو میں غیر مطبوع ہے اور عربی میں شائع و ذائع ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں ”باستثنائے چند“ سے اشارہ کیا گیا، قصیدے کی ہر ضرب مُتَفَاعِلُنْ (مفعول) پر قطع نہیں ہوتی بلکہ بہت سی ضربیں فِعْلَانُنْ کے وزن پر ہیں بلکہ رکن مُتَفَاعِلُنْ میں جب زحاف قطع آتا ہے تو وہ اصلاً فِعْلَانُنْ ہی ہوتا ہے، کیوں کہ رکن کے آخر سے و تہ مجموع کے ایک حرف متحرک کو

ساقط کرنے سے یہ زحاف پیدا ہوتا ہے۔ یہاں متفاعِلُنْ کے عِلْنِ کا عین متحرک ساقط کرنے سے مُتَفَاعِلُنْ کی شکل بنی، جسے فِعْلَانُنْ سے تبدیل کیا گیا۔ اب اس مقطوع کو جب مضمر بنایا گیا، یعنی دوسرے متحرک حرف کو ساکن کیا گیا تو فِعْلَانُنْ ہوا جس کی تبدیل شدہ شکل مفعول ہے۔ اب اگر پورا قصیدہ نوہ کو ملاحظہ کیا جائے تو ہر شعر کی ضرب یا تو فِعْلَانُنْ سے تقطیع ہوگی یا مفعول سے اور یہ زحافات قصائد عرب میں شائع و ذائع ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا تازیوں کے یہاں بحر کامل سدس ہے لیکن فارسی اور اردو میں اہل عروض نے اسے مشمن بھی بنالیا ہے اور زحاف اضماع ہر ایک کے یہاں جائز ہے۔ قصائد عرب میں تو مجھے ایک قصیدہ بھی ایسا نظر نہیں آیا جس میں زحاف اضماع پایا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر مرتبی کا مطلع ہی بحر کامل مضمر سے شروع ہوتا ہے:

يَا لَانْمِیْ کَف الملام عن الدی
اضناه طول سقامه و شقانه

اس کے بعد ہر دو تین شعر کے بعد زحاف مضمر نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں میں فاضل بریلوی کے کمال فن کو بدیہ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ جہاں عربی دواوین میں بحر کامل کا کوئی قصیدہ اس زحاف سے خالی نہیں ہے، وہیں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دو نعتیہ کلام جو حدائق بخشش حصہ اول و دوم میں ہیں ان میں سے ایک نعت شریف ۱۶ اشعار پر اور دوسری ۲۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ دونوں بحر کامل سالم مشمن میں ہیں اور ۳۳ مصرعے میں سے ایک مصرعہ میں بھی زحاف اضماع واقع نہیں ہوا ہے۔ ان میں سے ایک نعت کا مطلع ہے:

وہ کمال حسن حضور ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں
اور دوسری نعت کا مطلع ہے:

نظراک چمن سے دو چار ہے نہ چمن چمن بھی نثار ہے
عجب اس کے گل کی بہار ہے کہ بہار بلبل زار ہے
بحر کامل سالم مشمن کی دونوں نعتوں میں سارے الفاظ پورے تواتر کے ساتھ آگے کی طرف رواں دواں ہیں۔

فاضل بدایونی کے تحقیقی جائزے کا وہ حصہ نہایت وقیع ہے جس

میں زیر نظر قصائد پر نحو لغت یا عروض وقوفی کی جہت سے فاضل بغداد ڈاکٹر رشید عبیدی کی بعض تنقیدات کا جواب دیا ہے۔

فاضل بدایونی نے فاضل بغدادی کے تعارف میں لکھا ہے کہ موصوف نے جامعہ بغداد سے بی اے، جامعہ القاہرہ ازہر سے ایم فل اور وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور فنون ادبیہ کی مختلف شاخوں پر کم و بیش ۵۰۰ تحقیقی مقالات اور مضامین قلم بند کیے۔ تین شعری دیوان اپنی یادگار چھوڑے، یہ اپنی جگہ، لیکن فاضل بغدادی کی تنقیدات اور فاضل بدایونی کے جوابات کو دیکھتے ہوئے قارئین کو یہ فیصلہ کرنے میں تامل نہیں ہوگا کہ میدان علم و تحقیق کا معرکہ سر کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ خانودا عثمانی بدایوں شریف کے علوم و معارف کی آغوش کا پروردہ ہے جسے فضیلتہ الشیخ اسید بدایونی کہتے ہیں۔

۲۰۱۳ء

یہاں طول کلام سے بچتے ہوئے ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر عبیدی سے ایک عجیب فنی و عروضی معاملہ ہوا، انھوں نے درج ذیل شعر میں العینان کو عین کا متضیہ قرار دیا:

تسقى فتشقى ثم تشقى بالنعنا
وتفلق الاکباد والعینان

ڈاکٹر عبیدی نے عینان کو متضیہ قرار دینے کے باوجود لہجات عرب کا سہارا لیتے ہوئے اور فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حسن ظن قائم رکھتے ہوئے دفع و غل مقدر کیا ہے۔ تاویل عبیدی کی ضرورت یوں ہوئی کہ العینان حالت جری میں ہے، الف کے ساتھ لکھنا خلاف قاعدہ ہے۔ فاضل بدایونی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ جب خود فاضل بریلوی نے العینان کی یا پرز برنگا یا ہے تو پھر اس کو عین کا متضیہ قرار دینے کی طرف ناقد کی توجہ منعطف ہوئی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اس کے بعد العینان کی لغوی تحقیق کر کے اور خود مصنف قصیدہ کی مرقومہ عبارت نقل کر کے، مسئلہ بے غبار کر دیا ہے۔ یہاں میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر عبیدی جیسے عالم و فاضل اور زبان و لہجہ پر گہری نظر رکھنے والے کو یہ دھوکا کیسے ہوا اور مصنف قصیدہ نے جو العینان کی یا پرز برنگا یا ہے اس کے باوجود انھوں نے العینان کو ساکن کیوں پڑھا؟ ڈاکٹر عبیدی کی علمی استعداد کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ سوال از خود قائم

احادیث قدسیہ: ایک جائزہ

کتاب ابواب فقہیہ کے موافق مرتب ہے اور اس میں مذکور احادیث میں دودو صفتیں جمع ہیں۔ پہلی یہ کہ ساری احادیث، قدسیہ ہیں، دوسری یہ کہ سب حدیثیں مقبول یعنی صحیح و حسن ہیں لہذا یہ ہوں کہ لغیرہ۔

یہاں اس بات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج حدیث سے دل چسپی رکھنے والوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو احادیث ضعیفہ کو موضوع کے خانے میں ڈال دیتا ہے۔ ان احادیث کو شجرہ ممنوعہ قرار دیتا ہے اور ان پر عمل کرنا ناجائز و حرام تصور کرتا ہے، جب کہ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ لوگوں کو احادیث اور ان پر عمل سے دور کرنے کی ایک سازش ہے، اللہ ہمیں ایسے لوگوں سے محفوظ رکھے۔

احادیث ضعیفہ سے متعلق متقدمین و متاخرین علما کا ایک اجماعی موقف یہ ہے کہ فرض و واجب اور حرام امور احادیث ضعیفہ سے ثابت نہیں ہوتے، البتہ یہ احادیث فضائل و مکروہات میں مقبول ہیں۔ ہاں! سخت ترین ضعیف احادیث کے سلسلے میں بعض محدثین کا موقف اور بھی سخت ہے لیکن کسی نے بھی موضوع احادیث کی طرح ان کو کلام قرار نہیں دیا ہے۔ اس پر تفصیلی مطالعے کے لیے محمود سعید مدوح کی کتاب

”التعریف باوہام من قسم السنن الی صحیح و ضعیف“ (جلد ۱) دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ”کشف اللثام عن الاحادیث الضعیفہ فی الاحکام المعمول بها عند الانماء الاعلام“ از سعید بن عبدالقادر بھی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

میں نے یہ گفتگو اس لیے کی تاکہ احادیث صحیحہ کا مطالعہ کرنے والے قارئین اس طرح کے نجان میں مبتلا نہ ہوں کہ احادیث ضعیفہ کا ذخیرہ لغو و بے اصل ہے۔

”عرض مرتب“ کے بعد دو مقدمے ہیں۔ پہلا مقدمہ مصنف

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (الحشر: ۷) رسول تمہیں جو بھی حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں رک جاؤ۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: يَتْلُوْا عَنِّيْ وَكُلُوْا آيَةً (سنن الترمذی) کوئی ایک بات بھی سہی، لوگوں تک میری طرف سے پہنچاؤ۔

قرآن وحی متلو ہے جب کہ سنت وحی غیر متلو، ان کی خدمت ہی اصل میں اسلام کی خدمت ہے، ان کے پیغام کو عام کرنا، ان سے مسائل استنباط کرنا، ان کو بعینہ صورت میں امت تک پہنچانا، ان کی شرح و معانی بیان کرنا، یہ سب خدمات کی مختلف شکلیں ہیں۔ اخلاص کے ساتھ ساری خدمات اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری علیہ الرحمہ نے موجودہ عام روش سے اوپر اٹھ کر اسلام اور سنت کی عظیم خدمات انجام دیں۔ مولانا کی خدمات جن فنون میں خاص کر نمایاں رہیں، ان میں حدیث و علوم حدیث بھی ہیں۔ انہوں نے اس فن کے جملہ شعبہ جات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان ہی خدمات کی ایک کڑی ”احادیث قدسیہ“ بھی ہے۔

یہ کتاب دو گراں قدر مقدمے اور تقریباً سوا احادیث قدسیہ پر مشتمل ایک سوا سی صفحات کو محیط ہے۔ مقدمہ سے پہلے مصنف علیہ الرحمہ نے ۳ صفحات پر ”عرض مرتب“ کے نام سے ایک تحریر قلم بند فرمائی ہے، جس میں لکھا کہ ایک عرصے سے حدیث پاک کی کسی خدمت کی خواہش تھی جس کا نکلہ توفیق الہی اس مجموعہ احادیث قدسیہ کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کے بعد آپ نے اس مجموعے کی ترتیب و تدوین میں درپیش دشواریوں کا ذکر کیا اور ترتیب میں اپنے طریقہ کار، اسلوب اور منہج کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

رائخان کی اشاعت ہو چکی تھی، آئندہ اشاعت میں کچھ ترمیمات کا ارادہ غام کیا تھا، اگر وہ ہمارے درمیان ہوتے تو مجھے یہاں لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی مولانا نے جس حذف و ترسیم کا مشورہ قبول کیا تھا ان میں سے یہ بھی تھا۔

(۱) اشعار کی تقطیع ہمیشہ معروف وزن کے ساتھ کی جاتی ہے جب زحافات سے رکن میں تبدیلی ہوتی ہے تو ہمیشہ ان ٹکڑوں کو معروف وزن میں تبدیل کر لیا جاتا ہے، مثلاً مفاعیلن پر جب خرم کا عمل ہوگا یعنی و تہ مجموع کا پہلا حرف گر جائے گا تو ماقبی فاعیلن ہوگا، اسے مفعولن سے بدلا جائے گا، یونہی متفاعیلن پر جب اضمار کا عمل ہوگا تو یہ متفَاعِلِمْ ہو جائے گا اسے مستفعلن سے بدل دیا جائے گا۔ وغیرہ

(۲) تحقیقی جائزے میں بحر کامل بحر وکی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ ”ہر شعر میں تین کی بجائے صرف دودو تقطیعات ہی ہوں“ یہاں تک تو صحیح ہے لیکن اس کے بعد کی عبارت، ”یعنی عروض اور ضرب دونوں حذف کر دیے جائیں“ صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایک شعر کی تشکیل صدر ابتدا اور عروض و ضرب سے ہوتی ہے، اس کے درمیان کے تقطیعات حشو کہلاتے ہیں، اس لیے کوئی شعر صدر و ابتدا اور عروض و ضرب کے بغیر شعر ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ الفاظ دیگر ایک شعر میں کم سے کم چار رکن کا ہونا ضروری ہے۔ دور کن مصرع اولیٰ میں اور دور کن مصرع ثانی میں۔

پہلے مصرعے کے دور کن یہ ہیں، صدر و عروض، پہلا رکن صدر کہلاتا ہے اور دوسرا رکن عروض۔ اسی طرح دوسرے مصرعے کے دور کن یہ ہیں، ابتدا و ضرب، اس دوسرے مصرعے کے پہلے رکن کو ابتدا اور دوسرے رکن کو ضرب کہتے ہیں، اس کے درمیان کے جتنے ارکان ہیں وہ سب کے سب حشو کہلاتے ہیں۔

(۳) بحر کامل میں زحاف و قص کو تجزیہ نگار نے عیب قرار دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے، کوئی زحاف معیوب نہیں ہوتا، بلکہ یہ بحر کے مختلف اوزان کی تشکیل میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ فاضل بریلوی کے ان دو قصائد میں سے کسی میں یہ زحاف واقع نہیں ہوا ہے، یہ اس لیے نہیں کہ عیب ہے بلکہ اس لیے کہ اس زحاف کا یہ محل نہیں ہے۔

□□□

☆ T-181، سیکنڈ فلور، ماڈل ہسٹی، جمیلان روڈ، نئی دہلی

ہوتا ہے۔ میرے خیال میں مصنف قصیدہ کا حاشیہ یا بین السطور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر تھا، ان کی نظر عینان کے زبر پر بھی پڑی ہوگی، مگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ شاید یہ زبر ہو کا تب ہے، اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ زیر نظر شعر میں عینان کی نیتوں متحرک واقع ہوئے ہیں، جب کہ اس قصیدے کے آگے پیچھے کے اشعار میں نیتوں متحرک نہیں ہیں۔ یہ الفاظ دیگر، دیگر اشعار کی ضرب مفعولن سے تقطیع ہو رہی ہے۔ عینان کی کی اس تقطیع میں فٹ نہیں ہو رہی ہے۔ غالباً اسی تصور نے ڈاکٹر عبیدی کو اسے صیغہ تشبیہ قرار دینے پر مجبور کیا۔ پھر بھی انہوں نے حسن ظن قائم رکھا اور لہجہ عرب کے سہارے مصرع کو غیر موزوں قرار دینے سے احتراز کیا۔

میں نے پچھلی سطور میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس قصیدے کی ضرب میں مفعولن اور فعاتن دونوں زحافوں سے کام لیا گیا ہے اور دونوں یکساں جائز اور شائع و ذائع ہیں بلکہ زحاف قطع جس سے متفاعلن سیدھا فعاتن ہوتا ہے، بلا واسطہ ہے اور مفعولن کا زحاف متفاعلن میں غزل و تسکین سے حاصل ہوتا ہے اور شعر زیر نظر کی ضرب میں یہی فعاتن (تحرکات ثلاث) واقع ہے۔

جیسے علامہ شیخ عبداللہ بن محمد صالح خزرجی کے درج ذیل شعر میں:

و حباه من جم الفضائل والمکا

دم ماتکل بوصفہ الشفتان

اس کا مطلع یہ ہے۔

حمدا لفاتح جملة الانسان

شرفا بطه المصطفى العدنان

پہلے شعر کی ضرب فعاتن کے وزن پر ہے اور مطلع میں عروض و ضرب دونوں مفعولن کے وزن پر ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے یہ دونوں قصائد شعری و فنی اعتبار سے شاہکار ہیں اور فاضل بدایونی نے جو تحقیقی تجزیہ پیش کیا ہے یہ داد و تحسین سے بے نیاز ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ مولانا شیخ اسید الحق ہمارے درمیان نہ رہے ان سے عراق کی حاضری سے پہلے فون پر خیالات کا تبادلہ ہوتا رہا، بعض امور کی طرف میں نے انہیں متوجہ کیا تھا، تحقیقی تجزیہ کے ساتھ قصیدتان

نے خود تحریر کیا ہے جس کا عنوان ”احادیث قدسیہ“ ایک تفصیلی مطالعہ دیا جاسکتا ہے جب کہ دوسرا مقدمہ مصنف کے رفیق دیرینہ مولانا منظر الاسلام ازہری نے سپرد قلم کیا ہے، جو اصل میں صفات باری تعالیٰ، تشبیہ اور علما کی آرا پر ایک طویل مقالہ ہے جس کا عنوان ”احادیث قدسیہ اور صفات باری“ دیا گیا ہے۔ پہلا مقدمہ درج ذیل چند ذیلی سرخیوں کے تحت لکھا گیا ہے جن سے مقدمے کی افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

حدیث قدسی کا معنی اور تعریف: اس کے تحت متعدد علما کے اقوال نقل کیے گئے ہیں جو مفہوم و معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں، اگرچہ ان کے الفاظ و تعبیرات مختلف ہیں، یعنی حدیث قدسی وہ ہے جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ سے روایت کریں۔

یہاں پر ایک شبہ کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس کا ازالہ کیا گیا ہے۔ شبہ یہ ہے کہ جب تمام احادیث رسول بھی اللہ ہی کی جانب سے ہیں تو پھر صرف احادیث قدسیہ ہی کو وحی الہی سے ماخوذ قرار دینا کہاں تک درست ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ درست ہے کہ احادیث قدسیہ اور غیر قدسیہ دونوں منجانب اللہ ہوتی ہیں، لیکن باقی حدیثوں کے مقابلے میں احادیث قدسیہ اس لیے ممتاز ہوتی ہیں کہ ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ (ص: ۱۵)

یہاں پر عام قارئین کے ذہن میں ایک دوسرا خطرہ گزر سکتا ہے، جس کا ذکر کر کے تذکر کرنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ احادیث قدسیہ دوسری احادیث کے مقابلے میں زیادہ قوی اور اعلیٰ و افضل ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ تمام احادیث اللہ ہی کی جانب سے ہیں، فرق صرف نام میں ہے کہ ایک کو صراحۃً یا اشارۃً نام لے کر کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جب کہ دوسرے میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی لیے دونوں کے درجات میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم اور احادیث قدسیہ میں فرق: اس کے تحت بڑی ہی جامعیت کے ساتھ اصولی و فروعی فرق کی ایک فہرست شمار کرائی گئی ہے۔

حدیث قدسی کی اقسام: اس کے تحت اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب قول و فعل کا صراحۃً و کنایۃً اور ضمناً ذکر کے اعتبار سے اقسام کو بڑی ہی خوبی کے ساتھ مع مثال بیان کیا گیا ہے۔

احادیث قدسیہ کی تعداد: اس بارے میں یہ تحریر ہے کہ اس کی

تعداد بہت ہی کم ہیں جو ۸۵۳ سے زائد نہیں ہیں اور سند کی صحت پر بحث کی جائے تو یہ تعداد بہت ہی کم رہ جاتی ہیں۔

احادیث قدسیہ کے موضوعات: اس حوالے سے ایک سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان موضوعات میں کوئی شرعی قوانین یا احرام و حلال وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس ضمن میں ۱۵ احادیث قدسیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک سرخی ”موضوع احادیث قدسیہ“ کے نام سے قائم کی گئی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ:

”جن اسباب کی خاطر حدیثیں وضع کی گئیں ان میں ایک سبب ترغیب و ترہیب بھی تھا۔۔۔۔۔ جب حدیثیں گڑھنے کا چلن شروع ہوا تو احادیث قدسیہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہیں اور لوگوں نے بہت سی حدیثیں گڑھ کر احادیث قدسیہ کے نام سے پھیلا دیں۔“ (ص: ۳۹)

یہ اتفاق کہیے کہ مصنف نے مثال میں تین احادیث قدسیہ ذکر کیں اور تینوں حدیثیں صوفیہ کے یہاں مقبول ہیں جب کہ مولف کا گھرانہ ہندوستان میں ایک ممتاز صوفیانہ گھرانہ ہے، نیز علمی، تحقیقی، تنقیدی اور تصنیفی و تالیفی میدان میں بھی اس گھرانے کا ملک گیر نہیں عالم گیر شہرہ ہے۔ اسی لیے مولف کو اس پر خطر راہ سے بچنے کے لیے ایک نوٹ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آپ لکھتے ہیں:

”ضمنی طور پر یہ اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ یہاں گفتگو بطریق محدثین ہو رہی ہے، فی الحال صوفیوں اور ان کا معیار رد و قبول کے سلسلے میں صوفیائے کرام کا اپنا ایک الگ مزاج و مذاق ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ صوفی کی صحیح قرار دی ہوئی حدیث محدثین اور ناقدین فن کے نزدیک بھی صحیح ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ محدثین نے جس حدیث کو موضوع قرار دیا ہو وہ صوفیائے نزدیک بھی موضوع ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔“ (ص: ۴۱)

ایک محقق اس طرح کی باتیں کہہ کر اپنا دامن بچا سکتا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھ جیسا ایک ادنیٰ طالب علم، خطبا اور عام مسلمان ان احادیث کے متعلق کیا رویہ اختیار کریں؟ کیا ان احادیث کو

موضوع سمجھ کر رد کر دیں یا بلا چون و چرا ان کو قبول کر لیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ ان احادیث سے متعلق درمیان کا راستہ اختیار کیا جائے تو مناسب ہوگا وہ یہ کہ تحریر و تقریر میں استدلال کے وقت صرف آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ پر اکتفا کیا جائے، کیوں کہ ہمارے قارئین و سامعین میں ہر مذہب و مسلک کے لوگ ہوتے ہیں، صرف صوفی یا تصوف سے محبت کرنے والے لوگ نہیں ہوتے۔ کلموا الناس علی قدر عقولہم لیکن دوسری جانب صوفیہ کی بیان کردہ احادیث کو کبھی بھی رد نہ کیا جائے بلکہ تصوف، زہد اور تزکیہ کی محفلوں میں اپنے مخاطب کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں ضرور بیان کیا جائے۔

رہی بات تحقیق کی تو اس ضمن میں ہم دو طرح کی باتیں کر سکتے ہیں: ایک یہ کہ جس طرح ہم صوفیہ کے بہت سارے اقوال و اشعار سے ان کی تاویل و تشریح میں پڑے بغیر حظ اٹھاتے ہیں اور آیات و تفسیلات کی طرح یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتے ہیں کہ اس کے صحیح معنی و مصداق کو وہی لوگ جانیں، ٹھیک اسی طرح ہمیں ان احادیث سے استفادہ کرنا چاہیے اور یہی بات اس کے ثابت ہونے یا نہ ہونے کی تو وہ صوفیہ جانیں۔ دوسری یہ کہ جس طرح صوفیہ کے منہج پر کلام کیا جاسکتا ہے، اسی طرح محدثین کے منہج پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔ راقم الحروف نے اس موضوع پر خضر راہ کے شمارہ اگست ۲۰۱۳ء سے مئی ۲۰۱۴ء تک (جنوری کے علاوہ) متعدد عنوانات کے تحت ایک تفصیلی بحث کی ہے جس کو اہل تنقید و تحقیق پڑھ سکتے ہیں۔ اس بحث کو آگے بڑھا سکتے ہیں اور نئی راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

اس مقدمے کی آخری بحث ”احادیث قدسیہ پر بعض اہم کتابیں“ کے عنوان سے کی گئی ہے جس میں احادیث قدسیہ پر لکھی گئی چند نمایاں کتابوں پر ایک جامع تعارف و تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ پورا مقدمہ آسان اور علمی اسلوب میں مواد سے پر ہے، علما و طلبہ سب کے لیے لائق مطالعہ ہے۔

اس کتاب پر ایک دوسرا مقدمہ مولانا منظر الاسلام ازہری نے تحریر کیا ہے، یہ مقدمہ کیا ہے، دراصل ایک پیچیدہ کلامی مسئلے پر صحیح موقف پیش کرنے کی کوشش ہے۔ بہت سارے اسکالرز کے فکری قبیلے کی سمت درست کرنے کی تنگ و دو ہے۔

قرآن و احادیث خاص کر احادیث قدسیہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ایسے تعبیرات و الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس سے عام مخلوق سے مشابہت کا گمان ہوتا ہے جیسے یہ، قدم، نزول وغیرہ، جب کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس سے منزہ و پاک ہے کہ وہ کسی مخلوق کے مشابہ ہو۔ اس مسئلے کو مسئلہ تشبیہ کہا جاتا ہے اور ان الفاظ و تعبیرات کو تشابہات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا منظر الاسلام نے چار نظریات بیان کیے ہیں:

(۱) تقویٰ: اس نظریے کو سلف کا عقیدہ کہا جاتا ہے، یعنی ان آیتوں اور حدیثوں کا معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

(۲) تاویل: ان آیتوں اور حدیثوں کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، تاہم الفاظ و قرآن اگر اجازت دیں تو ان کا ایسا معنی بیان کیا جاسکتا ہے، جو شریعت کی روح کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ عقل سلیم کے موافق ہو۔ یہ نظریہ علمائے متکلمین میں اشاعرہ و ماتریدیہ کا ہے۔

(۳) تجسیم و تشبیہ: ان الفاظ و تعبیرات تشابہہ کو اپنے معنی حقیقی پر ہی محمول کیا جائے، اس کے ماننے والوں کو مشبہ اور مجسمہ کہا جاتا ہے۔

(۴) اثبات، مخالف تاویل: ان الفاظ و تعبیرات تشابہہ کو ثابت مانا جائے، یعنی جہاں یہ ہے وہاں یہ ہی مانا جائے مگر وہ انسانی يد کی طرح نہیں۔ یہ لوگ کسی بھی طرح کی تاویل کے مخالف ہیں۔ اس نظریے کے قیام بعض محدثین اور شیخ ابن تیمیہ ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہی نظریہ اسلاف و متقدمین کا ہے۔

ان دونوں مقدمے کے بعد صفحہ ۸۷ سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۳ عنوانات، ۱۰۱ ذیلی عناوین اور کمرار کے ساتھ ۱۰۴ احادیث پر مشتمل ہے، ترتیب اچھی ہے، ترجمہ تشریحی اور عام فہم ہے، حوالے میں جلد، صفحہ یا رقم کی جگہ باب اور فصل کا انتخاب بھی بہت پسند آیا، یہ علمی طرز ہے، خاص کر اس زمانے میں جب کہ روزانہ ان کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ احادیث کی عربی عبارتوں پر اعراب لگا ہوتا تو طلبہ اور عوام سب تلاوت حدیث کے ثواب سے بھی محروم نہ ہوتے۔

□□□

☆ استاذ جامعہ عربیہ اسلامیہ، کوشاھی، ڈالہ آباد (پوٹی)

فرزدق تمیمی کا قصیدہ ممیہ: ایک جائزہ

ہر دل عزیز و اعلا و خطیب، بہترین عالم و فاضل اور عمدہ محقق و ناقد غرض کہ بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتوں کے جامع تھے۔ زیر مطالعہ کتاب در اصل ماہ نامہ ”جام نور“ دہلی (اگست ۲۰۱۲ء) اور سال نامہ ”اہل سنت کی آواز“ (خصوصی شمار) میں شائع شدہ ان کے مضامین کا عمدہ مجموعہ اور کچھ معلومات کا اضافہ ہے۔

پس منظر اور خواب کی تعبیر:

مولانا اسید الحق قادری بدایونی شہید نے قیام ازہر کے دوران ایک تقریب میں ڈاکٹر فواد شاکر مصری کے خطاب میں قصیدہ ممیہ کے چند اشعار کو سنا، جس سے آپ کے اندر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اس قصیدے سے آپ کی یہ پہلی واقفیت تھی۔ چونکہ حضرت امام زین العابدین سے آپ کو غیر معمولی عقیدت و محبت تھی، اس لیے یہ اشعار فوراً ذہن نشین ہو گئے اور پھر کئی تقریری محافل میں ان کو والہانہ انداز میں پڑھتے رہے، لیکن عرس قادری (۱۳۳۳ھ/۲۰۱۱ء) کے موقع پر آپ نے دوران خطاب یہ اشعار پڑھے اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد آپ نے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر غور کرنے کے بعد اس قصیدے کا ترجمہ و تحقیق کی صورت میں عمل میں آئی۔

قصیدہ ممیہ کی تلاش و تحقیق:

شیخ موصوف کا تحقیقی ذوق اور علمی مذاق چونکہ اعلیٰ تھا، اس لیے آپ کو قصیدہ ممیہ کی تلاش و جستجو کی فکر دامن گیر ہوئی اور جلد ہی اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی اور کتب خانہ قادریہ بدایوں سے مکمل قصیدہ اور اس سے متعلق ضروری چیزیں فراہم ہو گئیں۔

اشاعت و مقبولیت:

آپ نے عربی زبان پر مشتمل قصیدہ ممیہ کا سلیس اور با محاورہ اردو زبان میں ترجمہ کیا اور پھر اسے حرکات و سکنات کا بھی جامہ پہنایا

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت اصل ایمان اور مدار نجات ہے اور اہل بیت اطہار سے محبت و عقیدت دینی و دنیاوی دونوں زندگیوں میں سعادت مندی و فیروز بختی کا واضح اشارہ۔ اولاد اطہار میں ایک ہارکات شخصیت حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے جن کی ذات ستودہ صفات سے نسل حسینی کی افزائش و ترقی ہوئی اور پوری دنیا میں پھیلی ہوئی۔

قصیدہ ممیہ ایک مدحیہ قصیدہ ہے جسے عہد بنو امیہ کے ممتاز شاعر ابوفراس فرزدق تمیمی نے حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات و شخصیت، صفات و کمالات، محامد و محاسن، اخلاق و عادات اور ان کی خاندانی نجابت و شرافت کو بڑی مہارت و عمدگی کے ساتھ منظوم شکل میں پیش کیا ہے اور گلستان نبوت کے اس گل سرسبد کی جامع کمالات و برکات ذات کا بہترین نقشہ کھینچا ہے، جو یقیناً زین السجاد حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتی و خاندانی کمالات سے والہانہ عقیدت و محبت کا زبردست اشارہ اور ایک بیش قیمتی سرمایہ ہے، یہ قصیدہ اہل علم و ادب کے نزدیک بڑی اہمیت و مقبولیت کا حامل ہے، یہی وجہ ہے کہ قصیدہ ممیہ سے ظاہری و باطنی حظ اٹھانے نیز اس کے فیضان و برکات کو عام کرنے کے لیے بلا کسی تفریق اہل سنت و اہل تشیع کے علما و محققین اور ادباء و شعرا نے کافی کوششیں کی ہیں جن کے ضمن میں مختلف زبانوں میں اس کے متعدد شروح و تراجم اور تجمیسات وغیرہ معرض وجود میں آئے۔

زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، جو حضرت شیخ اسید الحق قادری بدایونی علیہ الرحمہ کی قابل قدر تصانیف و تحقیقات میں سے ایک اہم تصنیف و تحقیق ہے، موصوف نو جوان علما و محققین میں امتیازی شان و حیثیت کے حامل تھے۔ آپ بیک وقت بے مثال حافظ و قاری،

اور کچھ ضروری چیزوں کو مضمون کی صورت عطا کر کے قارئین کی آسانی کے لیے اسے اور دل کش اور دل چسپ بنا دیا۔ سب سے پہلے یہ مضمون ماہ نامہ جام نور دہلی سے شائع ہوا اور پھر سال نامہ ”اہل سنت کی آواز“ مارہرہ (خصوصی شمار) میں حضرت زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات و شخصیت پر لکھے گئے مقالے کو بھی اس میں شامل کر دیا جس سے قصیدہ ممیہ کی اہمیت دو بالا ہو گئی اور حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات و مناقب پر ایک مستقل کتاب وجود میں آگئی۔ چنانچہ کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر رضاء الحسن لاہوری نے مکتبہ الاسلام لاہور سے شائع کیا، اس کے بعد تیسری بار اس کی اشاعت حال ہی میں ۲۰۱۳ء میں تاج الحول اکیڈمی بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔ اس طرح سے مضمون کا بار بار اشاعت پذیر ہونا دراصل اس کی افادیت اور مقبولیت کا واضح ثبوت اور شیخ موصوف کی علمی و تحقیقی صلاحیت کی قدر شناسی ہے۔

تعارف و تمہرہ:

زیر نظر کتاب کل ۴۸ صفحات پر محیط ہے۔ شروع میں دو صفحات پر مولانا اسید الحق قادری کے قلم سے ”ابتدائیہ“ ہے، پھر ڈاکٹر ممتاز احمد سیدی کی ایک مختصر اور معلوماتی ”تقریظ“ ہے، جس میں انہوں نے فرزدق کے جذبہ خلوص کی ترجمانی کرتے ہوئے قصیدہ ممیہ کی اہمیت و افادیت پر بہترین روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد ”تعارف و تمہید“ کے عنوان سے مصنف کی ایک مختصر تعارفی تحریر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت امام زین العابدین کی زندگی کے ضروری اور اہم گوشوں کو ۱۱ صفحات میں جمع کر دیا ہے، جو انتہائی گراں قدر، تحقیقی اور معلوماتی ہے۔ قارئین کے افادے کے لیے چند چیزوں کو بطور اختصار پیش کیا جا رہا ہے، ملاحظہ ہو:

”شب بیداری، عبادت گزاری اور جہد ریزی میں امتیازی مقام حاصل کرنے کی وجہ سے آپ ”زین العابدین“ اور ”زین السجاد“ کے لقب سے یاد کیے گئے۔ آپ کی والدہ مورخین کے مطابق بادشاہ فارس یزدگرد کی تیسری صاحبزادی تھیں، والدہ کا نام سلامہ یا سلافہ یا غزالہ ہے“ (ص: ۱۳) حضرت امام حسن کے تین صاحبزادوں کا نام علی ہے، تینوں

میں امتیاز کے لیے علی اکبر، علی اوسط اور علی اصغر کہا جاتا ہے اور امام زین العابدین علی اوسط ہیں۔“ (ص: ۱۴) اسی طرح مصنف نے میدان کربلا میں حضرت امام زین العابدین کی عدم شہادت کے حوالے سے ایک لطیف امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”سناخیز کربلا کے وقت آپ کا بیمار ہو جانا اور جنگ میں شرکت نہ کرنا اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم مصلحت اور حکمت تھی؛ کیوں کہ امام حسین کے صاحبزادوں میں صرف آپ ہی باقی رہے اور اور نسل حسینی آپ ہی کے ذریعے آگے بڑھی، اگر خدا نخواستہ سرزمین کربلا میں آپ شہید ہو گئے ہوتے تو حضرت امام حسین کا سلسلہ اولاد منقطع ہو جاتا“ (ص: ۱۴-۱۵)

اس کے بعد فرزدق تمیمی کی شخصیت کا تعارف ہے۔ فرزدق کی عظمت کے اظہار کے لیے نغیوں کا درج ذیل قول نقل کیا ہے کہ ”اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو عربی زبان کا تہائی حصہ تلف ہو جاتا۔“ لیکن اس کے باوجود فرزدق کی اخلاقی پستی اور نازیبا کردار و عمل کے بارے میں اکثر مورخین کا اتفاق ہے، چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے مصنف رقم طراز ہیں:

”تقریباً سبھی مورخین کا اتفاق ہے کہ ”وہ ایک برا شخص تھا۔ اس کے اخلاق گھٹیا تھے۔ فسق و فجور کا عادی اور عیاشی کا دل دادہ تھا۔“ (ص: ۲۴)

لیکن آپ نے مذکورہ قول پر جو تبصرہ پیش کیا ہے، بلاشبہ وہ آپ کی انسانی اقدار کی پاس داری، عمدہ خانقاہی تربیت کی غمازی اور صوفیانہ مزاج کی صحیح عکاسی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ”آدمی عملی طور پر کتنا ہی برا کیوں نہ ہو مگر کبھی بھی اس کے اندر ایمانی اور اسلامی حیت بیدار ہو ہی جاتی ہے“ (ص: ۲۴)

قصیدہ کوئی کا سبب:

قصیدہ ممیہ نظم کرنے کا سبب فرزدق کے اندر اہل بیت سے بے کمال عقیدت اور حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بے پایاں محبت ہے۔ بنو امیہ کے عہد حکومت میں فرزندان توحید مختلف دیار و امصار سے حج بیت اللہ کے لیے جس سال جمع ہوئے تھے اسی سال

خلیفۃ المسلمین کا فرزند ہشام بن عبد الملک، عہد اموی کا ممتاز شاعر فرزدق تہمی اور گلستان نبوت کا گل سرسبد حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر ہوئے تھے۔ ہشام بن عبد الملک اپنی شاہ زادگی کے نشے میں چور اور دنیاوی کردار میں مغرور ہو کر یہ آسانی جگر اسود کو بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھا؛ لیکن لوگوں نے انہیں کوئی اہمیت ہی نہیں دی، جس سے انہیں غمت و سکی محسوس ہوئی اور پھر کچھ دیر بعد ازہام میں دھکے کھانے کی وجہ سے جگر اسود کو بوسہ دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور خود ہی مطاف کے کنارے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اسی درمیان جب حضرت امام عالی مقام کے تحت جگر حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحن کعبہ میں قدم رنجہ ہوئے تو بھیڑ فوراً ختم ہو گئی اور آپ نے اطمینان و سکون کے ساتھ جگر اسود کو بوسہ دے کر طواف کا آغاز کیا اور جس طرف سے بھی گزرتے، لوگ ادباً و احتراماً ہٹ جاتے۔ ہشام کے ہمراہ لوگوں کے لیے یہ منظر انتہائی حیرت انگیز تھا۔ ان میں سے کسی نے بادشاہ ہشام سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے حضرت امام کو جاننے کے باوجود تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے توہین آمیز لہجے میں کہا کہ ”میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟“ ہشام کے قریب ہی فرزدق تہمی کھڑا تھا جو عہد بنو امیہ کا ایک ممتاز اور قد آور شاعر تھا، اس کو حضرت امام کی اہانت برداشت نہیں ہوئی اور کہا کہ ”میں جانتا ہوں“ شامی شخص نے کہا ”بتاؤ کون ہے؟“ چنانچہ انہوں نے حضرت امام زین العابدین کی شان و برکت اور ان کی خاندانی شرافت و بزرگی کو اپنی فن کارانہ صلاحیت سے برجستہ ایک مدحیہ قصیدہ ۳۰ اشعار پر مشتمل نظم کر دیا، جو آج اہل بیت اطہار سے محبت رکھنے والے اور شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے دونوں کے یہاں بے حد مقبول و محترم ہے۔ قصیدہ ہمیہ کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

هذا الذي تعرف البطحاء وطائه
والبيست يعرفه والحل والحرم
اور انتہا اس شعر پر ہوتی ہے:

يستدفع الشر والبلوى بحهم
ويستزبد به الاحسان والكرم
فرزدق کے تعارف کے بعد ہشام بن عبد الملک کا ذکر ہے، جو

ابو الولید ہشام اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کا بیٹا تھا۔ یہ انتہائی ذہین و زیرک تھا اور اہل علم کی صحبت پسند کرتا تھا۔ اپنے بھائی عبد الملک کی وفات کے بعد تقریباً ۳۴ رسال کی عمر میں تخت خلافت پر بیٹھا اور ۱۹ برس ۷ یا ۸ ماہ حکومت کی۔ قیصریہ الروم، حجرہ اور حرسہ کو فتح کیا اور ۱۲۵ھ میں اس نے وفات پائی۔

قصیدہ ہمیہ کا تعلق جائزہ:

شارح و محقق نے قصیدہ ہمیہ کی پیش بہا معلومات اور اس میں واقع اختلافات کا زبردست انکشاف کیا ہے اور دلائل و براہین سے بحث و تحقیق کر کے اس کا علمی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔

اختلاف کی نوعیت:

قصیدہ ہمیہ کے بارے میں ارباب علم و ادب اور اصحاب تاریخ و سیرت کے مابین واقع اختلافات و روایات کی نوعیتیں مختلف ہیں، جن میں قصیدے کا متن، قصیدے کا شاعر، اشعار کی تعداد و ترتیب وغیرہ شامل ہیں، چنانچہ حضرت مصنف نے ان کو اجمالی طور پر واضح فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

”یہ اختلاف قصیدے کے شاعر اور ممدوح دونوں کے بارے میں ہے، جن لوگوں نے اس کو ثابت مانا ہے، ان میں اکثر اہل علم کا ماننا ہے کہ یہ قصیدہ فرزدق کا ہے جو امام زین العابدین کی شان میں کہا گیا تھا، بعض حضرات نے قصیدے کی نسبت حزن کنائی کی جانب کی ہے، مگر قصیدے کا ممدوح امام زین العابدین ہی کو قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے اس قصیدے کے دو شعروں کو حزن کی جانب منسوب کر کے ان کا ممدوح عبد اللہ بن عبد الملک کو قرار دیا ہے، بعض حضرات نے قصیدے کے شاعر کی حیثیت سے تو فرزدق کا ذکر کیا ہے مگر قصیدے کا ممدوح امام زین العابدین کی بجائے ان کے والد امام حسین کو قرار دیا ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ قصیدہ جریر کا ہے، بعض نے کہا کہ یہ قصیدہ کثیر کا ہے جو اس نے امام زین العابدین کے صاحبزادے امام محمد باقر کی شان میں کہا تھا۔“ (ص: ۲۸)

اس کے بعد شیخ موصوف نے ۱۳ اقوال کو معتبر و مستند کتابوں کے

حوالے سے پیش کیا ہے اور پھر ان سے کچھ اہم نتائج و ثمرات کو اخذ کیا ہے اور ٹھوس دلائل کی روشنی میں اس کو چھ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ قارئین کی معلومات میں اضافے کی غرض سے پیش خدمت ہیں، ملاحظہ ہو:

الف: محدثین، مؤرخین اور ادبا کی ایک بڑی جماعت (جس میں حافظ ابن کثیر جیسے محتاط مؤرخ اور حضرت شیخ محقق جیسے محقق شامل ہیں) نے قصیدے کے شاعر کی حیثیت سے فرزدق اور ممدوح کی حیثیت سے امام زین العابدین کو تسلیم کر کے اس واقعے کو کثرت سے نقل کیا ہے۔

ب: امام طبرانی کی جس روایت سے قصیدے کے ممدوح امام حسین قرار پاتے ہیں، اس روایت پر حافظ ابن کثیر اور شیخ محقق کی تنقید برحمل اور مقول ہے۔

ج: المصعب زبیری، آمدی، ابن تیمیہ اور ابوالفرج اصفہانی نے حزن کی طرف پورا قصیدہ منسوب نہیں کیا بلکہ صرف دو اشعار کا انتساب کیا ہے اس قصیدے کے باقی اشعار کو فرزدق سے منسوب کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں شعر فرزدق کے قصیدے کے نہیں ہیں، غلطی سے اس میں درج ہو گئے ہیں، جیسا کہ ابوالفرج اصفہانی کا موقف ہے۔

د: یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ کوئی احادیث مبارکہ یا حلال و حرام کا معاملہ نہیں ہے، جس کے لیے روایت و درایت کا وہ سخت معیار برتا جائے جو احادیث رسول ﷺ کے رد و قبول میں برتا جاتا ہے، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کا تعلق تاریخ ادبیات سے بھی ہے۔ اگر عام تاریخی واقعات اور ادبی شہ پاروں کے رد و قبول میں بھی روایت و درایت کا وہی سخت معیار برتا جائے تو تاریخ اور ادب دونوں کا قافیہ تنگ ہو جائے گا۔

ه: قصیدے کے متن، اشعار کی ترتیب اور تعداد میں اختلاف روایت کو اس کے خلاف دلیل نہیں بنایا جاسکتا؛ کیوں کہ ایسا اختلاف روایت صرف اسی قصیدے میں نہیں ہے بلکہ ادب جاہلی اور ادب اسلامی دونوں کے بہترین شعری اور نثری شہ پاروں میں اس قسم کا اختلاف روایت موجود ہے، جو ماہرین

کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔
و: قصیدے کی زبان، اسلوب، آہنگ، لہجہ اور پرواز خیال کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو فرزدق کی دیگر شعری کاوشوں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ (ص: ۳۳)

مذکورہ تحریرات و بیانات سے اہل علم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کو تحقیقی ذوق اور کثرت مطالعہ کس قدر حاصل تھا۔

آپ نے قصیدہ ہمیہ سے متعلق دیگر ضروری چیزوں کی بھی دریافت کی ہے، چنانچہ آپ نے قصیدہ ہمیہ کا منظوم ترجمہ اور اس کی تخریص و شرح کی تحقیق کر کے ان کا سراغ لگایا ہے۔ چنانچہ آپ نے مولانا عبد الرحمن جامی کی ”سلسلۃ الذہب“ جو بطور مشنوی ۶۸ اشعار پر مبنی قصیدہ ہمیہ کا منظوم فارسی ترجمہ ہے، کی تحقیق کی ہے اور ساتھ ہی آغاز بزرگ طہرانی کی کتاب ”الدریۃ الی تصانیف الشیعہ“ میں قصیدہ ہمیہ کی تخریص کرنے والے پانچ درج ذیل شیعہ شعرا کا تذکرہ کیا ہے:

(۱) الشیخ محمد بن اسماعیل ابن خلفہ

(۲) السید ابوالفتح نصر اللہ بن الحسین الموسوی الحائری

(۳) السید راضی بن السید صالح قزوینی النعمی

(۴) مصطفیٰ بن الجواد الخالصی

(۵) الشیخ درویش علی البغدادی۔

اس کے بعد آپ نے ایک کتاب ”کتاب خانہ شیعہ“ کے حوالے سے قصیدہ ہمیہ کی درج ذیل شروع کا سراغ لگایا ہے:

(۱) شرح قصیدۃ الفرزدقۃ الہمیۃ: مرزا ابو الحسین بن حسین جبیلانی (۲) شرح قصیدۃ الفرزدق: سید علی خان مدنی (۳) شرح قصیدۃ الفرزدق: فاضل علی رضا تبیان الملک رضائی (۴) شرح قصیدۃ الفرزدق: ملا علی قاری آزاد قزوینی (۵) شرح قصیدۃ الفرزدق: قاسم رسائی بن حسین مشہدی (۶) شرح قصیدۃ الفرزدق: مرزا محمد بن سلیمان تنکابنی (۷) شرح قصیدۃ الفرزدق: محمد شفیع بن محمد علی استرآبادی (۸) شرح قصیدۃ الفرزدق: محمد بن طاہر ساوی۔

قصیدہ کے اشعار مرویہ کی تعداد کے بارے میں بہت اختلاف ہے، آپ نے اس کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

”جن حضرات نے قصیدہ نقل کیا ہے، ان کی نقل میں اشعار کی تعداد اور ترتیب دونوں کے بارے میں اختلاف ہے، یاقینی نے مراۃ البیان میں ۲۵ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں ۲۷ اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ۲۸ اشعار درج کیے ہیں، جب کہ دیوان فرزدق میں ۲۷ اور مولانا جمیل احمد بکرامی کی شرح ”درقصید“ میں ۲۹ اشعار ہیں۔“ (ص: ۳۸)

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

”ان تمام کتابوں میں وارد اشعار کو یکجا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدے کے اشعار مرویہ کی مجموعی تعداد ۳۰۳ ہے، سب سے زیادہ (۲۹) اشعار درقصید میں ہیں، لہذا ہم اسی کو اصل بنا کر اس میں درج کردہ متن اور ترتیب کے مطابق یہاں قصیدہ درج کر رہے ہیں۔ مختلف کتب میں منقول قصیدے کے متن میں بھی بعض جگہ اختلاف ہے مگر یہ اختلاف صرف چند اشعار کے چند الفاظ میں ہے اور یہ اختلاف بھی اکثر جگہ ہم معنی الفاظ کی حد تک ہے۔ اس سے شعر کے عمومی معنی و مفہوم پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔“

زیر نظر کتاب اگرچہ ایک مختصر معلومات پر مشتمل ہے تاہم یہ اپنی جامعیت و معنویت میں انتہائی اہم اور قابل مطالعہ ہے، حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عربی دانی، ترجمہ نگاری اور تحقیقی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ محقق و تنقید کے معاملے میں انصاف و دیانت کے دامن کو نہیں چھوڑا ہے اور نہ ہی کسی ناقد و محقق کو یوں ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ خود اپنے ہی امر میں اصول تحقیق میں یہ کس قدر محتاط ہیں، اس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

”اصول تحقیق کا تقاضا ہے کہ ترجمے کے ذیل میں ان وجوہ بلاغت اور اسرار معانی کی طرف بھی اشارہ کیا جائے مگر یہ طویل عمل بھی ہے اور ایک اردو داں قاری کے لیے غیر ضروری بھی، اس لیے ہم یہاں اس سے صرف نظر کر رہے ہیں۔“ (ص: ۳۸)

تحقیقی دیانت و خصوصیت:

آپ نے قصیدہ ممیہ سے متعلق ضروری حوالے نقل کرنے اور

دلائل کا انبار لگانے کے باوجود برملا یہ اعتراف کیا ہے:

”مندرجہ بالا شروح و تفسیلات میں سے کسی تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی، لہذا ان پر کوئی تبصرہ یا ان کا کوئی تعارف پیش نہیں کیا جاسکتا۔ درج بالا کتب کے علاوہ اس سلسلے کی تین کاوشیں ہماری دسترس میں آئی ہیں۔“

اس ضمن میں انہوں نے

(۱) شرح قصیدہ ممیہ از مولانا جمیل احمد بکرامی

(۲) تحفیس قطب الدین فی مدح سیدنا زین العابدین

(۳) الخمیس المقبول فی مدح ابن الرسول

کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ان پر جامع و مختصر انداز میں اچھوتا تبصرہ بھی کیا ہے، یہ تینوں کتابیں کتب خانہ قادریہ بدایوں میں موجود ہیں۔

قصیدہ ممیہ کی عروضی حیثیت:

آپ کو عروض و قوافی پر بھی بڑی گہری نظر تھی۔ قصیدہ ممیہ کا عروضی جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”عروضی حیثیت سے یہ قصیدہ بحر بسیط میں ہے، عربی قصیدے کے جو عناصر ترکیبی ہیں یعنی تشبیب، مگریرہ و غیرہ وہ اس میں نہیں ہیں؛ کیوں کہ یہ ایک خاص موقع پر برجتہ کہا گیا تھا اور اس وقت صرف مدح مقصود تھی۔ اس لیے اس میں تشبیب وغیرہ نظم نہیں کی گئی، ایسے قصیدوں کو اصطلاح میں ”مقضب“ کہتے ہیں۔“ (ص: ۳۸)

حاصل یہ ہے کہ زیر نظر کتاب ”فرزدق تہمی کا قصیدہ ممیہ: ایک تحقیقی مطالعہ“ جہاں علم و تحقیق اور زبان و بیان کے اعتبار سے اہم، قارئین کے لیے قصیدہ ممیہ کے معانی و حقائق سے استفادے کا ذوق پیدا کرنے میں مؤثر اور اہل بیت اطہار سے غایت عقیدت کا درس پیغام ہے، وہیں یہ علمی و تحقیقی اسلوب، عمدہ پیرایہ بیان اور شستہ اور آسان زبان میں گراں قدر پیش کش ہے، جس سے یقیناً مصنف کے عربی زبان و ادب پر عبور، علوم مختلفہ پر نظر، ترجمہ نگاری پر یدِ طولی اور تحقیق و تلاش کا خاص ملکہ اور کثرت مطالعہ وغیرہ خوبیاں صفحات میں نمایاں ہیں۔ □□□

☆ پرنسپل: الجامعۃ الاسلامیہ، جیت پور، نئی دہلی

(۹)

اظہار غم

مجالس تعزیت

شہید بغداد کے ایصالِ ثواب اور اعتبارِ غم کے لیے منعقد مجالس کی فہرست

شہید بغداد، مقبول ہر گاہ غوثیت حضرت اعلیٰ شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت پر ملک و بیرون ملک ایک کھرام ہوا گیا جس نے جہاں سنا، سراپا حیرت و غم بن گیا، سب اپنے اپنے طور پر شہید مرحوم کے لیے دعائے رحمت و غفران کرنے لگے اور پھر ہر ادارے، مدرسے اور خانقاہ میں تعزیت اور ایصالِ ثواب کی محفلیں منعقد ہونے لگیں اور اخبارات میں تعزیتی خبریں شائع ہونے لگیں، اس حوالے سے کچھ اہم تعزیتی مجلسوں کی فہرست ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔ آنے والے شمارے میں ان کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوگی۔ واضح رہے کہ تعزیتی مجلسوں کی جو خبریں ہم تک پہنچ سکی ہیں، یقیناً ان کے علاوہ بہت سی خبریں ایسی ہوں گی جو ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ ہم شہید بغداد کے تمام محبین کے شکر گزار ہیں۔ (ادارہ)

مرکزی مجلس قادریہ	حیدرآباد (دکن)	سید شاہ مشاہد اللہ حسنی، مولانا سید مشاہد پاشا مولانا سید حامد حسین حسان فاروقی، خواجہ شاہ محمد شجاع الدین افتخاری سید قمر شاہ شاہجہاں پوری، قاری حبیب اختر شاہدی، مولانا غلام قادر، مولانا قاری شفیق سید شاہ رفیق اللہ حسینی، ڈاکٹر سید شاہ مخدوم محمد الدین قادری، مولانا سید شاہ توفیق اللہ حسینی، مولانا شاہ فصیح الدین نظامی مولانا محبوب عالم اشرفی مولانا شیخ عبدالرحمن ازہری مولانا خالد رشید فرنگی بھٹی حضرت شیخ راشد علی مینائی مفتی محمد رضا مصباحی، مولانا غلام رسول دہلوی، مولانا محمد عرفان ازہری واساتذہ پروفیسر خواجہ اکرام الدین ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر شاہد اختر و دیگر اراکین مولانا محمد مجاہد حسین حبیبی جملہ اراکین جملہ اراکین حضرت سید محمد اشرف کچھوچھوی تمام اساتذہ و طلبہ مولانا امیر خسرو دارا کین سیمٹی مولانا محمد ابراہیم شافعی مفتی سید رضوان رفاہی، مولانا رحمت اللہ مصباحی، مفتی محمد مشتاق قادری مفتی محمد مشتاق قادری، مولانا قاری اظہر قادری قاری غفران مفتی محمد رضوان رفاہی مولانا ایوب اشرفی حضرت سید محبوب میاں قادری
بزم ادب	کانپور	
تنظیم عاشقانِ مصطفیٰ	حیدرآباد (دکن)	
دارالعلوم امام احمد رضا	حیدرآباد (دکن)	
فرنگی محل	لکھنؤ	
دارالعلوم شاہ مینا	لکھنؤ	
جامعہ حضرت نظام الدین اولیا	ڈاکر گڑ، اوکھلا (نئی دہلی)	
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان	جسولہ (نئی دہلی)	
آل انڈیا تبلیغ سیرت مغربی بنگال	کولکاتا	
تاج الفحول اکیڈمی شاخ کولکاتا	کولکاتا	
انجمن خدام قادری	کولکاتا	
آل انڈیا علماء و مشائخ بورڈ	نئی دہلی	
جامعہ اہلسنت صادق العلوم	شاہی مسجد، ناسک (مہاراشٹر)	
تنظیم پاسان سنت	منڈی ہزار، ورنگل (آندھرا پردیش)	
غوثیہ مسجد	وڈالہ، ناسک (مہاراشٹر)	
کھڑکالی مسجد	ناسک (مہاراشٹر)	
شاہجہانی مسجد	قسمت باغ، ناسک (مہاراشٹر)	
اجیری مسجد	نانگیوڑی پورہ، ناسک (مہاراشٹر)	
مسجد کوکئی پورہ	کوکئی پورہ، ناسک (مہاراشٹر)	
محدث اعظم مشن	بولٹن (انگلینڈ)	
قادری مسجد	سنگم نیر ضلع احمد نگر (مہاراشٹر)	

ادارہ/مسجد/خانقاہ/تنظیم	مقام	اہم شرکا
الاتحاد لو جوانان کیش	سنگریا، مغربی بنگال	مولانا شہباز عالم، مولانا شمس آغاز شمس اور مولانا حفیظ الدین و دیگر
جامعہ مرکز الثقافتہ السیدیہ	کالی کٹ (کیرالہ)	تمام اراکین مرکز
جامعہ غوثیہ رضویہ	سہارنپور (یوپی)	حکیم سید محمد احمد (بانی جامعہ) واساتذہ
مرکز سنی دعوت اسلامی	مالی گاؤں	مولانا سید امین القادری
جماعت اسلامی ہند	فیروز آباد	مولانا انعام اللہ اصلاحی، حامد علی فلاحی اور ڈاکٹر اتحاد عالم و دیگر
آستانہ شرافت	بریلی	الحاج ممتاز میاں دو ابٹنگان
تاج الفحول اکیڈمی	کیلاش نگر (دہلی)	مولانا یعقوب علی قادری، مولانا غلام حسن، ساجد حسین قادری
ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل	کراچی (پاکستان)	سید و جاہت رسول قادری، پروفیسر دلاور خان، ڈاکٹر مجید اللہ قادری، سید سلوٹ رسول قادری
خانقاہ اصدقہ	خضر پور کولکاتا	حضرت مشاہد اصدق
ہیڈ کوارٹر ورلڈ اسلامک سنٹر	اوکسفورڈ یونیورسٹی (انگلینڈ)	اراکین
جامعہ اسلامیہ	میراروڈ ایسٹ، تھانہ (مہاراشٹر)	مولانا اختر علی و اجداد قادری، محمد نذیر احمد رضوی
خانقاہ اشرفیہ حسیہ سرکار کلاں شاخ دہلی	بلہ ہاؤس (دہلی)	حضرت سید محمود اشرف اشرفی (سجادہ نشین)
الجامعۃ الاشرفیہ	مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)	جملہ اساتذہ و طلبہ

مسجد کشمی پورہ
قادری کمیٹی
دارالعلوم، قادری مسجد

ششم نیر ضلع احمد نگر (مہاراشٹر)
سیون پور ضلع کاس گج
ڈاکٹر ادا کھلا (نئی دہلی)

حضرت سید محبوب میاں قادری
مولانا محمد یاسر خان قادری
مولانا یونس اختر مصباحی، مولانا ضیاء الدین
خان مصباحی، مولانا ارشاد عالم نعمانی واساتذہ

مولانا غلام احمد قادری وارا کین
مولانا مبشر قادری وارا کین

مولانا انور قادری

ارا کین

مولانا عارف اشرفی

ارا کین

ارا کین

مولانا انور سہیل

حافظ ادریس قادری

ارا کین

ارا کین

ارا کین

ارا کین

مولانا محمد ایوب اشرفی

ارا کین

ارا کین

ارا کین

ارا کین

ارا کین

ارا کین

ارا کین

ارا کین

مولانا نسیم خان، مولانا نظام الدین

مولانا سید عبدالعلیم و دیگر

حافظ کریم الدین قادری و دیگر

ارا کین

اشتیاق ایوبی

پونہ
کھڑکی (پونہ)

پونہ

پونہ

پونہ

کوئٹہ (پونہ)

کیمپ (کوئٹہ)

پونہ

پونہ

پونہ

پونہ

پونہ

پونہ

کوئٹہ (پونہ)

پونہ

پونہ

پونہ

پونہ

ایم جی روڈ (پونہ)

پونہ

بیمبری (پونہ)

رشید پورہ (اورنگ آباد)

دولت آباد (اورنگ آباد)

رحمانیہ کالونی (اورنگ آباد)

پٹنہ (بہار)

نئی دہلی

روشن مسجد
جامع مسجد
منوشا مسجد

نشیان مسجد
بارہ امام مسجد
جامع مسجد

جامعہ القریش مسجد
قمر الدین مسجد
بھنڈار شاہ مسجد

بابا جان درگاہ
باقر قصاب مسجد
کمیلا مسجد

باغبان مسجد
جامعہ اشرفیہ
علاء الدین مسجد

سٹی جامع مسجد
موڈی خانہ مسجد
اہل بیت مسجد

جامع مسجد
پنشنین والا مسجد
جامعہ القریش مسجد

دارالعلوم غوث الوردی
درگاہ حضرت بہاء الدین شہزاری
درگاہ والی مسجد

قومی تنظیم
خانقاہ چشتیہ فریدیہ اسعدیہ

نوری مشن

مدارس البرکات

رضا جامع مسجد

رضا اسلامک مشن آف بہار

جامعہ صدیہ

قریش مسجد

خانقاہ عویشہ صدیقیہ

مدرسہ فیضان رضا

دارالعلوم محمدیہ

سنی دعوت اسلامی

دارالعلوم شاہ ولایت

دارالعلوم عویشہ رضویہ

دارالعلوم امام احمد رضا

جامعہ عارفیہ

مسجد فتح پوری

مدرسہ مظہر العلوم

سنی اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن

ادارہ قاضی شہر

مالیگاؤں

جامع مسجد بہار شریعت

کراچی (پاکستان)

لوہیا نگر، دہرا دون (یو کے)

سیتا موہی (بہار)

پچھوند شریف، ایٹھ (یو پی)

منماڑ (مہاراشٹر)

سہرام (بہار)

امرت نگر، تھانے (مہاراشٹر)

لال مسجد حسن پور، امر وہہ (یو پی)

بنگلور

ہدایوں

کورئی، باندہ (یو پی)

یا قوت پورہ (حیدر آباد)

سید سراواں، الہ آباد (یو پی)

نئی دہلی

لونی (نئی دہلی)

تھکوسرائے، سنجل (یو پی)

پورنیہ (بہار)

مولانا عبدالمبین نعمانی، مولانا غلام مصطفیٰ
رضوی، حافظ انیس الرحمن رضوی وغیرہ
محمد عارف برکاتی

سید اشرف حسین قادری
مولانا نسیم احمد مصباحی، مولانا حشمت امجدی
پوکھر روی، مفتی کلیم احمد مصباحی و دیگر

مولانا سید غلام الصمد میاں چشتی، مفتی انفاس
الحسن چشتی، مولانا ساجد مصباحی،
مولانا غلام جیلانی مصباحی و دیگر

مولانا شبیر اشرفی، مولانا مقصود قادری، حافظ
انوار اللہ قادری، غلام محمد خان قادری و دیگر

حضرت سید شاہ عارفین اصدق،
مولانا شہباز اصدق و دیگر

مفتی محمد شہروز مصباحی، مولانا عبدالمطلب،
مولانا عبدالمبین و دیگر

مفتی ثار احمد، مفتی غلام غوث ازہری،
مولانا یعقوب علی و دیگر

ارا کین

قاری عبدالرسول قاسمی برکاتی

مولانا نذیر حیات قادری، تبارک حسین فاروقی
خواجہ معز الدین اشرفی،
مولانا محبوب عالم اشرفی و دیگر

حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ چشتی،
مولانا ضیاء الرحمن طنمی، مولانا نذیر شان مصباحی،
مولانا مجیب الرحمن طنمی و دیگر

مفتی مکرم احمد نقشبندی
مفتی مکرم احمد نقشبندی

محمد علی ارمان رضا، محمد شارب فائز علی و دیگر

نئی دہلی

پورنیہ (بہار)

تعزیتی فون / ایس ایم ایس

حالم ربانی کی شہادت پر موصول ہونے والے چند اہم فون اور ایس ایم ایس

شہید بغداد، مقبول بارگاہِ غوثیت حضرت العلامہ شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت پر ملک و بیرون ملک ایک کھرام ہوا گیا، جس نے جہاں سنا، سراپا حیرت و غم بن گیا اور پھر شہید بغداد کے والد گرامی تاجدار اہل سنت حضرت مولانا شاہ عبدالحمید محمد سالم اتقادی، ان کے اہل خانہ اور اہل غم کے مدد کے لیے ملک و بیرون ہر طرف سے تعزیتی فون اور ایس ایم ایس آنے لگے۔ یاد رہے جانے والے چند اہم تعزیت کرنے والوں کی فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے۔ ان کے علاوہ ہم ان تمام حضرات کے بھی ممنون ہیں، جنہوں نے اس دل خراش سانحے پر فون یا ایس ایم ایس کیے اور ہمارے غموں کو بانٹنے کی کوشش کی۔ اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ (ادارہ)

- شہزادہ غوث اعظم حضرت سید پیر ہاشم الگیلانی (بغداد شریف، عراق)
- شہزادہ غوث اعظم حضرت سید عدنان توفیق الگیلانی (بغداد شریف، عراق)
- شہزادہ غوث اعظم حضرت سید سلمان الگیلانی (دبی)
- امین ملت حضرت پروفیسر سید امین میاں قادری برکاتی (سجادہ نشین: خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ)
- شرف ملت حضرت سید اشرف قادری برکاتی (چیف انکم نیٹس کمشنر، کولکاتا، بنگال)
- رفیق ملت حضرت سید نجیب میاں قادری برکاتی (سجادہ نشین: مسند نوریہ، خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ)
- حضرت مولانا سید سبطین حیدر قادری برکاتی (خانقاہ برکاتیہ، بڑی سرکار، مارہرہ مطہرہ)
- شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی (سجادہ نشین: آستانہ محدث اعظم ہند، کچھوچھو شریف)
- پروفیسر سید طلحہ رضوی برق (سجادہ نشین: خانقاہ نظامیہ چشتیہ، دانا پور، پٹنہ، بہار)
- حضرت سید شاہ آیت اللہ قادری (صاحب سجادہ خانقاہ مجیبیہ پھلواڑی شریف)
- حضرت سید عمار احمدی عرف نیر میاں (سجادہ نشین: خانقاہ شیخ العالم ردوئی شریف)
- حضرت سید شاہ ثقلین میاں قادری مجددی (سجادہ نشین: خانقاہ شرافتیہ، بریلی)
- حضرت سید شاہ گلزار میاں قادری (سجادہ نشین: خانقاہ اسماعیلیہ، مسولی شریف)
- مولانا غلام عبدالقادر علوی (سجادہ نشین: خانقاہ یار علویہ، براؤں شریف)
- حضرت سید اولیا حسینی پاشا قادری (قادری چمن، حیدرآباد، دکن)
- شیخ حازم تائف ابو غزالہ (مفتی اعظم، جورڈن)
- حضرت سید شاہ میاں (خانقاہ قادریہ، جیشہ شریف)
- حضرت سید آل علی نعیمی (ساڈھورا شریف)
- مولانا راشد رضا آسوی (سجادہ نشین: خانقاہ ابوالعلائیہ، اتروہ، ملرام پور)
- مفتی مطیع الرحمن مضطر پورنوی (بانی: جامعہ نوریہ، شام پور، اتر دیناج پور، بنگال)

خانقاہ وامتیہ نشاطیہ	شہامت منج بریلی	اسلم میاں وامتی، ظفر بیگ، محمود وامتی، اسلم وامتی، دانش وامتی
فلاح عام اسلامک اسکول مدرسہ عطائے فضل رسول	پنجابیان چورماہیلی بمیت آنولہ ضلع بریلی (یو پی)	ڈاکٹر مجاہد رضا، نجم الحسن قادری، مختتم رضا مولانا شاہ احمد و مولانا حنیف قادری، سید عزام قادری، حاجی جلال الدین
مدرسہ طبیب العلوم قادریہ جمیدیہ مدرسہ امین البرکات نورانی مسجد	آنولہ ضلع بریلی (یو پی) قصبہ سکندرہ راؤ	مولانا بادشاہ احمد و حافظ حشمت قادری قاری ضیاء الدین برکاتی، حافظ محمد اویس برکاتی، مولانا محمد یوسف برکاتی
مدرسہ شرافت العلوم	بدھ بازار	مولانا عبدالغفور، قاری محمد اشرفی، حافظ علی حسین اشرفی، حافظ ضمیر قریشی، مولانا عرفان وغیرہ حافظ محمد طاہر حسین، محمد یامین، حبیب احمد
مدرسہ شمس العلوم آل انڈیہ فنکارا کیڈمی تکیہ والی مسجد مسجد بروالی جامع مسجد آئینہ مسجد بیڑ والی مسجد محمدیہ عربک کالج ورلڈ اسلامک مشن مہمان محدث اعظم ہند رسول ہارغ دارالعلوم شمس العلوم	گھنٹہ گھر دایوں (یو پی) محلہ تاہر خاں سرائے، دایوں (یو پی) علی پور، دایوں (یو پی) محلہ سوچہ، دایوں (یو پی) گنور، دایوں (یو پی) کچہری روڈ ایولہ (مہاراشٹر) ایولہ (مہاراشٹر) آزادنگر، پورنیہ (بہار) گلاسکو (انگلینڈ) جدہ (سعودی عرب) ناسک (مہاراشٹر) گھوسی، مو (یو پی)	اراکین اراکین اراکین اراکین اراکین اراکین مفتی محمد زبیر صدیقی و دیگر مولانا فروغ القادری محترم جناب بشارت صدیقی حضرت سید معین میاں اشرفی، ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، مولانا ممتاز عالم مصباحی، ڈاکٹر محبت الحق قادری و دیگر شیخ حازم تائف ابو غزالہ (مفتی اعظم جارڈن) مفتی مطیع الرحمن مضطر رضوی، مولانا مسعود احمد پروفیسر سید طلحہ رضوی برق و دیگر مولانا انصار رضا و اراکین
دار القرآن (خانقاہ) جامعہ نوریہ خانقاہ نظامیہ چشتیہ غریب نواز فاؤنڈیشن مدرسہ رضاء العلوم مدرسہ حیات العلوم	جارڈن (عمان) شام پور، اتر دیناج پور (بنگال) شاہ ٹولی، دانا پور (بہار) نئی دہلی نئی دہلی کے گھر بلاک (بہار)	اراکین و اساتذہ قاری عبدالوکیل

□□□

- مولانا نسیم اختر مصباحی (بانی: دارالعلوم، اوکھلا، نئی دہلی)
- مفتی آل مصطفیٰ مصباحی (استاذ: جامعہ امجدیہ رضویہ، گھوسی منو)
- مولانا کوب نورانی اوکاڑوی (سولجر بازار، کراچی، پاکستان)
- ڈاکٹر شعائر اللہ خان وجہی (ایڈیٹر: ماہنامہ ضیائے وجہی، رام پور)
- سید صبیح الدین صبیح رحمانی (مدیر: نعت رنگ، کراچی، پاکستان)
- ڈاکٹر غلام زرقانی (ڈائریکٹر: جاز فاؤنڈیشن، بیوٹن، امریکا)
- مولانا منظر الاسلام ازہری (ڈائریکٹر: البیج اشٹی ٹیوٹ، تارتھ کیرو لینا، امریکا)
- مولانا مبارک حسین مصباحی (مدیر: ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ)
- مولانا سید نور الدین اصدق (مدیر: ماہنامہ جام شہود، پکی تالاب، بہادر شریف)
- مولانا سید کاظم پاشا قادری (قادری چمن، حیدر آباد، دکن)
- مولانا نفیس احمد مصباحی (استاذ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ)
- مولانا محمود احمد رفاقی (خانقاہ اشرفیہ، مظفر پور، بہار)
- مولانا سید قاسم اشرف کچھوچھو (کچھوچھو شریف)
- حضرت سید محمد عربی میاں (کچھوچھو شریف)
- مولانا شاہ کرونری (امیر: سنی دعوت اسلامی، ممبئی)
- مولانا ملک النظر مہسرای (مہتمم: مدرسہ خیریہ نظامیہ، بہرام، بہار)
- مولانا حنیف قادری نوری (صدر: امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی)
- حضرت سید معین الدین اشرف اشرفی البیلانی (ممبئی)
- حضرت سید خالد اشرف اشرفی (ممبئی)
- حضرت سید فرید اشرف اشرفی (ممبئی)
- حضرت سید نظام اشرف اشرفی (خطیب و امام: ذکر یا مسجد، ممبئی)
- حضرت سید معین اشرف اشرفی (ممبئی)
- مولانا فیضان اشرف اشرفی (خطیب و امام: ذکر یا مسجد، ممبئی)
- مولانا سید جامی اشرف (خانقاہ اشرفیہ، کھسبات، گجرات)
- ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی (کریم الدین پور، گھوسی، منو)
- مولانا جلال رضا ازہری (قاہرہ، مصر)
- ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی (علی گڑھ)
- انجینئر سید فضل اللہ چشتی (نئی دہلی)
- احمد جاوید (ایڈیٹر: انچارج: روزنامہ انقلاب، بہار)
- ڈاکٹر عبدالسلام جیلانی (استاذ: شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

- مولانا عارف اقبال مصباحی (مہتمم: دارالعلوم تاج الشریعہ، مدھونی، بہار)
- مولانا فیضان الرحمن سجانی (مہتمم: الجامعۃ الواحیدیہ، دربھنگہ، بہار)
- مولانا بشیر رضا قادری (احمد آباد، گجرات)
- ڈاکٹر نسیم عثمان صدیقی (کوآرڈینیٹر: البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی، علی گڑھ)
- ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی (جوائنٹ سکریٹری: البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی، علی گڑھ)
- مولانا معین اختر اعظمی (استاذ: دارالعلوم فیض الرسول، براؤن شریف)
- ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی (استاذ: پریسڈنسی یونیورسٹی، کولکاتا)
- مولانا ذیشان احمد مصباحی (استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد)
- مولانا اشرف الکوثر مصباحی (ریسرچ اسکالر: جامعہ طیبہ اسلامیہ، نئی دہلی)
- مولانا انیس احمد اشرفی (ممبئی)
- مولانا جاوید اختر مصباحی (گلبرگہ)
- مولانا عابد رضا مصباحی (جسید پور)
- حافظ شمس الحق رضوی (رضا ہوزری، لدھیانہ، پنجاب)
- مولانا ابراہیم قیصر فیضی (مہتمم: دارالعلوم محبوب سجانی، جسید پور)
- مولانا سترم علی رضوی (انچارج، تمل ناڈو)
- مولانا وقار احمد ندوی

- مولانا منظر محسن (پٹنہ)
- خطیب و امام: قادری مسجد، اوکھلا، دہلی
- عارف اقبال (ایڈیٹر: اردو بک ریویو، دریا سنج، نئی دہلی)
- سید نورین علی حق (کاپی ایڈیٹر: اردو نیوز جرنل، دور درشن، نئی دہلی)
- پروفیسر خواجہ اکرام الدین (ڈائریکٹر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)
- مفتی محمد ایوب اشرفی (بولٹن، انگلینڈ)
- مولانا غلام صدیقی رشیدی (دھباؤ، جھارکھنڈ)
- مولانا محمد منیر ازہری (جامعہ ازہریہ، قاہرہ، مصر)
- مولانا ابراہیم احمد امجدی (دارالعلوم امجدیہ ارشد العلوم، اوجھانج، بہتی)
- مولانا خولجہ ساجد عالم مصباحی (استاذ: مدرسہ لطیفیہ، رحمن پور، کٹیہار)
- پروفیسر اختر الواسع (چیف کمنٹر، اقلیتی لسانیات، حکومت ہند، نئی دہلی)
- بشارت صدیقی (جدہ، سعودیہ عربیہ)
- قاضی خطیب عالم (استاذ: دارالعلوم وارثیہ، بکھنؤ)
- مولانا عبید اللہ خان اعظمی (سابق ممبر پارلیمنٹ، نئی دہلی)
- مولانا ذوق المصطفیٰ امجدی (کولکاتا، بنگال)
- مولانا آصف علوی ازہری

(ناجیب مہتمم: دارالعلوم فیض الرسول، براؤں شریف)

• مولانا اشتیاق

(افریقہ)

• مولانا عبدالعلیم

(نیپال)

• مولانا غلام غوث علوی

(مہتمم: دارالعلوم مسکینیہ، دھوراجی، گجرات)

• الحاج محمد سعید نوری

(جنرل سیکریٹری: رضا اکیڈمی، ممبئی)

• حافظ محمد آصف مجددی

(پاکستان)

• مولانا سید محمد دپاشا قادری

(حیدرآباد)

• مولانا محمد راغب مصباحی

(جامعہ ازہر، قاہرہ، مصر)

• صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری

(صدر: ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی، پاکستان)

• بیرسٹر اسد الدین اویسی

(ممبر آف پارلیمنٹ، حیدرآباد، دکن)

• مولانا حبیب احمد

(رام پور، یوپی)

• مولانا قاری جنید

(استاذ: جامعہ قادریہ، ممبئی)

• مولانا خورشید عالم

(خطیب و امام، قصباتی محلہ، ممبئی)

• مولانا ذکوان ندوی

(نئی دہلی)

• ڈاکٹر سید علیم اشرف جاسی

(استاذ: شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

• پروفیسر یونس الحاسکر

(استاذ: ممبئی یونیورسٹی، ممبئی)

• پروفیسر فاروق احمد صدیقی

(سابق صدر: شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار)

• سید تالیف حیدر

(نئی دہلی)

• مولانا ارشاد عالم نعمانی

(ریسرچ اسکالر: جامعہ ہمدرد، نئی دہلی)

• مولانا صدر الورقی مصباحی

(استاذ: ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ)

• مولانا ممتاز احمد سیدی

(اسٹنٹ پروفیسر: منہاج یونیورسٹی، لاہور، پاکستان)

• محمد ثاقب رضا قادری

(لاہور، پاکستان)

• ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی

(جمیلیان روڈ، نئی دہلی)

• مولانا قمر احمد اشرفی

(ناظم: جامعہ اشرف، کچھوچہ شریف)

• ڈاکٹر افضل مصباحی

(استاذ: شعبہ اردو، ڈاکٹر ہری سنگھ گور یونیورسٹی، ساگر)

• محمد یامین انصاری

(نیوز ایڈیٹر: روزنامہ انقلاب، نئی دہلی)

• مولانا حافظ یعقوب علی خاں

(خطیب و امام: مسجد خلیل اللہ، ملہ باؤس، نئی دہلی)

• مولانا سید سیف الدین اصدق

(ڈاکٹر: پیغام اسلام، حسینی مسجد، ڈاکٹر نگر، جمشید پور)

• ڈاکٹر حفیظ الرحمن

(نئی دہلی)

□□□

(۱۰)

حدیث دل

حدیث دل

عالم ربانی مولانا شیخ اسحاق محمد مام قادری کا منتخب کلام

شہید بغداد، عالم ربانی شیخ اسحاق قادری بدایونی محدث، مفسر، محقق، خطیب، مصنف اور مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد لب و لہجہ کے بہترین شاعر بھی تھے۔ علامہ بدایونی نے معنی حیثیت سے شاعری کی ہے، تاہم جتنی بھی کی ہے وہ دنیا کے شعرو سخن میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ یہاں ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ادب و علم وادب ان کی اس حیثیت سے بھی متعارف ہو سکیں اور ان کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے۔ (ادارہ)

حمد یہ نعت

میں پہلے کوثر و تنیم سے وضو کر لوں
میں اپنی فکر رسا کو ادب شعار کر دوں
قلم کو سرحدِ ادراک سے گزرتا ہے
وہ رب کہ جس نے رسول کریم بھیجا ہے
رسول وہ جو رسولوں کا تاجدار ہوا
رسول وہ جسے محبوبِ کردگار کہیں
بہارِ گلشنِ جنت اسی کے صدقے میں
بنامِ قصرِ ولایت اسی کے صدقے میں
وہ جس کا مصحفِ رخِ پرتو صفات ہوا
وہ جس کی گردِ سواری ہے کہکشانِ فلک
وہ جس کے لب سے گلابوں نے ناز کی پائی

اسی رسول کے خالق کی حمد لکھتا ہوں

میں اپنی زیست کے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

□□□

نعت رسول ﷺ

جب تصور میں بسالیں آنکھیں
عرش پر ان کی سواری آئی
قدسیوں نے پے دیدار نمی
دیکھ کر تپش پائے انور
عمرِ رحمت میں تلاطم آیا
خاکِ طیبہ ہے خبردار قبر
اے اجل شوق سے آجا ہم نے
حشر میں سامنے ان کے عاصم
شرمِ عصیاں سے جھکالیں آنکھیں



سنا ہے لالہ طیبہ کی تازہ کاری کو
سنا ہے طیبہ کے ذرات ایسے روشن ہیں
خرامِ ناز پہ معش جہاں ٹھہرتی ہے
وہ بخش دیتے ہیں قدموں پہ گرنے والوں کو
لباسِ گل سے شگونے نکل کے دیکھتے ہیں
کہ مہر و ماہ انھیں آنکھ مل کے دیکھتے ہیں
فرشتے عرش کے پہلو بدل کے دیکھتے ہیں
سو ہم بھی قدموں پہ ان کے چل کے دیکھتے ہیں
اسیدِ لے پہ دیوانِ نعت رکھ دیجئے
جو اپنے نیک عمل آپ ہلکے دیکھتے ہیں

□□□

زُرخ مہر ہے یا مد لقا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
 حسن دبستان جنناں نیرنگی کون و مکاں
 ہے گلشنِ خلد بریں یا مسکنِ روح الامیں
 تابانی دُورِ عدن رخسائی لعل یمن
 تاج سر کسری کہاں پیشانی زہرہ کہاں
 برق جلال کبریا وہ لن ترانی کی صدا
 اوروں نے جب نفسی کہا اذھب الی غیری کہا
 مست مئے بغداد ہم ہے غوثِ اعظم کا کرم
 ہادی سا استاذِ زمن، منظور سا شیریں سخن
 تو عاصم مدحت سرا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
 طرزِ رضا کی پیروی عاصم یہ تیری شاعری
 حسن سخن، فکر رسا، یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

□□□

تمنا تھی کہ ہم بھی روضہ سرکار پر جاتے
 فرشتے عرش سے بہرِ سلامی آرہے ہوں گے
 ادب گاہِ پست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
 کسی کے بخت کی زلفیں سنواری جارہی ہوں گی
 کوئی دیوانہ سرکارِ نوکِ خارِ طیبہ سے
 بصارت کر رہی ہوگی طوافِ گنبدِ خضرا
 نکس کے نور سے تاروں نے دامن بھر لیے ہوں گے
 ادھر آقا نواسوں کا اتارا بانٹتے ہوں گے
 یوسیری، جامی و قدسی قصائد لکھ رہے ہوں گے
 کسی کی آنکھ میں اشکِ ندامت کی لڑی ہوگی
 کوئی سرمہ بنانا ہوگا خاکِ راہِ طیبہ کو
 صداقت کا، عدالت کا، سخاوت کا، شجاعت کا

جہاں پر عاشقوں کا آج کل میلا لگا ہوگا
 پر روح الامیں جارو پ روضہ بن گیا ہوگا
 جنید وقت بھی پاس نفس کر کے کھڑا ہوگا
 کسی کا بختِ خواہیدہ جگایا جارہا ہوگا
 وریدہ دامنِ وحشت کو اپنے سی رہا ہوگا
 بصیرت کی جبین پر عکسِ روئے مصطفیٰ ہوگا
 قمر سرکار کے نکووں کا صدقہ مانگتا ہوگا
 ادھر بیت الشرف والوں کا صدقہ بٹ رہا ہوگا
 کوئی حسانِ نعتِ سرور دیں پڑھ رہا ہوگا
 کسی ماتھے سے عرقِ انفعالی بہہ رہا ہوگا
 کسی کو جذبِ الفت ان کی جانب کھینچتا ہوگا
 امامت کا، ولایت کا خزانہ بٹ رہا ہوگا

گنہ گاروں، سیہ کاروں، خطا کاروں کا طیبہ میں
 شفاعت کی سند لینے کو میلا لگ گیا ہوگا
 اگر سرکارِ طیبہ میں ہمیں بھی یاد فرماتے
 ہمیں بھی غنود بخشش کی صفات مل گئی ہوتی
 ہمارا خواب مگر شرمندہ تعبیر ہو جاتا
 حقیقت میں ہماری زندگی بھی زندگی ہوتی

□□□

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں

میں تیز دھوپ میں سایہ تلاش کرتا ہوں سیاہ شب میں اجالا تلاش کرتا ہوں
نشانِ پائے مسحا تلاش کرتا ہوں ہلالِ عید تمنا تلاش کرتا ہوں
میں زندگی کا قرینہ تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں
حقائے حضرت عثمانؓ چاہیے مجھ کو حضورِ غوثؐ کا فیضان چاہیے مجھ کو
معینِ حقؐ کا قلم دان چاہیے مجھ کو جنابِ شیخؒ کا دامان چاہیے مجھ کو
نگاہِ مقتدر آقا تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں
مجیدیِ نعتی کردار کی ضرورت ہے معنیِ نکلتے گفتار کی ضرورت ہے
فقیرِ مخلوق کے افکار کی ضرورت ہے جیسے کو سجدہ سرکار کی ضرورت ہے
میں علمِ قادری دولہا تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں
شہیدِ راہِ وفا جیسی زندگانی ہو زباں میں حضرت منظورؒ کی روانی ہو
شعور و فکر میں حامدِ علمی ترجمانی ہو وحیفہ صبح و مسامیرا نعت خوانی ہو
میں سوزِ ہادیؒ شیدا تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں
پہرا پہنے گم شدہ معیار کی طلب ہے مجھے پہرا پہنے گرمی بازار کی طلب ہے مجھے
ہے ست قافلہ رفتار کی طلب ہے مجھے نظر کی، علم کی، کردار کی طلب ہے مجھے
میں افتخارِ گزشتہ تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں
ہمارے بحرِ موجوں میں پھر تلاطم ہو گلِ مراد کے ہونٹوں پہ پھر تبسم ہو
سکوتِ لالہ و گلِ جو صد تقلم ہو چمن میں ہلہلِ شیدا کا پھر ترنم ہو

دل پریشان ہے کیا ہونا ہے غم کا طوفان ہے کیا ہونا ہے
وقت کھیلوں میں گنوا یا سارا اب پشیمان ہے کیا ہونا ہے
کچھ بھی نامہ میں نہیں حسنِ عمل سر پہ میزان ہے کیا ہونا ہے
شبِ تیرہ ہے مسافر تنہا راہِ انجان ہے کیا ہونا ہے
ٹوٹی کشتی ہے شکستہ پتوار موجِ طوفان ہے کیا ہونا ہے
اے گدائے درِ غوثِ الاعظم کیوں پریشان ہے کیا ہونا ہے
تیرا حامی تیرا ناصر ترا غوث شاہِ جیلان ہے کیا ہونا ہے
لا فخر الی عزومِ قاتل ان کا فرمان ہے کیا ہونا ہے
غم کے سورج کی پیش لاکھ سہی ان کا دامان ہے کیا ہونا ہے
خواجہ ہند ہے دالی تیرا پھر بھی حیران ہے کیا ہونا ہے
آلِ احمد کی نگاہِ رحمت تجھ پہ ہر آن ہے کیا ہونا ہے
غوثِ اعظم کی غلامی عامم
اپنی پہچان ہے کیا ہونا ہے

□□□

دیداک حقیقت تھی

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب اپنے وطن میں ہم تھے
روبرو پھر مغاں مائل احسان بھی تھا
محفل بادہ کشی شام و سحر ہوتی تھی
روئے جانا کو ٹکا کرتے تھے یکسو بیٹھے
صبح گلشن میں تھی اور شام تھی میخانے میں
وہ تبسم وہ تکلم وہ نظارے وہ ادا
نہ اپنے تھے اک موج تبسم پہ ثار
نہ تیسو بھی بیٹے تو سحر ہوتی تھی
حسن رعنا کے وہ انداز و ادا میں توبہ
تذکرہ ان کی اداؤں کا ہوا کرتا تھا
شیخ صاحب تھے ہمیں توبہ کرانے پہ مصر
انغرض دیر بھی تھا مسجد و میخانہ بھی
ہائے کیا وقت تھا کیا رت تھی زمانہ کیا تھا
غم جاناں غم دوراں غم فردا غم دل
پھر سے افریقہ کے صحرا میں لے آیا ہے نصیب
آج ہم پھر اسی زندان کہن تک پہنچے
اب نہ وہ شام ڈھلے ان سے ملاقات رہی
اب نہ وہ صبح نہ وہ رات نہ وہ شام ہی ہے
اب نہ چلن کے سرکنے کی وہ آواز رہی
اب نہ وہ شمع فرداں نہ وہ پروانے ہیں
اب تو بس ہم ہیں اور اک گوشے تنہائی ہے
فصل گل کیسی بھلا موسم صبا کیسا
طف باقی نہ رہا اب تو کوئی جینے میں
زادہ و صوفی و میخوار جہاں باہم تھے
چھپر خوباں سے چل جانے کا سامان بھی تھا
ان کے الطاف و عنایت پہ نظر ہوتی تھی
سننے تھے جام بکف نغمہ کو کو بیٹھے
ڈوبے رہتے تھے سدا بادہ و پیانے میں
ہائے وہ توبہ شکن ان کے اشارے وہ ادا
لب خنداں کے تصدیق تو تکلم پہ ثار
روئے تباہ کی چمک رعنا قمر ہوتی تھی
عشقی آوارہ کی وہ شوخ نگاہیں توبہ
اور کبھی ذکر دغاؤں کا ہوا کرتا تھا
مست ساقی تھا کہ بس پینے پلانے پہ مصر
بب پہ توبہ کی صدا ہاتھ میں پیانہ بھی
جسم میں جان کا آنا تھا یہ جانا کیا تھا
نہ نسی قسم کا غم تھا نہ کوئی تھی مشکل
زندگی کیا کئے فرعون کی تربت کے قریب
قد و گیسو سے چپے دار و رن تک پہنچے
اب نہ وہ رات گئے بزم خرابات رہی
اب نہ وہ جلوۂ جانانہ سر بام ہی ہے
ب نہ وہ پر ہیں نہ وہ طاقب پرواز رہی
اب نہ وہ بادہ گساری نہ وہ پیانے ہیں
تو ہمیں گردش دوراں یہ کہاں لائی ہے
روئے جاناں کے نظارے کہاں بین کیسا
”کچھ مزہ ہے تو یہی خون جگر پینے میں“

آس اک ان سے ملاقات کی ہاں باقی ہے
اسی اُمید پہ بس جسم میں جاں باقی ہے
اب نہ وہ لطف نہ وہ کیف نہ وہ مستی ہے
اب نہ وہ فصل بہاری نہ وہ سرمستی ہے

بہار گلشن کہنہ تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں

نشاط پھر سے دل بے قرار پر آئے

یہاں کا ہر گل و غنچہ کھار پر آئے

افق پہ صبح تھکی تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں

مری زمین کا ہر ذرہ آفتاب ہے

شراب خانہ عینی شہیں پھر شراب ہے

حضور مست اللہ کا نیزہ تلاش کرتا ہوں

میں اپنی عظمت رفتہ تلاش کرتا ہوں

۱- عثمان:

۲- حضور غوث:

۳- معین الحق:

۴- جناب شیخ:

۵- مقتدر آقا:

۶- مجیدی:

۷- معینی:

۸- فقیر غوث:

۹- سجدہ سرکار:

۱۰- قادری دولہا:

۱۱- شہید راہ وفا:

۱۲- حضرت منظور:

۱۳- مد:

۱۴- ہادی:

۱۵- عینی:

۱۶- مست:

□□□

مجھ سے احباب یہ کہتے ہیں قصیدہ لکھو
آج کچھ تذکرہ جان تمنا لکھو
اک قصیدہ گل رنگیں کے تبسم پہ لکھو
نظم اک نازکی و شوخی ہم دم پہ لکھو
ایک افسانہ بعنوان مسرت لکھو
یار کے جسم شفق رنگ کی مدحت لکھو
آج کچھ بات سب و کاکل و رخسار کی ہو
شیشہ و ساغر و مینا سے و میواری کی ہو
مگر انہوں میں کس دل سے کروں یار کی بات
کس قسم سے لکھوں رعنائی گلزار کی بات
مجھ کو آتا ہے فسطین کے بچوں کا خیال
نوجوان بیٹوں کو روتی ہوئی ماؤں کا خیال
غرب اردن کے شہیدوں کا خیال آتا ہے
ان کی مایوس نگاہوں کا خیال آتا ہے
میرے بغداد پہ چھائے ہیں قضا کے بادل
فقر و افلاس کے فاقہ کے دبا کے بادل
میرے گجرات میں انسانوں کے کھٹے ہوئے سر
بھوک اور پیاس سے بچوں کے بکنے کا خیال
میرے کشمیر سے رونے کی صدا آتی ہے
میرے کابل میں مکانوں سے دھواں اٹھتا ہے
پھر بھی احباب یہ کہتے ہیں قصیدہ لکھو
کوئی نغمہ نہیں لکھ پاؤں گا یزداں کی قسم
ہاں حمیت کو اگر اپنی مٹا دوں تو لکھوں
اپنی غیرت کو اگر آگ لگا دوں تو لکھوں

”جوئے خوں می چکد از حسرت دیمند ما

ی تہ نالہ بہ نشر کدہ سینہ ما“

عید کا دن ہے مسرت کا ترانہ لکھو
نکبت و نور کے چکر کا سراپا لکھو
اک غزل بلبل شیدا کے ترنم پہ لکھو
مثنوی کوئی درخشانی انجم پہ لکھو
ذکر گلشن کا کرو گل کی حکایت لکھو
تبغ ابرو کو لکھو قد کو قیامت لکھو
زلف شب رنگ کی ہو گیسوئے خم دار کی ہو
غیر کا ذکر نہ ہو بات نظم یار کی ہو
کس زباں سے میں کروں زلف طرحدار کی بات
کیسے لکھوں گل و ببل لب و رخسار کی بات
ان کے سینوں میں اترتے ہوئے نیر وں کا خیال
خون سے بھیگی ہوئی ان کی رداؤں کا خیال
کبھی غزہ کے قیبوں کا خیال آتا ہے
گریہ کرتی ہوئی آنکھوں کا خیال آتا ہے
ظلم کے جور کے وحشت کے جفا کے بادل
آفت و رنج و مصیبت کے عنا کے بادل
بے کسوں مفسوس مجبوروں کے کھٹے ہوئے سر
خاک اور خون میں لاشوں کے ترپنے کا خیال
میرے قدحار سے آواز بکا آتی ہے
میرے شیشان کی گلیوں میں لبو بہتا ہے
عید کا دن ہے کوئی شوخ سا نغمہ لکھوں
قدس میں پہتے ہوئے خون شہیدان کی قسم
اپنی خود داری کو سولی پہ چڑھا دوں تو لکھوں
اپنے احساس کی دولت کو لٹا دوں تو لکھوں

دوستی کا ہاتھ

مرے عزیز مرے دوست میرے ہم سایہ
نہ تم کو مجھ پہ بھروسہ نہ مجھ کو تم پہ یقین
وہ جس کا نقش کف پا ہمارے سینے میں
وہ جس کے فیض سے ہم نے بلندیاں پائیں
ہماری کشت پر برسا ہے جو صاحب کرم
وہ جس کی بو سے معطر مشام جاں ہے مرا
وہ بادہ خانہ جہاں ہم نے گسری کی
ہے جس نگاہ کی مستی ہماری آنکھوں میں
جو عندلیب مرے باغ میں چمکتا ہے
وہ شمع جس سے منور ہے طاق دل میری
وہ بجلیاں جو مرے آشیاں کو نکلتی ہیں
تمہارا نقش صدر رنگ جس کی زد پر ہے
غرض کہ فرق نہیں کوئی ہم میں بنیادی
نہ اختلاف خیالات کا نہ مسلک کا
اگر یہ سچ ہے تو اسے محترم حریف مرے

ہمارے سچ جدائی کو اک صدی گزری
اسی نفاق و عداوت میں زندگی گزری
اسی کی یاد سے آباد تیرا سینہ ہے
اسی کا نام مبارک ترا وظیفہ ہے
اسی کے فیض کی بارش تمہارے آگلن میں
اسی گلاب کی رنگت تمہارے گلشن میں
شراب تم بھی اسی میکہ کی پیٹے ہو
اسی نگاہ سے مخمور تم بھی رہتے ہو
اسی کی نغمہ سرائی ترے گلستاں میں
اسی کی ضو سے اجاں ترے شبستاں میں
وہی حریف تمہارے نگار خانے کی
وہی خزاں ہے عدو میرے آشیانے کی
نہ فکر میں نہ عقیدے نہ دین و مذہب میں
نہ کوئی فرق ہمارے تمہارے شرب میں
کوئی جواز نہیں ہم میں دشمنی کے لیے

”اگر تمہاری انا ہی کا ہے سواں تو پھر

چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے“ (۱)

۱۔ آخری شعر احمد فراز کا ہے۔ (اسید الحق)

□□□

سابق نامہ

سال بھر بعد دیو پیر خرابات کھلا
حلقہ سلسلہ گروش حالات کھلا
یعنی رندوں کے لیے قبلہ حاجات کھلا

سمت مارہرہ سے اٹھا ہے صحاب بغداد
آگیا دور میں پھر جام شراب بغداد

جام دے جام تجھے روزِ استی کی قسم
بادہ و بادہ کش و بادہ گساری کی قسم
مست چشمِ شہِ بغداد کی مستی کی قسم

آئے گردش میں ذرا جام شراب بغداد
ساغر چشت میں بھر دے مے ناب بغداد

لب جاں بخش سے پیمانہ لگا کر دے دے
اپنی جھوٹی ذرا ساغر میں ملا کر دے دے
خوش کوثر سے کوئی بوند نہ لگا کر دے دے

سماعت دور مئے و جام ابھی گزری ہے
تشنہ کاموں کو یہ لگتا ہے صدی گزری ہے

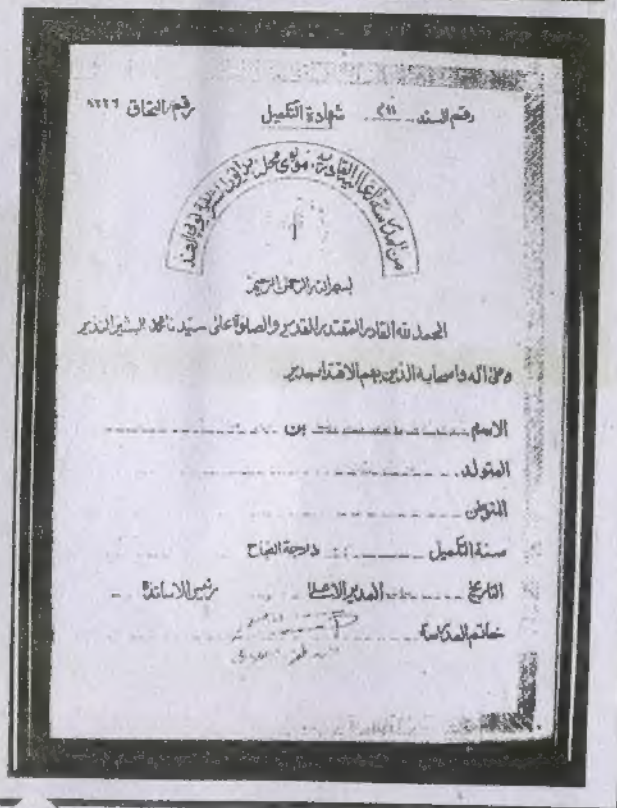
چشم بے نور کو انوار بصیرت دے دے
قلب صد چاک کو صہبائے محبت دے دے
طالب دید کو اک جام زیارت دے دے

آج باقی نہ رہے حسرت و ارماں ساقی
کاسۂ زیست میں بھر دے مئے عرفاں ساقی

000



عكس سند
الاجازة العالية، شعبية تفسير علوم قرآن
جامعة الازهر الشريف، مصر



عکس سند فضیلت من جانب مدرسہ قادریہ، بدایوں شریف
نوٹ: اس پر نقیب الاشراف حضرت سید احمد ظفر الہیائی
(سجادہ و متولی: آستانہ غوث اعظم) کے دستخط ہیں۔

عالم ربانی کو علمی و تحقیقی کتاب "خیر آبادیات" کی تصنیف پر
خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کی جانب سے ملنے والے ایوارڈ
اور توصیف نامے کا عکس۔

CERTIFICATE

خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ
کی جانب سے گرامر قدوسی خدمت پر

نشان تاج العلماء

2011

خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ
کی جانب سے گرامر قدوسی خدمت پر
نشان تاج العلماء 2011

پروفیسر سید محمد کاشف
خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ

ALLAMA FAZLE
HAQ KHAIRABADI

Haidul Haq Cade

فضل حق اکیڈمی دہلی اور بینائی ویلفیئر ٹرسٹ کی جانب سے
"خیر آبادیات" کی تصنیف پر یہ اعزاز دیا گیا



National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

The National Conference on Allama Fazle Haq Khairabadi
is a platform for the scholars and researchers to present their research papers
and to discuss the issues related to the life and works of Allama Fazle Haq Khairabadi.

عکس استاد علوم و حدیث
من جانب: اکابر شیوخ عرب

بسم الله الرحمن الرحيم
الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيدنا محمد وآله الطيبين الطاهرين
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

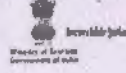
والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

والسلام على من اتبع الهدى
الذين هم خلائفنا في الأرض بعدنا.

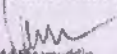


**International Seminar on
"Reflection of Indian Culture & Civilization in Travelogues"**
12-14 March, 2012

Centre of Indian Languages
School of Language, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University, New Delhi - 110 067, INDIA

Certificate of Participation

This is to certify that Mr. Usaidul Haq Qadri, Khangaah
Badma, Badma has participated in the International Seminar on
Reflection of Indian Culture & Civilization in Travelogues hosted by the Centre of Indian
Languages, School of Language, Literature and Culture Studies, Jawaharlal Nehru University,
New Delhi, India, from 12 to 14 March 2012, with a plenary presentation entitled Sufism
and the message of love & peace


Dr. Khwaja Moinuddin
Director of the Seminar

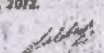


**DEPARTMENT OF ARABIC
UNIVERSITY OF MUMBAI**

Two Day
**NATIONAL SEMINAR
CERTIFICATE**

This is to certify that Prof. / Dr. / Mrs. / Miss / Mr.
Usaidul Haq Qadri
of Khangaah Badma, Badma
University / College
has attended / presented a paper / participated in the
SEMINAR on "LINGUISTIC & LITERARY RELATIONS
BETWEEN ARABIC & URDU" organized by
DEPARTMENT OF ARABIC, UNIVERSITY OF MUMBAI,
on 21 & 22 FEBRUARY, 2012.

Mumbai
22 Feb. 2012


Prof. Dr. J. K. Puri
Director of Seminars
Department of Arabic, University of Mumbai

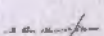
University of Mumbai

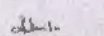


DEPARTMENT OF ARABIC
Kamala Bhawan, Ground Floor, Vidyasagar Campus,
Santacruz (E), Mumbai - 400 055

This is to certify that Mr. Usaidul Haq Qadri
of Khangaah Badma, Badma participated
and presented the paper on the National Seminar
on "Linguistic & Literary Relations"
organized
by the Department of Arabic, University of Mumbai,
on 21 & 22 February 2012

Mumbai
Date: 22 February 2012


Secretary of the
Seminar


Director of the
Seminar

سورج ہوں زندگی کی رمت چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

1975 - 2014